

فتاویٰ
شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ



انتخاب وتقدیم
فضیلۃ الشیخ محمد عزیر شمس رحمہ اللہ

ترجمہ
پروفیسر حافظ عبد الجبار حفظہ اللہ

فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ

انتخاب و تقدیم

فضیلۃ الشیخ محمد عُزیر شمس رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ

پروفیسر حافظ عبدالجبّار حفظہ اللہ

جلد دوم

دارُ ابی الطّیب
للبحث والتحقیق

نام کتاب: ــــــــــــ فتاویٰ شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ

انتخاب وتقدیم: ــــــــــــ فضیلۃ الشیخ محمد عُزیر شمس رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ: ــــــــــــ پروفیسر حافظ عبدالجبار حفظہ اللہ

طبع اول: ــــــــــــ فروری 2021ء

طبع دوم: ــــــــــــ مارچ 2024ء

ناشر

دار ابی الطیب

للبحث والتحقیق

گل روڈ، حمید کالونی گلی نمبر 5 گوجرانوالہ

www.darabitayyab.com @ darabitayyab1@gmail.com

www.facebook.com/darabitayyab/

+92-55-3823990

فہرست (جلد دوم)

علاماتِ قیامت، قیامت اور آخرت:

صحابہ کرام:

اللہ تعالیٰ کی مختلف مخلوقات:

متفرق مسائل:



وسیلہ

رسول اللہ ﷺ کو وسیلہ بنانے اور آپ ﷺ سے فریاد کرنے کا حکم

سوال اس شخص کا کیا حکم ہے جو کہتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے استغاثہ کرنا ہر اس کام میں جائز ہے جس میں اللہ سے استغاثہ کیا جاتا ہے، اور یہ اس معنی میں ہے کہ آپ ﷺ بھی اللہ کے فراہم کردہ وسائل میں ایک وسیلہ ہیں۔ اسی طرح جن امور میں اللہ سے استغاثہ کیا جاتا ہے، ان میں تمام انبیا اور صالحین سے بھی استغاثہ جائز ہے۔

جس شخص نے کسی پریشانی کو دور کرنے کے لیے اللہ کی طرف اپنے نبی کا وسیلہ لیا، گویا اس نے نبی سے استغاثہ کیا، خواہ اس نے استغاثہ کا لفظ استعمال کیا یا وسیلہ کا، یا ان کے معنی میں کوئی دوسرا لفظ استعمال کیا۔ کہنے والے کا یہ قول: "أتوسل إليك يا إلٰهي برسولك، أو أستغيث برسولك عندك، أن تغفرلي" (اے میرے معبود! میں تیری طرف تیرے رسول کا وسیلہ لیتا ہوں یا تجھ سے تیرے رسول کے ذریعے استغاثہ کرتا ہوں کہ تو میری مغفرت فرما دے) عربوں سمیت تمام اقوام کی زبان میں حقیقتاً رسول سے استغاثہ ہے۔

وہ مزید کہتا ہے: قدیم و جدید زمانے میں ہمیشہ سے لوگ استغاثہ کا مطلب ذات سے استغاثہ سمجھتے رہے ہیں۔ استغاثہ کی نسبت مخلوق کی طرف صحیح ہے۔ وسیلے کے طور پر ان سے استغاثہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ ہر اس شخص کے لیے عام ہے جو اس کے توسل اور واسطے سے پریشانی دور کرنے کی دعا کرے۔ یہ انبیا اور صالحین کے سلسلے میں صحیح ہے۔

اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ طبرانی نے نبی اکرم ﷺ سے جو حدیث نقل کی ہے کہ بعض صحابہ نے آپس میں کہا کہ اس منافق کے سلسلے میں رسول سے استغاثہ کرو تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: مجھ سے استغاثہ نہیں کیا جاسکتا، صرف اللہ سے استغاثہ کیا جاسکتا ہے۔[1] یہاں نبی اکرم ﷺ نے اپنی ذات سے استغاثہ کی جو نفی کی ہے، اس سے توحید کی طرف اشارہ ہے اور یہ کہ تنہا اللہ ہی کو یہ قدرت حاصل ہے، لیکن ہمارے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ ہم آپ ﷺ کی ذات سے اس کی نفی کریں، بلکہ ہمارے لیے یہ کہنا جائز ہے کہ نبی اکرم ﷺ اور صالح انسان سے ہر اس کام میں استغاثہ کیا جاسکتا ہے جس میں اللہ سے استغاثہ کیا جاتا ہے۔ یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ آپ سے یہ استغاثہ بطور وسیلہ اور

[1] علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد (١٠/١٦٢) میں کہا ہے کہ اسے امام طبرانی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے، اس کے رجال صحیح والے رجال ہیں سوائے ابن لہیعہ کے، جب کہ وہ بھی حسن الحدیث ہے۔ نیز دیکھیں: مسند أحمد (٥/٣١٧)

واسطہ کیا جاتا ہے۔ جو شخص یہ کہے کہ آپ سے استغاثہ نہیں کیا جاسکتا، وہ آپ ﷺ کی تنقیص کر رہا ہے اور اس کی وجہ سے وہ کافر ہے۔ لیکن اگر وہ جہالت کی وجہ سے یہ بات کہہ رہا ہو تو اسے معذور سمجھا جائے گا، تاہم جب وہ استغاثہ کا مفہوم سمجھ لے، اس کے بعد بھی اپنے موقف پر اصرار کرے تو وہ کافر ہو جائے گا۔

آپ ﷺ سے توسل کرنا آپ ﷺ سے استغاثہ کرنا ہے، جیسا کہ یہ بیان گزرا۔ کیا علمائے اسلام میں سے کسی سے یہ بات معروف ہے کہ انھوں نے کہا ہو کہ نبی اکرم ﷺ اور صالح انسان سے ہر اس کام میں استغاثہ کیا جاسکتا ہے جس میں اللہ سے استغاثہ کیا جاتا ہے؟ کیا اس کا اطلاق، جیسا کہ قائل کا کہنا ہے، جائز ہے؟

کیا نبی اکرم ﷺ، کسی صالح انسان یا ان کے علاوہ دوسروں سے ہر امر میں توسل کرنا ان کی ذات سے استغاثہ کرنا ہے، جیسا کہ اس قول کے قائل نے تمام زبانوں کے حوالے سے ذکر کیا ہے۔ خواہ وسیلہ نبی اکرم ﷺ کا لیا جائے یا کسی صالح انسان کا، حقیقت میں اس سے استغاثہ کرنا ہے یا نہیں؟ کیا کسی عالم کے بارے میں معلوم ہے کہ اس نے کہا ہو کہ اللہ کی طرف ہر نبی اور صالح انسان کا وسیلہ لینا جائز ہے؟ شیخ عزالدین بن عبدالسلام نے اپنے مشہور فتاویٰ میں یہ فتوی دیا ہے کہ اللہ کی جانب صرف نبی اکرم ﷺ سے وسیلہ لینا جائز ہے، اگر اس بابت حدیث صحیح ہو! کیا کسی نے شیخ مذکور کے فتویٰ کے خلاف فتویٰ دیا ہے؟

اگر یہ مان لیا جائے کہ مسئلے میں اختلاف ہے تو جس نے یہ کہا ہے کہ تمام انبیا اور صالحین کا وسیلہ نہیں لیا جاسکتا، جیسا کہ شیخ عزالدین نے فتویٰ دیا ہے تو کیا اس قائل کی طرح اس کی بھی تکفیر کی جائے گی؟ اور شیخ نے جو فتویٰ دیا ہے وہ کفر قرار دیا جائے گا، بلکہ خود نبی اکرم ﷺ سے وسیلہ لینے کے متعلق اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ نہ آپ سے وسیلہ لینا جائز ہے، نہ آپ ﷺ سے استغاثہ کرنا جائز ہے، نہ آپ ﷺ کی حیات اور موجودگی میں اور نہ آپ ﷺ کی وفات کے بعد آپ ﷺ کی عدمِ موجودگی میں۔ کیا یہ بھی کفر قرار پائے گا اور آپ ﷺ کی تنقیص سمجھی جائے گی؟

اگر وہ یہ کہے کہ جس کام پر صرف اللہ قادر ہے، اس میں صرف اللہ سے استغاثہ کیا جاسکتا ہے، یعنی اس چیز کا مطالبہ صرف اللہ سے کیا جاسکتا ہے تو کیا یہ بھی کفر ہو گا یا ایک صحیح بات ہو گی؟ جب نبی اکرم ﷺ نے ربوبیت کی خصوصیات ہونے کی وجہ سے کچھ چیزوں کی اپنی ذات سے خود نفی فرما دی ہو تو کیا آپ کی ذات سے اس کی نفی کرنا حرام ہے، یا ایسا کرنا واجب ہے، یا اس کی نفی کرنا جائز ہے؟

جواب الحمد للہ رب العالمین. علمائے اسلام میں سے کسی نے یہ نہیں کہا ہے کہ جن باتوں میں صرف اللہ سے استغاثہ کیا جاتا ہے ان میں کسی مخلوق سے استغاثہ کیا جاسکتا ہے، نہ کسی نبی سے، نہ کسی فرشتے سے اور نہ کسی صالح انسان سے، بلکہ دینِ اسلام کی واضح اور صاف باتوں میں سے ایک اہم بات یہ ہے کہ مطلق طور پر ایسا کرنا ناجائز ہے۔

کسی نے یہ بھی نہیں کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے وسیلہ لینے کا مطلب آپ سے استغاثہ کرنا ہے، بلکہ عام طور پر جو لوگ اپنی دعاؤں میں جن چند چیزوں کا وسیلہ چاہتے ہیں، جیسے ایک کہتا ہے کہ اے اللہ! میں فلاں شیخ کے حق یا اس کی حرمت کو تیرے حضور وسیلہ بناتا ہوں، یا تیری جناب میں لوح، قلم یا کعبہ وغیرہ کو وسیلہ بنا کر پیش کرتا ہوں تو ایسا کرنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ ان چیزوں سے استغاثہ نہیں کرتے۔ نبی اکرم ﷺ سے استغاثہ کرنے والا آپ ﷺ سے درخواست کرنے والا ہے۔ وہ آپ ﷺ سے سوال کرتا ہے۔ جس سے وسیلہ لیا جاتا ہے، خود اس سے نہ دعا کی جاتی ہے، نہ اس سے طلب کی جاتی ہے اور نہ اس سے سوال کیا ہے، بلکہ اس ذریعے سے اللہ سے طلب کی جاتی ہے۔ ہر آدمی مدعو (جس سے دعا کی جاتی ہے) اور مدعو بہ (جس کے ذریعے سے دعا کی جاتی ہے) میں فرق کرتا ہے۔

''استغاثہ'' طلبِ غوث اور مدد مانگنے کو کہتے ہیں۔ غوث نام ہے مصیبت اور تکلیف کو زائل کرنے کا، جیسے استنصار مدد طلب کرنے کو کہتے ہیں اور ''استعانہ'' بھی مدد طلب کرنے کو کہتے ہیں۔ ان امور میں سے صرف وہی چیز مخلوق سے طلب کی جا سکتی ہے جس کی اسے قدرت حاصل ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ ﴾ [الأنفال: ٧٢]

''اور اگر وہ دین کے بارے میں تم سے مدد مانگیں تو تم پر مدد کرنا لازم ہے۔''

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِيْ مِنْ عَدُوِّهٖ ﴾ [القصص: ١٥]

''تو جو اس کی قوم سے تھا اس نے اس سے اس کے خلاف مدد مانگی جو اس کے دشمنوں سے تھا۔''

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

﴿ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ﴾ [المائدة: ٢]

''اور نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو۔''

لیکن جن چیزوں کی قدرت صرف اللہ رکھتا ہے، وہ صرف اللہ ہی سے طلب کی جا سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ اسلام نبی اکرم ﷺ سے استغاثہ نہیں کرتے تھے، لیکن وہ آپ ﷺ کے ذریعے سے بارش طلب کرتے تھے اور اس میں آپ ﷺ کا وسیلہ لیتے تھے، جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے:

''إِنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رضي الله عنه اِسْتَسْقَى بِالْعَبَّاسِ وَقَالَ: اَللّٰهُمَّ إِنَّا كُنَّا إِذَا أَجْدَبْنَا نَتَوَسَّلُ إِلَيْكَ بِنَبِيِّنَا فَتَسْقِيْنَا، وَإِنَّا نَتَوَسَّلُ إِلَيْكَ بِعَمِّ نَبِيِّنَا فَاسْقِنَا فَيُسْقَوْنَ'' [1]

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٩٦٤، ٣٥٠٧)

''سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے سیدنا عباس رضی اللہ عنہ سے بارش کی دعا کے لیے درخواست کی اور یہ دعا فرمائی: اے اللہ! جب ہم قحط سالی کا شکار ہوتے تھے تو تیرے حضور اپنے نبی کو وسیلہ بنا کر پیش کرتے تھے اور تو ہمیں سیراب کرتا تھا۔ آج ہم اپنے نبی کے چچا کو تیری جناب میں وسیلہ بنا کر پیش کرتے ہیں تو ہمیں سیراب فرما۔ چنانچہ وہ سیراب کیے جاتے تھے۔''

سنن ابو داود میں ہے:

«إِنَّ رَجُلًا قَالَ لِلنَّبِيِّ ﷺ: إِنَّا نَسْتَشْفِعُ بِاللّٰهِ عَلَيْكَ، وَنَسْتَشْفِعُ بِكَ عَلَى اللّٰهِ؛ فَقَالَ: شَأْنُ اللّٰهِ أَعْظَمُ مِنْ ذَلِكَ، إِنَّهُ لَا يُسْتَشْفَعُ بِهِ عَلَى أَحَدٍ مِنْ خَلْقِهِ»[1]

''ایک شخص نے نبی اکرم ﷺ سے عرض کی: ہم آپ کے حضور اللہ تعالیٰ کو اپنا سفارش کنندہ بنا کر پیش کرتے ہیں اور اللہ کے حضور آپ کو اپنا سفارش کنندہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کی شان اس سے کہیں زیادہ عظیم ہے۔ اس کو اس کی کسی مخلوق کے یہاں سفارش کنندہ نہیں بنایا جا سکتا۔''

آپ ﷺ نے اس کے اس قول: ''اللہ کے حضور آپ کو اپنا سفارش کنندہ بنا کر پیش کرتے ہیں'' کو تو برقرار رکھا، لیکن اس کے اس قول: ''ہم آپ کے حضور اللہ کو اپنا سفارش کنندہ بنا کر پیش کرتے ہیں'' کی تردید فرمائی۔

تمام مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ہمارے نبی ﷺ قیامت کے دن شفاعت فرمائیں گے اور ساری مخلوق آپ سے شفاعت کی درخواست کرے گی۔ اہلِ سنت کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ اہلِ کبائر کے حق میں بھی شفاعت فرمائیں گے، جب کہ وعیدیہ فرقہ[2] کہتا ہے کہ آپ ﷺ صرف ثواب میں اضافے کے لیے شفاعت فرمائیں گے۔

کہنے والے کا یہ قول کہ جس نے اللہ کے یہاں کسی نبی کا وسیلہ لیا اور یہ کہا: ''میں تیرے حضور تیرے رسول کا وسیلہ پیش کرتا ہوں'' تو اس نے حقیقت میں رسول سے استغاثہ کیا۔ عرب اور دیگر تمام امتوں کی لغت میں یہی مفہوم ہے۔'' تو اس نے سب پر جھوٹ باندھا ہے۔ ابنِ آدم کی کسی لغت میں یہ معنی معروف نہیں ہے، بلکہ تمام لوگ جانتے ہیں کہ جس سے استغاثہ کیا جاتا ہے وہ وہی ہوتا ہے جس سے سوال کیا جاتا اور جس سے دعا مانگی جاتی ہے۔ وہ مسئول (جس سے سوال کیا جاتا ہے) اور مسئول بہ (جس کے ذریعے سے سوال کیا جاتا ہے) کے درمیان فرق کرتے ہیں، خواہ خالق سے استغاثہ کرے یا مخلوق سے استغاثہ کرے۔ مخلوق سے استغاثہ صرف ان چیزوں میں جائز ہے جن میں مدد کرنے کی قدرت اسے حاصل ہے۔ نبی اکرم ﷺ تو افضل خلائق ہیں، اس طرح کی چیزوں میں آپ سے بھی استغاثہ کرنا جائز ہے۔

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧٢٦) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے ضعیف کہا ہے۔

[2] اس سے مراد خوارج اور معتزلہ ہیں، جن کا یہ غلط نظریہ ہے کہ کبیرہ گناہ کا مرتکب ہمیشہ جہنم میں رہے گا اور اس کو کسی سفارش کا فائدہ نہیں ہوگا۔

اگر کوئی کہنے والا جس سے استغاثہ کرتا ہے، اس سے یہ کہتا ہے کہ میں تجھ سے فلاں کے وسیلے سے یا فلاں کے اس حق کی وجہ سے جو تجھ پر اس کا ہے، سوال کرتا ہوں تو کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے جس کا وسیلہ لیا ہے، اس سے استغاثہ کیا ہے، بلکہ استغاثہ اس سے ہوتا ہے جس کو پکارا جاتا اور جس سے سوال کیا جاتا ہے۔ اسی لیے اللہ کے اسمائے حسنیٰ کی شرح میں مصنّفین لکھتے ہیں کہ مغیث، مجیب کے معنی میں ہے، لیکن اغاثہ خاص ہے عمل کے ساتھ اور اجابہ خاص ہے قول کے ساتھ۔ ①

نبی اکرم ﷺ کے علاوہ کسی دوسرے کا اللہ کی جناب میں وسیلہ لینا خواہ اس کا نام استغاثہ رکھا جائے یا اسے استغاثہ کا نام نہ دیا جائے، ہمیں نہیں معلوم کہ سلف میں سے کسی نے کسی دوسرے کا وسیلہ لیا ہے اور نہ اس کے متعلق کوئی اثر مروی ہے۔ شیخ عزالدین کے فتوے کے علاوہ ہمیں اس سلسلے میں کچھ معلوم نہیں۔ ان کے فتوے میں نبی اکرم ﷺ کے علاوہ کسی دوسرے کا وسیلہ لینے سے منع کیا گیا ہے۔ جہاں تک مسئلہ نبی اکرم ﷺ کا وسیلہ لینے کا ہے تو اس سلسلے میں سنن میں، جسے نسائی اور ترمذی وغیرہ نے روایت کیا ہے، یہ حدیث ہے کہ ایک اعرابی نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! میری آنکھوں کی بینائی چلی گئی ہے، آپ اللہ سے میرے لیے دعا فرمائیں۔ نبی اکرم ﷺ نے اس سے فرمایا:

«تَوَضَّأْ وَصَلِّ رَكْعَتَيْنِ، ثُمَّ قُلْ: اَللّٰهُمَّ أَسْأَلُكَ وَأَتَوَجَّهُ إِلَيْكَ بِنَبِيِّكَ مُحَمَّدٍ، يَا مُحَمَّدُ! إِنِّيْ أَتَشَفَّعُ بِكَ فِيْ رَدِّ بَصَرِيْ، اَللّٰهُمَّ شَفِّعْ نَبِيَّكَ فِيَّ، وَقَالَ: "فَإِنْ كَانَتْ لَكَ حَاجَةٌ فَمِثْلُ ذَلِكَ"، فَرَدَّ اللّٰهُ بَصَرَهُ» ②

''وضو کرو اور دو رکعت نماز پڑھو اور اس کے بعد اس طرح دعا کرو: اے اللہ! میں تیرے نبی محمد ﷺ کے وسیلے سے تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ اے محمد! میں اپنی بصارت واپس آنے کے لیے آپ کو سفارشی بناتا ہوں۔ اے اللہ! میرے سلسلے میں اپنے نبی کی سفارش قبول فرما۔'' اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمھیں جب بھی کوئی حاجت ہو تو اسی طرح کہا کرو۔'' چنانچہ اللہ نے اس کی بینائی لوٹا دی۔''

اسی حدیث کی وجہ سے شیخ عزالدین نے اپنے فتوے میں نبی اکرم ﷺ سے وسیلہ لینے کو مستثنیٰ کیا ہے۔

---

① اس بات کی مزید وضاحت اگلے فتویٰ میں آ رہی ہے۔

② عمل اليوم والليلة للنسائي (ص: ٢٠٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٧٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٣٨٥) مسند أحمد (١٣٨/٤) صحيح الجامع (١٢٧٩)

لوگوں نے اس وسیلے کے دو مفہوم بیان کیے ہیں:

① یہ وہی وسیلہ ہے جس کا ذکر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس وقت کیا تھا جب انھوں نے فرمایا تھا: ''ہم جب قحط سالی کا شکار ہوتے تھے تو تیرے حضور اپنے نبی کا وسیلہ پیش کرتے تھے اور تو ہمیں سیراب کرتا تھا، لیکن آج ہم تیرے حضور اپنے نبی کے چچا کا وسیلہ پیش کرتے ہیں، اے اللہ! تو ہمیں سیراب کر۔'' اس حدیث میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ذکر کیا ہے کہ وہ لوگ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا استسقا میں آپ کی حیاتِ طیبہ میں وسیلہ لیتے تھے، لیکن انھوں نے آپ کی وفات کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کا وسیلہ لیا۔ ان کا وسیلہ لینا اس معنی میں تھا کہ انھوں نے آپ کے ذریعے سے بارش طلب کی اور وہ بھی اس طرح کہ آپ دعا فرماتے تھے اور اصحابِ رسول آپ کے ساتھ ساتھ بارش کی دعا کرتے تھے۔ اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے حضور ان کے لیے وسیلہ تھے، لیکن صحابہ کرام نے یہ کام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر موجودگی میں کبھی نہیں کیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح کی حاجات میں ان کے لیے شفاعت فرمانے والے تھے، ان کے لیے دعا فرمانے والے تھے۔ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیثِ اعمیٰ میں فرمایا تھا کہ تم اپنی دعا میں کہو: اے اللہ! میرے بارے میں ان (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی سفارش قبول فرمالے۔ اسے یہ بات معلوم تھی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بارے میں اللہ سے سفارش فرمائیں گے، اس لیے اس نے اللہ تعالیٰ سے یہ درخواست کی کہ اس کے بارے میں ان کی شفاعت قبول فرمائے۔

② وسیلے کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ آپ کی زندگی میں بھی لیا جائے اور آپ کی وفات کے بعد بھی، اسی طرح آپ کی موجودگی میں بھی لیا جائے اور آپ کی غیر موجودگی میں بھی۔ لیکن کسی نے بھی یہ نہیں کہا ہے کہ جو پہلے قول کا قائل ہے اس نے کفر کا ارتکاب کیا ہے اور اس کی تکفیر کی کوئی وجہ بھی نہیں ہے، کیوں کہ یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ اس کے دلائل واضح اور ظاہر نہیں ہیں اور کفر کا مرتکب انسان اس وقت ہوتا ہے جب وہ دین میں معلوم بالضرورہ کا انکاری ہو یا متواتر اور متفق علیہ احکام کا انکار کرے۔

کون سی دعا جائز ہے اور کون سی جائز نہیں ہے، اس میں لوگوں کا اختلاف اسی طرح کا ہے جس طرح کا جانور ذبح کرتے وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنے کا ہے۔ تاہم کسی مسلمان کے نزدیک بھی یہ مسائل ایسے نہیں ہیں کہ ان کی بنا پر کسی کو برا بھلا کہا جائے۔ البتہ جس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور سے وسیلہ (استغاثہ) لینے کی نفی کرنے والے کو کافر کہا، اسی طرح جو شیخ عزالدین اور ان جیسے حضرات کی طرح عقیدہ رکھتے ہیں تو اس کا جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ جواب بالکل واضح ہے، بلکہ اس طرح کے مسائل میں دوسروں کی تکفیر کرنے والا دین میں افترا پردازی کرنے والوں کی طرح سخت سزا اور تعزیر کا مستحق ہے، خاص طور پر جب کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرما دیا ہو:

((مَنْ قَالَ لِأَخِيْهِ: كَافِرٌ، فَقَدْ بَاءَ بِهَا أَحَدُهُمَا))[1]

''جس نے اپنے بھائی کو کافر کہا تو دونوں میں سے ایک ضرور کافر ہو گا۔''

لیکن جس نے یہ کہا ہے کہ جن کاموں کی قدرت صرف اللہ رکھتا ہے، ان میں استغاثہ صرف اللہ سے کرنا جائز ہے، اس کی بات حق ہے، بلکہ اگر وہ اس موقع پر وہ بات کہتا جو ابو یزید بسطامی اور شیخ ابوعبداللہ قرشی نے کہی ہے تو زیادہ اچھا ہوتا۔ ابو زید فرماتے ہیں:

''استغاثة المخلوق بالمخلوق كاستغاثة الغريق بالغريق''

''مخلوق کا مخلوق سے فریاد کرنا ٹھیک اسی طرح ہے جیسے کوئی پانی میں ڈوبنے والا اپنی طرح ڈوبنے والے ہی سے فریاد کرے۔''

نیز شیخ ابوعبداللہ قرشی فرماتے ہیں:

''استغاثة المخلوق بالمخلوق كاستغاثة المسجون بالمسجون''

''مخلوق کا مخلوق سے فریاد کرنا ٹھیک اسی طرح ہے، جیسے کوئی قیدی دوسرے قیدی سے فریاد کرے۔''

کیوں کہ اس مطلق کلام سے مطلق استغاثہ سمجھا جاتا ہے، جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے فرمایا تھا:

((إِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللّٰهِ، وَإِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ))[2]

''جب بھی مانگو اللہ سے مانگو اور جب بھی مدد چاہو اللہ کی مدد چاہو۔''

جب نبی اکرم ﷺ اپنی ذات سے کسی چیز کی نفی فرما دیں تو وہ اس بابت بھی صادق و مصدوق ہیں، جیسا کہ آپ اپنی تمام خبروں میں صادق و مصدوق ہیں، چاہے وہ خبر نفی کی ہو یا اثبات کی۔ آپ کی ہر نفی و اثبات کی تصدیق کرنا ہم پر واجب ہے۔ جس کسی نے آپ کی تعظیم کے زعم میں آپ کی کسی خبر کو رد کیا، اس نے نصاریٰ کی مشابہت کی، جنھوں نے مسیح علیہ السلام کی تعظیم کے زعم میں ان تمام خبروں کی تکذیب کی جن میں آپ علیہ السلام نے اپنی عبودیت کی خبر دی تھی۔ ہمارے لیے درست ہے کہ ہم آپ کی ذات سے ان باتوں کی نفی کریں جن کی نفی خود آپ نے کی ہے۔ کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اس نفی کے مقابلے میں قطعی طور پر کوئی نقیض وارد کرے۔ واللہ أعلم.[3]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٥٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٠)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥١٦) مسند أحمد (٢٩٣/١، ٣٠٣، ٣٠٧) صحيح الجامع (٧٨٣٤)

[3] مجموع الفتاویٰ (١٠١/١۔١٠٧)

رسول اللہ ﷺ کو وسیلہ بنانے کا مفہوم

سوال کبار علما اور ائمہ دین کا اس شخص کے بارے کیا موقف ہے جو کہتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے استغاثہ نہیں کیا جاسکتا۔ کیا اس کا یہ کہنا حرام ہے؟ کیا ایسا کہنا کفر ہے یا نہیں؟ اگر وہ قرآن کی آیات اور رسول اکرم ﷺ کی احادیث سے دلائل فراہم کرے تو کیا کوئی دلیل اس کے حق میں مفید ہو گی یا نہیں؟ اگر اس مسئلے میں کتاب و سنت سے دلیل ہاتھ آجائے تو اس کی مخالفت کرنے والے کے لیے کیا حکم ہے؟

جواب الحمد لله. مشہور، بلکہ متواتر احادیث، نیز امت کے اجماع سے ثابت ہے کہ ہمارے نبی ﷺ شفاعت کرنے والے ہیں اور آپ کی شفاعت قبول بھی کی جائے گی۔ آپ قیامت کے دن مخلوقات کے حق میں شفاعت کریں گے۔ لوگ آپ سے شفاعت طلب کریں گے اور درخواست کریں گے کہ ان کے رب سے ان کے لیے شفاعت فرمائیں اور آپ ان کے حق میں شفاعت کریں گے۔

اہلِ سنت والجماعت کا اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ آپ کبیرہ گناہوں کے مرتکبین کے لیے بھی شفاعت کریں گے اور اہلِ توحید میں سے کوئی بھی شخص ہمیشہ کے لیے جہنم میں نہیں رہے گا۔ خوارج اور معتزلہ نے اہلِ ایمان کے حق میں آپ کی شفاعت کا انکار تو نہیں کیا ہے، تاہم وہ اہلِ کبائر کے حق میں آپ کی شفاعت کے منکر ہیں۔ یہ بدعتی اور گمراہ لوگ ہیں۔ جہاں تک ان کو کافر قرار دیے جانے کا سوال ہے تو اس سلسلے میں اہلِ علم کا اختلاف ہے اور اس کی علاحدہ تفصیلات ہیں۔

قیامِ حجت کے بعد تواتر اور اجماع سے ثابت شدہ امر کا انکار کرنے والا کافر ہے، خواہ وہ اسے استغاثہ کا نام دے یا نہ دے۔ لیکن جو شخص آپ کی شفاعت کا اقرار کرے اور آپ سے اس طرح وسیلہ لینے اور شفاعت طلب کرنے کا انکار کرے جس طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کرتے تھے، جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا معمول تھا کہ جب لوگ قحط میں مبتلا ہوتے تو آپ عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ سے استسقا کے لیے دعا کی درخواست کرتے تھے کہ "اے اللہ! ہم اپنے نبی کے وسیلے سے بارش طلب کیا کرتے تھے اور تو ہمیں سیراب کرتا تھا۔ اب ہم اپنے نبی کے چچا کو وسیلہ بنا کر بارش مانگتے ہیں۔ تو ہمیں بارش عطا فرما۔" تو لوگ سیراب کیے جاتے تھے۔[1]

سنن ابی داود وغیرہ میں ہے کہ ایک دیہاتی نے نبی اکرم ﷺ سے عرض کی: لوگ تنگی و مشقت میں گرفتار ہیں، بچے

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٩٦٤، ٣٥٠٧)

بھوکے ہیں اور ڈھور ڈنگر مر رہے ہیں۔ آپ اللہ تعالیٰ سے ہمارے لیے دعا فرمائیں۔ ہم آپ کو سفارش کنندہ بناتے ہیں اللہ تعالیٰ کے پاس اور اللہ کو سفارش کنندہ بناتے ہیں آپ کے پاس۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے سبحان اللہ کہا، یہاں تک کہ دیہاتی کی بات پر ناگواری آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے چہروں سے بھی ظاہر ہونے لگی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تیرا برا ہو، اللہ تعالیٰ کو اس کی کسی مخلوق کے پاس سفارش کنندہ نہیں بنایا جاسکتا۔ اللہ تعالیٰ کی شان اس سے کہیں زیادہ بلند ہے۔''[1] راوی نے پھر باقی حدیث کا تذکرہ کیا ہے۔ آپ ﷺ نے دیہاتی کے اس قول: ''ہم اللہ تعالیٰ کو آپ کے پاس سفارش کنندہ بناتے ہیں'' پر نکیر کی، لیکن اس کے اس قول: ''ہم آپ کو اللہ کے پاس سفارش کنندہ بناتے ہیں'' کی نکیر نہیں کی، بلکہ اسے باقی رکھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا کہنا جائز ہے۔

لہٰذا اگر کوئی شخص اس کا انکار کرتا ہے تو وہ گمراہ، خطا کار اور بدعتی ہے۔ البتہ ایسے شخص کو کافر قرار دیا جائے گا یا نہیں، اس سلسلے میں اختلاف ہے اور اس کی الگ تفصیلات ہیں۔ البتہ جو شخص آپ کی اس شفاعت اور وسیلے وغیرہ کا اقرار کرے جس کا ثبوت کتاب وسنت اور اجماع سے ملتا ہے، لیکن یہ بھی کہے کہ دعا صرف اللہ تعالیٰ قبول کرتا ہے اور جن چیزوں پر صرف اللہ قدرت رکھتا ہے، ان کو صرف اللہ تعالیٰ سے طلب کیا جائے گا، جیسے: گناہوں کی بخشش، دلوں کو ہدایت یاب کرنا، بارش برسانا اور نباتات کا اگانا وغیرہ تو اس کا یہ کہنا درست ہے، بلکہ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں مسلمانوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ﴾ [آل عمران: ١٣٥] ''اور اللہ کے سوا اور کون گناہ بخشتا ہے؟''

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ [القصص: ٥٦]

''بے شک تو ہدایت نہیں دیتا جسے تو دوست رکھے اور لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔''

اس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ ﴾ [فاطر: ٣]

''اے لوگو! اللہ کی نعمت یاد کرو جو تم پر ہے، کیا اللہ کے سوا کوئی پیدا کرنے والا ہے، جو تمھیں آسمان اور زمین میں سے رزق دیتا ہو۔''

اللہ نے یہ بھی فرمایا ہے:

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧٢٦) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے ضعیف کہا ہے۔

﴿وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَىِٕنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ۚ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ [آل عمران: ۱۲٦]

''اور اللہ نے اسے نہیں بنایا مگر تمھارے لیے ایک خوش خبری اور تاکہ تمھارے دل اس کے ساتھ مطمئن ہو جائیں اور مدد نہیں ہے مگر اللہ کے پاس سے۔''

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ﴾ [التوبة: ٤٠]

''اگر تم اس کی مدد نہ کرو تو بلاشبہہ اللہ نے اس کی مدد کی، جب اسے لوگوں نے نکال دیا جنھوں نے کفر کیا، جب کہ وہ دو میں دوسرا تھا، جب وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا غم نہ کر، بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''

جو معانی کتاب وسنت سے ثابت ہوں ان کا اثبات ضروری ہے اور جن معانی کی کتاب وسنت سے نفی ہوتی ہے، ان کی نفی کرنا واجب ہے۔ جو عبارت نفی واثبات دونوں معانی پر دلالت کرے، اگر وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے کلام میں پائی جاتی ہو تو اس کا اقرار کرنا واجب ہے، لیکن اگر کسی انسان کے کلام میں ایسی عبارت نظر آئے اور اس سے اس کا مطلب ظاہر ہو رہا ہو تو اس پر حکم لگے گا، ورنہ اس کی مراد جاننے کے لیے اسی کی طرف رجوع کیا جائے گا۔

بسا اوقات اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے کلام میں ایسی کوئی عبارت ہوتی ہے جس کا معنی صحیح ہوتا ہے، لیکن بعض لوگ اس سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مراد کے خلاف کوئی دوسرا معنی سمجھ لیتے ہیں۔ ایسی صورت میں ان کے اخذ کردہ معنی ومفہوم کو رد کیا جائے گا، جیسا کہ امام طبرانی نے اپنی ''المعجم الکبیر'' میں روایت بیان کی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں ایک منافق تھا جو مومنوں کو تکلیف پہنچایا کرتا تھا۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: ہمارے ساتھ چلو، ہم اس منافق کے شر سے بچنے کے لیے رسول اللہ ﷺ سے استغاثہ کریں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: استغاثہ مجھ سے نہیں، اللہ سے کیا جاتا ہے۔[1] اس سے نبی اکرم ﷺ نے دوسرا معنی مراد لیا ہے اور وہ یہ کہ آپ سے ایسی چیز طلب کی جائے جس کی قدرت صرف اللہ تعالیٰ رکھتا ہے۔ ورنہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ سے دعا کی درخواست کرتے تھے اور آپ سے بارش کی دعا کے لیے کہتے تھے جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ

[1] علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد (۱۰/۱٦۲) میں کہا ہے کہ اسے امام طبرانی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے، اس کے رجال صحیح والے رجال ہیں سوائے ابن لہیعہ کے، جب کہ وہ بھی حسن الحدیث ہے۔ نیز دیکھیں: مسند أحمد (۵/۳۱۷)

بسا اوقات مجھے شاعر کا مندرجہ ذیل شعر یاد آتا ہے اور نبی اکرم ﷺ کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے۔ آپ سے بارش کے لیے دعا کی درخواست کی جاتی۔ آپ دعا کر کے ابھی منبر سے اترے بھی نہ ہوتے کہ پرنالوں سے بڑی تیزی کے ساتھ پانی گرنے لگتا تھا ع

وَأَبْيَضُ يُسْتَسْقَى الْغَمَامُ بِوَجْهِهِ ثِمَالُ الْيَتَامٰى عِصْمَةٌ لِلْأَرَامِلِ

''اور وہ سرخ و سفید جس کے چہرے کے واسطے سے بدلیوں میں سے بارش طلب کی جاتی ہے، جو یتیموں کے فریاد رس اور بیواؤں کے کفیل ہیں۔''[1]

یہ شعر ابو طالب کا ہے۔ اسی لیے اسمائے الٰہی کے موضوع پر کتابیں تصنیف کرنے والے علما نے کہا ہے کہ ہر مکلّف انسان کے لیے اس حقیقت کا علم و ادراک ضروری ہے کہ مطلق طور پر اللہ تعالیٰ کے علاوہ نہ کوئی مدد کرنے والا ہے اور نہ کسی کی فریاد سننے والا ہے۔ ہر قسم کی مدد اسی کے ہاں سے آتی ہے، اگرچہ وہ کسی دوسرے کے ہاتھوں اس فعل کو انجام دلائے۔ حقیقت میں مدد اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی ہوتی ہے، دوسرے کی مدد مجازی معنی میں ہوتی ہے۔

ان اصحابِ تصنیف علما نے یہ بھی کہا ہے کہ ''المغیث'' اور ''الغیاث'' اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہیں۔ ''المغیث'' کا ذکر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں موجود ہے۔[2] ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس بات پر امت کا اتفاق ہے۔

ابو عبداللہ الحلیمی کہتے ہیں کہ ''الغیاث'' ہی ''المغیث'' ہے۔ ''غیاث المستغیثین'' اکثر بولا جاتا ہے جس کا مطلب ہے: وہ ذات جو اپنے بندوں کی تکالیف میں ان کی دست گیری کرتی ہے۔ جب وہ اسے پکارتے ہیں، ان کو جواب دیتی اور تکلیفوں سے انھیں نجات دیتی ہے۔ بخاری و مسلم میں استسقا کی حدیث میں ہے: «اَللّٰهُمَّ أَغِثْنَا اَللّٰهُمَّ أَغِثْنَا»[3] (اے اللہ! ہماری فریاد سن لے۔ اے اللہ! ہماری فریاد سن لے) کہا جاتا ہے: أغاثه إغاثة وغیاثا وغوثا۔ یہ لفظ ''المجیب'' (جواب دینے والا) اور ''المستجیب'' (دعا قبول کرنے والا) کے معنی میں ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ ﴾ [الأنفال: ٩]

''جب تم اپنے رب سے مدد مانگ رہے تھے تو اس نے تمھاری دعا قبول کر لی۔''

البتہ بالعموم اِغاثہ (فریاد سننا) عملاً ہوتا ہے اور اِستجابہ (دعا قبول کرنا) قولاً ہوتا ہے۔ کبھی کبھی دونوں کو ایک

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٩٦٣)

[2] المستدرك للحاكم (١/١٦)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٩٦٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٩٧)

دوسرے کی جگہ پر بھی بولا جاتا ہے۔

ان علما نے یہ بھی کہا ہے کہ فریاد کرنے والے اور دعا کرنے والے کے درمیان فرق یہ ہے کہ فریاد کرنے والا غوث کو پکارتا ہے اور دعا کرنے والا اس ذات کو صدا دیتا ہے جس سے دعا کی جاتی ہے اور جو فریاد سنتی ہے، لیکن یہ تفریق محلِ نظر ہے، کیوں کہ "یا للّٰہ للمسلمین" (اے اللہ کے لیے مسلمانوں کے لیے!) استغاثہ کے الفاظ میں سے ہے۔ معروف کرخی کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اکثر "واغوثاہ" (اے فریاد سننے والے) کہا کرتے تھے۔ دلیل کے طور پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پیش کرتے تھے:

﴿ إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ ﴾ [الأنفال: ٩]

"جب تم اپنے ربّ سے مدد مانگ رہے تھے تو اس نے تمھاری دعا قبول کر لی۔"

دعائے ماثور میں ہے:

« يَا حَيُّ يَا قَيُّومُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ بِرَحْمَتِكَ أَسْتَغِيثُ أَصْلِحْ لِي شَأْنِي كُلَّهُ وَلَا تَكِلْنِي إِلَىٰ نَفْسِي طَرْفَةَ عَيْنٍ وَلَا إِلَىٰ أَحَدٍ مِنْ خَلْقِكَ » [1]

"اے زندہ اور اے ہمیشہ قائم رہنے اور قائم رکھنے والے! تیرے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں۔ میں تیری رحمت سے فریاد کرتا ہوں، میری ہر حالت کو درست فرما دے۔ لحہ بھر کے لیے بھی مجھے میرے نفس کے حوالے نہ کر اور نہ اپنی کسی مخلوق کے۔"

اللہ تعالیٰ کی رحمت کو وسیلہ بنا کر فریاد کرنا حقیقت میں اس کی ذات سے فریاد کرنا ہے جس طرح اس کی صفات سے پناہ طلب کرنے کا مطلب حقیقت میں اس کی ذات سے پناہ طلب کرنا ہے، نیز اس کی صفات کی قسم کھانا حقیقت میں اس کی ذات کی قسم کھانا ہے۔ حدیث میں ہے:

« أَعُوذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّةِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ » [2]

"میں پناہ مانگتا ہوں اللہ کے پورے پورے کلمات کے ساتھ تمام مخلوق کی برائی سے۔"

ایک دوسری حدیث میں ہے:

« أَعُوذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ، وَبِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوبَتِكَ، وَبِكَ مِنْكَ، لَا أُحْصِي ثَنَاءً

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٠٩٠) مسند أحمد (٤٢/٥) علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد (١٤٠/١٠) میں کہا ہے: اسے طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس کی اسناد حسن ہے۔

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٠٨)

عَلَيْكَ أَنْتَ كَمَا أَثْنَيْتَ عَلَى نَفْسِكَ »[1]

''میں تیری رضا کے ساتھ تیری ناراضی سے اور تیری عافیت کے ساتھ تیری سزا سے پناہ مانگتا ہوں۔ تیری ہی ذات کے ساتھ تیرے عذاب سے پناہ طلب کرتا ہوں۔ میں تیری تعریف کما حقہ نہیں کر سکتا، تو ٹھیک ویسا ہی ہے جیسا کہ تو نے اپنی تعریف خود فرمائی ہے۔''

ائمہ دین نے کلام اللہ کے غیر مخلوق ہونے کی ایک دلیل "أعوذ بكلمات الله التامة" سے بھی دی ہے، کیوں کہ کسی مخلوق سے پناہ طلب کرنا درست نہیں ہے۔

قسم کا بھی یہی حال ہے۔ صحیحین میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ كَانَ حَالِفاً فَلْيَحْلِفْ بِاللّٰهِ أَوْلِيَصْمُتْ »[2]

''جو قسم کھائے صرف اللہ کی قسم کھائے یا چپ رہے۔''

سنن ترمذی کی روایت ہے اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے:

« مَنْ حَلَفَ بِغَيْرِ اللّٰهِ فَقَدْ أَشْرَكَ »[3] ''جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی اس نے شرک کیا۔''

اسی طرح صحیح بخاری میں "عزة الله" اور "عمر الله" وغیرہ کی قسم کھانا بھی ثابت ہے[4] جس کے بارے میں مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ یہ غیر اللہ کی قسم نہیں ہے جس سے منع کیا گیا ہے۔

استغاثہ اس معنی میں کہ رسول اکرم ﷺ سے وہ چیز طلب کی جائے جو آپ کے منصب و مقام کے لیے مناسب اور زیبا ہے تو اس سلسلے میں کسی مسلمان کو اختلاف نہیں ہے۔ اس معنی و مفہوم سے اختلاف کرنے والا یا تو کافر ہے اگر وہ اس چیز کا انکار کرتا ہے جس سے کفر لازم آتا ہے یا پھر خطا کار اور گمراہ ہے۔ رہا استغاثہ اس معنی میں جس کی نفی رسول اللہ ﷺ نے کی ہے تو اس کی نفی کرنا بھی واجب ہے۔ جو شخص غیر اللہ کے لیے وہ چیز ثابت کرے جو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مختص ہے تو وہ بھی کافر ہے اگر اس کے خلاف وہ دلیل موجود ہو جس کے ترک کرنے پر کفر لازم آتا ہے۔ اسی مفہوم میں ابو یزید بسطامی رحمہ اللہ کا یہ قول ہے:

"استغاثة المخلوق بالمخلوق كاستغاثة الغريق بالغريق"

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٨٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٣٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٤٦)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٥١) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥٣٥) مسند أحمد (٤٧/١) السلسلة الصحيحة (٢٠٤٢)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٤٨)

’’مخلوق کا مخلوق سے فریاد کرنا ٹھیک اسی طرح ہے جیسے کوئی پانی میں ڈوبنے والا کسی ڈوبنے والے سے فریاد کرے۔‘‘

دیارمصریہ کے مشہور بزرگ ابوعبداللہ القرشی فرماتے ہیں:

"استغاثة المخلوق بالمخلوق كاستغاثة المسجون بالمسجون"

’’مخلوق کا مخلوق سے فریاد کرنا ٹھیک اسی طرح ہے جیسے کوئی قیدی کسی دوسرے قیدی سے فریاد کرے۔‘‘

موسیٰ علیہ السلام کی ایک دعا ہے:

"اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ، وَإِلَيْكَ الْمُشْتَكَى، وَأَنْتَ الْمُسْتَعَانُ، وَبِكَ الْمُسْتَغَاثُ، وَعَلَيْكَ التُّكْلَانُ، وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِكَ"[1]

’’اے اللہ! تمام حمد وشکر تیرے لیے ہے، تکلیف دور کرنے کی درخواست تجھی سے ہے، تو ہی مدد بہم پہنچانے والا ہے، فریادرس تو ہی ہے، بھروسے کے قابل تیری ذات ہے اور ہر قوت وطاقت کا منبع تو ہی ہے۔‘‘

لفظ استغاثہ جب مطلق طور پر بولا جائے تو یہی معنی ومفہوم مراد ہوتا ہے اور یہ اللہ کے لیے خاص ہے۔ ایسی صورت میں غیر اللہ سے اس کی مطلق نفی کرنا درست ہوگا۔ اسی لیے کسی امام سے یہ منقول نہیں ہے کہ اس نے غیر اللہ سے مطلق استغاثہ کرنے کو جائز قرار دیا ہو اور غیر اللہ سے مطلق استغاثہ کی نفی کرنے کا انکار کیا ہو۔ اسی طرح ان کاموں میں استغاثہ کرنا جن میں صرف اللہ سے استغاثہ کرنا درست ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں اسی طرف اشارہ ہے:

﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴾ [الفاتحة: ٤]

’’ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ سے مدد مانگتے ہیں۔‘‘

عبادت پر مطلقاً مدد اللہ تعالیٰ ہی کرسکتا ہے۔ مخلوق سے مدد بھی صرف ان کاموں میں طلب کی جاسکتی ہے جن میں مدد کرنے کی طاقت اسے حاصل ہے۔ نصرت طلب کرنے کا حال بھی یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ ﴾ [الأنفال: ٧٢]

’’اور اگر وہ دین کے بارے میں تم سے مدد مانگیں تو تم پر مدد کرنا لازم ہے۔‘‘

مطلق طور پر نصرت (ایسی صورت حال کے) پیدا کرنے کو کہتے ہیں جس کی بدولت مدد کا طالب دشمن پر غالب آجائے اور اس پر اللہ کے سوا کوئی قادر نہیں۔

---

[1] المعجم الصغير (١٢٢/١) علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد (١٨٦/١٠) میں کہا ہے: اسے طبرانی نے المعجم الأوسط اور المعجم الصغير میں روایت کیا ہے اور اس میں وہ راوی ہیں جنھیں ہم نہیں پہچانتے۔

کتاب و سنت سے ثابت امر کا مخالف یا تو کافر ہے یا فاسق ہے یا پھر نافرمان ہے، اِلا یہ کہ ازراہِ اجتہاد ہو اور غلطی کرنے والا مومن ہو۔ اس صورت میں اپنے اجتہاد کرنے پر وہ ثواب کا مستحق ہوگا اور اس کی غلطی معاف کر دی جائے گی۔ یہی حکم اس شخص کا ہے جس کے پاس حجت تمام کرنے والا علم نہ پہنچا ہو، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ۱۵]

''اور ہم کبھی عذاب دینے والے نہیں، یہاں تک کہ کوئی پیغام پہنچانے والا بھیجیں۔''

لیکن اگر کتاب و سنت سے ثابت شدہ حجت اس پر تمام ہو جائے پھر بھی وہ اس کی مخالفت کرے تو اسے اس کی مخالفت اور انکار کے مطابق سزا دی جائے گی، یہ سزا قتل بھی ہو سکتی ہے اور اس سے کم بھی۔ واللہ أعلم[1]

بندے اور اللہ کے درمیان وسیلے کا مفہوم اور حکم

سوال دو آدمیوں نے آپس میں مناظرہ کیا۔ ایک نے کہا کہ ہمارے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان واسطہ ضروری ہے، کیوں کہ واسطے کے بغیر ہم اللہ تعالیٰ تک نہیں پہنچ سکتے۔ ان کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب الحمد لله رب العالمين. اگر اپنی اس بات سے اس کی مراد یہ ہے کہ ہم تک اللہ کا حکم پہنچنے کے لیے ایک واسطہ ضروری ہے تو اس کی بات حق اور درست ہے، کیوں کہ اللہ اپنے بندوں کی طرف اپنے جن رسولوں کو بھیجتا ہے ان کے واسطے کے بغیر انسانوں کو یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ اللہ کو کیا پسند ہے، وہ کس بات سے راضی ہوتا ہے، ان کو اس نے کیا کرنے کو کہا ہے، کن چیزوں سے منع کیا ہے، اپنے محبوب بندوں کی تکریم کے لیے اس نے کیا انعامات تیار کر رکھے ہیں اور اپنے دشمنوں کے لیے کس قسم کے عذاب کی دھمکی دے رکھی ہے۔ اسی طرح وہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور اس کی صفاتِ علیا کی معرفت حاصل نہیں کر سکتے جن سے اللہ کی ذات متصف ہے اور جن تک عقلِ انسانی کی رسائی ناممکن ہے۔

رسولوں پر ایمان رکھنے اور ان کی اتباع کرنے والے ہی وہ ہدایت یافتہ لوگ ہیں جن کو اللہ اپنا تقرب عطا فرماتا ہے، جن کے درجات بلند کرتا ہے، جن کو دنیا میں عزت دیتا ہے اور جن کی وہ آخرت میں تکریم فرمائے گا۔ اس کے برعکس جو لوگ رسولوں کی مخالفت کرتے ہیں وہ ملعون ہیں، گمراہ ہیں اور اپنے رب سے محروم ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿35﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾ [الأعراف: ۳۵، ۳۶]

[1] مجموع الفتاویٰ (۱/۱۰۸۔۱۱۳)

''اے آدم کی اولاد! اگر کبھی تمھارے پاس واقعی تم میں سے کچھ رسول آئیں، جو تمھارے سامنے میری آیات بیان کریں تو جو شخص ڈر گیا اور اس نے اصلاح کر لی تو ان پر نہ کوئی خوف ہے نہ وہ غم کھائیں گے۔ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور انھیں ماننے سے تکبر کیا، وہی آگ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔''

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ﴿١٢٣﴾ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴿١٢٤﴾ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ﴿١٢٥﴾ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ﴾ [طٰہٰ: ۱۲۳۔۱۲۶]

''پھر اگر کبھی واقعی تمھارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کے پیچھے چلا تو نہ وہ گمراہ ہوگا اور نہ مصیبت میں پڑے گا۔ اور جس نے میری نصیحت سے منہ پھیرا تو بے شک اس کے لیے تنگ گزران ہے اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا کر کے اٹھائیں گے۔ کہے گا اے میرے رب! تو نے مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا؟ حالانکہ میں تو دیکھنے والا تھا۔ وہ فرمائے گا اسی طرح تیرے پاس ہماری آیات آئیں تو تو انھیں بھول گیا اور اسی طرح آج تو بھلایا جائے گا۔''

سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: قرآن پڑھنے اور اس کی تعلیمات اور احکام پر عمل کرنے والے کے لیے اللہ نے ذمہ لیا ہے کہ اسے نہ دنیا میں گمراہ کرے گا اور نہ آخرت میں بدبختی اس کے قریب آئے گی۔

البتہ جہنمیوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ﴿٨﴾ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۚ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ ﴾ [الملک: ۸، ۹]

''جب بھی کوئی گروہ اس میں ڈالا جائے گا، اس کے نگران ان سے پوچھیں گے کیا تمھارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا؟ وہ کہیں گے کیوں نہیں! یقیناً ہمارے پاس ڈرانے والا آیا تو ہم نے جھٹلا دیا اور ہم نے کہا اللہ نے کوئی چیز نہیں اتاری، تم تو ایک بڑی گمراہی میں ہی پڑے ہو۔''

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۭ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴾ [زمر: ۷۱]

''اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا گروہ در گروہ جہنم کی طرف ہانکے جائیں گے، یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس آئیں گے تو اس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اس کے نگران ان سے کہیں گے کیا تمھارے پاس تم میں سے کچھ رسول نہیں آئے جو تم پر تمھارے رب کی آیات پڑھتے ہوں اور تمھیں تمھارے اس دن کی ملاقات سے ڈراتے ہوں؟ کہیں گے کیوں نہیں، اور لیکن عذاب کی بات کافروں پر ثابت ہوگئی۔''

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ﴾ [الأنعام: ٤٨، ٤٩]

''اور ہم رسولوں کو نہیں بھیجتے مگر خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے، پھر جو شخص ایمان لے آئے اور اصلاح کر لے تو ان پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا انھیں عذاب پہنچے گا، اس وجہ سے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔''

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ ۚ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۝ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۚ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۝ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا﴾ [النساء: ١٦٣۔١٦٥]

''بلاشبہ ہم نے تیری طرف وحی کی، جیسے ہم نے نوح اور اس کے بعد (دوسرے) نبیوں کی طرف وحی کی اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اس کی اولاد اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان کی طرف وحی کی اور ہم نے داود کو زبور عطا کی۔ اور بہت سے رسولوں کی طرف جنھیں ہم اس سے پہلے تجھ سے بیان کر چکے ہیں اور بہت سے ایسے رسولوں کی طرف جنھیں ہم نے تجھ سے بیان نہیں کیا اور اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا، خود کلام کرنا۔ ایسے رسول جو خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے تھے، تاکہ لوگوں کے پاس رسولوں کے بعد اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت نہ رہ جائے اور اللہ ہمیشہ سے سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔''

اس طرح کی آیات قرآن مجید میں بہت ہیں۔ اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان اس طرح کے واسطوں کا ہونا تمام ملتوں: اسلام، یہودیت اور عیسائیت کے یہاں متفق علیہ ہے۔ ان سے وہ رسول مراد ہیں جو اللہ کی جانب

سے اس کے احکام اور اس کی خبریں پہنچانے کے لیے مبعوث کیے گئے تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ ۢ بَصِيْرٌ ﴾ [الحج: ٧٥]

''اللہ فرشتوں میں سے پیغام پہنچانے والے چنتا ہے اور لوگوں سے بھی۔''

اللہ اور بندوں کے درمیان نبیوں اور رسولوں کے ان واسطوں کا جو شخص انکار کرے وہ تمام ملتوں کے اجماع کے مطابق کافر ہے۔

جو سورتیں اللہ نے مکہ میں نازل فرمائی ہیں، جیسے الأنعام، الأعراف، الٓر، حمٓ، طسٓ اور ان کے علاوہ بھی بعض سورتیں، یہ دین کے اصولوں، جیسے: اللہ پر ایمان، رسولوں پر ایمان اور آخرت پر ایمان پر مشتمل ہیں۔ رسولوں کو جھٹلانے والے کافروں کے واقعات اللہ نے بیان کیے ہیں اور یہ بھی ذکر کیا ہے کہ انھیں کیسے ہلاک کیا اور کس طرح اپنے رسولوں اور اہلِ ایمان کی مدد فرمائی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ۝١٧١ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ۝١٧٢ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴾

[الصافات: ١٧١-١٧٣]

''اور بلاشبہ یقیناً ہمارے بھیجے ہوئے بندوں کے لیے ہماری بات پہلے طے ہو چکی۔ کہ بے شک وہ، یقیناً وہی ہیں جن کی مدد کی جائے گی۔ اور بے شک ہمارا لشکر، یقیناً وہی غالب آنے والا ہے۔''

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴾ [الغافر: ٥١]

''بے شک ہم اپنے رسولوں کی اور ان لوگوں کی جو ایمان لائے ضرور مدد کرتے ہیں دنیا کی زندگی میں اور اس دن بھی جب گواہ کھڑے ہوں گے۔''

یہ ہیں وہ واسطے جن کی اطاعت کی جاتی ہے، جن کا اتباع کیا جاتا ہے اور جن کی اقتدا میں زندگی گزاری جاتی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ ﴾ [النساء: ٦٤]

''اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اللہ کے حکم سے اس کی فرماں برداری کی جائے۔''

اسی سورت میں اللہ تعالیٰ آگے فرماتا ہے:

﴿ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ ﴾ [النساء: ٨٠]

''جو رسول کی فرماں برداری کرے تو بے شک اس نے اللہ کی فرماں برداری کی۔''

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ﴾ [آل عمران: ٣١]

''کہہ دے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔''

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾

[الأعراف: ١٥٧]

''سو وہ لوگ جو اس پر ایمان لائے اور اسے قوت دی اور اس کی مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو اس کے ساتھ اتارا گیا وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴾ [الأحزاب: ٢١]

''بلاشبہ یقیناً تمھارے لیے اللہ کے رسول میں ہمیشہ سے اچھا نمونہ ہے، اس کے لیے جو اللہ اور یومِ آخر کی امید رکھتا ہو اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرتا ہو۔''

لیکن واسطے سے اگر اس کی مراد یہ ہے کہ حصولِ منفعت اور دفعِ ضرر کے لیے ایک واسطہ ضروری ہے، مثال کے طور پر بندوں کو روزی پہنچانے، ان کی مدد کرنے اور ان کو ہدایت دینے کا واسطہ، ایک ایسا واسطہ جس سے وہ سوال کریں اور جس سے اپنے سوالات کے جوابات پانے کی امید کریں تو یہ سب سے بڑا شرک ہے جس کا ارتکاب کرنے پر اللہ نے مشرکین کو کافر قرار دیا، کیوں کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے علاوہ ایسے اولیاء اور شفاعت کرنے والے مقرر کر رکھے تھے جن کے بارے میں ان کا عقیدہ تھا کہ وہ ان کے ذریعے سے نفع حاصل کرتے اور نقصانات سے بچتے ہیں۔

ہاں شفاعت کا جہاں تک معاملہ ہے تو یہ صرف اس شخص کے لیے ہوگا جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ اجازت مرحمت فرمائے گا، جیسا کہ اس نے فرمایا ہے:

﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴾ [السجدة: ٤]

''اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین اور ان دونوں کے درمیان کی ہر چیز کو چھے دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر بلند ہوا، اس کے سوا تمھارا نہ کوئی دوست ہے اور نہ کوئی سفارش کرنے والا۔ تو کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے۔''

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴾ [الأنعام: ٥١]

''اور اس کے ساتھ ان لوگوں کو ڈرا جو خوف رکھتے ہیں کہ اپنے رب کی طرف (لے جا کر) اکٹھے کیے جائیں گے، ان کے لیے اس کے سوا نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی سفارش کرنے والا، تاکہ وہ بچ جائیں۔''

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ﴿٥٦﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ۭ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ﴾ [بني إسرائيل: ٥٦، ٥٧]

''کہہ پکارو ان کو جنھیں تم نے اس کے سوا گمان کر رکھا ہے، پس وہ نہ تو تم سے تکلیف دور کرنے کے مالک ہیں اور نہ بدلنے کے۔ وہ لوگ جنھیں یہ پکارتے ہیں، وہ (خود) اپنے رب کی طرف وسیلہ ڈھونڈتے ہیں، جو ان میں سے زیادہ قریب ہیں اور اس کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ بے شک تیرے رب کا عذاب وہ ہے جس سے ہمیشہ ڈرا جاتا ہے۔''

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ﴿٢٢﴾ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ۭ ﴾ [سبا: ٢٢، ٢٣]

''کہہ دے پکارو ان کو جنھیں تم نے اللہ کے سوا گمان کر رکھا ہے، وہ نہ آسمانوں میں ذرہ برابر کے مالک ہیں اور نہ زمین میں اور نہ ان کا ان دونوں میں کوئی حصہ ہے اور نہ ان میں سے کوئی اس کا مددگار ہے۔ اور نہ سفارش اس کے ہاں نفع دیتی ہے مگر جس کے لیے وہ اجازت دے۔''

سلف کی ایک جماعت کہتی ہے کہ بعض لوگ مسیح، عزیر اور فرشتوں کو پکارا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے سامنے یہ حقیقت واضح فرما دی کہ فرشتے اور انبیاء ان سے مصیبت اور تکلیف دور کرنے کے مالک نہیں ہیں اور نہ انھیں اس کا کوئی اختیار حاصل ہے، بلکہ وہ خود اللہ کا تقرب حاصل کرنے میں کوشاں رہتے ہیں، اس کی رحمت کی انھیں آس ہوتی ہے اور وہ اس کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓىِٕكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴾

[آل عمران: ۷۹، ۸۰]

''کسی بشر کا کبھی حق نہیں کہ اللہ اسے کتاب اور حکم اور نبوت دے، پھر وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ اور لیکن رب والے بنو، اس لیے کہ تم کتاب سکھایا کرتے تھے اور اس لیے کہ تم پڑھا کرتے تھے۔ اور نہ یہ (حق ہے) کہ تمھیں حکم دے کہ فرشتوں اور نبیوں کو رب بنا لو، کیا وہ تمھیں کفر کا حکم دے گا، اس کے بعد کہ تم مسلم ہو۔''

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بتا دیا کہ فرشتوں اور نبیوں کو رب بنانا کفر ہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی شخص فرشتوں اور نبیوں کو ایسا واسطہ بنالے کہ ان سے دعا کرے، ان پر بھروسا کرے، حصولِ منفعت اور دفعِ ضرر کے لیے ان کے سامنے دستِ سوال دراز کرے۔ مثال کے طور پر ان سے اپنے گناہوں کی بخشش طلب کرے، دلوں کی ہدایت کا خواستگار ہو، آلام و مصائب کو دور کرنے کی درخواست کرے اور فقر و محتاجی دور کرنے کا سوال کرے تو مسلمانوں کا اجماع ہے کہ وہ کافر ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۝ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ۝ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ۝ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْۤ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [الأنبياء: ۲۶-۲۹]

''اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف یہ وحی کرتے تھے کہ بے شک حقیقت یہ ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کرو۔ اور انھوں نے کہا رحمان نے کوئی اولاد بنا رکھی ہے، وہ پاک ہے، بلکہ وہ بندے ہیں جنھیں عزت دی گئی ہے۔ وہ بات کرنے میں اس سے پہل نہیں کرتے اور وہ اسی کے حکم کے ساتھ ہی عمل کرتے ہیں۔ وہ جانتا ہے جو ان کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے اور وہ سفارش نہیں کرتے مگر اسی کے لیے جسے وہ پسند کرے اور وہ اسی کے خوف سے ڈرنے والے ہیں۔ اور ان میں سے جو یہ کہے کہ بے شک میں اس کے سوا معبود ہوں تو یہی ہے جسے ہم جہنم کی جزا دیں گے۔ ایسے ہی ہم ظالموں کو جزا دیتے ہیں۔''

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓىِٕكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ﴾ [النساء: ١٧٢]

''مسیح ہرگز اس سے عار نہ رکھے گا کہ وہ اللہ کا بندہ ہو اور نہ مقرب فرشتے ہی اور جو بھی اس کی بندگی سے عار رکھے اور تکبر کرے تو عنقریب وہ ان سب کو اپنی طرف اکٹھا کرے گا۔''

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ۞ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْـًٔا اِدًّا ۞ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۞ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ۞ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ۞ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ۞ لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ۞ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴾ [مریم: ٨٨۔٩٥]

''اور انھوں نے کہا رحمان نے کوئی اولاد بنا لی ہے۔ بلاشبہ یقیناً تم ایک بہت بھاری بات کو آئے ہو۔ آسمان قریب ہیں کہ اس سے پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ڈھے کر گر پڑیں۔ کہ انھوں نے رحمان کے لیے کسی اولاد کا دعویٰ کیا۔ آسمانوں اور زمینوں میں جو کوئی بھی ہے وہ رحمان کے پاس غلام بن کر آنے والا ہے۔ بلاشبہ یقیناً اس نے ان کا احاطہ کر رکھا ہے اور انھیں خوب اچھی طرح گن کر شمار کر رکھا ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک قیامت کے دن اس کے پاس اکیلا آنے والا ہے۔''

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ۚ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾ [یونس: ١٨]

''اور وہ اللہ کے سوا ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ انھیں نقصان پہنچاتی ہیں اور نہ انھیں نفع دیتی ہیں اور کہتے ہیں یہ لوگ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ کہہ دے کیا تم اللہ کو اس چیز کی خبر دیتے ہو جسے وہ نہ آسمانوں میں جانتا ہے اور نہ زمین میں؟ وہ پاک ہے اور بہت بلند ہے اس سے جو وہ شریک بناتے ہیں۔''

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى ﴾ [النجم: ٢٦]

''اور آسمانوں میں کتنے ہی فرشتے ہیں کہ ان کی سفارش کچھ کام نہیں آتی مگر اس کے بعد کہ اللہ اجازت دے جس کے لیے چاہے اور (جسے) پسند کرے۔''

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ ﴾ [البقرۃ: ۲۵۵]

''کون ہے وہ جو اس کے پاس اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرے۔''

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَاِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ یُّرِدْكَ بِخَیْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ ﴾ [یونس: ۱۰۷]

''اور اگر اللہ تمھیں کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کے سوا اسے کوئی دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تیرے ساتھ کسی بھلائی کا ارادہ کرلے تو کوئی اس کے فضل کو ہٹانے والا نہیں۔''

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ مَا یَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا یُمْسِكْ ۙ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ ﴾

[فاطر: ۲]

''جو کچھ اللہ لوگوں کے لیے رحمت میں سے کھول دے تو اسے کوئی بند کرنے والا نہیں اور جو بند کر دے تو اس کے بعد اسے کوئی کھولنے والا نہیں۔''

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ قُلْ اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِیَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖۤ اَوْ اَرَادَنِیْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ ؕ قُلْ حَسْبِیَ اللّٰهُ ؕ عَلَیْهِ یَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴾

[الزمر: ۳۸]

''کہہ تو کیا تم نے دیکھا کہ وہ ہستیاں جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، اگر اللہ مجھے کوئی نقصان پہنچانے کا ارادہ کرے تو کیا وہ اس کے نقصان کو ہٹانے والی ہیں؟ یا وہ مجھ پر کوئی مہربانی کرنا چاہے تو کیا وہ اس کی رحمت کو روکنے والی ہیں؟ کہہ دے مجھے اللہ ہی کافی ہے، اس پر بھروسا کرنے والے بھروسا کرتے ہیں۔''

قرآنِ مجید میں اس طرح کی آیات بہت ہیں۔

انبیا کے علاوہ دیگر اہلِ علم اور مشائخِ دین کے بارے میں اگر کوئی یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ وہ رسول اوز ان کی امت کے درمیان واسطہ ہیں، ان تک دین حق پہنچاتے ہیں، ان کو تعلیم دیتے ہیں، ان کو ادب و تہذیب سکھاتے ہیں اور وہ ان کی اقتدا کرتا ہے تو اس کا یہ عقیدہ درست ہے۔

یہ اہلِ علم اور مشائخِ دین جب کسی بات پر اتفاق کرلیں تو وہ دین میں قطعی طور پر حجت ہوتا ہے۔ وہ گمراہی پر متفق نہیں ہوسکتے، لیکن جب وہ باہم کسی بات پر مختلف الرائے ہوں تو انھیں اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرنا

چاہیے، کیوں کہ ان میں سے کوئی ایک بھی مطلق طور پر معصوم نہیں ہوتا، بلکہ اللہ کے رسول ﷺ کے علاوہ ہر ایک کی یہ حیثیت ہے کہ اس کی بات قبول بھی کی جاتی ہے اور اس کی بات رد بھی کی جاتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

''علما انبیا کے وارث ہیں۔ انبیاے کرام کسی کو درہم و دینار کا وارث نہیں بناتے، بلکہ وہ علم کا وارث بناتے ہیں۔ جس نے اسے حاصل کرلیا اس نے بیش قیمت دولت حاصل کر لی۔''[1]

لیکن اگر اللہ اور اس کی مخلوق کے درمیان اس طرح کے واسطے فرض کیے جائیں جیسے بادشاہ اور رعایا کے درمیان دربان واسطے ہوتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھا جائے کہ یہی واسطے اللہ تک اس کے بندوں کی حاجات پہنچاتے ہیں، اللہ اپنے بندوں کو انھیں کے ذریعے سے ہدایت بھی دیتا ہے اور روزی بھی فراہم کرتا ہے، مخلوق ان سے سوال کرتی ہے اور وہ اللہ سے سوال کرتے ہیں جیسے کہ بادشاہوں کے یہاں دربان ہوتے ہیں، بادشاہوں سے قربت رکھنے کی وجہ سے یہ دربان لوگوں کی حاجات ان تک پہنچاتے ہیں اور لوگ دربانوں کے سامنے اپنے سوالات رکھتے ہیں۔ ایسا کرنے کی ایک وجہ یہ ہوتی ہے کہ بادشاہ کا ادب و احترام اس درجہ غالب ہوتا ہے کہ لوگ براہِ راست اس سے سوال نہیں کرتے۔ دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ براہِ راست بادشاہ سے طلب کرنے کے بجائے اگر دربانوں کے واسطے سے طلب کیا جائے تو زیادہ فائدہ ہوتا ہے، کیوں کہ ضرورت مندوں کے مقابلے میں یہ دربان بادشاہ سے زیادہ قریب ہوتے ہیں، جو شخص انبیا، فرشتوں، اہلِ علم اور مشائخِ دین کو اللہ اور اس کی مخلوق کے درمیان اس قسم کے واسطے سمجھے، وہ کافر اور مشرک ہے، اس سے توبہ کرانا واجب ہے، اگر توبہ کرلے تو ٹھیک ہے ورنہ اسے قتل کر دیا جائے۔

یہ لوگ اللہ کی تشبیہ دیتے ہیں۔ مخلوق کو اللہ کے مشابہ قرار دیتے اور اللہ کا ہم سر ٹھہراتے ہیں۔ قرآن میں ایسے لوگوں کی اس قدر تردید کی گئی ہے کہ اس مختصر فتوے میں ایسی تمام آیات کو ذکر کرنے کی گنجایش نہیں ہے۔

بادشاہوں اور رعایا کے درمیان واسطے تین اسباب سے ہوتے ہیں: ایک سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ بادشاہوں کو رعایا کے ان حالات سے باخبر کرتے ہیں جو بادشاہ کے علم میں نہیں ہوتے۔

اگر کوئی یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اللہ کو اپنے بندوں کے حالات سے اس وقت تک آگاہی نہیں ہوتی جب تک فرشتے، انبیاء یا بعض دوسرے لوگ اسے اطلاع نہ دیں تو وہ کافر ہے، کیوں کہ اللہ سبحانہ ہر مخفی اور پوشیدہ چیز سے باخبر ہے۔ زمین و آسمان کی کوئی بات اس سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ ﴿ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴾ [الشوریٰ: ۱۱] ''وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔'' وہ اپنے بندوں کی نوع بہ نوع حاجات پر مشتمل ان کی مختلف آوازوں کی فریادیں سنتا ہے۔ ایک کی

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٤١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٨٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٢٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٢٩٧)

بات سنتے ہوئے دوسرے کی بات سننے میں اسے کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ مسائل کا تنوع اسے حیران نہیں کرتا اور نہ فریادیوں کی فریادوں سے وہ زچ ہوتا ہے۔

بادشاہ اور رعایا کے درمیان واسطے کا دوسرا سبب یہ ہوتا ہے کہ بادشاہ اپنے خاص معاونین کے بغیر اپنی رعایا کی خبرگیری کرنے اور اپنے دشمنوں کا دفاع کرنے کی سکت نہیں رکھتا ہے۔ جب کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا کوئی مددگار نہیں ہے، نہ وہ عاجز و ناتواں ہے کہ اسے مددگار کی ضرورت ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ﴾ [سبا: ٢٢]

’’کہہ دے پکارو ان کو جنھیں تم نے اللہ کے سوا گمان کر رکھا ہے، وہ نہ آسمانوں میں ذرہ برابر کے مالک ہیں اور نہ زمین میں اور نہ ان کا ان دونوں میں کوئی حصہ ہے اور نہ ان میں سے کوئی اس کا مددگار ہے۔‘‘

ایک دوسری جگہ فرماتا ہے:

﴿ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ﴾ [بني إسرائيل: ١١١]

’’اور کہہ دے سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے نہ کوئی اولاد بنائی ہے اور نہ بادشاہی میں اس کا کوئی شریک ہے اور نہ عاجز ہو جانے کی وجہ سے کوئی اس کا مددگار ہے اور اس کی بڑائی بیان کر، خوب بڑائی بیان کرنا۔‘‘

کائنات میں موجود تمام اسباب کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ وہی ان کا رب اور مالک ہے۔ وہ اپنے سوا ہر کسی سے بے نیاز ہے اور اس کے سوا ہر کوئی اس کا محتاج ہے۔ اس کے برعکس بادشاہ اپنے مددگاروں کے محتاج ہیں، بلکہ حقیقت میں وہ اس کی بادشاہت میں شریک ہیں، جب کہ اللہ تعالیٰ کی بادشاہت میں کوئی اس کا شریک نہیں، بلکہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کی بادشاہت ہے اور اسی کے لیے حمد و شکر ہے اور وہی ہر چیز پر قادر ہے۔

بادشاہ اور رعایا کے درمیان واسطے کا تیسرا سبب یہ ہوتا ہے کہ کسی خارجی محرک کے بغیر بادشاہ اپنی رعایا کو فائدہ پہنچانے، اس پر ترس کھانے اور اس کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ جب اسے اس کا کوئی خیر خواہ اور اس کی تعظیم بجا لانے والا، جس سے بادشاہ کو امیدیں ہوتی ہیں اور جس سے وہ ڈرتا بھی ہے، مخاطب کرتا ہے تو رعایا کی حاجات پوری کرنے کے لیے بادشاہ کے ارادے اور اس کی ہمت حرکت میں آتی ہے۔ کبھی اس لیے کہ خیر خواہ اور

مشیر کار کی نصیحت آمیز بات اس کے دل کو چھو جاتی ہے اور کبھی اس کی گفتگو سے بادشاہ کو ترغیب ہوتی ہے یا اس کی بات اسے خوف زدہ کر دیتی ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہر چیز کا رب اور اس کا مالک ہے۔ وہ اپنے بندوں پر اس سے کہیں زیادہ شفقت فرماتا ہے جتنی شفقت ایک ماں کو اپنے بچے سے ہوتی ہے۔ ہر چیز اس کی مشیت کے تابع ہے۔ وہ جو چاہتا ہے، وہی ہوتا ہے اور وہ جو نہیں چاہتا، نہیں ہوتا۔ جب وہ بندوں کو باہم ایک دوسرے سے فائدہ پہنچانا چاہتا ہے تو اپنا حکم جاری کر دیتا ہے اور پھر کوئی کسی کے ساتھ حسنِ سلوک کرتا اور کوئی کسی کے ساتھ۔ کوئی کسی کے لیے دعا کرتا ہے اور کوئی کسی کی سفارش کرتا ہے۔ اسی نے ہر چیز پیدا کی ہے۔ اسی نے اس محسن، دعا کرنے والے اور سفارش کرنے والے کے دل میں حسنِ سلوک کا داعیہ پیدا کیا ہے۔ مخلوق میں کوئی نہیں جو اسے اس کے ارادے کے خلاف کام کرنے پر مجبور کر دے اور اسے ایسی کوئی بات بتائے جو اس کے علم میں نہ ہو۔ رب جس سے کوئی امید وابستہ کرے یا اس سے خوف زدہ ہو۔

اسی لیے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے: کوئی اپنی دعا میں ہرگز یہ نہ کہے کہ ''اے اللہ! اگر تو چاہے تو میری مغفرت فرما دے، اے اللہ! اگر تو چاہے تو مجھ پر رحم کر دے، بلکہ پختگی سے سوال کرو، اس لیے کہ اللہ کو کوئی مجبور کرنے والا نہیں۔''[1]

جو لوگ اللہ تعالیٰ کے حضور شفاعت کرنے کے مجاز ہوں گے، وہ اس کی اجازت کے بغیر شفاعت نہیں کر سکیں گے، جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ﴾ [البقرة: ٢٥٥]

''کون ہے وہ جو اس کے پاس اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرے۔''

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَلَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی ﴾ [الأنبياء: ٢٨]

''اور وہ سفارش نہیں کرتے مگر اسی کے لیے جسے وہ پسند کرے۔''

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿ قُلِ ادْعُوا الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا یَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِیْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِیْرٍ ﴿22﴾ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ﴾ [سبا: ٢٢، ٢٣]

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٩٨٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٦٧٩)

’’کہہ دے پکارو ان کو جنھیں تم نے اللہ کے سوا گمان کر رکھا ہے، وہ نہ آسمانوں میں ذرہ برابر کے مالک ہیں اور نہ زمین میں اور نہ ان کا ان دونوں میں کوئی حصہ ہے اور نہ ان میں سے کوئی اس کا مددگار ہے۔ اور نہ سفارش اس کے ہاں نفع دیتی ہے مگر جس کے لیے وہ اجازت دے۔‘‘

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں یہ واضح فرما دیا کہ وہ اللہ کو چھوڑ کر جن کو پکارتا ہے، انھیں نہ بادشاہت حاصل ہے، نہ وہ بادشاہت میں شریک ہیں اور نہ وہ مددگار ہیں، بلکہ ان کی شفاعت صرف اسی کو فائدہ دے گی جس کے حق میں اللہ کی اجازت ہوگی۔

بادشاہوں کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ان کے پاس سفارش کرنے والا کبھی کوئی بادشاہ ہوتا ہے، کبھی وہ بادشاہت میں شریک ہوتا ہے اور کبھی وہ حکومت میں بادشاہ کا معاون اور مددگار ہوتا ہے۔ وہ بادشاہوں سے اجازت لیے بغیر ان کی اور دوسروں کی سفارش کرتے ہیں اور بادشاہ ان کی سفارش قبول کرتا ہے۔ کیوں کہ کبھی بادشاہ کو سفارش کرنے والوں کی ضرورت ہوتی ہے، کبھی وہ ان سے ڈرتا ہے، کبھی ان کے احسانوں کا بدلہ چکانا مقصود ہوتا ہے اور کبھی ان پر انعام کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے، حتی کہ وہ اپنے بیٹے اور بیوی کی سفارش بھی قبول کرتا ہے، کیوں کہ اسے بیٹے اور بیوی کی ضرورت ہے۔ اگر اس کا بیٹا اور بیوی منہ موڑ لیں تو اسے نقصان ہوسکتا ہے، بلکہ وہ اپنے خدام کی سفارش بھی قبول کرتا ہے، نہ قبول کرنے کی صورت میں اسے یہ اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں وہ اس کی نافرمانی نہ کرنے لگ جائے یا اسے نقصان پہنچانے کے جتن نہ کرنے لگے۔ بندوں کی باہم ایک دوسرے کے لیے سفارش اسی نوعیت کی ہوتی ہے۔ کوئی کسی کی سفارش کسی چاہت میں کرتا ہے یا کسی ڈر کی وجہ سے کرتا ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان تمام چیزوں سے بے نیاز ہے۔اسے نہ کسی سے کوئی امید ہوتی ہے اور نہ کسی کا اسے خوف ہوتا ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں ہے، بلکہ اس کی ذات غنی ہے، جیسا کہ قرآن میں ہے:

﴿ اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ ۭ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَاۗءَ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ؀ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ؀ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ۭ هُوَ الْغَنِيُّ ۭ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ ﴾ [يونس: ٦٦۔ ٦٨]

’’سن لو! بے شک اللہ ہی کے لیے ہے جو کوئی آسمانوں میں ہے اور جو کوئی زمین میں ہے اور جو لوگ اللہ کے غیر کو پکارتے ہیں وہ کسی بھی قسم کے شریکوں کی پیروی نہیں کر رہے۔ وہ پیروی نہیں کرتے مگر گمان کی اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اٹکلیں دوڑاتے ہیں۔ وہی ہے جس نے تمھارے لیے رات بنائی، تا کہ تم

اس میں آرام کرو اور دن کو روشن۔ بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں جو سنتے ہیں۔ انھوں نے کہا اللہ نے کوئی اولاد بنا رکھی ہے۔ وہ پاک ہے، وہی بے پروا ہے، اسی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔''

مشرکین شفاعت کے سلسلے میں جو عقیدہ رکھتے ہیں، اسی کے تحت وہ کچھ لوگوں کو اپنا سفارشی سمجھتے ہیں، جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هَٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللَّهِ ۚ قُلْ أَتُنَبِّئُونَ اللَّهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ ۚ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴾ [يونس: ١٨]

''اور وہ اللہ کے سوا ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ انھیں نقصان پہنچاتی ہیں اور نہ انھیں نفع دیتی ہیں اور کہتے ہیں یہ لوگ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ کہہ دے کیا تم اللہ کو اس چیز کی خبر دیتے ہو جسے وہ نہ آسمانوں میں جانتا ہے اور نہ زمین میں؟ وہ پاک ہے اور بہت بلند ہے اس سے جو وہ شریک بناتے ہیں۔''

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ قُرْبَانًا آلِهَةً ۖ بَلْ ضَلُّوا عَنْهُمْ ۚ وَذَٰلِكَ إِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴾ [الأحقاف: ٢٨]

''پھر ان لوگوں نے ان کی مدد کیوں نہ کی جنھیں انھوں نے قرب حاصل کرنے کے لیے اللہ کے سوا معبود بنایا؟ بلکہ وہ ان سے گم ہو گئے اور یہ ان کا جھوٹ تھا اور جو وہ بہتان باندھتے تھے۔''

اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ کہتے ہیں:

﴿ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ ﴾ [زمر: ٣]

''ہم ان کی عبادت نہیں کرتے مگر اس لیے کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں۔''

﴿ وَلَا يَأْمُرَكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلَائِكَةَ وَالنَّبِيِّينَ أَرْبَابًا ۗ أَيَأْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴾ [آل عمران: ٨٠]

''اور نہ یہ (حق ہے) کہ تمھیں حکم دے کہ فرشتوں اور نبیوں کو رب بنا لو، کیا وہ تمھیں کفر کا حکم دے گا، اس کے بعد کہ تم مسلم ہو۔''

﴿ قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُمْ مِنْ دُونِهِ فَلَا يَمْلِكُونَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيلًا ﴿٥٦﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ إِلَىٰ رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُ ۚ إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُورًا ﴾ [بني إسرائيل: ٥٦، ٥٧]

''کہہ پکارو ان کو جنھیں تم نے اس کے سوا گمان کر رکھا ہے، پس وہ نہ تو تم سے تکلیف دور کرنے کے مالک ہیں اور نہ بدلنے کے۔ وہ لوگ جنھیں یہ پکارتے ہیں، وہ (خود) اپنے رب کی طرف وسیلہ ڈھونڈتے ہیں، جو ان میں سے زیادہ قریب ہیں اور اس کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ بے شک تیرے رب کا عذاب وہ ہے جس سے ہمیشہ ڈرا جاتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں بتا دیا ہے کہ اللہ کو چھوڑ کر جن کو بھی پکارا جاتا ہے، وہ نہ کسی تکلیف کو دور کرنے کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ کسی انسان کی بگڑی ہوئی حالت کو سدھارنے کی ان کے اندر قوت ہے، بلکہ وہ خود رحمتِ الٰہی کی آس لگائے بیٹھے ہیں، اس کے عذاب سے خوف زدہ ہیں اور اس کی قربت کی تلاش میں ہیں۔ اس طرح اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرشتوں اور نبیوں سے سوائے شفاعت کے ہر چیز کی نفی کر دی ہے۔ شفاعت صرف ایک دعا ہے۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ مخلوق کی دعا آپس میں ایک دوسرے کے لیے مفید ہوتی ہے۔ اللہ نے تو اس کا حکم دیا ہے، لیکن دعا کرنے والا سفارش کنندہ اس وقت تک کسی کے لیے دعا اور سفارش کرنے کا مجاز نہیں ہے جب تک اللہ اسے اس کے لیے اجازت نہ دے۔ وہ ایسی سفارش نہیں کر سکتا جس کی ممانعت ہے، جیسے مشرکین کے لیے سفارش کرنا اور ان کی مغفرت کے لیے دعا کرنا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ﴾ [التوبة: ١١٣، ١١٤]

''اس نبی اور ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے، کبھی جائز نہیں کہ وہ مشرکوں کے لیے بخشش کی دعا کریں، خواہ وہ قرابت دار ہوں، اس کے بعد کہ ان کے لیے صاف ظاہر ہو گیا کہ یقیناً وہ جہنمی ہیں۔ اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے بخشش مانگنا نہیں تھا مگر اس وعدہ کی وجہ سے جو اس نے اس سے کیا تھا، پھر جب اس کے لیے واضح ہو گیا کہ بے شک وہ اللہ کا دشمن ہے تو وہ اس سے بے تعلق ہو گیا۔''

اللہ تعالیٰ نے منافقین کے تعلق سے فرمایا:

﴿سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۭ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ﴾ [المنافقون: ٦]

''ان پر برابر ہے کہ تو ان کے لیے بخشش کی دعا کرے، یا ان کے لیے بخشش کی دعا نہ کرے، اللہ انھیں ہرگز معاف نہیں کرے گا۔''

صحیح (بخاری) میں ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مشرکین اور منافقین کے لیے دعاے مغفرت کرنے

سے منع فرما دیا اور آپ کو یہ اطلاع دے دی کہ وہ ان کی مغفرت فرمانے والا نہیں ہے،[1] جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾ [النساء: ١١٦]

''بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک بنایا جائے اور بخش دے گا جو اس کے علاوہ ہے، جسے چاہے گا۔''

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴾ [التوبة: ٨٤]

''اور ان میں سے جو کوئی مر جائے اس کا کبھی جنازہ نہ پڑھنا اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہونا، بے شک انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا اور اس حال میں مرے کہ وہ نافرمان تھے۔''

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴾ [الأعراف: ٥٥]

''اپنے رب کو گڑگڑا کر اور خفیہ طور پر پکارو، بے شک وہ حد سے بڑھنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔''

آخری آیت میں دعا میں حد سے بڑھنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ دعا میں حد سے بڑھنے کی کئی ایک صورتیں ہیں: جیسے اللہ سے ایسی دعا مانگے جو اللہ کبھی پوری کرنے والا نہیں، مثلاً: اللہ سے یہ دعا مانگے کہ وہ اسے انبیا کا مقام و مرتبہ عطا فرما دے، حالاں کہ وہ نبی نہیں ہے، یا مشرکین کی مغفرت کے لیے دعا مانگے، وغیرہ۔ یا اللہ سے ایسی دعا کرے جس میں اللہ کی معصیت ہو، جیسے یہ کہے کہ اللہ کفر، فسق اور نافرمانی کے کاموں میں میری مدد فرما۔

شفاعت کرنے والا، جسے اللہ شفاعت کرنے کی اجازت مرحمت فرمائے گا، اس کی شفاعت جس دعا پر مشتمل ہو گی اس میں ضروری ہے کہ حد سے تجاوز نہ ہو۔ اگر کسی شفاعت کرنے والے نے غیر مناسب دعا کر لی تو اس کی تصویب نہیں کی جاتی، کیونکہ انھیں اس طرح کی دعاؤں پر برقرار نہیں رکھا جاتا، جیسا کہ نوح علیہ السلام نے کہا تھا:

﴿ وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ ﴾ [هود: ٤٥]

''اور نوح نے اپنے رب کو پکارا، پس کہا اے میرے رب! بے شک میرا بیٹا میرے گھر والوں سے ہے اور بے شک تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٩٥)

اللہ نے اس کے جواب میں فرمایا:

﴿ قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صٰلِحٍ ۖ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنِّىْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝ قَالَ رَبِّ اِنِّىْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَاِلَّا تَغْفِرْ لِيْ وَتَرْحَمْنِيْٓ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾ [هود: ٤٦-٤٧]

''فرمایا اے نوح! بے شک وہ تیرے گھر والوں سے نہیں، بے شک یہ ایسا کام ہے جو اچھا نہیں، پس مجھ سے اس بات کا سوال نہ کر جس کا تجھے کچھ علم نہیں۔ بے شک میں تجھے اس سے نصیحت کرتا ہوں کہ تو جاہلوں میں سے ہو جائے۔ اس نے کہا اے میرے رب! بے شک میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ تجھ سے اس بات کا سوال کروں جس کا مجھے کچھ علم نہیں اور اگر تو نے مجھے نہ بخشا اور مجھ پر رحم نہ کیا تو میں خسارہ پانے والوں سے ہو جاؤں گا۔''

جو بھی دعا اور شفاعت کرنے والا اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے دعا اور شفاعت کرتا ہے اس کی دعا اور شفاعت اللہ کے فیصلے، اس کی قدرت اور مشیت کے تحت ہوتی ہے۔ اللہ ہی ہے جو دعا کو سنتا اور شفاعت کو شرفِ قبولیت بخشتا ہے۔ اس لحاظ سے وہی ہے جس نے سبب اور مسبب دونوں کو پیدا کیا ہے۔ دعا ان اسباب میں سے ایک ہے جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مقدر کر رکھا ہے۔

جب صورتِ حال یہ ہے تو مکمل طور پر اسباب کی طرف توجہ دینا توحید میں شرک ہے۔ اسباب کی بالکلیہ نفی عقلی فتور ہے۔ اسباب سے اِعراض کرنا شریعت میں عیب جوئی ہے۔ بندے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا توکل، اس کی دعا، اس کا سوال اور اس کی رغبت سب کچھ اللہ کی طرف ہو۔ اللہ ہی ہے جو اس کے لیے مخلوق وغیرہ کی دعا کے اسباب فراہم کرتا ہے۔

دعا ہر کسی کے لیے جائز ہے، چاہے بڑا چھوٹے کے لیے دعا کرے یا چھوٹا بڑے کے لیے دعا کرے۔ انبیائے کرام علیہم السلام سے شفاعت اور دعا کی درخواست ٹھیک اسی طرح ہے جس طرح مسلمان نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے استسقا میں شفاعت طلب کرتے اور آپ سے دعا کی درخواست کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ نے آپ کے چچا عباس رضی اللہ عنہ سے استسقا کے لیے دعا کرنے کی درخواست کی تھی۔ قیامت کے دن سارے لوگ انبیائے کرام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے شفاعت کی درخواست کریں گے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو سید الشفعاء (شفاعت کرنے والوں کے سردار) ہیں، بلکہ آپ کو خاص قسم کی شفاعتوں کا حق حاصل ہو گا۔ اس کے باوجود صحیحین میں ثابت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم موذن کو اذان دیتے سنو، جو کلمات وہ کہہ رہا ہے تم بھی اسے دہراؤ۔ اس کے بعد مجھ پر

درود پڑھو، کیوں کہ جو کوئی مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجے گا اللہ اس پر دس بار رحمتیں بھیجے گا۔ پھر میرے لیے وسیلہ طلب کرو۔ وسیلہ جنت کا ایک مقام ہے جو اللہ کے کسی ایک بندے کو ملے گا اور مجھے امید ہے کہ وہ بندہ میں ہوں۔ جس کسی نے میرے لیے وسیلہ طلب کیا تو قیامت کے دن میں اس کے لیے شفاعت کروں گا۔''[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب عمرے کے ارادے سے نکلنے لگے اور نبی اکرم ﷺ نے انھیں رخصت کیا تو فرمایا:

''میرے بھائی! اپنی دعاؤں میں مجھے فراموش نہ کرنا۔''[2]

نبی اکرم ﷺ نے اپنی امت سے کہا کہ وہ آپ کے لیے دعا کرتی رہے، لیکن آپ کی یہ بات ان سے سوال کرنے کی نوعیت کی نہیں ہے، بلکہ یہ بھی اطاعتِ الٰہی کے ان کاموں میں سے ایک ہے جن کا آپ نے حکم دیا ہے اور جن کے سرانجام دینے سے ثواب ملتا ہے۔ ہاں مگر آپ ﷺ کو بھی اتنا ہی اجر ملے گا جتنا انھیں ان کاموں کے انجام دینے سے ملتا ہے، جیسا کہ نبی اکرم ﷺ سے ایک صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ ''جس نے راہِ ہدایت کی دعوت دی، اسے بھی اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا ثواب راہِ ہدایت پر چلنے والوں کو ملے گا، لیکن ان میں سے کسی کے ثواب میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ اسی طرح جس نے گمراہی کی طرف لوگوں کو بلایا اس پر بھی اتنا ہی گناہ ہو گا جتنا گمراہی کی راہ پر چلنے والوں کو ملے گا، لیکن ان میں سے کسی کے گناہ میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔''[3] آپ امت کو ہر ہدایت کی طرف بلانے والے ہیں، لہٰذا آپ کو بھی انھی کی طرح ثواب ملے گا جتنا ثواب انھیں آپ کی اتباع کرنے پر ملے گا۔

اسی طرح جب لوگ آپ پر ایک مرتبہ درود بھیجیں گے تو اللہ تعالیٰ ان پر دس بار رحمتیں نازل کرے گا۔ آپ کے حق میں ان کی دعا کو قبول کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ آپ کو ان کے ثواب کے برابر ثواب سے بھی نوازے گا۔ یہ دعا جس کا ثواب اللہ نے انھیں عطا فرمایا، اس کی حیثیت ایک نعمت کی ہے جو اللہ نے انھیں عطا فرمائی ہے۔ صحیح (مسلم) میں ثابت ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص اپنے کسی بھائی کے لیے اس کی غیر موجودگی میں دعا کرتا ہے اللہ اس کی وجہ سے اس کے پاس ایک فرشتہ مقرر کر دیتا ہے اور جب جب وہ اپنے بھائی کے لیے دعا کرتا ہے تو مقرر فرشتہ اس پر آمین کہتا ہے اور کہتا ہے کہ تجھے بھی وہ سب کچھ ملے جو تو اپنے بھائی کے لیے طلب کر رہا ہے۔''[4]

ایک دوسری حدیث میں ہے: ''سب سے جلد قبول ہونے والی دعا وہ ہے جو ایک بھائی اپنے بھائی کے لیے

---

[1] بخاری میں ان الفاظ سے مروی روایت نہیں ملی، البتہ یہ روایت صحیح مسلم (٣٨٤) میں عبداللہ بن عمرو کے واسطے سے مروی ہے۔

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٩٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٦٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٨٩٤) ضعيف الجامع، رقم الحديث (٦٢٧٨)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٧٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٠٩)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٣٢، ٢٧٣٣)

اس کی غیر موجودگی میں کرتا ہے۔''[1]

دوسرے کے لیے دعا کرنے سے دعا کرنے والے کو بھی فائدہ ہوتا ہے اور اسے بھی فائدہ ہوتا ہے جس کے لیے دعا کی جاتی ہے، اگرچہ دعا کرنے والا اس سے چھوٹا ہو جس کے لیے دعا کر رہا ہے۔ اسی طرح جب ایک مومن اپنے بھائی کے لیے دعا کرتا ہے تو دونوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اس پہلو سے دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ جس کسی نے دوسرے سے کہا کہ میرے لیے دعا کرو اور ارادہ یہ ہے کہ دونوں کو اس کا فائدہ پہنچے تو وہ اور اس کا بھائی دونوں نیکی اور بھلائی کے کام میں ایک دوسرے کا تعاون کر رہے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ ایک نفع بخش کام کا اشارہ ہے اس شخص کے لیے جس سے سوال کیا جا رہا ہے۔ اس کی حیثیت بالکل ایسی ہے کہ جیسے ایک شخص دوسرے کو نیکی اور تقویٰ کے کام کا حکم دے رہا ہے۔ اگر دوسرا شخص وہ کام کرتا ہے تو اسے ثواب ملے گا اور اسی جیسا ثواب حکم دینے والے کو بھی ملے گا، کیوں کہ اسی نے اس نیکی اور تقویٰ کی طرف اسے دعوت دی ہے۔ خاص طور پر ایسی دعائیں جن کا بندے کو حکم دیا گیا ہے، جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ﴾ [محمد: ١٩]

''اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کے لیے بھی معافی مانگ۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو استغفار کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کے بعد فرمایا:

﴿ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴾ [النساء: ٦٤]

''اور اگر واقعی یہ لوگ، جب انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا، تیرے پاس آتے، پھر اللہ سے بخشش مانگتے اور رسول ان کے لیے بخشش مانگتا تو اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا، نہایت مہربان پاتے۔''

اس آیت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے لوگوں کے استغفار کا ذکر کیا ہے اور ان کے لیے رسول اکرم ﷺ کی دعائے مغفرت کا تذکرہ فرمایا ہے۔ یہ ان باتوں میں سے ایک ہے جن کا رسول کو حکم دیا گیا تھا، یعنی کہ آپ مومن مردوں اور مومن عورتوں کے لیے دعائے مغفرت کریں۔ اللہ نے کسی مخلوق کو حکم نہیں دیا ہے کہ وہ کسی دوسری مخلوق سے ایسی چیز کا سوال کرے جس کا اسے اللہ نے حکم نہیں دیا۔ اللہ نے بندے کو جو حکم بھی دیا ہے چاہے وہ وجوب پر مبنی ہو یا استحباب پر، اس کا بجا لانا اللہ کی عبادت، اطاعت اور اس کے تقرب کا ذریعہ ہے۔ اس حکم کو بجا لانے میں اس کی بہتری اور بھلائی ہے اور اس سے اسے نیکیاں ملیں گی۔ اس کی توفیق اسے مل جائے تو یہ اللہ کا اس پر احسانِ عظیم اور

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٣٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٩٨٠) ضعيف الجامع (٩٤١)

اس کا انعام ہے، بلکہ اللہ کا سب سے بڑا انعام بندوں پر یہ ہے کہ اس نے انھیں ایمان کی ہدایت دی ہے۔

ایمان قول اور عمل دونوں سے عبارت ہے۔ اطاعت بجا لانے اور کارِ خیر سرانجام دینے سے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اور جیسے جیسے بندے کے اعمالِ خیر میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، اس کا ایمان بڑھتا جاتا ہے۔ یہی وہ انعامِ حقیقی ہے جس کا ذکر قرآن کی اس آیت میں ہوا ہے:

﴿ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ﴾ [الفاتحة: ٧]

''ان لوگوں کے راستے پر جن پر تو نے انعام کیا۔''

اور اس آیت میں بھی اسی انعام کا ذکر ہے:

﴿ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ﴾ [النساء: ٦٩]

''اور جو اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرے تو یہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا۔''

بلکہ دین کے بغیر دنیا کی نعمتیں، کیا یہ اللہ کی نعمتیں ہیں یا نہیں، اس مسئلے میں ہمارے اصحاب اور دیگر علما کے دو مشہور قول ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ وہ ایک پہلو سے نعمت ہیں، اگرچہ دوسرے پہلو سے مکمل نعمت نہیں ہیں۔ رہی دین کی نعمت جسے طلب کیا جانا چاہیے تو وہ درحقیقت اللہ کے حکم پر مشتمل ہے خواہ وہ حکم ایجابی ہو یا استحبابی۔ اہلِ اسلام کے متفقہ فیصلے کے مطابق یہی وہ خیر ہے جس کی طلب مناسب ہے۔ اہلِ سنت کی نظر میں یہی حقیقی نعمت ہے، کیوں کہ ان کے نظریے کے مطابق اللہ تعالیٰ ہی کارِ خیر انجام دینے کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے۔ قدریہ (منکرینِ تقدیر) کے نزدیک اللہ تعالیٰ کا بندے پر انعام صرف اس چیز سے عبارت ہے کہ اس نے اس کو کرنے یا نہ کرنے پر قدرت سے بہرہ مند کیا ہے اور اس کی یہ قدرت خیر و شر دونوں کی صلاحیت رکھتی ہے۔

غرضیکہ اللہ نے کسی مخلوق کو حکم نہیں دیا ہے کہ وہ کسی دوسری مخلوق سے ایسی چیز کا سوال کرے جس میں خود مخلوق کی کوئی مصلحت نہ ہو، خواہ وہ حکم ایجاباً ہو یا استحباباً۔ بندے سے اللہ کا اس کے سوا کوئی مطالبہ نہیں ہے، پھر بھلا وہ کیوں کر دوسرے کو اس کے سوا کسی اور چیز کے سوال کرنے کا حکم دے سکتا ہے؟ بلکہ اس نے بندے کے لیے حرام کر دیا ہے کہ وہ اپنے ہی جیسے بندے سے بغیر کسی ضرورت کے اس کے مال کا سوال کرے۔

اگر سوال سے بندے کا ارادہ اس کی مصلحت ہے جس سے سوال کی درخواست کی گئی ہے یا اپنی اور اس کی دونوں کی مصلحت پیشِ نظر ہے تو اس پر وہ مستحقِ ثواب ہوگا، لیکن اگر اس کا مقصد صرف اپنے مطلوب کا حصول ہے اور وہ مامور کی بھلائی کا ارادہ نہیں رکھتا تو اس قسم کے سوال کرنے کا اللہ نے حکم نہیں دیا ہے، بلکہ اس سے اس نے منع فرمایا

ہے، کیوں کہ یہ محض ایک سوال ہے جس میں نہ مخلوق کی مصلحت پیشِ نگاہ ہے اور نہ اس کا کوئی فائدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم اس کی عبادت کریں اور اس کی طرف راغب ہوں اور یہ بھی اس نے حکم دیا ہے کہ ہم اس کے بندوں کے ساتھ حسنِ سلوک کریں۔ جبکہ اس طرح کے سوال میں نہ اللہ کی عبادت ہے اور نہ مخلوق کے ساتھ حسنِ سلوک۔ نہ اس سے اللہ کی طرف رغبت پائی جاتی ہے اور نہ اس سے دعا مقصود ہے جس کی کامل شکل نماز ہے اور نہ بندوں کے ساتھ حسنِ سلوک مقصود ہے جس کی کامل شکل زکات ہے۔ اگر چہ بندہ اس نوعیت کا سوال کرنے سے گناہ گار نہیں ہوتا، لیکن اسے اس بات میں فرق کرنا چاہیے کہ کس بات کا بندے کو حکم دیا گیا ہے اور کس چیز کی اسے اجازت دی گئی ہے۔ دیکھتے نہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں جس میں امت کے ستر ہزار لوگوں کے بغیر حساب و کتاب جنت میں جانے کا ذکر ہے، فرمایا ہے کہ وہ جھاڑ پھونک کا کسی سے مطالبہ نہیں کرتے تھے،[1] حالانکہ جھاڑ پھونک کروانا فی نفسہٖ جائز ہے۔ یہ بات میں نے اس کے علاوہ دوسری جگہ پر شرح و بسط سے بیان کی ہے۔

مختصر یہ کہ جو آدمی بادشاہوں اور رعیت کے درمیان واسطوں کی طرح اللہ اور اس کی مخلوق کے درمیان واسطے قرار دیتا ہے وہ مشرک ہے، بلکہ یہی تو بتوں کے پجاری مشرکین کا مذہب تھا، جیسا کہ وہ بتوں کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ یہ نبیوں اور صالحین کے اسٹیچو (مجسمے) ہیں اور یہ وہ ذریعے ہیں جن سے وہ اللہ کا تقرب حاصل کرتے ہیں۔ اور یہی وہ شرک ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے نصاریٰ کی نکیر فرمائی ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾ [التوبة: ٣١]

’’انھوں نے اپنے عالموں اور اپنے درویشوں کو اللہ کے سوا رب بنا لیا اور مسیح ابن مریم کو بھی، حالانکہ انھیں اس کے سوا حکم نہیں دیا گیا تھا کہ ایک معبود کی عبادت کریں، کوئی معبود نہیں مگر وہی، وہ اس سے پاک ہے جو وہ شریک بناتے ہیں۔‘‘

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴾ [البقرة: ١٨٦]

’’اور جب میرے بندے تجھ سے میرے بارے میں سوال کریں تو بے شک میں قریب ہوں، میں پکارنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے، تو لازم ہے کہ وہ میری بات مانیں اور مجھ پر

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٣٧٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٨)

ایمان لائیں، تاکہ وہ ہدایت پائیں۔‘‘

مطلب یہ ہے کہ جب میں کوئی حکم دوں یا کسی چیز سے منع کروں تو میرے یہ احکام بجا لائیں اور اس بات پر ایمان رکھیں کہ جب وہ میرے سامنے دستِ سوال دراز کرتے ہیں یا میرے سامنے گریہ وزاری کرتے ہیں تو میں ان کی دعائیں سنتا اور ان کو شرفِ قبولیت بخشتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے:

﴿ فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ﴾ [الم نشرح: ۷،۸]

’’تو جب تو فارغ ہو جائے تو محنت کر۔ اور اپنے رب ہی کی طرف پس رغبت کر۔‘‘

اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا ہے:

﴿ وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِى الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ ﴾ [بني إسرائيل: ٦٧]

اور جب تمھیں سمندر میں تکلیف پہنچتی ہے تو اس کے سوا تم جنھیں پکارتے ہو گم ہو جاتے ہیں۔‘‘

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ﴾ [النمل: ٦٢]

’’یا وہ جو لاچار کی دعا قبول کرتا ہے، جب وہ اسے پکارتا ہے اور تکلیف دور کر دیتا ہے اور تمھیں زمین کے جانشین بناتا ہے؟‘‘

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ يَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِىْ شَاْنٍ ﴾ [الرحمٰن: ٢٩]

’’اسی سے مانگتا ہے جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہے، ہر دن وہ ایک (نئی) شان میں ہے۔‘‘

اللہ نے یہ توحید اپنی کتاب میں بیان کی ہے اور شرک کے ہر شایبے کی تردید فرمائی ہے، حتیٰ کہ یہ بھی تاکید کی ہے کہ غیر اللہ سے کوئی خوف نہ کھائے، اللہ کے سوا کسی سے امید نہ رکھے اور اس کے سوا کسی پر بھروسا نہ کرے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ﴾ [المائدة: ٤٤]

’’تو تم لوگوں سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو اور میری آیات کے بدلے تھوڑی قیمت نہ لو۔‘‘

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾

[آل عمران: ١٧٥]

''یہ تو شیطان ہی ہے جو اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے، تو تم ان سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو، اگر تم مومن ہو۔''

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ﴾ [النساء:۷۷]

''کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکات ادا کرو، پھر جب ان پر لڑنا لکھا گیا اچانک ان میں سے کچھ لوگ، لوگوں سے ڈرنے لگے، جیسے اللہ سے ڈرنا ہو، یا اس سے بھی زیادہ ڈرنا۔''

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ ﴾ [التوبۃ:۱۸]

''اللہ کی مسجدیں تو وہی آباد کرتا ہے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور اس نے نماز قائم کی اور زکات ادا کی اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرا۔''

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴾ [النور:۵۲]

''اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اور اللہ سے ڈرے اور اس سے بچے تو یہی لوگ کامیاب ہیں۔''

اس آیت میں اللہ نے واضح فرما دیا ہے کہ اطاعت اللہ اور اس کے رسول دونوں کی کی جائے، لیکن خوف صرف اللہ کا رکھا جائے۔

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ ﴾ [التوبۃ:۵۹]

''اور کاش کہ واقعی وہ اس پر راضی ہو جاتے جو انھیں اللہ اور اس کے رسول نے دیا اور کہتے ہمیں اللہ کافی ہے، جلد ہی اللہ ہمیں اپنے فضل سے دے گا اور اس کا رسول بھی۔''

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴾ [آل عمران: ۱۷۳]

''وہ لوگ کہ لوگوں نے ان سے کہا کہ بے شک لوگوں نے تمھارے لیے (فوج) جمع کر لی ہے، سو ان سے ڈرو، تو اس (بات) نے انھیں ایمان میں زیادہ کر دیا اور انھوں نے کہا ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے۔''

نبی اکرم ﷺ اپنی امت کو اسی حقیقی توحید کی تعلیم دیتے رہے اور ان کی زندگی سے شرک کے ہر شائبے کو دور کرتے رہے، کیوں کہ لا إله إلا الله کا یہی تقاضا تھا، کیوں کہ إله صرف وہ ہے جو اپنے کمال محبت و تعظیم، اِجلال و اِکرام اور امید وخوف سے دلوں کو گرویدہ بنا لے۔ آپ ﷺ نے ان سے فرمایا:

''جو اللہ چاہے اور جو محمد چاہیں، یہ جملہ نہ کہو، بلکہ یہ کہو کہ جو اللہ چاہے اور اس کے بعد پھر جو محمد ﷺ چاہیں۔''[1]

ایک آدمی نے کہہ دیا: جو اللہ چاہے اور آپ چاہیں۔ یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تو نے مجھے اللہ کا شریک بنا دیا، بلکہ صرف یہ کہو کہ جو اللہ چاہے۔''[2]

آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: ''جسے قسم کھانی ہو اللہ کی قسم کھائے، ورنہ پھر چپ رہے۔''[3]

آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی اس نے شرک کیا۔''[4]

آپ ﷺ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے فرمایا: ''جب مانگو صرف اللہ سے مانگو اور جب مدد چاہو تو صرف اللہ کی مدد چاہو۔ جو کچھ آپ کے ساتھ ہونے والا ہے، اسے قلم لکھ چکا ہے اور اس کی سیاہی خشک ہو چکی ہے۔ ساری مخلوق تمھیں فائدہ پہنچانے کی کوشش کرے تو وہ ایسا نہیں کر سکتی، صرف وہی فائدہ پہنچے گا جو اللہ نے آپ کی تقدیر میں لکھ دیا ہے۔ اسی طرح ساری مخلوق آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے تو ایسا نہیں کر سکتی، صرف وہی نقصان پہنچے گا جتنا اس نے لکھ دیا ہے۔''[5]

آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: ''مجھ کو اتنا نہ بڑھا دو جتنا کہ نصاریٰ نے عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کو بڑھا دیا تھا۔ بلاشبہ

---

[1] مسند أحمد (۷۲/۵، ۳۹۳) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۲۱۱۸) سنن الدارمي (۲۹۵/۲) صحيح الجامع (۴۳۷۸)

[2] مسند أحمد (۲۱۴/۱، ۲۲۴، ۲۸۳، ۳۴۷) السلسلة الصحيحة (۱۳۹)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (۲۵۳۳) صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۶۴۶)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (۳۲۵۱) سنن الترمذي، رقم الحديث (۱۵۳۵) مسند أحمد (۴۷/۱) السلسلة الصحيحة (۲۰۴۲)

[5] سنن الترمذي، رقم الحديث (۲۵۱۶) مسند أحمد (۲۹۳/۱، ۳۰۳، ۳۰۷) صحيح الجامع (۷۸۳۴)

میں ایک بندہ ہوں، لہٰذا مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہی کہو۔''[1]

آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے اللہ! میری قبر کو بت نہ بننے دینا کہ جس کی پوجا کی جانے لگے۔''[2]

آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم میری قبر کو عید گاہ نہ بنانا، مجھ پر درود بھیجا کرو، کیوں کہ تمھارا درود مجھ تک پہنچتا ہے خواہ تم کہیں بھی رہو۔''[3]

آپ ﷺ نے مرضِ وفات میں فرمایا: ''یہود ونصاری پر اللہ کی لعنت ہو، انھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔'' حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ اپنی امت کو یہود و نصاری کی راہ پر چلنے سے ڈراتے رہتے تھے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو آپ ﷺ کی قبر نمایاں کر کے بنائی جاتی، لیکن آپ ﷺ کو یہ بات سخت ناپسند تھی کہ آپ کی قبر کو سجدہ گاہ بنایا جائے۔[4]

مختصر یہ کہ آپ ﷺ نے اس تعلق سے کافی باتیں ارشاد فرمائی ہیں اور یہ شریعت کا ایک وسیع باب ہے۔

ایک مومن یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ اللہ ہی ہر چیز کا رب ہے اور وہی اس کا مالک بھی ہے۔ لہٰذا وہ ان اسباب کا انکار نہیں کرسکتا جو اللہ نے بنائے ہیں، جیسے اس نے پیڑ پودوں اور سبزوں کے اُگنے کا سبب بارش کو بنایا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ﴾ [البقرة: ١٦٤]

''اور اس پانی میں جو اللہ نے آسمان سے اتارا، پھر اس کے ساتھ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کر دیا اور اس میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیے۔''

اسی طرح اللہ نے سورج اور چاند کو ان چیزوں کے لیے سبب بنا دیا ہے جو وہ ان کے ذریعے سے پیدا کرتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اس نے شفاعت اور دعا کو ان باتوں کے لیے سبب بنایا جو اس کے ذریعے مانگی جاتی ہیں، جیسے مسلمانوں کا میت کے لیے نمازِ جنازہ پڑھنا کہ یہ ان اسباب میں سے ایک ہے جن کے سبب اللہ میت پر رحم فرماتا ہے اور نمازِ جنازہ پڑھنے والوں کو بھی ثواب عطا کرتا ہے، لیکن اسباب کے سلسلے میں تین باتوں کی معرفت ضروری ہے:

① کوئی معین سبب مستقل بالمطلوب نہیں ہوتا جب تک اس کے ساتھ کچھ دوسرے اسباب نہ مہیا ہو جائیں۔ مزید

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٤٥)

(2) مسند أحمد (٢٤٦/٢) الموطأ للإمام مالك (١٧٣/١)

(3) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٤٢) مسند أحمد (٣٦٧/٢) صحيح الجامع (١٧٠٣)

(4) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤١٧٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢٩)

یہ کہ اس کے ساتھ کچھ رکاوٹیں بھی ہوتی ہیں۔ اگر اللہ ان اسباب کو فراہم نہ کرے اور اس کی راہ میں آنے والی رکاوٹوں کو دور نہ فرما دے تو مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی ذات ہی جو چاہتی ہے وہی ہوتا ہے، خواہ انسان نہ چاہے، اسی طرح جو کچھ انسان چاہتے ہیں، وہ اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک اللہ نہ چاہے۔

۲۔ بغیر کسی علم کے کسی چیز کے سبب ہونے کا عقیدہ رکھنا جائز نہیں ہے۔ جس نے بغیر علم کے یا خلافِ شریعت کسی چیز کو سبب بنا لیا تو اس کا یہ عقیدہ باطل ہے۔ مثال کے طور پر نذر کو مصیبت دور کرنے یا نعمت حاصل کرنے کا سبب سمجھ لینا۔ صحیحین میں نبی اکرم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے نذر ماننے کی ممانعت فرمائی اور کہا: یہ کسی خیر کا ذریعہ نہیں، صرف اتنی بات ہے کہ اس کے ذریعے بخیل سے مال نکلوایا جاتا ہے۔[1]

۳۔ دینی اعمال میں سے کوئی عمل اس وقت تک سبب نہیں بن سکتا جب تک وہ سبب جائز نہ ہو، کیوں کہ عبادات توقیفی ہیں۔ لہٰذا کسی انسان کے لیے جائز نہیں کہ وہ اللہ کے ساتھ شرک کرے اور کسی غیر اللہ کو پکارے، اگرچہ اس کا خیال ہو کہ اس سے اس کے بعض مقاصد کی تکمیل ہو جائے گی۔ اسی طرح ان بدعات کے ذریعے جو خلافِ شریعت ہیں، اللہ کی عبادت نہ کرے، اگرچہ اس کا گمان ہو کہ اس سے اس کے بعض اغراض پورے ہو جائیں گے، کیوں کہ شیطان انسان کے بعض مقاصد کی تکمیل میں مدد دیتا ہے جب وہ شرک کرتا ہے۔ اسی طرح کفر، فسق اور نافرمانی کے کاموں سے بھی انسان کے بعض اغراض پورے ہو جاتے ہیں، لیکن پھر بھی ان کے جواز کی کوئی صورت نہیں ہے، کیوں کہ اس طریقے سے جو خرابی پیدا ہوتی ہے وہ اس کے ذریعے حاصل ہونے والی مصلحت سے کہیں زیادہ بڑی ہے، جب کہ رسول اکرم ﷺ کی بعثت کا مقصد مصالح کا حصول اور اس کی تکمیل تھا اور آپ مفاسد کو کالعدم اور اسے کم سے کم کرنے کے لیے مبعوث فرمائے گئے تھے۔ اللہ نے جس چیز کا حکم دیا ہے، اس کی مصلحت راجح ہے اور جس کی ممانعت فرمائی ہے، اس کا فساد راجح ہے۔ یہ جملے بڑی اہمیت کے حامل ہیں، ان کی تفصیل ضروری ہے، لیکن یہاں ان اوراق میں اس کی گنجایش نہیں۔[2]

محمد ﷺ کے واسطے سے دعا کا حکم

سوال اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جو کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ، محمد ﷺ کے واسطے سے دعا سنتا ہے، کیوں کہ آپ ﷺ وسیلہ اور واسطہ ہیں؟

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٣٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٣٩، ١٦٤٠)

[2] مجموع الفتاویٰ (١/١٢١ـ١٣٨)

جواب الحمد للہ. اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ محمد ﷺ پر ایمان لانا، آپ کی اطاعت کرنا اور آپ پر درود وسلام بھیجنا بندے کی دعا کی قبولیت اور دعا پر ثواب پانے کا ایک وسیلہ ہے تو اس کی بات درست ہے۔ لیکن اگر اس کی مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کی دعا اس وقت تک نہیں سنتا جب تک اسے کسی مخلوق کا واسطہ نہ دے یا اسے کسی مخلوق کی قسم نہ دلائے یا انبیاے کرام پر ایمان لائے، ان کی اطاعت کیے اور ان کی شفاعت کے بغیر محض ان کی ذات قبولیتِ دعا کے لیے ایک وسیلہ ہے، تو اس نے غلط کہا ہے۔ واللہ أعلم[1]

نبی اکرم ﷺ کو وسیلہ بنانے کا حکم

سوال نبی اکرم ﷺ کو وسیلہ بنانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب نبی اکرم ﷺ پر ایمان، آپ سے محبت، آپ کی اطاعت، آپ پر درود وسلام، آپ کی دعا اور آپ کی شفاعت وغیرہ سے جن کا تعلق آپ کے فعل اور بندوں کے ان افعال سے ہے جن کو آپ کے حق میں بجا لانے کا انھیں حکم دیا گیا ہے، وسیلہ لینا جائز ہے۔ اس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ صحابہ کرام آپ کی حیات میں آپ کو وسیلہ بناتے تھے۔ آپ کی وفات کے بعد وہ آپ کے چچا عباس رضی اللہ عنہ کو اسی طرح وسیلہ بناتے تھے جس طرح آپ کو وسیلہ بناتے تھے۔

کہنے والے کا یہ کہنا: اے اللہ! میں تیرے حضور محمد ﷺ کو وسیلہ بناتا ہوں، اس بارے میں علما کے دو قول ہیں، جس طرح آپ کی ذات کی قسم کھانے کے متعلق ان کے دو قول ہیں۔ جمہور ائمہ جیسے: امام مالک، امام شافعی اور امام ابو حنیفہ رحمہم اللہ، نہ آپ کی ذات کی قسم کھانے کو جائز سمجھتے ہیں اور نہ آپ کے علاوہ دیگر انبیاے کرام اور فرشتوں کی۔ علما کا اتفاق ہے کہ اس قسم کا اعتبار نہیں ہوگا۔

امام احمد رحمہ اللہ سے بھی ایک روایت یہی منقول ہے۔ ایک دوسری روایت کے مطابق امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک صرف نبی اکرم ﷺ کی ذات پر کھائی گئی قسم کا اعتبار ہوگا، اسی لیے امام احمد رحمہ اللہ نے اپنے شاگرد امام مروزی رحمہ اللہ کے لیے حج کے احکام و مسائل پر جو تحریر لکھی تھی، اس میں ہے کہ اپنی دعا میں نبی اکرم ﷺ کو وسیلہ بنائیں، لیکن امام احمد رحمہ اللہ کے علاوہ دیگر ائمہ کا خیال ہے کہ یہ بھی ایک طرح سے اللہ کو آپ ﷺ کی ذات کی قسم دلانا ہے اور کسی مخلوق کی اللہ کو قسم دلانا جائز نہیں ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ سے ایک روایت یہ منقول ہے کہ وہ آپ ﷺ کی ذات کی قسم دلانے کو جائز سمجھتے ہیں۔ اسی سے آپ ﷺ کی ذات کا وسیلہ لینے کو بھی درست سمجھتے ہیں۔

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۱/۱۳۹)

لیکن امام احمد کی دوسری روایت جمہور کے قول کے مطابق ہے، یعنی آپ ﷺ کی ذات کی قسم نہیں دلائی جا سکتی۔ لہٰذا فرشتوں اور دیگر انبیائے کرام کی طرح آپ ﷺ کی ذات کی بھی اللہ کو قسم دلانا جائز نہیں ہے۔ سلف اور ائمہ میں سے کسی کے متعلق ہمیں علم نہیں ہے کہ وہ آپ ﷺ کی ذات کی اللہ کو قسم دلاتے ہوں۔ اسی طرح وہ اس کے بھی قائل نہیں ہیں کہ مطلق طور پر ان کی قسم دلائی جائے۔ اسی لیے ابو محمد العز بن عبدالسلام نے فتویٰ دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کو فرشتوں اور انبیا وغیرہ میں سے کسی کی قسم نہ دلائی جائے۔ جب ان سے کہا گیا کہ آپ ﷺ کی ذات کی قسم دلانے سے متعلق ایک حدیث آتی ہے تو ان کا جواب یہ تھا کہ اگر وہ حدیث صحیح ہے تو صرف آپ ﷺ کی ذات کے لیے خاص ہوگی۔ لیکن مذکورہ حدیث آپ ﷺ کی ذات کی قسم کھانے پر دلالت نہیں کرتی ہے بلکہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

''جو کوئی قسم کھائے اسے صرف اللہ کی قسم کھانا چاہیے ورنہ پھر چپ رہنا چاہیے۔''[1]

آپ کا یہ بھی ارشاد ہے:

''جس کسی نے اللہ کے علاوہ کسی اور کی قسم کھائی، اس نے شرک کیا۔''[2]

دعا عبادت ہے اور عبادت توقیفی ہوتی ہے جس کی اساس اتباع پر ہے، خواہشِ نفس اور بدعت پر نہیں۔ واللّٰہ أعلم.[3]

انبیائے کرام اور صالحین کو وسیلہ بنانے کی جائز و ناجائز صورتیں

سوال انبیائے کرام اور نیک لوگوں کو وسیلہ بنانے اور ان سے شفاعت طلب کرنے کی جائز اور ناجائز صورتیں کیا ہیں؟

جواب الحمد للہ رب العالمین.

تمام مسلمانوں کا اجماع ہے کہ قیامت کے دن جب لوگ نبی محترم ﷺ سے شفاعت طلب کریں گے تو آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بعد ان کی شفاعت (سفارش) کریں گے۔

اس بات پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اہلِ سنت والجماعت کا اتفاق ہے اور اس کا مشہور روایات میں ذکر بھی ہوا ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنی امت میں سے کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرنے والے افراد کی سفارش کریں گے اور لوگوں کی عمومی سفارش بھی کریں گے۔

نبی کریم ﷺ کی کچھ شفاعتیں ایسی ہیں جو آپ ﷺ ہی کے ساتھ خاص ہیں۔ کوئی دوسرا ان میں آپ کا شریک نہیں۔ کچھ شفاعتیں ایسی ہیں جن میں دیگر انبیا اور نیک لوگ بھی آپ کے ساتھ شریک ہوں گے، لیکن جو

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٣٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٤٦)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٥١) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥٣٥) مسند أحمد (٤٧/١) السلسلة الصحيحة (٢٠٤٢)

[3] مجموع الفتاوى (١/١٤٠-١٤١)

آپ ﷺ کی شفاعتیں ہیں وہ دوسروں کی شفاعتوں سے افضل ہیں، کیوں کہ آپ ﷺ تمام مخلوق سے افضل اور اللہ تعالیٰ کے لیے سب سے زیادہ معزز و محترم ہیں۔ آپ ﷺ کے بہت سارے ایسے فضائل و مراتب ہیں جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو دوسرے تمام انبیا پر امتیاز بخشا ہے۔ ان کی تفصیل کی یہاں گنجایش نہیں۔ ان مراتب میں سے ایک مقامِ محمود کا مرتبہ ہے کہ جس پر پہلے اور پچھلے تمام آپ ﷺ پر رشک کریں گے۔ شفاعت کی احادیث بہت زیادہ اور متواتر ہیں، کچھ صحیحین (بخاری و مسلم) میں ہیں اور بہت ساری سنن و مسانید میں۔

خوارج اور معتزلہ میں سے وعیدیہ (فرقے) کا گمان ہے کہ شفاعت صرف مومنوں کے لیے ہے اور وہ بھی بعض درجات کی بلندی کے لیے۔ کچھ نے مطلق شفاعت ہی کا انکار کیا ہے۔ اہلِ علم کا اجماع ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کی زندگی اور آپ کی موجودگی میں آپ سے شفاعت طلب کرتے تھے اور آپ کو وسیلہ بناتے تھے۔

صحیح بخاری میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ جب قحط پڑتا تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کو وسیلہ بنا کر بارش طلب کرتے، وہ کہتے: ''اے اللہ! جب ہم خشک سالی کا شکار ہوتے تھے تو اپنے نبی کو وسیلہ بنا کر بارش کی دعا کیا کرتے تھے اور تو ہمیں سیراب کرتا تھا۔ اب ہم اپنے نبی کے چچا کو وسیلہ بنا کر بارش مانگتے ہیں تو ہمیں بارش عطا کر۔'' تو ان کو سیراب کیا جاتا۔[1]

صحیح بخاری ہی میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں: بسا اوقات رسولِ کریم ﷺ بارش کے لیے دعا مانگتے تو میں آپ ﷺ کے چہرے کی طرف دیکھتا اور مجھے شاعر کا یہ شعر یاد آ جاتا۔

وَأَبْيَضُ يُسْتَسْقَى الْغَمَامُ بِوَجْهِهِ ثِمَالُ الْيَتَامٰی عِصْمَةٌ لِلْأَرَامِلِ

''وہ حسین شخصیت جس کے چہرے کو وسیلہ بنا کر بادلوں سے بارش طلب کی جاتی ہے، وہ یتیموں کا سہارا اور بیواؤں کا کفیل ہے۔''

نبی اکرم ﷺ دعا کر کے ابھی منبر سے اترے بھی نہ ہوتے کہ پرنالوں سے بڑی تیزی کے ساتھ پانی گرنے لگتا۔[2]

نبی محترم ﷺ کو وسیلہ بنانے کا جو ذکر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، استسقا (بارش طلب کرنا) کی تمام احادیث میں وہ تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔ یہ آپ ﷺ سے شفاعت طلب کرنے ہی کی جنس سے ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ ﷺ سے دعا اور شفاعت طلب کی جائے اور اللہ تعالیٰ سے درخواست کی جائے کہ وہ آپ ﷺ کی دعا اور شفاعت کو قبول کرے۔ ہم آپ ﷺ کو (میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان ہوں) اپنا سفارش کنندہ اور سائل بنا کر پیش کرتے ہیں۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٩٦٤، ٣٥٠٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٩٦٣)

اس طرح جب شام میں خشک سالی کا دورہ پڑا تو حضرت معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما نے یزید بن اسود جرشی رضی اللہ عنہ کو وسیلہ بنا کر بارش کی دعا کی اور کہا: اے اللہ! ہم اپنے بہتر انسان کو وسیلہ اور سفارش کنندہ بناتے ہیں۔ اے یزید! اپنے ہاتھ بلند کر۔ تو انھوں نے اپنے ہاتھ بلند کیے اور دعا کی، لوگوں نے بھی دعا کی، حتی کہ ان پر بارش ہونے لگی۔

اس لیے علما نے کہا ہے کہ دین دار اور نیک لوگوں کو وسیلہ بنا کر بارش طلب کرنی چاہیے اور اگر وہ اہلِ بیتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہوں تو بہت بہتر ہے۔

یہ توسل اور شفاعت طلبی حقیقت میں اس کی دعا کو وسیلہ بنانا ہے۔ وہ متوسل بہ (جس کو وسیلہ بنایا گیا) اور مستشفع بہ (جس کو سفارش کنندہ بنایا گیا)، اس کے لیے دعا کرتا ہے اور لوگ اس کے ساتھ مل کر دعا کرتے ہیں۔

ایسے ہی جب عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں مسلمان قحط سالی کا شکار ہوئے تو ایک بدوی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا: اے اللہ کے رسول! مال (جانور) ہلاک ہو رہے ہیں اور راستے تباہ ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ ہمیں بارش عطا کرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کیے اور کہا: اے اللہ! ہمیں بارش دے، اے اللہ! ہمیں بارش دے۔ آسمان پر کہیں بادل نہیں تھے۔ اچانک سمندر کی جانب سے ایک بدلی اٹھی اور ایک ہفتہ ان پر بارش برستی رہی جس میں انھوں نے سورج کا منہ تک نہ دیکھا، حتی کہ وہی بدوی یا کوئی دوسرا آیا اور کہنے لگا: اے اللہ کے رسول! راستے بند ہو چکے ہیں اور عمارتیں ٹوٹ رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں، وہ اس بارش کو ہم سے دور کر دے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ اٹھائے اور کہا:

« اَللّٰھُمَّ حَوالَیْنَا وَلَا عَلَیْنَا، اَللّٰھُمَّ عَلَی الآكام، والظراب، ومنابت الشجر، وبطون الأودية »

''اے اللہ! ہم پر نہیں، ہمارے اردگرد پر، اے اللہ! ٹیلوں پر، گہری کھائیوں پر، درختوں کے اگنے کی جگہ پر اور وادیوں پر بارش لے جا۔''

تو بادل مدینے سے اس طرح چھٹ گئے جس طرح کپڑا پھٹ جاتا ہے۔ یہ حدیث مستند ہے صحیحین اور دیگر کتب میں موجود ہے۔[1]

سنن ابی داود میں ایک دوسری حدیث ہے کہ ایک آدمی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: ''ہم آپ کے حضور اللہ کو اپنا سفارش کنندہ بنا کر پیش کرتے ہیں اور اللہ کے حضور آپ کو۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سبحان اللہ کہا، حتی کہ اس کی بات کی ناگواری

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٩١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٩٧) سنن أبي داود، رقم الحديث (١١٧٤) سنن النسائي، رقم الحديث (١٥١٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٢٦٩)

آپ کے صحابہ کے چہروں سے بھی عیاں ہونے لگی، آپ ﷺ نے فرمایا: ''تیرا برا ہو، اللہ تعالیٰ کو اس کی کسی مخلوق کے پاس سفارش کنندہ نہیں بنایا جاتا، اللہ کی شان اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔''[1]

اس سے واضح ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے کلام میں کسی شخص کو سفارش کنندہ بنانے کا مطلب اس کی دعا کے ساتھ شفاعت طلب کرنا اور اس کی سفارش ہے۔ بذاتِ خود اس سے سوال کرنا یا اس کی ذات کے ساتھ سوال کرنا نہیں، کیوں کہ اگر یہ سوال اس کی ذات سے ہوتا تو مخلوق کا اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ سوال کرنا مخلوق کے واسطے سے اللہ تعالیٰ سے سوال کرنے سے اولیٰ اور زیادہ مناسب ہوتا، لیکن چوں کہ اس کا معنی پہلا ہے، اس لیے نبی مکرم ﷺ نے کہنے والے کی اس بات پر نکیر فرمائی کہ ''ہم اللہ کو آپ کے حضور سفارش کنندہ بناتے ہیں'' اور اس کی اس بات کا انکار نہیں کیا کہ ''ہم آپ کو اللہ کے حضور سفارش کنندہ بناتے ہیں''، کیوں کہ سفارش کرنے والا، جس سے سفارش کی جاتی ہے اس سے کہتا ہے کہ وہ ضرورت مند کی ضرورت پوری کرے اور اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے بندوں میں سے کسی سے بھی یہ درخواست نہیں کرتے کہ وہ اس کی مخلوق کی حاجتوں کو پورا کرے۔ گو کسی شاعر نے اپنے اس شعر میں کہا ہے کہ وہ اللہ کو اپنا سفارشی بناتا ہے ؏

شفيعي إليك الله لا رب غيره   وليس إلى رد الشفيع سبيل

''میرا تمھاری طرف سفارش کنندہ اللہ ہے، جس کے سوا کوئی رب نہیں اور اس سفارش کنندہ کو رد کرنے کی کوئی راہ نہیں۔''

تاہم یہ باطل کلام ہے جو کسی عالم کے منہ سے نہیں نکلا۔ اسی طرح ایک وحدت الوجود کا قائل ذکر کرتا ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کو نبی محترم ﷺ کے حضور سفارش کنندہ بنایا۔ یہ دونوں ہی غلط اور گمراہی پر مبنی ہیں۔

بلکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی سے سوال کیا جاتا اور اس سے دعا کی جاتی ہے۔ زمین و آسمان کے کل باشندگان اسی سے سوال کرتے ہیں، لیکن وہ بابرکت ذات اپنے بندوں کو حکم دیتی ہے تو وہ اس کی فرماں برداری کرتے ہیں۔ مخلوق میں سے ہر وہ فرد جس کی فرماں برداری واجب ہے، وہ صرف اس لیے واجب ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری ہے۔ رسول اللہ تعالیٰ کا حکم پہنچاتے ہیں۔ جو ان کی اطاعت کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت کرتا ہے اور جو ان کی بیعت کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کی بیعت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ [النساء: ٦٤]

''اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اللہ کے حکم سے اس کی فرماں برداری کی جائے۔''

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧٢٦) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے ضعیف کہا ہے۔

﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ [النساء: ٨٠]

''جو رسول کی فرماں برداری کرے تو بے شک اس نے اللہ کی فرماں برداری کی۔''

اہلِ علم اور اہلِ حکومت میں سے صاحبِ امر کی اطاعت اس وقت واجب ہے جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا حکم دیں۔ رسول اللہ ﷺ نے صحیح حدیث میں فرمایا ہے:

«عَلَى الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ السَّمْعُ وَالطَّاعَةُ فِيْ عُسْرِهِ وَيُسْرِهِ وَمَنْشَطِهِ وَمَكْرَهِهِ مَا لَمْ يُؤْمَرَ بِمَعْصِيَةِ اللّٰهِ، فَإِذَا أُمِرَ بِمَعْصِيَةِ اللّٰهِ فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ »[1]

''مسلمان آدمی پر تنگی، آسانی، پسندیدگی، ناپسندیدگی ہر دو حالتوں میں سننا اور اطاعت کرنا لازم ہے، جب تک اس کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا حکم نہ دیا جائے۔ جب اس کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا حکم دیا جائے تب سننا ہے نہ اطاعت کرنا۔''

نیز آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ »[2]

''خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی فرماں برداری روا نہیں۔''

جہاں تک سفارش کرنے والے کا تعلق ہے تو وہ سائل ہوتا ہے، جس کی شفاعت کو ماننا لازم نہیں ہوتا، خواہ وہ کوئی بڑا آدمی ہی ہو۔

صحیح حدیث میں ہے کہ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا جب آزاد ہوئیں تو نبی محترم ﷺ نے ان سے کہا کہ وہ اپنے خاوند کو نہ چھوڑے۔ آپ ﷺ نے اس کو یہ اختیار دیا تو اس نے اس کو چھوڑنا پسند کیا۔ اس کا خاوند اس سے محبت کرتا تھا۔ اس نے رونا شروع کر دیا۔ نبی اکرم ﷺ نے اس سے کہا کہ وہ اس سے علاحدہ نہ ہو۔ اس نے آپ سے پوچھا: کیا آپ مجھے حکم دیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: نہیں، میں تو صرف سفارشی ہوں۔[3]

مسلمانوں میں یہ مسئلہ مسلمہ حیثیت رکھتا ہے کہ آپ ﷺ کی سفارش کے برعکس آپ ﷺ کے حکم کی اطاعت واجب ہے اور آپ ﷺ کی سفارش قبول کرنا شرعاً لازمی نہیں، اس لیے نبی مکرم ﷺ نے حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کو اپنی سفارش قبول نہ کرنے پر ملامت نہ کیا۔ لہٰذا مخلوق میں آپ ﷺ کے علاوہ کسی بھی دوسرے کی سفارش بالاولیٰ واجب القبول نہیں۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٧٢٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٣٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٨٣٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٤٠)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٧٩)

خالق جل جلالہ کا حکم مخلوق کا سفارش کنندہ بننے سے کہیں بلند ہے، بلکہ اس کی شان تو اتنی بلند ہے کہ کوئی اس کے ہاں بھی اس کی اجازت کے بغیر سفارش نہیں کر سکے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴿26﴾ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿27﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴿28﴾ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ﴾ [الأنبياء: ٢٦-٢٩]

’’اور انھوں نے کہا رحمان نے کوئی اولاد بنا رکھی ہے، وہ پاک ہے، بلکہ وہ بندے ہیں جنھیں عزت دی گئی ہے۔ وہ بات کرنے میں اس سے پہل نہیں کرتے اور وہ اس کے حکم کے ساتھ ہی عمل کرتے ہیں۔ وہ جانتا ہے جو ان کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے اور وہ سفارش نہیں کرتے مگر اسی کے لیے جسے وہ پسند کرے اور وہ اسی کے خوف سے ڈرنے والے ہیں اور ان میں جو یہ کہے کہ بے شک میں اس کے سوا معبود ہوں تو یہی ہے جسے ہم جہنم کی سزا دیں گے، ایسے ہی ہم ظالموں کو جزا دیتے ہیں۔‘‘

مذکورہ بالا حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کے حضور سفارش کنندہ بنایا جا سکتا ہے، یعنی آپ سے درخواست کی جائے کہ آپ ﷺ اپنے رب سے دنیا و آخرت میں شفاعت کا سوال کریں۔

آخرت میں مخلوق آپ سے یہ سفارش کرے گی کہ اللہ تعالیٰ ان کے مابین فیصلہ کرے اور ان کو جنت میں داخل کیا جائے۔ آپ ﷺ اپنی امت کے کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرنے والوں کی شفاعت کریں گے۔ کچھ ان لوگوں کی شفاعت کریں گے جو جہنم کے مستحق بن چکے ہوں گے کہ وہ ان کو اس میں داخل نہ کرے اور کچھ ان لوگوں کی سفارش کریں گے جو جہنم میں داخل ہو چکے ہوں گے کہ ان کو اس سے نکال لے۔

امت کے جمہور کے درمیان اس مسئلے میں کوئی اختلاف نہیں کہ آپ ﷺ کے لیے ان لوگوں کے لیے بھی سفارش کرنا جائز ہے جو فرماں بردار اور ثواب کے مستحق ہیں، لیکن اکثر بدعتی فرقے، جیسے خوارج اور معتزلہ نے آپ ﷺ کی کبیرہ گناہوں کے مرتکبین کے حق میں شفاعت کا انکار کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے: آپ کبیرہ گناہ کرنے والوں کی سفارش نہیں کریں گے کیوں کہ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کبیرہ گناہ کرنے والوں کو نہیں بخشے گا اور ان کو جہنم میں داخل کرنے کے بعد کسی کی سفارش کے ساتھ یا اس کے بغیر اس سے باہر نہیں نکالے گا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین عظام رحمہم اللہ، علمائے اسلام اور تمام اہلِ سنت والجماعت کا مذہب ہے کہ آنحضرت ﷺ کبیرہ گناہ کرنے والوں کی سفارش کریں گے اور اہلِ ایمان میں سے کوئی بھی جہنم میں ہمیشہ نہیں رہے گا، بلکہ ہر وہ شخص اس سے نکل جائے گا جس کے دل میں ذرہ برابر یا رائی کے برابر بھی ایمان ہوا تاہم آپ کو یا کسی دوسرے کو

وسیلہ بنا کر بارش طلب کرنا یا شفاعت طلب کرنا اس کی زندگی میں ہوگا، یعنی وہ اس سے دعا کی درخواست کریں، وہ ان کے لیے دعا کرے، لہٰذا ان کا وسیلہ بنانا اس کی دعا کے ذریعے سے ہوگا اور اس سے شفاعت طلب کرنا بھی ایسے ہی ہے، کیوں کہ شفاعت بھی دعا ہی ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ آپ ﷺ کی موجودگی یا غیر موجودگی میں یا آپ ﷺ کی موت کے بعد آپ کی ذات کو وسیلہ بنانا تو یہ ایسے ہی ہے جیسے آپ کی ذات یا آپ کے علاوہ دیگر انبیاء کی ذات کی قسم کھانا یا ان کی دعاؤں کے ذریعے نہیں، بلکہ ان کی ذاتوں کے ذریعے سوال کرنا۔ یہ نظریہ صحابہ اور تابعین کے ہاں معروف نہیں، بلکہ حضرت عمر بن خطاب، معاویہ بن ابی سفیان اور ان کی موجودگی میں دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ نے، جب قحط پڑا تو ان لوگوں کو وسیلہ بنا کر بارش طلب کی جو زندہ تھے، جیسے سیدنا عباس اور یزید بن اسود رضی اللہ عنہما اس حالت میں انھوں نے نبی اکرم ﷺ کی قبر کے پاس یا کسی دوسری جگہ جا کر آپ ﷺ کو وسیلہ بنا کر یا سفارش کنندہ بنا کر بارش طلب نہیں کی تھی، بلکہ اس کے متبادل کو اختیار کیا، جیسے حضرت عباس اور حضرت یزید بن اسود رضی اللہ عنہما بلکہ وہ تو اپنی دعا میں آپ ﷺ پر درود پڑھا کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا تھا: اے اللہ! ہم تیرے حضور تیرے نبی کو وسیلہ بنا کر بارش طلب کیا کرتے تھے، تو ہمیں سیراب کرتا تھا اور اب ہم تیرے نبی کے چچا کو تیرے حضور وسیلہ بناتے ہیں، تو ہمیں سیراب کر۔ جب ان کے لیے شرعی طریقے سے آپ کو وسیلہ بنانا ناممکن ہوگیا کہ جو وہ کیا کرتے تھے تو انھوں نے اس طریقے کو اس کا متبادل بنا لیا تھا۔

حالانکہ ان کے لیے آپ ﷺ کی قبر کے پاس آنا، اس کو وسیلہ بنانا، صحرا میں اپنی دعاؤں میں آپ ﷺ کی جاہ کا واسطہ دینا، یا اس طرح کے دیگر الفاظ کہنا جو خالق کو مخلوق کا واسطہ دینے اور اس کو ذریعہ بنا کر اللہ سے دعا کرنے پر مشتمل ہوں، ممکن تھا۔ وہ کہہ سکتے تھے: ہم تجھے تیرے نبی کی قسم دے کر، یا تیرے نبی کی جاہ کے واسطے تجھ سے مانگتے ہیں، یا اس طرح کے دیگر کام جو کچھ لوگ کرتے ہیں۔ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ایسا کوئی کام بھی نہیں کیا، نہ انھوں نے ایسی کوئی دعا ہی مانگی ہے، حالاں کہ وہ ہم سے زیادہ علم رکھتے اور ان کاموں کو ہم سے زیادہ جانتے تھے جو اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہیں، وہ ان دعاؤں کو بھی زیادہ جانتے تھے جن کا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم دیا اور جو قبولیت کے زیادہ قریب ہیں، اس کے باوجود انھوں نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ کو وسیلہ بنایا جو نبی اکرم ﷺ کے مانند ہرگز نہیں تھے، لہٰذا ان کا افضل وسیلہ چھوڑ کر مفضول کا وسیلہ اختیار کرنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ افضل کو وسیلہ بنانا ممکن نہیں تھا۔ بعض جاہل نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے کہا:

« إذا سألتم الله فاسألوه بجاهي، فإن جاهي عند الله عظيم »

”جب تم اللہ تعالیٰ سے سوال کرو تو میری جاہ (مرتبہ) کو وسیلہ بناؤ، میری جاہ (مرتبہ) اللہ تعالیٰ کے ہاں

بہت عظیم ہے۔''

یہ ایک جھوٹی حدیث ہے جو مسلمانوں کی ان کتابوں میں کہیں نہیں جن پر محدثین اعتماد کرتے ہیں اور نہ کسی محدث نے اس کا ذکر کیا ہے، باوجودیکہ آپ ﷺ کی جاہ اور مرتبہ اللہ تعالیٰ کے ہاں تمام انبیاء علیہم السلام اور رسولوں کی جاہ سے عظیم ہے۔

ہمیں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ دونوں اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت مرتبہ اور جاہ رکھتے تھے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ آذَوْا مُوسَىٰ فَبَرَّأَهُ اللَّهُ مِمَّا قَالُوا ۚ وَكَانَ عِندَ اللَّهِ وَجِيهًا﴾ [الأحزاب: ٦٩]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے موسیٰ کو تکلیف پہنچائی تو اللہ نے اسے اس سے پاک ثابت کر دیا جو انھوں نے کہا تھا اور وہ اللہ کے ہاں بہت مرتبے والا تھا۔''

نیز فرمایا:

﴿إِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَا مَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ﴾ [آل عمران: ٤٥]

''جب فرشتوں نے کہا اے مریم! بے شک اللہ تجھے اپنی طرف سے ایک کلمے کی بشارت دیتا ہے، جس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہے، دنیا اور آخرت میں بہت مرتبے والا اور مقرب لوگوں سے ہوگا۔''

اگر حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت عزت والے تھے تو سید اولادِ آدم، صاحبِ مقامِ محمود جس کی وجہ سے سب پہلے اور پچھلے آپ پر رشک کریں گے اور صاحبِ حوضِ کوثر کی جاہ و مرتبت کے کیا کہنے کہ جس کا حوض کے برتن آسمان کے ستاروں کی تعداد کے برابر ہوں گے، اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ شیریں ہوگا اور جو اس سے ایک گھونٹ بھی پانی پی لے گا اس کے بعد کبھی پیاس محسوس نہیں کرے گا؟!

نبی اکرم ﷺ قیامت کے دن اس وقت شفاعت کریں گے جب حضرت آدم، نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام جیسے اولو العزم انبیاء اس سے پیچھے ہٹ جائیں گے تو آپ ﷺ اس کی طرف بڑھیں گے۔

آپ ﷺ پرچم کے مالک ہوں گے اور حضرت آدم علیہ السلام اور ان کے بعد والے آپ ﷺ کے جھنڈے تلے ہوں گے۔ آپ ﷺ آدم علیہ السلام کی اولاد کے سردار اور اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ معزز ہیں۔ جب انبیا اکٹھے ہوئے تو آپ ﷺ ان کے امام تھے اور جب وہ آئیں گے تو آپ ﷺ ان کے خطیب ہوں گے۔ آپ ﷺ کی جاہ اور مرتبہ بہت عظیم ہے۔

لیکن خالق کے ہاں مخلوق کی جاہ و مرتبہ مخلوق کی مخلوق کے ہاں جاہ و مرتبے کی طرح نہیں ہے۔ اس کی

شان تو یہ ہے کہ اس کے پاس اس کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش نہیں کرے گا:

﴿لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ﴿١٧٢﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا﴾ [النساء: ١٧٢-١٧٣]

’’مسیح ہرگز اس سے عار نہ رکھے گا کہ وہ اللہ کا بندہ ہو اور نہ مقرب فرشتے ہی اور جو بھی اس کی بندگی سے عار رکھے اور تکبر کرے تو عن قریب وہ ان سب کو اپنی طرف اکٹھا کرے گا۔ پھر جو لوگ تو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے سو وہ انھیں ان کے اجر پورے دے گا اور انھیں اپنے فضل سے زیادہ بھی دے گا اور رہے وہ جنھوں نے عار سمجھا اور تکبر کیا تو وہ انھیں دردناک عذاب دے گا اور وہ اپنے لیے اللہ کے سوا نہ کوئی دوست پائیں گے اور نہ کوئی مددگار۔‘‘

مخلوق مخلوق کے ہاں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرتی ہے اور مطلوب کے حصول میں اس کی شریک ہوتی ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں، جس طرح اس نے فرمایا ہے:

﴿قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ﴿٢٢﴾ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ﴾ [سبا: ٢٢، ٢٣]

’’کہہ دے پکارو ان کو جنھیں تم نے اللہ کے سوا گمان کر رکھا ہے، وہ نہ آسمانوں میں ذرہ برابر کے مالک ہیں اور نہ زمین میں اور نہ ان کا ان دونوں میں کوئی حصہ ہے اور نہ ان میں سے کوئی اس کا مددگار ہے اور نہ سفارش اس کے ہاں نفع دیتی ہے مگر جس کے لیے وہ اجازت دے۔‘‘

نبی محترم ﷺ کی مشہور و مستفیض احادیث ہیں کہ آپ نے قبروں کو سجدہ گاہ بنانے سے منع کیا ہے۔ ایسا کرنے والے پر لعنت کی ہے اور اپنی قبر پر میلہ لگانے سے منع کیا ہے، کیوں کہ آدم علیہ السلام کی اولاد میں سب سے پہلے شرک کا آغاز حضرت نوح علیہ السلام کی قوم میں ہوا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: حضرت آدم اور حضرت نوح علیہما السلام کے درمیان دس زمانے ہیں اور ان زمانوں میں سارے لوگ اسلام پر تھے۔[1]

بخاری و مسلم میں نبی محترم ﷺ سے یہ ثابت ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے سب سے پہلے رسول تھے، جن کو اللہ تعالیٰ نے اہلِ زمین کی طرف بھیجا، اللہ تعالیٰ نے ان کی قوم کے بارے میں کہا ہے کہ انھوں نے کہا:

---

[1] المستدرك (٢/٤٨٠)

﴿وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا ۝ وَقَدْ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا﴾ [نوح: ٢٣، ٢٤]

''اور انھوں نے کہا تم ہرگز اپنے معبودوں کو نہ چھوڑنا اور نہ کبھی وڈ کو چھوڑنا اور نہ سواع کو اور نہ یغوث اور نہ یعوق اور نہ نسر کو اور بلاشبہ انھوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا۔''

سلف صالحین میں سے ایک سے زیادہ افراد کا یہ قول ہے کہ یہ لوگ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے نیک لوگ تھے، جب وہ فوت ہوئے تو انھوں نے ان کی قبروں پر ڈیرے ڈال لیے اور جب ان کو ایک عرصہ گزر گیا تو انھوں نے ان کی عبادت شروع کر دی۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول نقل کیا اور ذکر کیا کہ یہ معبود عرب میں منتقل ہو گئے اور ان عرب قبائل کا نام ذکر کیا جن کے پاس یہ بت تھے۔[1]

جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ علم ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کو سجدہ گاہ بنانے سے روک کر شرک کی جڑ کاٹ دی ہے، چاہے نماز پڑھنے والا اللہ ہی کے لیے نماز کیوں نہ پڑھ رہا ہو، جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورج طلوع ہوتے وقت نماز پڑھنے سے منع کیا، تاکہ سورج کی پوجا کرنے والوں کے ساتھ مشابہت نہ ہو جائے، اور وہ شخص جو میت کو وسیلہ بنا کر یا اس کی قبر کے پاس دعا کا ارادہ رکھتا ہے اس شخص سے زیادہ شرک کے قریب ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے نماز پڑھنے کا قصد رکھتا ہے، بنا بریں وہ اس طرح نہیں کرتے تھے۔

اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جانتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وسیلہ بنانا درحقیقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے، آپ کی فرماں برداری، آپ کی دوستی اور محبت کو وسیلہ بنانا ہے، یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اور شفاعت کو وسیلہ بنانا ہے، اس لیے وہ ان چیزوں کو چھوڑ کر مجرد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو وسیلہ نہیں بناتے تھے۔ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ایسا کوئی کام نہیں کیا، نہ اس جیسی دعائیں مانگیں، حالانکہ وہ ان امور اور ان دعاؤں کو ہم سے زیادہ جانتے ہیں جو اللہ اور رسول کو زیادہ پسند، ان کے حکم کے مطابق اور قبولیت کے زیادہ قریب ہیں، بلکہ انھوں نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ کو وسیلہ بنا لیا جو نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مانند بھی نہیں۔ تو ان کے افضل کو وسیلہ بنانے سے ہٹ کر ایک مفضول کو وسیلہ بنانے سے معلوم ہوا کہ افضل کے ساتھ مشروع توسل ممکن نہیں تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''اے اللہ! میری قبر کو بت نہ بننے دینا جس کی پوجا کی جائے، اس قوم پر اللہ تعالیٰ کا غصہ بہت شدید ہوا، جس نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا'' موطا امام مالک وغیرہ،[2] سنن ابی داود میں نبیِ محترم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری قبر کو عید (میلہ) نہ بنانا،

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٣٦)

[2] الموطأ (١/١٧٣) مسند أحمد (٢/٢٤٦) شیخ البانی رحمہ اللہ نے تلخیص أحکام الجنائز (ص: ٨٨) میں اسے صحیح کہا ہے۔

تم جہاں کہیں ہو، وہیں سے مجھ پر درود بھیج دو، تمھارا درود مجھ تک پہنچ جاتا ہے۔‘‘[1]

صحیح مسلم میں حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی موت سے پانچ دن پہلے فرمایا: ’’میں اللہ تعالیٰ کے حضور اس امر سے براءت کا اظہار کرتا ہوں کہ میرا تم میں سے کوئی خلیل ہو۔ اگر میں اپنی امت میں سے کسی کو اپنا خلیل (گہرا دوست) بناتا تو ابوبکر کو بناتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے خلیل بنا لیا ہے، جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بنایا تھا۔ تم سے پہلے جو لوگ تھے وہ قبروں کو مساجد (سجدہ گاہ) بناتے تھے، خبردار! قبروں کو مساجد (سجدہ گاہ) نہ بناؤ، میں تم کو اس سے منع کرتا ہوں۔‘‘[2]

صحیح بخاری میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لَا تَطْرُوْنِي كَمَا أَطْرَتِ النَّصَارىٰ عِيْسَى بْنَ مَرْيَمَ، فَإِنَّمَا أَنَا عَبْدٌ فَقُوْلُوْا: عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهُ »[3]

’’مجھے اس طرح نہ بڑھاؤ جس طرح عیسائیوں نے عیسیٰ بن مریم کو بڑھا چڑھا دیا۔ میں تو صرف بندہ ہوں، لہٰذا تم کہو: اللہ کا بندہ اور اس کا رسول۔‘‘

امام ترمذی رحمہ اللہ نے نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک صحیح حدیث روایت کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو یہ دعا سکھائی:

« اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ وَأَتَوَسَّلُ إِلَيْكَ بِنَبِيِّكَ مُحَمَّدٍ نَبِيِّ الرَّحْمَةِ، يَا مُحَمَّدُ! يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، إِنِّيْ أَتَوَسَّلُ بِكَ إِلَى رَبِّيْ فِيْ حَاجَتِيْ لِيَقْضِيَهَا لِيْ، اَللّٰهُمَّ شَفِّعْهُ فِيَّ »[4]

’’اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیرے نبی، نبیِ رحمت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تیرے حضور وسیلہ بناتا ہوں، اے محمد! اے اللہ کے رسول! میں اپنی حاجت کے لیے آپ کو اپنے رب کے حضور وسیلہ بناتا ہوں، تاکہ وہ میری حاجت پوری کر دے، اے اللہ! ان کی میرے حق میں سفارش قبول فرما۔‘‘

سنن ترمذی اور ابن ماجہ نے عثمان بن حنیف سے روایت کیا ہے کہ ایک اندھا آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا: اللہ سے دعا کریں وہ مجھے عافیت دے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’اگر تم چاہو تو میں تمھارے لیے دعا کرتا ہوں اور اگر تم صبر کرنا چاہو تو وہ تمھارے لیے بہتر ہے۔‘‘ اس نے کہا: آپ دعا کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اچھے طریقے سے وضو کر کے یہ دعا پڑھنے کو کہا:

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٤٢) صحيح الجامع (٧٢٢٦)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٣٢)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦١)

[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٧٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٣٨٥) صحيح الجامع (١٢٧٩)

«اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ وَأَتَوَجَّهُ إِلَيْكَ بِنَبِيِّكَ مُحَمَّدٍ نَبِيِّ الرَّحْمَةِ، يَا رَسُولَ اللّٰهِ! يَا مُحَمَّدُ! إِنِّي تَوَجَّهْتُ بِكَ إِلَى رَبِّي فِي حَاجَتِي لِتُقْضِيَ، اَللّٰهُمَّ فَشَفِّعْهُ فِيَّ »[1]

امام ترمذی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

امام نسائی رحمہ اللہ نے جو عثمان بن حنیف سے روایت کی ہے اس کے الفاظ ہیں: ''ایک اندھے نے کہا: اے اللہ کے رسول! اللہ سے دعا کریں، وہ میری نظر کھول دے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جا وضو کر، پھر دو رکعات پڑھ، پھر کہہ:

«اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَتَوَجَّهُ بِكَ إِلَى رَبِّي أَنْ يَكْشِفَ عَنْ بَصَرِي، اَللّٰهُمَّ فَشَفِّعْهُ فِيَّ »

راوی کہتا ہے وہ جب واپس ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی بصارت کھول دی۔[2]

امام احمد رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں اپنی سند کے ساتھ عثمان بن حنیف سے نقل کیا ہے کہ ایک اندھا آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا تو کہا: اے اللہ کے نبی! اللہ سے دعا کریں کہ وہ مجھے عافیت دے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر تم اس کو موخر رکھنا چاہو تو یہ تمھاری آخرت کے لیے بہتر ہوگا اور اگر چاہو تو میں تمھارے لیے دعا کرتا ہوں۔'' اس نے کہا: نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ سے میرے لیے دعا کریں، آپ ﷺ نے اس کو وضو کرنے اور دو رکعات ادا کرنے اور یہ دعا پڑھنے کا حکم دیا:

«اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ وَأَتَوَجَّهُ إِلَيْكَ بِنَبِيِّكَ مُحَمَّدٍ، نَبِيِّ الرَّحْمَةِ يَا مُحَمَّدُ! إِنِّي أَتَوَجَّهُ بِكَ إِلَى رَبِّي فِي حَاجَتِي هٰذِهِ فَتُقْضِيَ، اَللّٰهُمَّ فَشَفِّعْنِي فِيهِ، وَشَفِّعْهُ فِيَّ »[3]

راوی کہتا ہے، اس آدمی نے اس طرح کیا تو شفایاب ہوگیا۔

لہٰذا اس حدیث میں آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف دعا میں وسیلہ بنانے کا ذکر ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ حدیث آپ ﷺ کو مطلق یعنی زندہ یا فوت شدہ حالت میں وسیلہ بنانے کا تقاضا کرتی ہے۔ جو لوگ آپ ﷺ کی وفات کے بعد اور آپ ﷺ کی غیر موجودگی میں آپ کی ذات کو وسیلہ بناتے ہیں وہ اسی حدیث سے دلیل لیتے ہیں۔

ان لوگوں کا گمان ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اس نابینا آدمی کا آپ ﷺ کی زندگی میں آپ کو وسیلہ بنانا اللہ تعالیٰ کو آپ کی قسم دینے کے معنی میں ہے یا اس معنی میں ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کو آپ ﷺ کی ذات کا واسطہ دے کر سوال کیا تھا کہ وہ ان کی حاجتوں کو پورا کر دے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ آپ ﷺ کو وسیلہ بنانا اس بات کا محتاج نہیں کہ

---

1. سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٧٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٣٨٥) صحيح الجامع (١٢٧٩)
2. سنن النسائي الكبرىٰ (٦/١٦٩) صحيح الترغيب والترهيب (١/٦٦)
3. سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٧٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٣٨٥) صحيح الجامع (١٢٧٩)

آپ ﷺ ان کے لیے دعا کریں، نہ اس بات کا محتاج ہے کہ وہ آپ ﷺ کی اطاعت ہی کریں، ان کے لیے برابر ہے کہ رسول نے ان کے لیے دعا کی یا نہ کی۔ یہ سب ان کے نزدیک آپ ﷺ کو وسیلہ بنانا ہے، خواہ انھوں نے رسول کی اطاعت کی یا نہ کی۔ وہ یہ بھی عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کی حاجت بھی اسی طرح پوری کر دیتے ہیں جس نے ان کے زعم کے مطابق آپ ﷺ کو وسیلہ بنایا اور رسول نے اس کے لیے دعا نہ کی، جس طرح اس شخص کی حاجت پوری کر دیتے ہیں جس نے آپ ﷺ کو وسیلہ بنایا اور آپ ﷺ نے اس کے لیے دعا کی، کیوں کہ یہ دونوں ہی آپ ﷺ کو وسیلہ بنا رہے ہیں۔ وہ یہ خیال بھی رکھتے ہیں کہ ہر وہ شخص جس نے اللہ تعالیٰ سے نبی کے واسطے سے دعا کی اس نے آپ کو اسی طرح وسیلہ بنایا جس طرح اس اندھے شخص نے آپ ﷺ کو وسیلہ بنایا تھا اور جو آپ ﷺ نے اس نابینا شخص کو حکم دیا تھا وہ ان کے لیے بھی جائز ہے۔ ان لوگوں کا یہ قول شرعاً اور قدراً باطل ہے، یہ نہ اللہ تعالیٰ کی شریعت کی موافقت کر رہے ہیں نہ ان کا یہ قول خلق اللہ (تقدیرِ الٰہی) ہی کے مطابق ہے۔

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ معین مسئلہ اور خاص قضیہ ہے۔ اس کے ان نظائر اور ملتی جلتی صورتوں میں، جو حکم کی علت میں متشابہ ہوں، یہی حکم ثابت ہوگا۔ لیکن یہ حکم ان صورتوں میں ثابت نہیں ہوگا جو اس سے مختلف یا اس سے ملتی جلتی نہ ہوں۔

جس شخص کے لیے نبی ﷺ نے دعا کی اور جس کے لیے دعا نہیں کی، ان دونوں میں فرق شرعاً اور قدراً ثابت ہے اور ایک کو دوسرے کی طرح قرار دینا جائز نہیں۔

اس نابینا شخص کے لیے نبی اکرم ﷺ نے شفاعت کی تھی، اس لیے اس نے اپنی دعا میں کہا: «اللھم فشفعه في» ''اے اللہ! اُن کی میرے حق میں کی گئی شفاعت قبول فرما۔'' تو معلوم ہوا آپ ﷺ اس کے سفارش کنندہ تھے۔ آپ ﷺ کے یہ الفاظ تھے: ''اگر تم چاہو تو صبر کر لو اور اگر چاہو تو میں تمھارے لیے دعا کرتا ہوں۔'' اس نے کہا: میرے لیے دعا کریں۔ اس نے نبیِ اکرم ﷺ سے دعا کی درخواست کی تو نبیِ مکرم ﷺ نے اس کو نماز پڑھنے اور خود اپنے لیے دعا کرنے کا حکم دیا اور اپنی دعا میں یہ الفاظ کہنے کا کہا: ''اے اللہ! میرے حق میں آپ ﷺ کی سفارش قبول فرما'' تو اس سے ثابت ہوا کہ اس کی اس بات کا معنی کہ: ''میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیرے نبی محمد ﷺ کے واسطے سے تیری طرف رخ کرتا ہوں۔'' یعنی آپ ﷺ کی دعا اور شفاعت کے واسطے سے مانگتا ہوں، جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول ہے: ''اے اللہ جب ہم قحط سالی کا شکار ہوتے تھے تو تیرے حضور تیرے نبی کا وسیلہ پیش کرتے تھے تو تو ہمیں سیراب کر دیتا تھا۔'' لہٰذا دونوں صورتوں کا معنی ایک ہی ہے۔ آپ ﷺ نے اپنی زندگی میں ایک آدمی کو اپنا وسیلہ بنانے کی تعلیم دی، جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی ذکر کیا ہے کہ وہ قحط سالی کی حالت میں آپ ﷺ کو وسیلہ

بناتے تھے، پھر آپ ﷺ کی وفات کے بعد وہ آپ ﷺ کی جگہ کسی دوسرے آدمی سے توسل کرتے تھے۔

اگر آپ ﷺ کو زندہ یا فوت شدہ حالت میں وسیلہ بنانا ایک جیسا ہوتا اور آپ ﷺ کو وسیلہ بنانے والا جس کے لیے آپ ﷺ نے دعا کی، اسی شخص کی طرح ہوتا جس کے لیے آپ ﷺ نے دعا نہیں کی تو وہ آپ ﷺ کو چھوڑ کر، حالاں کہ آپ تمام مخلوق سے افضل اور اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ معزز ہیں اور وسیلے کے اعتبار سے بھی سب سے زیادہ اللہ کے قریب ہیں، آپ ﷺ کے علاوہ کسی دوسرے کو وسیلہ نہ بناتے جو آپ جیسا نہیں تھا۔

اسی طرح اگر کوئی ایسا نابینا شخص جس نے آپ ﷺ کو وسیلہ بنایا، لیکن آپ ﷺ نے اس کے لیے دعا نہیں کی وہ اس نابینا صحابی کی طرح ہی ہوتا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے دیگر نابینا صحابی یا بعض دوسرے بھی اسی جیسا کام کرتے، لیکن جب انھوں نے ایسا نہیں کیا اور اس کو چھوڑ کر دوسری راہ اختیار کی، حالانکہ وہ ایمان میں سبقت لے جانے والے، اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والے، مہاجرین کی مدد کرنے والے تھے، اسی طرح تابعین عظام، یہ سب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو ہم سے زیادہ جاننے والے، اللہ اور اس کے رسول کے حقوق اور دعا میں جائز و ناجائز، مفید و غیر مفید کا ہم سے زیادہ علم رکھتے تھے، وہ ضرورت، بھوک اور خشک سالی کے وقت ہر ممکن طریقے سے رنج و مصیبت کو دور کرنے، تنگی کو آسانی میں بدلنے اور بارش طلب کرنے کے لیے مطالبہ کرتے تھے، اس کے باوجود انھوں نے ایسا نہیں کیا تو یہ اس کی دلیل ہے کہ جائز وہی کام ہے جو انھوں نے کیا، وہ نہیں جو انھوں نے ترک کیا۔

اسی لیے فقہا نے بھی استسقاء (بارش طلب کرنا) کے باب میں وہی ذکر کیا ہے جو انھوں نے کیا تھا، وہ نہیں جو انھوں نے ترک کیا۔ کیوں کہ آپ ﷺ کی زندگی میں آپ ﷺ کو وسیلہ بنانا آپ ﷺ کی دعا اور شفاعت کی درخواست کرنا ہے اور وہ آپ ﷺ سے دعا کی درخواست ہی کی قبیل سے ہے، لہٰذا آپ ﷺ کا ان کے لیے دعا کرنا جائز ہے۔

جہاں تک آپ ﷺ کی وفات کے بعد کی بات ہے تو صحابہ کرام اس وقت نہ آپ ﷺ کی قبر کے پاس اور کسی دوسری جگہ ہی آپ ﷺ سے دعا کی درخواست کرتے تھے، جس طرح بہت سارے لوگ نیک لوگوں کی قبروں کے پاس ایسا کرتے ہیں۔ کوئی میت سے اپنی حاجت براری چاہتا ہے، کوئی اللہ تعالیٰ کو اس کی قسم اور واسطہ دے رہا ہوتا ہے، اگرچہ بعض متاخرین سے اس طرح کی کہانیاں منقول ہیں، بلکہ ہر مومن کے لیے دوسرے مومن سے دعا کی درخواست کرنا جائز ہے، حتی کہ رسول اللہ ﷺ نے بھی اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا جب وہ عمرہ کی اجازت لینے کے لیے آپ ﷺ کے پاس آئے: «لَا تَنْسَنَا يَا أَخِي، مِنْ دُعَائِكَ»[1] ''برادر! اپنی دعا میں ہمیں نہ بھولنا۔'' اگر

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٩٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٦٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٨٩٤) ضعيف الجامع (٦٢٧٨)

یہ حدیث صحیح ہو تو۔ بلکہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت اویس قرنی سے بھی دعا کروانے کی ترغیب دلائی تھی، اگرچہ درخواست گزار حضرت اویس سے کہیں افضل تھا۔[1]

نبی اکرم ﷺ نے صحیح حدیث میں کہا ہے: ''جب تم موذن کو سنو تو اس کے الفاظ دہراؤ، پھر مجھ پر درود بھیجو، یقیناً جس نے مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجا، اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل کرے گا، پھر اللہ تعالیٰ سے میرے لیے ''وسیلہ'' مانگو۔ یہ جنت میں ایک درجہ اور مقام ہے جو اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے صرف ایک بندے کے لائق ہے اور میں امید رکھتا ہوں کہ وہ بندہ میں ہی ہوں گا، تو جس نے اللہ تعالیٰ سے میرے لیے وسیلہ مانگا، قیامت کے دن وہ میری شفاعت کا سزاوار ہوگا۔''[2]

باوجودیکہ آپ ﷺ کا اپنی امت سے دعا کے لیے کہنا، مخلوق سے کسی حاجت کی طلب اور درخواست کرنا نہیں، بلکہ امت کو اس کام کی تعلیم دینا ہے جس سے وہ اپنے دین میں مستفید ہو سکتے ہیں، اس تعلیم اور اس پر عمل کے سبب اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کے اجر کو عظیم کر دے گا۔ لہٰذا ہم جب آپ ﷺ پر ایک مرتبہ درود بھیجتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ہم پر دس رحمتیں نازل فرماتا ہے اور جب ہم اللہ تعالیٰ سے آپ ﷺ کے لیے وسیلہ کی دعا کریں گے تو قیامت کے دن آپ ﷺ کی شفاعت کے مستحق ہو جائیں گے۔ ہمارے ہر عمل کا جو ثواب ہمیں ملے گا، آپ ﷺ کو بھی وہی ملے گا، لیکن ہمارے اجر و ثواب میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے: ''جس نے کسی کو ہدایت کی دعوت دی، اس کو بھی اتنا ہی اجر ملے گا جتنا اس پر عمل کرنے والے کو ملے گا، لیکن ان کے اجر میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔''[3]

آپ ﷺ نے اپنی امت کو ہر خیر اور اچھائی کی دعوت دی ہے اور ہر وہ بھلائی جو امت کرتی ہے، آپ ﷺ کو بھی ان کے اجر کے برابر اجر ملے گا، لیکن ان کے اجر میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔

اسی لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ ﷺ کو اپنے اعمال کا ایصالِ ثواب نہیں کرتے تھے، نہ آپ ﷺ کی طرف سے حج کرتے نہ صدقہ کرتے، نہ تلاوتِ قرآن کرتے نہ قربانی، کیوں کہ مسلمان نماز، روزہ، حج، صدقہ اور تلاوتِ قرآن جیسا جو عمل بھی کرتے ہیں، آپ ﷺ کو بھی اس کا اتنا ہی ثواب ملتا ہے جتنا ان کو ہوتا ہے، لیکن ان کے ثواب میں

---

[1] اس موضوع پر مستقل رسالے کی عبارت اس طرح ہے: ''حتی کہ آپ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ اویس قرنی رحمہ اللہ سے درخواست کریں کہ وہ ان کے لیے بخشش کی دعا کرے، حالانکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، اویس قرنی رحمہ اللہ سے کہیں زیادہ افضل ہیں، آپ ﷺ نے اپنی امت کو بھی حکم دیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے آپ ﷺ کے لیے مقامِ وسیلہ کی دعا کریں اور آپ ﷺ پر درود بھیجیں۔'' صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٥٤٢)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٣٨٤)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٧٤)

کوئی کمی نہیں ہوتی، والدین کے برعکس کہ مسلمان جو بھی نیکی کرتا ہے، اس کے والدین کو اس کے برابر ثواب نہیں ملتا، اس لیے وہ والدین وغیرہ کو ایصالِ ثواب کرتا ہے۔

ہر کسی کو معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے رب کے اس فرمان: ﴿فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ﴾ کے تابع فرمان تھے اور آپ ﷺ اللہ کے علاوہ دوسروں کی طرف رغبت نہیں رکھتے تھے۔ صحیح (بخاری) میں آپ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«يَدْخُلُ مِنْ أُمَّتِي الْجَنَّةَ سَبْعُوْنَ أَلْفاً بِغَيْرِ حِسَابٍ، هُمُ الَّذِيْنَ لَا يَسْتَرْقُوْنَ وَلَا يَكْتَوُوْنَ وَلَا يَتَطَيَّرُوْنَ، وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ»[1]

''میری امت سے ستر ہزار افراد بغیر حساب جنت میں داخل ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جو دم کرواتے ہیں نہ داغ لگوا کر علاج کرواتے ہیں اور نہ پرندوں سے شگون پکڑتے ہیں، بلکہ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔''

یہ لوگ آپ ﷺ کے امتی ہوں گے۔ آپ ﷺ نے ان کی تعریف کی ہے کہ وہ دوسروں سے دم نہیں کرواتے۔ دم بھی دعا ہی کی ایک قسم ہے۔ آپ اپنے آپ کو اور دوسروں کو دم کرتے تھے، لیکن کسی دوسرے سے دم نہیں کرواتے تھے۔ اس روایت میں ایک راوی نے یہ الفاظ: «لا یرقون» ''وہ دم نہیں کرتے۔'' بھی ذکر کیے ہیں، مگر یہ روایت ضعیف اور غلط ہے۔

اس سے آپ ﷺ کے اپنی امت کو دعا کرنے کا کہنے کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ مخلوق کا اس اعتبار سے مخلوق کے لیے سوال کرنے کی قبیل سے نہیں کہ دوسرا اس سے افضل ہے۔ بے شک جو لوگوں سے سوال نہیں کرتا، بلکہ اللہ کے سوا کسی سے نہیں مانگتا، وہ اس سے افضل ہے جو لوگوں سے مانگتا اور سوال کرتا ہے، اور محمد ﷺ تو آدم علیہ السلام کی اولاد کے سردار ہیں۔

غیر موجود کی غیر موجود کے لیے دعا کرنا موجود کی دعا سے قبولیت کا زیادہ امکان رکھتا ہے، کیوں کہ اس کی دعا اخلاص سے بھرپور اور شرک سے دور ہوتی ہے، چنانچہ جو کہنے کے بغیر کسی دوسرے کے لیے دعا کرتا ہے، اس کی دعا اس کے مشابہ کس طرح ہو سکتی ہے جو کسی دوسرے کے کہنے پر اور اس کی موجودگی میں دعا کرتا ہے؟ حدیث میں آیا ہے:

«أَعْظَمُ الدُّعَاءِ إِجَابَةً دُعَاءُ غَائِبٍ لِغَائِبٍ»[2]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٣٧٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٨)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٣٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٩٨٠) ضعيف الجامع (٨٤١)

''غائب کی غائب کے لیے دعا بہت جلد قبول ہوتی ہے۔''

صحیح مسلم میں نبیِ کریم ﷺ کا یہ فرمان مروی ہے: ''جو آدمی بھی اپنے بھائی کے لیے اس کی غیر موجودگی میں دعا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ ایک فرشتے کو مقرر فرما دیتا ہے، لہٰذا جب وہ اپنے بھائی کے لیے کوئی دعا کرتا ہے تو مقرر فرشتہ کہتا ہے: آمین، اور تمھارے لیے اسی جیسا ہو۔''①

کیوں کہ مخلوق مخلوق سے وہی طلب کرتی ہے جو اس کے اختیار اور قدرت میں ہو اور مخلوق اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے اور مانگنے ہی کا اختیار رکھتی ہے، اس لیے دعا کی درخواست کرنا جائز ہے، جس طرح اس سے ان افعال میں مدد طلب کی جاتی ہے جن پر وہ قادر ہو۔ لیکن جس چیز پر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی قدرت نہیں رکھتا، اس کو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے سے مانگنا جائز نہیں، نہ فرشتوں سے، نہ انبیا سے اور نہ ان کے علاوہ کسی دوسرے ہی سے۔ لہٰذا غیر اللہ سے یہ کہنا جائز نہیں: ''اغفرلي'' ''مجھے معاف کر دے''، ''اسقنا الغيث'' ''ہمیں بارش سے سیراب کر''، ''انصرنا على القوم الكافرين'' ''ہماری کافروں کے خلاف مدد کر''، ''اهد قلوبنا'' ''ہمارے دلوں کو سیدھی راہ دکھا'' وغیرہ۔

اسی لیے امام طبرانی نے اپنی معجم میں یہ روایت ذکر کی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں ایک منافق تھا جو مومنوں کو اذیت پہنچاتا تھا، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: آؤ! رسول اللہ ﷺ سے اس منافق کے خلاف فریاد کریں، وہ آپ ﷺ کے پاس آئے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّهُ لَا يُسْتَغَاثُ بِي، وَإِنَّمَا يُسْتَغَاثُ بِاللّٰهِ))②

''مجھ سے فریاد نہیں کی جاتی (یعنی میں غوث نہیں) بلکہ فریاد صرف اللہ تعالیٰ سے کی جاتی ہے۔''

استعانت، یعنی مدد طلب کرنے میں بھی یہی بات ہے۔

تاہم جس پر بشر قدرت رکھتا ہے، وہ اس قبیل سے نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ ﴾ [الأنفال: ۹]

''جب تم اپنے رب سے مدد مانگ رہے تھے تو اس نے تمھاری دعا قبول کر لی۔''

---

① مولف کے مستقل رسالے میں یہاں درج ذیل اضافہ ہے: ''دوسرے سے دعا کی درخواست کرنے والے کی دو قسمیں ہیں: ایک اس کا سوال اس حیثیت سے ہو کہ اس کو اس کے ساتھ کوئی کام ہو تو وہ ایسے ہی ہے جیسے غیر موجود سے کہے کہ وہ اس کا کام کر دے۔ اور دوسری قسم یہ ہے کہ وہ اس سے اس حیثیت سے دعا کی درخواست کرے کہ دعا کرنے والے کو بھی اس دعا سے فائدہ ہو اور اس کو بھی فائدہ ہو، یہ اس دعا کے ساتھ اس کی طرح ہے جو مخلوق سے طلب کرتا ہے۔'' صحیح مسلم، رقم الحديث (۲۷۳۲)

② علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد (۱۰/۱۶۲) میں کہا ہے کہ اسے امام طبرانی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے، اس کے رجال صحیح والے رجال ہیں سوائے ابن لہیعہ کے، جب کہ وہ بھی حسن الحدیث ہے۔ نیز دیکھیں: مسند أحمد (۵/۳۱۷)

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ۚ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ﴾ [بني إسرائيل: ٥٦، ٥٧]

''کہہ پکارو ان کو جنھیں تم نے اس کے سوا گمان کر رکھا ہے، پس وہ نہ تو تم سے تکلیف دور کرنے کے مالک ہیں اور نہ بدلنے کے۔ وہ لوگ جنھیں یہ پکارتے ہیں، وہ (خود) اپنے رب کی طرف وسیلہ ڈھونڈتے ہیں، جو ان میں سے زیادہ قریب ہیں اور اس کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ بے شک تیرے رب کا عذاب وہ ہے جس سے ہمیشہ ڈرا جاتا ہے۔''

سلف کی ایک جماعت کا کہنا ہے: کچھ لوگ فرشتوں اور انبیاء علیہم السلام کو پکارا کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے کہا: یہ جن کو تم پکارتے ہو یہ بھی میرے ہی بندے ہیں، جس طرح تم میرے بندے ہو۔ وہ بھی میری رحمت کی اسی طرح امید رکھتے ہیں جس طرح تم رکھتے ہو۔ وہ بھی میرے عذاب سے اسی طرح ڈرتے ہیں جس طرح تم ڈرتے ہو اور وہ اسی طرح میرا قرب چاہتے ہیں جس طرح تم چاہتے ہو، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں اور انبیاء علیہم السلام کو پکارنے سے منع کر دیا حالانکہ اس نے ہمیں بتایا کہ فرشتے ہمارے لیے دعا کرتے اور مغفرت طلب کرتے ہیں، اس کے باوجود ہمارے لیے ان سے یہ مانگنا جائز نہیں۔

ایسے ہی انبیاء اور نیک لوگ ہیں، گو وہ اپنی قبروں میں زندہ ہوں،[1] اگر یہ فرض کیا جائے کہ وہ زندوں کے لیے دعا کرتے ہیں، خواہ اس کے آثار بھی وارد ہوں پھر بھی ان سے مانگنا جائز نہیں۔ سلف صالحین میں سے کسی ایک نے بھی ایسا نہیں کیا، کیوں کہ یہ ان کو شریک بنانے اور اللہ کے سوا ان کی عبادت کا ذریعہ ہے، لیکن ان میں سے کسی ایک کی زندگی میں درخواست کرنے کے برعکس، یہ شرک کا باعث نہیں بنتا، نیز اس وجہ سے بھی کہ فرشتے، انبیا اور نیک لوگ موت کے بعد جو کرتے ہیں، وہ امر کونی (ایسا حکم جو امرِ الٰہی کے ساتھ رونما ہوتا ہو اور شرعی امر نہ ہو) کے ساتھ ہوتا ہے جس میں مانگنے والوں کی مانگ اثر انداز نہیں ہوتی۔ ان کی زندگی میں ان سے سوال اور درخواست کرنے کے برخلاف، کیوں کہ زندگی میں سائل کو جواب دینا شرعی امر ہے اور موت کے بعد ان سے شرعی احکام ساقط ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

---

[1] یہ برزخی زندگی مراد ہے جو دنیوی حیات سے یکسر مختلف ہے۔

﴿ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴾

[آل عمران: ۷۹، ۸۰]

''کسی بشر کا کبھی حق نہیں کہ اللہ اسے کتاب اور حکم اور نبوت دے، پھر وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ اور لیکن رب والے بنو، اس لیے کہ تم کتاب سکھایا کرتے تھے اور اس لیے کہ تم پڑھا کرتے تھے۔ اور نہ یہ (حق ہے) کہ تمھیں حکم دے کہ فرشتوں اور نبیوں کو رب بنا لو، کیا وہ تمھیں کفر کا حکم دے گا، اس کے بعد کہ تم مسلم ہو۔''

لٰہذا اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے کہ جو فرشتوں اور نبیوں کو ایسا بناتا ہے وہ کافر ہے، ارشاد ہے:

﴿ قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ۝ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ؕ ﴾ [سبا: ۲۲، ۲۳]

''کہہ دے پکارو ان کو جنھیں تم نے اللہ کے سوا گمان کر رکھا ہے، وہ نہ آسمانوں میں ذرہ برابر کے مالک ہیں اور نہ زمین میں اور نہ ان کا ان دونوں میں کوئی حصہ ہے اور نہ ان میں سے کوئی اس کا مددگار ہے۔ اور نہ سفارش اس کے ہاں نفع دیتی ہے مگر جس کے لیے وہ اجازت دے''

﴿ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ﴾ [البقرة: ۲۵۵]

''کون ہے وہ جو اس کے پاس اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرے۔''

﴿ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ﴾ [یونس: ۳]

''کوئی سفارش کرنے والا نہیں مگر اس کی اجازت کے بعد''

﴿ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ ﴾ [السجدة: ٤]

''اس کے سوا تمھارا نہ کوئی دوست ہے اور نہ کوئی سفارش کرنے والا۔''

﴿ وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾

[یونس: ۱۸]

''اور وہ اللہ کے سوا ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ انھیں نقصان پہنچاتی ہیں اور نہ انھیں نفع دیتی ہیں

اور کہتے ہیں یہ لوگ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ کہہ دے کیا تم اللہ کو اس چیز کی خبر دیتے ہو جسے وہ نہ آسمانوں میں جانتا ہے اور نہ زمین میں؟ وہ پاک ہے اور بہت بلند ہے اس سے جو وہ شریک بناتے ہیں۔''

سورت یٰسین میں مذکور بزرگ کے بارے میں فرمایا:

﴿ وَمَا لِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿22﴾ ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ ﴿23﴾ اِنِّيْٓ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿24﴾ اِنِّيْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ ﴾ [یٰسٓ: ۲۲۔۲۵]

''اور مجھے کیا ہے کہ میں اس کی عبادت نہ کروں جس نے مجھے پیدا کیا اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ کیا میں اس کے سوا ایسے معبود بنا لوں کہ اگر رحمان میرے بارے میں کسی نقصان کا ارادہ کرے تو ان کی سفارش میرے کسی کام نہ آئے گی اور نہ وہ مجھے بچائیں گے۔ یقیناً میں تو اس وقت ضرور کھلی گمراہی میں ہوں گا۔ بے شک میں تمھارے رب پر ایمان لایا ہوں، سو مجھ سے سنو۔''

﴿ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ﴾ [سبا: ۲۳]

''اور نہ سفارش اس کے ہاں نفع دیتی ہے مگر جس کے لیے وہ اجازت دے۔''

﴿ يَوْمَىِٕذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا ﴾ [طٰهٰ: ۱۰۹]

''اس دن سفارش نفع نہ دے گی مگر جس کے لیے رحمان اجازت دے اور جس کے لیے وہ بات کرنا پسند فرمائے۔''

﴿ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ۲۸]

''اور وہ سفارش نہیں کرتے مگر اسی کے لیے جسے وہ پسند کرے اور وہ اسی کے خوف سے ڈرنے والے ہیں۔''

شفاعت کی دو اقسام ہیں:

پہلی: وہ شفاعت جس کی اللہ تعالیٰ نے نفی کی ہے، مثلاً: وہ شفاعت جس کو مشرکوں اور اس امت میں ان کے ہم نوا جاہلوں اور گمراہوں نے ثابت کیا ہے اور یہ شرک ہے۔

دوسری: یہ ہے کہ سفارش کرنے والا اللہ تعالیٰ کی اجازت سے سفارش کرے۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کے لیے ثابت کی ہے۔

اس لیے قیامت کے روز جب اللہ کی مخلوق سید الشفعاء سے شفاعت کی درخواست کرے گی تو وہ آئیں گے اور سجدہ ریز ہو جائیں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہے:

”تو میں اپنے رب کی ایسی تعریفیں کروں گا جو اس وقت مجھ پر وا ہوں گی، میں اب ان کو اچھی طرح نہیں جانتا۔ کہا جائے گا، اے محمد! اپنا سر اٹھایئے اور کہیے، آپ کی بات سنی جائے گی، مانگیے، آپ کو دیا جائے گا، سفارش کیجیے آپ کی سفارش قبول کی جائے گی۔“ [1]

جب اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو شفاعت کی اجازت دے گا اس وقت آپ اس کے لیے شفاعت کریں گے جس کے لیے اللہ چاہے گا کہ اس کی سفارش کی جائے۔

اس موقف کو اختیار کرنے والوں کا کہنا ہے: آپ کو وسیلہ بنانے (اس معنی میں کہ آپ وسیلہ بنانے والے کے لیے دعا کریں) اور آپ سے شفاعت طلب کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ توسل آپ کی غیر موجودگی اور آپ کی وفات کے بعد بھی جائز ہے، کیوں کہ اس حالت میں آپ نے وسیلہ بنانے والے کے لیے دعا نہیں کی، بلکہ آپ کو وسیلہ بنانے والے نے آپ کی قسم دی ہے۔ یا آپ کی ذات کا واسطہ دے کر سوال کیا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان دونوں امور میں فرق کیا ہے، کیوں کہ آپ ﷺ اپنی زندگی میں اس کے لیے دعا کرتے تھے جو آپ ﷺ کو وسیلہ بناتا تھا اور آپ کا اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا مخلوق کی افضل دعا ہے، کیوں کہ آپ ساری مخلوق سے افضل اور اللہ کے ہاں سب سے زیادہ معزز ہیں، چنانچہ ثابت ہوا کہ آپ ﷺ نے جس شخص کے لیے دعا اور سفارش کی وہ مخلوق کی مخلوق کے لیے سب سے بہتر اور افضل دعا ہے، تو اس پر اس کو کس طرح قیاس کیا جا سکتا ہے جس کے لیے رسول نے دعا اور سفارش نہیں کی؟ جس نے اس شخص کو جس کے لیے رسول نے دعا کی اور جس کے لیے رسول نے دعا نہیں کی، دونوں کو ایک ہی پلڑے میں رکھا اور اس کے توسل کو اس کے توسل کے مانند قرار دیا، وہ گمراہ ترین انسان ہے۔

نیز آپ ﷺ سے دعا کی درخواست کرنے، آپ کے دعا کرنے اور آپ کی دعا کو وسیلہ بنانے میں کوئی نقصان نہیں، بلکہ وہ شر سے خالی خیر ہی خیر ہے، اس میں کوئی ممنوع امر ہے نہ کوئی مفسدت۔ کسی بھی نبی کی اس کی زندگی اور موجودگی میں عبادت نہیں کی گئی، وہ اپنی عبادت کرنے والے اور شریک بنانے والے کو منع کرتا، خواہ وہ شرکِ اصغر ہی ہوتا، جس طرح نبی اکرم ﷺ نے اس شخص کو اپنے لیے سجدہ کرنے سے منع کیا جس نے آپ کو سجدہ کیا تھا، [1] نیز آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَا تَقُولُوا: مَا شَاءَ اللّٰهُ وَشَاءَ مُحَمَّدٌ، وَلٰكِنْ قُولُوا: مَا شَاءَ اللّٰهُ ثُمَّ مَا شَاءَ مُحَمَّدٌ» [3]

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٧٠٧٢) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٩٣)

[2] سنن أبي داود، رقم الحدیث (٢١٤٠) سنن الترمذي، رقم الحدیث (١١٥٩) صحیح الجامع (٥١٧٠، ٥١٧١)

[3] سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٢١١٨) سنن الدارمي، رقم الحدیث (٣٨٢/٢) مسند أحمد (٧٢/٥، ٣٩٣) الصحیحة (١٣٨)

''یہ نہ کہو جو اللہ اور محمد چاہے، بلکہ کہو جو اللہ چاہے، پھر محمد چاہے۔''

اور اس طرح کے دیگر فرامین ہیں۔ لیکن اپنی وفات کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدشہ تھا کہ لوگ فتنے میں مبتلا ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شریک بنانا نہ شروع کر دیں، جس طرح حضرت عیسیٰ، حضرت عزیر علیہما السلام اور ان کے علاوہ دوسروں کو ان کی قبروں پر اللہ کا شریک بنایا گیا، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مجھے اس طرح نہ بڑھاؤ جس طرح عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ بن مریم کو بڑھایا، میں تو صرف بندہ ہوں، اس لیے کہو: عَبدُ اللہ وَرَسُولہ (اللہ کا بندہ اور اس کا رسول)۔''[1]

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اَللّٰھُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِيْ وَثَنًا یُّعْبَدُ»[2]

''اے اللہ! میری قبر کو بت نہ بننے دینا، جس کی پوجا کی جائے۔''

ایک دوسرے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لَعَنَ اللّٰہُ الْیَھُوْدَ وَالنَّصَارٰی اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ أَنْبِیَائِھِمْ مَسَاجِدَ»[3]

''اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے، کیوں کہ انھوں نے اپنے انبیا کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے افعال سے خبردار کیا۔ بالجملہ ہمارے پاس دو عظیم الشان قاعدے ہیں۔ ایک، ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔ دوسرا: اللہ تعالیٰ کی عبادت صرف اس طریقے کے مطابق کریں جو اس نے جائز قرار دیا ہے اور کسی خود ساختہ عبادت کے ساتھ بندگی نہ کریں۔ یہ دونوں عظیم الشان قاعدے ہی ''لا إله إلا الله، محمد رسول الله'' کے اقرار و شہادت کی حقیقی اور عملی تفسیر ہیں، جس طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ﴾ [الملك: ٢]

''تاکہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں زیادہ اچھا ہے۔''

حضرت فضیل بن عیاض کا قول ہے: خالص ترین اور درست ترین۔ لوگوں نے پوچھا: اے ابوعلی! اس کا کیا مطلب ہوا؟ انھوں نے جواب دیا: ''عمل اگر خالص ہو لیکن درست نہ ہو تو قبول نہیں کیا جاتا اور اگر درست ہو لیکن خالص نہ ہو تو پھر بھی اس وقت تک قبول نہیں کیا جاتا جب تک خالص اور درست نہ ہو۔ خالص کا مطلب ہے کہ وہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣٦١)

[2] الموطأ (١٧٢/١) مسند أحمد (٢٤٦/٢) شیخ البانی رحمہ اللہ نے تلخيص أحكام الجنائز (ص: ٨٨) میں اسے صحیح کہا ہے۔

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٢٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢٩)

صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہو اور درست کا مطلب ہے کہ وہ سنت کے مطابق ہو۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان:

﴿ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴾ [الکهف: ١١٠]

''پس جو شخص اپنے رب کی ملاقات کی امید رکھتا ہو تو لازم ہے کہ وہ عمل کرے نیک عمل اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے۔'' کا یہی حقیقی معنی ہے۔

امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اپنی دعا میں کہا کرتے تھے: ''اللهم اجعل عملي كله صالحا، واجعله لوجهك خالصا، ولا تجعل لأحد فيه شيئا'' ''اے اللہ! میرے سارے عملوں کو صالح بنا، ان کو خالص اپنی رضا کے لیے کر اور ان میں کسی دوسرے کے لیے کچھ نہ رکھ۔'' اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ﴾ [الشوریٰ: ٢١]

''یا ان کے لیے کچھ ایسے شریک ہیں جنھوں نے ان کے لیے دین کا وہ طریقہ مقرر کیا ہے جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی۔''

صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَنْ أَحْدَثَ فِيْ أَمْرِنَا هَذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ »[1]

''جس نے ہمارے امرِ (دین) میں وہ پیدا کیا جو اس میں نہیں ہے تو وہ مردود ہے۔''

صحیح بخاری میں ایک روایت کے یہ الفاظ ہیں:

« مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ »[2]

''جس نے کوئی ایسا عمل کیا جس پر ہمارا حکم نہیں تو وہ مردود ہے۔''

صحیح وغیرہ میں یہ حدیثِ قدسی بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

« أَنَا أَغْنَى الشُّرَكَاءِ عَنِ الشِّرْكِ، مَنْ عَمِلَ عَمَلًا أَشْرَكَ فِيْهِ مَعِيَ غَيْرِيْ فَأَنَا مِنْهُ بَرِيْءٌ وَهُوَ كُلُّهُ لِلَّذِيْ أَشْرَكَ »[3]

''میں شریکوں کے شرک سے بے نیاز ہوں، جس نے کوئی ایسا عمل کیا، جس میں میرے علاوہ کسی دوسرے کو شریک کیا تو میں اس سے بری ہوں، وہ سارا اسی کے لیے ہے، جسے اس نے شریک بنایا۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٥٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧١٨)

[2] صحيح البخاري (٢/٧٥٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧١٨)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٨٥)

اسی لیے فقہا کہتے ہیں: عبادات کی بنیاد توقیفی ہے، چنانچہ صحیحین میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے حجرِ اسود کو بوسہ دیا اور کہا:

"وَاللّٰهِ إِنِّي لَأَعْلَمُ أَنَّكَ حَجَر لَا تَضُرُّ وَلَا تَنْفَعُ، وَلَوْ لَا أَنِّي رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ يُقَبِّلُكَ مَا قَبَّلْتُكَ" [1]

''اللہ کی قسم! میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے، تو نہ نقصان پہنچا سکتا ہے نہ نفع۔ اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو تجھے کبھی بوسہ نہ دیتا۔''

اللہ تعالیٰ نے ہم کو حکم دیا ہے کہ اس کے رسول کی اتباع اور اطاعت کریں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت اور موالات رکھیں۔ اللہ اور اس کا رسول ہم کو ہر چیز سے محبوب ہونا چاہیے، اس نے ہمیں ضمانت دی ہے کہ اگر ہم اس کے رسول کے ساتھ محبت رکھیں گے اور اس کی اطاعت کریں گے تو وہ بھی ہمارے ساتھ محبت رکھے گا اور ہمیں عزت دے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ﴾ [آل عمران: ۳۱]

''کہہ دے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَإِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ﴾ [النور: ٥٤] ''اور اگر اس کا حکم مانو گے تو ہدایت پا جاؤ گے۔''

دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴾ [النساء: ۱۳]

''اور جو اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانے وہ اسے جنتوں میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان میں ہمیشہ رہنے والے اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔''

قرآنِ کریم میں اس جیسی آیات بہت زیادہ ہیں۔ کسی مسلمان کو زیبا نہیں کہ وہ اس مسئلے میں سنت، شریعت، کتاب و سنت کے مدلول اور سلف صالحین کے موقف کے دائرے سے باہر قدم رکھے۔ جس امر کا اسے علم ہو اس کا قائل ہو، جو نہ جانتا ہو اس سے رک جائے، اس چیز کا پیچھا نہ کرے جس کا اس کو علم نہیں، وہ بات اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہ کرے جو جانتا نہیں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سب حرام قرار دیا ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٥٣٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٧٠)

احادیثِ نبویہ میں اس وسیلے کا ذکر موجود ہے جس کے ذریعے آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے مانگا، جیسے آپ ﷺ کا یہ قول:

«اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ بِأَنَّ لَكَ الْحَمْدُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ الْمَنَّانُ، بَدِيْعُ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ، يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ، يَا حَيُّ، يَا قَيُّوْمُ » (أبو داود وغيره)[1]

''اے اللہ! میں تجھ سے اس بات کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں کہ تمام تر تعریفات تیرے ہی لیے ہیں، تیرے سوا کوئی معبودِ حقیقی نہیں، تو منان (بہت زیادہ احسان کرنے والا) ہے، زمین و آسمان کا موجد ہے، اے عزت و جلال کے مالک، اے زندہ و قائم و دائم!''

ایک دوسری حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں:

«اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ بأني أشهد أَنَّكَ أَنْتَ اللّٰهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ الْأَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِيْ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ، وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا أَحَدٌ » (أبو داود، نسائي، ابن ماجه)[2]

''اے اللہ! میں تجھ سے اس بات کا واسطہ دے کر مانگتا ہوں کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ تو اللہ ہے۔ تیرے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں تو احد اور صمد ہے، جس نے کسی کو نہیں جنا اور جو نہ خود جنا گیا اور کوئی اس کے برابر نہیں ہے۔''

علما کا اتفاق ہے کہ اللہ کے سوا کسی دوسرے کے نام پر کھائی جانے والی قسم منعقد نہیں ہوتی، یعنی مخلوقات کی قسم کھانا۔ اگر کوئی شخص کعبہ، فرشتوں نبیوں یا کسی عالم یا کسی بادشاہ کی قسم کھائے تو ایسی قسم نافذ نہیں ہوتی نہ یہ مشروع اور جائز ہی ہے، بلکہ ممنوع ہے اور ممنوع بھی تحریمی ہے یا تنزیہی، اس میں علما کے دو اقوال ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ یہ ممنوع تحریمی ہے۔

صحیح (بخاری) میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ كَانَ حَالِفاً فَلْيَحْلِفْ بِاللّٰهِ أَوْ لِيَصْمُتْ »[3]

''جو قسم کھانے والا ہو تو اللہ کی قسم کھائے یا خاموش رہے۔''

ترمذی میں ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٩٥) سنن النسائي، رقم الحديث (١٣٠٠) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٩٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٤٧٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٨٥٧) صحيح الترغيب والترهيب (١٣٠/٢)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٣٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٤٦)

«مَنْ حَلَفَ بِغَيْرِ اللّٰهِ فَقَدْ أَشْرَكَ »[1]

''جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی تو یقیناً اس نے شرک کیا۔''

یہ قول کہ نبی کے نام پر کھائی جانے والی قسم واقع ہو جاتی ہے، اصلاً ضعیف اور شاذ ہے۔ ہمارے علم کے مطابق یہ کسی بھی عالم کا قول نہیں۔ جمہور ائمہ جیسے مالک، شافعی، ابو حنیفہ اور احمد رحمہم اللہ سے منقول ایک روایت کے مطابق، یہی مذہب ہے اور یہی صحیح ہے۔

اسی طرح مخلوقات سے پناہ طلب کرنے کا مسئلہ ہے پناہ صرف خالق سے اس کے اسما و صفات کے ذریعے سے طلب کی جاتی ہے۔ اسی لیے امام احمد وغیرہ نے قرآنِ کریم کے غیر مخلوق ہونے کے دلائل میں یہ فرمانِ مصطفیٰ بھی پیش کیا: « أَعُوذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ »[2] ''میں اللہ تعالیٰ کے کامل کلمات کی پناہ میں آتا ہوں۔'' اور کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ذریعے سے پناہ طلب کی ہے اور پناہ مخلوق سے طلب نہیں کی جاتی۔ صحیح میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے: « لا بأس بالرقي ما لم تكن شركا »[3] ''دم اگر شرکیہ کلمات پر مشتمل نہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔'' بنا بریں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دم سے منع کیا جس میں شرک ہو، جیسے وہ الفاظ جن میں جنوں سے پناہ طلب کرنے کا ذکر ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ﴾ [الجن: ٦]

''اور یہ کہ بلاشبہہ بات یہ ہے کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں سے بعض لوگوں کی پناہ پکڑتے تھے تو انھوں نے ان (جنوں) کو سرکشی میں زیادہ کر دیا۔''

اسی لیے علمائے کرام نے اس قسم دینے اور جھاڑ پھونک سے منع کیا ہے جو مرگی زدہ شخص پر کیا جاتا ہے اور شرک پر مشتمل ہوتا ہے، بلکہ انھوں نے اسی خدشے کے پیشِ نظر کہ مبادا اس میں شرک ہو ایسی جھاڑ پھونک سے بھی منع کیا ہے جس کے معنی معلوم نہ ہو سکیں۔ اس کے برخلاف شرعی دم جائز ہے، لہٰذا جب اللہ کے سوا کسی کی قسم کھانا یا قسم دینا مطلقاً ناجائز ہے تو اللہ کے سوا کسی اور سے پناہ بھی طلب نہیں کی جا سکتی۔

جو اللہ تعالیٰ سے کسی دوسرے کے واسطے سے سوال کرتا ہے، وہ یا تو اللہ تعالیٰ کو اس کی قسم دیتا ہے یا اس سبب کی وجہ سے مانگتا ہے۔ جس طرح تین لوگوں نے غار میں اپنے اپنے عمل کو وسیلہ بنایا اور جس طرح انبیائے کرام اور

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٥١) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥٣٥) مسند أحمد (٤٧/١) السلسلة الصحيحة (٢٠٤٢)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٠٨)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٠٠)

نیک لوگوں کی دعا کو وسیلہ بنایا جاتا ہے۔ چنانچہ اگر اللہ کو غیر اللہ کی قسم دی جائے تو یہ جائز نہیں ہوگا۔

ہاں اگر کسی ایسے سبب کے ذریعے سے سوال ہو جو حصولِ مطلوب کا تقاضا کرتا ہو، جیسے ان اعمال کے ذریعے سوال کرنا جن میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ہو، مثلاً: رسول پر ایمان اور رسول کی محبت و دوستی کے ذریعے سوال کرنا، تو یہ جائز ہے، لیکن اگر انبیاے کرام اور نیک لوگوں کی محض ذات کے واسطے سے سوال ہو تو یہ ناجائز ہے۔ کئی ایک علما نے اس سے منع کیا ہے اور اس کو ناجائز کہا ہے، کچھ نے اس میں رخصت بھی دی ہے، لیکن پہلا موقف ہی زیادہ راجح ہے جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔ یہ ایسے سبب کے وسیلے سے سوال کرنا ہے جو حصولِ مطلوب کا تقاضا نہیں کرتا، اس شخص کے برخلاف جو ایسے سبب کے ذریعے سے سوال کرتا ہے جو حصولِ مقصد کا مقتضی ہو، جیسے نیک لوگوں کی دعا اور نیک اعمال کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ سے مانگنا، کیوں کہ نیک لوگوں کی دعا جو وہ کریں، ہمارے مقصد کے حصول کا سبب ہے، ایسے ہی نیک اعمال بھی اللہ تعالیٰ سے ثواب حاصل کرنے کے لیے ہمارا ذریعہ ہیں، لہٰذا جب ہم ان کی دعا اور اپنے نیک اعمال کے وسیلے سے سوال کرتے ہیں تو ہم اللہ تعالیٰ کی جناب میں وسیلہ بناتے ہیں، جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ ﴾ [المائدة: ٣٥]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو اور اس کی طرف قرب تلاش کرو۔''

اور وسیلے سے مراد نیک اعمال ہیں۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ ﴾ [بني إسرائيل: ٥٧]

''وہ لوگ جنھیں یہ پکارتے ہیں، وہ (خود) اپنے رب کی طرف وسیلہ ڈھونڈتے ہیں۔''

اگر ہم اللہ کے حضور نہ انبیا اور نیک لوگوں کی دعا کو وسیلہ بنائیں اور نہ اپنے نیک اعمال ہی کو، بلکہ ان کی ذات کو وسیلہ بنائیں، جو ہماری دعاؤں کی قبولیت کا تقاضا کرنے والا سبب نہیں تو ایسی صورت میں ہم صحیح وسیلے کو وسیلہ بنانے والے نہیں ہوں گے، اس لیے یہ نبی اکرم ﷺ سے صحیح منقول ہے اور نہ سلف صالحین ہی سے مشہور ہے۔

"منسك المروذی" میں امام احمد رحمہ اللہ سے ایک دعا منقول ہے، جس میں نبی اکرم ﷺ کو وسیلہ بنانے کا ذکر ہے۔ اس کو نبی اکرم ﷺ کی قسم کھانے کے جواز کے بارے میں امام احمد رحمہ اللہ سے منقول ایک روایت پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اکثر علما دونوں صورتوں میں ممانعت کا موقف رکھتے ہیں (یعنی آپ ﷺ کی قسم کھانے اور آپ کی ذات کو وسیلہ بنانے کی صورتوں میں)۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں انبیا کا مرتبہ بہت بلند ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام

کے حق میں فرمایا ہے اور اس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے جو درجات اور مراتب ہیں ان کا فائدہ انہی کو ہوگا، ہم اس سے ان کی اتباع کر کے اور ان کے ساتھ محبت رکھ کر ہی مستفید ہو سکتے ہیں، لہٰذا اگر ہم اللہ تعالیٰ کے حضور اس کے نبی پر ایمان، اس کی محبت و دوستی اور سنتوں کی پیروی کا وسیلہ پیش کریں تو یہ سب سے عظیم وسیلہ ہے، لیکن نبی پر ایمان اور نبی کی اطاعت کے وسیلے کے بغیر محض نبی کی ذات کو وسیلہ بنانا صحیح وسیلہ نہیں ہو سکتا، کیوں کہ جو مخلوق کو وسیلہ بناتا ہے، اگر وہ جس کو وسیلہ بنا رہا ہے اس پر ایمان اور اس کی اطاعت کو وسیلہ نہیں بناتا تو پھر وہ کس چیز کو وسیلہ بناتا ہے؟ کیوں کہ انسان جب کسی وسیلے سے کسی کے قریب ہونا چاہتا ہے تو اس وسیلے سے یا تو وہ اس کے پاس سفارش کروانا چاہتا ہے، مثلاً: کسی آدمی کے باپ کے دوست سے یا کسی ایسے شخص سے جس کی وہ عزت کرتا ہو کہا جائے: میری اس کے پاس سفارش کرنا، یہ جائز ہے۔ یا اس کو اس کی قسم دیتا ہے، مثلاً یہ کہے: تیرے فلاں بیٹے کی زندگی کی قسم یا یہ کہے: تیرے باپ کی قبر کی مٹی کی قسم، فلاں پیر صاحب کی عزت کی قسم وغیرہ۔ لیکن نہ اللہ تعالیٰ کو مخلوق کی قسم دینا جائز ہے اور نہ مخلوق کو مخلوق ہی کی قسم دینا۔

یا وہ ایسے سبب کے وسیلے سے سوال کرتا ہے جو مطلوب کے حصول کا تقاضا کرتا ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ﴾ [النساء: ۱]

''اور اللہ سے ڈرو جس کے واسطے سے تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور رشتوں سے بھی۔''

اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ لہٰذا واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو غیر اللہ کی قسم دینا جائز نہیں اور مخلوق کی قسم کھانا بھی اصلاً ناجائز ہی ہے، لیکن جس کو سفارش کی اجازت ہو اس کی سفارش کو وسیلہ بنانا جائز ہے، اس اندھے شخص نے بھی رسول اللہ ﷺ سے دعا ہی کی درخواست کی تھی، جس طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ سے استسقا کے لیے درخواست کیا کرتے تھے، دعا میں اس کا یہ کہنا: ''میں تیرے نبی محمد کے ذریعے سے جو نبیِ رحمت ہے، تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں۔'' یہ مطلب رکھتا ہے کہ میں آپ کی میرے لیے دعا اور شفاعت کے ذریعے سے۔ اس لیے حدیث کے آخری الفاظ یہ ہیں: ''اے اللہ! میرے حق میں ان کی شفاعت قبول فرما۔'' حدیث میں جو بات مذکور ہے، اس کے جواز پر اتفاق ہے، اس کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں جو اس وقت ہمارا موضوعِ سخن ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ﴾ جمہور کی قراءت میں لفظ ''أرحام'' کے آخر میں زبر ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ وہ صرف ایک اللہ تعالیٰ کے واسطے سے سوال کرتے ہیں، رِشتے داری کے وسیلے سے نہیں اور ان کا اللہ تعالیٰ کے واسطے سے ایک دوسرے سے سوال کرنا ایک دوسرے کو اللہ تعالیٰ کی قسم دینے پر مشتمل ہے۔

حفص کی قراءت کو بنیاد بناتے ہوئے سلف کے ایک گروہ کا کہنا ہے: اس سے مراد ان کا یہ کہنا ہے: ''میں اللہ کے واسطے سے اور رشتے داری کے واسطے سے تجھ سے سوال کرتا ہوں۔'' یہ ان کے سوال کے بارے میں بتایا جا رہا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اس کے جواز کی دلیل نہیں۔ اگر یہ اس کے جواز کی دلیل ہے تو اس وقت اس کے اس قول: ''میں تجھ سے رشتے داروں کے واسطے سے سوال کرتا ہوں۔'' کا مطلب یہ نہیں کہ رشتے داری کی قسم دیتا ہوں، (کیوں کہ یہاں قسم کھانا جائز نہیں) بلکہ یہ معنی ہے کہ رشتے داری کے سبب مانگتا ہوں، کیوں کہ قرابت داری ایک دوسرے پر بہت سے حقوق عائد کرتی ہے، جیسے غار میں پھنسے ہوئے تین لوگوں کا اللہ تعالیٰ سے اپنے نیک اعمال کے وسیلے سے سوال کرنا اور ہمارا نبی اکرم ﷺ کی دعا اور آپ ﷺ کی شفاعت کے وسیلے سے سوال کرنا۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی یہ بات بھی اس قبیل سے تعلق رکھتی ہے کہ ان کا بھتیجا عبداللہ بن جعفر جب ان کو حضرت جعفر کے حق کا واسطہ دے کر مانگتا تھا تو وہ اس کو دیتے تھے۔ یہ قسم دینے کے باب سے نہیں، بلکہ رشتے داری کے حق کے باب سے ہے، کیوں کہ جعفر کی قسم دینا تو بہت بڑا کام ہے اور اللہ تعالیٰ کا حق جعفر کے سبب واجب ہوا اور جعفر کا حق علی پر تھا۔

اسی باب سے نبی محترم ﷺ کی نماز پڑھنے کے لیے جاتے وقت یہ دعا بھی ہے جو حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ بِحَقِّ السَّائِلِيْنَ عَلَيْكَ، وَبِحَقِّ مَمْشَايَ هٰذَا فَإِنِّيْ لَمْ أَخْرُجْ أَشْراً وَّلَا بَطِراً وَّلَا رِيَاءً وَّلَا سُمْعَةً وَّلٰكِنْ خَرَجْتُ اِتِّقَاءَ سِخَطِكَ، وَابْتِغَاءَ مَرْضَاتِكَ، أَسْأَلُكَ أَنْ تُنْقِذَنِيْ مِنَ النَّارِ وَأَنْ تَغْفِرَلِيْ ذُنُوْبِيْ، فَإِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا أَنْتَ» (ابن ماجه)[1]

''اے اللہ! میں تجھ پر مانگنے والوں کے حق کے واسطے سے تجھ سے سوال کرتا ہوں، میرے اپنے اس چلنے کے حق کے واسطے سے، میں سرکشی کرتے ہوئے، تکبر کرتے ہوئے، ریا کاری اور شہرت کی طلب میں نہیں نکلا، لیکن تیرے غصے سے بچنے اور تیری رضا کے حصول کے لیے نکلا ہوں، میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ تو مجھے آگ سے بچا، میرے گناہ معاف کر دے، کیوں کہ تیرے سوا کوئی گناہ معاف نہیں کر سکتا۔''

اس حدیث کی سند میں عطیہ العوفی ہے اور اس میں کمزوری ہے۔ اگر یہ نبیِ کریم ﷺ کا کلام ہے تو یہ دو وجوہ کی بنا پر اس باب سے ہے: ایک اس وجہ سے کہ اس میں سائلوں کے حق اور اللہ تعالیٰ کی فرماں برادری میں چلنے

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٧٨) مسند أحمد (٢١/٣) اس کی سند میں ایک سے۔ زیادہ راوی ضعیف ہیں، لہٰذا یہ روایت ضعیف ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة (٢٤)

والوں کے حق کے واسطے سے اس سے مانگنا ہے۔ سوال کرنے والوں کا حق یہ ہے کہ وہ ان کو جواب دے اور چلنے والوں کا حق یہ ہے کہ ان کو ثواب دے۔ یہ وہ حق ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے لازم قرار دیا ہے، لیکن مخلوق کو کوئی اختیار حاصل نہیں کہ وہ کسی چیز کو اللہ تعالیٰ پر لازم کرے۔ اسی باب سے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی ہے:

﴿ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ﴾ [الأنعام: ٥٤]

''تمھارے رب نے رحم کرنا اپنے آپ پر لازم کر لیا ہے۔''

اور یہ فرمان:

﴿ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [الروم: ٤٧] ''اور مومنوں کی مدد کرنا ہم پر لازم ہی تھا۔''

اور یہ فرمان بھی:

﴿ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ۭ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ ﴾ [التوبة: ١١١]

''یہ تورات اور انجیل اور قرآن میں اس کے ذمے پکا وعدہ ہے اور اللہ سے زیادہ اپنا وعدہ پورا کرنے والا کون ہے؟''

صحیح بخاری میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے:

« حَقُّ اللّٰهِ عَلٰى عِبَادِهِ أَنْ يَّعْبُدُوْهُ وَلَا يُشْرِكُوْا بِهِ شَيْئًا، وَحَقُّ الْعِبَادِ عَلَى اللّٰهِ، إِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ، أَنْ لَّا يُعَذِّبَهُمْ »[1]

''اللہ تعالیٰ کا اس کے بندوں پر حق ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو بھی شریک نہ ٹھہرائیں اور بندوں کا اللہ تعالیٰ پر یہ حق ہے کہ جب وہ یہ کریں تو وہ ان کو عذاب نہ دے۔''

صحیح میں حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے حدیث قدسی میں مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

« يَا عِبَادِيْ، إِنِّيْ حَرَّمْتُ الظُّلْمَ عَلٰى نَفْسِيْ، وَجَعَلْتُهُ بَيْنَكُمْ مُحَرَّمًا فَلَا تَظَالَمُوْا »[2]

''میرے بندو! میں نے اپنے نفس پر ظلم کو حرام قرار دیا ہے اور اس کو تمھارے درمیان بھی حرام قرار دیا ہے، اس لیے ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔''

اگر اللہ تعالیٰ سے سوال کرنے والوں اور اس کی عبادت کرنے والوں کا یہ حق ہے کہ وہ ان کی دعا قبول کرے اور ان کو ثواب دے تو یہ اللہ تعالیٰ کے افعال کے واسطے سے سوال کرنا ہے، جیسے درجِ ذیل دعا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٩١٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٠)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٧٧)

اس جیسے افعالِ الٰہی کے واسطے سے پناہ طلب کرنا:

«أَعُوذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ، وَبِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوبَتِكَ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنْكَ، لَا أُحْصِي ثَنَاءً عَلَيْكَ، أَنْتَ كَمَا أَثْنَيْتَ عَلَى نَفْسِكَ »[1]

''میں تیری رضا کے واسطے سے تیرے غصے سے اور تیری معافی کے وسیلے سے تیری سزا سے پناہ مانگتا ہوں اور میں تیرے ذریعے سے تجھ سے پناہ مانگتا ہوں، میں تیری تعریف کو احاطہ شمار میں نہیں لا سکتا، تو اسی طرح ہے جس طرح تو نے خود اپنی تعریف کی ہے۔''

چنانچہ اس کی معافی کے واسطے سے، جو اس کا فعل ہے، پناہ طلب کرنا، اس کے ثواب دینے کے واسطے سے سوال کرنے کی طرح ہی ہے اور ثواب دینا بھی اس کا فعل ہے۔

امام طبرانی رحمہ اللہ نے ''کتاب الدعاء'' میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''اے میرے بندے! یہ چار ہیں: ایک میرے لیے، ایک تیرے لیے، ایک میرے اور تیرے درمیان اور ایک تیرے اور میری مخلوق کے درمیان۔ جو میرے لیے ہے وہ یہ ہے کہ تو میری عبادت کر اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرا۔ جو تیرے لیے ہے وہ یہ ہے کہ میں تجھ کو اس وقت اس کا صلہ دوں گا، جب تجھے اس کی سخت ضرورت ہوگی۔ جو میرے اور تیرے درمیان ہے وہ تمھاری طرف سے دعا کرنا ہے اور میری طرف سے قبول کرنا۔ اور جو تیرے اور میری مخلوق کے درمیان ہے وہ یہ ہے کہ لوگوں سے وہی سلوک کر جو تجھے پسند ہے کہ وہ تجھ سے کریں۔''[2]

اس حدیث میں جو یہ تقسیم کی گئی ہے کہ ایک میرے لیے اور ایک تیرے لیے یہ اسی تقسیم کی طرح ہے، جس کا ذکر سورۃ فاتحہ کی حدیث میں ہوا ہے، اس اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

« قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِي نِصْفَيْنِ، نِصْفُهَا لِي، وَنِصْفُهَا لِعَبْدِي، وَلِعَبْدِي مَا سَأَلَ »[3]

''میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان آدھا آدھا تقسیم کر دیا ہے، ایک نصف میرے لیے

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٤٨٦)

[2] المعجم الکبیر (٦١٣٧) علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد (٥١/٥) میں لکھا ہے کہ اس کی اسناد میں حمید بن الربیع نامی ایک راوی ہے جسے کئی ایک اہلِ علم نے ثقہ کہا ہے، جبکہ وہ مدلس راوی ہے اور اس میں ضعف بھی ہے۔

[3] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٣٩٥)

اور دوسرا نصف میرے بندے کے لیے اور میرے بندے کے لیے وہ ہے جو اس نے مانگا۔‘‘

دونوں نصف حصوں کا فائدہ بندے ہی کو پہنچے گا اور اللہ تعالیٰ دونوں نصف حصوں کو پسند کرتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے کہ اس کی عبادت کی جائے۔ وہ بندے کو جو ہدایت اور اعانت عطا فرماتا ہے، وہ اس کا وسیلہ ہے، وہ اس کو اس لیے پسند کرتا ہے، کیوں کہ وہ اس کی عبادت کی راہ ہے۔ بندہ پہلے وہ طلب کرتا ہے جس کی اس کو ضرورت ہوتی ہے، وہ عبادت پر اعانت اور صراط مستقیم کی ہدایت کا محتاج ہے، اس طرح وہ عبادت تک پہنچ جاتا ہے۔ اس موضوع پر مزید گفتگو سے بات لمبی ہو جائے گی اور یہ اس کا موقع بھی نہیں، اگرچہ ہم موضوعِ سخن سے کچھ باہر نکل آئے ہیں۔

دوسری وجہ: اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا اور اس کے لیے عمل کرنا بندے کے مقصود کے حصول کا سبب ہے۔ یہ نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کی امت کے نیک لوگوں کی دعا کے توسل کی طرح ہی ہے۔ یہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ نبی اکرم ﷺ اور کسی نیک شخص کی دعا کا وسیلہ یا تو اس کی قسم دینا ہے یا اس کو سبب بنانا ہے۔ اگر آپ کا یہ کہنا: «بحق السائلین علیك» سوال کرنے والوں کے حق کی قسم دینا ہے تو اللہ تعالیٰ کو اس کے سوا کسی کی قسم دینا جائز نہیں اور اگر یہ سبب ہے تو یہ وہ سبب ہے جس کو خود اللہ تعالیٰ نے سبب قرار دیا ہے، یعنی اس کو پکارنا اور اس کی عبادت کرنا۔

یہ تمام ایک دوسرے سے ملتی جلتی صورتیں ہیں اور اس میں اسی سے دعا کرنے اور اپنا نیک عمل پیش کرنے کے علاوہ اس سے مخلوق کے واسطے سے سوال کرنے جیسی کوئی چیز نہیں۔

اگر سوال کرنے والا یہ کہے: ’’میں تجھ سے فرشتوں کے حق یا انبیا اور نیک لوگوں کے حق کے واسطے سے سوال کرتا ہوں۔‘‘ وہ اللہ کے علاوہ کسی دوسرے سے جب یہ نہیں کہتا کہ میں تجھ کو ان لوگوں کے حق کی قسم دیتا ہوں، اگر اس کے لیے اس حق کی قسم دینا جائز نہیں اور نہ وہ مخلوق کو اس قسم کی قسم دیتا ہے تو پھر خالق کو اس حق کی قسم کیوں دیتا ہے؟

اگر وہ اس حق کی قسم نہیں دیتا، بلکہ اس کو سبب بناتا ہے تو محض ان لوگوں کی ذات کوئی ایسا سبب نہیں جو اس کے مقصود کے حصول کو لازم قرار دے، اس کے لیے کسی اور سبب کا ہونا ضروری ہے، مثلاً: فرشتوں اور انبیا پر ایمان، یا ان کی طرف سے کوئی چیز، جیسے: ان کا دعا کرنا، لیکن اکثر لوگ اس کے عادی ہیں، جس طرح وہ ان کی قسم دینے کے عادی ہیں، بلکہ کچھ یہاں تک کہہ دیتے ہیں: اللہ پر تیرے حق کی قسم، اللہ پر اس بوڑھے کے حق کی قسم! اگر کہنے والا کہے: میں تجھ سے فلاں کے حق کے وسیلے سے یا اس کی جاہ کے وسیلے سے سوال کرتا ہوں، یعنی میں اس پر ایمان رکھنے اور اس کے ساتھ محبت کرنے کے واسطے سے تجھ سے سوال کرتا ہوں تو یہ سب سے عظیم وسیلہ ہے۔ کہا جاتا ہے: جس نے یہ معنی مراد لیا تو یہ صحیح معنی ہے، لیکن ان لوگوں کی غالب اکثریت کا یہ مقصود نہیں ہوتا۔

جس نے کہا: ’’میں تجھ پر اور تیرے رسول پر ایمان رکھنے کے واسطے سے تجھ سے سوال کرتا ہوں۔‘‘ یا یہ کہا:

''تیرے رسول پر ایمان اور اس کے ساتھ محبت رکھنے کے واسطے سے سوال کرتا ہوں۔'' اس نے وسیلے میں بڑا خوبصورت انداز اپنایا، جس طرح اللہ تعالیٰ مومنوں کی دعا میں ذکر کرتے ہیں:

﴿ رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَ تَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ﴾ [آل عمران: ۱۹۳]

''اے ہمارے رب! بے شک ہم نے ایک آواز دینے والے کو سنا، جو ایمان کے لیے آواز دے رہا تھا کہ اپنے رب پر ایمان لے آؤ تو ہم ایمان لے آئے، اے ہمارے رب! پس ہمیں ہمارے گناہ بخش دے اور ہم سے ہماری برائیاں دور کر دے اور ہمیں نیکوں کے ساتھ فوت کر۔''

﴿ اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴾ [آل عمران: ۱۶]

''جو کہتے ہیں اے ہمارے رب! بے شک ہم ایمان لے آئے، سو ہمیں ہمارے گناہ بخش دے اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔''

﴿ اِنَّهٗ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْ عِبَادِيْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴾ [المؤمنون: ۱۰۹]

''بے شک حقیقت ہے کہ میرے بندوں میں سے کچھ لوگ تھے جو کہتے تھے اے ہمارے رب! ہم ایمان لے آئے، سو تو ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر اور تو سب رحم کرنے والوں سے بہتر ہے۔''

﴿ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴾ [آل عمران: ۵۳]

''اے ہمارے رب! ہم اس پر ایمان لائے جو تو نے نازل فرمایا اور ہم رسول کے پیروکار بن گئے، سو تو ہمیں شہادت دینے والوں کے ساتھ لکھ لے۔''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے:

''اَللّٰهُمَّ أَمَرْتَنِيْ فَأَطَعْتُكَ، وَدَعَوْتَنِيْ فَأَجَبْتُكَ، وَهٰذَا سَحَرٌ فَاغْفِرْ لِيْ''

''اے اللہ! تم نے مجھے حکم دیا تو میں نے فرمانبرداری کی، تم نے مجھے دعوت دی تو میں نے قبول کی، یہ سحری کا وقت ہے، تو مجھے بخش دے۔''

تین لوگوں کو شدید بارش نے آ گھیرا۔ انھوں نے ایک غار میں پناہ لی۔ ایک چٹان گری اور غار کا منہ بند ہو گیا۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے اپنے اپنے نیک اعمال کے وسیلے سے دعا کی تو ان کو اس سے رہائی مل گئی۔ یہ حدیث صحیحین میں مذکور ہے۔[1]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۲۲۰۸) صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۷۴۳)

ابوبکر بن ابی الدنیا نے "خالد بن خراش العجلاني و إسماعيل بن إبراهيم، قالا: حدثنا صالح المري" کی سند سے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک واقعہ نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں: "ہم ایک انصاری کے گھر گئے۔ وہ شدید بیمار تھا۔ ہم ابھی وہیں تھے کہ اس کی روح قبض ہو گئی۔ ہم نے اس پر اس کا کپڑا ڈال دیا۔ اس کے سرہانے اس کی بوڑھی ماں بھی کھڑی تھی۔ ہمارا ایک ساتھی اس کی طرف متوجہ ہوا اور اس کو صبر کی تلقین کرنے لگا۔ اس نے پوچھا: کیوں، کیا میرا بیٹا فوت ہو چکا ہے؟ ہم نے کہا: ہاں۔ اس نے پوچھا: کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟ ہم نے کہا: ہاں۔ اس نے اپنے ہاتھ اللہ تعالیٰ کی طرف پھیلا دیے اور کہنے لگی: اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میں نے اسلام قبول کیا اور تیرے رسول کی طرف ہجرت کی، یہ امید کرتے ہوئے کہ تو مجھے ہر مصیبت سے چھٹکارا دے گا، لہٰذا آج مجھ پر یہ مصیبت نہ ڈال۔ راوی کہتا ہے: اس کے چہرے سے کپڑا ہٹا دیا گیا اور ہم اس کے ساتھ کھانا کھا کر اٹھے۔"[1]

ابونعیم کی کتاب "الحلیہ" میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت داود علیہ السلام نے کہا: "تجھ پر میرے آباء، ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کے حق کے واسطے سے۔" تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی بھیجی اور پوچھا: تیرے آبا کا مجھ پر کون سا حق ہے؟

یہ دلیل اگرچہ شرعی دلیلوں میں شامل نہیں، کیوں کہ اسرائیلی روایات سے تائید تو حاصل کی جا سکتی ہے، لیکن ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ یہی رائج ہے کہ جس طرح کسی زندہ سے ان کاموں میں درخواست کی جاتی ہے جو اس کے دائرۂ اختیار میں ہوتے ہیں، اسی طرح اس سے دعا کی درخواست بھی کی جاتی ہے۔

جہاں تک غیر موجود اور فوت شدہ مخلوق کا تعلق ہے تو اس سے کچھ بھی نہیں مانگا جا سکتا۔ اس معاملے کی تحقیق اس طرح ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وسیلہ بنانا اور آپ کے واسطے سے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا ایک ایسا لفظ ہے جو اصطلاحِ شرع کے مطابق مجمل اور مشترک ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زبان میں اس کا مطلب ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا اور شفاعت کی درخواست کرنا، چنانچہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اور شفاعت کو وسیلہ بناتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اور شفاعت اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے بڑا وسیلہ ہے۔

لیکن بہت سے لوگوں کی زبان میں اس کا مطلب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو وسیلہ بنا کر اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قسم دے کر اللہ تعالیٰ سے سوال کرنا ہے، جب کہ اللہ کو مخلوقات میں سے کسی چیز کی بھی قسم نہیں دی جا سکتی، بلکہ کسی حالت میں مخلوق کی قسم دینا جائز نہیں، لہٰذا یہ کہنا: اے پروردگار! میں تجھ کو فرشتوں کی، یا تیرے کعبے کی، یا تیرے نیک بندوں کی قسم دیتا ہوں، درست نہیں ہے۔ اسی طرح ان چیزوں کی قسم کھانا بھی جائز نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے ناموں اور اس کی صفتوں کی قسم کھائی جاتی ہے۔ اسی لیے سنت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اس کے ناموں اور صفتوں کا واسطہ دے کر مانگا

---

[1] مجابو الدعوة لابن أبي الدنيا (٤٤/١)

جائے، جس طرح احادیث میں مذکور ہے:

❁ «أَسْأَلُكَ بِأَنَّ لَكَ الْحَمْدُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ الْمَنَّانُ، بَدِيعُ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ، يَا ذَالْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ، يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ»[1]

❁ «أَسْأَلُكَ بِأَنَّكَ أَنْتَ اللّٰهُ، الْأَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِي لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ، وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا أَحَدٌ»[2]

❁ «أَسْئَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ هُوَ لَكَ سَمَّيْتَ بِهٖ نَفْسَكَ»[3]

وغیرہ وغیرہ۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کو اس کی مخلوق کی قسم اور واسطہ دے کر سوال کرنے کی دینِ اسلام میں کوئی اصلیت نہیں۔ ایسے ہی یہ الفاظِ دعا بھی:

«اللهم إني أسألك بمعاقد العز من عرشك، ومنتهى الرحمة من كتابك، وباسمك الأعظم، وجدك الأعلىٰ، وبكلماتك التَّامَّات»

''اے اللہ! میں تیرے عرش میں مقاماتِ عزت کے واسطے سے، تیری کتاب میں منتہائے رحمت، تیرے اسمِ اعظم، تیری بزرگی اور تیرے مکمل کلمات کے واسطے سے تجھ سے مانگتا ہوں۔''

باوجودیکہ اس تیسری دعا کے ساتھ دعا کرنے کے جواز میں علما کے دو اقوال ہیں۔ شیخ ابو الحسن قدوری نے اپنی کتاب ''شرح کرخی'' میں کہا ہے: ''بشر بن ولید نے کہا کہ میں نے ابو یوسف سے سنا، انھوں نے امام ابوحنیفہ سے نقل کیا: کسی کے لائق نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کو اس کے علاوہ کسی اور واسطے سے پکارے، میں یہ کہنا: ''بمعاقد العز من عرشك'' (تیرے عرش کے مقامات و اسبابِ عزت و عظمت کے واسطے۔) یا ''بحق خلقك'' (تیری مخلوق کے واسطے سے) کہنا بھی مکروہ سمجھتا ہوں۔

امام ابو یوسف کا قول ہے کہ ''معقد العزة من عرشه'' ''اللہ کے عرش کی عزت کا باعث اللہ تعالیٰ خود ہی ہے۔ اس لیے میں ان الفاظ کو مکروہ نہیں کہتا، لیکن یہ کہنا مکروہ سمجھتا ہوں: تیرے نبیوں اور رسولوں کے حق کا واسطہ، بیت اللہ اور مشعر الحرام کے حق کا واسطہ۔''

قدوری کا قول ہے: ''اس کی مخلوق کے واسطے سے سوال کرنا جائز نہیں، کیوں کہ مخلوق کا خالق پر کوئی حق نہیں،

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٩٥) سنن النسائي، رقم الحديث (١٣٠٠) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٩٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٤٧٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٨٥٧) صحيح الترغيب والترهيب (١٣٠/٢)

[3] مسند أحمد (٣٩١/١) صحيح ابن حبان (٢٥٣/٣، ٤٥٢) السلسلة الصحيحة (١٩٩)

لہٰذا بالاتفاق یہ کہنا جائز نہیں، چنانچہ امام ابو حنیفہ اور قاضی ابو یوسف وغیرہما کے قول کا یہ تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اس کے علاوہ کسی دوسرے کے واسطے سے سوال کرنا منع اور حرام ہے۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ پروردگارِ عالم اپنی مخلوق میں سے جس کی قسم کھانا چاہے کھا سکتا ہے اور ہم اس کو اس کے علاوہ کسی کی قسم نہیں دے سکتے تو یہ کیوں نہیں کہا جا سکتا کہ اس کو اس کی مخلوق کی قسم دینا جائز ہے اور مخلوق کو صرف خالق کی قسم دی جائے؟

اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کی اپنی مخلوقات کی قسم کھانا اپنی تعریف و مدح اور اپنی نشانیوں کے ذکر کے باب سے ہے، جبکہ ہم اگر کسی کو ایک کام کی ترغیب دلانے کے لیے، یا اس سے روکنے کے لیے، یا کسی خبر کی تصدیق یا تردید کے لیے مخلوق کی قسم کھائیں گے تو یہ شرک ہو گا۔

جس نے کسی دوسرے سے کہا: میں تجھ سے فلاں چیز کے واسطے سے سوال کرتا ہوں وہ یا قسم کھانے والا ہو گا اور اللہ کے سوا کسی دوسرے کی قسم کھانا جائز نہیں، اس صورت میں کفارہ قسم کھانے والے پر ہو گا اس پر نہیں جسے قسم دی گئی، جس طرح ائمہ وفقہا نے وضاحت کی ہے، اگر وہ قسم کھانے والا نہ ہو تو پھر یہ بات سوال کی قبیل سے ہو گی اور اس صورت میں دونوں میں سے کسی ایک پر بھی کفارہ نہیں ہو گا۔

چنانچہ واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے مخلوق کے واسطے سے مانگنے والا یا مخلوق کی قسم کھاتا ہے اور یہ جائز نہیں، یا اس کے واسطے سے سوال کرتا ہے اور اس کی تفصیل پیچھے گزر چکی ہے۔

اگر وہ کہے کہ اللہ کے واسطے ایسا کر دو (اور وہ نہ کرے) تو اس میں دونوں میں سے کسی پر کوئی کفارہ نہیں، لیکن اگر یہ کہے: میں تجھے اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ تم ضرور ایسا کرو گے، یا یہ کہے: اللہ کی قسم! تم ضرور یہ کرو گے، مگر وہ اس کی قسم پوری نہ کرے تو قسم کھانے والے پر کفارہ ادا کرنا لازم ہو جائے گا۔

سوال کے اسلوب میں دعا کرنا سوال کرنا ہی ہے، لیکن اگر کوئی اللہ تعالیٰ کو ان الفاظ میں قسم دے: اے پروردگار میں تجھے قسم دیتا ہوں کہ تم ایسا ضرور کرو گے جس طرح حضرت براء بن مالک رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کرتے تھے۔ صحیح میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«رُبَّ أَشْعَثَ أَغْبَرَ ذِي طِمْرَيْنِ مَدْفُوعٌ بِالْأَبْوَابِ، لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَأَبَرَّهُ» [1]

"کچھ ایسے پراگندہ بالوں والے، غبار آلود، دو پرانے کپڑوں کے مالک اور دروازوں سے دھتکار دیے جانے والے بھی ہوتے ہیں، اگر اللہ کی قسم کھائیں تو وہ اس کو پورا کر دے۔"

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٢٢)

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت انس بن نضر (رضی اللہ عنہ) نے کہا: ''اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے، ربیع کے اگلے دانت نہیں توڑے جائیں گے۔'' نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اے انس! کتاب اللہ قصاص کا تقاضا کرتی ہے۔'' لوگوں نے اس کو معاف کر دیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ مِنْ عِبَادِ اللّٰهِ مَنْ لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَأَبَرَّهُ» [1]

''اللہ کے کچھ ایسے بندے بھی ہوتے ہیں کہ اگر وہ اس کو قسم دے دیں تو وہ اس کو پورا کر دیتا ہے۔''

یہ درحقیقت کسی کو اللہ کی قسم کھا کر کوئی کام کرنے کا کہنے کی نوع سے ہے اور اس میں اللہ کو اللہ کی قسم دینا ہے، مخلوق کی قسم دینا نہیں۔

چنانچہ ان مسنون اور شرعی دعاؤں کے ذریعے دعا کرنی چاہیے جن کا کتاب وسنت میں ذکر ہوا ہے، اس کی فضیلت اور خوبی میں کوئی شک نہیں۔ یہی صراطِ مستقیم ہے، ان لوگوں کی راہ جن پر اس نے انعام کیا، یعنی انبیا، صدیقین، شہدا اور صالحین اور ان کا ساتھ کیا ہی اچھا ہے!

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ عام لوگ جو یہ حدیث ذکر کرتے ہیں کہ جب تمھیں کوئی حاجت ہو تو اللہ تعالیٰ سے میری جاہ کے واسطے سے سوال کرو۔ یہ باطل حدیث ہے۔ اسے کسی محدث نے ذکر نہیں کیا اور حدیث کی کسی کتاب میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ جائز اور شرعی امر یہ ہے کہ ہر دعا میں آپ ﷺ پر درود بھیجا جائے، اسی لیے علما جب استقا (بارش طلب کرنا) وغیرہ میں دعا کا ذکر کرتے ہیں تو وہ آپ پر درود کا ذکر بھی کرتے ہیں، لیکن انھوں نے اس جائز صورت میں بھی آپ ﷺ کو وسیلہ بنانے کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ اسی طرح کسی بھی عالم نے غیر اللہ کو پکارنے اور کسی بھی حال میں اللہ کے سوا کسی دوسرے سے مطلق مدد طلب کرنے کا ذکر نہیں کیا، اگرچہ ان دونوں صورتوں میں بہت فرق ہے۔ غیر اللہ کو پکارنا کفر ہے، اس لیے کسی بھی صحابی، تابعی اور امامِ علم سے فوت شدگان اور غیر موجود کو پکارنا، خواہ وہ نبی ہو یا غیر نبی، منقول نہیں، البتہ بعض غیر مجتہد متاخرین نے اس کا ذکر کیا ہے، لیکن اس قول کے برخلاف: ''أسألك بجاه نبينا، أو بحقه'' ''میں تجھ سے ہمارے نبی کی جاہ یا اس کے حق کے واسطے سے سوال کرتا ہوں'' یہ بعض متقدمین سے منقول ہے، لیکن یہ ان کے درمیان مشہور نہیں تھا، اس کے بارے میں ہمارے نبی کی کوئی حدیث یا سنت بھی منقول نہیں، بلکہ سنت اس کی ممانعت پر دلالت کرتی ہے، جس طرح امام ابو حنیفہ اور ابو یوسف رحمہما اللہ سے منقول ہے۔

میں نے فقیہ ابو محمد العز بن عبدالسلام کے فتاویٰ میں دیکھا ہے، انھوں نے کہا: اللہ تعالیٰ کی جناب میں اس کی مخلوق میں سے رسول اللہ ﷺ کے سوا کسی کو بھی وسیلہ بنانا جائز نہیں، بشرطیکہ نابینا والی حدیث صحیح ہو۔ وہ اس کی صحت

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٥٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٧٥)

سے آ گاہ نہیں تھے۔ نیز میں نے ابو حنیفہ اور ابو یوسف رحمہما اللہ وغیرہ سے منقول اقوال میں دیکھا ہے کہ انھوں نے کہا: اللہ تعالیٰ کو کسی بھی نبی کی قسم دینا جائز نہیں۔ میں نے امام احمد کے کلام کو دیکھا۔ وہ نبی اکرم ﷺ کے بارے میں ہے۔ لیکن اس کو ان سے منقول دو روایات میں سے ایک پر محمول کیا جا سکتا ہے، جو آپ ﷺ کی قسم کھانے کے جواز پر دلالت کرتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کو مخلوق کی قسم دینے کے باب سے تعلق نہیں رکھتی نہ اس کا رسول اللہ ﷺ کی ذات کو وسیلہ بنانے ہی سے کوئی تعلق ہے۔

جو لوگ دعا کی قبولیت کے لیے آپ ﷺ کی ذات کو وسیلہ بناتے ہیں، وہ اس حکم سے انحراف کر کے، جو ان کے لیے جائز قرار دیا گیا ہے اور ان کو اس کا حکم دیا گیا ہے، وہ ان کے لیے تمام امور سے زیادہ نفع آور بھی ہے، دوسرا کام کرتے ہیں جو اس طرح نہیں۔

آپ ﷺ پر درود بھیجنا دعا کی قبولیت کا سب سے بڑا وسیلہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم بھی دیا ہے۔ دعا کرتے وقت آپ ﷺ پر درود بھیجنا کتاب وسنت اور اجماعِ امت سے ثابت ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ إِنَّ اللَّهَ وَمَلَٰٓئِكَتَهُۥ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ ءَامَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴾

[الأحزاب ٥٦]

”بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر صلاۃ بھیجتے ہیں، اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اس پر صلاۃ بھیجو اور سلام بھیجو، خوب سلام بھیجنا۔“

صحیح بخاری میں آپ ﷺ کا یہ فرمان ہے:

«مَنْ صَلىٰ عَلَيَّ مَرَّةً صَلَى اللّٰهُ عَلَيْهِ عَشْراً»[1]

”جس نے مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجا، اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں کرے گا۔“

رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابی حضرت فضالہ بن عبید بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ایک آدمی کو اپنی نماز میں دعا کرتے ہوئے سنا تو آپ ﷺ نے فرمایا: «عَجلَ هَذَا» ”اس نے جلدی کی“ پھر آپ ﷺ نے اس کو بلایا اور اس سے یا کسی دوسرے سے کہا: «إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ فَلْيَبْدَأْ بِحَمْدِ رَبِّهِ، ثُمَّ يُصَلِّيْ عَلَى النَّبِيِّ ثُمَّ يَدْعُوْ بِمَا شَاءَ» ”جب تم میں سے کوئی شخص نماز پڑھے تو اپنے رب کی حمد سے ابتدا کرے، پھر نبی پر درود بھیجے، پھر اس کے بعد جو چاہے دعا کرے۔“ یہ حدیث مسند احمد، ابو داود، ترمذی اور نسائی میں ہے اور امام ترمذی نے کہا ہے:

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٠٨)

''یہ حدیث صحیح ہے۔''①

صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا: ''جب تم موذن کو سنو تو جو وہ کہتا ہے تم بھی وہی کہو، پھر مجھ پر درود بھیجو، کیوں کہ جس نے مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجا، اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل کرے گا، پھر اللہ تعالیٰ سے میرے لیے وسیلہ مانگو۔ یہ جنت میں ایک درجہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے صرف ایک بندے کے لائق ہے اور میں امید رکھتا ہوں کہ وہ میں ہوں گا، لہٰذا جس نے میرے لیے وسیلے کا سوال کیا، وہ میری شفاعت کا مستحق ہو گا۔''②

سنن ابی داود اور نسائی میں انھی سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے کہا: اے اللہ کے رسول! اذان دینے والے ہم پر فضیلت رکھتے ہیں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس طرح وہ کہتے ہیں تو بھی اسی طرح کہہ۔ جب فارغ ہو جائے تو مانگ، تجھے عطا کیا جائے گا۔''③

مسند احمد میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: ''جس نے موذن کے اذان دیتے وقت کہا: «اَللّٰھُمَّ رَبَّ ھٰذِہِ الدَّعْوَۃِ الْقَائِمَۃِ، وَالصَّلَاۃِ النَّافِعَۃِ، صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ، وَارْضَ عَنْہُ، رِضَاءً لَا سَخَطَ بَعْدَہُ» ''اے اللہ! اس قائم دعوت اور مفید نماز کے رب، محمد پر درود بھیج اور ان سے اس طرح راضی ہو جا جس کے بعد کوئی ناراضی نہ ہو۔'' اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول کرے گا۔''④

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اذان اور اقامت کے درمیان کی جانے والی دعا رد نہیں ہوتی۔'' یہ حدیث مسند احمد، ابو داود، ترمذی اور نسائی میں ہے۔ امام ترمذی نے کہا ہے: ''یہ حدیث حسن ہے۔''⑤

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دو گھڑیاں ایسی ہیں جن میں آسمان کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور ان میں کسی دعا کرنے والے کی دعا کم ہی رد ہوتی ہے: اذان کے وقت اور اللہ کی راہ میں صف بناتے وقت۔'' یہ حدیث ابو داود میں ہے۔⑥

---

① مسند أحمد (١٨/٦) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٨١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٤٧٧) صحيح ابن خزيمة (٣٥١/١) صحيح ابن حبان (٢٩٠/٥)

② صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٨٤)

③ سنن أبي داود (١٤٤/١) مسند أحمد (١٧٢/٢) صحيح الجامع (٤٢٧٩)

④ مسند أحمد (٣٣٧/٣) شیخ البانی رحمہ اللہ نے إرواء الغليل (٢٤٣) میں اسے صحیح کہا ہے۔

⑤ مسند أحمد (٢٥٤/٣) سنن أبي داود (١٤٤/١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٤١٥/١، ٤١٦) سنن النسائي الكبرىٰ (٢٢/٦) صحيح الجامع (٣٤٠٢)

⑥ سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٥٤٠) صحيح الجامع (٣٥٨١)

مسند احمد اور ترمذی وغیرہما میں حضرت طفیل بن ابی بن کعب اپنے والد سے روایت کرتے ہیں، انھوں نے کہا: جب رات کا ایک چوتھائی حصہ ختم ہو جاتا تو رسول اللہ ﷺ اٹھتے اور کہتے: ''لوگو! اللہ کو یاد کرو، ہلا دینے والا آ چکا ہے، اس کے پیچھے ہی دوسرا زلزلہ بھی ہے، موت اپنی تمام کٹھنائیوں کے ساتھ آ موجود ہوگی۔''[1]

حضرت ابی کہتے ہیں: میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں آپ پر بڑی کثرت سے درود بھیجتا ہوں، تو میں آپ پر کتنا درود بھیجوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جتنا چاہو۔'' میں نے کہا: ایک چوتھائی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جتنا چاہو، اور اگر بڑھا لو تو وہ تمھارے لیے بہت بہتر ہوگا۔'' میں نے کہا: آدھا حصہ؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جتنا چاہو، اور اگر بڑھا لو تو وہ تمھارے لیے بہت بہتر ہوگا۔'' میں نے کہا: دو تہائی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جتنا چاہو، اور اگر بڑھا لو تو وہ تمھارے لیے بہتر ہوگا۔'' میں نے کہا: کیا میں اپنی ساری دعا ہی آپ پر درود بھیجنے کے لیے خاص کر دوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تب اللہ تعالیٰ تمھارے دنیا اور آخرت کے تمام کاموں میں تمھیں کافی ہوگا۔'' ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں: ''تب وہ تیرے غم (اور فکر) کو کفایت کرے گا اور تیرے گناہ معاف کر دے گا۔''[2]

سائل کا کہنا: «کم أجعل لك من صلاتي؟» ''میں اپنی صلاۃ سے کتنا حصہ آپ کے لیے مخصوص کروں؟'' دعا کے معنی میں ہے، کیوں کہ صلاۃ کا لغوی معنی دعا کرنا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَصَلِّ عَلَيۡهِمۡ إِنَّ صَلَوٰتَكَ سَكَنٞ لَّهُمۡ ﴾ [التوبة: ۱۰۳]

''اور ان کے لیے دعا کر، بے شک تیری دعا ان کے لیے باعثِ سکون ہے۔''

نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے: «اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَى آلِ أَبِيْ أَوْفَى» ''اے اللہ! آلِ ابی اوفی پر رحمت کر۔''[3]

ایک عورت نے کہا: «صَلِّ عَلَيَّ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، وَعَلَى زَوْجِيْ، فَقَالَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْكِ وَعَلَىٰ زَوْجِكِ» اے اللہ کے رسول! میرے لیے اور میرے خاوند کے لیے رحمت کی دعا کریں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ تجھ پر اور تیرے خاوند پر رحمت کرے۔''[4] چنانچہ سائل کا مقصود یہ ہوگا کہ اے اللہ کے رسول! میں اپنے لیے بھلائی حاصل کرنے اور اپنے سے شر دور کرنے کے لیے دعا کرتا ہوں۔ اس دعا میں سے آپ کے لیے کتنا حصہ مخصوص کروں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: جتنا چاہو، جب وہ اس بات تک پہنچا کہ اپنی ساری دعا ہی آپ کے لیے مخصوص کر

---

[1] مسند أحمد (۱۳٦/٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (۲٤٥۷) صحيح الجامع (۷۸٦۳)

[2] مسند أحمد (۱۳٦/٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (۲٤٥۷) صحيح الجامع (۷۸٦۳)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (۱٤۲٦)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (۱٥۳۳) شیخ البانی رحمہ اللہ نے فضل الصلاة على النبي (ص: ٦۸) میں اسے صحیح کہا ہے۔

دوں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تب اللہ تعالیٰ تیرے دنیا اور آخرت کے اہم کاموں میں تمھارے لیے کافی ہوگا۔ اور دوسری روایت کے الفاظ ہیں: تب یہ دعا تیرے غم کو کفایت کرے گی اور اللہ تیرے گناہ معاف کرے گا۔

انسان کی دعا کا منتہائے مقصود یہی ہوتا ہے کہ وہ بھلائیاں حاصل کر سکے اور ضرر رساں امور کو دور کر سکے۔ دعا کے ذریعے مطلوب کو حاصل کیا جاتا ہے اور اندیشوں کو دور بھگایا جاتا ہے، اس کی تفصیل اس کے مقام پر گزر چکی ہے۔

علمائے اسلام اور ائمہ دین نے شرعی دعاؤں کا ذکر کیا ہے اور بدعتی دعاؤں سے اجتناب کیا ہے، اس لیے اسی کا اتباع کرنا چاہیے۔ دعا کے تین مراتب ہیں:

① پہلا مرتبہ: اللہ کے سوا کسی دوسرے کو پکارنا جو مردہ ہو یا غیر موجود، چاہے وہ کوئی نبی ہو، یا ولی یا کوئی دوسرا، کہنے والا کہے: اے میرے آقا، غوث! میری فریاد سن، یا یہ کہے: میں تیری پناہ میں آتا ہوں، یا یہ کہے: میں تجھ سے فریاد کرتا ہوں، یا یہ کہے: مجھے میرے دشمن پر نصرت عطا کر، یہ اور اس طرح کے دیگر جملے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کھلا شرک ہیں۔

بعض اوقات شیطان مخلوقات سے فریاد کرنے والے کی حاجت پوری کر دیتا ہے، یا اس کی حاجت کا کچھ حصہ پورا کر دیتا ہے، کبھی اس کی شکل بھی اختیار کر لیتا ہے، جس سے وہ فریاد کرتا ہے اور وہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ یہ اس کی کرامت ہے جس سے اس نے فریاد کی، مگر حقیقت میں یہ شیطان ہوتا ہے جو اس کے اندر داخل ہو کر اس کو شرک کی گمراہی میں ڈال دیتا ہے۔

شیطان بتوں میں اور آسیب زدہ انسان میں بولتا ہے۔ ہمارے زمانے میں اس طرح کی مثالیں بہت ملتی ہیں میں۔بھی بہت سارے واقعات جانتا ہوں جن کو بیان کرنا طوالت کا باعث ہوگا۔

مجھے بتایا گیا کہ کچھ لوگوں نے میرے واسطے سے یا میرے علاوہ کسی دوسرے کے واسطے سے فریاد کی تو ان کے پاس میری شکل میں یا اس دوسرے کی شکل میں ایک آدمی آیا اور اس نے ان کی حاجتیں پوری کیں۔ وہ سمجھ بیٹھے کہ یہ میرے واسطے سے یا دوسرے کے واسطے سے استغاثہ کرنے کی برکت ہے، جب کہ وہ شیطان تھا جس نے ان کو گمراہ کیا اور پھسلایا۔

پرانے زمانوں میں بتوں کی عبادت کرنے اور اللہ کے ساتھ شریک بنانے کی اصل وجہ یہی تھی، جس طرح تاریخ سے ثابت ہے، چنانچہ یہ بات کہنے والا ۔نعوذ باللہ۔ اللہ کے ساتھ شرک کرتا ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہنا ہے:

''اغفرلي وتب علي'' ''مجھے بخش دے اور مجھ پر مہربانی فرما'' جس طرح جاہل مشرکوں کا ایک گروہ کہتا ہے۔

اس سے بھی بدتر عمل اس کی قبر کو سجدہ کرنا اور اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کو بیت اللہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے سے افضل سمجھنا ہے، بلکہ بعض لوگوں نے تو یہاں تک کہا ہے کہ یہ خاص لوگوں کا قبلہ ہے اور کعبۃ اللہ

عوام کا قبلہ ہے! پھر اس سے بھی قبیح تر فعل یہ عقیدہ رکھنا ہے کہ اس کے لیے سفر کرنا حج کی جنس سے ہے، حتی کہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہاں کئی مرتبہ سفر کر کے جانا حج کے برابر ہے، بلکہ ان کے غالی اور انتہا پسند یہاں تک کہتے ہیں کہ اس کی ایک مرتبہ زیارت کرنا کئی مرتبہ حجِ بیت اللہ سے افضل ہے، وغیرہ وغیرہ۔ یہ ان کو شریک بنانے کی مختلف صورتیں ہیں، اگرچہ بہت سے لوگ اس کی بعض صورتوں میں مبتلا ہیں۔

② دوسرا مرتبہ: فوت شدگان یا غیر موجود انبیا اور نیک لوگوں سے کہا جائے: میرے لیے دعا کر، یا میرے لیے اپنے رب سے دعا کر، یا ہمارے لیے اللہ تعالیٰ سے سوال کر، جس طرح عیسائی حضرت مریم علیہا السلام اور ان کے علاوہ دوسروں سے کہتے ہیں۔ اس کے ناجائز ہونے میں بھی کوئی عالم شک کا شکار نہیں ہو سکتا۔ یہ وہ بدعت ہے جو امت کے کسی سلف سے سرزد نہیں ہوئی۔ گو اہلِ قبور کو سلام کہنا اور مخاطب کرنا جائز ہے، جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کو تعلیم دیتے تھے کہ قبرستان میں جاتے وقت یہ کلمات پڑھیں:

«اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا أَهْلَ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ، وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَاحِقُوْنَ، يَغْفِرُ اللّٰهُ لَنَا وَلَكُمْ نَسْأَلُ اللّٰهَ لَنَا وَلَكُمُ الْعَافِيَةَ، اَللّٰهُمَّ لَا تَحْرِمْنَا أَجْرَهُمْ، وَلَا تَفْتِنَّا بَعْدَهُمْ، وَاغْفِرْ لَنَا وَلَهُمْ»[1]

''اے مومن اور مسلمان اہلِ دیار! تم پر سلامتی ہو، ہم بھی ان شاء اللہ تم سے ملنے والے ہیں، اللہ ہمیں اور تمھیں معاف کرے، ہم اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے اور تمھارے لیے عافیت کے خواست گار ہیں، اے اللہ! ہمیں ان کے اجر سے محروم نہ کرنا اور ان کے بعد فتنے میں نہ ڈالنا اور ہمیں اور ان کو معاف کر دینا۔''

حافظ ابو عمر بن عبدالبر نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو آدمی بھی کسی ایسے آدمی کی قبر کے پاس سے گزرتا ہے جس کو وہ دنیا میں جانتا تھا اور اس کو سلام کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی روح اس میں لوٹاتا ہے اور وہ سلام کا جواب دیتا ہے۔''[2]

سنن ابی داود میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو مسلمان بھی مجھ پر سلام بھیجتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی سلام کا جواب دینے کے لیے میری روح کو مجھ میں لوٹاتا ہے۔''[3]

لیکن فوت شدگان سے دعا یا کسی دوسری چیز کی درخواست کرنا جائز نہیں۔

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٧٥) "اللهم لا تحرمنا أجرهم ..." کے الفاظ مسلم میں نہیں ہیں۔

[2] تهذيب تاريخ ابن عساكر (٢٩٢/٧) ضعيف الجامع (٥٢١١)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٤١) السلسلة الصحيحة (٢٢٦٦)

موطا امام مالک میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے: ”اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا أَبَا بَكْرٍ، اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا أَبَتِ“ ”اے اللہ کے رسول! آپ پر سلامتی ہو، اے ابو بکر! آپ پر سلامتی ہو، اے ابا جان! آپ پر سلامتی ہو۔“ پھر گزر جاتے تھے۔[1]

عبداللہ بن دینار کا قول ہے کہ میں نے عبداللہ بن عمر کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر کھڑے دیکھا، وہ وہاں درود پڑھ رہے تھے اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے دعا کر رہے تھے۔

ایسے ہی حضرت انس رضی اللہ عنہ وغیرہ سے بھی مروی ہے کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کہا کرتے تھے، لیکن جب دعا کا ارادہ کرتے تو قبلہ رخ ہو کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرے کی طرف منہ کر کے دعا نہ کرتے۔

اگر فقہا اور صوفیہ کے بعض گروہ اور عام لوگ ان میں سے بعض کاموں کے مرتکب ہوئے ہیں تو ان کی کوئی حیثیت نہیں، کیوں کہ یہ کسی قابلِ اتباع امام کا قول ہے نہ کسی ایسے عالم کا مذہب، جس کو امت کا عمومی اعتبار حاصل ہو۔

ائمہ اربعہ، یعنی امام مالک، ابو حنیفہ، شافعی اور احمد رحمہم اللہ اور دیگر ائمہ اسلام کا یہ موقف ہے کہ اگر آدمی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام بھیجے اور اپنے لیے دعا کرنا چاہے تو وہ قبلہ رخ ہو، تاہم آپ پر سلام بھیجنے کے وقت میں ان کا اختلاف ہے۔ امام مالک، شافعی اور احمد کا کہنا ہے: سامنے کی طرف سے حجرہ رخ ہو اور سلام بھیجے، لیکن امام ابو حنیفہ کا کہنا ہے کہ سلام بھیجتے وقت بھی حجرہ کی طرف رخ نہ ہو، جس طرح بالاتفاق دعا کے وقت حجرہ کی طرف رخ نہیں ہوتا، پھر ان کے مذہب میں اس کے بارے میں بھی دو قول ہیں: یہ کہ ایک حجرے کی طرف پشت کرے، دوسرا یہ کہ حجرے کو اپنی بائیں جانب رکھے۔ یہ آپ پر سلام بھیجتے وقت ان کا اختلاف ہے، لیکن دعا کے وقت اس میں ان کا کوئی اختلاف نہیں کہ قبلہ رخ ہو، حجرہ کی طرف منہ نہ کرے۔

وہ حکایت جو امام مالک سے بیان کی جاتی ہے کہ خلیفہ منصور نے جب ان سے حجرہ رخ ہونے کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے جواب دیا: ”هو وسيلتك و وسيلة أبيك آدم“ ”وہ تمھارا اور تمھارے باپ آدم کا وسیلہ ہے۔“ یہ امام مالک پر افترا ہے۔ اس کی کوئی معروف سند نہیں، بلکہ یہ ان سے صحیح سندوں کے ساتھ ثابت اقوال کے خلاف ہے۔ جو ان کے اصحاب کی کتابوں میں ثابت ہے، قاضی اسماعیل بن اسحاق وغیرہ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے کہ امام مالک سے ایسے لوگوں کے بارے میں پوچھا گیا جو حجرے کی طرف منہ کر کے بہت دیر تک کھڑے رہتے ہیں اور اپنے لیے دعائیں کرتے ہیں تو انھوں نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ یہ بدعت ہے، جو صحابہ نے کی نہ تابعین نے، نیز فرمایا: ”لا يصلح آخر هذه الأمة إلا ما أصلح أولها“ ”اس امت کے آخری حصے کی اصلاح بھی اسی

[1] الموطأ للإمام مالك (١٦٦/١) مصنف عبد الرزاق (٥٧٦/٣)

سے ہو گی جس نے اس کے پہلے حصے کی اصلاح کی تھی۔"

بلاشبہہ بات ایسے ہی ہے جیسے امام صاحب نے فرمایا۔ صحابہ کرام اور تابعین عظام سے متواتر ایسے آثار مروی ہیں جو بیان کرتے ہیں کہ یہ ان کا طریقہ تھا نہ عمل۔ اگر دعا کے وقت حجرے کی طرف منہ کرنا جائز ہوتا تو ان کو اس کا زیادہ علم ہوتا اور وہ بعد والے لوگوں سے اس کام میں سبقت دکھاتے۔ دعا کرنے والا اللہ وحدہ لا شریك له سے دعا کرے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے وقت حجرے کی طرف منہ کرنا منع ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کے لیے نماز پڑھتے وقت حجرے کی طرف منہ کرنا منع ہے۔

صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت ابو مرثد غنوی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا تَجْلِسُوْا عَلَى الْقُبُوْرِ، وَلَا تُصَلُّوْا إِلَيْهَا »[1]

"قبروں پر بیٹھو نہ ان کی طرف منہ کر کے نماز ہی پڑھو۔"

چنانچہ اس حدیث کی بنیاد پر انبیا یا غیر انبیا کی قبروں کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا قطعاً جائز نہیں۔ مسلمانوں میں اس مسئلے میں کوئی اختلاف نہیں کہ قبر کی طرف منہ کر کے نماز کا قصد کرنا جائز نہیں، بلکہ یہ بدعت اور نیا کام ہے۔ اس طرح دعا کے لیے قبروں بالخصوص انبیا اور نیک لوگوں کی قبروں کا کسی طرح کا قصد کرنا بھی جائز نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے وقت بھی قبر کی طرف رخ کرنا جائز نہیں تو خود میت کو پکارنا بالاولیٰ ناجائز ہو گا، اسی طرح قبر کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا جائز نہیں تو خود میت کے لیے نماز پڑھنا تو بالاولیٰ ناجائز ہو گا۔

چنانچہ معلوم ہوا کہ میت سے کچھ بھی مانگنا جائز نہیں، نہ اس سے یہ درخواست کی جا سکتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرے نہ اس کے علاوہ کوئی دوسری چیز۔ اسی طرح اس کے سامنے دنیا یا دین کے کسی معاملے کا شکوہ کرنا بھی جائز نہیں۔ اگر اس کی زندگی میں اس سے کوئی اس طرح کا شکوہ کرنا جائز تھا، اس لیے کہ یہ اس کی زندگی میں شرک کا باعث نہیں بن سکتا تھا، کیوں کہ اپنی زندگی میں وہ سوال کرنے والے کا جواب دینے کا شرعی طور پر مکلّف اور پابند تھا، کیوں کہ یہ کام اجر و ثواب کا باعث ہے، لیکن موت کے بعد وہ مکلّف نہیں رہا، بلکہ قبر میں جو وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے اور اس سے دعا وغیرہ کرتا ہے، جیسے موسیٰ علیہ السلام اپنی قبر میں نماز پڑھتے ہیں، ایسے ہی معراج کی رات بیت المقدس میں انبیائے کرام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی، اسی طرح اہلِ جنت اور فرشتوں کا تسبیح کرنا، تو وہ اس سے محظوظ ہوتے ہیں اور وہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ قدرت اور سہولت کے مطابق کرتے ہیں، اس کا اس شرعی تکلیف اور پابندی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں جس کے ساتھ بندوں کو آزمایا جاتا ہے، لہٰذا ایسی صورت میں سائل کا میت سے سوال

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٩٧٢)

کرنا کوئی اثر نہیں رکھتا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو جو کرنے کا پابند کیا ہے، وہ وہی کرتا ہے، چاہے بندہ اس سے سوال نہ بھی کرے، جیسے فرشتے وہی کرتے ہیں جو ان کو حکم دیا جاتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی فرماں برداری کرتے ہیں، مخلوق کے حکم کے تابع فرمان نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴿٢٦﴾ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ٢٦، ٢٧]

''اور انھوں نے کہا: رحمان نے کوئی اولاد بنا رکھی ہے، وہ پاک ہے، بلکہ وہ بندے ہیں، جنھیں عزت دی گئی ہے۔ وہ بات کرنے میں اس سے پہل نہیں کرتے اور وہ اس کے حکم کے ساتھ ہی عمل کرتے ہیں۔''

لہٰذا وہ صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حکم پر عمل کرتے ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں کسی چیز کے جواز سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ آپ کی رحلت کے بعد بھی جائز ہی ہوگا۔ آپ ﷺ کے گھر میں نماز پڑھنا جائز تھا اور اس کو مسجد بنانا بھی جائز تھا، لیکن جب آپ ﷺ کو اس میں دفن کر دیا گیا تو پھر اس کو مسجد (سجدہ گاہ) بنانا ناجائز ہوگیا۔ صحیح بخاری و مسلم میں آپ ﷺ کی یہ حدیث ہے:

« لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ »[1]

''اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے! انھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔''

اس حدیث میں آپ ﷺ نے ان کے فعل سے خبردار کیا ہے۔ اگر یہ خدشہ نہ ہوتا تو آپ ﷺ کی قبر کو نمایاں بنایا جاتا، لیکن آپ نے اس کو سجدہ گاہ بنانا ناپسند کیا۔

صحیح مسلم وغیرہ میں آپ ﷺ کا یہ فرمان ہے: ''تم سے پہلے جو لوگ تھے وہ قبروں کو سجدہ گاہ بناتے تھے، خبردار! قبروں کو سجدہ گاہ نہ بنانا، میں تم کو اس سے منع کرتا ہوں۔''[2]

نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں آپ ﷺ کے پیچھے نماز ادا کی جاتی تھی اور یہ افضل عمل تھا، لیکن آپ ﷺ کی موت کے بعد کسی آدمی کے لیے آپ ﷺ کی قبر کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہیں۔ اسی طرح آپ ﷺ کی حیاتِ مبارک میں آپ ﷺ سے درخواست کی جاتی تھی کہ آپ ﷺ کوئی حکم دیں، کوئی فتویٰ دیں، کوئی فیصلہ سنائیں، لیکن آپ ﷺ کی وفات کے بعد آپ ﷺ سے کوئی ایسی درخواست کرنا جائز نہیں، اس طرح کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔

امام مالک وغیرہ نے ناپسند کیا ہے کہ کوئی آدمی یہ الفاظ کہے: ''میں نے رسول اللہ ﷺ کی قبر کی زیارت کی۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٢٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢٩)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٣٢)

کیوں کہ یہ الفاظ منقول نہیں۔ نبی اکرم ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت (کی خصوصی ترغیب) کے متعلق جتنی احادیث روایت کی گئی ہیں، وہ سب ضعیف بلکہ موضوع ہیں۔

یہ لفظ (زیارتِ قبر) متاخرین کے عرف میں مشترک لفظ بن چکا ہے، جس سے بدعتی زیارت مراد لی جاتی ہے، جو شرک کے معنی میں ہے، مثلاً: کوئی شخص قبر پر مانگنے، یا اس کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ سے مانگنے کے لیے جائے تو اس کو عرفِ عام میں زیارت کرنا کہا جاتا ہے۔ جب کہ شرعی زیارت یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے قبر کی زیارت کرے، یعنی میت کے لیے دعا کرنے اور اس پر سلام بھیجنے کے لیے، جس طرح اس کی نمازِ جنازہ پڑھتا ہے۔

یہ دوسری قسم جائز ہے، لیکن اکثر لوگ زیارتِ قبر سے پہلا معنی مراد لیتے ہیں، اسی لیے امام مالک نے یہ کہنا مکروہ خیال کیا ہے کہ میں نے اس کی قبر کی زیارت کی، کیوں کہ اس میں اس فاسد معنی کا وہم پیدا ہو سکتا ہے جو اہلِ شرک و بدعت مراد لیتے ہیں۔

③ تیسرا مرتبہ: یہ کہا جائے: میں تجھ سے فلاں کے واسطے سے، یا فلاں کا تیرے ہاں جو مرتبہ ہے اس کے ذریعے سے سوال کرتا ہوں، یا اس طرح کے دیگر الفاظ۔ اس کے بارے میں امام ابو حنیفہ اور ابو یوسف وغیرہ کا قول گزر چکا ہے کہ یہ ممنوع ہے۔ نیز یہ بھی پہلے گزر چکا ہے کہ یہ صحابہ کے ہاں مشہور نہیں تھا، بلکہ انھوں نے اس کو چھوڑ کر حضرت عباس وغیرہ کو وسیلہ بنانے کی راہ اختیار کی۔ اسی طرح یہ بھی واضح ہو چکا ہے کہ لفظ توسل (وسیلہ بنانا) ایک مشترک لفظ ہے جو اس پر بھی مشتمل ہے جو صحابہ کرام کرتے تھے اور اس پر بھی جو نہیں کرتے تھے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زبان اور عرف میں لفظ توسل اور توجہ کا معنی تھا: آپ ﷺ کی دعا اور شفاعت کو وسیلہ بنانا۔ اس بنا پر مومن کی دعا کو وسیلہ بنانا اور پیش کرنا جائز ہے، گو بعض مشائخ اور پیر حضرات نبی اکرم ﷺ سے مروی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں:

"إِذَا أَعيتكُمُ الْأُمُوْرُ، فَعَلَيْكُمْ بِأَهْلِ الْقُبُوْرِ" أَوْ "فَاسْتَعِيْنُوْا بِأَهْلِ الْقُبُوْرِ"

''جب تم مشکل میں پڑ جاؤ تو اہلِ قبور سے مدد مانگو۔''

یہ حدیث جھوٹی اور ماہرینِ حدیث کے اتفاق کے ساتھ آنحضرت ﷺ کے نام پر گھڑی گئی ہے۔ کسی عالم نے اسے روایت کیا ہے نہ یہ حدیث کی کسی معتبر کتاب ہی میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوْتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ وَكَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا ﴾ [الفرقان: ۵۸]

''اور اس زندہ پر بھروسا کر جو کبھی نہیں مرے گا اور اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کر اور وہ اپنے بندوں کے گناہوں کی پوری خبر رکھنے والا کافی ہے۔''

یہ ان امور میں ہے جن کا دینِ اسلام میں ناجائز ہونا ہر کسی کو معلوم ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے اس سے جو قریب ترین چیز ہے اس سے بھی منع کیا ہے، یعنی قبروں کو سجدہ گاہ بنانا، اور ایسا کرنے والوں پر لعنت بھیجی، تاکہ ان کی مشابہت اختیار کرنے سے گریز کیا جائے، کیوں کہ بتوں کی عبادت کی یہی اصل ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا﴾ [نوح: ۲۳]

''اور انھوں نے کہا تم ہرگز اپنے معبودوں کو نہ چھوڑنا اور نہ کبھی وڈ کو چھوڑنا اور نہ سواع کو اور نہ یغوث اور نہ یعوق کو۔''

یہ نوح علیہ السلام کی قوم کے نیک لوگ تھے۔ یہ جب فوت ہو گئے تو انھوں نے ان کی قبروں پر ڈیرے ڈال لیے، پھر ان کی تصویریں بنائیں اور اس کے بعد ان کی تصویروں پر بت کھڑے کر لیے۔ یہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر علمائے سلف سے منقول ہے۔ لہٰذا جو ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ کا معنی و مفہوم سمجھتا ہے وہ جانتا ہے کہ عبادت پر مطلق اعانت اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں کر سکتا اور مخلوق سے صرف اس کام میں مدد طلب کی جاتی ہے جس پر وہ قادر ہو۔ ایسے ہی استغاثہ بھی اللہ ہی سے کیا جاتا ہے اور توکل بھی اسی پر کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ [آل عمران: ۱۲۶]

''اور مدد نہیں ہے مگر اللہ کے پاس سے۔''

چنانچہ مطلق نصرت پر بھی، یہ ایسی چیز ہے جس کے ذریعے دشمن پر غلبہ حاصل کیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی قدرت نہیں رکھتا۔ جس کو اللہ نے ہدایت سے سرفراز کیا ہے اس کے لیے اسی قدر تفصیل کافی ہے۔ واللّٰه أعلم.

یہ شرک جس سے نبی اکرم ﷺ نے منع کیا ہے آپ ﷺ کے علاوہ دیگر انبیا کی شریعتوں میں بھی ممنوع ہے۔ تورات میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو مردوں کو پکارنے جیسے شرک سے منع کیا اور ذکر کیا کہ جو ایسا کرتا ہے اس کے لیے یہ اللہ تعالیٰ کی سزا کا ایک سبب ہے، کیوں کہ انبیا کا دین ایک ہی ہے، گو ان کی شریعتیں الگ الگ ہیں۔ صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّا مَعْشَرَ الْأَنْبِيَاءِ، دِيْنُنَا وَاحِدٌ» [1]

''ہم انبیا کی جماعت کا دین ایک ہی ہے۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٥٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٦٥)

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ﴾ [الشوریٰ: ۱۳]

''اس نے تمھارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا جس کا تاکیدی حکم اس نے نوح کو دیا اور جس کی وحی ہم نے تیری طرف کی اور جس کا تاکیدی حکم ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا، یہ کہ اس دین کو قائم رکھو اور اس میں جدا جدا نہ ہو جاؤ، مشرکوں پر وہ بات بھاری ہے جس کی طرف تو انھیں بلاتا ہے۔''

ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿51﴾ وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ﴿52﴾ فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ﴾ [المؤمنون: ۵۱۔۵۳]

''اے رسولو! پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک عمل کرو، یقیناً میں اسے جو تم کرتے ہو، خوب جاننے والا ہوں۔ اور بے شک یہ تمھاری امت ہے، جو ایک ہی امت ہے اور میں تمھارا رب ہوں، سو مجھ سے ڈرو۔ پھر وہ اپنے معاملے میں آپس میں کئی گروہ ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے، ہر گروہ کے لوگ اسی پر خوش ہیں جو ان کے پاس ہے۔''

ارشادِ ربانی ہے:

﴿فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿30﴾ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿31﴾ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ﴾ [الروم: ۳۰۔۳۲]

''پس تو ایک طرف کا ہو کر اپنا چہرہ دین کے لیے سیدھا رکھ، اللہ کی اس فطرت کے مطابق، جس پر اس نے سب لوگوں کو پیدا کیا، اللہ کی پیدایش کو کسی طرح بدلنا (جائز) نہیں، یہی سیدھا دین ہے اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اس کی طرف رجوع کرتے ہوئے اور اس سے ڈرو اور نماز قائم کرو اور شرک کرنے والوں سے نہ ہو جاؤ۔ ان لوگوں سے جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور کئی گروہ ہو گئے، ہر گروہ اسی پر جو ان کے پاس ہے، خوش ہے۔''

یہی دینِ اسلام ہے اور اللہ تعالیٰ گزرے ہوئے لوگوں اور بعد میں آنے والوں سے اس دین کے علاوہ کوئی اور دین قبول نہیں کرے گا، اس کی تفصیل دوسری جگہ گزر چکی ہے۔

فوت شدہ اور غیر موجود کو وسیلہ بنانے کی ممانعت:

یہ واضح ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے ساری مخلوق سے اشرف شخصیت، اللہ کے ہاں سب سے زیادہ معزز، آدم کی اولاد کے سردار، خاتم الانبیاء والمرسلین، افضل الاولین والآخرین، اللہ تعالیٰ کے ہاں شفاعت کرنے والوں میں سب سے بڑھ کر مرتبے اور مقام اور جاہ کے مالک حضرت محمد ﷺ کے حق میں کیا حکم دیا ہے اور کس چیز سے منع کیا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو انبیا اور بزرگ آپ سے کم درجے کے ہیں ان کو اللہ کا شریک بنانا، ان کی قبر کو بت بنا کر پوجنا اور ان کو اللہ کے سوا ان کی زندگی میں، یا ان کے مرنے کے بعد پکارنا بالاولیٰ ناجائز ہے۔

کسی کے لیے بھی کسی بھی غیر موجود یا فوت شدہ پیر کے وسیلے سے فریاد کرنا جائز نہیں، مثلاً: کوئی کہے: ''يا سيدي فلان أغثني، وانصرني، وادفع عني، أنا في حسبك وغيره'' ''اے میرے فلاں پیر، میری مدد کر، فریاد سن، مجھ سے شر کو دور کر، میں تیری پناہ میں ہوں، میں تیرے دائرۂ کفایت میں ہوں۔'' یہ تمام الفاظ اس شرک سے تعلق رکھتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں نے حرام قرار دیا ہے اور ان کی تحریم ان چیزوں میں داخل ہے جن کا دینِ اسلام میں حرام ہونا ہر کسی کے علم میں ہے۔

یہ غیر موجود اور فوت شدگان کی قبروں کے پاس، یا کسی دوسری جگہ ان کے واسطے سے فریاد کرنے والے بتوں کی پوجا کرنے والوں کی قسم سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے شیطان ان کو اس طرح گمراہ کرتا اور پھسلاتا ہے جس طرح بتوں کے پجاریوں کو گمراہ کرتا ہے۔ شیطان اس کا روپ دھار لیتا ہے جس سے فریاد کی جاتی ہے اور وہ اس سے اس طرح مخاطب ہوتا ہے جس طرح اس کو کشف ہوا ہے، جیسے شیاطین کاہنوں سے مخاطب ہوتے ہیں۔ ان کی باتوں میں کچھ سچائی بھی ہوتی ہے، لیکن ان میں جھوٹ کا ہونا ضروری ہے، بلکہ سچ کی نسبت جھوٹ زیادہ ہوتا ہے۔

کبھی شیطان ان کی بعض حاجتوں کو پورا بھی کر دیتے ہیں اور ان سے بعض ایسی چیزوں کو دور کر دیتے ہیں جن کو وہ ناپسند کرتے ہیں تو یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ پیر خود غیب سے آیا اور اس نے آ کر وہ کام کیا، یا وہ گمان کر لیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی صورت میں فرشتے کو بھیجا ہے جس نے یہ کام کیا۔ کچھ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ پیر صاحب کا راز اور حال ہے! جب کہ وہ شیطان ہوتا ہے جو اس کی شکل میں آ کر اس مشرک اور فریاد کرنے والے کو گمراہ کرتا ہے، جس طرح شیاطین بتوں میں داخل ہوتے ہیں اور ان کی پرستش کرنے والوں سے ہم کلام ہوتے ہیں اور ان کی بعض حاجتوں کو پورا بھی کر دیتے ہیں۔ عرب کے مشرکوں کے بتوں میں ایسا ہوتا تھا اور یہ آج بھی ترکی اور ہندوستان وغیرہ کے مشرکوں میں موجود ہے۔

میں ذاتی طور پر ایسے بہت سارے واقعات کو جانتا ہوں کہ کچھ لوگوں نے میرے اور کچھ دیگر علما کی غیر

موجودگی میں ہمارے واسطے سے فریاد کی تو انھوں نے مجھے یا اس دوسرے عالم کو دیکھا جس کے واسطے سے فریاد کی تھی کہ ہم ہوا میں آئے اور ان سے پریشانی کو دور کیا۔ جب انھوں نے یہ بات بتائی تو میں نے ان کے سامنے وضاحت کی کہ یہ شیطان تھا جس نے میری اور میرے علاوہ دیگر علما کی شکل اختیار کی جن سے انھوں نے استغاثہ کیا تھا، تاکہ وہ یہ گمان کریں کہ یہ شیخ کی کرامت تھی اور پھر غیر موجود اور فوت شدہ پیروں کے واسطے سے استغاثہ کرنے کے لیے ان کے عزائم مضبوط ہو جائیں۔ یہ مشرکوں اور بتوں کے پجاریوں کے شرک کرنے کا سب سے بڑا سبب ہے۔

اسی طرح وہ عیسائی جو اپنے پادریوں کے واسطے سے استغاثہ کرتے ہیں، وہ انھیں علامس کہتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ جس مذہبی پیشوا کے واسطے سے انھوں نے استغاثہ کیا تھا اس کی شکل میں کوئی آ کر ان کی بعض حاجتیں پوری کر جاتا ہے۔ یہ لوگ جو فوت شدہ انبیا، صلحا، مشائخ اور اہلِ بیت کے وسیلے سے استغاثہ کرتے ہیں، ان کی زیادہ سے زیادہ یہ تمنا ہوتی ہے کہ ان کے لیے بھی کوئی ایسی چیز رونما ہو جائے، یا ان کو کوئی ایسی بات سنائی جائے، وہ اس کو اس عمل کے سبب کرامت یا معجزہ سمجھ بیٹھتا ہے۔

ان میں کچھ لوگ اس پیر کی قبر کے پاس آتے ہیں جس کو اللہ کا شریک بناتے ہیں اور جس کے واسطے سے استغاثہ کرتے ہیں تو ان پر آسمان سے کھانا اترتا ہے یا پیسے یا اسلحہ یا کوئی بھی چیز جو وہ مانگتے ہیں، وہ اس کو اپنے پیر کی کرامت سمجھ لیتے ہیں، جب کہ یہ سب کچھ شیطانوں کی طرف سے ہوتا ہے۔ یہ بتوں کی پرستش کا ایک بہت اہم سبب ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا:

﴿ وَإِذْ قَالَ إِبْرَٰهِيمُ رَبِّ ٱجْعَلْ هَٰذَا ٱلْبَلَدَ ءَامِنًا وَٱجْنُبْنِى وَبَنِىَّ أَن نَّعْبُدَ ٱلْأَصْنَامَ ﴾

[إبراهيم: ٣٥]

''اور جب ابراہیم نے کہا: اے میرے رب! اس شہر کو امن والا بنا دے اور مجھے اور میرے بیٹوں کو بچا کہ ہم بتوں کی عبادت کریں۔''

حضرت نوح علیہ السلام نے بھی اسی طرح کہا تھا۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ پتھر بہت سارے لوگوں کو گمراہ نہیں کرتا، مگر وہ ان کی گمراہی کا سبب بنتا ہے۔ کوئی بھی بتوں کا پجاری یہ عقیدہ نہیں رکھتا تھا کہ انھوں نے زمین اور آسمان کو پیدا کیا، بلکہ وہ ان کو سفارشی اور وسیلہ بناتے تھے۔ کسی نے ان کو انبیا اور صالحین کی شکلوں میں ڈھالا ہوا تھا، کسی نے ان کو سورج چاند اور ستاروں کے مجسمے اور طلسم بنایا ہوا تھا، کسی نے ان کو جنوں کے لیے بنایا ہوا تھا اور کسی نے ان کو فرشتوں کے لیے بنایا ہوا تھا، ان کے قصد و نیت میں معبود فرشتے انبیا و صالحین سورج اور چاند تھے، جب کہ وہ حقیقت میں شیطان کی پوجا کرتے ہیں۔ شیاطین ہی انسانوں سے اپنی عبادت کروانا چاہتے ہیں اور وہ ان کے لیے وہ سب کچھ

ظاہر کرتے ہیں جو اس کی راہ کی طرف ان کو بلاتا ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کا کہنا ہے:

﴿وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا مَكَانَكُمْ أَنْتُمْ وَشُرَكَاؤُكُمْ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَاؤُهُمْ مَا كُنْتُمْ إِيَّانَا تَعْبُدُونَ﴾ [یونس: ۲۸]

''اور جس دن ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے، پھر ہم ان لوگوں سے جنھوں نے شریک بنائے تھے، کہیں گے اپنی جگہ ٹھہرے رہو، تم اور تمھارے شریک بھی، پھر ہم ان کے درمیان علاحدگی کر دیں گے اور ان کے شریک کہیں گے تم ہماری تو عبادت نہیں کیا کرتے تھے۔''

اگر پرستش کرنے والا ان لوگوں میں ہو جو شیطانوں کی پرستش کرنا حلال نہیں سمجھتا تو وہ اس کو باور کرواتے ہیں کہ وہ انبیا، صالحین اور فرشتوں وغیرہ کو پکارتا ہے جن کے بارے میں عبادت کرنے والا حسنِ ظن رکھتا ہے اور اگر وہ ان لوگوں میں ہو جو جنوں کی عبادت حرام نہیں سمجھتا تو ان کو وہ بتا دیتے ہیں کہ وہ جن ہیں۔

بسا اوقات انسان کی صورت اختیار کرنے والا شیطان اس سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ اس کو سجدہ کرے، یا اس کے ساتھ بدکاری کرے، یا مردار کھائے، یا شراب پیے، یا کوئی مردار ان کو پیش کرے، جب کہ ایسے اکثر لوگ اس سے ناواقف ہوتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ جن سے وہ ہم کلام ہوتے ہیں وہ یا فرشتے ہیں یا جنوں کے مردانِ غیب، وہ سمجھتے ہیں کہ مردانِ غیب اللہ تعالیٰ کے وہ ولی ہیں جو نظروں سے اوجھل رہتے ہیں، حالاں کہ یہ جن ہوتے ہیں جو انسان کا روپ دھارتے ہیں یا کسی دوسری شکل میں دیکھے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَأَنَّهُ كَانَ رِجَالٌ مِنَ الْإِنْسِ يَعُوذُونَ بِرِجَالٍ مِنَ الْجِنِّ فَزَادُوهُمْ رَهَقًا﴾ [الجن: ٦]

''اور یہ کہ بلاشبہہ بات یہ ہے کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں سے بعض لوگوں کی پناہ پکڑتے تھے تو انھوں نے ان (جنوں) کو سرکشی میں زیادہ کر دیا۔''

کوئی انسان جب کسی وادی میں اترتا تو وہاں کے رہنے والوں سے ڈرتا اور کہتا کہ میں اس وادی کے بے وقوفوں سے اس وادی کے سردار کی پناہ میں آتا ہوں۔ انسان جنوں سے پناہ مانگا کرتے تھے تو یہ جنوں کی سرکشی کا سبب بنا اور وہ کہنے لگے: انسان ہم سے پناہ مانگتے ہیں!

اسی طرح جھاڑ پھونک اور عجمی تعویذ جنوں کے مَردوں کے ناموں پر مشتمل ہوتے ہیں، وہ ان کو پکارتے ہیں، ان سے فریاد کرتے ہیں، ان کو ان کے بڑوں اور معزز افراد کی قسم دیتے ہیں، اس کی وجہ سے شیاطین ان کو بعض کاموں میں سے کچھ دے بھی دیتے ہیں۔ یہ جادو اور شرک ہی کی جنس سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ عَلٰی مُلْكِ سُلَیْمٰنَ وَمَا كَفَرَ سُلَیْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّیٰطِیْنَ كَفَرُوْا یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَی الْمَلَكَیْنِ بِبَابِلَ هٰرُوْتَ وَمَارُوْتَ وَمَا یُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰی یَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ فَیَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا یُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَیْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ وَمَا هُمْ بِضَآرِّیْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَیَتَعَلَّمُوْنَ مَا یَضُرُّهُمْ وَلَا یَنْفَعُهُمْ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ﴾

[البقرة: ۱۰۲]

''اور وہ اس چیز کے پیچھے لگ گئے جو شیاطین سلیمان کے عہدِ حکومت میں پڑھتے تھے اور سلیمان نے کفر نہیں کیا اور لیکن شیطانوں نے کفر کیا کہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے اور (وہ اس چیز کے پیچھے لگ گئے) جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت اور ماروت پر اتاری گئی، حالانکہ وہ دونوں کسی ایک کو نہیں سکھاتے تھے، یہاں تک کہ کہتے ہم تو محض ایک آزمایش ہیں، سو تو کفر نہ کر۔ پھر وہ ان دونوں سے وہ چیز سیکھتے جس کے ساتھ وہ مرد اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی ڈال دیتے اور وہ اس کے ساتھ ہرگز کسی کو نقصان پہنچانے والے نہ تھے مگر اللہ کے اذن کے ساتھ۔ اور وہ ایسی چیز سیکھتے تھے جو انھیں نقصان پہنچاتی اور انھیں فائدہ نہ دیتی تھی۔ حالانکہ بلاشبہ یقیناً وہ جان چکے تھے کہ جس نے اسے خریدا آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں اور بے شک بری ہے وہ چیز جس کے بدلے انھوں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا۔ کاش وہ جانتے ہوتے۔''

ان میں سے اکثر لوگ ہوا میں اڑتے ہیں، شیطان ان کو اٹھا کر مکہ وغیرہ بھی لے جاتے ہیں، لیکن اس کے باوجود یہ پیر زندیق ہوتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے نماز وغیرہ کی طرح کے فرائض کا انکار کرتا ہے اور اللہ اور اس کے رسول کے حرام کردہ کاموں کو حلال سمجھتا ہے۔ اس کے کفر، نافرمانی اور معصیت کی وجہ سے اس کے ساتھ یہ جن لگ جاتے ہیں، لیکن جوں ہی یہ پیر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لے آئے، توبہ کرے اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا التزام کرے تو یہ شیاطین اس سے جدا ہو جاتے ہیں اور غیبی باتیں بتانے اور تاثیرات کے وہ سب شیطانی احوال ختم ہو جاتے ہیں۔

میں شام، مصر، حجاز اور یمن میں ایسے بہت سارے لوگوں کو جانتا ہوں، البتہ جزیرہ، عراق، خراسان اور روم میں اس صنف کے جھوٹے پیر شام وغیرہ سے زیادہ ہیں، جب کہ مشرکوں اور اہلِ کتاب کے دیارِ کفر میں تو یہ بہت زیادہ ہیں۔

یہ شیطانی حالات، جن کے اسباب کفر، گناہ اور نافرمانی ہیں، اپنے اسباب کے ظہور کے مطابق ہی ظاہر ہوتے ہیں۔ جہاں ایمان، توحید اور نورِ فرقان قوی ہو اور نبوت و رسالت کے اثرات ظاہر ہوں، وہاں یہ شیطانی حالات کم

زور پڑ جاتے ہیں اور جہاں کفر، گناہ اور نافرمانی زوروں پر ہوں، وہاں یہ شیطانی حالات طاقتور بن جاتے ہیں۔ ایک ہی شخص جس میں یہ دونوں حالتیں ہوں، جس میں ایمان کا مادہ بھی ہو جو اس کو ایمان کی طرف کھینچے اور منافقت کا مادہ بھی ہو جو اس کو منافقت کی طرف کھینچے، اس میں دونوں حالتوں کے اثرات پائے جاتے ہیں۔

وہ مشرک جو اسلام میں داخل ہی نہیں ہوئے، جیسے: بخشیہ، طونیہ اور بُدّی وغیرہ کی طرح کے مشرک گروہ اور ان کے پنڈت اور ترکی اور ہندوستان کے کافروں کے پروہت، ان میں اس طرح کے شیطانی حالات زیادہ پائے جاتے ہیں۔ یہ ہوا میں اڑتے ہیں، ان کو غیبی باتیں بتاتے ہیں۔ جو دف بجاتے ہیں وہ ہوا میں اڑتی ہے۔ اگر کوئی ان کے طریقے سے باہر نکلے تو اس کے سر پر ضرب پڑتی ہے، لیکن وہ دف بجانے والے کو نہیں دیکھتے۔ جس برتن سے پیتے ہیں وہ ان کے سامنے گھومتا ہے، لیکن وہ برتن اٹھانے والے کو نہیں دیکھتے۔ وہ کسی جگہ ہوں اور وہاں ان کے پاس کوئی مہمان آئے تو وہ رنگا رنگ کھانے منگواتے ہیں اور وہ کھانا سب کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔

یہ شیطانوں کا کام ہوتا ہے۔ وہ کسی قریبی شہر سے لے آتے ہیں، یا چوری کرتے ہیں اور لا کر ان کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

ترکیوں میں جو مشرک ہو یا ناقص الایمان، اس کے ہاں اس طرح کے امور بہت زیادہ ہوتے ہیں، جب کہ تاتاریوں میں اس طرح کی بہت زیادہ قسمیں پائی جاتی ہیں۔ لیکن جو اسلام میں داخل ہو چکے ہوں اگر وہ توحید اور رسول اللہ ﷺ کی اتباع کو یقینی نہ بنائیں، بلکہ غیر موجود پیروں کو پکاریں، ان کے وسیلے سے استغاثہ کریں تو ان میں ان شیطانی حالات کا اتنا ہی حصہ ہوتا ہے جتنا شیطان ان سے راضی ہوتا ہے۔ ان میں کچھ ایسے لوگ ہیں جو دین دار اور عبادت گزار ہیں، لیکن ایک طرح کی جہالت بھی رکھتے ہیں۔ ان میں کوئی فضا میں بلند ہوتا ہے اور میقات سے گزرتے وقت احرام باندھے بغیر حاجیوں کے ساتھ عرفات میں وقوف کرتا ہے، لیکن نہ مزدلفہ میں رات گزارتا ہے نہ طوافِ افاضہ کرتا ہے اور سمجھ بیٹھتا ہے کہ یہ کام کر کے اس نے نیک عمل کیا ہے اور اس کو ولیوں کی ایک کرامت مل گئی ہے، جب کہ اس کو علم نہیں کہ یہ شیطان کا اس کے ساتھ کھلواڑ ہے۔

اس جیسا حج شرعی ہے نہ علما کے اتفاق کے ساتھ جائز ہی۔ جس نے سمجھا کہ یہ عبادت اور ولیوں کی کوئی کرامت ہے وہ جاہل اور گمراہ ہے، اسی لیے انبیا اور صحابہ میں سے کسی نے بھی ان کے ساتھ ایسا نہیں کیا، ان کا تو مرتبہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔

ایسا ہی ایک مسئلہ اسکندریہ سے عرفات اڑ کر جانے والے ایک طائفے کو پیش آیا۔ اس نے دیکھا فرشتے اتر رہے ہیں اور حاجیوں کا نام لکھ رہے ہیں تو اس نے پوچھا: کیا تم نے مجھے ان لوگوں میں لکھا ہے؟ انھوں نے کہا: تم

نے اس طرح حج ہی نہیں کیا جس طرح لوگوں نے حج کیا ہے، تم نے کوئی مشقت اٹھائی ہے نہ احرام باندھا ہے اور نہ تجھ کو وہ حج حاصل ہو سکا ہے جس پر لوگوں کو ثواب ملتا ہے اور جو حاجیوں کو حاصل ہوا ہے۔ ان میں سے کسی شخص نے کسی عالم کو اپنے ساتھ ہوا میں حج کرنے کی دعوت دی تو اس نے جواب دیا: اس حج کی وجہ سے تم سے فریضۂ حج ساقط نہیں ہوا، کیوں کہ تم نے اس طرح حج نہیں کیا جس طرح اللہ اور اس کے رسول نے حکم دیا ہے۔

دینِ اسلام دو اصول پر مبنی ہے: ایک اللہ اکیلے کی عبادت کی جائے اور اس کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک نہ بنایا جائے اور دوسرا اس کی اس طریقے کے مطابق عبادت کی جائے جو اس نے اپنے نبی کی زبانِ مبارک سے شریعت قرار دیا ہے۔ یہ دونوں قواعد ہمارے اس کلمہ شہادت "أشهد أن لا إله إلا الله، وأشهد أن محمداً عبده ورسوله" کی حقیقت ہیں۔

اللہ وہی ہے جس کے حضور دل عبادت، استعانت، محبت، تعظیم، خوف، امید اور احترام و اکرام میں والہانہ جھکیں اور اس کو اپنا معبودِ حقیقی تسلیم کریں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ایسا حق ہے کہ اس میں اس کا کوئی شریک نہیں، لہٰذا اس کے سوا کسی کی بھی عبادت نہ کی جائے، اللہ کے سوا کسی کو نہ پکارا جائے، اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرا جائے اور اللہ کے سوا کسی کی اطاعت نہ کی جائے۔

رسول، اللہ کے امر، نہی اور حلال و حرام کو لوگوں تک پہنچانے والا ہے۔ حلال وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے۔ حرام وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے اور دین وہ ہے جس کو اس نے مقرر اور شریعت قرار دیا ہے۔ رسول، اللہ تعالیٰ کے امر، نہی، وعد، وعید، حلال و حرام اور اس کے تمام کلام کو اس کی مخلوق تک پہنچانے میں اس کے اور لوگوں کے درمیان واسطہ ہے۔

جہاں تک دعا قبول کرنے، مصیبت دور کرنے، ہدایت دینے اور مال دار کرنے کا تعلق ہے تو صرف اللہ تعالیٰ ان کی بات سنتا ہے، ان کو دیکھتا ہے، ان کے رازوں اور سرگوشیوں کو جانتا ہے، وہی نعمتیں اتارنے والا، بیماری اور نقصان دور کرنے پر قادر ہے اور اس کو کوئی ضرورت نہیں کہ کوئی اس کو اس کے بندوں کے حالات سے باخبر کرے، یا ان کی حاجتوں کو پورا کرنے میں اس کی کوئی معاونت کرے۔ وہ اسباب جن کے ذریعے یہ سب کچھ حاصل ہو سکتا ہے، اس نے انھیں پیدا کیا اور میسر کیا ہے۔ وہی مسبب الاسباب، یکتا اور بے نیاز ہے۔ اس نے کسی کو جنا ہے نہ وہ جنا گیا ہے اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے۔

﴿ يَسْئَلُهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ﴾ [الرحمٰن: ٢٩]

"اسی سے مانگتا ہے جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہے، ہر دن وہ ایک (نئی) شان میں ہے۔"

اہلِ آسمان اور اہلِ زمین اسی سے مانگتے ہیں۔ وہ ایک کی بات سنتے ہوئے دوسرے کی بات سننے سے غافل نہیں ہوسکتا۔ نہ ان کی آوازوں اور زبانوں کا تنوع ہی اس کو کسی معاملے میں ڈال سکتا ہے۔

وہ مختلف زبانوں میں متنوع حاجتوں کو، شور سے لبریز، ہر ایک آواز کو سنتا ہے۔ اس کو اصرار کرنے والوں کا اصرار کوئی محکم فیصلہ کرنے پر مجبور یا زچ نہیں کرسکتا، بلکہ وہ دعا میں الحاح و لجاحت پسند کرتا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب نبی اکرم ﷺ سے احکام کے بارے میں سوال کرتے تو آپ کو ان کا جواب دینے کا حکم دیا جاتا، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۭ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ﴾ [البقرۃ: ۱۸۹]

''وہ تجھ سے نئے چاندوں کے متعلق پوچھتے ہیں، کہہ دے وہ لوگوں کے لیے اور حج کے لیے وقت معلوم کرنے کے ذریعے ہیں۔''

﴿ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ﴾ [البقرۃ: ۲۱۵]

''وہ تجھ سے پوچھتے ہیں: کیا چیز خرچ کریں؟''

﴿ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۭ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ﴾ [البقرۃ: ۲۱۷]

''وہ تجھ سے حرمت والے مہینے کے متعلق اس میں لڑنے کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہہ دے اس میں لڑنا بہت بڑا ہے۔''

جب صحابہ نے آپ ﷺ سے اللہ تعالیٰ کے بارے میں سوال کیا تو ارشاد ہوا:

﴿ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّىْ فَاِنِّىْ قَرِيْبٌ ۭ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ﴾ [البقرۃ: ۱۸۶]

''اور جب میرے بندے تجھ سے میرے بارے میں سوال کریں تو بے شک میں قریب ہوں۔ میں پکارنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے۔''

یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں کہا: "فقل" ''کہہ دے'' بلکہ کہا: ﴿ فَاِنِّىْ قَرِيْبٌ ۭ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ ﴾ لہٰذا وہ اپنے بندوں کے قریب ہے۔ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دعا میں اور ذکر میں اپنی آوازیں بلند کیں تو آپ نے فرمایا:

« أَيُّهَا النَّاسُ اِرْبَعُوا عَلَى أَنْفُسِكُمْ، فَإِنَّكُمْ لَا تَدْعُوْنَ اَصَمَّ وَلَا غَائِباً، إِنَّمَا تَدْعُوْنَ سَمِيْعاً قَرِيْباً، إِنَّ الَّذِيْ تَدْعُوْنَهُ أَقْرَبُ إِلَى أَحَدِكُمْ مِنْ عُنُقِ رَاحِلَتِهِ »[1]

---

[1] مسند أحمد (٤٠٢/٤) صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩٦٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٠٤) مگر بخاری و مسلم میں یہ الفاظ "إن الذي تدعونه أقرب إلى أحدكم من عنق راحلته" نہیں ہیں۔

''اے لوگو! ٹھہرو! تم کسی بہرے یا غیر موجود کو نہیں پکار رہے، بلکہ تم ہمیشہ سے سننے والے اور قریب کو پکارتے ہو، جس کو تم پکارتے ہو وہ تم میں سے کسی ایک کے اس کی سواری کی گردن سے بھی زیادہ قریب ہے۔''

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب تم میں سے کوئی ایک اپنی نماز کے لیے کھڑا ہو تو اپنے سامنے کی طرف نہ تھوکے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ اس کے چہرے کے سامنے کی طرف ہے، نہ اپنی دائیں جانب تھوکے، کیوں کہ اس کی دائیں جانب فرشتہ ہوتا ہے، لیکن اپنی بائیں جانب یا اپنے پاؤں کے نیچے تھوکے۔''[1]

یہ حدیث صحیح (بخاری) میں دیگر الفاظ اور اسناد سے مروی ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے آسمانوں کے اوپر اپنے عرش پر ہے۔ اپنی مخلوق سے جدا ہے۔ اس کی مخلوقات میں کوئی چیز بھی اس کی ذات کی نہیں۔ نہ اس کی ذات میں اس کی مخلوقات کی کوئی چیز ہے۔ وہ عرش اور اپنی تمام مخلوقات سے بے نیاز ہے۔ وہ اپنی مخلوقات میں سے کسی چیز کا بھی محتاج نہیں، بلکہ وہ اپنی قدرت کے ساتھ عرش اور حاملینِ عرش کو اٹھائے ہوئے ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جہان کے کئی طبقات بنائے ہیں اور بلند طبقے کو نچلے طبقے کا محتاج نہیں بنایا۔ آسمان خلا اور فضا کا محتاج ہے، نہ فضا زمین کی۔ زمین و آسمان اور ان میں بسنے والی ہر چیز کا رب ہی بلند و بالا ہے۔ اس نے از خود اپنے تعارف میں کہا ہے:

﴿ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾ [الزمر: ٦٧]

''اور انھوں نے اللہ کی قدر نہیں کی جو اس کی قدر کا حق ہے، حالانکہ زمین ساری قیامت کے دن اس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لپیٹے ہوئے ہوں گے، وہ پاک ہے اور بہت بلند ہے اس سے جو وہ شریک بنا رہے ہیں۔''

وہ کسی بھی اٹھانے والی یا نہ اٹھانے والی چیز کا محتاج ہونے سے بلند و بالا، بے پروا اور جلیل و عظیم ہے، بلکہ وہ یکتا اور بے نیاز ہے۔ اس نے کسی کو جنا ہے نہ وہ جنا گیا ہے، نہ اس کا کوئی ہمسر ہی ہے۔ وہ ایسی ذات ہے کہ اس کے علاوہ ہر کوئی اس کا محتاج ہے اور وہ اپنے ہر ماسوا سے بے نیاز ہے۔ ان امور کی تفصیل کئی مقامات پر بیان کی گئی ہے۔ اس میں وہ عملی اور قولی توحید بیان کی گئی ہے جسے دے کر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو مبعوث فرمایا ہے۔ توحیدِ قولی کی مثال سورت اخلاص ہے اور عملی توحید کی مثال سورت کافرون۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی سنتوں اور طواف

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٠٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٠٠٨)

وغیرہ کی دو رکعات میں انہی دو سورتوں کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ نیز آپ فجر کی سنتوں اور طواف کی دو رکعات میں بالترتیب یہ آیات بھی پڑھا کرتے تھے:

﴿قُولُوٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ [البقرة: ١٣٦]

''کہہ دو ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہماری طرف اتارا گیا اور جو ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اس کی اولاد کی طرف اتارا گیا اور جو موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اور جو تمام نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا، ہم ان میں سے کسی ایک کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں۔''

اور دوسری رکعت میں یہ آیت:

﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ﴾ [آل عمران: ٦٤]

''کہہ دے اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے درمیان اور تمھارے درمیان برابر ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں اور ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب نہ بنائے۔ پھر اگر وہ پھر جائیں تو کہہ دو گواہ رہو کہ بے شک ہم فرماں بردار ہیں۔''

ان دونوں آیات میں دینِ اسلام ہے، اور ان دونوں ہی میں قولی اور عملی ایمان بھی ہے، لہٰذا یہ آیت:

﴿قُولُوٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ [البقرة: ١٣٦]

''کہہ دو ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہماری طرف اتارا گیا اور جو ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اس کی اولاد کی طرف اتارا گیا اور جو موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اور جو تمام نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا، ہم ان میں سے کسی ایک کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں۔''

قولی ایمان اور اسلام پر مشتمل ہے۔ اور دوسری آیت:

﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ﴾ [آل عمران: ٦٤]

”کہہ دے اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے درمیان اور تمھارے درمیان برابر ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں اور ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب نہ بنائے۔ پھر اگر وہ پھر جائیں تو کہہ دو گواہ رہو کہ بے شک ہم فرماں بردار ہیں۔“

عملی اسلام اور ایمان پر مشتمل ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت جس سے اس نے اپنے بندوں کو نوازا ہے وہ اسلام اور ایمان کی نعمت ہے اور یہ دونوں ان دونوں آیات میں مذکور ہیں، واللہ أعلم.[1]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۱/۳۱۳۔۳۲۸)

فرشتوں پر ایمان

بندے کے ساتھ مقرر فرشتوں اور صبح و شام کے فرشتوں کی وضاحت

سوال بندے کے ساتھ جو فرشتے مقرر ہیں کیا وہ اس کے ساتھ ہمیشہ رہتے ہیں یا اللہ تعالیٰ ان کے علاوہ دو فرشتے روزانہ اس کے پاس بھیجتا ہے؟ کیا مقرر فرشتوں سے مراد رات اور دن کے مقرر فرشتے ہیں؟ قرآن کی آیت:

﴿ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً حَتَّى إِذَا جَاءَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُونَ ﴾ [الأنعام: ٦١]

''اور وہی اپنے بندوں پر غالب ہے اور تم پر نگہبان بھیجتا ہے، یہاں تک کہ جب تمھارے کسی ایک کو موت آتی ہے اسے ہمارے بھیجے ہوئے قبض کر لیتے ہیں اور وہ کوتاہی نہیں کرتے۔''

کا کیا مطلب ہے؟

جواب الحمد للہ، فرشتوں کی کئی ایک قسمیں ہیں: کچھ فرشتے ایسے ہیں جو بندے کے ساتھ ہمیشہ مقرر رہتے ہیں، جب کہ کچھ فرشتے وہ ہیں جو رات اور دن آتے جاتے ہیں اور وہ فجر اور عصر کی نماز میں ملتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سے پوچھتا ہے، حالاں کہ وہ ان سے زیادہ اچھی طرح جانتا ہے کہ تم میرے بندے کو کس حال میں چھوڑ کر آئے ہو؟ جواب میں وہ کہتے ہیں کہ جب ہم ان کے پاس پہنچے وہ نماز پڑھ رہے تھے اور ہم ان کو نماز ہی کی حالت میں چھوڑ کر آئے ہیں۔ لوگوں کے اعمال لکھنے والوں کے علاوہ بعض دوسرے فرشتے بھی ہیں جو ذکر کی مجالس میں شریک ہوتے ہیں۔

بندوں کے اعمال مجموعی طور پر بھی پیش کیے جاتے ہیں اور ایک ایک کر کے بھی۔ چنانچہ رات کے اعمال دن کے اعمال سے پہلے پیش کیے جاتے ہیں اور دن کے اعمال رات سے پہلے پیش کیے جاتے ہیں۔ اللہ کے حضور ہر پیر اور جمعرات کو بھی اعمال پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ تمام باتیں صحیح احادیث میں موجود ہیں۔ رہا اس بات کا سوال کہ کیا بندے کے پاس ہر روز دو نئے فرشتے آتے ہیں تو اس سلسلے میں کوئی بات ہم تک نہیں پہنچی ہے۔ واللہ أعلم [1]

[1] مجموع الفتاویٰ (٢٥٢/٤)

بندے کے ارادے پر فرشتے کے اطلاع پانے کی کیفیت

سوال نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

«إِذَا هَمَّ الْعَبْدُ بِالْحَسَنَةِ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كُتِبَتْ لَهُ حَسَنَة... الحديث »[1]

''بندہ جب کسی نیکی کا ارادہ کرتا ہے، لیکن اس پر عمل نہیں کر پاتا پھر بھی اس کے لیے ایک نیکی لکھی جاتی ہے۔''

جب ارادہ بندے اور اس کے رب کے درمیان ایک راز ہے تو فرشتوں کو اس کی اطلاع کیسے ہو جاتی ہے؟

جواب الحمد لله: اس سوال کے جواب میں سفیان بن عیینہ کا یہ قول نقل کیا جاتا ہے کہ انھوں نے فرمایا: بندہ جب نیکی کا ارادہ کرتا ہے تو فرشتہ اس کی خوشبو سونگھ لیتا ہے۔ اسی طرح جب وہ برائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس کی بدبو فرشتے کو محسوس ہو جاتی ہے۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اللہ اس بات پر قادر ہے کہ بندے کے دل کی بات پر فرشتے کو جیسے چاہے مطلع فرما دے جس طرح وہ اس بات پر قادر ہے کہ بعض انسانوں کو دوسرے انسان کے دل کی بات پر مطلع فرما دیتا ہے۔

جب بعض انسانوں کو اللہ اس طرح کا کشف مہیا کر دیتا ہے کہ وہ اس کے ذریعے بسا اوقات دوسرے انسان کے دل کی بات معلوم کر لیتا ہے تو مقرر کیے ہوئے فرشتے کو بدرجہ اولی اس سے واقف کرا سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ ﴾ [ق:١٦]

''اور ہم اس کی رگِ جاں سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔''

اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس سے مراد فرشتے ہیں۔ اللہ نے فرشتے مقرر کر رکھے ہیں جو بندے کے دل میں خیالات کا القا کرتے ہیں، جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''فرشتے کا الہام ہوتا ہے اور شیطان کا وسوسہ ڈالنا۔ فرشتے کا الہام حق کی تصدیق اور نیکی اور بھلائی کا وعدہ کرنا ہے اور شیطان کا وسوسہ ڈالنا حق کی تکذیب کرنا اور برائی کا وعدہ کرنا ہے۔''[2] حدیثِ صحیح میں نبی اکرم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''ہر ایک آدمی کے ساتھ ایک فرشتہ مقرر ہوتا ہے اور ایک جن بھی اس کا ساتھی ہوتا ہے۔ لوگوں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! کیا آپ کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے؟ فرمایا: میں اس سے الگ نہیں ہوں، لیکن اللہ نے جن کے خلاف میری مدد فرمائی ہے اور وہ مجھے صرف نیکی اور بھلائی کا ہی حکم دیتا ہے۔''[3]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٢٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٨-١٣١)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٩٨٨) ضعيف الجامع (١٩٦٣)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨١٤)

لہٰذا بندہ جس برائی کا ارادہ کرتا ہے، جب وہ شیطان کی طرف سے القا ہوتا ہے تو وہ شیطان کے علم میں ہوتا ہے۔ اسی طرح بندہ جب نیکی کا ارادہ کرتا ہے تو جب وہ فرشتے کی طرف سے القا ہوتا ہے تو بدرجہ اولیٰ وہ فرشتے کے علم میں ہوتا ہے۔ جب اسے فرشتہ جانتا ہے تو بنو آدم کے اعمال کا ریکارڈ تیار کرنے والے فرشتوں کے علم میں اس کا آنا ممکن ہے۔ ①

فرشتوں کی موت

سوال کیا تمام مخلوق کے ساتھ ساتھ فرشتوں کو بھی موت آئے گی؟

جواب اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ تمام مخلوق موت سے دوچار ہوگی، یہاں تک کہ فرشتے اور موت کے فرشتے عزرائیل بھی۔ اس سلسلے میں نبی اکرم ﷺ سے مرفوع حدیث بھی روایت کی گئی ہے۔ مسلمان، یہودی اور نصاریٰ اس کے امکان پر متفق ہیں اور اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ اس پر قادر ہے۔ اس کی مخالفت فلسفیوں کی ایک جماعت، ارسطو کے پیروکار اور ان کے جیسے لوگوں نے کی ہے۔ اسی طرح ان کے گروہ میں بعض نام نہاد مسلمان، یہودی اور نصرانی جیسے "رسائل اخوان الصفا" کے مصنفین اور ان کے جیسے لوگ بھی شامل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ فرشتے عقول اور نفوس ہیں، ان کو کسی بھی حال میں موت نہیں آسکتی، بلکہ وہ ان کی نظر میں معبود اور اس دنیا کے رب ہیں۔

قرآن اور دیگر تمام آسمانی کتابیں اعلان کرتی ہیں کہ فرشتے تدبیر کرنے والے بندے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓىِٕكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ﴾ [النساء: ١٧٢]

"مسیح ہرگز اس سے عار نہ رکھے گا کہ وہ اللہ کا بندہ ہو اور نہ مقرب فرشتے ہی اور جو بھی اس کی بندگی سے عار رکھے اور تکبر کرے تو عنقریب وہ ان سب کو اپنی طرف اکٹھا کرے گا۔"

ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴿26﴾ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿27﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى ﴾

[الأنبياء: ٢٦-٢٨]

① مجموع الفتاویٰ (٤/٢٥٣-٢٥٤)

اور انھوں نے کہا رحمٰن نے کوئی اولاد بنا رکھی ہے، وہ پاک ہے، بلکہ وہ بندے ہیں جنھیں عزت دی گئی ہے۔ وہ بات کرنے میں اس سے پہل نہیں کرتے اور وہ اسی کے حکم کے ساتھ ہی عمل کرتے ہیں۔ وہ جانتا ہے جو ان کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے اور وہ سفارش نہیں کرتے مگر اسی کے لیے جسے وہ پسند کرے۔"

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِنْ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى ﴾ [النجم: ٢٦]

"اور آسمانوں میں کتنے ہی فرشتے ہیں کہ ان کی سفارش کچھ کام نہیں آتی مگر اس کے بعد کہ اللہ اجازت دے جس کے لیے چاہے اور (جسے) پسند کرے۔"

اللہ تعالیٰ قادر ہے کہ وہ ان پر موت طاری کر دے اور پھر انھیں زندہ کر دے، جس طرح وہ انسان اور جن کو موت دینے اور دوبارہ ان کو زندہ کرنے پر قادر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ﴾ [الروم: ٢٧]

"اور وہی ہے جو خلق کو پہلی بار پیدا کرتا ہے، پھر اسے دوبارہ پیدا کرے گا اور اسے وہ زیادہ آسان ہے۔"

صحیح حدیث میں نبی اکرم ﷺ سے کئی ایک سندوں اور کئی ایک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

"جب اللہ وحی کے ذریعے کلام فرماتا ہے تو فرشتوں پر غشی جیسی چیز طاری ہو جاتی ہے۔"

ایک دوسری روایت کے الفاظ ہیں:

"جب فرشتے اس کا کلام سنتے ہیں تو بے ہوش ہو جاتے ہیں۔"

ایک اور روایت میں ہے:

"فرشتوں نے چٹان پر زنجیر کھینچے جانے جیسی آواز سنی تو بے ہوش ہو گئے۔ جب ذرا گھبراہٹ ان کے دل سے دور ہوئی تو وہ باہم کہنے لگے کہ تمھارے رب نے کیا فرمایا؟ انھوں نے جواب دیا: حق فرمایا۔ پھر وہ حق حق پکاریں گے۔"[1]

مذکورہ بالا صحیح احادیث میں بتایا گیا ہے کہ فرشتے غشی طاری ہونے جیسی حالت سے دوچار ہوتے ہیں۔ جب ان پر غشی طاری ہو سکتی ہے تو موت بھی طاری ہو سکتی ہے۔ اس کے برعکس یہ فلسفی حضرات فرشتوں پر نہ غشی طاری ہونے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٢٤)

کے قائل ہیں اور نہ موت طاری ہونے کے۔ غشی جیسی بے ہوشی ٹھیک اسی طرح ہے جیسی بے ہوشی موسیٰ علیہ السلام پر طاری ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ﴾ [الأعراف: ١٤٣]

تو جب اس کا رب پہاڑ کے سامنے ظاہر ہوا تو اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔''

قرآن مجید تین نفخات (صور پھونکے جانے) کا ذکر کرتا ہے:

گھبراہٹ پیدا کرنے والا نفخہ۔ اس کا ذکر سورت نمل میں ہے:

﴿ وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ﴾

[النمل: ٨٧]

اور جس دن صور پھونکا جائے گا تو جو بھی آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، گھبرا جائے گا مگر جسے اللہ نے چاہا۔''

بے ہوش کر دینے والا اور اٹھا کر کھڑا کر دینے والا نفخہ۔ ان دونوں کا ذکر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے:

﴿ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ﴾ [الزمر: ٦٨]

''اور صور میں پھونکا جائے گا تو جو لوگ آسمانوں میں اور جو زمین میں ہوں گے، مر کر گر جائیں گے مگر جسے اللہ نے چاہا، پھر اس میں دوسری دفعہ صور پھونکا جائے گا تو اچانک وہ کھڑے دیکھ رہے ہوں گے۔''

''مگر وہ جسے اللہ چاہے'' سے جن کو مستثنیٰ کیا گیا ہے ان میں جنت میں موجود حوریں ہیں، کیوں کہ جنت میں موت نہیں آئے گی۔ اسی طرح بعض دوسرے لوگوں کو بھی یہ استثنا شامل ہے، لیکن یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے کن کن کو مستثنیٰ کیا ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس کو مطلق طور پر ذکر کیا ہے۔

صحیح بخاری میں موجود ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''قیامت کے دن تمام لوگ بے ہوش ہو جائیں گے۔ میں ہی وہ پہلا انسان ہوں گا جسے سب سے پہلے ہوش آئے گا۔ میں دیکھوں گا کہ موسیٰ علیہ السلام عرش کا پایہ تھامے ہوئے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ مجھ سے پہلے ہوش میں آچکے ہوں گے یا وہ ان لوگوں میں سے ہوں گے جن کو اللہ نے بے ہوش ہونے سے مستثنیٰ رکھا ہے۔''[1]

اس بے ہوشی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ چوتھا نفخہ ہوگا۔ بعض حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ ان نفخات

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٢٨٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٧٣)

میں سے ایک ہے جو قرآن میں مذکور ہیں۔

بہر حال جو بھی ہو، اس سے اتنا تو معلوم ہو جاتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں توقف اختیار کیا ہے کہ وہ استثنا میں شامل ہیں یا نہیں۔ جب نبی اکرم ﷺ نے ان کی تفصیلات نہیں بیان فرمائیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ کریمہ میں مستثنیٰ قرار دیا ہے، پھر ہمارے لیے کیوں کر ممکن ہے کہ ہم یقین کے ساتھ کوئی بات کہہ سکیں۔ اس طرح اس کی حیثیت قیامت کے وقت کے علم اور تمام انبیا کی تعیین کی ہو جاتی ہے اور یہ وہ باتیں ہیں جن کی آپ ﷺ نے خبر نہیں دی، جب کہ یہ علم صرف نبی اکرم ﷺ کے خبر دینے سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ واللہ أعلم وصلی اللہ علیٰ محمد وآله وصحبه وسلم.[1]

صالحین افضل ہیں یا فرشتے؟

سوال بنو آدم کے صالحین اور فرشتوں میں سے کون زیادہ افضل ہے؟

جواب انسانوں میں سے صالحین انجام کے کمال کے اعتبار سے اور فرشتے آغاز کے کمال کے اعتبار سے افضل ہیں۔

فرشتے اس وقت رفیقِ اعلیٰ میں ہیں اور ان برائیوں سے پاک صاف ہیں جن میں بنو آدم ملوث ہیں۔ اپنے رب تعالیٰ کی عبادت میں ڈوبے ہوئے ہیں اور بلاشبہہ ان کے اس وقت کے یہ حالات انسانوں کے حالات سے زیادہ مکمل ہیں۔

لیکن قیامت کے دن جنت میں داخل ہونے کے بعد انسانوں میں سے صالح لوگ فرشتوں کے حالات سے زیادہ مکمل ہوں گے۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اس تفصیل سے رازِ فضیلت کھل جاتا ہے اور دونوں فریقوں کے دلائل میں توافق پیدا ہو جاتا ہے اور ہر ایک کو اس کا حق مل جاتا ہے۔[2]

سوال محمد ﷺ کی امت کے فرماں بردار بندوں کے متعلق استفسار کیا گیا کہ آیا وہ فرشتوں سے افضل ہیں؟

جواب عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے ثابت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''فرشتوں نے عرض کی: اے میرے رب! تو نے بنو آدم کو دنیا میں اس طرح پیدا کیا ہے کہ وہ کھاتے ہیں، پیتے ہیں اور مزے کرتے ہیں، ہمارے لیے بھی آخرت میں وہی انتظام فرما دے، جیسا تو نے دنیا میں ان کے لیے کیا ہے۔ اللہ نے فرمایا: میں ایسا نہیں کروں گا۔ انھوں نے دوبارہ درخواست کی۔ اس بار بھی اللہ نے وہی فرمایا کہ میں ایسا نہیں کروں گا، پھر انھوں نے

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٤/٢٥٩۔٢٦١)

[2] مجموع الفتاوی (٤/٣٤٣)

جب تیسری بار اپنا مطالبہ دہرایا تو اللہ نے کہا: قسم ہے میری عزت کی! میں اپنی اس مخلوق کے صالحین کو جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے، اس مخلوق کی طرح کیوں کر کر دوں جسے میں نے کہا کہ ہو جا اور وہ ہو گئی۔'' یہ روایت عثمان بن سعید دارمی نے ذکر کی ہے اور اسے عبداللہ بن احمد نے ''السنن'' میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرسلاً روایت کیا ہے۔ ①

عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: ''اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مکرم کوئی مخلوق پیدا نہیں کی۔ پوچھا گیا: کیا جبریل اور میکائیل بھی نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سائل سے پوچھا: جانتے ہو کہ جبریل اور میکائیل کیا ہیں؟ جبریل اور میکائیل سورج اور چاند کی طرح ایک مسخر مخلوق ہیں۔ اللہ نے کوئی مخلوق پیدا ہی نہیں کی جو اس کی نظر میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مکرم ہو۔''

مجھے کسی صحابی کے بارے میں نہیں معلوم کہ انھوں نے اس بات سے اختلاف کیا ہے۔ ائمہ اربعہ کے اصحاب اور دوسرے حضرات جو سنت کی طرف انتساب کرتے ہیں، ان کے یہاں بھی یہی بات مشہور ہے۔ یعنی انبیاے کرام اور اولیاے امت فرشتوں سے افضل ہیں۔ میں نے اس مسئلے پر مستقل ایک کتاب لکھی ہے جس میں فریقین کے دلائل تفصیل سے ذکر کیے گئے ہیں۔ ②

---

① کتاب السنة (٤٦٩/٢) (١٠٦٥) اس کی سند میں عثمان بن علاق مجہول راوی ہے۔ علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد (٨٢/١) میں کہا ہے کہ اسے طبرانی نے المعجم الکبیر اور المعجم الأوسط میں روایت کیا ہے، اس کی سند میں ابراہیم بن عبداللہ بن خالد مصیصی راوی کذاب ومتروک ہے۔ اسی طرح المعجم الأوسط کی روایت میں طلحہ بن زید راوی کذاب ہے۔ لہٰذا یہ روایت سخت ضعیف ہے۔

② مجموع الفتاویٰ (٣٤٤/٤)

تقدیر پر ایمان

ارادہ، اذن، کتابت، حکم، قضا اور تحریم میں شرعی و تکوینی تقسیم

سوال ارادہ، اذن (اجازتِ الٰہی) کتابت، حکم، قضا اور تحریم وغیرہ کے بارے میں تفصیل بتائیں کہ ان میں سے کون سا امر دینی (شرعی) ہے جو اللہ تعالیٰ کی محبت، رضا اور شرعی حکم کے مطابق ہے اور کون سا امر تکوینی (تخلیقِ کائنات سے متعلق) ہے جو اللہ تعالیٰ کی تکوینی مشیت کے مطابق ہے؟

جواب الحمد للہ. یہ مذکورہ امور اور ان کے علاوہ امرِ الٰہی، بعث و ارسال (رسول بھیجنا) وغیرہ جیسے امور کتاب اللہ میں دو قسموں میں منقسم ہیں:

پہلی قسم: وہ جن کا دینی و شرعی امور سے تعلق ہے، جن کو اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے، ایسا کرنے والوں کو ثواب دیتا ہے، ان کو جنت میں داخل کرے گا اور دنیا اور آخرت میں ان کی مدد کرتا ہے۔ وہ انھی اعمال کے بدلے میں اپنے پرہیز گار بندوں، دوستوں اور کامیابی پانے والے اپنے گروہ اور نیک بندوں کی مدد کرتا ہے۔

دوسری قسم: وہ جن کا تکوینی واقعات سے تعلق ہے، جن کا اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کیا، انھیں مقدر کیا۔ ان میں ایمان دار، بے ایمان، نیک، بد، جنتی، جہنمی، اللہ تعالیٰ کے دوست، دشمن، فرماں بردار جن سے وہ محبت کرتا ہے اور وہ اس سے محبت کرتے ہیں، وہ ان پر رحمت کرتا ہے اور فرشتے ان کے لیے دعائے رحمت کرتے ہیں اور نافرمان جن سے وہ نفرت کرتا ہے، جن سے ناراض ہوتا ہے اور لعنت کرتا ہے، پھر ہر کوئی لعنت کرنے والا بھی ان پر لعنت کرتا ہے، سب شریک ہیں۔

جو انسان ان امور پر اس پہلو سے نظر ڈالتا ہے وہ وجود کی تکوینی حقیقت کا مشاہدہ کرتا ہے تو دیکھتا ہے کہ تمام اشیا اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہیں، اس کی مشیت کے مطابق چلائی جاتی ہیں، اس کی حکمت کے ذریعے مغلوب ہیں۔ جو وہ چاہتا ہے ہو جاتا ہے، خواہ لوگ نہ چاہیں۔ جو وہ نہیں چاہتا نہیں ہوتا، خواہ لوگ چاہیں۔ اس کے حکم اور فیصلے پر کوئی نظر ثانی کرنے والا نہیں، نہ کوئی اس کے حکم کو بدل سکتا ہے۔ وہ ہر چیز کا رب اور مالک ہے۔ پیدا کرنا اور حکم دینا اسی کا کام ہے۔ اس کے سوا سب پروردہ، تدبیر کیا گیا، اور مغلوب ہے جو اپنے لیے نہ کسی فائدے کا مالک ہے نہ نقصان

کا۔ اور نہ زندگی موت اور مرنے کے بعد اٹھنے ہی کا اختیار رکھتا ہے، بلکہ وہ ہر جہت سے بندۂ محتاج ہے۔ اللہ تعالیٰ جس طرح تمام مخلوقات سے بے نیاز ہے، اسی طرح اس سے بھی بے نیاز ہے۔ یہ شہود اور مشاہدہ فی نفسہٖ حق ہے، لیکن ایک گروہ نے اس میں تقصیر کی ہے، یہ مجوسی قدریہ ہیں۔ اور ایک گروہ اسی پر جم گیا ہے، یہ مشرک قدریہ ہیں۔

پہلے گروہ کا عقیدہ ہے کہ مخلوقات میں ایسے امور ہیں جو اللہ تعالیٰ کی قدرت اور مشیت کے ساتھ تعلق نہیں رکھتے، جیسے: بندوں کے افعال۔ اس گروہ کے غالی اور انتہا پسند افراد اللہ تعالیٰ کے قدیمی علم اور اس کی تقدیر کے پہلے سے لکھے ہونے کا انکار کرتے ہیں۔ اس امت میں سب سے پہلے ان کا ظہور ہوا، صحابہ کرام اور سلف صالحینِ امت نے ان کی تردید کی اور ان سے براءت کا اظہار کیا۔

دوسرا گروہ پہلے سے بھی زیادہ برا ہے۔ یہ تصوف وسلوک، زہد و ارادہ اور فقر وتعبد کی راہ پر چلنے والوں کے گروہ ہیں۔ وہ اس حقیقت کا مشاہدہ کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات کا خالق ہے۔ وہ بندوں کے افعال کا خالق اور تمام کائنات کا ارادہ کرنے والا ہے۔ وہ اس کے بعد کفر و ایمان، معرفتِ الٰہی اور انکارِ الٰہی، حق و باطل، ہدایت یافتہ اور گمراہ، ہدایت دینے والے اور گمراہ کرنے والے، سچے نبی اور جھوٹے نبی، ولی اللہ اور دشمنِ خدا، اللہ کے پسندیدہ اور ناپسندیدہ، محبوب اور مغضوب، ظلم و عدل، والدین کی فرماں برداری اور نافرمانی، اہلِ جنت کے اعمال اور اہلِ جہنم کے اعمال اور نیک لوگوں اور برے لوگوں کے درمیان کوئی فرق اور امتیاز نہیں کرتے۔ انھوں نے یہ مشاہدہ کیا کہ کائنات میں قضائے سابق، یعنی تقدیر مشیتِ نافذہ، قدرتِ کاملہ اور تخلیقِ عام قدم قدم پر مشترک نظر آتی ہے۔ انھوں نے مخلوقات میں ان مشترک امور کا مشاہدہ تو کیا مگر جہاں ان میں افتراق و امتیاز تھا اس سے صرفِ نظر کیا۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ مسلمان اور مجرم کو ایک نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ﴾ [القلم: ٣٥]

''تو کیا ہم فرماں برداروں کو جرم کرنے والوں کی طرح کر دیں گے؟''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ﴾ [صٓ: ٢٨]

''کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے، زمین میں فساد کرنے والوں کی طرح کر دیں گے؟ یا کیا ہم پرہیز گاروں کو بدکاروں جیسا کر دیں گے؟''

تیسری جگہ فرمایا:

﴿ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾ [الجاثية: ٢١]

''یا وہ لوگ جنھوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا، انھوں نے گمان کر لیا ہے کہ ہم انھیں ان لوگوں کی طرح کر دیں گے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے۔''

ایک مقام پر ارشاد ہوا:

﴿ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ بِمَا صَبَرُوْا ﴾ [الأعراف: ١٣٧]

''اور تیرے رب کی بہترین بات بنی اسرائیل پر پوری ہوگئی، اس وجہ سے کہ انھوں نے صبر کیا۔''

نبی اکرم ﷺ کی درج ذیل حدیث بھی اسی معنی میں ہے:

«أَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللهِ التَّامَّاتِ الَّتِيْ لَا يَتَجَاوَزُهُنَّ بَرٌّ وَلَا فَاجِرٌ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَذَرَأَ، وَبَرَأَ وَمِنْ شَرِّ مَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا، وَمِنْ شَرِّ مَا ذَرَأَ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا، وَمِنْ شَرِّ فِتَنِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ، وَمِنْ شَرِّ كُلِّ طَارِقٍ إِلَّا طَارِقاً يَطْرُقُ بِخَيْرٍ، يَا رَحْمَانُ»[1]

''میں اللہ تعالیٰ کے ان مکمل اور پورے کلمات کے ذریعے کہ جن سے کوئی نیک اور بد تجاوز نہیں کر سکتا، اس کی ہر مخلوق اور اس کی بنائی اور پھیلائی ہوئی ہر چیز کے شر سے اس کی پناہ میں آتا ہوں اور آسمان سے اترنے والی اور اس کی جانب بلند ہونے والی اور جو اس نے زمین میں پھیلایا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے، ان تمام امور کے شر سے اس کی پناہ میں آتا ہوں، نیز دن اور رات کے فتنوں کے شر سے، ہر اچانک آنے والی بلا کے شر سے سوائے اس آنے والے کے جو خیر اور اچھائی لے کر آئے، اے رحمان!''

اس کے وہ کلمات جن سے کوئی نیک اور بد تجاوز نہیں کر سکتا، اس کا شرعی امر اور نہی نہیں، کیوں کہ فاجر اس کے امر (حکم) کی بھی نافرمانی کرتے ہیں اور نہی (منع کردہ) کی بھی، بلکہ ان سے مراد وہ کلمات ہیں جن سے نظامِ کائنات چلتا ہے اور کائنات کی تکوین و تخلیق ہوئی ہے۔

جہاں تک شرعی کلمات ہیں جو اس کے شرعی اور دینی امر و نہی پر مشتمل ہیں، جیسے: تورات، انجیل، زبور اور قرآن جیسی الٰہی کتابیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ۭ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ﴾ [التوبة: ٤٠]

''اور ان لوگوں کی بات نیچی کر دی جنھوں نے کفر کیا اور اللہ کی بات ہی سب سے اونچی ہے۔''

---

[1] مسند أحمد (٤١٩/٣) موطأ (٩٥٠/٢، ٩٥١)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«وَاسْتَحْلَلْتُمْ فُرُوجَهُنَّ بِكَلِمَةِ اللّٰهِ »[1]

''تم نے اللہ تعالیٰ کے کلمے کے ساتھ ان کی شرم گاہوں کو حلال کیا ہے (عورتوں کے ساتھ نکاح کیا ہے)۔''

اس آیت:

﴿ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ﴾ [الأنعام: ١١٥]

''اور تیرے رب کی بات سچ اور انصاف کے اعتبار سے پوری ہو گئی۔''

میں اس کا کلمہ دونوں انواع (شرعی اور تکوینی) کو عام ہے۔

پہلے معنی میں بعث (مبعوث کرنا، دوبارہ اٹھانا) کی مثال یہ آیت ہے:

﴿ فَإِذَا جَآءَ وَعْدُ أُولٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ ﴾ [بني اسرائيل: ٥]

''پھر جب ان دونوں میں سے پہلی کا وعدہ آیا تو ہم نے تم پر اپنے سخت لڑائی والے کچھ بندے بھیجے۔''

درج ذیل آیات سے دوسرا معنی مراد ہے:

﴿ هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ ﴾ [الجمعة: ٢]

''وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں ایک رسول انھی میں سے بھیجا۔''

﴿ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ ﴾ [البقرة: ١٢٩]

''اے ہمارے رب! اور ان میں انھی میں سے ایک رسول بھیج۔''

﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ ﴾ [النحل: ٣٦]

''اور بلاشبہ یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔''

پہلے معنی میں ارسال (رسول بنانا) کی مثال یہ آیت ہے:

﴿ أَلَمْ تَرَ أَنَّآ أَرْسَلْنَا الشَّيَاطِينَ عَلَى الْكَافِرِينَ تَؤُزُّهُمْ أَزًّا ﴾ [مريم: ٨٣]

''کیا تو نے نہیں دیکھا کہ بے شک ہم نے شیطانوں کو کافروں پر کھلا چھوڑ رکھا ہے، وہ انھیں ابھارتے ہیں، خوب ابھارنا۔''

﴿ وَأَرْسَلْنَا الرِّيَاحَ لَوَاقِحَ ﴾ [الحجر: ٢٢] ''اور ہم نے ہواؤں کو بار آور بنا کر بھیجا۔''

اور دوسرے معنی میں اس کی مثال درج ذیل آیات ہیں:

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢١٨)

﴿ اِنَّآ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِہٖۤ ﴾ [نوح:١] ''بے شک ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔''

﴿ اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ بِالۡحَقِّ بَشِیۡرًا وَّ نَذِیۡرًا ﴾ [البقرة: ١١٩]

''بے شک ہم نے تجھے حق کے ساتھ خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔''

﴿ وَسۡـَٔلۡ مَنۡ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ مِنۡ رُّسُلِنَاۤ ﴾ [زخرف: ٤٥]

''اور ان سے پوچھ جنھیں ہم نے تجھ سے پہلے اپنے رسولوں میں سے بھیجا۔''

﴿ وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰہِ ﴾ [النساء: ٦٤]

''اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اللہ کے حکم سے اس کی فرماں برداری کی جائے۔''

﴿ وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا نُوۡحِیۡۤ اِلَیۡہِ اَنَّہٗ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدُوۡنِ ﴾

[الأنبياء: ٢٥]

''اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف یہ وحی کرتے تھے کہ بے شک حقیقت یہ ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کرو۔''

﴿ اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلَیۡکُمۡ رَسُوۡلًا ۬ۙ شَاہِدًا عَلَیۡکُمۡ کَمَاۤ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ رَسُوۡلًا ﴿۱۵﴾ فَعَصٰی فِرۡعَوۡنُ الرَّسُوۡلَ فَاَخَذۡنٰہُ اَخۡذًا وَّبِیۡلًا ﴿۱۶﴾ ﴾ [المزمل: ١٥، ١٦]

''بلاشبہ ہم نے تمھاری طرف ایک پیغام پہنچانے والا بھیجا جو تم پر گواہی دینے والا ہے، جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک پیغام پہنچانے والا بھیجا۔ سو فرعون نے اس پیغام پہنچانے والے کی نافرمانی کی تو ہم نے اسے پکڑ لیا، نہایت سخت پکڑنا۔''[1]

مشیتِ الٰہی ماضی اور مستقبل دونوں میں کارگر ہے

سوال کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت (مرضی، ارادہ) ماضی اور مستقبل دونوں میں کارگر ہے۔ کچھ کہتے ہیں: مشیت مستقبل میں ہے، ماضی میں نہیں؟ ان دونوں میں درست کیا ہے؟

جواب ماضی اللہ تعالیٰ کی مشیت ہی کے ساتھ گزرا۔ مستقبل بھی وہی ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔

جس نے ماضی میں کہا: ''اللہ تعالیٰ نے، ان شاء اللہ، آسمانوں کو پیدا کیا، ان شاء اللہ محمد ﷺ کو رسول بنایا'' اس نے غلط کہا۔

جس نے کہا: ''اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت سے آسمانوں کو پیدا کیا، اپنی مشیت سے محمد ﷺ کو رسول بنایا''

[1] مجموع الفتاویٰ (٨/٥٨۔٦١)

اس نے درست کہا۔

جو کہتا ہے: ''اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر بھی کوئی چیز وجود میں آ جاتی ہے'' وہ غلط کہتا ہے۔ جو کہتا ہے: ''جو اللہ نے چاہا وہ ہو گیا اور جو نہیں چاہا وہ نہیں ہوا'' وہ صحیح کہتا ہے۔

جو پہلے گزر چکا ہے وہ سب قطعیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ رونما ہوا۔ اس نے آسمانوں کو قطعی طور پر اپنی مشیت کے ساتھ پیدا کیا۔ محمد ﷺ کو قطعی طور پر اپنی مشیت کے ساتھ رسول بنایا۔ موجود انسان کو اللہ تعالیٰ نے قطعی طور پر اپنی مشیت کے ساتھ پیدا کیا۔ اگر وہ مخلوق کو ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلنا چاہے تو بدل سکتا ہے اور وہ اس پر قادر ہے۔

لہٰذا جو اس نے پیدا کیا ہے وہ حتمی اور یقینی طور پر اس کی مشیت کے ساتھ رونما ہوا۔ اگر وہ اس کو بدلنا چاہے تو قطعی طور پر اپنی مشیت کے ساتھ بدل سکتا ہے۔ واللہ أعلم[1]

اچھائی اور برائی کی نسبت کس کی طرف کرنی چاہیے؟

سوال ایک گروہ اللہ کی قضا و قدر کے اچھا اور برا ہونے میں باہم اختلاف کا شکار ہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ اچھائی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور برائی بالخصوص نفس کی طرف سے؟

اس کے بارے میں فتوی درکار ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔

جواب اہلِ سنت والجماعت کا مذہب ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق، رب اور مالک ہے۔ اس کے سوا کوئی رب ہے نہ خالق۔ جو اس نے چاہا وہ ہو گیا اور جو نہ چاہا نہ ہوا۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے اور ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ بندے کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کے رسول کی فرماں برداری کا حکم دیا گیا ہے اور ان دونوں کی نافرمانی سے منع کیا گیا ہے۔ اگر وہ فرماں برداری کرے تو یہ ایک نعمت ہے اور اگر نافرمانی کرے تو وہ سزا اور مذمت کا سزاوار ٹھہرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حجت اس پر قائم ہے، لیکن اللہ تعالیٰ پر کسی کی کوئی حجت نہیں۔ سب کچھ اس کی قضا و قدر، مشیت اور قدرت کے تحت ہوتا ہے، لیکن وہ فرماں برداری کو پسند کرتا اور اس کا حکم دیتا ہے۔ جو فرماں برداری اختیار کرے اس کو ثواب دیتا ہے اور اس کی عزت افزائی کرتا ہے۔ وہ نافرمانی کو ناپسند کرتا ہے اور اس سے منع کرتا ہے اور جو نافرمانی کرتا ہے اس کو سزا دیتا اور رسوا کرتا ہے۔

بندے کو جو نعمت ملے وہ اللہ تعالیٰ کے نوازنے کی وجہ سے ہوتی ہے اور جس برائی اور پریشانی کا سامنا کرنا

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٦٢/٨)

پڑے وہ اس کے گناہوں اور نافرمانیوں کا خمیازہ ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَمَآ اَصٰبَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ ﴾ [الشوریٰ: ٣٠]

''اور جو بھی تمھیں کوئی مصیبت پہنچی تو وہ اس کی وجہ سے ہے جو تمھارے ہاتھوں نے کمایا۔''

﴿ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ﴾ [النساء: ٧٩]

''جو کوئی بھلائی تجھے پہنچے سو اللہ کی طرف سے ہے اور جو کوئی برائی تجھے پہنچے سو تیرے نفس کی طرف سے ہے۔''

یعنی جو نصرت، شادابی اور ہدایت تم کو نصیب ہو وہ اللہ تعالیٰ کے تجھ کو نوازنے کی وجہ سے ہوتی ہے اور جو غم، ذلت اور برائی ملے تو وہ تمھارے گناہوں اور غلطیوں کی وجہ سے ہوتی ہے۔ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی مشیت، قدرت اور تخلیق ہی سے وجود پذیر ہوتی ہیں، لہٰذا انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر اور شریعت و حکم پر ایمان و یقین رکھنا ازبس ضروری ہے۔

جو شخص امور کی تقدیری حقیقت کو مدِ نظر رکھتا ہے اور امر و نہی اور وعد (نیکیوں پر جنت کا وعدہ) اور وعید (نافرمانیوں پر جہنم کی دھمکی) سے صرفِ نظر کرتا ہے وہ مشرکوں سے مشابہت رکھتا ہے۔

جو امر و نہی کو مدِ نظر رکھتا ہے اور قضا و قدر کی تکذیب کرتا ہے وہ مجوسیوں سے مشابہت رکھتا ہے اور جو ان دونوں پر ایمان رکھتا ہے، جب اچھا کام کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی تعریف کرتا ہے اور جو کوئی برا کام کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرتا اور جانتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر کی وجہ سے ہے تو وہ مومنوں سے ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام سے جب گناہ سرزد ہوا تو انھوں نے توبہ کی۔ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو چن لیا اور ہدایت دی۔ لیکن ابلیس نے اصرار کیا اور کٹ حجتی کی تو اللہ تعالیٰ نے اس کو لعنت کا طوق پہنا کر دور کر دیا۔

چنانچہ جو توبہ کرتا ہے وہ آدم علیہ السلام سے تعلق رکھتا ہے اور جو تقدیر کو حجت بنا کر گناہ پر اصرار کرتا ہے وہ ابلیسی ٹولے کا فرد ہے۔ نیک بخت اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں اور بدبخت اپنے دشمن ابلیس کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس سیدھی راہ پر چلائے جو انبیا، صدیقین، شہدا اور صالحین جیسے انعام یافتہ افراد کی راہ ہے۔ آمین یا رب العالمین [1]

قرآن میں وارد حسنات اور سیئات کی تفسیر

سوال ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٨/٦٣-٦٤)

﴿وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ۚ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا﴾
[النساء: ۷۸]

''اور اگر انھیں کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر انھیں کوئی برائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں یہ تیری طرف سے ہے۔ کہہ دے سب اللہ کی طرف سے ہے، پھر ان لوگوں کو کیا ہے کہ قریب نہیں ہیں کہ کوئی بات سمجھیں۔''

اس میں حسنات (اچھائیاں) اور سیئات (برائیاں) سے کیا مراد ہے؟

جواب اس آیت میں حسنات سے مراد نعمتیں اور سیئات سے مراد مصیبتیں ہیں، جس طرح مندرجہ ذیل آیات میں بھی ان کا ذکر ہے، فرمایا:

﴿وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾ [الأعراف: ۱۶۸]

''اور ہم نے اچھے حالات اور برے حالات کے ساتھ ان کی آزمائش کی، تاکہ وہ باز آجائیں۔''

﴿اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ۚ﴾ [آل عمران: ۱۲۰]

''اگر تمھیں کوئی بھلائی پہنچے تو انھیں بری لگتی ہے اور اگر تمھیں کوئی تکلیف پہنچے تو اس پر خوش ہوتے ہیں۔''

﴿اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَآ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ﴾
[التوبة: ۵۰]

''اگر تجھے کوئی بھلائی پہنچے تو انھیں بری لگتی ہے اور اگر تجھے کوئی مصیبت پہنچے تو کہتے ہیں ہم نے تو پہلے ہی اپنا بچاؤ کر لیا تھا۔''

قوم فرعون کے متعلق اللہ نے ذکر کیا:

﴿فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ۚ﴾
[الأعراف: ۱۳۱]

''اور جب ان پر خوش حالی آتی تو کہتے یہ ہمارے ہی لیے ہے اور اگر انھیں کوئی تکلیف پہنچتی تو موسیٰ اور اس کے ساتھ والوں کے ساتھ نحوست پکڑتے۔''

یہ آیات جہاد کے حکم اور منافقوں کی مذمت کے سیاق اور پس منظر میں نازل ہوئیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اَيْنَمَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ۚ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا﴾ [النساء: ۷۸]

''تم جہاں کہیں بھی ہو گے، موت تمھیں پا لے گی، خواہ تم مضبوط قلعوں میں ہو۔ اور اگر انھیں کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر انھیں کوئی برائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں یہ تیری طرف سے ہے۔ کہہ دے سب اللہ کی طرف سے ہے، پھر ان لوگوں کو کیا ہے کہ قریب نہیں ہیں کہ کوئی بات سمجھیں۔''

جب ان کو نصرت اور رزق وغیرہ جیسی کوئی نعمت ملتی تو کہتے: یہ اللہ کی طرف سے ہے اور جب وہ خوف اور قحط وغیرہ میں مبتلا ہوتے تو کہتے: یہ محمد (ﷺ) کی طرف سے ہے اور اس دین کی وجہ سے جو اس نے پیش کیا، جس طرح قومِ فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یہی کہا تھا، تو اللہ نے کہا:

﴿ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ﴾ [النساء: ۷۸]

''پھر ان لوگوں کو کیا ہے کہ قریب نہیں ہیں کہ کوئی بات سمجھیں۔''

محمد ﷺ تو ان کے پاس ہدایت اور حق لے کر آئے ہیں اور وہ تو اس کو نیکی کا حکم دیتے اور برائی سے منع کرتے ہیں، پھر فرمایا: ﴿ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ ﴾ [النساء: ۷۹] یعنی نصرت اور رزق وغیرہ۔ ﴿ فَمِنَ اللّٰهِ ﴾ [النساء: ۷۹] تو وہ اللہ کی طرف سے ہے۔ ﴿ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ ﴾ [النساء: ۷۹] یعنی خوف اور خشک سالی وغیرہ ﴿ فَمِنْ نَّفْسِكَ ﴾ [النساء: ۷۹] تو وہ تیرے گناہوں کی وجہ سے۔ یہ اللہ کی قضا و قدر کے ساتھ ہوتا تھا، تاہم ہم تقدیر پر ایمان تو رکھتے ہیں، لیکن اس کو دلیل نہیں بناتے، کیوں کہ بندے کے پاس اللہ کے خلاف حجت قائم کرنے کا کوئی اختیار اور حق نہیں، بلکہ حجتِ بالغہ اللہ ہی کی ہے۔

اس کی نظیر اور ہم معنی یہ آیات بھی ہیں:

﴿ وَمَآ اَصٰبَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ﴾ [الشوریٰ: ۳۰]

''اور جو بھی تمھیں کوئی مصیبت پہنچی تو وہ اس کی وجہ سے ہے جو تمھارے ہاتھوں نے کمایا اور وہ بہت سی چیزوں سے درگزر کر جاتا ہے۔''

﴿ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ اِذَا هُمْ يَقْنَطُوْنَ ﴾ [الروم: ۳۶]

''اور اگر انھیں کوئی برائی پہنچتی ہے تو اچانک وہ ناامید ہو جاتے ہیں۔''

﴿ اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ۭ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ﴾
[آل عمران: ۱۶۵]

''اور کیا جب تمھیں ایک مصیبت پہنچی کہ یقیناً اس سے دگنی تم پہنچا چکے تھے تو تم نے کہا یہ کیسے ہوا؟ کہہ دے یہ تمھاری طرف سے ہے۔''

صحیح مسلم میں حدیثِ قدسی ہے، جس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''میرے بندو! یہ تمھارے اعمال ہی ہیں جو میں تمھارے لیے گنتا ہوں اور شمار کرتا ہوں، تمھیں ان کا پورا بدلہ دوں گا، جو اچھائی پائے وہ اللہ کی تعریف کرے اور جو اس کے علاوہ کچھ اور پائے تو وہ صرف اپنے آپ کو ملامت کرے۔''[1]

سید الاستغفار میں بندہ کہتا ہے:

«اَللّٰهُمَّ أَنْتَ رَبِّيْ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ، خَلَقْتَنِيْ وَأَنَا عَبْدُكَ، وَأَنَا عَلٰى عَهْدِكَ وَوَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ، أَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ، أَبُوْءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ وَأَبُوْءُ بِذَنْبِيْ، فَاغْفِرْ لِيْ فَإِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا أَنْتَ»

جو انسان یقین کے ساتھ صبح یہ کلمات پڑھتا ہے، اگر اس دن مر جائے تو جنت میں جائے گا اور جو یقین کے ساتھ شام کے وقت پڑھے اور اس رات مر جائے تو جنت میں داخل ہو جائے گا۔ (رواه البخاري)[2] ''أَبُوْءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ'' کا مطلب ہے: میں تیری نعمتوں کا اعتراف و اقرار کرتا ہوں اور اپنے گناہوں کا اعتراف و اقرار بھی کرتا ہوں۔

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٥٩٤٧)

جو شخص کہتا ہو کہ اس کا مواخذہ نہیں ہو گا یا اس نے کبھی گناہ اور غلطی نہیں کی یا جو حقیقت کا مشاہدہ کرے، اس سے امر و نہی اور سزا و ثواب سب کچھ ساقط ہو جاتا ہے۔ وہ مشرک اور یہود و نصاریٰ سے بھی بڑا کافر ہے۔ جو یہ کہتا ہو کہ اللہ کی قضا و قدر کوئی چیز نہیں، وہ اس امت کا مجوسی اور قدری ہے۔ جس شخص کا یہ عقیدہ ہو کہ ہر چیز اللہ کی قضا و قدر کے نتیجے میں وقوع پذیر ہوتی ہے اور اس کو علم ہو کہ تقدیر پر ایمان رکھا جاتا ہے، اس کو اللہ پر بطورِ حجت پیش نہیں کیا جاتا، کیوں کہ بندے کے پاس اپنے رب کے خلاف کوئی حجت نہیں، بلکہ حجتِ بالغہ اللہ ہی کی ہے۔ ایسا انسان جب نیکی کرے تو اس پر اللہ کا شکر کرتا ہے اور جب برائی کرے تو اللہ سے بخشش طلب کرتا ہے، یہی موحد ہے۔ جس کی یہ رائے ہے کہ اس آیت میں حسنات و سیئات سے مراد نیکیاں اور برائیاں ہیں جس طرح اس آیت میں ذکر ہوا ہے:

﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰۤى اِلَّا مِثْلَهَا﴾

[الأنعام: ١٦٠]

''جو شخص نیکی لے کر آئے گا تو اس کے لیے اس جیسی دس نیکیاں ہوں گی اور جو برائی لے کر آئے گا سو اسے جزا نہیں دی جائے گی، مگر اسی کی مثل۔''

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٥٧٧)

اس کا موقف غلط ہے، کیوں کہ اس سے قرآن میں تناقض لازم آئے گا۔ وہاں اللہ نے بتایا ہے کہ دونوں ہی اللہ کی طرف سے ہیں۔ یہ بھی بتایا ہے کہ حسنہ اللہ کی طرف سے ہے اور سیئہ تیری طرف سے۔ نیز اللہ نے یہ کہا ہے: ﴿مَآ اَصَابَكَ﴾ ''جو تجھے پہنچے۔'' یہ نہیں کہا: "مَا أَصَبْتَ" اگر اس سے بندوں کے افعال مراد ہوتے تو الفاظ اس طرح ہوتے: "مَا أَصَبْتَ" یا "مَا كَسَبْتَ" یا "مَا فَعَلْتَ" وغیرہا (یعنی جو تو نے کیا اور کمایا) لیکن یہاں اس نے نعمتیں اور مصیبتیں مراد لی ہیں جو دونوں اللہ کی طرف سے ہیں، لیکن نعمتیں اس کے احسان و انعام کا نتیجہ ہیں اور مصیبتیں بندوں کے گناہوں کا کیا دھرا ہے۔ اسی لیے فرمایا:

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ﴾ [الأنفال: ٣٣]

''اور اللہ کبھی ایسا نہیں کہ انھیں عذاب دے، جب کہ تو ان میں ہو اور اللہ انھیں کبھی عذاب دینے والا نہیں جب کہ وہ بخشش مانگتے ہوں۔'' واللہ أعلم.[1]

اچھائی اللہ کی طرف سے اور برائی بندے کے ہاتھ میں ہونے کا عقیدہ

سوال ایک شخص یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ خیر (اچھائی) اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور شر (برائی) شیطان کی طرف سے۔ برائی انسان کے ہاتھ میں ہے، چاہے تو کرے اور چاہے تو نہ کرے۔ جب اس کے اس عقیدے کی تردید کی جائے تو وہ کہتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ﴾ [الأعراف: ٢٨] ''بے شک اللہ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا۔''

﴿فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ ۫ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ﴾ [الزمر: ٧]

''یقیناً اللہ تم سے بہت بے پروا ہے اور وہ اپنے بندوں کے لیے ناشکری پسند نہیں کرتا۔''

اس شخص کا عقیدہ ہے کہ اچھائی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور برائی اس کے ہاتھ میں ہے۔ جب وہ برائی کرنا چاہے تو کر لیتا ہے، وہ کہتا ہے: میری مشیت اور مرضی ہے۔ میں جب برائی کرنا چاہوں کر لیتا ہوں۔ تو کیا اس کی مشیت فعال ہے کہ نہیں؟

جواب اس گفتگو کی اصل دو مقدمے ہیں:

پہلا مقدمہ: بندہ یہ جانے کہ اللہ تعالیٰ ایمان اور نیک عمل کا حکم دیتا ہے۔ وہ نیکیوں کو پسند کرتا ہے۔ ان سے خوش ہوتا ہے۔ نیکی کرنے والوں کو عزت، ثواب اور دوستی سے نوازتا ہے۔ ان سے راضی ہوتا ہے۔ ان سے محبت کرتا ہے

[1] جامع المسائل (٣/٢٦٥_٢٦٧)

اور وہ بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کا نصرت یافتہ لشکر، غالب آنے والا گروہ اس کے پرہیز گار دوست، اس کا کامیاب گروہ اور اس کے نیک جنتی بندے ہیں۔ وہ انبیا، صدیقین، شہدا اور صالحین میں سے ہیں اور وہی اس صراطِ مستقیم پر چلنے والے ہیں جو انعام یافتہ، ہدایت یافتہ اور اس کے محبوب بندوں کا راستہ ہے۔

وہ یہ بھی جانے کہ اللہ تعالیٰ نے کفر، نافرمانی اور گناہوں جیسی برائیوں سے منع کیا ہے۔ وہ ان سے نفرت رکھتا ہے۔ ان گناہوں میں مبتلا افراد سے ناراض ہوتا ہے۔ ان پر غصہ کرتا ہے۔ ان پر لعنت کرتا ہے۔ ان سے عداوت رکھتا ہے۔ ان کو سزا دے گا۔ وہ اللہ اور اس کے رسول کے دشمن ہیں۔ شیطان کے دوست، بدبخت اور جہنمی ہیں، لیکن وہ ان امور میں کافر و فاسق اور غیر کافر نافرمان اور گناہ گار کے درمیان ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں۔

دوسرا مقدمہ: بندہ جانے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا رب، خالق اور مالک ہے۔ اس کے سوا کوئی رب ہے نہ خالق۔ اس نے جو چاہا ہو گیا، جو نہیں چاہا نہیں ہوا۔ اس کے بغیر نیکی کرنے کی طاقت ہے نہ برائی سے بچنے کی قوت۔ اس کے علاوہ کوئی جائے پناہ نہیں اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، زمین و آسمان میں جو اعیان (موجودات، ذاتیں)، ان کی صفات اور حرکات ہیں وہ سب اسی کی پیدا کردہ۔ اس کی قدرت کا نتیجہ اور اس کی مشیت کے تصرف میں ہیں۔ کوئی چیز اس کی قدرت اور بادشاہت سے باہر نہیں۔ ان میں کوئی بھی اس کا شریک نہیں۔ وہ پاک ہے اس کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں۔ وہ اکیلا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس کی بادشاہی اور اسی کے لیے تمام تعریفات ہیں اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ بندہ ہر چیز میں اسی کا محتاج ہے۔ اسی کے در کا فقیر ہے اور وہ لمحہ بھر کے لیے اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ جس کو اللہ ہدایت دے اس کو کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جس کو وہ گمراہ کر دے اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔

جب یہ دونوں مقدمات ثابت ہو جائیں تو ہم کہیں گے: جب بندے کے دل میں یہ ڈالا جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ہدایت مانگے اور اس سے اس کی فرماں برداری کرنے میں مدد مانگے تو وہ اس کی مدد بھی کرتا ہے اور اس کی اعانت بھی کرتا ہے۔ یہ اس کی دنیاوی اور اخروی نیک بختی کا سبب بن جاتا ہے۔

وہ جب بندے کو رسوا کرے تو وہ نہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے نہ اس سے مدد طلب کرتا ہے اور نہ اس پر توکل ہی کرتا ہے، بلکہ اس کو اسی کی اپنی قوت کے سپرد کر دیا جاتا ہے، لہٰذا شیطان اس کو صحیح راہ سے روک دیتا ہے اور اس سے پھیر کر غلط راہ پر لگا دیتا ہے، چنانچہ وہ دنیا اور آخرت میں بدبخت ہو جاتا ہے۔

کائنات میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر کا نتیجہ ہے، کوئی بھی اپنی اس تقدیر سے باہر نہیں نکل سکتا جو لوحِ محفوظ میں اس کے لیے لکھ دی گئی ہے اور کسی کے پاس اللہ تعالیٰ کے خلاف کوئی حجت نہیں، بلکہ کامل حجت

اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے، ارشاد ہے:

﴿ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴾ [الأنعام: ١٤٩]

''کہہ دے پھر کامل دلیل تو اللہ ہی کی ہے، سو اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ضرور ہدایت دے دیتا۔''

اس کی طرف سے ملنے والی ہر نعمت اس کا فضل ہے اور اس کی طرف سے لیا جانے والا ہر انتقام اس کا عدل ہے۔ بندے کو تقدیر پر ایمان رکھنا چاہیے اور اس کو اللہ تعالیٰ کے سامنے بطورِ حجت پیش کرنا اس کو زیب نہیں دیتا۔ تقدیر پر ایمان رکھنا ہدایت ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ کے سامنے بطورِ حجت پیش کرنا گمراہی اور ہلاکت ہے۔ تقدیر پر ایمان لانے کا لازمی تقاضا ہے کہ انسان صبر و شکر کرے، مصیبت پر صبر کرے اور فراخی پر شکر۔ جب اس کو کوئی نعمت ملے تو اس کو یقین ہونا چاہیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، لہٰذا اس کا شکر کرے، خواہ وہ نعمت کوئی نیکی ہو جو اس نے کی ہو، یا اس کو اپنی کوشش کا کوئی پھل ملا ہو، کیوں کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی نیکیاں کرنے کی توفیق دیتا ہے اور وہی ان کا ثواب دے کر احسان کرتا ہے۔ لہٰذا ان سب میں وہی مکمل تعریف کا حق دار ہے۔

اگر اس کو کوئی مصیبت آئے تو وہ اس پر صبر کرتا ہے۔ اگر اس کو وہ مصیبت کسی بندے کے ہاتھ سے پہنچی ہو تو حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی اس بندے کو مسلط کرتا ہے۔ اس نے اس کے افعال پیدا کیے ہیں اور وہ بندے کے نصیب میں لکھے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿22﴾ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ﴾ [الحدید: ٢٢، ٢٣]

''کوئی مصیبت نہ زمین پر پہنچتی ہے اور نہ تمھاری جانوں پر مگر وہ ایک کتاب میں ہے، اس سے پہلے کہ ہم اسے پیدا کریں۔ یقیناً یہ اللہ پر بہت آسان ہے۔ تاکہ تم نہ اس پر غم کرو جو تمھارے ہاتھ سے نکل جائے اور نہ اس پر پھول جاؤ جو وہ تمھیں عطا فرمائے۔''

﴿ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ﴾ [التغابن: ١١]

''کوئی مصیبت نہیں پہنچی مگر اللہ کے اذن سے اور جو اللہ پر ایمان لے آئے وہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے''

اس کی تفسیر میں مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ آدمی ہے جس کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ جانتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اس لیے اس پر راضی ہو کر اس کو تسلیم کر لیتا ہے۔

اگر وہ کوئی گناہ کرے تو اس کو توبہ اور استغفار کرنا چاہیے، اللہ کے سامنے تقدیر کو بہانہ نہیں بنانا چاہیے۔ یہ نہیں کہنا چاہیے کہ جب یہ گناہ میرے مقدر میں تھا تو اس میں میرا گناہ کیا ہے؟ بلکہ اس کو علم ہونا چاہیے کہ

وہی گناہ کرنے والا، وہی نافرمان اور وہی گناہ کا فاعل ہے۔ گو یہ سب اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر اور مشیت سے خارج نہیں، کیوں کہ کوئی چیز بھی اس کی مشیت اور قدرت اور پیدا کرنے کے بغیر ممکن نہیں ہوتی، لیکن جو حرام کھاتا ہے، بدکاری کرتا ہے، اپنی جان پر ظلم کرتا ہے، وہ بندہ ہی ہے۔ جس طرح جو نماز پڑھتا ہے، روزہ رکھتا ہے، حج کرتا ہے اور جہاد کرتا ہے، وہ بھی بندہ ہی ہوتا ہے۔ وہی ان افعال سے موصوف ہوتا ہے، وہی ان حرکات کے ساتھ متحرک ہوتا ہے، وہی ان حوادث کا کاسب ہوتا ہے۔ جو وہ نیکی کماتا ہے وہ اس کے لیے ہوتی ہے اور جو بدی کماتا ہے اس کا وبال بھی اسی پر ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ان کو اور تمام اشیا کو اپنی مکمل قدرت اور نافذ ہونے والی مشیت کے ساتھ پیدا کرنے والا ہے اور ان سب میں اس کی کامل حکمت ہے، ارشاد ہے:

﴿ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ ﴾ [المؤمن: ٥٥]

''پس صبر کر، یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اپنے گناہ کے لیے بخشش مانگ۔''

بندے کو مصائب پر صبر کرنا چاہیے اور معائب پر استغفار کرنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نہ فحاشی کا حکم دیتا ہے نہ اپنے بندوں کے لیے کفر پسند کرتا ہے اور نہ فساد ہی پسند کرتا ہے۔ وہ ہر چیز کا خالق، رب اور مالک ہے۔ جو اس نے چاہا ہو گیا، جو نہیں چاہا نہیں ہوا۔ جس کو وہ ہدایت دے اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں۔ جس کو وہ گمراہ کر دے اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔ بندے میں خیر اور شر دونوں کا ارادہ کرنے کی استطاعت ہے۔ وہ دونوں پر قدرت بھی رکھتا ہے اور دونوں کو کرنے والا بھی ہے، لیکن اللہ سبحانہ و تعالیٰ اس سب کا خالق، رب اور مالک ہے۔ اس کے سوا کوئی خالق ہے نہ رب۔ اس نے جو چاہا ہو گیا، جو نہیں چاہا نہیں ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے دونوں مشیتوں، یعنی بندے کی مشیت اور رب تعالیٰ کی مشیت کا اثبات کیا ہے اور بیان کیا ہے کہ بندے کی مشیت اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع ہے۔ ارشاد ہے:

﴿اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿29﴾ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿30﴾ ﴾ [الدھر: ٢٩، ٣٠]

''یقیناً یہ ایک نصیحت ہے، تو جو چاہے اپنے رب کی طرف (جانے والا) راستہ اختیار کر لے اور تم نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ چاہے، یقیناً اللہ ہمیشہ سے سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے۔''

﴿اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿27﴾ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ﴿28﴾ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿29﴾ ﴾ [التکویر: ٢٧-٢٩]

''یہ اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ جہانوں کے لیے نصیحت ہے۔ اس کے لیے جو تم میں سے چاہے کہ سیدھا چلے اور تم نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ چاہے، جو سب جہانوں کا رب ہے۔''

﴿ اَیۡنَمَا تَکُوۡنُوۡا یُدۡرِکۡکُّمُ الۡمَوۡتُ وَلَوۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ بُرُوۡجٍ مُّشَیَّدَۃٍ ؕ وَاِنۡ تُصِبۡہُمۡ حَسَنَۃٌ یَّقُوۡلُوۡا ہٰذِہٖ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ ۚ وَاِنۡ تُصِبۡہُمۡ سَیِّئَۃٌ یَّقُوۡلُوۡا ہٰذِہٖ مِنۡ عِنۡدِکَ ؕ قُلۡ کُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ ؕ فَمَالِ ہٰۤؤُلَآءِ الۡقَوۡمِ لَا یَکَادُوۡنَ یَفۡقَہُوۡنَ حَدِیۡثًا ﴿۷۸﴾ مَاۤ اَصَابَکَ مِنۡ حَسَنَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ ۫ وَمَاۤ اَصَابَکَ مِنۡ سَیِّئَۃٍ فَمِنۡ نَّفۡسِکَ ؕ ﴾ [النساء: ۷۸،۷۹]

''تم جہاں کہیں بھی ہوگے، موت تمھیں پالے گی، خواہ تم مضبوط قلعوں میں ہو اور اگر انھیں کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر انھیں کوئی برائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں یہ تیری طرف سے ہے۔ کہہ دے سب اللہ کی طرف سے ہے، پھر ان لوگوں کو کیا ہے کہ قریب نہیں ہیں کہ کوئی بات سمجھیں۔ جو کوئی بھلائی تجھے پہنچے سو اللہ کی طرف سے ہے اور جو کوئی برائی تجھے پہنچے سو تیرے نفس کی طرف سے ہے۔''

کچھ لوگ گمان کرتے ہیں کہ یہاں حسنات (نیکیوں) سے فرماں برداریاں اور سیئات (برائیوں) سے گناہ مراد ہیں، پھر وہ اختلاف کرتے ہیں تو ایک کہتا ہے:

﴿ قُلۡ کُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ ؕ ﴾ [النساء: ۷۸] ''کہہ دے سب اللہ کی طرف سے ہے۔''

اور دوسرا کہتا ہے: نیکی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور برائی تیری طرف سے، لیکن یہ دونوں ہی آیت کو سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں، یہاں حسنات سے نعمتیں اور سیئات سے مصائب مراد ہیں، جس طرح اس آیت میں ہے:

﴿ وَبَلَوۡنٰہُمۡ بِالۡحَسَنٰتِ وَالسَّیِّاٰتِ لَعَلَّہُمۡ یَرۡجِعُوۡنَ ﴿۱۶۸﴾ ﴾ [الأعراف: ۱۶۸]

''اور ہم نے اچھے حالات اور برے حالات کے ساتھ ان کی آزمایش کی، تاکہ وہ باز آجائیں۔''

یعنی ہم نے ان کو تنگی اور خوشی دے کر آزمایا۔

یہ آیت منافقوں کے بارے میں ہے جن کو جب نصرت، رزق اور عافیت جیسی کوئی نعمت ملتی تو کہتے: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، لیکن جب ان کو بیماری، دشمن کا خوف اور مار جیسی کوئی تکلیف پہنچتی تو کہتے: یہ اے محمد! تمھاری طرف سے ہے۔ آپ ہی یہ دین لے کر آئے جس کی وجہ سے لوگ ہمارے دشمن بن گئے اور ہم اس کی وجہ سے ان مصیبتوں میں مبتلا ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَمَالِ ہٰۤؤُلَآءِ الۡقَوۡمِ لَا یَکَادُوۡنَ یَفۡقَہُوۡنَ حَدِیۡثًا ﴿۷۸﴾ ﴾ [النساء: ۷۸]

''پھر ان لوگوں کو کیا ہے کہ قریب نہیں ہیں کہ کوئی بات سمجھیں۔''

آپ ﷺ نے تو صرف ان کو نیکی کا حکم دیا اور برائی سے منع کیا ہے۔ جو آپ ﷺ کو نصرت، عافیت اور صحت جیسی نعمت ملتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جو تمھیں فقیری، ذلت، خوف اور بیماری وغیرہ جیسی کوئی مصیبت

پہنچتی ہے تو وہ تمھارے گناہوں اور غلطیوں کی وجہ سے ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت میں فرمایا ہے:

﴿ وَمَآ اَصٰبَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ ﴾ [الشوریٰ: ٣٠]

''اور جو بھی تمھیں کوئی مصیبت پہنچی تو وہ اس کی وجہ سے ہے جو تمھارے ہاتھوں نے کمایا۔''

﴿ اَوَ لَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ۭ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ۭ ﴾

[آل عمران: ١٦٥]

''اور کیا جب تمھیں ایک مصیبت پہنچی کہ یقیناً اس سے دگنی تم پہنچا چکے تھے تو تم نے کہا یہ کیسے ہوا؟ کہہ دے یہ تمھاری طرف سے ہے۔''

﴿ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ ﴾ [الشوریٰ: ٤٨]

''اور اگر انھیں اس کی وجہ سے کوئی مصیبت پہنچتی ہے جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا تو بے شک انسان بہت ناشکرا ہے۔''

لہٰذا جب انسان کو اس کے گناہوں اور غلطیوں کی وجہ سے کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہی اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہوتا ہے۔ جب توبہ اور استغفار کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو ہر غم سے آزاد کر دیتے ہیں، ہر تنگی سے نکال لیتے ہیں اور اس کو اس جگہ سے رزق دیتے ہیں جہاں سے اس نے سوچا بھی نہیں ہوتا۔

گناہ زہر پینے کی طرح ہیں۔ انسان جب زہر پیتا ہے تو وہ یا بیمار ہو جاتا ہے یا مر جاتا ہے۔ تو وہی بیمار ہوتا ہے، تکلیف برداشت کرتا ہے، اذیت میں مبتلا ہوتا ہے اور مر جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو اس سب کا خالق ہے، لیکن وہ اس کو پینے کی وجہ سے بیمار ہوا، اسی نے اس کو پی کر اپنی جان پر ظلم کیا۔ اگر وہ اس کا مفید تریاق پی لے تو اللہ تعالیٰ اس کو عافیت دے دیتا ہے، لہٰذا گناہ زہر پینے کی طرح اور مفید توبہ مفید تریاق کی طرح ہے، تاہم بندہ ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے۔ وہ اپنے فضل و رحمت ہی سے اس کو توبہ کی توفیق دیتا ہے۔ اگر وہ توبہ کرے تو وہ اس پر مہربانی کر دیتا ہے اور اگر بندہ اس سے دعا اور سوال کرے تو وہ اس کی دعا قبول کر لیتا ہے، جس طرح ارشادِ ربانی ہے:

﴿ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّىْ فَاِنِّىْ قَرِيْبٌ ۭ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴾ [البقرۃ: ١٨٦]

''اور جب میرے بندے تجھ سے میرے بارے میں سوال کریں تو بے شک میں قریب ہوں، میں پکارنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے، تو لازم ہے کہ وہ میری بات مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں، تاکہ وہ ہدایت پائیں۔''

جو انسان کہتا ہے کہ نیکی یا برائی میں اس کی کوئی مرضی نہیں، وہ جھوٹ بولتا ہے اور جو یہ کہتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر اپنی مرضی کے ساتھ جو نیکی یا برائی کرنا چاہے کر سکتا ہے، وہ بھی جھوٹ بولتا ہے۔ اس کی ہر اس کام میں مرضی ہے جو وہ اپنے اختیار کے ساتھ کرتا ہے، خواہ وہ اچھا کام ہو یا برا۔ لیکن یہ سب اللہ تعالیٰ کی مرضی اور قدرت کے بغیر نہیں ہوتا۔ لہٰذا ان دونوں باتوں پر ایمان رکھنا ضروری ہے، تاکہ اس کے امر و نہی، وعد و وعید اور تقدیر کے اچھا یا برا ہونے پر ایمان رکھ کر ایمان حاصل ہو۔ بندے کو جو مصیبت پہنچتی ہے وہ اس سے ٹل نہیں سکتی اور جو اس سے ٹل گئی ہے وہ اس کو پہنچ نہیں سکتی۔

جو انسان تقدیر کو گناہوں پر حجت بناتا ہے اس کی حجت بے کار اور باطل ہے اور جو اس کو عذر بناتا ہے اس کا عذر غیر مقبول ہے۔ بلکہ یہ گمراہ لوگ ہیں۔ جس طرح ان کے بارے میں کسی عالم نے کہا: تم نیکی کے وقت قدری ہو جاتے ہو اور گناہ کے وقت جبری۔ جو مذہب تمھاری خواہش کے مطابق ہو تم اسے اختیار کر لیتے ہو۔

ایسے لوگوں پر اگر کوئی شخص زیادتی کرے، بلکہ وہ کوئی ایسا کام کرے جو اگرچہ صحیح ہو، لیکن انسان کو ناپسندیدہ ہو تو اس کو تقدیر کی وجہ سے معذور خیال نہیں کریں گے، بلکہ حق یا باطل کے ساتھ اس کا مقابلہ کریں گے۔ اگر تقدیر ان کے لیے حجت بن سکتی ہے تو ان کے لیے بھی ہونی چاہیے۔ لیکن اگر ان کے لیے حجت نہیں تو پھر ان کے مخالفین کے لیے بھی نہیں۔ مگر یہ لوگ نفس کی پیروی اور اپنے آقا کی نافرمانی کرتے وقت تقدیر کو حجت بناتے ہیں۔

لیکن مومن ان کے عکس ہوتا ہے۔ اس کو جب کوئی انسان تکلیف دے تو وہ اسے تقدیر کا لکھا ہوا سمجھ کر صبر کرتا ہے اور ثواب کی امید رکھتا ہے۔ جب خود کوئی برائی کرے تو توبہ اور استغفار کرتا ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ ﴾ [المؤمن: ٥٥]

''پس صبر کر، یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اپنے گناہ کے لیے بخشش مانگ۔''

یہ مومن کا شیوہ ہے۔ لیکن منافق کا رویہ اس کے الٹ ہوتا ہے۔ وہ اپنے گناہ کی معافی نہیں مانگتا، بلکہ تقدیر کو بہانہ بناتا ہے اور مصیبت پر صبر نہیں کرتا، اسی لیے وہ دنیا میں بھی بدبخت ہوتا ہے اور آخرت میں بھی۔ مومن دنیا میں بھی خوش نصیب ہوتا ہے اور آخرت میں بھی خوش نصیب۔ واللہ أعلم [1]

اللہ تعالیٰ کا اولادِ آدم میں سے جنتیوں اور جہنمیوں سے مٹھی بھرنا

سوال درج ذیل حدیث کے بارے میں بتائیں جس میں ذکر ہوا ہے: ''اللہ تعالیٰ نے دو مرتبہ مٹھی بھری اور فرمایا: یہ جنت کے لیے ہے اور مجھے کوئی پروا نہیں۔ یہ جہنم کے لیے ہے اور مجھے کوئی پروا نہیں۔''

[1] مجموع الفتاویٰ (٨/٢٣٥_٢٤١)

کیا یہ حدیث صحیح ہے؟ ''اللہ تعالیٰ نے خود مٹھی بھری یا اپنے کسی فرشتے کو مٹھی بھرنے کا حکم دیا تھا؟'' ایک دوسری حدیث میں ہے: ''اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو انھیں دائیں اور بائیں طرف سے ان کی اولاد دکھائی اور فرمایا: یہ آگ کی طرف جانے والے ہیں اور مجھے کوئی پروا نہیں۔ یہ جنت کی طرف جانے والے ہیں اور مجھے کوئی پروا نہیں۔'' کیا یہ صحیح میں ہے؟

جواب یہ صحیح ہے اور یہ معنی متعدد سندوں سے موطا، سنن ابو داود اور نسائی وغیرہ میں حضرت مسلم بن یسار رضی اللہ عنہ کی روایت سے نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے۔ نعیم بن ربیعہ سے مروی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: ''حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے اس آیت:

﴿ وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِىٓ ءَادَمَ مِن ظُهُورِهِمْ ﴾ [الأعراف: ١٧٢]

''اور جب تیرے رب نے آدم کے بیٹوں سے ان کی پشتوں میں سے ان کی اولاد کو نکالا۔''

کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا، پھر ان کی پشت پر اپنا دایاں ہاتھ پھیرا اور اس سے ان کی اولاد نکالی اور کہا: ان کو میں نے جنت کے لیے پیدا کیا ہے اور وہ اہلِ جنت جیسے عمل کریں گے، پھر ان کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور اس سے ان کی اولاد نکالی اور کہا: ان کو میں نے آگ کے لیے پیدا کیا ہے اور یہ اہلِ جہنم جیسے عمل کریں گے۔'' ایک آدمی نے کہا: اے اللہ کے رسول! تو عمل کس میں ہے، یعنی کس لیے ہے؟ آپ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ جب کسی آدمی کو جنت کے لیے پیدا کرتا ہے تو اس کو اہلِ جنت کے عملوں میں مشغول کر دیتا ہے، حتی کہ اہلِ جنت جیسے کسی عمل پر اس کی موت واقع ہو جاتی ہے اور اس کو جنت میں داخل کر دیتا ہے۔ جب وہ کسی آدمی کو آگ کے لیے پیدا کرتا ہے تو اس کو اہلِ جہنم کے عملوں میں مصروفِ کار کر دیتا ہے، حتی کہ اہلِ جہنم جیسے کسی عمل پر اس کی موت واقع ہو جاتی ہے اور وہ اس کو جہنم میں داخل کر دیتا ہے۔''[1]

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے ایک مٹھی بھری تو فرمایا: میری رحمت کے ساتھ جنت کی طرف اور ایک مٹھی بھری تو فرمایا: جہنم کی طرف اور مجھے کوئی پروا نہیں۔''[2]

اس جیسی حدیث میں دو فصلیں اور بحثیں ہیں:

پہلی: سابقہ تقدیر، یعنی اللہ تعالیٰ کو لوگوں کے عمل کرنے سے پہلے ہی علم ہے کہ کون جنتی ہے اور کون جہنمی۔ یہ حق اور سچ

---

[1] موطأ (٨٩٨/٢) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧٠٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٧٥) ضعيف الجامع (١٦٠٢)

[2] مسند أحمد (١٧٦/٤، ١٧٧) السلسلة الصحيحة (٤٧)

ہے اور اس پر ایمان رکھنا ضروری ہے، بلکہ امام مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ نے صاف صاف کہا ہے کہ جس نے اس کا انکار کیا وہ کافر ہے۔

بلکہ یہ ایمان رکھنا بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے ہی اس کا علم رکھتا ہے۔ اس پر بھی ایمان رکھنا ضروری ہے کہ اس نے یہ سب لکھ رکھا ہے اور اس کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے ہی اس کے بارے میں بتا دیا۔ صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان پیدا کرنے سے پچاس ہزار سال پہلے ہی مخلوقات کی تقدیریں مقرر کر دی تھیں اور اس کا عرش پانی پر تھا۔''[1]

صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ تھا اور کوئی چیز نہیں تھی۔ اس کا عرش پانی پر تھا۔ اس نے ذکر (لوحِ محفوظ) میں ہر چیز لکھ دی، پھر آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔''[2]

مسند احمد میں حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''حضرت آدم علیہ السلام ابھی اپنی مٹی میں گوندھے ہوئے تھے کہ میں اللہ تعالیٰ کے ہاں خاتم النبیین لکھا ہوا تھا۔ میں تم کو اس کے آغاز (اپنی نبوت کی بشارت کی ابتدا) کے بارے میں بتاتا ہوں کہ میں اپنے باپ ابراہیم کی دعا، عیسیٰ کی خوش خبری اور اپنی ماں کا خواب ہوں۔ جب انھوں نے مجھے جنم دیا تو دیکھا کہ ان سے ایک روشنی نکلی ہے جس میں شام کے محلات روشن ہو گئے۔''[3]

میسرۃ الحر کی حدیث میں ہے، کہتے ہیں کہ میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! آپ کب نبی تھے؟ آپ نے فرمایا: ''آدم ابھی روح اور جسم کے درمیان تھے۔''[4]

صحیحین میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انھوں نے کہا: ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں اور آپ کو سچا مانا جاتا ہے:

''تم میں سے ہر ایک کی خلق، یعنی پیدائش اس کی ماں کے پیٹ میں نطفے (منی کا قطرہ) کی شکل میں رہتی ہے، پھر وہ اتنے ہی دن جما ہوا خون رہتا ہے، پھر اتنے ہی دن لوتھڑا بنا رہتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ اس

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٥٣)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٠١٩)

[3] مسند أحمد (٤/١٢٧، ١٢٨) صحیح ابن حبان (١٤/٣١٢)

[4] سنن الترمذي، رقم الحدیث (٣٦٠٩) مسند أحمد (٤/٦٦) صحیح الجامع (٤٥٨١)

کی طرف ایک فرشتہ بھیجتا ہے۔ اس کو چار کلمات کا حکم دیا جاتا ہے: اس کا رزق، عمل، عمر اور نیک بختی یا بدبختی لکھ۔ پھر اس میں روح پھونک دی جاتی ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اور جس کے سوا کوئی معبود نہیں، تم میں سے ایک اہلِ جنت جیسے عمل کرتا رہتا ہے، حتی کہ اس کے اور جنت کے درمیان ایک ہاتھ کے برابر فاصلہ رہ جاتا ہے کہ اس پر لکھا ہوا غالب آ جاتا ہے اور وہ جہنمیوں جیسے عمل کرنے لگتا ہے، پھر جہنم میں داخل ہو جاتا ہے۔''[1]

صحیحین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ہم بقیع الغرقد میں ایک جنازے میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''تم میں سے ہر ایک کا جنت یا جہنم میں ٹھکانا لکھ دیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! کیا ہم لکھے ہوئے پر اعتماد کر کے عمل کرنا چھوڑ نہ دیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: عمل کرو، ہر ایک کے لیے وہ عمل آسان کر دیا جاتا ہے، جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ جو خوش بختوں سے ہو اس کے لیے نیک بختوں کے عمل کرنا میسر ہو جاتا ہے اور جو بدبختوں سے ہو اس کے لیے بدبختوں کے عمل کرنا میسر ہو جاتا ہے، پھر آپ ﷺ نے درج ذیل آیات کی تلاوت کی:

﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝﴾ [الليل: ٥-١٠]

''پس لیکن وہ جس نے دیا اور (نافرمانی سے) بچا اور اس نے سب سے اچھی بات کو سچ مانا تو یقیناً ہم اسے آسان راستے کے لیے سہولت دیں گے اور لیکن جس نے بخل کیا اور بے پروا ہوا اور اس نے سب سے اچھی بات کو جھٹلا دیا تو یقیناً ہم اسے مشکل راستے کے لیے سہولت دیں گے۔''[2]

صحیح میں ہے کہ آپ ﷺ سے کہا گیا: اے اللہ کے رسول! کیا یہ متعین ہے کہ کون جنتی ہے اور کون جہنمی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں، تو آپ ﷺ سے کہا گیا: پھر عمل کس لیے ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: عمل کرو، ہر ایک کو وہ عمل میسر ہو جاتا ہے جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔''[3]

نبی اکرم ﷺ نے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ کون جنتی ہے اور کون جہنمی۔ اس نے یہ لکھا ہوا ہے،

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٣٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٩٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٧)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٢٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٩)

آپ ﷺ نے ان کو اس لکھے ہوئے پر اعتماد کرتے ہوئے عمل چھوڑنے سے منع کیا جس طرح ملحدین اور بے دین کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے بتایا کہ ہر ایک کو وہ عمل میسر آ جاتا ہے جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ نیک بختوں کو نیک بختوں والے عمل میسر آ جاتے ہیں اور بدبختوں کو بدبختوں والے عمل۔ یہ بڑی بہترین تفصیل ہے جو آپ ﷺ نے بیان کی ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام معاملات کا مآل جانتا ہے۔ اس نے چیزوں کو اسباب کے ساتھ مربوط کیا ہوا ہے جو ان اسباب کے ساتھ ہی وجود میں آتے ہیں۔ جس طرح اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے مباشرت کرتا ہے تو اس کی اولاد ہوتی ہے۔ اگر یہ شخص کہے کہ اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ میری اولاد ہوگی اس لیے مجھے مباشرت کی کوئی ضرورت نہیں تو اس کو سب بے وقوف اور احمق ہی کہیں گے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ اس نے یہی مقدر کیا ہے کہ وہ مباشرت کرے گا تو اس کی اولاد ہوگی۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ فلاں شخص کی کھیتی اگے گی، کیوں کہ وہ بیج پھینکے گا اور اس کو پانی دے گا۔ اگر وہ کہے: اگر اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ ایسا ہوگا تو مجھے بیج بونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ایسا شخص جاہل اور گمراہ متصور ہوگا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ یہ کھیتی ان اسباب کی وجہ سے پروان چڑھے گی۔ اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ فلاں کھانے کے ساتھ سیر ہو جائے گا اور پینے کے ساتھ اس کی پیاس ختم ہو جائے گی۔ فلاں کی موت قتل کی صورت میں واقع ہوگی تو ان اسباب کا ہونا ضروری ہے جن کے بارے میں اللہ کے علم میں ہے کہ یہ امور ان کے ساتھ رونما ہوں گے۔

اسی طرح اگر اس کو معلوم ہے کہ فلاں آخرت میں خوش بخت ہوگا اور فلاں بدنصیب تو اس وجہ سے کہ وہ بدنصیبوں والے عمل کرتا ہے۔ اللہ کو علم ہے کہ وہ یہ عمل کر کے بدبخت ہو جائے گا۔ اگر کہا جائے کہ وہ بدنصیب ہے خواہ عمل نہ بھی کرے تو یہ غلط بات ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کسی کو بھی گناہ کے بغیر جہنم میں نہیں پھینکے گا، فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنكَ وَمِمَّن تَبِعَكَ مِنْهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٨٥﴾ ﴾ [ص: ٨٥]

”کہ میں ضرور بالضرور جہنم کو تجھ سے اور ان سب لوگوں سے بھر دوں گا، جو ان میں سے تیری پیروی کریں گے۔“

اس نے قسمیہ کہا کہ وہ ابلیس اور اس کے پیروکاروں سے جہنم بھرے گا۔ جو ابلیس کی پیروی کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس وجہ سے کسی بندے کو سزا نہیں دیتا کہ وہ جانتا ہے کہ وہ ایسا عمل کرے گا، جب تک وہ عمل نہ کر لے۔

اسی لیے جب رسول اللہ ﷺ سے مشرکوں کے بچوں کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں کہ وہ کیا کرنے والے تھے۔''[1] یعنی اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ اگر وہ بالغ ہو جاتے تو کیا کرتے۔ یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ قیامت کے دن ان کے پاس ایک رسول بھیجا جائے گا۔ جو اس کی اطاعت کرے گا وہ جنت میں داخل ہو جائے گا اور جو اس کی نافرمانی کرے گا وہ جہنم میں داخل ہو جائے گا۔ ان کے بارے میں اس کا علم ظاہر ہو جائے گا کہ وہ جنتی ہیں یا جہنمی۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے جنت اہلِ ایمان اور اطاعت گزار بندوں کے لیے پیدا کی ہے۔ جس کے بارے میں اس نے مقدر کیا ہوا ہے کہ وہ ان میں سے ہوگا، اس کو ایمان اور اطاعت کی توفیق دیتا ہے۔

جو یہ کہتا ہے: ''اگر میرے نصیب میں لکھا ہوا ہے کہ میں جنتی ہوں تو جنت میں داخل ہو جاؤں گا، چاہے ایمان قبول کروں یا کافر ہی رہوں'' وہ اللہ پر اس بات میں جھوٹ باندھتا ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ وہ اس کو ایمان کے ساتھ ہی جنت میں داخل کرے گا۔ اگر اس کے پاس ایمان نہیں تو یہ ان لوگوں میں نہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ وہ جنتی ہیں، بلکہ جو مومن نہیں وہ کافر ہے اور اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ وہ جہنمی ہے، جنتی نہیں۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو دعا کرنے اور مدد مانگنے جیسے اسباب اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ جو انسان کہتا ہے: میں تقدیر پر اعتماد کرتے ہوئے دعا کرتا ہوں نہ مانگتا ہوں وہ غلط ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے دعا اور سوال کرنے کو ان اسباب سے قرار دیا ہے جن کے ذریعے اس کی مغفرت، رحمت، ہدایت، نصرت اور رزق حاصل کیا جاتا ہے۔ اگر بندے کے مقدر میں ہے کہ اس کو کوئی بھلائی دعا کرنے کے ساتھ ہی ملے گی تو وہ دعا کے بغیر حاصل نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے جو حالات اور جو انجام مقدر کیا ہے اس کو اسباب کے ساتھ ہی مقدر اور مربوط کیا ہے۔ تقدیر مقررہ اوقات کی طرف لے جاتی ہے۔ دنیا اور آخرت میں کوئی بھی چیز اسباب کے بغیر نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی اسباب اور نتائج کا خالق ہے۔

اسی بنا پر کسی نے کہا ہے: اسباب پر تکیہ اور توجہ کرنا توحید میں شرک ہے۔ اسباب کے اسباب ہونے کی نفی کرنا بے عقلی ہے۔ اسباب سے کلی طور پر اعراض کرنا شریعت کی تنقیص ہے، لہٰذا خالی اسباب نتیجے کے حصول کے لیے کافی نہیں۔ جب دانہ بو دیا جائے تو کھیتی کے حصول کے لیے صرف بارش کافی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے ساتھ پروان چڑھانے والی ہوا کی ضرورت بھی ہوتی ہے اور رکاوٹ دور کرنا بھی ضروری ہے، لہٰذا تمام شرطوں کا پورا ہونا اور تمام رکاوٹوں کا دور ہونا ضروری ہے اور یہ سب اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر کے ساتھ ہے۔

اسی طرح بچہ محض شرم گاہ میں منی انڈیلنے سے پیدا نہیں ہوتا، بلکہ کتنے ایسے لوگ ہیں جو مجامعت کرتے ہیں، لیکن اولاد سے محروم رہتے ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو پیدا کرنا چاہے تب عورت حاملہ ہوتی

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٢٢٤) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٥٩)

ہے اور وہ بچہ رحم میں پرورش پاتا ہے۔ لہٰذا تمام شرطیں پوری ہوں اور رکاوٹیں دور ہوں تب پیدائش تکمیل پاتی ہے۔

اسی طرح آخرت کا معاملہ بھی ہے۔ انسان خالی عمل کے ساتھ سعادت اور خوش نصیبی نہیں پا سکے گا، بلکہ یہ ایک سبب ہے، اسی لیے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''تم میں سے کوئی بھی اپنے عمل کے ساتھ جنت میں داخل نہیں ہوگا، انھوں نے کہا: آپ بھی نہیں؟ اے اللہ کے رسول! آپ ﷺ نے فرمایا: میں بھی نہیں، جب تک اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت اور فضل میں نہ ڈھانپ لے۔''[1]

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴾ [النحل: ۳۲]

''جنت میں داخل ہو جاؤ، اس کے بدلے جو تم کیا کرتے تھے۔''

یہاں ''با'' سبب کے معنی میں ہے، یعنی اپنے عملوں کے سبب۔ نبی اکرم ﷺ نے جس کی نفی کی ہے وہ عوض کی نفی ہے، جیسے کہا جاتا ہے: میں نے یہ چیز اتنے پیسوں کے بدلے میں خریدی۔ عمل جنت میں داخل ہونے کے لیے قابلِ کفایت قیمت اور عوض نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے عفو و درگزر اور فضل و رحمت کی اشد ضرورت ہے۔ وہ اپنے عفو و درگزر کے ساتھ برائیاں مٹاتا ہے، اپنی رحمت کے ساتھ اچھائیاں لاتا اور اپنے فضل کے ساتھ برکتوں کو دوگنا کرتا ہے۔ اس جگہ لوگوں کے دو گروہ گمراہ ہوئے ہیں:

ایک فریق تقدیر پر ایمان رکھتا ہے اور حصولِ مقصود کے لیے اسے ہی کافی سمجھتا ہے۔ یہ شرعی اسباب اور نیک اعمال سے صرفِ نظر کرتے ہیں۔ یہ مآلِ کار اللہ تعالیٰ کی کتابوں، رسولوں اور دین کے ساتھ کفر کرتے ہیں۔

دوسرا فریق اس طرح اللہ تعالیٰ سے بدلے کا تقاضا کرتا ہے جس طرح مزدور اجرت پر رکھنے والے سے اجرت کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ اپنی نیکی، قوت اور عمل کی باتیں کرتے ہیں۔ یہ جاہل اور گمراہ لوگ ہیں۔

اللہ تعالیٰ بندوں کو جس کام کا حکم دیتا ہے اس لیے نہیں دیتا کہ اس کو اس کی کوئی ضرورت ہوتی ہے اور جس سے منع کرتا ہے اس لیے نہیں کرتا کہ وہ اس کو اپنے تک محدود رکھنا چاہتا ہے۔ وہ ان کو اسی کام کا حکم دیتا ہے جس میں ان کی بہتری ہوتی ہے اور اس کام سے منع کرتا ہے جو ان کے لیے بگاڑ کا باعث ہوتا ہے۔ حدیثِ قدسی ہے:

«يَا عِبَادِيْ! إِنَّكُمْ لَنْ تَبْلُغُوْا ضُرِّيْ فَتَضُرُّوْنِيْ، وَلَنْ تَبْلُغُوْا نَفْعِيْ فَتَنْفَعُوْنِيْ »[2]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٣٤٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨١٦)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٧٧)

''میرے بندو! تم کبھی مجھے نقصان پہنچانے کی حیثیت کو نہیں پہنچ سکتے کہ مجھے کوئی نقصان پہنچا سکو اور تم کبھی مجھے فائدہ پہنچانے کی حیثیت کو نہیں پہنچ سکتے کہ مجھے کوئی فائدہ پہنچا سکو۔''

مالک جب اپنے زرخرید کو کوئی حکم دیتا ہے تو اپنے کام اور ضرورت کی وجہ سے اس کو حکم دیتا ہے۔ وہ اپنی اس قوت کے ساتھ وہ کام کرتا ہے جو اس کے مالک نے اس میں پیدا نہیں کی۔ وہ غلام اس کی اجرت بھی طلب کرتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔ اگر وہ کوئی اچھا کام کریں تو اپنے لیے کریں گے اور کوئی برا کام کریں تو اپنے ہی لیے کریں گے۔ جو نیکی کمائیں گے اپنے لیے اور جو برائی کمائیں گے وہ بھی اپنے ہی لیے۔

﴿ مَنْ عَمِلَ صٰلِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴾ [حمٓ السجدة: ٤٦]

''جس نے نیک عمل کیا سو اپنے لیے اور جس نے برائی کی سو اسی پر ہوگی اور تیرا رب اپنے بندوں پر ہرگز کوئی ظلم کرنے والا نہیں۔''

صحیح حدیثِ قدسی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''میرے بندو! میں نے اپنے اوپر ظلم کرنا حرام کر رکھا ہے اور اس کو تمھارے درمیان بھی حرام ہی رکھا ہے، لہٰذا ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو، میرے بندو! تم دن رات گناہ کرتے ہو اور میں سب گناہ معاف کرتا ہوں، مجھے کوئی پروا نہیں۔ لہٰذا میرے بندو! مجھ سے بخشش طلب کرو، میں تم کو معاف کروں گا۔ تم میں سے ہر کوئی گمراہ ہے، بجز اس کے جس کو میں ہدایت دوں، لہٰذا مجھ سے ہدایت طلب کرو میں تم کو ہدایت دوں گا۔ تم میں سے ہر کوئی بھوکا ہے بجز اس کے جس کو میں کھلا دوں۔ تو میرے بندو! مجھ سے کھانا طلب کرو میں تم کو کھانا دوں گا۔ تم کبھی مجھے نقصان پہنچانے کی صلاحیت کو نہیں پہنچ سکتے کہ مجھ کو کوئی نقصان پہنچاؤ اور تم کبھی مجھے فائدہ پہنچانے کی صلاحیت کو نہیں پہنچ سکو گے کہ مجھ کو کوئی فائدہ پہنچاؤ۔ میرے بندو! اگر تمھارے اگلے پچھلے، جن اور انسان تم میں سے سب سے زیادہ پرہیزگار انسان کے دل کی طرح ہو جائیں، اس سے میری بادشاہت میں کچھ اضافہ نہیں ہوگا۔ میرے بندو! اگر تمھارے اگلے پچھلے اور جن و انسان تم میں سے سب سے زیادہ گناہ گار انسان کے دل کی طرح ہو جائیں تو اس سے میری بادشاہت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔ میرے بندو! اگر تمھارے اگلے پچھلے اور جن و انسان ایک میدان میں اکٹھے ہو جائیں اور مجھ سے مانگیں اور میں ہر انسان کی مانگ پوری کر دوں تو میری بادشاہت میں اتنی کمی بھی نہیں ہوگی جتنی کسی سمندر میں سوئی ڈبو کر نکالنے کے ساتھ ہوتی ہے۔ میرے بندو! یہ تمھارے اعمال ہی ہیں۔ میں انھیں تمھارے لیے شمار کرتا ہوں، پھر تمھیں ان کا پورا پورا بدلہ دوں گا، اس لیے جو خیر اور

بھلائی پائے تو وہ اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کرے اور جو اس کے علاوہ کچھ اور پائے وہ اپنی ہی ذات کو ملامت کرے۔''[1]

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تمام جہانوں سے اپنی بے نیازی کے باوجود ان کو پیدا کیا، ان کی سعادت وشقاوت بیان کرنے کے لیے ان کی طرف رسول بھیجے، پھر اپنی اجازت سے اپنے مومن بندوں کو اختلافی امور میں حق کی ہدایت دی۔ ان کو ایمان قبول کرنے اور نیک عمل کرنے کی توفیق دی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے لوگوں کو پیدا کیا، اپنے فضل سے رسول بھیجے اور اپنے فضل سے ان کو ہدایت دی۔

وہ تمام اچھائیاں جو وہ اپنی طاقتوں کے ساتھ یا ان کے بغیر حاصل کرتے ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ ہیں۔ اسی طرح ثواب و جزا بھی اس کے فضل ہی سے ملے گا، اگرچہ اس نے یہ اپنے اوپر لازم کیا ہے، جس طرح اس نے اپنے اوپر ظلم حرام کیا ہے اور اس کا وعدہ کیا ہے، ارشاد ہے:

﴿ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ﴾ [الأنعام: ١٢] ''اس نے اپنے آپ پر رحم کرنا لکھ دیا ہے۔''

﴿ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [الروم: ٤٧] ''اور مومنوں کی مدد کرنا ہم پر لازم ہی تھا۔''

چنانچہ وہ لامحالہ ہو کر رہے گا، اس کے خود واجب کرنے اور اس کا وعدہ کرنے کے ساتھ وہ اس پر لازم ہے، کیوں کہ مخلوق اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب اور لازم کرسکتی ہے نہ حرام، بلکہ وہ اس سے کہیں زیادہ کمزورتر اور حقیر تر ہیں۔

ہر نعمت اس کا فضل ہے اور ہر انتقام اس کا عدل ہے، جس طرح گزشتہ حدیث میں ذکر ہوا ہے: ''یہ تمھارے اعمال ہی ہیں جو میں تمھارے لیے شمار کروں گا، پھر تمھیں ان کا پورا پورا بدلہ دوں گا۔ تو جو اچھائی پائے وہ اللہ تعالیٰ کی تعریف کرے اور جو اس کے علاوہ کچھ پائے وہ اپنے ہی آپ کو ملامت کرے۔''

صحیح حدیث میں ہے، درج ذیل کلمات سید الاستغفار ہیں:

« اَللّٰهُمَّ أَنْتَ رَبِّيْ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ خَلَقْتَنِيْ، وَأَنَا عَبْدُكَ وَأَنَا عَلٰى عَهْدِكَ وَوَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ، أَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ، أَبُوْءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ، وَأَبُوْءُ بِذَنْبِيْ، فَاغْفِرْ لِيْ إِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا أَنْتَ »[2]

''اے اللہ! تو میرا رب ہے، تیرے سوا کوئی معبودِ حقیقی نہیں، تو نے مجھے پیدا کیا، میں تیرا بندہ ہوں، میں جتنی استطاعت رکھتا ہوں تیرے عہد اور وعدے پر ہوں، میں نے جو کیا اس کے شر اور برائی سے تیری

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٧٧)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٩٦٤)

پناہ میں آتا ہوں، اپنے اوپر تیری نعمتوں کا اعتراف کرتا ہوں اور اپنے گناہ کا اعتراف بھی کرتا ہوں، مجھے بخش دے، تیرے سوا کوئی گناہوں کو بخشنے والا نہیں۔''

جس شخص نے صبح کے وقت یقین کی حالت میں یہ کلمات کہے اور اس رات فوت ہو گیا وہ جنت میں داخل ہو گا۔

اس میں یہ الفاظ: «أَبُوءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ، وَأَبُوءُ بِذَنْبِي» اللہ کی نعمت کا اقرار اور بندے کے گناہ کا اعتراف ہے۔ کسی بزرگ کا قول ہے: ''میں صبح کے وقت اپنے اوپر اللہ کی طرف سے اترنے والی نعمت اور اپنی طرف سے اس کی طرف چڑھنے والے گناہ کے درمیان ہوتا ہوں تو نعمت کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں اور گناہ سے استغفار۔''

جو انسان تقدیر کو بہانہ بنا کر امر و نہی اور وعد و وعید سے اعراض کرتا ہے وہ گمراہ ہے۔ جو تقدیر کو نظر انداز کرتے ہوئے امر و نہی کے قیام کا دعویٰ کرتا ہے وہ بھی گمراہ ہے۔ مومن کی حالت یہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے: ﴿ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ﴾ ہم اس کے حکم کی پیروی کرتے ہوئے اس کی عبادت کرتے ہیں اور تقدیر پر ایمان رکھتے ہوئے اس سے مدد طلب کرتے ہیں۔

صحیح حدیث ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ کے نزدیک طاقتور مومن کمزور مومن سے زیادہ بہتر اور اس کو زیادہ پیارا ہے۔ ہر ایک آدمی بھلائی ہے۔ اس کی آرزو رکھ جو تیرے لیے فائدہ مند ہے۔ اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کر اور کمزور نہ بن۔ اگر تجھے کوئی نقصان پہنچے تو یہ نہ کہہ: اگر میں ایسا کرتا تو ویسا ہوتا، بلکہ یہ کہہ: اللہ تعالیٰ نے جو چاہا اور جو مقدر کیا وہ ہو گیا۔ اس لیے لفظ ''اگر'' شیطان کے عمل کی راہ کھولتا ہے۔''[1]

نبی اکرم ﷺ نے صحابی کو دو چیزوں کا حکم دیا:

1. وہ اس کام کی آرزو رکھے جو اس کے لیے نفع مند ہو۔ یہی حکم کی بجا آوری ہے۔ یہی عبادت ہے اور یہی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت ہے۔
2. وہ اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرے۔ یہ تقدیر پر ایمان کو شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر بندہ نیکی کی طاقت رکھتا ہے نہ بدی سے رک سکتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے چاہا وہ ہو گیا اور جو نہ چاہا نہ ہوا۔

جو انسان قدریہ اور مجوسیہ کی طرح یہ گمان رکھتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی معاونت کے بغیر اس کی اطاعت کرتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی مکمل قدرت، اس کی مشیتِ نافذہ اور اس کے ہر چیز کو پیدا کرنے کا انکار کرتا ہے۔

جو یہ گمان رکھتا ہے کہ اگر اس کام میں اس کی معاونت کی جائے جس کا وہ ارادہ رکھتا ہے اور وہ اس کے لیے

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٦٤)

آسان ہو جائے تو وہ قابلِ تعریف ہو گا، خواہ شرعی حکم کے مطابق ہو یا مخالف، وہ اللہ تعالیٰ کے دین کا انکار کرتا ہے، اس کی کتابوں، رسولوں اور وعد و وعید کو جھٹلاتا ہے۔ وہ پہلے انسان پر اس کے غصے اور سزا سے زیادہ غصے اور بڑی سزا کا مستحق ہے، کیوں کہ بندہ کبھی ایسے کاموں کا ارادہ کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہوں، اس نے ان کا حکم دیا ہوتا ہے اور وہ اس کے قرب کا باعث ہوتے ہیں اور کبھی ایسے کاموں کا ارادہ کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہوتے ہیں، وہ ان سے نفرت کرتا ہے، ان پر ناراض ہوتا ہے، ان سے منع کرتا ہے اور وہ کام کرنے والوں کو سزا دیتا ہے۔

تو ان دونوں میں اس کا جو حصہ ہو وہ اس کے لیے میسر ہو جاتا ہے جس طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

''ہر ایک کو وہ عمل میسر ہوتا ہے جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہوتا ہے، اگر وہ نیک بختوں میں سے ہو تو نیک بختوں والے عمل اس کو میسر آ جاتے ہیں اور اگر وہ بدبختوں میں سے ہو تو بدبختوں والے عمل اس کو نصیب ہوتے ہیں۔''[1]

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿18﴾ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓىِٕكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿19﴾ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ﴿20﴾﴾

[بني اسرائيل:١٨۔٢٠]

''جو شخص اس جلدی والی (دنیا) کا ارادہ رکھتا ہو ہم اس کو اس میں جلدی دیں گے جو چاہیں گے، جس کے لیے چاہیں گے، پھر ہم نے اس کے لیے جہنم بنا رکھی ہے، اس میں داخل ہو گا، مذمت کیا ہوا، دھتکارا ہوا اور جس نے آخرت کا ارادہ کیا اور اس کے لیے کوشش کی، جو اس کے لائق کوشش ہے، جب کہ وہ مومن ہو تو یہی لوگ ہیں جن کی کوشش ہمیشہ سے قدر کی ہوئی ہے۔ ہم ہر ایک کی مدد کرتے ہیں، ان کی اور ان کی بھی، تیرے رب کی بخشش سے اور تیرے رب کی بخشش کبھی بند کی ہوئی نہیں۔

دوسری جگہ فرمایا:

﴿فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ﴿15﴾ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ﴿16﴾﴾ [الفجر: ١٥، ١٦]

''پس لیکن انسان جب اس کا رب اسے آزمائے، پھر اسے عزت بخشے اور اسے نعمت دے تو کہتا ہے میرے رب نے مجھے عزت بخشی۔ اور لیکن جب وہ اسے آزمائے، پھر اس پر اس کا رزق تنگ کر دے تو

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٦٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٧)

کہتا ہے میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے کہ ہر وہ انسان جس کو اللہ تعالیٰ دنیا میں آزماتا ہے، ضروری نہیں کہ وہ اس کی اہانت ہی کر رہا ہے، بلکہ وہ تنگی اور فراوانی کے ساتھ اپنے بندے کو آزماتا ہے۔ مومن تنگی میں صبر کرتا ہے اور فراوانی میں شکر۔ یہ دونوں ہی اس کے لیے بہتر ہیں۔

صحیح میں رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے:

''اللہ تعالیٰ مومن کے لیے جو فیصلہ بھی کرتا ہے وہ اس کے لیے بہتر ہی ہوتا ہے۔ یہ مومن کے علاوہ کسی کے لیے نہیں۔ اگر اس کو خوشی ملے تو شکر کرتا ہے تو یہ اس کے لیے بہتر ہوتا ہے۔ اگر اس کو تنگی کا سامنا کرنا پڑے تو وہ صبر کرتا ہے۔ یہ اس کے لیے بہتر ہوتا ہے۔''[1]

منافق تھڑ دلا اور بہت جلد گھبرا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ۝١٩ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ۝٢٠ وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا ۝٢١ إِلَّا الْمُصَلِّينَ ۝٢٢ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ۝٢٣ وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ ۝٢٤ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ۝٢٥ وَالَّذِينَ يُصَدِّقُونَ بِيَوْمِ الدِّينِ ۝٢٦ وَالَّذِينَ هُم مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِم مُّشْفِقُونَ ۝٢٧ إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَأْمُونٍ ۝٢٨ وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ۝٢٩ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ۝٣٠ فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ ۝٣١ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ ۝٣٢ وَالَّذِينَ هُم بِشَهَادَاتِهِمْ قَائِمُونَ ۝٣٣ وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ۝٣٤ أُولَٰئِكَ فِي جَنَّاتٍ مُّكْرَمُونَ ۝٣٥﴾ [المعارج: ١٩۔٣٥]

''بلاشبہ انسان تھڑ دلا بنایا گیا ہے۔ جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو بہت گھبرا جانے والا ہے اور جب اسے بھلائی ملتی ہے تو بہت روکنے والا ہے۔ سوائے نماز ادا کرنے والوں کے۔ وہ جو اپنی نماز پر ہمیشگی کرنے والے ہیں اور وہ جن کے مالوں میں ایک حصہ مقرر ہے۔ سوال کرنے والے کے لیے اور (اس کے لیے) جسے نہیں دیا جاتا اور وہ جو جزا کے دن کو سچا مانتے ہیں اور وہ جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرنے والے ہیں۔ یقیناً ان کے رب کا عذاب ایسا ہے جس سے بے خوف نہیں ہوا جا سکتا اور وہ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ مگر اپنی بیویوں پر، یا جس کے مالک ان کے دائیں ہاتھ ہیں، تو یقیناً وہ ملامت کیے ہوئے نہیں۔ پھر جو اس کے علاوہ کوئی راستہ ڈھونڈے تو وہی حد سے گزرنے والے ہیں اور وہ جو اپنی امانتوں کا اور اپنے عہد کا لحاظ رکھنے والے ہیں اور وہ جو اپنی گواہیوں پر قائم رہنے والے ہیں اور وہ جو اپنی

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٩٩٩)

نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہی لوگ جنتوں میں عزت دیے جانے والے ہیں۔''

اگر انسان کو وہ عمل میسر ہو جو اس کے لیے فائدہ مند ہونے کے بجائے نقصان دہ ہو، یعنی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنا، تکبر کرنا، سرکشی کرنا اور وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت، اطاعت اور نیک عمل کا ارادہ کرے تو اس کو یہ حاصل نہیں ہوتا۔

ہر نماز میں یہ کہنے کا حکم دیا گیا ہے:

﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴾ [الفاتحة: ٤]

''ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ سے مدد مانگتے ہیں۔''

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان آدھا آدھا تقسیم کیا ہے۔ جب وہ کہتا ہے: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ اللہ تعالیٰ کہتا ہے: میرے بندے نے میری تعریف کی۔ جب وہ کہتا ہے: ﴿ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں: میرے بندے نے میری ثنا کی۔ جب وہ کہتا ہے: ﴿ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴾ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں: میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی۔ جب وہ کہتا ہے: ﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴾ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں: یہ آیت میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے اور میرے بندے کے لیے وہ ہے جس کا اس نے سوال کیا، جب وہ کہتا ہے: ﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴾ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں: یہ سب میرے بندے کے لیے ہیں اور میرے بندے کے لیے وہ ہے جس کا اس نے سوال کیا۔''[1]

کسی بزرگ کا قول ہے: ''اللہ تعالیٰ نے سو کتابیں نازل فرمائیں، ان تمام کا علم چار کتابوں میں جمع کیا، یعنی تورات، انجیل، زبور اور قرآن، ان چاروں کو قرآن میں جمع کیا، قرآن کا علم مفصل سورتوں میں جمع کیا، مفصل سورتوں کا علم سورت فاتحہ میں جمع کیا اور سورت فاتحہ کا علم ﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴾ میں ہے۔''

ہر وہ عمل جو بندہ کرتا ہے اگر وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عبادت نہ ہو اور صالح عمل نہ ہو تو وہ باطل ہے۔ دنیا ملعون ہے اور اس میں ہر وہ کام ملعون ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے نہ ہو، خواہ وہ اس کے ذریعے کوئی منصب یا مال حاصل کرے۔ حکمران اور سربراہ بننے والا زیادہ سے زیادہ یہ تمنا کر سکتا ہے کہ وہ فرعون کی طرح بن جائے اور دولت مند کی زیادہ سے زیادہ خواہش یہ ہو سکتی ہے کہ وہ قارون کی طرح مال دار بن جائے۔

اللہ تعالیٰ نے سورت قصص میں فرعون اور قارون دونوں سے متعلق بیان فرمایا ہے جس میں عقل مندوں کے

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٩٥)

لیے بڑی عبرت ہے۔

ہر وہ عمل جس پر اللہ تعالیٰ بندے کی مدد نہیں کرتا وہ نہ پایہ تکمیل کو پہنچتا ہے اور نہ فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔ جو اس کی مدد کے بغیر ہے وہ نہیں ہوتا اور جو اس کے لیے نہیں ہوتا وہ فائدہ مند اور دائمی نہیں ہوتا، اسی لیے بندے کو ﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴾ کہنے کا حکم دیا گیا ہے۔

بندے کی تقدیر میں لکھے ہوئے امور میں دو حالتیں ہیں: ایک اس کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے اور ایک بعد میں۔

مقدور کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے اس کو اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنی چاہیے، اس پر توکل کرنا چاہیے اور اس سے دعا کرنی چاہیے۔ جب اس کے فعل کے بغیر مقدور واقع ہو جائے تو اس کو اس پر راضی رہنا چاہیے اور صبر کرنا چاہیے۔ اگر وہ اس کے فعل کی وجہ سے واقع ہو اور وہ نعمت ہے تو اس کو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اگر وہ گناہ ہو تو اس کو استغفار کرنا چاہیے۔

مامور (جس کا حکم دیا گیا ہو) میں بھی اس کی دو ہی حالتیں ہوتی ہیں: ایک فعل سے پہلے اور ایک فعل کے بعد۔ فعل سے پہلے اس کو اللہ تعالیٰ کا حکم بجا لانے کے لیے عزم کرنا ہوتا ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنی ہوتی ہے۔ فعل کے بعد تقصیر پر استغفار اور نعمت و احسان پر شکر کرنا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ ﴾ [المؤمن: ٥٥]

''پس صبر کر، یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اپنے گناہ کے لیے بخشش مانگ۔''

اللہ تعالیٰ نے آپ کو مقدور میں لکھی گئی مصیبتوں پر صبر کرنے اور گناہ سے استغفار کرنے کا حکم دیا، گو ہر بندے کا استغفار اس کے اپنے حسبِ حال ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: ''حسنات الأبرار، سيئات المقربين'' ''نیک لوگوں کی نیکیاں اللہ تعالیٰ کے مقرب بندوں کی غلطیاں ہوتی ہیں۔'' اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿١٨٦﴾ ﴾ [آل عمران: ١٨٦]

''اور اگر تم صبر کرو اور متقی بنو تو بلاشبہ یہ ہمت کے کاموں سے ہے۔''

حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا تھا:

﴿ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ [یوسف: ٩٠]

''بے شک حقیقت یہ ہے کہ جو تقویٰ اختیار کرے اور صبر کرے تو بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔''

انھوں نے مصائب پر صبر کرنے اور ترکِ معائب کو از روئے تقویٰ اختیار کرنے کا ذکر کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی فرمایا:

"اس کی آرزو کر جو تجھے فائدہ دے، اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کر، کمزوری نہ دکھا....."[1]

اس حدیث میں آپ ﷺ نے صحابی کو حکم دیا کہ جب اس کو کوئی مصیبت پہنچے تو وہ تقدیر میں غور کرے اور ماضی پر کفِ افسوس نہ ملتا رہے، بلکہ اس کو یقین ہونا چاہیے کہ جو اس کو مصیبت پہنچی ہے وہ اس سے ٹل نہیں سکتی تھی اور جو ٹل گئی وہ اس کو پہنچنے والی نہیں تھی۔

چنانچہ مصیبت کے وقت تقدیر کی طرف دیکھنا اور عیب دار کاموں کی وجہ سے استغفار کرنا ہی شریعت کا حکم ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ یَسِیْرٌ ۝ لِّكَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ﴾ [الحدید: ۲۲، ۲۳]

"کوئی مصیبت نہ زمین پر پہنچتی ہے اور نہ تمھاری جانوں پر مگر وہ ایک کتاب میں ہے، اس سے پہلے کہ ہم اسے پیدا کریں۔ یقیناً یہ اللہ پر بہت آسان ہے۔ تاکہ تم نہ اس پر غم کرو جو تمھارے ہاتھ سے نکل جائے اور نہ اس پر پھول جاؤ جو وہ تمھیں عطا فرمائے۔"

﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَمَنْ یُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ یَهْدِ قَلْبَهٗ﴾ [التغابن: ۱۱]

"کوئی مصیبت نہیں پہنچی مگر اللہ کے اذن سے اور جو اللہ پر ایمان لے آئے وہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے۔"

حضرت علقمہ وغیرہ کا قول ہے: "یہ وہ آدمی ہے جس کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو اس کو یقین ہوتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، پھر وہ اس کو برضا و رغبت تسلیم کرتا ہے۔" واللّٰہ أعلم[2]

کیا اللہ ہی گمراہ کرتا اور ہدایت دیتا ہے؟

سوال کیا پروردگارِ عالم ہی گمراہ کرتا اور ہدایت دیتا ہے؟

جواب کائنات میں جو کچھ ہے وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور پیدا کردہ ہے۔ اس نے اس کو اپنی مشیت اور قدرت کے ساتھ پیدا کیا۔ اس نے جو چاہا ہو گیا اور جو نہ چاہا نہ ہوا۔ وہی دیتا ہے، وہی روکتا ہے، وہی بلند کرتا ہے، وہی پست کرتا ہے، وہی عزت دیتا ہے، وہی ذلت دیتا ہے، وہی مالدار کرتا ہے، وہی فقیر بناتا ہے، وہی ہدایت دیتا

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲٦٦٤)

[2] مجموع الفتاویٰ (۸/٦٥-۷۷)

ہے، وہی گمراہ کرتا ہے، وہی خوش بخت بناتا ہے، وہی بد بخت بناتا ہے، وہ جس کو چاہتا ہے بادشاہت عطا کرتا ہے، جس سے چاہتا ہے بادشاہت چھین لیتا ہے، جس کا سینہ چاہتا ہے اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جس کا چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے جیسے وہ آسمان کی طرف چڑھ رہا ہو۔ وہی دلوں کو پھیرتا ہے۔ ہر بندے کا دل اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں کے درمیان ہے۔ اگر اس کو درست رکھنا چاہے تو وہ درست رہتا ہے اور اگر اس کو ٹیڑھا اور گمراہ کرنا چاہے تو گمراہ کر دیتا ہے۔

اسی نے مومنوں کے لیے ایمان کو محبوب بنایا، اسے ان کے دلوں میں مزین کیا اور کفر، نافرمانی اور گناہ کو ان کے لیے قابلِ نفرت بنا دیا اور وہی ہدایت والے ہیں۔ اسی نے مسلمان کو مسلمان اور نمازی کو نمازی بنایا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی:

﴿ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ﴾ [البقرة: ١٢٨]

''اے ہمارے رب! اور ہمیں اپنے لیے فرماں بردار بنا اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک امت اپنے لیے فرماں بردار بنا۔''

دوسری جگہ کہا:

﴿ رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ﴾ [إبراهيم: ٤٠]

''اے میرے رب! مجھے نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد میں سے بھی۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ﴾ [السجدة: ٢٤]

''اور ہم نے ان میں ایسے پیشوا بنائے، جو ہمارے حکم سے ہدایت دیتے تھے، جب انھوں نے صبر کیا۔''

آلِ فرعون کے بارے میں کہا:

﴿ وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ﴾ [القصص: ٤١]

''اور ہم نے انھیں ایسے پیشوا بنایا جو آگ کی طرف بلاتے تھے۔''

ایک جگہ کہا:

﴿ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۝١٩ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۝٢٠ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ۝٢١ ﴾ [المعارج: ١٩۔٢١]

''بلاشبہ انسان تھڑ دلا بنایا گیا ہے۔ جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو بہت گھبرا جانے والا ہے اور جب اسے

بھلائی ملتی ہے تو بہت روکنے والا ہے۔''

ایک مقام پر ارشاد ہوا:

﴿ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا ﴾ [هود: ٣٧]

''اور ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہماری وحی کے مطابق کشتی بنا۔''

نیز فرمایا:

﴿ وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ ﴾ [هود: ٣٨] ''اور وہ کشتی بناتا رہا۔''

کشتی آدم علیہ السلام کی اولاد کے لیے بنائی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ اس نے اس کو پیدا کیا:

﴿ وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهِ مَا يَرْكَبُونَ ۝ ﴾ [يٰس: ٤٢]

''اور ہم نے ان کے لیے اس جیسی کئی اور چیزیں بنائیں جن پر وہ سوار ہوتے ہیں۔''

ارشاد ہے:

﴿ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا ﴾ [النحل: ٨٠]

''اور اللہ نے تمھارے لیے تمھارے گھروں سے رہنے کی جگہ بنا دی اور تمھارے لیے چوپاؤں کی کھالوں سے ایسے گھر بنائے جنھیں تم اپنے کوچ کے دن اور اپنے قیام کے دن ہلکا پھلکا پاتے ہو اور ان کی اونوں سے اور ان کی پشموں سے۔''

یہ تمام چیزیں بنی آدم کے لیے بنائی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ۝ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ ﴾ [الصافات: ٩٥، ٩٦]

''کیا تم اس کی عبادت کرتے ہو جسے تم خود تراشتے ہو؟ حالانکہ اللہ ہی نے تمھیں پیدا کیا اور اسے بھی جو تم کرتے ہو۔''

اس آیت میں لفظ ﴿ مَا ﴾ الذي (اسم موصول) کے معنی میں ہے۔ جو اس کو ما مصدریہ قرار دیتا ہے وہ غلط کہتا ہے، لیکن اگر اس نے ''تراشیدہ'' کو بھی اسی طرح پیدا کیا ہے جس طرح ہر بنائی گئی چیز کو، لباس کو اور عمارت کو تو ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ ہر بنانے والے اور اس کی بنائی گئی چیزوں کا خالق ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ﴾ [الكهف: ١٧]

''جسے اللہ ہدایت دے سو وہی ہدایت پانے والا ہے اور جسے گمراہ کر دے، پھر تو اس کے لیے ہرگز کوئی

راہنمائی کرنے والا دوست نہ پائے گا۔‘‘

ایک جگہ فرمایا:

﴿فَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ وَمَنْ يُرِدْ أَنْ يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا﴾ [الأنعام: ١٢٥]

’’تو وہ شخص جسے اللہ چاہتا ہے کہ اسے ہدایت دے، اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے کہ اسے گمراہ کرے اس کا سینہ تنگ، نہایت گھٹا ہوا کر دیتا ہے۔‘‘

لہٰذا اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق، پروردگار اور مالک ہے۔ اس نے جو پیدا کیا ہے اس میں اس کی حکمت کمال کو پہنچی ہوئی، نعمت چھائی ہوئی اور رحمتِ عام اور خاص ہے۔ وہ جو کرتا ہے اس کے بارے میں اس سے نہیں پوچھا جاتا، لیکن لوگوں سے پوچھا جائے گا۔ یہ سب کچھ محض اس کی قدرت اور غلبے کے ساتھ وقوع پذیر نہیں ہوا، بلکہ اس کے کمالِ علم، کمالِ قدرت، کمالِ رحمت اور کمالِ حکمت کا پرتو ہے۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ سب حاکموں سے بڑا حاکم اور سب رحم کرنے والوں سے بڑا رحم کرنے والا ہے۔ وہ اپنے بندوں پر ماں کے اپنی اولاد پر رحم کرنے سے بھی زیادہ رحم کرتا ہے۔ اس نے ہر چیز کو بڑے خوب صورت انداز میں پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ صُنْعَ اللَّهِ الَّذِي أَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ﴾ [النمل: ٨٨]

’’اور تو پہاڑوں کو دیکھے گا، انھیں گمان کرے گا کہ وہ جمے ہوئے ہیں، حالانکہ وہ بادلوں کے چلنے کی طرح چل رہے ہوں گے، اس اللہ کی کاری گری سے جس نے ہر چیز کو مضبوط بنایا۔‘‘

اس نے چیزوں کو اسباب کے ساتھ پیدا کیا ہے، ارشاد ہے:

﴿وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ [البقرة: ١٦٤]

’’اور اس پانی میں (نشانیاں ہیں) جو اللہ نے آسمان سے اتارا، پھر اس کے ساتھ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کر دیا۔‘‘

دوسری جگہ فرمایا:

﴿فَأَنْزَلْنَا بِهِ الْمَاءَ فَأَخْرَجْنَا بِهِ مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ﴾ [الأعراف: ٥٧]

’’پھر ہم اس سے پانی اتارتے ہیں، پھر اس کے ساتھ ہر قسم کے پھل پیدا کرتے ہیں۔‘‘

اور ایک جگہ فرمایا:

﴿يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ﴾ [المائدة: ١٦]

''جس کے ساتھ اللہ ان لوگوں کو جو اس کی رضا کے پیچھے چلیں، سلامتی کے راستوں کی ہدایت دیتا ہے۔''[1]

کیا مخلوق کے گناہ کرنے میں اللہ کا ارادہ شامل ہوتا ہے؟

سوال کیا اللہ تعالیٰ نے یہ ارادہ کیا کہ اس کی مخلوق گناہ کرے یا نہیں کیا؟

جواب لفظ ارادہ ایک مجمل لفظ ہے جس کے دو معانی ہیں: ایک اس سے اللہ تعالیٰ کے کسی چیز کو پیدا کرنے کی مشیت مراد ہے اور دوسرے اس سے اس کی اس امر کے لیے محبت اور پسندیدگی مراد ہے جس کا وہ حکم دیتا ہے۔

اگر سائل کا یہ مقصود ہے کہ وہ گناہوں کو پسند کرتا ہے، ان پر خوش ہوتا اور ان کا حکم دیتا ہے تو اس معنی میں اس نے مخلوق کے لیے گناہ کا ارادہ نہیں کیا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ فساد سے نفرت کرتا ہے، اپنے بندوں کے لیے کفر پسند نہیں کرتا اور برائی کا حکم نہیں دیتا، بلکہ اس نے جب اس سے منع کیا تو فرمایا:

﴿كُلُّ ذَٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهُ عِندَ رَبِّكَ مَكْرُوهًا﴾ [بني اسرائيل: ٣٨]

''یہ سب کام، ان کا برا تیرے رب کے ہاں ہمیشہ سے ناپسندیدہ ہے۔''

اگر اس کی مراد یہ ہے کہ وہ بھی من جملہ ان پیدا کردہ چیزوں میں سے ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے چاہا اور پیدا کیا، لہٰذا اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے۔ جو اس نے چاہا ہو گیا اور جو نہ چاہا نہ ہوا کائنات میں کوئی بھی چیز اس کی مشیت اور مرضی کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتی۔

اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ ذکر کیا ہے کہ وہ اس کا ارادہ کرتا ہے اور دوسری جگہ ذکر کیا کہ وہ اس کا ارادہ نہیں کرتا۔ پہلی جگہ سے مراد ہے کہ اس نے خَلقاً، یعنی پیدا کرنے کے لحاظ سے اس کا ارادہ کیا، مگر وہ امراً اس کو پسند نہیں کرتا اور اس پر خوش نہیں ہوتا۔ جیسے درج ذیل آیت میں ہے:

﴿فَمَن يُرِدِ اللَّهُ أَن يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ ۖ وَمَن يُرِدْ أَن يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا﴾ [الأنعام: ١٢٥]

''تو وہ شخص جسے اللہ چاہتا ہے کہ اسے ہدایت دے، اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے کہ اسے گمراہ کرے اس کا سینہ تنگ، نہایت گھٹا ہوا کر دیتا ہے۔''

حضرت نوح علیہ السلام نے کہا:

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٨/٨٧)

﴿ وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيَ إِنْ أَرَدْتُ أَنْ أَنْصَحَ لَكُمْ إِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيدُ أَنْ يُغْوِيَكُمْ هُوَ رَبُّكُمْ ﴾ [هود: ٣٤]

''اور میری نصیحت تمھیں نفع نہ دے گی اگر میں چاہوں کہ تمھیں نصیحت کروں، اگر اللہ یہ ارادہ رکھتا ہو کہ تمھیں گمراہ کرے، وہی تمھارا رب ہے۔''

دوسرے معنی میں کہا:

﴿ يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ﴾ [البقرة: ١٨٥]

''اللہ تمھارے ساتھ آسانی کا ارادہ رکھتا ہے اور تمھارے ساتھ تنگی کا ارادہ نہیں رکھتا۔''

﴿ يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوبَ عَلَيْكُمْ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿26﴾ وَاللّٰهُ يُرِيدُ أَنْ يَتُوبَ عَلَيْكُمْ وَيُرِيدُ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الشَّهَوَاتِ أَنْ تَمِيلُوا مَيْلًا عَظِيمًا ﴿27﴾ يُرِيدُ اللّٰهُ أَنْ يُخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْإِنْسَانُ ضَعِيفًا ﴿28﴾ ﴾ [النساء: ٢٦۔٢٨]

''اللہ چاہتا ہے کہ تمھارے لیے کھول کر بیان کرے اور تمھیں ان لوگوں کے طریقوں کی ہدایت دے جو تم سے پہلے تھے اور تم پر مہربانی فرمائے اور اللہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے اور اللہ چاہتا ہے کہ تم پر مہربانی فرمائے اور جو لوگ خواہشات کی پیروی کرتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم (سیدھے راستے سے) ہٹ جاؤ، بہت بڑا ہٹ جانا۔ اللہ چاہتا ہے کہ تم سے (بوجھ) ہلکا کرے اور انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔''

﴿ مَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ حَرَجٍ وَلَٰكِنْ يُرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ ﴾ [المائدة: ٦]

''اللہ نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی تنگی کرے اور لیکن وہ چاہتا ہے کہ تمھیں پاک کرے اور تاکہ وہ اپنی نعمت تم پر پوری کرے۔''

﴿ إِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا ﴾ [الأحزاب: ٣٣]

''اللہ تو یہی چاہتا ہے کہ تم سے گندگی دور کر دے اے گھر والو! اور تمھیں پاک کر دے، خوب پاک کرنا۔''[1]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (١٥٩/٨۔١٦٠)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول: ''صرف اپنے رب سے امید رکھنا اور اپنے گناہ سے ڈرنا'' کی شرح

سوال حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس قول کا کیا معنی ہے: ''لَا يَرْجُوَنَّ عَبْدٌ إِلَّا رَبَّهُ وَلَا يَخَافَنَّ إِلَّا ذَنْبَهُ'' ''بندہ صرف اپنے رب سے امید رکھے اور صرف اپنے گناہوں سے ڈرے۔''؟

جواب یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول جملہ ہے جو خوبصورت ترین، بلیغ ترین اور کامل ترین جملہ ہے۔ خیر کی امید کی جاتی ہے اور شر سے ڈرا جاتا ہے۔ بندے کو اس کے گناہوں کی وجہ سے شر اور تکلیف پہنچتی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَمَآ اَصٰبَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ﴾ [الشوریٰ: ۳۰]

''اور جو بھی تمھیں کوئی مصیبت پہنچی تو وہ اس کی وجہ سے ہے جو تمھارے ہاتھوں نے کمایا اور وہ بہت سی چیزوں سے درگزر کر جاتا ہے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ اَيْنَمَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ۝ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ﴾ [النساء: ۷۸، ۷۹]

''تم جہاں کہیں بھی ہو گے موت تمھیں پا لے گی، خواہ تم مضبوط قلعوں میں ہو اور اگر انھیں کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر انھیں کوئی برائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں یہ تیری طرف سے ہے۔ کہہ دے سب اللہ کی طرف سے ہے، پھر ان لوگوں کو کیا ہے کہ قریب نہیں ہیں کہ کوئی بات سمجھیں۔ جو کوئی بھلائی تجھے پہنچے سو اللہ کی طرف سے ہے اور جو کوئی برائی تجھے پہنچے سو تیرے نفس کی طرف سے ہے۔''

بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس آیت میں حسنات (اچھائیوں) سے مراد فرماں برداریاں اور سیئات (برائیوں) سے مراد نافرمانیاں ہیں۔

تقدیر کا اثبات کرنے والے اس فرمان: ﴿ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ﴾ سے استدلال کرتے ہیں تو یہ دوسری آیت: ﴿ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ﴾ ان کی مخالفت کرتی ہے۔ تقدیر کی نفی کرنے والے اس دوسری آیت سے حجت لیتے ہیں اور اس میں غلطی کرتے ہیں، کیوں کہ ان کا نظریہ ہے کہ بندہ اپنے تمام افعال کا خود خالق ہے، جب کہ یہ فرمان: ﴿ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ﴾ ان کی مخالفت کرتا ہے۔

دونوں ہی فریق اچھائیوں سے فرماں برداریاں اور برائیوں سے نافرمانیاں مراد لے کر غلطی کا شکار ہوئے ہیں، کیوں کہ اس آیت میں حسنات اچھائیوں سے مراد نعمتیں اور سیئات (برائیوں) سے مراد مصیبتیں ہیں، جس طرح اللہ تعالیٰ درج ذیل آیات میں بیان کرتے ہے:

﴿ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴾ [الأعراف: ١٦٨]

''اور ہم نے اچھے حالات اور برے حالات کے ساتھ ان کی آزمایش کی، تاکہ وہ باز آ جائیں۔''

﴿ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ﴾

[الأعراف: ١٣١]

''اور جب ان پر خوش حالی آتی تو کہتے یہ ہمارے ہی لیے ہے اور اگر انھیں کوئی تکلیف پہنچتی تو موسیٰ اور اس کے ساتھ والوں کے ساتھ نحوست پکڑتے۔''

﴿ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۡ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ﴾ [آل عمران: ١٢٠]

''اگر تمھیں کوئی بھلائی پہنچے تو انھیں بری لگتی ہے اور اگر تمھیں کوئی تکلیف پہنچے تو اس پر خوش ہوتے ہیں۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی مذمت کی ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے فرار کی راہیں ڈھونڈتے تھے۔ جب ان کو رزق، نصرت اور عافیت ملتی تو کہتے: ﴿ هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ ﴾ [النساء: ٧٨] ''یہ اللہ کی طرف سے ہے۔'' اور جب انھیں فقیری، ذلت اور بیماری کا سامنا کرنا پڑتا تو کہتے: ﴿ هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ۭ ﴾ [النساء: ٧٨] ''یہ تمھاری طرف سے ہے۔'' یعنی اے محمد! تم نے جو ہمیں حکم دیا، اس کی وجہ سے ہمیں ان ذلتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے ان سے کہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان کی کیفیت بیان کی:

﴿ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ﴾

[الأعراف: ١٣١]

''اور جب ان پر خوش حالی آتی تو کہتے یہ ہمارے ہی لیے ہے اور اگر انھیں کوئی تکلیف پہنچتی تو موسیٰ اور اس کے ساتھ والوں کے ساتھ نحوست پکڑتے۔''

کافروں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رسولوں سے بھی یہی کہا تھا:

﴿ اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ ﴾ [یٰسٓ: ١٨] ''بے شک ہم نے تمھیں منحوس پایا ہے۔''

چنانچہ جب کافروں اور منافقوں کو اپنے گناہوں کی وجہ سے کوئی تکلیف پہنچتی تو مومنوں سے بدشگونی لیتے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ حقیقت بیان کی کہ اچھائی (نعمت) اللہ کی طرف سے ہے اور وہ ان کو اس کے ساتھ نوازتا ہے اور برائی

(مصیبت) ان کے گناہوں کی وجہ سے ان کو پہنچتی ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴾ [الأنفال: ٣٣]

''اور اللہ کبھی ایسا نہیں کہ انھیں عذاب دے، جب کہ تو ان میں ہو اور اللہ انھیں کبھی عذاب دینے والا نہیں جب کہ وہ بخشش مانگتے ہوں۔''

اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ وہ بخشش طلب کرنے والے کو عذاب نہیں دیتا، کیوں کہ استغفار (بخشش طلب کرنا) اس گناہ کو مٹا دیتا ہے جو عذاب کا سبب ہوتا ہے، لہٰذا عذاب ٹل جاتا ہے۔ سنن ابوداود اور ابن ماجہ میں فرمانِ مصطفیٰ ہے:

''جو کثرت سے استغفار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو ہر غم سے آزاد کرتا ہے، ہر تنگی سے نکلنے کی راہ مہیا کرتا ہے اور اس کو اس جگہ سے رزق دیتا ہے، جہاں سے وہ گمان بھی نہیں کرتا۔''[1]

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۭ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ ۙ وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ﴾ [هود: ٢، ٣]

''یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، بے شک میں تمھارے لیے اس کی طرف سے ایک ڈرانے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں اور یہ کہ اپنے رب سے بخشش مانگو، پھر اس کی طرف پلٹ آؤ تو وہ تمھیں ایک معین مدت تک اچھا ساز و سامان دے گا اور ہر زیادہ عمل والے کو اس کا زیادہ ثواب دے گا۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار کرتا ہے اور اس سے بخشش طلب کرتا ہے، اس کو مقررہ وقت تک بڑا بہترین فائدہ پہنچاتا رہتا ہے اور جو اس کے بعد کوئی اچھا عمل کرتا ہے تو اس کی فضیلت میں اضافہ کر دیتا ہے۔ حدیثِ نبوی ہے کہ شیطان کہتا ہے:

''میں نے لوگوں کو گناہوں کے ساتھ ہلاک کیا اور انھوں نے مجھے لا إله إلا الله اور استغفار کے ساتھ ہلاک کر دیا۔ جب میں نے یہ دیکھا تو ان میں خواہشات پھیلا دیں، پس وہ گناہ کرتے ہیں اور توبہ نہیں کرتے، کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں۔''[2]

اسی لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥١٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٨١٩) السلسلة الضعفة (٧٠٥)

[2] مسند أبي يعلىٰ (١/١٢٣) السنة لابن أبي عاصم (١/٩) ضعيف الجامع (٣٧٩٥) اس کی سند میں عثمان بن مطر راوی کمزور ہے لہٰذا یہ روایت ضعیف ہے۔

﴿ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ۝ فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا ﴾

[الأنعام: ٤٢، ٤٣]

''پھر انھیں تنگ دستی اور تکلیف کے ساتھ پکڑا، تاکہ وہ عاجزی کریں۔ پھر انھوں نے کیوں عاجزی نہ کی، جب ان پر ہمارا عذاب آیا۔''

یعنی جب ان کے پاس ہماری سختی آئی تو انھوں نے گڑگڑاہٹ کیوں نہ کی؟ کیوں کہ سختی کے آنے کے وقت گڑگڑانا ان کا حق تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُوْنَ ۝ ﴾ [المؤمنون: ٧٦]

''اور بلاشبہ یقیناً ہم نے انھیں عذاب میں پکڑا، پھر بھی وہ نہ اپنے رب کے آگے جھکے اور نہ عاجزی اختیار کرتے تھے۔''

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا قول ہے:

''ما نزل بلاء إلا بذنب، ولا رفع إلا بتوبة''

''ہر مصیبت گناہ کی وجہ سے آتی ہے اور توبہ کے بغیر رفع اور زائل نہیں ہوتی۔''

اسی لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ۝ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ۝ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۠ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ ﴾ [آل عمران: ١٧٣۔١٧٥]

''وہ لوگ کہ لوگوں نے ان سے کہا کہ بے شک لوگوں نے تمھارے لیے (فوج) جمع کر لی ہے، سو ان سے ڈرو، تو اس (بات) نے انھیں ایمان میں زیادہ کر دیا اور انھوں نے کہا ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے۔ تو وہ اللہ کی طرف سے عظیم نعمت اور فضل کے ساتھ لوٹے، انھیں کوئی برائی نہیں پہنچی اور انھوں نے اللہ کی رضا مندی کی پیروی کی اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے۔ یہ تو شیطان ہی ہے جو اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے، تو تم ان سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو، اگر تم مومن ہو۔''

لہٰذا اس نے مومنوں کو شیطان کے دوستوں سے ڈرنے سے منع کیا اور صرف اپنے سے ڈرنے کا حکم دیا، کیونکہ اس کا ڈر اور خوف اس کے حکم کی تعمیل، اس کے منع کردہ کاموں سے اجتناب اور گناہوں سے استغفار کا موجب ہے۔ جب مومن یہ کام کرتا ہے تو اس وقت مصیبت ٹل جاتی ہے اور وہ دشمنوں پر فتح پا لیتا ہے۔ اسی لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے

کہا ہے: ''بندہ صرف اپنے گناہ سے ڈرے۔''

اگر اس پر مخلوق کو مسلط کر دیا جائے تو ایسا صرف اس کے گناہوں کی وجہ سے ہوتا ہے، لہٰذا بندے کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے اور ان گناہوں سے توبہ کرنی چاہیے جن کی وجہ سے اس کو مصیبتیں پہنچتی ہیں۔ ایک اثر (روایت) میں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''میں اللہ ہوں بادشاہوں کا بادشاہ۔ بادشاہوں کے دل اور پیشانیاں میرے ہاتھ میں ہیں۔ جس نے میری فرماں برداری کی، میں ان کو اس پر رحمت بنا دوں گا۔ جس نے میری نافرمانی کی، میں ان کو اس پر عذاب بنا دوں گا، لہٰذا بادشاہوں کو برا بھلا کہنے میں مشغول نہ رہو اور میری اطاعت کرو۔ میں ان کے دل تمھارے لیے نرم کر دوں گا۔''

ان کے قول کا دوسرا حصہ ہے: ''کوئی بندہ اپنے رب کے سوا کسی سے امید نہ رکھے۔''

امید رکھنے والا بھلائی کا طلب گار ہوتا ہے اور برائی کو دور بھگانا چاہتا ہے۔ اچھائیاں صرف اللہ تعالیٰ لاتا ہے اور برائیاں بھی وہی دور کرتا ہے:

﴿ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَاۗدَّ لِفَضْلِهٖ ﴾ [یونس: ۱۰۷]

''اور اگر اللہ تمھیں کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کے سوا اسے کوئی دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تیرے ساتھ کسی بھلائی کا ارادہ کر لے تو کوئی اس کے فضل کو ہٹانے والا نہیں۔''

﴿ مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكْ ۙ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ ﴾ [الفاطر: ۲]

''جو کچھ اللہ لوگوں کے لیے رحمت میں سے کھول دے اسے کوئی بند کرنے والا نہیں اور جو بند کر دے اس کے بعد اسے کوئی کھولنے والا نہیں۔''

امید توکل کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ توکل کرنے والا جس فائدے کے حصول اور جس نقصان سے محفوظ رہنے کی امید رکھتا ہے، اس کو طلب کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی پر توکل کرنا جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ [المائدۃ: ۲۳]

''اور اللہ ہی پر پس بھروسا کرو، اگر تم مومن ہو۔''

﴿ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴾ [آل عمران: ۱۲۲]

''اور اللہ ہی پر پس لازم ہے کہ مومن بھروسا کریں۔''

﴿ اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ۗ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴾ [آل عمران: ١٦٠]

''اگر اللہ تمھاری مدد کرے تو تم پر کوئی غالب آنے والا نہیں اور اگر وہ تمھارا ساتھ چھوڑ دے تو وہ کون ہے جو اس کے بعد تمھاری مدد کرے گا اور اللہ ہی پر پس لازم ہے کہ مومن بھروسا کریں۔''

﴿ وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ﴿59﴾ ﴾ [التوبة: ٥٩]

''اور کاش کہ واقعی وہ اس پر راضی ہو جاتے جو انھیں اللہ اور اس کے رسول نے دیا اور کہتے ہیں ہمیں اللہ کافی ہے، جلد ہی اللہ ہمیں اپنے فضل سے دے گا اور اس کا رسول بھی۔ بے شک ہم اللہ ہی کی طرف رغبت رکھنے والے ہیں۔''

﴿ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴾ [آل عمران: ١٧٣]

''وہ لوگ کہ لوگوں نے ان سے کہا کہ بے شک لوگوں نے تمھارے لیے (فوج) جمع کر لی ہے، سو ان سے ڈرو، تو اس (بات) نے انھیں ایمان میں زیادہ کر دیا اور انھوں نے کہا ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے۔''

ان لوگوں نے کہا: ﴿ حَسْبُنَا اللّٰهُ ﴾، یعنی مصیبت دور کرنے میں ہمارے لیے اللہ ہی کافی ہے اور ان کو یہ کہنے کا حکم دیا گیا: ''نعمتیں لانے میں ہمیں اللہ ہی کافی ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہی برائی دور کرنے اور بھلائی عطا کرنے میں اپنے بندے کے لیے کافی ہے، کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو کافی نہیں؟''

جو انسان غیر اللہ پر توکل کرتا ہے اور اس سے امید لگاتا ہے وہ اس کی طرف سے ناامید اور محروم ہو جاتا ہے:

﴿ مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۖ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ۖ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ﴾ [العنكبوت: ٤١]

''ان لوگوں کی مثال جنھوں نے اللہ کے سوا اور مددگار بنا رکھے ہیں مکڑی کی مثال جیسی ہے، جس نے ایک گھر بنایا، حالانکہ بے شک سب گھروں سے کمزور تو مکڑی کا گھر ہے۔''

﴿ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ﴿81﴾ كَلَّا ۚ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴿82﴾ ﴾ [مريم: ٨١، ٨٢]

''اور انھوں نے اللہ کے سوا اور معبود بنا لیے، تا کہ وہ ان کے لیے باعث عزت ہوں۔ ہرگز ایسا نہ ہوگا، عنقریب وہ ان کی عبادت کا انکار کر دیں گے اور ان کے خلاف مدِ مقابل ہوں گے۔''

﴿ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ﴾ [الحج: ٣١]

''اور جو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرائے تو گویا وہ آسمان سے گر پڑا، پھر اسے پرندے اچک لیتے ہیں، یا اسے ہوا کسی دور جگہ میں گرا دیتی ہے۔''

﴿ لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ﴾ [بني اسرائيل: ٢٢]

''اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود مت بنا، ورنہ مذمت کیا ہوا، بے یار و مددگار ہو کر بیٹھا رہے گا۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا:

﴿ فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ [العنكبوت: ١٧]

''اللہ کے ہاں ہی رزق تلاش کرو اور اس کی عبادت کرو اور اس کا شکر ادا کرو، اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔''

جو انسان اس امید پر غیر اللہ کے لیے عمل کرتا ہے کہ وہ اس سے کوئی فائدہ اٹھا سکے گا وہ خسارے کا سودا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۢ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً حَتّٰى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴾ [النور: ٣٩]

''اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، ان کے اعمال کسی چٹیل میدان میں ایک سراب کی طرح ہیں، جسے پیاسا پانی خیال کرتا ہے، یہاں تک کہ جب اس کے پاس آتا ہے تو اسے کچھ بھی نہیں پاتا اور اللہ کو اپنے پاس پاتا ہے تو وہ اسے اس کا حساب پورا چکا دیتا ہے اور اللہ بہت جلد حساب کرنے والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ِۨاشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ﴾ [إبراهيم: ١٨]

''ان لوگوں کی مثال جنھوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا، ان کے اعمال اس راکھ کی طرح ہیں جس پر آندھی والے دن میں ہوا بہت سخت چلی۔ وہ اس میں سے کسی چیز پر قدرت نہ پائیں گے جو انھوں نے کمایا۔''

﴿ وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴾ [الفرقان: ٢٣]

''اور ہم اس کی طرف آئیں گے جو انھوں نے کوئی بھی عمل کیا ہوگا تو اسے بکھرا ہوا غبار بنا دیں گے۔''

﴿ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ ﴾ [القصص: ۸۸] ''ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے مگر اس کا چہرہ۔''

اس کی تفسیر میں کہا گیا ہے کہ ہر وہ عمل باطل ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے نہ کیا گیا ہو، لہٰذا جو انسان اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کے لیے عمل کرتا ہے اور اس سے امید رکھتا ہے، اس کی کوشش رائیگاں ہے۔ امید کرنے والا کبھی اپنے اس عمل کے ذریعے سے امید کرتا ہے جو وہ اس کے لیے کرتا ہے جس سے امید رکھتا ہے، کبھی اس پر دلی اعتماد کر کے اور اس سے التجا اور سوال کر کے اس سے امید رکھتا ہے۔ یہ اس کی عبادت کی ایک قسم اور اس سے مدد طلب کرنے کی ایک نوع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ﴾ [الفاتحة: ٤]

''ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ سے مدد مانگتے ہیں۔''

﴿ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ﴾ [هود: ۱۲۳] ''سو اس کی عبادت کر اور اس پر بھروسا کر۔''

﴿ قُلْ هُوَ رَبِّي لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ مَتَابِ ﴿٣٠﴾ ﴾ [الرعد: ۳۰]

''کہہ دے وہی میرا رب ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی پر میں نے بھروسا کیا اور اسی کی طرف میرا لوٹنا ہے۔''

اس کی مزید وضاحت اس سے بھی ہوتی ہے کہ ہر بھلائی اور نعمت جو بندے کو حاصل ہوتی ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے اور ہر برائی اور مصیبت جو بندے سے دور ہوتی ہے اس کو اللہ تعالیٰ ہی روکتا ہے۔

جب اس کا کوئی سبب مخلوق کے ہاتھ سے جاری اور رونما ہوتا ہے تو حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی تمام اسباب کا خالق ہے، خواہ وہ اسباب کسی زندہ کی اختیاری اور ارادی حرکت ہو، جس طرح اللہ تعالیٰ فرشتوں، جنوں، انسانوں اور چوپایوں کی حرکت سے کوئی چیز پیدا کرتا ہے، یا وہ کسی جماد اور بے جان کی حرکت ہو جو اللہ تعالیٰ نے اس کی فطرت میں رکھی ہو، یا وہ کسی مجبور کرنے والے کے مجبور کرنے سے رونما ہو، یعنی جبری حرکت ہو، جیسے: ہواؤں کی حرکت، پانیوں کی حرکت وغیرہ۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی ان سب کا خالق ہے۔ نیکی کرنے کی طاقت اور بدی سے رکنے کی قوت اسی کے ساتھ ہے۔ جو اس نے چاہا وہ ہو گیا اور جو نہ چاہا نہ ہوا، لہٰذا مکمل امید صرف اللہ تعالیٰ سے رکھنی چاہیے، اسی پر توکل کرنا چاہیے اور اسی سے دعا کرنی چاہیے۔ اگر اس نے وہ چاہا اور اس کو آسان کیا تو وہ ہو جائے گا اور آسان ہو جائے گا۔ اگر نہ چاہا نہ آسان کیا، تو وہ نہ ہو گا نہ آسان ہو گا، خواہ سارے لوگ ہی چاہیں۔

اگر اسباب میں کوئی چیز مطلوب کو حاصل کرنے میں مستقل ہوتی تو پھر بھی اللہ تعالیٰ ہی سے امید رکھنا ضروری ہوتا۔ اگر فرض کیا جائے کہ اسباب میں کوئی چیز مطلوب کو حاصل کرنے میں مستقل ہو تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت اور

اس کے آسان کرنے ہی کی وجہ سے مستقل ہوگی، پھر بھی واجب اور لازم یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے امید نہ رکھی جائے، اس کے سوا کسی پر توکل نہ کیا جائے، اس کے سوا کسی سے نہ مانگا جائے، اس کے سوا کسی سے مدد طلب نہ کی جائے، اسی سے فریاد کی جائے، اسی کی تعریف کی جاتی ہے، اسی سے شکایت کی جاتی ہے، اسی سے مدد طلب کی جاتی ہے اور اسی سے فریاد کی جاتی ہے۔ اس کے عطا کرنے سے نیکی کی طاقت اور برائی سے بچنے کی قوت میسر آتی ہے، لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ اسباب میں کوئی چیز بھی مطلوب کو حاصل کرنے میں مستقل نہیں، بلکہ اس کے ساتھ دیگر اسباب کا ملنا از بس ضروری ہے اور اس سے رکاوٹوں اور سامنے آنے والی چیزوں کو دور کرنا بھی لازمی ہے، پھر کہیں جا کر گوہرِ مقصود ہاتھ آتا ہے۔ ہر سبب کا ایک شریک ہوتا ہے اور ایک مخالف اور مدِ مقابل، اگر اس کا شریک اس کی معاونت نہ کرے اور اس کے مدِ مقابل کو اس سے دور نہ کیا جائے تو اس کا سبب اور نتیجہ حاصل نہیں ہوتا۔ اکیلی بارش نباتات نہیں اگاتی، جب تک اس کے ساتھ ہوا اور مٹی وغیرہ نہ ملے۔ پھر کھیتی اس وقت تک مکمل پروان نہیں چڑھتی، جب تک اس سے اس کو خراب کرنے والی آفتوں کو دور نہ کیا جائے۔

کھانا اور پینا اس وقت تک غذا اور جزوِ بدن نہیں بنتا، جب تک جسم میں اعضا اور قوتیں نہ ہوں، پھر یہ سب بھی غیر مفید ہی رہتا ہے اگر رکاوٹوں اور خرابی پیدا کرنے والی چیزوں کو دور نہ کیا جائے، وہ مخلوق (انسان) جو تجھے کچھ دیتی ہے، یا تیری مدد کرتی ہے تو وہ، باوجود یکہ اللہ تعالیٰ اس مین ارادہ، قوت اور فعل پیدا کرتا ہے، جو کرتی ہے اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا، جب تک اس کے ساتھ وہ بہت سارے اسباب وابستہ نہ ہوں جو اس کی قدرت اور مطلوب پر تعاون کرنے سے باہر ہوتے ہیں۔ اگر وہ ایسا بادشاہ ہو جس کی فرماں برداری کی جاتی ہو تو اس کے لیے مدد کرنے والے اسباب سے رکاوٹوں کو دور کرنا ضروری ہوتا ہے، چنانچہ مطلوب اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا، جب تک طلب و تقاضا موجود نہ ہو اور مانع مفقود نہ ہو۔ ہر متعین سبب تقاضے کا ایک حصہ ہوتا ہے، کائنات میں کوئی ایسی چیز نہیں جو اکیلی ہی تقاضا کرنے والی ہو، خواہ اس کو تقاضا کرنے والا کہا جائے اور اس کی تمام مددگار چیزوں کو شرطیں کہا جائے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، کیوں کہ یہ اختلاف لفظی ہے۔

تو کہا جائے گا کہ حصولِ مطلوب کے لیے تقاضے اور شرطوں کا ہونا اور رکاوٹوں کا نہ ہونا ضروری ہے۔

مخلوقات میں کوئی چیز مکمل علت نہیں جو اس کے معلول اور نتیجے کو مستلزم ہو، ایسا ہونا باطل ہے۔

جو انسان اس بات کی اچھی طرح معرفت رکھتا ہے اس کے سامنے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا دروازہ کھل جاتا ہے اور وہ یہ حقیقت یقین کے ساتھ جان لیتا ہے کہ غیر کی عبادت تو ایک طرف رہی، اس کے علاوہ کوئی اتنا بھی حق نہیں رکھتا کہ اس کو پکارا جائے، اس پر توکل کیا جائے اور اس سے امید رکھی جائے۔

یہ بات عقل و شریعت کے دلائل سے مزین و مسلح ہے، اس میں عالم بالا اور عالم زیریں کے اسباب، فرشتوں، انبیا اور مومنوں کے افعال اور ان کی شفاعت جیسے اسباب میں کوئی فرق نہیں۔ جو انسان سفارش اور دعا میں کسی فرشتے، نبی یا نیک آدمی پر توکل اور بھروسا کرتا ہے اس سے کہا جائے گا: یہ بھی ایک سبب ہے، یہ سفارش کرنے والا یا دعا کرنے والا یہ سب اللہ تعالیٰ کی مشیت اور قدرت کے بغیر نہیں کر سکتا، بلکہ اس کے فرماں برداروں کی شفاعت بھی اسی کے لیے ہوگی جس کے لیے وہ پسند کرے گا:

﴿ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى ﴾ [الأنبياء: ٢٨]

''اور وہ سفارش نہیں کرتے مگر اسی کے لیے جسے وہ پسند کرے۔''

اس کے پاس کوئی بھی اس کی تکوینی اور تقدیری (تقدیری حکم جس میں بندے کے پاس کوئی اختیار نہیں ہوتا) اجازت کے بغیر سفارش نہیں کر سکے گا۔ بندوں کا فعل ہونے کے اعتبار سے شفاعت اس کی مشیت اور قدرت کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ اس کی شفاعت مخلوق کی طرح نہیں کہ جہاں سفارش کرنے والے کی سفارش، جس کے پاس سفارش کی جاتی ہے، اس کی قوت اور ارادے کی مرہونِ منت نہیں ہوتی، جبکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ تمام تحولات اور تبدیلیوں کی طرح سفارش کرنے والے کی سفارش کا بھی خالق ہے۔ اس کے بغیر نیکی کی طاقت ہے نہ برائی سے بچنے اور پھرنے کی قوت۔ پھرنے (حول) سے مراد حرکت، ارادے یا کسی دوسری چیز کے ساتھ ایک حالت سے دوسری حالت میں پھرنا اور تبدیل ہونا ہے۔ تو شفاعت کرنے والے کے لیے شفاعت یا کسی بھی دوسرے کام میں اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی قوت نہیں جو اس کو اس کام کی طرف پھیر دے اور اس پر اکسائے۔ نیز اس کے فرماں بردار بندے جن کی شفاعت قبول کی جائے گی، صرف اس کے لیے شفاعت کریں گے، جس کے لیے وہ خود شفاعت کرنا پسند کرے گا اور وہ اللہ تعالیٰ سے ایسی چیز طلب نہیں کریں گے جس کو طلب کیا جانا اسے پسند نہیں، بلکہ فرشتے جن کے بارے میں قرآن کریم میں بیان کیا گیا ہے:

﴿ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴿٢٦﴾ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿٢٧﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴿٢٨﴾ ﴾ [الأنبياء: ٢٦-٢٨]

''اور انھوں نے کہا رحمٰن نے کوئی اولاد بنا رکھی ہے، وہ پاک ہے، بلکہ وہ بندے ہیں جنھیں عزت دی گئی ہے۔ وہ بات کرنے میں اس سے پہل نہیں کرتے اور وہ اسی کے حکم کے ساتھ ہی عمل کرتے ہیں۔ وہ جانتا ہے جو ان کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے اور وہ سفارش نہیں کرتے مگر اسی کے لیے جسے وہ پسند کرے اور وہ اسی کے خوف سے ڈرنے والے ہیں۔''

ان سے قول صادر ہوگا یا عمل اور قول بھی خدا کے بات کرنے سے پہلے صادر نہیں ہوگا، بلکہ وہ جب تک نہیں بولے گا تب تک یہ کوئی بات نہیں کریں گے اور سفارش بھی صرف اسی کی کریں گے جس کے لیے وہ پسند کرے گا۔

اس لیے ہمیں بھی چاہیے کہ ہم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کے ساتھ یہی ادب روا رکھیں۔ دین میں اس وقت تک کوئی بات نہ کہیں جب تک وہ نہ کہے۔ اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھیں۔ اس کی صرف اس طریقے کے مطابق عبادت کریں جس کا اس نے حکم دیا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر صرف اس پر عمل کریں جس کا اس نے حکم دیا ہے اور ہمارے اعمال واجب ہوں یا مستحب۔ اگر ان جیسے اسباب میں اس طرح ہے تو پھر اس شخص کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے جو ان اسباب کو چھوڑ کر ستاروں اور بادشاہوں، سربراہوں، دوستوں، غلاموں اور پیروکاروں وغیرہ کے افعال پر توکل کرتا ہے اور ان سے امید لگا لیتا ہے؟!

یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ علما نے جو کہا ہے کہ ''صرف اسباب کی طرف توجہ کرنا شرک ہے، اسباب کے سبب ہونے کی نفی کرنا کم عقلی ہے اور اسباب سے بالکل صرفِ نظر کرنا شریعت کی تنقیص وتنقید ہے'' تو اس لیے کہا ہے کہ توکل اور امید ایسے مفاہیم ہیں جو توحید، عقل اور شریعت کے نتیجے اور اثر سے تشکیل پاتے ہیں۔ اس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

سبب پر انحصار کرنے کا معنی ہے دل کا اس پر اعتماد کرنا، اس سے امید لگانا اور اس کو سہارا بنانا۔ مخلوقات میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں جو ان امور کا مستحق ہو، کیوں کہ سبب مستقل اور خود کار نہیں ہوتا، اس کے شرکا اور اضداد، یعنی مخالفین کا ہونا ضروری ہے۔ اس کے باوجود اگر مسبب الاسباب اس کو مسخر اور تابع نہ کرے تو وہ مسخر نہیں ہوتا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا پروردگار اور مالک ہے۔ زمین و آسمان، ان کے درمیان رہنے والی ساری مخلوق، افلاک اور ان کے مندرجات کا خالق اور ان کے علاوہ دیگر سب کا منتظم اور مدبر ہے، کیوں کہ کسی فلک کوکب (سیارہ) یا فرشتے وغیرہ سے جو کچھ صادر ہوتا ہے، وہ کسی بھی چیز کو پیدا کرنے میں مستقل حیثیت نہیں رکھتا، اس کے ساتھ شریک کار اور معاون کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے موانع (رکاوٹیں) اور مخالفت کرنے والی چیزیں بھی ہوتی ہیں۔ ان افلاک سے سب سے بڑا فلک اطلس (نواں فلک) ہے، جس کے بارے میں بہت سارے نام نہاد فلاسفرز، الاہیات کے بارے میں بحث کرنے والے اور نجومی گمان کرتے ہیں کہ اس کی حرکت تمام حادثات کے رونما ہونے کا باعث ہے، حادثات کے اسباب کے بارے میں ان کا علم اس تک جا کر ختم ہو جاتا ہے۔

پھر وہ اس فلک اطلس کو عقل یا نفس کے ذریعے سے، یا ان کے بغیر براہِ راست واجب الوجود (اللہ تعالیٰ) کا معلول (اثر) قرار دیں یا اس کے معلول (نتیجہ) ہونے کا انکار کریں اور اسے ہی واجب الوجود قرار دیں، ان امکانات کے سوا ان کے پاس کوئی اور امکان نہیں۔ لہٰذا ان کا یہ قول (کہ فلک اطلس کی حرکت تمام حادثات کے رونما

ہونے کا سبب ہے) باطل ترین قول ونظریہ ہے۔

اگرچہ وہ اپنی تمام تر ذہانت کے باوصف اس میں صحیح راہ تک نہیں پہنچ پائے اور بہت سارے لوگوں کو ان کا جواب دینے کے لیے بھی کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی۔

جو شخص بھی آسمان میں غور وفکر کرے اس کو معلوم ہو جائے گا کہ اس کی حرکت ہی تمام آسمانی حرکتوں کا سبب نہیں۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ اس کی مشرقی حرکت کی وجہ سے افلاک میں سب کچھ مشرق سے مغرب کی طرف حرکت کرتا ہے، لیکن اس کے باوجود ہر فلک کی اپنی مخصوص حرکت بھی ہے، جو اس حرکت کے مخالف ہوتی ہے۔ ٹھہرے ہوئے افلاک، سورج چاند وغیرہ اور پیچھے ہٹنے والے، چلنے والے اور چھپ جانے والے ستارے یہ تمام مختلف حرکات اس ایک (فلک اطلس کی) حرکت سے صادر نہیں ہوتیں (جو اس کی حرکت کے مخالف ہیں) اور اسی طرح بقیہ افلاک اس نویں فلک کا معلول اور نتیجہ نہیں۔

اگر فرض کیا جائے کہ واقعات کواکب کی حرکتوں سے جنم لیتے ہیں اور جو مختلف، مثلث، مربع، مسدس اور ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی اشکال پیدا ہوتی ہیں وہ سب اسی کا نتیجہ ہیں تو یہ ان فلاسفہ کے ہاں معلوم ہے کہ یہ مختلف اشکال نویں آسمان کی حرکت کا نتیجہ اور معلول نہیں، بلکہ نویں کی حرکت سبب کا ایک حصہ ہے، جس طرح ہر فلک کی حرکت سبب کا ایک جز ہے۔ فلکی شکل دو حرکتوں کے مجموعے یا مختلف حرکتوں سے پیدا ہوئی ہے۔ اگر فرض کیا جائے کہ نو افلاک میں اتصال ہے اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں تو اس کی (نویں فلک کی) سات حرکتیں ہوں گی، بلکہ اس سے زیادہ، ان کے نزدیک، آخری زائد افلاک کے اعتبار سے جن پر مختلف حرکات سے استدلال کیا جاتا ہے، جیسے: بدری افلاک جن کے ساتھ کواکب درست چلتے ہیں اور لوٹتے ہیں۔ اگر ایسے ہی ہے تو جو نویں کی حرکت ہی کو تمام حوادث کا سبب قرار دیتا ہے، اس کا نظریہ اس کے بھی مخالف ہے جو ان فلاسفہ اور نجومیوں اور ہر عقل مند کے نزدیک معلوم حقائق ہیں۔

پھر اگر یہ فرض کیا جائے کہ یہی تمام افلاک کی حرکت کا سبب ہے تو وہ بادلوں، بجلیوں، بارشوں، نباتات، معدنیات اور حیوانات کے احوال میں سے کسی بھی چیز کو پیدا کرنے میں مستقل حیثیت نہیں رکھتی، کیوں کہ ان اجسام کی حرکتیں تمام کی تمام افلاک کی حرکتوں سے جنم نہیں لیتیں، بلکہ ان میں ایسی قوتیں اور اسباب ہیں جو ان کے لیے دیگر حرکات کا موجب اور باعث ہیں، جس طرح ابتدا کرنے والے فلک کی حرکت دوسرے فلک سے جنم نہیں لیتی۔

تمام حرکات فطری ہوتی ہیں یا ارادی، یا جبری۔ جبری حرکات جابر و قاہر کے ماتحت ہوتی ہیں۔ فطری حرکات وہ ہوتی ہیں کہ ان کے ساتھ حرکت کرنے والے میں کوئی احساس نہیں ہوتا، جیسے: مٹی کی نیچے کی طرف حرکت۔ ارادی

حرکات وہ ہوتی ہیں جن کے ساتھ حرکت کرنے والے میں احساس ہو، جیسے: حیوان کی حرکت۔

ان افلاک میں جو فطری حرکت کے ساتھ متحرک ہو یا ارادی حرکت کے ساتھ تو اس کی حرکت کا آغاز اسی سے ہوگا اور جو مجبور ہو تو اس کو مخلوقات میں سے مجبور کرنے والا اسی صورت میں مجبور کر سکتا ہے کہ اس میں اس کے جبر کو قبول کرنے کی استعداد ہو۔ یہ معنوی ہے جبر کرنے والے کی طرف سے نہیں۔

لہٰذا افلاک کی حرکات جب اکٹھی ہو جائیں تو وہ ان اجسام کو تحریک دینے میں مستقل حیثیت نہیں رکھتیں گو وہ سبب کا جز بن سکتی ہیں۔ جس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سورج بعض جسموں کی نشو و نما، تری اور خشکی وغیرہ کے سبب کا ایک حصہ ہے، پھر اگر فرض کیا جائے کہ یہ افلاک اسباب بنتے ہیں تو ان کے موانع (رکاوٹیں) اور معارضات (مخالفت کرنے والی چیزیں) بھی ہوں گے، کیوں کہ ہر سبب کا کوئی نہ کوئی مانع ضرور ہوتا ہے، خواہ وہ فطری مانع ہو یا ارادی یا اس کے علاوہ، جیسے: دعا کرنا، صدقہ کرنا، نیک اعمال کرنا، یہ آسمان کی طرف سے اترنے والی مصیبتوں کو دور کرنے کے سب سے بڑے اسباب ہیں، اسی لیے سورج اور چاند گرہن وغیرہ کی طرح کی آسمانی نشانیوں کے رونما ہوتے وقت، جو عذاب کا سبب بن سکتی ہیں، ہمیں ان کاموں کا حکم دیا گیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

''سورج اور چاند کسی کے پیدا ہونے یا مرنے کی وجہ سے گرہن زدہ نہیں ہوتے، وہ دونوں تو اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں، جن کے ساتھ وہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے، جب تم یہ دیکھو تو دوڑ کر نماز کی پناہ میں آؤ۔''[1]

لہٰذا سورج گرہن کے وقت آپ ﷺ نے نماز پڑھنے، ذکر کرنے، استغفار کرنے، صدقہ کرنے اور غلام آزاد کرنے کا حکم دیا۔

انسان جب بشمول فلک اطلس کائنات میں نظر آنے والی تمام اشیا اور موجودات میں ایک نظر ڈالتا ہے تو دیکھتا ہے کہ اس میں کوئی ایک چیز بھی کسی بھی چیز کو اصلاً پیدا کرنے میں مستقل اور خود مختار نہیں، بلکہ حوادث کے لیے دیگر اسباب کا ہونا ضروری ہے، خواہ وہ سبب کا جزو ہی ہو اور ان کے دیگر معارضات (رکاوٹیں) بھی ہوتے ہیں تو معلوم ہوا ان امور میں کسی ایک کے بارے میں بھی یہ کہنا درست نہیں کہ وہی نظر آنے والے اور مشاہدہ کیے جانے والے واقعات کو پیدا کرتا ہے۔ یہ کہنا تو ایک طرف رہا کہ وہ ایسے متحرک جسموں کو ایجاد کرنے والا ہے جن کی حرکتیں اس کی حرکت کے مخالف ہوں اور اس کے موجب و محرک کو دور کرتی ہوں، کیوں کہ کوئی چیز بھی اپنے متضاد اور مخالف کو لازم نہیں کرتی۔ اگر متحرک اجسام میں کوئی ایسی چیز ہو جس کا تقاضا نویں فلک کے موجب اور مقتضا کے مخالف اور متضاد ہو تو ایک کا دوسرے کی علت ہونا ممتنع ہو جاتا ہے، کیوں کہ معلول اپنی علت کے متضاد نہیں ہوتا۔ اسی طرح وہ اپنی علت

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٠٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩١٢)

کا فاعل بھی نہیں ہوتا۔ پھر چیز اپنی ذات کی ضد ہوتی ہے نہ اس کی فاعل، کیونکہ اس کا اپنی ذات کے متضاد ہونے کا لازمی مطلب ہوگا کہ اس کا وجود، اس کے وجود ہی کے تابع ہو، اس طرح تو وہ موجود بھی ہوگی اور معدوم بھی، پھر اس کا اپنے نفس کا فاعل ہونا علت کے معلول سے متقدم ہونے کے ساتھ ساتھ، اس کے نفس کے معدوم موجود ہونے کو لازم کرتا ہے۔

یہ معلوم ہے کہ اگر حادثات اور حرکات جو جسموں کی قوتوں سے صادر ہوتی ہیں، نویں فلک کی طرف سے نہیں، اس کی طرف سے تو صرف اتفاقی اور غیر جوہری حرکت ہوتی ہے تو ان اجسام اور ان کی قوتوں کا اس سبب نہ ہونا زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ افلاک اور دیگر نظر آنے والے جسموں کو حرکت دینے والا اور ان اجسام کو کسی دوسرے سبب کے ساتھ تخلیق کرنے والا ان کے علاوہ رب ہے، اسی نے ان کو مختلف شکلوں پر پیدا کیا اور مختلف حرکات کے ساتھ حرکت دی اور یہی مطلوب ہے۔

پھر یہ کواکب اگر بعض حادثات کے سبب کا ایک جزو ہیں تو ضروری نہیں کہ وہ ہر حال میں سبب کا جز ہوں، بلکہ کسی حالت میں جزوِ سبب ہو سکتے ہیں اور کسی حالت میں نہیں، کیوں کہ جب یہ ظاہر ہوتے ہیں اس وقت ان کی روشنی اور اثر بھی ظاہر ہوتا ہے اور جب چھپ جائیں تب ان کی روشنی اور اثر ختم ہو جاتا ہے، اس وقت یہ سبب رہتے ہیں، نہ سبب کا جزو ہی، اسی لیے حضرت خلیل علیہ السلام نے کہا تھا:

﴿ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ﴾ [الأنعام: ٧٦] ''میں غروب ہونے والوں سے محبت نہیں کرتا۔''

کیوں کہ یہ جب چھپ جاتے ہیں اس وقت ان کا اثر ہم سے مکمل طور پر منقطع ہو جاتا ہے اور ان کے ساتھ تعلق رکھنے والے کے پاس کوئی شبہ باقی نہیں رہتا جس کا سہارا لے سکے۔

وہ رب جس کو پکارا جاتا ہے، جس سے مانگا جاتا ہے، جس سے امید لگائی جاتی ہے اور جس پر توکل اور بھروسا کیا جاتا ہے ضروری ہے کہ وہ قیوم ہو جو تمام اوقات اور تمام حالات میں بندے کو قائم رکھے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ ﴾ [الفرقان: ٥٨] ''اور اس زندہ پر بھروسا کر جو نہیں مرے گا۔''

﴿ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ﴾ [البقرة: ٢٥٥]

''اللہ (وہ ہے کہ) اس کے سوا کوئی معبود نہیں، زندہ ہے، ہر چیز کو قائم رکھنے والا ہے۔''

لہٰذا نظر و فکر اور اعتبار و قیاس کے ان مختلف پہلوؤں کا لازمی تقاضا ہے کہ بندہ صرف اللہ تعالیٰ سے امید رکھے اور صرف اسی پر بھروسا رکھے۔

رہی یہ بات کہ ''وہ صرف اپنے گناہ سے ڈرے'' جب وہ یہ حقیقت جان لیتا ہے کہ اس کو جو مصیبت بھی پہنچتی ہے، اس کے اپنے گناہوں ہی کی وجہ سے پہنچتی ہے تو اس کو گناہ کرنے سے ڈرنا چاہیے۔ وہ آیات جو انفس اور آفاق کے بارے میں ہیں ان میں اس مسئلے کی وضاحت موجود ہے، کسی دوسری جگہ ہم نے ان پر تفصیلی گفتگو کی ہے اور اس کے اسرار بیان کیے ہیں، یہاں ان کی گنجایش نہیں۔

پچھلے صفحات میں حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت کردہ حدیثِ قدسی میں ذکر ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''میرے بندو! یہ تمھارے اعمال ہی ہیں جو میں تمھارے لیے شمار کرتا ہوں، جس نے بھلائی پائی وہ اللہ کی تعریف کرے اور جس نے اس کے علاوہ کوئی اور چیز پائی تو وہ صرف اپنے آپ کو ملامت کرے۔''[1]

اس میں اللہ تعالیٰ نے بیان کیا کہ بندے کو جو بھلائی ملتی ہے اس پر اللہ کا شکر ادا کرے، کیوں کہ یہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمت ہے اور وہ جو برائی اور تکلیف پاتا ہے تو اس میں اپنی ہی ذات کو ملامت کرے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی اسی حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے۔ صحیح بخاری میں یہ حدیث بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: درج ذیل کلمات سید الاستغفار ہیں:

«اَللّٰهُمَّ أَنْتَ رَبِّي لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ، خَلَقْتَنِي وَأَنَا عَبْدُكَ وَأَنَا عَلٰى عَهْدِكَ وَوَعْدِكَ، مَا اسْتَطَعْتُ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ أَبُوْءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ، وَأَبُوْءُ بِذَنْبِي فَاغْفِرْ لِي إِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا أَنْتَ»[2]

اس میں بھی ''أبوء لك بنعمتك علي'' کے الفاظ میں اس کی نعمت کا اعتراف و اقرار اور ''أبوء بذنبي'' کے الفاظ میں بندے کا اپنے گناہوں کا اعتراف ہے۔

اسی لیے کسی بزرگ نے کہا تھا: ''میں نعمت اور گناہ کے درمیان ہوتا ہوں، لہٰذا نعمت کا شکر یہ ادا کرتا ہوں اور گناہ سے استغفار کرنا چاہتا ہوں۔''

لیکن شکر نعمت کے بعد ہوتا ہے اور توکل اور امید نعمت سے پہلے، جس طرح حضرت خلیل علیہ السلام نے کہا تھا:

﴿ فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ﴾ [العنکبوت: ١٧]

''سو تم اللہ کے ہاں ہی رزق تلاش کرو اور اس کی عبادت کرو اور اس کا شکر ادا کرو۔''

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خطبے میں کہا کرتے تھے:

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٧٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٩٦٤)

«اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا» [1]

''تمام تعریفات اللہ ہی کے لیے ہیں، ہم اسی سے مدد مانگتے ہیں، اسی سے بخشش طلب کرتے ہیں، اپنے نفس کی شرارتوں (برائیوں) اور اپنے اعمال کی برائیوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آتے ہیں۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی حمد، اس سے مدد طلبی اور اس سے بخشش طلبی کو ایک ساتھ ذکر کیا۔ تو معلوم ہوا اسباب پر تکیہ کرنا توحید میں شرک ہے اور یہ ظلم و جہالت ہے، جو غیر اللہ کو پکارتا ہے اور اس پر توکل کرتا ہے، اس کی یہی حالت ہے۔

ان کا یہ کہنا: اسباب کے اسباب ہونے کی نفی کرنا کم عقلی ہے تو یہ صحیح بات ہے اور یہ شریعت میں تنقید بھی ہے۔

اکثر متکلمین اسباب کی مکمل طور پر نفی کرتے ہیں اور ان کے ہونے نہ ہونے کو ایک برابر سمجھتے ہیں، لیکن نیچری (فطرت پرست) ان کو تقاضا کرنے والی علتیں قرار دیتے ہیں، معتزلہ حیوان وغیرہ کے افعال میں فرق کرتے ہیں۔ یہ تینوں نظریات ہی باطل ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَهُوَ الَّذِىْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَىْ رَحْمَتِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۚ﴾ [الأعراف: ٥٧]

''اور وہی ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت سے پہلے بھیجتا ہے، اس حال میں کہ خوش خبری دینے والی ہیں، یہاں تک کہ جب وہ بھاری بادل اٹھاتی ہیں تو ہم اسے کسی مردہ شہر کی طرف ہانکتے ہیں، پھر اس سے پانی اتارتے ہیں، پھر اس کے ساتھ ہر قسم کے کچھ پھل پیدا کرتے ہیں۔''

﴿وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ [البقرة: ١٦٤]

''اور اس پانی میں جو اللہ نے آسمان سے اتارا، پھر اس کے ساتھ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کر دیا۔''

﴿يَّهْدِىْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ﴾ [المائدة: ١٦]

''جس کے ساتھ اللہ ان لوگوں کو جو اس کی رضا کے پیچھے چلیں، سلامتی کے راستوں کی ہدایت دیتا ہے۔''

﴿يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِىْ بِهٖ كَثِيْرًا﴾ [البقرة: ٢٦]

''وہ اس کے ساتھ بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور اس کے ساتھ بہتوں کو ہدایت دیتا ہے۔'' وغیرہ۔

جو کہتا ہے: وہ ان (امور) کے ہوتے ہوئے ایسا کرتا ہے ان کے ذریعے نہیں، وہ قرآن کے الفاظ کی مخالفت

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٠٩٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٠٥) سنن النسائي، رقم الحديث (١٤٠٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٩٢) الصحيح المسند للوادعي (٨٧٢)

کرتا ہے، حالانکہ عقل اور محسوسات بھی ان کے اسباب ہونے کی گواہی دیتی ہیں۔ وہ پیشانی اور آنکھ کے فرق اور ان کی خصوصیات سے آگاہ ہے اور روٹی اور کنکری کے درمیان جو فرق ہے اس سے بھی واقف ہے کہ ایک غذا مہیا کرتی ہے دوسری نہیں۔

ان کا یہ کہنا: اسباب سے کلی طور پر اعراض کرنا شریعت کی تنقیص ہے تو یہ صرف شریعت ہی کی نہیں، بلکہ عقل کی تنقیص بھی ہے، کیوں کہ بندوں کے افعال ان نتائج کے قوی ترین اسباب ہوتے ہیں جو ان کے ساتھ مربوط ہوتے ہیں۔ جو انسان ایمان داروں اور نیک عمل کرنے والوں کو زمین میں فساد برپا کرنے والوں کی طرح ہی قرار دیتا ہے، یا یہ پرہیز گاروں اور بدکاروں کو ایک برابر سمجھتا ہے وہ سب سے بڑا جاہل اور کافر ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے جن عبادتوں، دعاؤں، علوم اور اعمال کا حکم دیا ہے وہ ان عبادات کے ساتھ مربوط نتائج کو حاصل کرنے کے سب سے بڑے اسباب ہیں۔ اس طرح اس نے جس کفر، نافرمانی اور گناہ سے منع کیا ہے وہ ان کے ساتھ معلق بدبختیوں سے بچنے کے سب سے اہم اسباب ہیں۔

اس کے باوجود تاجدارِ انسانیت ﷺ نے فرمایا ہے:

''تم میں سے کوئی ایک انسان بھی اپنے عمل کی وجہ سے جنت میں داخل نہیں ہو سکے گا۔ انھوں نے کہا: آپ ﷺ بھی نہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: میں بھی نہیں، تا آنکہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنے فضل و رحمت میں ڈھانپ لے۔''[1]

جب آپ ﷺ نے صحابہ سے کہا:

''تم میں سے ہر ایک کا ٹھکانا جنت ہوگا یا جہنم، یہ اللہ کو معلوم ہے۔'' انھوں نے کہا: کیا ہم لکھے ہوئے پر بھروسا کر کے عمل کرنا چھوڑ دیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں، عمل کرو، ہر ایک کو وہ عمل میسر آ جاتا ہے جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے، جو نیک بخت ہے اس کو نیک بختوں والے عمل میسر آ جاتے ہیں اور جو بدبخت ہے اس کو بدبختوں والے عمل میسر آ جاتے ہیں۔''[2]

اس طرح دعا اور توکل ان نتائج کے سب سے بڑے اسباب ہیں جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو اسباب بنایا ہے۔ جو انسان کہتا ہے: جو میرا مقدر ہے وہ مجھے مل کر رہے گا، خواہ میں دعا کروں یا نہ کروں، توکل کروں یا نہ کروں، وہ اس انسان کے قائم مقام ہے جو کہتا ہے: ''میری قسمت میں جو نیک بختی یا بدبختی لکھی ہوئی ہے وہ مجھے مل کر رہے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٠٩٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨١٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٩٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٧)

گی، خواہ میں ایمان قبول کروں یا نہ کروں، فرماں برداری کروں یا نہ نافرمانی۔'' یہ بات کفر اور گمراہی ہے، اگر چہ پہلی بات گمراہی میں اس دوسری کے برابر نہیں، کیوں کہ مقاصد کو دعا اور توکل کے ساتھ معلق کرنا اخروی سعادت کو ایمان کے ساتھ معلق کرنے کی طرح نہیں، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ جس کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے دعا کو سبب بنایا ہو وہ اسی کے قائم مقام ہے جس کے لیے اس نے نیک عمل کو سبب بنایا ہوتا ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ اس کو اس سبب کے بغیر بھی کرنے پر قادر ہے اور کبھی کسی دوسرے سبب سے اس کو کر دیتا ہے۔

اسی طرح وہ انسان جو ان اسباب کو چھوڑتا ہے جن کو جلبِ منفعت (فائدہ حاصل کرنے) اور دفع مضرت (نقصان دور کرنے) کے لیے اختیار کرنا شرعی طور پر واجب یا مستحب ہے تو وہ شریعت میں کیڑے نکالنے والا اور عقل سے تہی دامن ہے، لہٰذا وہ ان اسباب کو چھوڑنے میں، جن کا حکم دیا گیا ہے، غلطی کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہی توکل کی معراج ہے، جب کہ توکل عبادت کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ﴾ [هود: ۱۲۳] ''سو اس کی عبادت کر اور اس پر بھروسا کر۔''

اور عبادت وہ فعل ہے جس کو کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ تو جو انسان اس عبادت کو ترک کرتا ہے جس کا حکم دیا گیا ہے اور توکل کرتا ہے وہ اس شخص سے بہتر نہیں جو اس کی عبادت تو کرتا ہے، لیکن اس پر توکل نہیں کرتا، بلکہ یہ دونوں ہی اللہ تعالیٰ کے نافرمان اور اس کے ایک حکم کو ترک کرنے والے ہیں۔

توکل دو معانی پر مشتمل ہے:

1. اللہ پر توکل کرنا کہ وہ بندے کی اس کام میں مدد کرے جس کا اس نے اس کو حکم دیا ہے۔
2. اللہ تعالیٰ پر توکل کرنا کہ وہ بندے کو وہ دے جس کی وہ خود قدرت نہیں رکھتا۔

استعانت یعنی مدد طلب کرنے کا تعلق اعمال سے ہوتا ہے، لیکن توکل اس سے وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ فائدہ حاصل کرنے اور نقصان دور کرنے کے لیے اس پر توکل کیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ﴾ [التوبة: ۵۹]

''اور کاش کہ واقعی وہ اس پر راضی ہو جاتے جو انھیں اللہ اور اس کے رسول نے دیا اور کہتے ہیں ہمیں اللہ کافی ہے، جلد ہی اللہ ہمیں اپنے فضل سے دے گا اور اس کا رسول بھی۔ بے شک ہم اللہ ہی کی طرف رغبت رکھنے والے ہیں۔''

﴿ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴾ [آل عمران: ۱۷۳]

’’وہ لوگ کہ لوگوں نے ان سے کہا کہ بے شک لوگوں نے تمھارے لیے (فوج) جمع کر لی ہے، سو ان سے ڈرو، تو اس (بات) نے انھیں ایمان میں زیادہ کر دیا اور انھوں نے کہا ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے۔‘‘

جو انسان وہ کام نہیں کرتا جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے وہ اس میں اس سے مدد طلب کرنے والا نہیں ہوتا تو گویا وہ اس جگہ توکل ترک کر کے اس کی عبادت اور اس میں اس سے مدد طلب کرنا چھوڑ دینے والا سمجھا جائے گا، دوسرا اس فعل کے بغیر ہی توکل کرتا ہے جس کا حکم دیا گیا ہے اور یہی قابلِ مذمت عجز اور نااہلی ہے۔

سنن ابوداود میں حدیث ہے:

’’دو آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس اپنا جھگڑا لے کر آئے۔ آپ ﷺ نے ایک کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ جس کے خلاف فیصلہ ہوا اس نے کہا: مجھے اللہ ہی کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’اللہ تعالیٰ عجز اور نااہلی کی مذمت کرتا ہے۔ تجھے دانائی سے کام لینا چاہیے۔ پھر اگر معاملہ تمھارے بس سے باہر ہو جائے تو کہہ: «حسبي الله و نعم الوكيل»‘‘[1]

صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

’’اللہ تعالیٰ کو طاقتور مومن کمزور مومن سے زیادہ پسند اور اچھا لگتا ہے اور ہر ایک میں بھلائی ہے۔ اسی کو حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کر جو تمھارے لیے مفید ہو۔ اللہ تعالیٰ سے مدد مانگ اور عاجز نہ آ۔ اگر تجھے کوئی نقصان پہنچے تو یہ نہ کہہ: اگر میں ایسے کرتا تو ایسے ہوتا، لیکن یہ کہہ: اللہ تعالیٰ نے جو مقدر کیا اور چاہا وہ ہو گیا، اس لیے کہ ’’اگر‘‘ شیطان کی کارروائی کا دروازہ کھول دیتا ہے۔‘‘[2]

انسان کو جب کوئی کام کرنے کا حکم دیا جائے تو اس وقت اس کو تقدیر کی طرف دیکھنے کا پابند نہیں بنایا گیا، لیکن جب اس کو ایسے مصائب کا سامنا کرنا پڑ جائے جو اس کے بس سے باہر ہوں اور اس کے لیے کوئی چارہ نہ ہو، خواہ وہ لوگوں کے فعل کی وجہ سے مصیبت پیش آئی ہو یا اس کے بغیر، دونوں حالتوں میں اس پر صبر کرنا چاہیے اور تسلیم و رضا کی خو اختیار کرنی چاہیے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ يَهْدِ قَلْبَهُ﴾ [التغابن: ١١]

’’کوئی مصیبت نہیں پہنچی مگر اللہ کے اذن سے اور جو اللہ پر ایمان لے آئے وہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے۔‘‘

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٢٧) مسند أحمد (٦/٢٤) ضعيف الجامع (١٧٥٩)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٦٤)

اس آیت کی تفسیر میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ یا سیدنا علقمہ رضی اللہ عنہ، ان دونوں میں سے کسی ایک کا قول ہے:
''یہ وہ آدمی ہے جس کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ یقین کے ساتھ جانتا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، پھر وہ اس پر راضی ہو جاتا ہے اور اسے تسلیم کر لیتا ہے۔''

اسی بنا پر حضرت آدم علیہ السلام نے حضرت موسی علیہ السلام سے کہا تھا: ''تم مجھے اس کام پر ملامت کرتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے مجھے پیدا کرنے سے چالیس سال پہلے لکھ دیا تھا؟!'' ان کی یہ دلیل کارگر ثابت ہوئی اور حضرت موسی علیہ السلام خاموش ہو گئے، کیوں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا تھا: ''تم نے ہم کو اور اپنے آپ کو جنت سے کیوں نکالا؟''

انھوں نے ان کو اس مصیبت پر ملامت کی جو ان کے فعل کی وجہ سے نازل ہوئی۔ اس کے گناہ ہونے کی وجہ سے ان کو ملامت نہیں کی تھی، اسی لیے حضرت آدم علیہ السلام نے تقدیر کو بطورِ دلیل پیش کیا تھا۔

یہ بات کہ ان کے گناہ کی وجہ سے ایسا ہوا تھا، جس طرح بعض لوگوں کا گمان ہے تو حدیث سے یہ مراد نہیں، کیوں کہ حضرت آدم علیہ السلام نے گناہ سے توبہ کر لی تھی اور گناہ سے توبہ کرنے والا اس شخص کی طرح گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے جس کے ذمے کوئی گناہ نہیں ہوتا، پھر بالاتفاق توبہ کرنے والے کو ملامت کرنا جائز نہیں۔

نیز حضرت آدم علیہ السلام نے تقدیر کو بطور دلیل پیش کیا تھا اور تمام مسلمانوں، تمام ادیان کے پیروکاروں اور تمام حکما و عقلا کے اتفاق کے ساتھ کسی بھی انسان کے لیے گناہ پر تقدیر سے حجت لینا جائز نہیں۔ اگر یہ بات قابلِ قبول ہو تو پھر ہر کوئی جس کے دل میں، قتل کرنے، مال لوٹنے اور فساد پھیلانے کا جو خیال آئے وہ کر گزرے اور تقدیر کو بطورِ حجت پیش کرے۔ پھر یہ خود تقدیر سے حجت لینے والا اگر کسی کی طرف سے زیادتی کا شکار ہو جائے اور زیادتی کرنے والا تقدیر کو بطورِ حجت پیش کرے تو یہ اس کو کبھی قبول نہیں کرے گا۔ اس طرح وہ قول و فعل میں تضاد کا شکار ہو گا اور یہ تضاد اور تناقض اس کے اس قول و نظریے کے فاسد ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ لہٰذا تقدیر سے حجت لینا ابتدائی عقلی دلائل کی روشنی میں بھی فاسد ہے۔

جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ تقدیر پر ایمان کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ بندوں کے افعال کا خالق ہے جس طرح مباحیہ مشرک فرقے کا نظریہ ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر تقدیر کا اقرار کرتے ہیں۔ اور مجوسیہ قدریہ کا عقیدہ ہے، امرِ الٰہی کا اقرار کیا جائے مگر تقدیرِ الٰہی کا انکار۔ یا وہ شخص یہ گمان رکھے کہ اس کے باوجود تکلیف (شرعی احکام) غیر معقول ہے، لیکن اس میں محض مشیتِ الٰہی کی وجہ سے شارع کی اطاعت کی گئی ہے، اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے، وہ شخص اس (تقدیر) کو افعال میں حجت بناتا ہے اور کہتا ہے یہ (تکلیف) امر و نہی کے مناسب اسباب پر مشتمل نہیں، بلکہ شریعت بندوں کے لیے جن دنیاوی اور اخروی مقاصد، محاسن اور مفادات پر مشتمل ہے وہ ان کا بھی انکار کرتا ہے، وہ

شریعت کو صرف ایک اضافہ قرار دیتا ہے جس کا علت کے معلول کے مناسب ہونے کے باب سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ یہ بھی انکار کرتا ہے کہ افعال ذاتی طور پر ایسی وجوہ پر مشتمل ہوتے ہیں جن کی وجہ سے وہ اچھے ہوتے ہیں اور ان کا حکم دیا جاتا ہے۔ یا وہ برے ہوتے ہیں تو ان سے منع کیا جاتا ہے۔ اس سب پر وہ تقدیر سے حجت لیتا ہے اور کہتا ہے کہ چونکہ اصل میں رب ہی ان سب کا خالق ہے، اس لیے یہ سب ممتنع ہے تو ایسا انسان غلطی پر ہے اور گمراہ ہے۔ اس کے قول کا فاسد ہونا کتاب وسنت اور اجماع کی دلالت کے ساتھ ساتھ حکما کے اصول اور بدیہی امور کی روشنی میں بھی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔

عام بنی آدم تقدیر پر ایمان رکھتے ہیں اور کہتے ہیں: زیادتی کرنے والوں کو سزا دینا ضروری ہے، حتی کہ پاگلوں اور چارپایوں کی زیادتی روکنے کے لیے ان کی تادیب بھی کی جائے، اگرچہ ان کے افعال تقدیر کے پابند ہیں اور آدمی ان کی زیادتی کو معاف کر دیتے ہیں۔ تاہم بندے کو صبر کرنا چاہیے۔ جو مصیبتیں اس کے نصیب میں لکھی ہیں ان پر راضی رہنا چاہیے، اپنے گناہوں اور عیوب کی بخشش کی دعا کرنی چاہیے۔ تقدیر کو حجت نہیں بنانا چاہیے اور اللہ تعالیٰ نے اس کو جو نعمتیں اور صلاحیتیں دی ہیں، ان کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اس طرح وہ شکر، صبر اور استغفار اور تقدیر وشریعت پر ایمان رکھ کر ان تمام امور کو یکجا کر سکتا ہے۔ واللہ أعلم [1]

کن فیکون، لیعبدون میں لام، قضائے الٰہی پر راضی رہنے، قلم خشک ہو چکنے اور تقدیر میں دعا کے عمل دخل کی وضاحت

سوال ائمہ دین اس فرمانِ الٰہی:

﴿ اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ﴾ [النحل: ٤٠]

''ہمارا کہنا کسی چیز کو، جب ہم اس کا ارادہ کر لیں، اس کے سوا نہیں ہوتا کہ ہم اسے کہتے ہیں ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔''

کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ اگر مخاطب موجود ہے تو تحصیلِ حاصل محال ہے۔ اگر وہ معدوم ہے تو معدوم سے کس طرح مخاطب ہوا جا سکتا ہے؟ نیز اس آیت:

﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ﴾ [الذاریات: ٥٦]

''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا نہیں کیا مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں۔''

[1] مجموع الفتاویٰ (٨/١٦١-١٨٠)

میں ﴿لِيَعْبُدُونِ﴾ میں ''لام'' اگر اس معنی میں ہے کہ انجام کار ایسا ہو کر ہی رہے گا (وہ صیرورت کے معنی میں ہے) تو ایسا نہیں ہوا۔ اگر ''لام'' غایت (مقصد) کا معنی بیان کرنے کے لیے ہے تو لازم آئے گا کہ لوگوں میں سے کوئی ایک انسان بھی اس کی عبادت سے پیچھے نہ ہٹے، لیکن ایسا بھی نہیں تو اس تنگ نائے سے کس طرح نکلا جا سکتا ہے؟

ان روایات اور آیات کی وضاحت بھی کریں جو اللہ تعالیٰ کی قضا پر راضی رہنے کے بارے میں وارد ہوئی ہیں، نیز اس حدیث:

« جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا هُوَ كَائِنٌ » ''جو کچھ ہونا ہے، قلم لکھ کر خشک ہو چکا۔''

اور اس آیت:

﴿ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ [المؤمن: ٦٠] ''مجھے پکارو، میں تمھاری دعا قبول کروں گا۔''

کا معنی بھی بیان کریں۔ اگر دعا بھی اس میں داخل ہے جو ہو کر رہے گا اور اس نے حتماً واقع ہونا ہے تو پھر اس کا حکم دینے کا کیا فائدہ ہے؟

جواب الحمد لله رب العالمين.

پہلا مسئلہ:

پہلا مسئلہ دو قواعد پر مبنی ہے:

پہلا قاعدہ: خطابِ تکوین اور خطابِ تکلیف کے درمیان فرق ہے۔ خطابِ تکوین میں اللہ تعالیٰ مخاطب سے کسی فعل اور کام کا مطالبہ نہیں کرتا، یعنی اس کو کوئی کام کرنے کا حکم نہیں دیتا، بلکہ وہی اس کا مخاطب ہوتا ہے اور وہ اس کو مخاطب کے فعل، قدرت، ارادے یا اس کے وجود کے بغیر پیدا کرتا ہے اور خطابِ تکلیف میں مخاطب کو کوئی کام کرنے کا حکم دیا جاتا ہے یا کسی کام سے منع کیا جاتا ہے اور وہ اس کو اپنی قدرت اور ارادے کے ساتھ کرتا ہے، اگرچہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ قوت اور توفیق کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ ان دونوں خطابات میں فرق ہے۔

اس دوسرے خطاب میں بھی لوگ اختلاف کرتے ہیں کہ آیا اس کے ساتھ معدوم کو اس کے وجود کی شرط کے ساتھ مشروط کر کے کوئی حکم دیا جانا درست ہے یا اس کو اس کے وجود کے بعد ہی مخاطب کیا جائے اور کوئی حکم دیا جائے؟ البتہ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ خطاب کا حکم اس کے وجود کے بعد ہی اس سے تعلق رکھے گا۔

اسی طرح پہلے خطاب میں یہ اختلاف ہے کہ کیا یہ حقیقی خطاب ہے یا اس معنی میں ہے کہ وہ قدرتِ الٰہی کے ساتھ فوراً تشکیل پا لیتا ہے۔ اہلِ سنت کی طرف منسوب متکلمین کے ہاں پہلا قول مشہور ہے۔

دوسرا قاعدہ: معدوم حالتِ عدم میں کوئی چیز ہے یا نہیں؟

معتزلی متکلمین اور شیعہ کے کئی گروہوں کا یہ موقف ہے کہ معدوم خارج میں کوئی چیز ہے اور ذات اور عین ہے۔ ان کا گمان ہے کہ ماہیتیں بنائی گئی ہیں نہ پیدا کی گئی ہیں۔ ان کا وجود ان کی حقیقتوں سے زائد چیز ہے۔ یہ کئی فلاسفہ، وحدت الوجود کے قائلین اور ملحدوں کا مذہب بھی ہے۔ جمہور لوگوں، یعنی اہلِ سنت کی طرف منسوب متکلمین اور صفات کا اثبات کرنے والوں کا یہ مذہب ہے کہ کوئی چیز بھی اپنے وجود سے پہلے خارج میں اصلاً کچھ بھی نہیں نہ وہ عین ہے نہ ذات۔ خارج میں دو چیزیں نہیں ہوتیں جن میں ایک حقیقت ہو اور دوسری اس کا حقیقت سے زائد وجود۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ذوات کو پیدا کیا جو ماہیات ہی ہیں اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ سب اس کا بنایا ہوا، اس کا پیدا کردہ، اسی کا ایجاد کردہ اور اسی کا آغاز کیا ہوا ہے، لیکن ان میں کچھ لوگ ہیں جو کہتے ہیں، معدوم اصل میں کوئی چیز نہیں، اس کو اس لحاظ سے چیز کہا جاتا ہے کہ علم میں اس کا ثبوت ہے، لہٰذا اس کو مجازاً چیز کہا جاتا ہے۔

کچھ کہتے ہیں: بلاشبہہ اس کا علم میں ثبوت اور وجود ہے اور وہ اس اعتبار سے چیز اور ذات ہے۔ یہ وجود اور ثبوت کے درمیان اس طرح فرق نہیں کرتے جس طرح معدوم کو شے کہنے والے ان دونوں میں فرق کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ معدوم کے لا شے ہونے کے اعتبار سے ممکن اور ممتنع کے درمیان بھی فرق نہیں کرتے، جس طرح وہ فرق کرتے ہیں، کیوں کہ ان کا اس پر اتفاق ہے کہ ممتنع لا شے ہے، نزاع ممکن کے بارے میں ہے۔ جو اس کو، یعنی معدوم کو شے (چیز) قرار دیتا ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ علم میں ثابت ہے۔ اس اعتبار سے اس کو قصد، خلق، خبر عنہ، امر بہ اور نہی عنہ وغیرہ کے ساتھ مخصوص کرنا صحیح ہے۔ وہ کہتے ہیں: یہ تخصیصات عدمِ محض کے ساتھ متعلق نہیں ہوسکتیں۔

اگر اس وجود کے درمیان، جو عینی اور مادی طور پر ثابت ہو اور اس وجود کے درمیان جو علم سے ثابت ہو، فرق کیا جائے تو اس باب میں شبہہ زائل ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان:

﴿ اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ﴾ [النحل: ٤٠]

''ہمارا کہنا کسی چیز کو، جب ہم اس کا ارادہ کرلیں، اس کے سوا نہیں ہوتا کہ ہم اسے کہتے ہیں ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔''

میں جو شے (چیز) ہے وہ اس اپنی تخلیق اور اس حکم کا مخاطب بننے سے پہلے سے معلوم ہے اور یہی اس کے بارے میں فیصلہ کیا گیا اور لکھا گیا تھا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے علم سے جو چاہتا ہے کہتا ہے اور لکھتا ہے، جس طرح نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

''اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے سے پچاس ہزار سال پہلے مخلوقات کی تقدیریں لکھ دی تھیں۔''[1]

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٥٣)

صحیح بخاری میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ تھا اور اس کے ساتھ کوئی چیز نہیں تھی، اس کا عرش پانی پر تھا، اس نے ذکر (لوحِ محفوظ) میں ہر چیز لکھ دی، پھر آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔''[1]

سنن ابو داود وغیرہ میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم پیدا کیا تو اس سے کہا: لکھ! اس نے کہا: کیا لکھوں؟ اللہ تعالیٰ نے کہا: جو قیامت تک ہونے والا ہے۔''[2]

یہ اور اس طرح کی دیگر نصوص بیان کرتی ہیں کہ مخلوق اپنی پیدایش سے معلوم تھی، اس کے بارے میں بتایا اور لکھ دیا گیا تھا۔ تو وہ اپنے علمی، کلامی اور کتابی وجود کے اعتبار سے چیز ہے، اگرچہ اس کی وہ حقیقت جو اس کا عینی اور مادی وجود ہے، وہ ابھی تک خارج میں ثابت نہیں، بلکہ وہ عدمِ محض اور نفیِ خالص ہے۔ یہ موجودات کے چار مشہور مراتب ہیں، اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے نبی پر جو پہلی وحی کی تھی، اس میں ان کا ذکر کر دیا تھا، فرمان ہے:

﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝۱ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝۲ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝۳ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝۴ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝۵ ﴾ [العلق: ۱-۵]

''اپنے رب کے نام سے پڑھ جس نے پیدا کیا۔ اس نے انسان کو ایک جمے ہوئے خون سے پیدا کیا۔ پڑھ اور تیرا رب ہی سب سے زیادہ کرم والا ہے۔ وہ جس نے قلم کے ساتھ سکھایا۔ اس نے انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔''

ہم نے کسی دوسری جگہ اس پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اگر بات ایسے ہی ہے تو خطاب کا مخاطب وہ ہوگا جو ارادے کا ہدف ہو اور جس کے ساتھ قدرتِ الٰہی اور پھر تخلیق وتکوین متعلق ہو جائے، جیسے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝۴۰ ﴾ [النحل: ٤٠]

''ہمارا کہنا کسی چیز کو، جب ہم اس کا ارادہ کر لیں، اس کے سوا نہیں ہوتا کہ ہم اسے کہتے ہیں ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔''

جس سے کہا جاتا ہے ہو جا، وہی مراد ہوتا ہے اور جب اس کی پیدایش سے پہلے اس کا ارادہ کیا گیا ہو، اس وقت علم اور تقدیر میں اس کا ثبوت اور امتیاز موجود ہوتا ہے، اگر ایسا نہ ہو تو کس کو پیدا کرنا ہے اور کس کو پیدا نہیں کرنا،

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠١٨)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧٠٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٥٥) صحيح الجامع (٢٠١٧)

ان دونوں میں امتیاز نہیں ہو سکتا۔ یہ تقسیم کا جواب ہے۔

سائل کے اس قول: ''اگر مخاطب موجود ہے تو تحصیلِ حاصل محال ہے۔'' کا جواب یہ ہے کہ یہ اس صورت میں ہے جب خارج میں اس کا وہ وجود موجود ہو جو اس کا اپنا وجود ہے اور بلاشبہہ معدوم موجود ہے نہ فی نفسہ ثابت، لیکن وہ چیز جس کا علم ہو، جس کا ارادہ کیا گیا ہو، وہ علم، ارادے اور تقدیر میں چیز ہو تو خارج میں اس کا وجود محال نہیں، بلکہ تمام مخلوقات اس وقت تک وجود میں نہیں آتیں جب تک علم اور ارادے میں ان کا وجود نہ ہو۔

سائل کے اس قول: ''اگر وہ معدوم ہے تو معدوم کو مخاطب کرنا کس طرح تصور کیا جا سکتا ہے؟'' کے جواب میں کہا جائے گا: اگر تو اس کی مراد یہ ہے کہ معدوم کو اس طرح مخاطب کرنا کہ وہ خطاب اور حکم کو سمجھ لیتا ہو اور اس پر عمل کرتا ہو تو یہ محال ہے، کیوں کہ مخاطب میں سمجھنے اور کرنے کی شرط کا ہونا ضروری ہے، لیکن معدوم کے بارے میں یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ سمجھے اور عمل کرے، لہٰذا عدم کی حالت میں اس کو خطاب و تکلیف سے مخاطب کرنا ناممکن ہے، یعنی عدم کی حالت میں اس سے سمجھنے اور عمل کرنے کا تقاضا کرنا۔ اسی طرح خارج میں معدوم کو خطابِ تکوین سے مخاطب کرنا بھی ممتنع ہے، اس معنی میں کہ وہ یہ عقیدہ رکھے کہ وہ خارج میں ثابت شدہ چیز ہے اور اس کو یہ حکم دیا جائے کہ وہ ہو جائے، لیکن جو چیز معلوم ہے، ذکر کی گئی ہے اور لکھی گئی ہے، اگر اس کو مراد اور ہدف بنا کر خطابِ تکوین سے مخاطب کیا جائے تو یہ محال نہیں، بلکہ ممکن ہے، بلکہ اس جیسا معاملہ انسان بھی اپنے دل میں محسوس کرتا ہے، وہ اپنے دل میں کوئی کام طے کرتا ہے، وہ اس کو کرنا چاہتا ہے، اس کو طلب کرتا ہے اور اپنے ارادے کو اسی طرف موڑتا ہے، تو وہ اسی قدرت اور طاقت کے مطابق اپنا مقصد حاصل کر لیتا ہے، اگر اس کا ارادہ مضبوط ہو اور طلب سچی ہو اور وہ اس کو حاصل کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہو تو وہ اس کو حاصل کر لیتا ہے، لیکن اگر وہ عاجز ہو تو اس کو حاصل نہیں کر سکتا، انسان بھی بسا اوقات حکمیہ الفاظ استعمال کرتا ہے اور اس کا مطلوب اس پر اس کی قدرت کے مطابق واقع ہو جاتا ہے لہٰذا اللہ سبحانہ وتعالیٰ جو ہر چیز پر قادر ہے، جو اس نے چاہا ہو گیا جو نہیں چاہا نہیں ہوا، وہ جب کسی چیز کا ارادہ کر لیتا ہے تو اس کا حکم یہی ہوتا ہے کہ وہ اس سے کہتا ہے ''ہو جا'' تو وہ ہو جاتا ہے۔

فصل (﴿ لِيَعْبُدُوْنِ ﴾ میں لام کی وضاحت):

دوسرا مسئلہ:

سائل کا کہنا ہے: اس آیت: ﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝ ﴾ [الذاریات: ٥٦] میں لام اگر اس معنی میں ہے کہ انجام کار ایسا ہو کر ہی رہے گا (یعنی لام عاقبت اور صیرورت کے معنی میں ہے) تو ایسا نہیں ہوا، اگر لام غرض و غایت کے معنی میں ہے تو لازم آئے گا کہ لوگوں میں سے کوئی ایک انسان بھی اس کی عبادت سے پیچھے نہ

ہٹے، لیکن ایسا بھی نہیں ہوا تو اس تنگ نائے سے کس طرح نکلا جا سکتا ہے؟ جواب میں کہا جائے گا: یہ لام وہ لام نہیں جسے نحوی لامِ عاقبت اور صیرورت کہتے ہیں اور یہاں یہ بات کسی نے بھی نہیں کہی، جس طرح سائل نے ذکر کیا ہے کہ ایسا نہیں ہوا، لیکن اگر ان کے قول کو اختیار کیا جائے جو ﴿لِيَعْبُدُونِ﴾ کی تفسیر ''يَعْرِفُوْنَ'' (معرفت حاصل کر لیں) سے کرتے ہیں تو پھر ایسا ہوا ہے، یعنی وہ معرفت جس کا اللہ تعالیٰ نے مومن اور کافر کو حکم دیا ہے، لیکن یہ قول ضعیف ہے، کچھ لوگوں نے سورت ہود کے آخر میں اس آیت:

﴿وَلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ۝ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ۚ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ﴾ [ھود: ۱۱۸۔۱۱۹]

''اور وہ ہمیشہ مختلف رہیں گے۔ مگر جس پر تیرا رب رحم کرے اور اسی لیے انھیں پیدا کیا۔''

کی تفسیر میں یہ گمان کیا ہے۔ بعض قدریہ کا خیال ہے کہ یہ لام، لامِ عاقبت اور صیرورت ہے، یعنی ان کی عاقبت اور انجام رحمت اور اختلاف میں تبدیل ہو گیا، اگرچہ خالق نے یہ قصد اور ارادہ نہیں کیا، انھوں نے اس کو اس آیت:

﴿فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا﴾ [القصص: ۸]

''تو فرعون کے گھر والوں نے اسے اٹھا لیا، تا کہ آخر ان کے لیے دشمن ہو اور غم کا باعث ہو۔''

میں ﴿لِيَكُوْنَ﴾ میں لام جس معنی میں ہے اور شاعر کے اس قول ع

لِدُوا لِلْمَوْتِ وَ ابْنُوا لِلْخَرَابِ[1]

میں لام جس معنی میں ہے اس معنی میں قرار دیا۔ یہاں یہ قول بھی کمزور ہے، کیوں کہ لامِ عاقبت اس شخص کے لیے آتی ہے جو امور کے انجام سے آگاہ نہیں ہوتا تو وہ ایسا کام کر گزرتا ہے جس کا نامعلوم انجام ہوتا ہے، آلِ فرعون کی طرح (جنھوں نے موسیٰ علیہ السلام کو اٹھایا، لیکن ان کو علم نہیں تھا کہ وہ ان کے لیے پریشانی کا باعث بن جائیں گے)

لیکن جو انسان افعال کے عواقب سے آگاہ ہو، اس کے بارے میں یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ایسا کام کرے جس کا کوئی انجام ہو اور وہ اس سے بے خبر ہو۔ جب اس کو علم ہو کہ اس کے فعل کا انجام ہے تو وہ اپنے فعل سے وہ ارادہ نہیں کرتا جس کے بارے میں وہ جانتا ہے کہ وہ نہیں ہو سکے گا، یہ تمنا تو ہو سکتی ہے، لیکن ارادہ نہیں۔

اس آیت میں جو لام ہے وہ معروف لام ہے، یعنی وہ لامِ کَي اور لامِ تعلیل ہے (وہ لام جو کام کی علت اور وجہ بیان کرتی ہے) اس لام کو جب حذف کر دیا جائے تو جس مصدر کو اس کی وجہ سے زیر دی گئی ہوتی ہے وہ مفعول لہ بن کر منصوب (زبر والا) بن جاتا ہے، اس کو علتِ غائی کہا جاتا ہے، یہ علم اور ارادے میں پہلے سے موجود ہوتی ہے، لیکن وجود میں بعد میں آتی ہے اور فعل سے یہی علت مراد اور مطلوب ہوتی ہے۔

---

[1] موت کے لیے پیدا کرو اور اُجڑنے کے لیے بناؤ۔

یہاں یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں ارادے کی دو انواع ہیں:

پہلی قسم: ارادہ کونیہ، یہ مراد کے وقوع پذیر ہونے کو لازم قرار دیتا ہے، اسی کے بارے میں کہا جاتا ہے، ”ما شاء اللّٰہ کان، وما لم یشاء لم یکن“ ”جو اللہ تعالیٰ نے چاہا وہ ہو گیا اور جو نہ چاہا نہ ہوا۔“ درج ذیل آیات سے یہی ارادہ مراد ہے:

﴿فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا﴾ [الأنعام: ١٢٥]

”تو وہ شخص جسے اللہ چاہتا ہے کہ اسے ہدایت دے، اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے کہ اسے گمراہ کرے اس کا سینہ تنگ، نہایت گھٹا ہوا کر دیتا ہے۔“

﴿وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْۤ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ؕ﴾ [هود: ٣٤]

”اور میری نصیحت تمھیں نفع نہ دے گی اگر میں چاہوں کہ تمھیں نصیحت کروں، اگر اللہ یہ ارادہ رکھتا ہو کہ تمھیں گمراہ کرے۔“

﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۫ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۝۲۵۳﴾ [البقرة: ٢٥٣]

”اور اگر اللہ چاہتا تو وہ آپس میں نہ لڑتے، لیکن اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔“

﴿وَلَوْلَاۤ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ﴾ [الكهف: ٣٩]

”اور جب تو اپنے باغ میں داخل ہوا تو تو نے یہ کیوں نہ کہا ”جو اللہ نے چاہا، کچھ قوت نہیں مگر اللہ کی مدد سے۔“

اس آیت:

﴿وَلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ۝۱۱۸ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ﴾ [هود: ١١٨۔١١٩]

”اور وہ ہمیشہ مختلف رہیں گے۔ مگر جس پر تیرا رب رحم کرے اور اسی لیے اس نے انھیں پیدا کیا۔“

میں ﴿وَلِذٰلِكَ﴾ کی لام سے یہی ارادہ مراد اور مدلول ہے۔

ارادے کی اقسام:

سلف کا قول ہے: اس نے ایک فریق کو اختلاف کے لیے پیدا کیا اور ایک کو رحمت کے لیے، جب یہاں رحمت ارادہ ہے اور وہاں ارادہ کونیہ تو اس سے جو مطلوب اور مراد تھا وہ واقع ہو گیا، لہٰذا ایک قوم نے اختلاف کیا اور ایک پر رحم کیا گیا۔

دوسری قسم: دینی اور شرعی ارادہ، یہ مطلوب و مراد کی محبت، اس کی رضا، اس کے حاملین کی محبت، ان سے راضی ہونے

اور ان کو اچھا بدلہ دینے پر مشتمل ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ﴾ [البقرة: ١٨٥]

''اللہ تمھارے ساتھ آسانی کا ارادہ رکھتا ہے اور تمھارے ساتھ تنگی کا ارادہ نہیں رکھتا۔''

﴿ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ ﴾ [المائدة: ٦]

''اللہ نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی تنگی کرے اور لیکن وہ چاہتا ہے کہ تمھیں پاک کرے اور تاکہ وہ اپنی نعمت تم پر پوری کرے۔''

﴿ يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۣ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ۝ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ۝ ﴾ [النساء: ٢٦-٢٨]

''اللہ چاہتا ہے کہ تمھارے لیے کھول کر بیان کرے اور تمھیں ان لوگوں کے طریقوں کی ہدایت دے جو تم سے پہلے تھے اور تم پر مہربانی فرمائے اور اللہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے اور اللہ چاہتا ہے کہ تم پر مہربانی فرمائے اور جو لوگ خواہشات کی پیروی کرتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم (سیدھے راستے سے) ہٹ جاؤ، بہت بڑا ہٹ جانا۔ اللہ چاہتا ہے کہ تم سے (بوجھ) ہلکا کرے اور انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔''

یہ ارادہ مراد اور مطلوب کے واقع ہونے کو لازم قرار نہیں دیتا، اِلا یہ کہ اس کے ساتھ ارادے کی پہلی قسم متعلق ہو جائے، اس لیے چار اقسام بنتی ہیں:

1. جس کے ساتھ دونوں ارادے تعلق رکھتے ہوں: یہ جو کائنات میں نیک اعمال ہو رہے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کا دینی اور شرعی ارادہ کیا، ان کا حکم دیا، ان کو پسند کیا، ان سے خوش ہوا اور کونی ارادہ کیا جس کی وجہ سے یہ واقع ہوئے، کیوں کہ اگر وہ نہ چاہتا تو یہ نہ ہوتے۔

2. جس کے ساتھ صرف دینی ارادہ تعلق رکھتا ہو: یہ وہ نیک کام ہیں، جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تو کافروں اور نافرمانوں نے اس کے حکم کی نافرمانی کی۔ یہ دینی ارادہ ہے۔ یہ واقع ہو یا نہ ہو، وہ اس کو پسند کرتا ہے اور اس سے راضی ہوتا ہے۔

3. جس کے ساتھ صرف کونی ارادہ تعلق رکھتا ہو: یہ وہ حوادث ہیں جو اس نے چاہے اور مقرر کیے ہیں، لیکن ان کا حکم نہیں دیا، جیسے مباحات (جائز کام) اور گناہ، اس نے ان کا حکم دیا ہے نہ ان کو پسند کیا ہے اور نہ ان سے

راضی ہی ہے، وہ فحاشی کا حکم دیتا ہے نہ اپنے بندوں کے لیے کفر پسند کرتا ہے، اگر اس کی مشیت، ارادہ اور ان کو پیدا کرنا نہ ہوتا تو یہ وجود میں نہ آتے۔ اس نے جو چاہا ہو گیا اور جو نہیں چاہا نہیں ہوا۔

4 جس کے ساتھ ان دونوں ارادوں میں سے کوئی ایک بھی تعلق نہ رکھتا ہو: یہ وہ چیزیں ہیں جو مباحات اور گناہوں کے انواع سے تعلق نہیں رکھتے۔ اگر بات ایسے ہی ہے تو ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴾ میں لام کا تقاضا یہی دینی اور شرعی ارادہ ہے۔ اس کی مراد کبھی واقع ہوتی ہے اور کبھی نہیں۔ معنی یہ ہے کہ وہ غایت اور انجام کار جس کو اللہ تعالیٰ ان کے لیے پسند کرتا ہے اور انھیں جس کو کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ عبادت ہے۔ تو یہ وہ عمل ہے جس کے لیے بندوں کو پیدا کیا گیا ہے۔ یعنی یہی وہ کام ہے جو ان کو اس کمال اور قابلیت سے نواز سکتا ہے جس کے ساتھ وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب اور پسندیدہ بندے بن سکتے ہیں۔ جو اس مقصد کو حاصل نہ کر سکے وہ اس کمال اور قابلیت سے محروم ہوتا ہے، جس کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کا محبوب اور پسندیدہ بندہ بن سکتا ہے۔ اس کے لیے وہ دینی ارادہ مراد لیا جاتا ہے جو اس کی سعادت اور نجات کا ضامن ہے اور جس میں اس کا کمال اور صلاحیت نہ ہو تو وہ اس کی خرابی اور عذاب کو لازم قرار دیتا ہے۔

جو یہ کہتا ہے کہ عبادت عزیمت کا نام ہے یا یہ فطری ہے تو یہ دونوں اقوال ہی کمزور اور فاسد ہیں اور کئی پہلوؤں سے ان کا فساد ظاہر ہوتا ہے۔

فصل (اللہ کی رضا پر راضی رہنے کا حکم دینے والی آیات و احادیث کی وضاحت):

تیسرا مسئلہ:

وہ روایات اور آیات جو اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہنے کے بارے میں وارد ہوئی ہیں، اگر گناہ اللہ تعالیٰ کی قضا کے بغیر ہیں تو یہ محال ہے اور توحید کی تنقیص اگر وہ اللہ تعالیٰ کی قضا اور فیصلے کے ساتھ ہیں تو ان سے نفرت کرنا اور ان کو ناپسند کرنا، اللہ تعالیٰ کی قضا سے نفرت کرنا اور اس سے بغض رکھنا ہے۔

اس کے جواب میں کہا جائے گا: قرآن کریم میں کوئی ایسی آیت ہے نہ سنتِ رسول ﷺ میں کوئی ایسی حدیث ہی جو بندوں کو بندوں کے ان تمام اچھے اور برے اعمال کو پسند کرنے کا حکم دیتی ہو جو تقدیر کے پابند ہیں۔

اس قاعدے سے اعتنا رکھنا ضروری ہے، لیکن لوگوں کو اس سے راضی رہنا چاہیے، جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے، کسی کو اللہ تعالیٰ کے حکم پر ناراض ہونے کا حق نہیں پہنچتا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴾ [النساء: ٦٥]

''پس نہیں! تیرے رب کی قسم ہے! وہ مومن نہیں ہوں گے، یہاں تک کہ تجھے اس میں فیصلہ کرنے والا مان لیں جو ان کے درمیان جھگڑا پڑ جائے، پھر اپنے دلوں میں اس سے کوئی تنگی محسوس نہ کریں جو تو فیصلہ کرے اور تسلیم کر لیں، پوری طرح تسلیم کرنا۔''

﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَكَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ﴾ [محمد: ٩]

''یہ اس لیے کہ بے شک انھوں نے اس چیز کی پیروی کی جس نے اللہ کو ناراض کر دیا اور اس کی خوشنودی کو برا جانا تو اس نے ان کے اعمال ضائع کر دیے۔''

﴿ وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ﴾ [التوبة: ٥٩]

''اور کاش کہ واقعی وہ اس پر راضی ہو جاتے جو انھیں اللہ اور اس کے رسول نے دیا اور کہتے ہیں ہمیں اللہ کافی ہے، جلد ہی اللہ ہمیں اپنے فضل سے دے گا اور اس کا رسول بھی۔ بے شک ہم اللہ ہی کی طرف رغبت رکھنے والے ہیں۔''

اس آیت میں رسول کا ذکر یہ بتاتا ہے کہ جو اس نے ان کو جو دیا ہے وہ دینی شرعی حکم ہے، تقدیری اور تکوینی نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

« ذَاقَ طَعْمَ الْإِيْمَانِ مَنْ رَضِيَ بِاللّٰهِ رَبًّا، وَبِالْإِسْلَامِ دِيْناً، وَ بِمُحَمَّدٍ نَبِيًّا »[1]

''اس شخص نے ایمان کا ذائقہ چکھ لیا جو اللہ تعالیٰ کے رب ہونے، اسلام کے دین ہونے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے پر راضی ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے انسان کے مقدر میں جو مصیبتیں لکھی ہیں جو گناہ نہیں، مثلاً: وہ کسی کو غربت، تنگ دستی، بیماری، ذلت اور لوگوں کے آزار میں مبتلا کر دے تو اس کو اس پر راضی رہنا چاہیے، کیوں کہ مصیبتوں پر صبر کرنا فرض ہے، لیکن ان پر راضی رہنا مشروع ہے، یعنی شرعی حکم ہے، لیکن اس میں امام احمد رحمہ اللہ کے اصحاب وغیرہ کے نزدیک اختلاف ہے کہ یہ واجب ہے یا مستحب۔ لیکن صحیح یہی ہے کہ یہ مستحب ہے، واجب نہیں۔

یہ بھی معلوم ہے کہ ایمان کا مضبوط ترین کڑا اللہ تعالیٰ کے لیے محبت اور اللہ تعالیٰ ہی کے لیے نفرت کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم نیکی کا حکم دیں، اس سے محبت رکھیں، اس پر خوش ہوں اور نیک لوگوں سے بھی محبت رکھیں، برائی سے منع کریں، اس سے نفرت اور بغض رکھیں اور بروں سے بھی بغض رکھیں۔ اپنے ہاتھوں، زبانوں اور

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٤)

دلوں کے ساتھ ان کے خلاف جہاد کریں، یہ ہم کس طرح خیال کر سکتے ہیں کہ مخلوقات میں کوئی ایسی چیز نہیں جس سے ہم بغض و نفرت رکھیں؟!

اللہ تعالیٰ نے جب منع کردہ امور کا ذکر کیا تو فرمایا:

﴿ كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ﴾ [بني اسرائيل: ٣٨]

''یہ سب کام، ان کا برا تیرے رب کے ہاں ہمیشہ سے ناپسندیدہ ہے۔''

اگر اللہ تعالیٰ جو ان کا اندازہ کرنے والا ہے اور ان کو بنانے والا ہے، وہ ان سے نفرت کرتا ہے تو اس کو اس سے کیوں نفرت نہیں کرنی چاہیے، جس کو اس نے ان سے نفرت کرنے کا حکم دیا ہے؟ حالانکہ اس نے یہ بھی فرمایا ہے:

﴿ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ﴾ [الحجرات: ٧]

''اور اس نے کفر اور گناہ اور نافرمانی کو تمھارے لیے ناپسندیدہ بنا دیا، یہی لوگ ہدایت والے ہیں۔''

﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَكَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ﴾ [محمد: ٢٨]

''یہ اس لیے کہ بے شک انھوں نے اس چیز کی پیروی کی جس نے اللہ کو ناراض کر دیا اور اس کی خوشنودی کو برا جانا تو اس نے ان کے اعمال ضائع کر دیے۔''

﴿ فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ ﴾ [الزخرف: ٥٥]

''پھر جب انھوں نے ہمیں غصہ دلایا تو ہم نے ان سے انتقام لیا۔''

﴿ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ ﴾ [الفتح: ٦] ''اللہ ان پر غصے ہوا اور اس نے ان پر لعنت کی۔''

﴿ يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ﴾ [النساء: ١٠٨]

''وہ لوگوں سے چھپاؤ کرتے ہیں اور اللہ سے چھپاؤ نہیں کرتے، حالانکہ وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ رات کو اس بات کا مشورہ کرتے ہیں جسے وہ پسند نہیں کرتا۔''

تو اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے بتایا ہے کہ کچھ باتیں حقیقت میں ہوتی ہیں، لیکن وہ ان کو پسند نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ ﴾ [النور: ٥٥]

''اللہ نے ان لوگوں میں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے وعدہ کیا ہے کہ وہ

انھیں زمین میں ضرور ہی جانشین بنائے گا، جس طرح ان لوگوں کو جانشین بنایا جو ان سے پہلے تھے اور ان کے لیے ان کے اس دین کو ضرور ہی اقتدار دے گا جسے اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے۔''

﴿ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلٰمَ دِيْنًا ﴾ [المائدۃ: ۳]

''اور تمھارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کر لیا۔''

﴿ وَاِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ ﴾ [الزمر: ۷]

''اور اگر تم شکر کرو تو وہ اسے تمھارے لیے پسند کرے گا۔''

یہاں اس نے بیان کیا ہے کہ وہ اس دین کو پسند کرتا ہے جس کا حکم اس نے دیا ہے، اگر وہ ہر چیز کو پسند کرتا تو اس کی کوئی خصوصیت نہ ہوتی۔ صحیحین میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''کوئی شخص اپنے غلام یا لونڈی کے زنا کرنے پر جتنا غیرت مند ہو اللہ اس سے کہیں بڑھ کر غیرت مند ہے۔''[1]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ غیور ہے اور مومن کو بھی غیرت آتی ہے، اللہ تعالیٰ کی غیرت اس پر ہے کہ بندہ وہ کام کرے جو اس نے حرام کیا ہے۔''[2]

اور غیرت میں اس کام سے نفرت اور بغض رکھنا ضروری ہے جس پر غیرت کھائی جائے۔ یہ بڑا وسیع باب ہے۔

فصل (قلم خشک ہو چکنے کی وضاحت):

چوتھا مسئلہ:

اگر جو ہونا ہے اسے لکھ کر قلم خشک ہو چکا ہے تو اس فرمانِ الٰہی: ﴿ اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ﴾ کا کیا معنی ہے؟ اگر دعا بھی ان کاموں میں ہے جو ہو کر رہیں گے تو جب اس نے ہو کر رہنا ہے تو اس کا حکم دینے کا کیا فائدہ؟

اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ دعا قبولیت کے تقاضے میں تمام نیک اعمال کے ثواب میں تقاضے کی طرح ہے اور ان تمام اسباب کی طرح ہی ہے جو مسببات اور نتائج کا تقاضا کرتے ہیں۔ جو کہتا ہے: دعا مطلوب اور مانگی گئی چیز کے حصول کی محض علامت اور دلالت ہے، وہ سبب نہیں یا وہ محض عبادت ہے جس کا عدماً یا وجوداً حصولِ مطلوب میں کوئی اثر نہیں، بلکہ جو دعا سے حاصل ہوتا ہے اس کے بغیر بھی حاصل ہو جاتا ہے تو یہ دونوں اقوال ہی کمزور ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دعا کے ساتھ قبولیت کو سبب کے ساتھ مسبب اور نتیجے کو معلق کرنے کی طرح ہی معلق کیا ہے، جس طرح

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٢٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٠١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٢٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٦١)

اس آیت میں ہے: ﴿ادْعُونِيٓ أَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾

صحیحین میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

''جو مسلمان بھی اللہ تعالیٰ سے ایسی دعا کرتا ہے جس میں گناہ اور قطع تعلقی والی کوئی بات نہیں ہوتی تو وہ اس کو تین میں سے ایک چیز ضرور دیتا ہے: یا اس کی دعا جلد قبول کر لیتا ہے یا اس کے لیے اس جیسی بھلائی ذخیرہ کر لیتا ہے یا اس سے اس جیسی برائی دور کر دیتا ہے۔'' انھوں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! تب تو ہم کثرت سے دعا کریں گے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو اللہ بھی کثرت سے دے گا۔''[1]

آپ ﷺ نے عطا کو دعا کے ساتھ اسی طرح معلق کیا جس طرح جنت کے وعدے اور اچھے بدلے کو حکم دیے گئے عمل کے ساتھ معلق کیا گیا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

''مجھے قبولیت کی کوئی فکر نہیں ہوتی۔ مجھے تو دعا کی فکر ہوتی ہے۔ جب کوئی دعا میرے دل میں ڈال دی جاتی ہے تو قبولیت اس کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔''

اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔

اسی طرح معروضی حقائق اور مشاہدات بھی اس پر اسی طرح دلالت کرتے ہیں جس طرح دیگر تمام اسباب میں اس کے نظائر دلالت کرتے ہیں، اس کی کچھ مثالیں اللہ تعالیٰ نے بیان کی ہیں:

﴿وَلَقَدْ نَادٰىنَا نُوحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِيبُونَ ﴿٧٥﴾﴾ [الصافات: ٧٥]

''اور بلاشبہ یقیناً نوح نے ہمیں پکارا تو یقیناً ہم اچھے قبول کرنے والے ہیں۔''

﴿وَذَا النُّونِ إِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ أَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنْتَ سُبْحٰنَكَ إِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٨٧﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ۚ وَكَذٰلِكَ نُـۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ﴾

[الأنبياء: ٨٧، ٨٨]

''اور مچھلی والے کو، جب وہ غصے سے بھرا ہوا چلا گیا، پس اس نے سمجھا کہ ہم اس پر گرفت تنگ نہ کریں گے تو اس نے اندھیروں میں پکارا کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو پاک ہے، یقیناً میں ظلم کرنے والوں سے ہو گیا ہوں۔ تو ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اسے غم سے نجات دی اور اس طرح ہم ایمان والوں کو نجات دیتے ہیں۔''

﴿أَمَّنْ يُّجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْأَرْضِ﴾ [النمل: ٦٢]

---

[1] مسند أحمد (١٨/٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٧٣) صحيح الجامع (٥٦٣٧)

''یا وہ جو لاچار کی دعا قبول کرتا ہے، جب وہ اسے پکارتا ہے اور تکلیف دور کر دیتا ہے اور تمھیں زمین کے جانشین بناتا ہے؟''

حضرت زکریا علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

﴿ وَزَكَرِيَّآ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ۝ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَوَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ﴾ [الأنبياء: ۸۹، ۹۰]

''اور زکریا کو جب اس نے اپنے رب کو پکارا اے میرے رب! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تو سب وارثوں سے بہتر ہے۔ تو ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اسے یحییٰ عطا کیا اور اس کی بیوی کو اس کے لیے درست کیا۔''

﴿ فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ﴾ [العنكبوت: ٦٥]

''پھر جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو اللہ کو پکارتے ہیں، اس حال میں کہ اسی کے لیے عبادت کو خالص کرنے والے ہوتے ہیں، پھر جب وہ انھیں خشکی کی طرف نجات دے دیتا ہے تو اچانک وہ شریک بنا رہے ہوتے ہیں۔''

﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ۝ اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهْرِهٖ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝ اَوْ يُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا وَيَعْفُ عَنْ كَثِيْرٍ ۝ وَّيَعْلَمَ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ ۝ ﴾ [الشوریٰ: ۳۲۔۳۵]

''اور اس کی نشانیوں سے سمندر میں چلنے والے جہاز ہیں، جو پہاڑوں جیسے ہیں۔ اگر وہ چاہے ہوا کو ٹھہرا دے تو وہ اس کی سطح پر کھڑے رہ جائیں۔ بے شک اس میں ہر ایسے شخص کے لیے یقیناً کئی نشانیاں ہیں جو بہت صبر کرنے والا، بہت شکر کرنے والا ہے۔ یا وہ انھیں اس کی وجہ سے ہلاک کر دے جو انھوں نے کمایا اور (چاہے تو) بہت سے لوگوں سے درگزر کر دے اور (تا کہ) وہ لوگ جو ہماری آیات میں جھگڑا کرتے ہیں، جان لیں کہ ان کے لیے بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ اگر وہ چاہے تو ان کو ہلاک کر دے، یعنی ان کے گناہوں پر ان کا مواخذہ کرتا ہے اور بہت سارے گناہوں سے درگزر بھی کرتا ہے اور جو اس کی آیات میں جھگڑا اور بحث مباحثہ کرتے ہیں وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ان کے لیے راہِ فرار نہیں، کیوں کہ اس جیسی صورتِ حال میں رب تعالیٰ کی ربوبیت، قدرت، مشیت اور رحمت پر دلالت کرنے والے دلائل پر شبہات وارد کرنے والا جانتا ہے کہ وہ جس مشکل میں پھنسا ہے، اس سے اس کو کوئی نکالنے والا نہیں، جس طرح دوسری آیات میں ہے:

﴿وَهُمْ يُجَادِلُونَ فِي اللّٰهِ وَهُوَ شَدِيدُ الْمِحَالِ﴾ [الرعد: ۱۳]

''وہ اللہ کے بارے میں جھگڑ رہے ہوتے ہیں اور وہ بہت سخت قوت والا ہے۔''

وہ علوم و معارف جو نفس میں اضطراری اسباب سے حاصل ہوتے ہیں وہ ان علوم و معارف سے زیادہ راسخ اور ثابت ہوتے ہیں جو محض منطق و قیاس کے نتیجے میں معلوم ہوتے ہیں۔ جو اس جیسی صورتِ حال میں نفس سے دور ہو جاتا ہے، کیا رب تعالیٰ موجب بذاتہ (فلاسفہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے اس جہان کو ایک مرتبہ بنا دیا اس کے بعد یہ علت و معلول کے مطابق چلتا ہے، اس کا کوئی کام نہیں) ہے کہ وہ آغاز میں حادثات کا پیدا کرنے والا نہیں ہوگا نہ اس کے لیے اس وقت تک کسی چیز کو پیدا کرنا یا جہاں کو تبدیل کرنا ممکن نہ ہوگا جب تک اس سے سوال نہ کیا جائے اور اس سے دعا نہ کی جائے؟ کیا وہ تفصیل و اجمال کو جاننے والا اور احوال کو پھیرنے والا نہیں ہے کہ جب تک اس سے ایک حالت سے دوسری حالت میں پھرنے کا سوال نہ کیا وہ ایسا نہیں کرے گا؟ کیا اس طرح نہیں ہے جس طرح بعض فلسفی اور دیگر گمراہ لوگ خیال کرتے ہیں؟

تو ذوالجلال والاکرام کی طرف سے سزا دینے اور معاف کرنے کے ساتھ جھگڑا اور بحث کرنے والوں کا علم بھی ایک ساتھ ہی ایک ہی جگہ ذکر ہو جائے اور وہ جان لیں کہ انھوں نے اس کی آیات میں جو بحث و جھگڑا کیا ہے اس میں ان کے لیے کوئی جائے فرار نہیں، ہم نے کسی دوسری جگہ اس سے متعلقہ افکار و مذاہب کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

یہاں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ دعا اور سوال اس چیز کے حصول کا سبب ہے جس کے لیے دعا کی جائے۔ اس میں دعا کا وجود دعا کے نہ ہونے کی طرح نہیں اور نہ وہ محض علامت ہی ہے جس طرح کتاب وسنت سے ثابت ہے۔

اگرچہ اس میں اہلِ قبلہ یعنی مسلمانوں کے بہت سے گروہوں نے اختلاف بھی کیا ہے، حالانکہ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کی اکثریت، خواہ وہ مسلمان ہوں، یہودی ہوں، عیسائی ہوں، صابی ہوں کہ مشرک، اس کا اعتراف و اقرار کرتی ہے، لیکن ارسطو کے پیروکاروں میں سے کئی مشرک، صابی، مشائی فلاسفہ اور ادیانِ سماویہ کے پیروکاروں میں سے کئی لوگ، جیسے: فارابی، ابن سینا اور ان کے ہم نوا، جنھوں نے علمِ کلام، تصوف اور فقہ کے ساتھ اس کو خلط ملط کر دیا ہے۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ مقصود کے حصول کے لیے دعا کی تاثیر ایسے ہی ہے جیسے تمام ممکنات اور مخلوقات میں فلکی، طبعی، نفسی اور عقلی قوتوں کی تاثیر ہوتی ہے۔ دعا کا جو نتیجہ سامنے آئے اس کو وہ انسانی نفوس کی تاثیر قرار دیتے ہیں۔ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے تفصیلی علم یا جہاں کو تبدیل کرنے اور اس پر تصرف کرنے کی اس کی قدرت کو ثابت نہیں کرتے اور نہ اس سے وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ اس نے جو کام کیا ہے۔ اگر وہ اس کے علاوہ بھی کوئی کام کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ وہ ان کے نزدیک انسان کی ہڈیاں جمع کرنے اور اس کے پورے برابر اور مناسب بنانے پر قادر نہیں، حالانکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی ان کا اور ان کے اندر موجود قوتوں کا خالق ہے۔

دعا کا تقدیر میں عمل دخل:

اس کا یہ کہنا کہ دعا اگر اس چیز میں سے ہے جس نے ہو کر رہنا ہے، جب اس نے ہو کر رہنا ہے تو اس کا حکم دینے کا کیا فائدہ ہے؟

اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ دعا جس کا حکم دیا گیا ہے وہ تکوینی حکم نہیں، بلکہ جب اللہ تعالیٰ بندوں کو دعا کا حکم دیتا ہے تو کچھ اس کی اطاعت کرتے ہیں اور ان کی دعا قبول ہو جاتی ہے اور وہ اپنا گوہرِ مقصود حاصل کر لیتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں جو معلوم اور تقدیر میں لکھا ہوا تھا وہ یہی تھا دعا کرنا اور قبول کرنا۔ کچھ نافرمانی کرتے ہیں۔ وہ دعا نہیں کرتے۔ تو جو مقصد دعا کے ساتھ معلق تھا وہ ان کو حاصل نہیں ہوتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں جو معلوم اور تقدیر میں لکھا گیا تھا وہ دعا نہ کرنا اور قبول نہ کرنا تھا۔

وہ دعا جو ہو کر رہنے والی ہے اس کے بارے میں پہلے سے علم ہے کہ وہ ہو کر رہے گی اور وہ دعا جو نہیں ہوتی یہ وہی ہے جس کے بارے میں پہلے سے علم تھا کہ وہ نہیں ہو گی۔

اگر کہا جائے جو کام دعا ہی سے ہونا ہے، اس کا حکم دینے کا کیا فائدہ؟ اس کے جواب میں کہا جائے گا: حکم، حکم دیے گئے کام کو بجا لانے کا سبب ہے، جس طرح باقی اسباب ہوتے ہیں۔ تو دعا بھی مصیبت دور کرنے کا سبب ہے۔ اگر وہ اس سے زیادہ قوی ہو تو اس کو روک لے گی۔ اگر مصیبت کا سبب زیادہ طاقتور ہو گا تو وہ اس کو نہیں روک سکے گی، لیکن اس کی قوت و شدت میں کمی اور کمزوری پیدا کر دے گی۔ اسی لیے سورج اور چاند کو گرہن لگتے وقت اور ایسی نشانیاں دیکھتے وقت نماز، دعا، استغفار، صدقہ اور غلام آزاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ واللہ أعلم [1]

ولی کے اختیار ''کن'' کی حقیقت

سوال ایک شخص کہتا ہے کہ اللہ کے متقی اور نیک اولیا جب کسی چیز سے کہتے ہیں کہ ''کن'' ہو جا، تو وہ اللہ کی اجازت سے ہو جاتا ہے، کیا یہ بات صحیح ہے؟

جواب جو کہتا ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی بھی جب کسی چیز کا ارادہ کرے اور اس سے کہے: ''کُنْ'' ''ہو جا'' تو وہ ہو جاتی ہے، اس شخص سے توبہ کروائی جائے، اگر توبہ کر لے تو صحیح، ورنہ اس کی گردن اڑا دی جائے۔ دنیا میں کوئی ایک بھی ایسا فرد نہیں ہے، وہ جو بھی ہو، جس کی ہر ہر مراد پوری ہو جاتی ہو۔ البتہ آخرت میں مومن جو خواہش کرے گا، اس کی خواہش پوری کر دی جائے گی، اور اللہ کی قدرت سے اس کی مراد حاصل ہو جائے گی۔

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۸/۱۸۱۔۱۹۶)

ایک اسرائیلی روایت میں ہے: ''حق عزوجل کہیں گے: اے میرے بندے! میں کسی چیز سے کہتا ہوں ''ہو جا'' تو وہ ہو جاتی ہے۔ اگر تو نے میری فرماں برداری کی تو میں تجھے یہ صلاحیت دے دوں گا۔ تو کسی چیز سے کہے گا: ہو جا! تو وہ ہو جائے گی۔''

لیکن اس کی سند قابلِ اعتماد نہیں۔ اگر تو اس بات سے قائل کی مراد یہ ہے کہ اللہ آخرت میں مومن کی ہر مراد پوری کرے گا تو صحیح ہے، ورنہ اس کی بات مردود اور لغو ہے۔ واللّٰہ أعلم [1]

خدائی فیصلوں میں حکمت، نیز ارادے کی پیشگی اور عذر

سوال کیا اللہ کے فیصلے حکمت کا تقاضا کرنے والے ہیں یا نہیں؟ اگر حکمت کا تقاضا کرتے ہیں تو کیا لوگ جو کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ارادے کے مطابق کرتے ہیں؟ اگر ارادہ پہلے ہے تو اس صورتِ حال میں عذر کے وجود کا کیا معنی ہے؟ فتویٰ عنایت فرمائیں، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا کرے۔

جواب الحمد للّٰہ رب العالمین. اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہر چیز کا علم، قدرت اور حکمت کے ساتھ احاطہ کیا ہے۔ اس کی رحمت اور علم ہر چیز کو شامل ہے۔ زمین وآسمان کا ذرہ ذرہ اور ہر معنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے کامل علم، کامل رحمت، کامل قدرت، کامل حکمت کا شاہد ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مخلوق کو باطل پیدا کیا نہ کسی چیز کو بے کار بنایا۔ وہ اپنے افعال اور اقوال میں حکیم ہے، پھر اس نے کچھ بندوں کو اپنی کچھ حکمت سے آگاہ کیا اور کچھ کا علم اپنے ہی پاس رکھا۔

اس کے ارادے کی دو اقسام ہیں: ایک امر (حکم) وتشریع کا ارادہ اور دوسرا قضا وقدر کا ارادہ۔

پہلی قسم: نیکیوں کے ساتھ تعلق رکھتی ہے گناہوں کے ساتھ نہیں، خواہ وہ وقوع پذیر ہوں یا نہ ہوں۔ جس طرح درج ذیل آیات میں ہے:

﴿ يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ﴾ [النساء: ٢٦]

''اللہ چاہتا ہے کہ تمھارے لیے کھول کر بیان کرے اور تمھیں ان لوگوں کے طریقوں کی ہدایت دے جو تم سے پہلے تھے اور تم پر مہربانی فرمائے۔''

﴿ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ﴾ [البقرة: ١٨٥]

''اللہ تمھارے ساتھ آسانی کا ارادہ رکھتا ہے اور تمھارے ساتھ تنگی کا ارادہ نہیں رکھتا۔''

دوسری قسم: اس سے تقدیری ارادہ مراد ہے۔ یہ تمام کائنات کو شامل ہے اور تمام حادثات کو گھیرے ہوئے ہے۔ جہاں میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس کے اس ارادے کے تابع ہے، پہلے معنی میں ارادے کے تابع نہیں، جس طرح درج

---

[1] جامع المسائل (۹/.........)

ذیل آیات میں ہے:

﴿فَمَنۡ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنۡ يَّهۡدِيَهٗ يَشۡرَحۡ صَدۡرَهٗ لِلۡاِسۡلَامِ‌ۚ وَمَنۡ يُّرِدۡ اَنۡ يُّضِلَّهٗ يَجۡعَلۡ صَدۡرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا﴾ [الأنعام: ١٢٥]

''تو وہ شخص جسے اللہ چاہتا ہے کہ اسے ہدایت دے، اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے کہ اسے گمراہ کرے اس کا سینہ تنگ، نہایت گھٹا ہوا کر دیتا ہے۔''

﴿وَلَا يَنۡفَعُكُمۡ نُصۡحِىۡۤ اِنۡ اَرَدْتُّ اَنۡ اَنۡصَحَ لَـكُمۡ اِنۡ كَانَ اللّٰهُ يُرِيۡدُ اَنۡ يُّغۡوِيَكُمۡ‌ ؕ هُوَ رَبُّكُمۡ﴾ [هود: ٣٤]

''اور میری نصیحت تمھیں نفع نہ دے گی اگر میں چاہوں کہ تمھیں نصیحت کروں، اگر اللہ یہ ارادہ رکھتا ہو کہ تمھیں گمراہ کرے، وہی تمھارا رب ہے۔''

مسلمان کہتے ہیں: "ما شاء اللہ کان، وما لم یشاء لم یکن" ''جو اللہ نے چاہا وہ ہوگیا اور جو نہیں چاہا وہ نہیں ہوا۔''

یہ ارادہ ان نیکیوں اور گناہوں کو شامل ہے جو واقع ہوئی ہیں، ان کو نہیں جو واقع نہیں ہوئیں۔ پہلا ارادہ صرف نیکیوں کو شامل ہے، خواہ واقع ہوئی ہوں یا نہ ہوں۔

نیک بخت وہ ہے جس کے لیے اس نے تقدیر میں بھی وہی ارادہ کیا جو شریعت میں کیا اور بد بخت وہ ہے جس کے لیے تقدیر میں وہ ارادہ کیا جو تشریع میں نہیں کیا۔ حکم ان دونوں ارادوں کے مطابق جاری ہوتا ہے۔ جو اعمال کو ان دونوں نظروں سے دیکھتا ہے وہ صاحبِ بصیرت ہے اور جو تقدیر کو مدِ نظر رکھتا ہے شریعت کو نہیں، یا شریعت کو مدِ نظر رکھتا ہے تقدیر کو نہیں، وہ یک چشم ہے، قریش کی طرح جنھوں نے کہا تھا:

﴿لَوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَاۤ اَشۡرَكۡنَا وَلَاۤ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمۡنَا مِنۡ شَىۡءٍ‌ ؕ﴾ [الأنعام: ١٤٨]

''اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شریک بناتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کوئی چیز حرام ٹھہراتے۔''

اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا:

﴿كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ حَتّٰى ذَاقُوۡا بَاۡسَنَا‌ ؕ قُلۡ هَلۡ عِنۡدَكُمۡ مِّنۡ عِلۡمٍ فَتُخۡرِجُوۡهُ لَـنَا‌ ؕ اِنۡ تَتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا تَخۡرُصُوۡنَ﴾ [الأنعام: ١٤٨]

''اسی طرح ان لوگوں نے جھٹلایا جو ان سے پہلے تھے، یہاں تک کہ انھوں نے ہمارا عذاب چکھ لیا۔ کہہ کیا تمھارے پاس کوئی علم ہے کہ تم اسے ہمارے لیے نکالو، تم تو گمان کے سوا کسی چیز کی پیروی نہیں کر رہے اور تم اس کے سوا کچھ نہیں کہ اٹکل دوڑاتے ہو۔''

انھوں نے عقیدہ رکھا کہ ہر وہ چیز کہ اللہ تعالیٰ نے جس کے وجود اور ہونے کا ارادہ کیا (یہ تقدیری ارادہ ہے) تو اس نے شرعی ارادہ چھوڑ کر اسی ارادے کا حکم دیا اور اسی کو پسند کیا۔ پھر انھوں نے دیکھا کہ ان کا شرک اس شریعت کے بغیر ہے جس کے وجود کو اللہ تعالیٰ نے چاہا تو کہا: اللہ تعالیٰ نے اسی کو پسند کیا اور اسی کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب دیا:

﴿ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ﴾ [الأنعام: ١٤٨]

''اسی طرح ان لوگوں نے جھٹلایا جو ان سے پہلے تھے۔''

یعنی انھوں نے اس سے پہلے شریعتوں کو جھٹلایا جو امر و نہی پر مشتمل تھیں۔

﴿ حَتَّىٰ ذَاقُوا بَأْسَنَا قُلْ هَلْ عِندَكُم مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا ﴾ [الأنعام: ١٤٨]

''یہاں تک کہ انھوں نے ہمارا عذاب چکھ لیا۔ کہہ کیا تمھارے پاس کوئی علم ہے کہ تم اسے ہمارے لیے نکالو۔''

یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ نے شرک کا حکم دیا ہو اور جس کو تم حرام کہتے ہو اس کو حرام کہا ہو۔ تم اس سلسلے میں صرف گمان کی پیروی کرتے ہو۔ یہ تمھارا وہم ہے کہ اس نے ہر وہ کام جو مقدر بنایا ہے اس کو شریعت بھی بنایا ہے۔ کہہ دیجیے اللہ تعالیٰ کی حجت پہنچنے والی ہے۔ یعنی اس نے رسولوں کو بھیج کر مخلوق پر اپنی حجت قائم کر دی جنھوں نے ان کو توحید اور شریعت کی دعوت دی۔ اس کے باوجود اگر وہ چاہتا تو اپنی تمام مخلوق کو اپنی شریعت کی پیروی کی توفیق دے دیتا۔ لیکن وہ جس پر چاہتا ہے احسان کرتا ہے اور اس کو اپنے فضل و احسان سے ہدایت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے محروم کر دیتا ہے، کیوں کہ احسان کرنے والا چاہے احسان کرے چاہے تو نہ کرے۔ اس نے جس کو اپنے فضل و احسان سے محروم کیا ہے وہ اس کا عدل و انصاف ہے اور اس کی اس میں گہری حکمت ہے۔

وہ مخلوق کو اپنے حکم اور شرعی ارادے کی مخالفت کی وجہ سے سزا دیتا ہے، اگرچہ یہ بھی اس کے تقدیری ارادے کے ساتھ ہی ہے، کیوں کہ تقدیر جس طرح نافرمانی میں چلتی ہے اسی طرح اس کو سزا دینے میں بھی چلتی ہے۔ ایسے بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کے مقدر میں ایسی بیماریاں لکھ دیتا ہے جو تکالیف کا پیش خیمہ ہوتی ہیں تو بیماری اور تکلیف اس کا مقدر ہے جو اللہ تعالیٰ نے لکھا۔

اگر بندہ کہے: ارادہ گناہ سے پہلے ہوتا ہے، اس لیے مجھے سزا نہیں ملنی چاہیے تو اس کی یہ بات ایسے ہی ہے جیسے مریض کہے کہ بیمار بنانے کا ارادہ تو پہلے تھا اس لیے اس کے نتیجے میں مجھے تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔ گرم کھانے کا ارادہ تو پہلے کیا تھا اس لیے میرا مزاج گرم نہیں ہونا چاہیے۔ یا مار تو پہلے پڑی تھی اس لیے مضروب کو تڑپنا نہیں چاہیے۔ یہ بات جہالت کے ساتھ ساتھ انسان کے لیے غیر مفید بھی ہے، بلکہ تقدیر کو بہانہ بنانا دوسرا گناہ ہے، جو قابلِ سزا

ہے۔ ابلیس نے بھی تقدیر کو بہانہ بناتے ہوئے کہا تھا:

﴿ بِمَآ اَغْوَيْتَنِیْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِی الْاَرْضِ ﴾ [الحجر: ۳۹]

''چونکہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے، میں ضرور ہی ان کے لیے زمین میں مزین کروں گا۔''

لیکن آدم علیہ السلام نے کہا تھا:

﴿ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾ [الأعراف: ۲۳]

''اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ کیا تو یقیناً ہم ضرور خسارہ پانے والوں سے ہو جائیں گے۔''

لہٰذا اللہ تعالیٰ جس کو سعادت مند اور خوش بخت بنانا چاہتا ہے اس کو وہ کلمات الہام کرتا ہے جو اس نے آدم علیہ السلام وغیرہ کو الہام کیے تھے اور جس کو بد بخت بنانا چاہتا تھا، وہ ابلیس کے بہانے کو بہانہ بناتا ہے۔ وہ ایسے شخص کی طرح ہے جو گرمی سے بچنے کے لیے آگ میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔

اس کی مثال اس شخص کی مثال ہے جس کے گھر میں آگ کی چنگاری اڑ کر آئے اور عقل مند اس سے کہیں: اس کو بجھا دے، کہیں یہ تیرے گھر کو نہ جلا دے۔ وہ کہنا شروع کر دے: یہ کہاں تھی؟ یہ ہوا اس کو پھینک گئی۔ اس آگ کو جلانے میں میرا کیا قصور؟ وہ یہی بہانے اور علتیں تراشتا رہتا ہے کہ آگ بھڑک اٹھتی ہے اور سارے گھر میں پھیل کر اس کو جلا کر راکھ بنا دیتی ہے۔

لہٰذا جو انسان تقدیر کو بہانہ بنا کر گناہ کرنا شروع کر دیتا ہے اور ان کو استغفار کے ساتھ بخشواتا نہیں، اس کا یہی حال ہوتا ہے، بلکہ گناہ کرنے کی وجہ سے اس شخص سے بھی زیادہ بری حالت میں ہے جس کے گھر میں باہر سے چنگاری آتی ہے، جس میں اس کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔

اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو اس کی توفیق دے جو وہ پسند کرتا ہے اور جس سے خوش ہوتا ہے، کیوں کہ اس کی مدد کے بغیر اس کی فرماں برداری ہو سکتی ہے نہ اس کے بچانے کے بغیر اس کی نافرمانی سے بچا ہی جا سکتا ہے۔ واللہ أعلم

اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلوں اور قضا و قدر میں اس کی کامل حکمت ہے، خواہ بندے اس کو نہ جانتے ہوں یا وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے بتا دے۔ لوگوں کے افعال اللہ کے تکوینی ارادے کے ماتحت ہیں مگر گناہ گاروں کے گناہ میں اس کا ارادہ شرعی، دینی، حکمی اور محبت و رضا کا ارادہ نہیں ہوتا۔

سائل کا یہ پوچھنا کہ وجودِ عذر کا کیا معنی ہے؟ تو معذور اس کو کہا جاتا ہے جو کسی کام کا ارادہ رکھنے کے باوجود

اس کو کرنے سے عاجز ہو، جیسے: ایسا بیمار آدمی جو کھڑا ہونے سے، روزہ رکھنے سے اور جہاد کرنے سے عاجز ہو، یا وہ فقیر اور تنگ دست جو خرچ کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو۔ ایسے لوگ مکلّف نہیں اور جو انھوں نے چھوڑ دیا اس کی ان کو سزا بھی نہیں دی جائے گی۔ اسی طرح جو سننے اور سمجھنے سے عاجز ہو، جیسے بچہ، پاگل یا جس تک دعوت ہی نہ پہنچی ہو، یہ بھی معذور ہیں، لیکن جو انسان برائیاں کرنا پسند کرتا ہو اور ان کو کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو اور ان کو کر گزرے تو وہ نہ اپنے ارادے اور مرضی کے خلاف مجبور ہے نہ اس کو مجبور کیا گیا ہے، لہٰذا اس کو کس طرح معذور کہا جا سکتا ہے؟ بلکہ اس کو تو مغرور کہنا چاہیے۔ واللہ أعلم[1]

تقدیر کو بہانہ بنانا

سوال کچھ لوگ تقدیر کے پہلے سے مقرر ہونے کو بہانہ اور حجت بناتے ہیں اور کہتے ہیں: معاملہ طے ہو چکا ہے، بد بخت بد بخت ہے اور نیک بخت نیک بخت۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُم مِّنَّا الْحُسْنَىٰ أُولَٰئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ ﴿١٠١﴾ ﴾ [الأنبیاء: ۱۰۱]

''بے شک وہ لوگ جن کے لیے ہماری طرف سے پہلے بھلائی طے ہو چکی، وہ اس سے دور رکھے گئے ہوں گے۔''

وہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ ہی نے اچھائی اور برائی کو مقدر کیا۔ ہمارے نصیب میں زنا لکھا ہوا ہے۔ افعال میں ہماری کوئی قدرت نہیں۔ قدرت صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ ہم اسی سے بچتے ہیں جو ہمارے نصیب میں لکھا ہوا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے نافرمانی نہیں کی تھی۔ جس نے لا إله إلا الله کہا وہ جنت میں داخل ہوگا، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: جو ''لا إله إلا الله کہتا ہے، جنت میں داخل ہوگا، خواہ زنا کرے اور چوری۔'' اس گروہ کے نظریے کی خرابی قطعی دلائل کی روشنی میں بیان کریں۔

جواب الحمد لله رب العالمين. یہ لوگ اگر اس عقیدے پر اصرار کرتے ہیں تو یہود و نصاریٰ سے بھی بڑے کافر ہیں، کیوں کہ وہ بھی امر و نہی، وعد و وعید اور جزا و سزا پر ایمان رکھتے ہیں، لیکن انھوں نے دین میں تحریف اور تبدیلی کی، کچھ کو مان لیا اور کچھ سے انکار کر دیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَن يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَن يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ﴿١٥٠﴾ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا ۚ

[1] مجموع الفتاویٰ (۸/۱۹۷-۲۰۰)

وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿١٥١﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿١٥٢﴾﴾ [النساء: ١٥٠-١٥٢]

''بے شک وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسولوں کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں اور کہتے ہیں ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے اور چاہتے ہیں کہ اس کے درمیان کوئی راستہ اختیار کریں۔ یہی لوگ کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لیے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے اور وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور انھوں نے ان میں سے کسی کے درمیان تفریق نہ کی، یہی لوگ ہیں جنھیں وہ عنقریب ان کے اجر دے گا اور اللہ ہمیشہ سے بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے۔''

جو شخص دین کے کچھ حصے پر ایمان رکھے اور کچھ سے انکار کر دے وہ پکا کافر ہے۔ لیکن جو سارے ہی دین سے انکار کر دے، اللہ تعالیٰ کے امر و نہی اور وعد و وعید کا اقرار نہ کرے، بلکہ تقدیر کو حجت بنا کر اس کو چھوڑ دے تو اس کے کفر کا کیا عالم ہوگا؟ وہ یقیناً اس سے بڑا کافر ہے جو دین کے کچھ حصے پر ایمان رکھتا ہے اور کچھ سے انکار کرتا ہے۔

ان لوگوں کے نظریے کا بطلان کئی پہلوؤں سے ظاہر ہے:

پہلا پہلو: یہ بندے کے لیے تقدیر کو حجت سمجھتے ہیں یا نہیں سمجھتے۔ اگر تقدیر بندے کے لیے حجت ہے تو وہ سب کے لیے حجت ہے۔ تقدیر میں وہ سب مشترک ہیں۔ ایسی صورت میں اگر ان پر کوئی ظلم کرے، کوئی ان کو گالی دے، کوئی ان کا مال لوٹے، کوئی ان کی عزت پائمال کرے، کوئی ان کو قتل کرے اور کھیتی اور نسل تباہ کر دے تو ان پر لازم ہوگا کہ اس کے اس عمل کو برا نہ کہیں، لیکن یہ اس کی مذمت کرتے ہیں، اس سے نفرت رکھتے ہیں اور اس کی مخالفت کرتے ہیں، بلکہ جو ان کو برا کہتا ہے اور ان کے نظریے کی تردید کرتا ہے، اس سے بغض و عداوت رکھتے ہیں تو معلوم ہوا کہ یہ جھوٹے ہیں اور تضاد بیانی سے کام لیتے ہیں۔

اگر حرام کام کرنے والے اور واجبات ترک کرنے والے کے لیے تقدیر حجت ہے تو ان پر لازم آتا ہے کہ کسی بھی انسان کی مذمت نہ کریں، نہ کسی سے بغض رکھیں، کسی کو ظالم نہ کہیں۔ وہ جو کرتا ہے، کرتا پھرے، لیکن ایسا کہنا اور کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔ اگر لوگ ایسا کرنا شروع کر دیں تو دنیا تباہ ہو جائے۔ اس دلیل سے معلوم ہوا کہ جس طرح ان کا نظریہ شریعت کے اعتبار سے کفر ہے، اسی طرح عقل کی نگاہ میں بھی فاسد ہے۔ وہ اپنے اس نظریے میں جھوٹے اور افترا پرداز ہیں کہ تقدیر بندے کے لیے حجت ہے۔

دوسرا پہلو: اس نظریے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ ابلیس، فرعون، قومِ نوح اور قومِ عاد جن کو اللہ تعالیٰ نے ان کے

گناہوں کی وجہ سے ہلاک کیا، وہ معذور تھے۔ یہ وہ کفر ہے جس پر تمام ادیان کے پیروکار متفق ہیں۔

تیسرا پہلو: اس نظریے سے لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دوستوں اور دشمنوں، مومنوں اور کافروں اور جنتیوں اور جہنمیوں کے درمیان کوئی فرق نہیں، جب کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ ۝ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ ۝ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُورُ ۝ وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ﴾ [الفاطر: ۱۹-۲۲]

''اور اندھا اور دیکھنے والا برابر نہیں اور نہ اندھیرے اور نہ روشنی اور نہ سایہ اور نہ دھوپ اور نہ زندے برابر ہیں اور نہ مردے۔''

﴿أَمْ نَجْعَلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَالْمُفْسِدِينَ فِي الْأَرْضِ أَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ كَالْفُجَّارِ﴾ [صٓ: ۲۸]

''کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے، زمین میں فساد کرنے والوں کی طرح کر دیں گے؟ یا کیا ہم پرہیز گاروں کو بدکاروں جیسا کر دیں گے؟''

﴿أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ أَنْ نَجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَاءً مَحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ۚ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ۝﴾ [الجاثیۃ: ۲۱]

''یا وہ لوگ جنھوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا، انھوں نے گمان کر لیا ہے کہ ہم انھیں ان لوگوں کی طرح کر دیں گے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے؟ ان کا جینا اور ان کا مرنا برابر ہوگا؟ برا ہے وہ فیصلہ جو وہ کرتے ہیں۔''

ان تمام لوگوں کی تقدیریں بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں پہلے ہی لکھی ہوئی تھیں اور اس نے ان کو پیدا کرنے سے بھی پہلے ان کو لکھ دیا تھا، لیکن وہ اس کے باوجود ایمان اور نیک عمل کر کے نیک بختوں اور کفر، نافرمانی اور گناہ کر کے بدبختوں کی صفوں میں تقسیم ہوئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قضا و قدر کسی کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے میں حجت نہیں۔

چوتھا پہلو: ہم تقدیر پر ایمان رکھتے ہیں، لیکن اس کو حجت نہیں بناتے۔ جو تقدیر کو حجت بناتا ہے اس کی حجت باطل اور بے وقعت ہے۔ جو تقدیر کو عذر بناتا ہے اس کا عذر غیر مقبول ہے۔ اگر اس کو حجت بنانا کوئی حیثیت رکھتا تو اس کو ابلیس اور نافرمانوں سے قبول کیا جاتا۔ اگر بندوں کے لیے تقدیر حجت ہو تو کسی بھی انسان کو دنیا اور آخرت میں سزا نہیں ملنی چاہیے۔ چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جانا چاہیے۔ قاتل کو قتل نہیں کیا جانا چاہیے۔ کسی مجرم پر حد نافذ نہیں ہونی چاہیے۔ نہ اللہ کی راہ میں جہاد کیا جانا چاہیے۔ نہ نیکی کا حکم دیا جانا چاہیے اور نہ برائی سے منع ہی کیا جانا چاہیے۔

پانچواں پہلو: نبی اکرم ﷺ سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''جنت یا جہنم میں تم میں سے ہر ایک کا ٹھکانا لکھ دیا گیا ہے۔'' کہا گیا اے اللہ کے رسول! پھر کیا ہم عمل چھوڑ کر لکھے گئے پر بھروسا نہ کر لیں؟ آپ نے فرمایا: ''نہیں، عمل کرو، ہر ایک جس کے لیے پیدا کیا گیا ہے، وہ اس کو میسر آ جاتا ہے۔'' (رواه البخاري و مسلم)[1]

صحیح میں ایک دوسری حدیث ہے:

''کہا گیا: اے اللہ کے رسول! اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جو لوگ عمل اور محنت کرتے ہیں، کیا وہ ان میں ہے جو قلموں نے لکھ دیا ہے، سیاہی خشک ہوگئی اور صحیفوں میں لپیٹ دیا گیا، یا وہ ان میں ہے جو رسول ان کے پاس لایا ہے تو وہ از سرِ نو کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''نہیں، بلکہ وہ ان میں ہے جن کے ساتھ قلموں کی سیاہی خشک ہوگئی اور صحیفوں میں لپیٹ دیا گیا۔'' تو کہا گیا: پھر عمل کس لیے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''عمل کرو، ہر ایک جس کے لیے پیدا کیا گیا ہے وہ اس کو میسر ہو جاتا ہے۔''[2]

چھٹا پہلو: اللہ سبحانہ و تعالیٰ تمام امور کا علم رکھتا ہے۔ اس نے ان کو اسی طرح لکھا جس طرح انھوں نے ہونا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ فلاں شخص ایمان قبول کرے گا۔ نیک اعمال کرے گا تو جنت میں داخل ہوگا۔ فلاں شخص نافرمانی اور گناہ کرے گا تو وہ جہنم میں داخل ہوگا۔ یہ سب اسی طرح ہے جس طرح اس کو یہ علم ہے اور اس نے لکھا ہے کہ فلاں شخص عورت سے شادی کرے گا، اس کے ساتھ مباشرت کرے گا تو اس کی اولاد پیدا ہوگی۔ فلاں کھانا کھائے گا، پانی پیے گا تو وہ سیر اور سیراب ہو جائے گا۔ فلاں دانہ ڈالے گا تو کھیتی اگے گی۔ اب جو انسان کہتا ہے کہ اگر میں جنتی ہوں تو نیک عمل کرنے کے بغیر ہی اس میں داخل ہو جاؤں گا، اس کی یہ بات باطل اور تضاد پر مبنی ہے، کیوں کہ اللہ کو علم ہے کہ وہ اپنے نیک عمل ہی کے سبب جنت میں جائے گا۔ اگر وہ نیک عمل کے بغیر جنت میں داخل ہو گیا تو یہ اللہ تعالیٰ کے علم اور تقدیر کے متضاد ہوگا۔

اس کی مثال اس طرح ہے کہ کوئی شخص کہے: میں کسی عورت سے مباشرت نہیں کروں گا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے میرے مقدر میں اولاد لکھی ہے تو وہ پیدا ہو جائے گی۔ یہ جاہل انسان ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ جب کسی کو پیدا کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو یہ بھی فیصلہ کرتا ہے کہ اس کا باپ کسی عورت سے مباشرت کرے گا، جس کے نتیجے میں وہ حاملہ ہو کر اس کو جنے گی، لیکن جماع اور حمل کے بغیر بچے پیدا کرنا نہ اس نے مقدر کیا ہے اور نہ لکھا ہے۔ اسی طرح اس نے جنت صرف مومنوں کے لیے تیار کی ہے۔ جو یہ خیال کرتا ہے کہ وہ ایمان کے بغیر اس میں داخل ہو جائے گا اس کا یہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٩٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٧)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٨)

خیال باطل ہے۔ اگر وہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن اعمال کا حکم دیا ہے اس کو انھیں کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، وہ انھیں کرے یا نہ کرے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تو وہ کافر ہے اور اللہ تعالیٰ نے جنت کافروں کے لیے حرام کی ہے۔ یہ عقیدہ اس ایمان کے منافی ہے جس کا حامل جہنم میں داخل نہیں ہوگا۔

فصل (اسباب پہلے سے طے ہیں):

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُم مِّنَّا الْحُسْنَىٰ أُولَٰئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ ﴾ [الأنبياء: ۱۰۱]

''بے شک وہ لوگ جن کے لیے ہماری طرف سے پہلے بھلائی طے ہو چکی، وہ اس سے دور رکھے گئے ہوں گے۔''

تو وہ جس کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے بھلائی طے ہو چکی ہے، وہ ضرور مومن اور متقی بنے گا۔ جو مومن نہیں اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے بھلائی طے نہیں ہوئی، لیکن جب کسی بندے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے سے کوئی چیز طے ہو جائے تو وہ اس کو اس عمل میں لگا دیتا ہے جس کے ذریعے وہ اس تک پہنچ جاتا ہے، مثلاً: وہ شخص جس کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے سے طے ہے کہ اس کی اولاد ہوگی تو ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ کسی عورت سے مباشرت کرے اور وہ حاملہ ہو۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی اسباب اور ان کے نتائج کو مقرر کرتا ہے تو یہ سب اسی کی طرف سے پہلے سے طے ہوتا ہے۔ جو انسان یہ سمجھتا ہے کہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے سے بلاسبب بھلائی طے ہے، وہ گمراہ ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی اسباب اور نتائج مہیا کرتا ہے اور اس نے پہلے سے یہ سب کچھ طے کر دیا ہے۔

فصل (افعال میں بندوں کی قدرت کی نفی کی تردید):

قائل کا یہ کہنا کہ ''ہمارے تمام افعال میں ہماری کوئی قدرت نہیں'' جھوٹ ہے، کیوں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قدرت اور استطاعت رکھنے والے اور قدرت اور صلاحیت نہ رکھنے والے کے درمیان فرق کیا اور فرمایا ہے:

﴿ فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ [التغابن: ۱۶] ''سو اللہ سے ڈرو جتنی طاقت رکھو۔''

﴿ وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ﴾ [آل عمران: ۹۷]

''اور اللہ کے لیے لوگوں پر اس گھر کا حج (فرض) ہے، جو اس کی طرف راستے کی طاقت رکھے۔''

﴿ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن ضَعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِن بَعْدِ ضَعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِن بَعْدِ قُوَّةٍ ضَعْفًا وَشَيْبَةً ﴾ [الروم: ۵۴]

''اللہ وہ ہے جس نے تمھیں کمزوری سے پیدا کیا، پھر کمزوری کے بعد قوت بنائی، پھر قوت کے بعد کمزوری

اور بڑھاپا بنا دیا۔‘‘

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بندے کے لیے فعل بھی ثابت کیا ہے اور مرضی بھی:

﴿ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ۝ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ [التكوير: ٢٨، ٢٩]

’’اس کے لیے جو تم میں سے چاہے کہ سیدھا چلے اور تم نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ چاہے، جو سب جہانوں کا رب ہے۔‘‘

﴿ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ ﴾ [الواقعة: ٢٤] ’’اس کے بدلے کے لیے جو وہ کیا کرتے تھے۔‘‘

لیکن اللہ تعالیٰ اس کا اور اس کی قدرت، مرضی اور عمل کا خالق بھی ہے، اس کے سوا کوئی رب اور کوئی معبود نہیں اور وہ ہر چیز کا خالق، مالک اور رب ہے۔

فصل (گناہوں کے نصیب میں لکھا ہونے کو بہانہ بنانے کی تردید):

قائل کا یہ کہنا: ’’زنا اور دیگر گناہ ہمارے نصیب میں لکھے ہوئے ہیں۔‘‘ یہ صحیح بات ہے، لیکن اس کو دلیل بنانا غیر مفید ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے اچھے اور برے اعمال لکھے ہیں، ان کا انجامِ خیر یا انجامِ بد بھی لکھا ہے۔ اس نے اعمال کو ثواب اور سزا کا سبب بنایا ہے اور یہ بھی لکھا ہے، جس طرح بیماریاں لکھی ہیں اور انھیں موت کا سبب بنایا ہے۔ اس نے لکھا ہے جو زہر پیے گا وہ بیمار ہوگا یا موت کے منہ میں چلا جائے گا، اسی طرح جو انسان کفر، نافرمانی اور گناہ جیسے اس کے منع کردہ کام کرتا ہے تو وہ وہی کرتا ہے جو اس کے نصیب میں لکھا ہے اور وہ اس بدلے کا مستحق ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس عمل کا لکھا ہے۔ ان لوگوں کا تقدیر کو گناہ کے لیے دلیل بنانا مشرکوں کی دلیل سے ملتا جلتا کام ہے، جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے کہا:

﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ﴾ [النحل: ٣٥]

’’اور جن لوگوں نے شریک بنائے انھوں نے کہا اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم اس کے سوا کسی چیز کی عبادت کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم اس کے بغیر کسی بھی چیز کو حرام ٹھہراتے۔ اسی طرح ان لوگوں نے کیا جو ان سے پہلے تھے۔‘‘

﴿ سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ﴾

[الأنعام: ١٤٨]

''عنقریب وہ لوگ کہیں گے جنھوں نے شریک بنائے ہیں، اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شریک بناتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کوئی چیز حرام ٹھہراتے۔''

﴿ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ﴿١٤٨﴾ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبٰلِغَةُ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿١٤٩﴾ ﴾ [الأنعام: ١٤٨، ١٤٩]

''اسی طرح ان لوگوں نے جھٹلایا جو ان سے پہلے تھے، یہاں تک کہ انھوں نے ہمارا عذاب چکھ لیا۔ کہہ کیا تمھارے پاس کوئی علم ہے کہ تم اسے ہمارے لیے نکالو، تم تو گمان کے سوا کسی چیز کی پیروی نہیں کر رہے اور تم اس کے سوا کچھ نہیں کہ اٹکل دوڑاتے ہو۔ کہہ دے پھر کامل دلیل تو اللہ ہی کی ہے، سو اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ضرور ہدایت دے دیتا۔''

فصل (آدمی کی نافرمانی کی نفی کرنے والے کی مذمت):

جو انسان کہتا ہے: ''آدم علیہ السلام نے نافرمانی نہیں کی تھی'' وہ قرآن کو جھٹلاتا ہے۔ اس سے توبہ کروائی جائے۔ اگر توبہ کرلے تو صحیح ورنہ اس کو قتل کر دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴾ [طٰہٰ: ۱۲۱] ''اور آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی تو وہ بھٹک گیا۔''

معصیت شرعی حکم کی نافرمانی کا نام ہے۔ جو انسان اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی مخالفت کرتا ہے جو اس نے اپنے رسولوں کو دے کر بھیجا اور اپنی کتابوں میں اتارا، وہ نافرمانی کرتا ہے، اگرچہ وہ اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر میں داخل ہے۔

یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ معصیت اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے باہر نکلنے کا نام ہے اور یہ ممکن نہیں۔ مخلوقات میں سے کوئی بھی اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اگر معصیت اسی کا نام ہوتا تو ابلیس، فرعون، قومِ نوح، قومِ عاد، قومِ ثمود اور تمام کافر نافرمان نہ ہوتے، کیوں کہ وہ سب اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں داخل ہیں۔

جو انسان یہ بات کہتا ہے، اگر کوئی اس کو مارے اور ذلیل کرے اور وہ اس کا شکوہ کرے تو اس سے کہا جائے گا، وہ جس نے تمھارے ساتھ یہ سب کچھ کیا ہے وہ نافرمان نہیں، تمام مخلوقات کی طرح اس کی تقدیر میں داخل ہے۔ یہ بات کہنے والا شخص متضاد رویہ رکھتا ہے اور کسی ایک حالت پر قائم نہیں رہتا۔

فصل (ایمان پر جنت کا وعدہ اور گناہوں پر وعید):

قائل کا یہ کہنا: ''جو مذکورہ حدیث سے استدلال کرتے ہوئے کہتا ہے کہ لا إله إلا اللّٰه کہنے والا جنت میں داخل ہوگا۔'' اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ بلاشبہہ کتاب و سنت میں جنت کا وعدہ بھی ہے اور جہنم کی وعید اور

دھمکی بھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوٰلَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَّسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ﴾

[النساء: ۱۰]

’’بے شک جو لوگ یتیموں کے اموال ظلم سے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ کے سوا کچھ نہیں کھاتے اور عنقریب وہ بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے۔‘‘

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوٰلَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۚ وَلَا تَقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۝ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ۚ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝ ﴾ [النساء: ۲۹، ۳۰]

’’اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے مال آپس میں باطل طریقے سے نہ کھاؤ، مگر یہ کہ تمھاری آپس کی رضا مندی سے تجارت کی کوئی صورت ہو اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو، بے شک اللہ تم پر ہمیشہ سے بے حد مہربان ہے اور جو زیادتی اور ظلم سے ایسا کرے گا تو عنقریب ہم اسے آگ میں جھونکیں گے اور یہ اللہ پر ہمیشہ سے بہت آسان ہے۔‘‘

اس طرح کی نصوص کتاب وسنت میں بہت زیادہ ہیں۔ بندے کو ان دونوں کی تصدیق کرنی چاہیے، یہ نہیں کہ کچھ حصے پر ایمان لے آیا اور کچھ کے ساتھ کفر کیا۔ میٹھا میٹھا ہپ کڑوا کڑوا تھو۔ ان مشرکوں نے وعدے کی تصدیق کرنا چاہی اور وعید کی تکذیب، لیکن معتزلہ حروریہ نے وعدے کو چھوڑ کر وعید کی تصدیق کرنا چاہی۔ ان دونوں ہی نے غلطی کی ہے۔ اہلِ سنت والجماعت کا مذہب وعد اور وعید دونوں پر ایمان رکھنا ہے، نیز اللہ تعالیٰ نے جس بندے کو سزا کی وعید سنائی ہے تو ساتھ یہ شرطیں بھی بیان کی ہیں کہ اس نے توبہ نہ کی ہو، کیوں کہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والے کی توبہ قبول کرتا ہے۔ اس کی ایسی نیکیاں نہ ہوں، جو اس کی برائیوں کو مٹا دیں، جب کہ نیکیاں گناہوں کو مٹا دیتی ہیں اور تیسری شرط یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو معاف نہ کرنا چاہا ہو، کیوں کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ ﴾ [النساء: ٤٨]

’’بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک بنایا جائے اور وہ بخش دے گا جو اس کے علاوہ ہے۔‘‘

اسی طرح وعدے کی تفسیر اور تفصیل بھی ہے۔ جو زبان سے لا إلٰه إلا الله کہتا ہے، لیکن رسولوں کی تکذیب کرتا ہے وہ بالاتفاق کافر ہے۔ اسی طرح اگر وہ اللہ تعالیٰ کے کسی نازل کردہ حکم کا انکار کرے تب بھی۔

لہٰذا رسول کی پیش کردہ ساری شریعت پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اس کے بعد اگر وہ کبیرہ گناہ کرنے والا ہو تو اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے۔ چاہے گا تو اس کو معاف کر دے گا، نہیں چاہے گا تو نہیں معاف کرے گا۔

اگر وہ اسلام سے پھر کر ارتداد کی موت مرا تو وہ جہنم میں جائے گا۔ برائیوں کو نیکیاں مٹاتی ہیں اور نیکیوں کو ارتداد ضائع کر دیتا ہے۔ جس کی نیکیاں بھی ہوں اور برائیاں بھی تو اللہ تعالیٰ اس پر ظلم نہیں کرے گا، بلکہ جو ذرہ برابر نیکی کرے گا اس کو دیکھ لے گا اور جو ذرہ برابر برائی کرے گا اس کو بھی دیکھ لے گا، لیکن اللہ تعالیٰ چاہے تو اس پر اپنا فضل و احسان کرتے ہوئے اس کو اپنی رحمت اور بخشش میں ڈھانپ کر اس کے ساتھ اچھا سلوک کر دے۔

جو ایمان کی حالت میں فوت ہوا وہ جہنم میں ہمیشہ نہیں رہے گا۔ زنا کرنے والا اور چوری کرنے والا جہنم میں ہمیشہ نہیں رہے گا، بلکہ ضرور جنت میں داخل ہوگا۔ جہنم سے ہر اس شخص کو نکال لیا جائے گا جس کے دل میں ذرہ برابر ایمان ہوگا۔

یہ جن کے بارے میں پوچھا گیا ہے ان کو مشرک قدریہ مباحیہ کہا جاتا ہے۔ ان کی مذمت میں اتنے آثار منقول ہیں کہ جن کو یہاں ذکر کرنے سے جگہ کم پڑ سکتی ہے، واللّٰہ سبحانه و تعالیٰ أعلم

وصلی اللّٰہ علیٰ سیدنا محمد وآله وصحبه وسلم وحسبنا اللّٰہ ونعم الوکیل.[1]

بدبختی اور خوش بختی پہلے سے طے شدہ ہونے کی صورت میں عمل کی توجیہ

سوال اگر کچھ لوگ نیک بختی کے ساتھ مخصوص ہیں اور کچھ بدبختی کے ساتھ، نیک بخت بدبخت نہیں ہوگا اور بدبخت نیک بخت نہیں ہوگا، اعمال بذاتِ خود مراد نہیں، بلکہ وہ نیک بختی حاصل کرنے اور بدبختی دور کرنے کے لیے ہیں تو نفس کو اعمال کر کے تھکانے اور لذتوں سے دور رکھنے کی کوئی وجہ نہیں، کیوں کہ جو پہلے لکھا جا چکا ہے وہ لامحالہ واقع ہو کر رہے گا! ان امور کی تفصیل بیان کریں۔

جواب الحمد للّٰه. رسول اللہ ﷺ نے اس مسئلے کا جواب کئی ایک احادیث میں دیا ہے۔ صحیحین میں عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، انھوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا:

''اے اللہ کے رسول! کیا جنتی اور جہنمی معلوم ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں۔'' تو کہا گیا: عمل کرنے والے کس میں عمل کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''ہر ایک کو اس عمل کی آسانی کر دی گئی ہے جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔''[2]

بخاری کی روایت میں ہے: میں نے کہا: ''ہر کوئی وہی عمل کرتا ہے جس کے لیے پیدا کیا گیا ہے یا جو اس کے لیے میسر ہے؟''

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۶۲/۸۔۲۷۱)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۶۲۲۳) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۶۴۹)

امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب صحیح مسلم میں حضرت ابو الاسود الدؤلی سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے کہا: عمران بن حصین رضی اللہ عنہما نے مجھ سے کہا کہ تمھارا کیا خیال ہے کہ آج لوگ کس وجہ سے عمل کرتے اور مشقت اٹھاتے ہیں، کیا یہ ایسی چیز ہے جو پہلے سے ان کی تقدیر میں لکھ دی گئی ہے اور ان پر جاری ہوتی ہے؟ یا مستقبل میں جو ان کا نبی ان کے پاس لے کر آتا ہے اور ان پر حجت قائم ہو جاتی ہے تو اس کی روشنی میں عمل کرتے ہیں؟ میں نے کہا: بلکہ یہ پہلے ان کی تقدیر میں لکھ دی گئی ہے اور ان پر جاری ہو چکی ہے۔ انھوں نے کہا: کیا پھر یہ ظلم نہیں ہو گا؟ دؤلی کہتے ہیں: میں اس بات سے بہت زیادہ گھبرا گیا اور میں نے کہا: ہر چیز اللہ کی مخلوق اور مملوک ہے، اس سے اس کے بارے میں جو وہ کرتا ہے قطعاً نہیں پوچھا جاتا، بلکہ ان سے پوچھا جائے گا۔

انھوں نے کہا: اللہ تجھ پر رحم کرے! میں نے صرف تمھاری عقل کی آزمایش کے لیے یہ سوال کیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مزینہ قبیلے کے دو آدمی آئے اور کہنے لگے: اے اللہ کے رسول! آج لوگ جو عمل کرتے ہیں اور اس میں مشقت اٹھاتے ہیں، اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا یہ چیز پہلے سے ان کی تقدیر میں فیصلہ کر دی گئی ہے اور ان پر جاری ہو چکی ہے؟ یا مستقبل میں جو ان کا نبی ان کے پاس لے کر آتا ہے اور ان پر حجت قائم ہو جاتی ہے تو اس کے مطابق عمل کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: نہیں، بلکہ یہ وہ چیز ہے جو ان کے مقدر میں طے کر دی گئی ہے۔"[1]

صحیح مسلم میں جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں: سراقہ بن مالک بن جعشم رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہنے لگے:

> "اے اللہ کے رسول! ہمیں ہمارے دین کے بارے میں اس طرح کھول کر بتائیں جیسے ہم ابھی پیدا ہوئے ہوں۔ آج عمل کس وجہ سے ہے، کیا یہ تقدیر میں لکھا ہونے اور قلمِ تقدیر کے خشک ہو جانے کی وجہ سے ہے، یا جو مستقبل میں ہونے والا ہو اس وجہ سے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، بلکہ یہ اس میں ہے جس کو لکھ کر قلم خشک ہو گئے ہیں اور تقدیر جاری ہو چکی ہے۔ اس نے کہا: پھر عمل کیوں؟"

زبیر کہتے ہیں: پھر ابو زبیر نے کچھ کہا، لیکن میں سمجھ نہ سکا تو میں نے پوچھا: کس کے بارے میں کہا تھا؟ اس نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "عمل کرو، ہر کسی کو عمل میسر ہوتا ہے۔"

ایک روایت میں ہے: "ہر عمل کرنے والے کو اس کا عمل میسر ہوتا ہے۔"[2]

صحیحین میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انھوں نے کہا:

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٥٠)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٤٨، ٢٦٤٩)

''ہم بقیع الغرقد میں ایک جنازے میں شریک تھے کہ ہمارے پاس رسول اللہ ﷺ تشریف لائے۔ آپ ﷺ بیٹھ گئے اور ہم بھی آپ کے اردگرد بیٹھ گئے۔ آپ کے پاس ایک چھڑی تھی۔ آپ تھوڑا سا پیچھے ہٹے اور اس چھڑی سے زمین کو کریدنا شروع کیا، پھر فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ہر ایک، بلکہ ہر ایک سانس لینے والی جان کی جنت یا جہنم میں جگہ لکھ دی ہے۔ یہ بھی لکھ دیا گیا ہے کہ وہ نیک بخت ہو گی یا بد بخت۔'' ایک آدمی نے کہا: اے اللہ کے رسول! کیا ہم اپنے لکھے ہوئے (نوشتہ تقدیر) پر اعتماد کر کے عمل کرنا چھوڑ نہ دیں؟! جو نیک بختوں سے ہے وہ آخر کار ان جیسے عملوں میں لگ جائے گا اور جو بدبختوں سے ہے وہ بھی انجام کار ان جیسے عملوں میں لگ جائے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''عمل کرو، ہر ایک کو عمل میسر ہے۔ نیک بختوں کو نیک بختوں جیسے عمل میسر آئیں گے اور بدبختوں کو بدبختوں والے عمل۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت کی:

﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی ۝ فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی ۝ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی ۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰی ۝ فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰی ۝﴾ [اللیل: ٥-١٠]

''پس لیکن وہ جس نے دیا اور (نافرمانی سے) بچا اور اس نے سب سے اچھی بات کو سچ مانا تو یقیناً ہم اسے آسان راستے کے لیے سہولت دیں گے اور لیکن جس نے بخل کیا اور بے پروا ہوا اور اس نے سب سے اچھی بات کو جھٹلا دیا۔ تو یقیناً ہم اسے مشکل راستے کے لیے سہولت دیں گے۔''[1]

بخاری کی روایت میں ہے: ''کیا ہم اپنے نامہ اعمال پر بھروسا کر کے عمل کرنا چھوڑ نہ دیں؟ جو ہم میں سے نیک بختوں میں سے ہو گا وہ نیک بختوں کے عمل کی طرف ہو جائے گا اور جو بدبختوں میں سے ہو گا وہ بدبختوں کے عملوں کی طرف ہو جائے گا۔''[2]

صحیحین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے: ایک دن رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں ایک لکڑی تھی۔ آپ اس کے ساتھ زمین کرید رہے تھے۔ آپ نے اپنا سر اٹھایا اور فرمایا:

''تم میں سے ہر ایک جان کا جنت یا جہنم میں ٹھکانا معلوم ہے۔'' انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! تو ہم عمل کیوں کرتے ہیں، کیا ہم بھروسا نہ کر لیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں! عمل کرو، ہر ایک کو وہ عمل میسر ہے جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے، پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٩٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٩٦)

﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝﴾ [اللیل: ۵۔۱۰]

''پس لیکن وہ جس نے دیا اور (نافرمانی سے) بچا اور اس نے سب سے اچھی بات کو سچ مانا تو یقیناً ہم اسے آسان راستے کے لیے سہولت دیں گے اور لیکن جس نے بخل کیا اور بے پروا ہوا اور اس نے سب سے اچھی بات کو جھٹلا دیا تو یقیناً ہم اسے مشکل راستے کے لیے سہولت دیں گے۔''[1]

یہ اور ان جیسی دیگر احادیث میں رسول اللہ ﷺ نے جو بتایا ہے، قرآن کریم بھی اسی پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو بندوں کے انجامِ بد یا انجامِ خیر کا پہلے سے علم ہے۔ اس نے اس کو لکھا ہوا ہے اور اس کا فیصلہ کر دیا ہے۔ اسی طرح ان کے علاوہ بھی بندوں کے جتنے احوال ہیں ان سب کو وہ پہلے سے جانتا ہے اور اس نے انھیں لکھا ہوا ہے۔ جس طرح حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے بتایا جو سچے ہیں اور سچے قرار دیے گئے ہیں:

''تم میں سے ہر ایک کی پیدایش اس کی ماں کے پیٹ میں چالیس دن نطفے (منی کے قطرے) کی شکل میں جمع رہتی ہے۔ پھر اتنے ہی دن وہ جما ہوا خون رہتا ہے۔ پھر اتنے ہی دن وہ لوتھڑا بنا رہتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اس کے پاس ایک فرشتے کو چار باتیں دے کر بھیجتا ہے۔ اس کا عمل، عمر، رزق اور نیک بخت ہونا یا بدبخت ہونا لکھ دیا جاتا ہے۔ پھر اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔ اس ذات کی قسم، جس کے سوا کوئی معبودِ حقیقی نہیں! تم میں سے ایک اہلِ جنت جیسے عمل کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ اس کا لکھا ہوا اس پر غالب آ جاتا ہے۔ پھر وہ جہنمیوں والے عمل کرنا شروع کر دیتا ہے اور اس میں داخل ہو جاتا ہے۔ تم میں سے ایک جہنمیوں والے کام کرتا رہتا ہے، حتیٰ کہ اس کے اور جہنم کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ اس کا لکھا ہوا اس پر غالب آ جاتا ہے۔ پھر وہ جنتیوں والے کام کرنا شروع کر دیتا ہے اور اس میں داخل ہو جاتا ہے۔''[2]

صحیحین میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً بیان کیا ہے:

''اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ رحمِ مادر کے سپرد کیا ہے۔ وہ کہتا ہے: اے رب! اس کو نطفہ بنا دے۔ اے رب! اس کو جما ہوا خون بنا دے۔ اے رب! اس کو لوتھڑا بنا دے۔ اے رب! اس کو نر بنانا ہے کہ مادہ۔ نیک بخت

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٣١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٣٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٣)

بنانا ہے کہ بد بخت؟ اس کا رزق کیا ہوگا؟ اس کی عمر کتنی ہوگی؟ تو وہ یہ سب کچھ اس کی ماں کے پیٹ میں لکھ دیتا ہے۔"[1]

صحیح مسلم میں حضرت حذیفہ بن اسید غفاری کی حدیث کا مفہوم بھی یہی ہے۔[2] ایسی بہت ساری نصوص اور آثار ہیں جو بیان کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو چیزوں کو پیدا کرنے سے پہلے سے ان کا علم ہے۔ اس نے ان کو لکھا ہوا ہے اور ان کا فیصلہ کر دیا ہوا ہے۔ اس کی بہت زیادہ انواع ہیں۔

نبی اکرم ﷺ نے بھی بیان فرما دیا ہے کہ یہ ان اعمال کے وجود کے منافی نہیں جو نیک بختی اور بدبختی کے اسباب ہیں۔ جو نیک بخت ہے اس کے لیے نیک بختوں کے عمل آسان کر دیے جاتے ہیں اور جو بد بخت ہے اس کے لیے بدبختوں کے عمل آسان کر دیے جاتے ہیں۔

آپ ﷺ نے پہلے سے لکھی ہوئی تقدیر پر بھروسا کر کے عمل ترک کرنے سے منع کیا ہے، لہٰذا جو انسان تقدیر پر بھروسا کر کے عمل کرنا چھوڑ دیتا ہے وہ ان لوگوں میں شمار ہوتا ہے جو اعمال میں سب سے زیادہ خسارہ پانے والے ہیں اور جن کی کوشش دنیا کی زندگی میں کھو گئی، ان کا ان اعمال کو چھوڑ دینا جو ان پر لازم تھے، یہ بھی اس جملہ تقدیر میں داخل ہے جو ان کے لیے بدبختوں جیسے عمل کرنے کے لیے آسان کی گئی۔ نیک بخت وہ ہیں جو حکم دیے گئے کام پر عمل کرتے ہیں اور منع کیے گئے کام چھوڑ دیتے ہیں، لہٰذا جو انسان تقدیر کو بہانہ بنا کر وہ عمل چھوڑ دیتا ہے جس کا حکم دیا گیا ہے اور ممنوع کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ ان بدبختوں میں سے ہے جن کے لیے بدبختوں کے عمل آسان بنائے جاتے ہیں۔

یہ جواب جو رسول اللہ ﷺ نے دیا تھا، انتہائی درست اور راست ہے۔ یہ اسی جواب کی طرح ہے جو آپ ﷺ نے علاج کروانے سے متعلق پوچھے گئے سوال کے موقع پر دیا تھا۔ آپ ﷺ سے پوچھا گیا:

"اے اللہ کے رسول! جن دوائیوں کو ہم بطورِ علاج استعمال کرتے ہیں اور جو دم کرتے اور پرہیز کرتے ہیں، اس سب کے حوالے سے آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا یہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں سے کسی چیز کو لوٹا سکتے ہیں؟

آپ ﷺ نے فرمایا: ((هي من قدر الله)) "یہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر ہی سے ہیں۔" (رواه الترمذي)[3]

کیوں کہ اللہ تعالیٰ چیزوں کی ماہیت اور خصائص جانتا ہے اور اسی طرح ان کو لکھتا بھی ہے۔ اگر وہ کسی چیز کے بارے میں یہ جانتا ہے کہ وہ عمل وغیرہ کی طرح کے اسباب کے نتیجے میں رونما ہوگی، وہ فیصلہ کر دیتا ہے کہ وہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٦)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٥)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٠٦٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٤٣٧)

ایسے ہی ہوگی اور وہ اس کو تقدیر میں لکھ دیتا ہے تو پھر یہ گمان کرنا درست نہیں کہ وہ امور ان اسباب کے بغیر ہی وجود پذیر ہو سکتے ہیں جن کو اس نے ان کے اسباب بنایا ہے۔ یہ بات تمام حادثات و واقعات میں عام ہے۔

مثلاً: اگر اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے اور اس نے لکھ دیا ہے کہ فلاں جوڑے کے بچے پیدا ہوں گے تو اللہ تعالیٰ نے اس کا یہ سبب بنایا ہے کہ میاں بیوی سے مباشرت کرے اور وہ پانی اس کے رحم میں داخل ہو جس سے حمل ٹھہرتا ہے، لہٰذا اس سبب کے بغیر بچے کا وجود ممکن نہیں جس پر اس کا وجود معلق ہے۔

اسباب کی دو قسمیں ہیں: ① معمول کے مطابق ② غیر معمولی اور عجیب سبب۔ آدمی کا ماں باپ دونوں کے ملاپ سے پیدا ہونا معمول کے مطابق ہے، لیکن غیر معمول اور عجیب سبب بچے کا صرف ماں سے پیدا ہونا جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے یا صرف باپ سے پیدا ہونا جس طرح حضرت حوا علیہا السلام کی ولادت ہوئی، یا ماں اور باپ دونوں کے بغیر پیدا ہونا ہے جس طرح حضرت آدم علیہ السلام کو گندھی ہوئی مٹی سے پیدا کیا گیا۔

لہٰذا تمام اسباب پہلے سے اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں، اس نے ان کو لکھا ہوا ہے، ان کا اندازہ کیا ہوا ہے ان کا فیصلہ کیا ہوا ہے اور ان کو مسببات، یعنی نتائج کے ساتھ مربوط کیا ہوا ہے۔ اسی طرح کھیتی وغیرہ اگانے کے لیے بارش وغیرہ کا سبب ہونا بھی اسی باب سے تعلق رکھتا ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ﴾ [البقرة: ١٦٤]

''اور اس پانی میں جو اللہ نے آسمان سے اتارا، پھر اس کے ساتھ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کر دیا اور اس میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیے۔''

﴿ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ﴾ [الأعراف: ٥٧]

''پھر ہم اس سے پانی اتارتے ہیں، پھر اس کے ساتھ ہر قسم کے کچھ پھل پیدا کرتے ہیں۔''

﴿ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ٣٠]

''اور ہم نے پانی سے ہر زندہ چیز بنائی، تو کیا یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔''

یہ اور اس طرح کی دیگر آیات۔ تو یہ سب اپنی تخلیق و تکوین سے پہلے مقدر (اندازہ کیا گیا) معلوم (اللہ کے علم میں) فیصلہ کیا گیا اور لکھا ہوا ہے۔

جو یہ خیال کرتا ہے کہ کسی چیز کے وجود کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اللہ کے علم میں ہو اور اس نے اس کو لکھ دیا ہو، اس کے لیے کسی فاعل، فعل یا سبب کی ضرورت نہیں، وہ دو پہلوؤں سے جاہل اور کھلی گمراہی میں ہے:

پہلا پہلو:

ایک اس لحاظ سے کہ اس نے علم کو جہالت بنا دیا ہے، کیوں کہ علم معلوم کے مطابق اور وہ جن چیزوں پر مشتمل ہوتا ہے ان سے متعلق ہوتا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو علم ہے کہ بنائی گئی چیزیں ان اسباب کے ساتھ ہی بنتی ہیں جن کو اس نے اسباب بنایا ہے اور یہی امرِ واقع بھی ہے۔ جو کہتا ہے کہ وہ چیزوں کو ان کے اسباب کے بغیر جانتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف غلط اور باطل بات منسوب کرتا ہے۔ وہ اس شخص کی طرح ہے جو کہتا ہے: اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ یہ بچہ والدین کے بغیر پیدا ہوا، یہ کھیتی پانی کے بغیر اُگی۔ علم کا ماضی اور مستقبل کے ساتھ تعلق یکساں حیثیت رکھتا ہے۔ لہٰذا جس نے کہا کہ ماضی میں اللہ تعالیٰ کو ان چیزوں کا ان اسباب کے بغیر علم تھا، وہ بھی باطل پر ہے اور جو کہتا ہے کہ مستقبل میں جو ہو گا اللہ تعالیٰ کو اس کا تو علم ہے، لیکن ان کے اسباب کا نہیں، وہ بھی باطل پر ہے مثلاً کوئی کہنے والا کہے: اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ اس نے آدم علیہ السلام کو مٹی کے بغیر پیدا کیا، اس کو علم ہے کہ لوگ نکاح و جماع کے بغیر اپنی نسل آگے بڑھائیں گے۔ اس نے کھیتیوں کو پانی اور مٹی کے بغیر اگایا تو غلط بات ہے جس کا غلط ہونا بالکل ظاہر ہے، اسی طرح مستقبل کے بارے میں محض خبر دینا بھی۔

اسی طرح اعمال بھی جزا اور سزا کے اسباب ہیں۔ اگر کوئی کہنے والا کہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے گناہ کے بغیر نکالا، اس نے اس کو ان کا مقدر بنایا ہوا تھا، یا یہ کہے کہ اس نے توبہ کے بغیر ان کو معاف کیا اور اس کو اس کا علم تھا تو اس کی یہ بات جھوٹ اور بہتان ہے، لیکن اگر وہ یہ کہے جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ فَتَلَقَّىٰٓ ءَادَمُ مِن رَّبِّهِۦ كَلِمَٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۚ ﴾ [البقرۃ: ۳۷]

''پھر آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ لیے، تو اس نے اس کی توبہ قبول کر لی۔''

﴿ فَأَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْءَٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِن وَرَقِ ٱلْجَنَّةِ ۚ ﴾ [طٰہٰ: ۱۲۱]

''پس دونوں نے اس میں سے کھا لیا تو دونوں کے لیے ان کی شرم گاہیں ظاہر ہو گئیں اور وہ دونوں اپنے آپ پر جنت کے پتے چپکانے لگے۔''

وہ اس بات میں سچا ہو گا، اللہ تعالیٰ کو اس کے رونما ہونے سے پہلے سے علم تھا کہ اس سے کیا سرزد ہو گا اور بعد میں جو ہوا وہ اس کو بھی جاننے والا ہے۔

اسی طرح انبیاے کرام علیہم السلام کے واقعات کے ضمن میں اس نے جو کچھ بتایا ہے اس کو علم تھا کہ اس نے قومِ نوح، قومِ عاد، قومِ ثمود، قومِ لوط، اصحابِ مدین اور فرعون وغیرہ کو ان کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کیا اور انبیاے کرام علیہم السلام اور ان کے پیروکاروں کو ان کے ایمان اور تقوے کی وجہ سے نجات دی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ أَنجَيْنَا الَّذِينَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوءِ وَأَخَذْنَا الَّذِينَ ظَلَمُوا بِعَذَابٍ بَئِيسٍ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴾ [الأعراف: ١٦٥]

''پھر جب وہ اس بات کو بھول گئے جس کی انھیں نصیحت کی گئی تھی تو ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا جو برائی سے منع کرتے تھے، اور ان کو سخت عذب میں پکڑ لیا جنھوں نے ظلم کیا تھا، اس وجہ سے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔''

﴿فَكُلًّا أَخَذْنَا بِذَنبِهِ ۖ فَمِنْهُم مَّنْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا وَمِنْهُم مَّنْ أَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ وَمِنْهُم مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْأَرْضَ وَمِنْهُم مَّنْ أَغْرَقْنَا ۚ ﴾ [العنکبوت: ٤٠]

''تو ہم نے ہر ایک کو اس کے گناہ میں پکڑ لیا، پھر ان میں سے کوئی وہ تھا جس پر ہم نے پتھراؤ والی ہوا بھیجی اور ان میں سے کوئی وہ تھا جسے چیخ نے پکڑ لیا اور ان میں سے کوئی وہ تھا جسے ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور ان میں سے کوئی وہ تھا جسے ہم نے غرق کر دیا۔''

﴿ ذَٰلِكَ جَزَيْنَاهُم بِبَغْيِهِمْ ۖ ﴾ [الأنعام: ١٤٦] ''یہ ہم نے انھیں ان کی سرکشی کی جزا دی۔''

﴿ فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ وَمَا كَانَ لَهُم مِّنَ اللَّهِ مِن وَاقٍ ﴾ [المؤمن: ٢١]

''پھر اللہ نے انھیں ان کے گناہوں کی وجہ سے پکڑ لیا اور انھیں اللہ سے بچانے والا کوئی نہ تھا۔''

﴿ فَأَهْلَكْنَاهُم بِذُنُوبِهِمْ وَأَنشَأْنَا مِن بَعْدِهِمْ قَرْنًا آخَرِينَ ﴾ [الأنعام: ٦]

''پھر ہم نے انھیں ان کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کر دیا اور ان کے بعد دوسرے زمانے کے لوگ پیدا کر دیے۔''

﴿فَتِلْكَ بُيُوتُهُمْ خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوا ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝ وَأَنجَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ﴾ [النمل: ٥٢، ٥٣]

''تو یہ ہیں ان کے گھر گرے ہوئے، اس کے باعث جو انھوں نے ظلم کیا۔ بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً ایک نشانی ہے جو جانتے ہیں اور ہم نے ان لوگوں کو نجات دی جو ایمان لائے اور بچتے رہے تھے۔''

﴿ وَكَذَٰلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ إِذَا أَخَذَ الْقُرَىٰ وَهِيَ ظَالِمَةٌ ۚ إِنَّ أَخْذَهُ أَلِيمٌ شَدِيدٌ ﴾ [هود: ١٠٢]

''اور تیرے رب کی پکڑ ایسی ہی ہوتی ہے، جب وہ بستیوں کو پکڑتا ہے، اس حال میں کہ وہ ظلم کرنے والی ہوتی ہیں، بے شک اس کی پکڑ بڑی دردناک، بہت سخت ہے۔''

﴿وَكَذَٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ يَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ ۚ نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَن نَّشَاءُ ۖ وَلَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴾ [یوسف: ٥٦]

''اور اسی طرح ہم نے اس سرزمین میں یوسف کو اقتدار عطا فرمایا، اس میں سے جہاں چاہتا جگہ پکڑتا تھا۔ ہم اپنی رحمت جس کو چاہتے ہیں پہنچا دیتے ہیں اور ہم نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔''

﴿ ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا ۝ ﴾ [بني إسرائيل: ٣]

''اے ان لوگوں کی اولاد جنھیں ہم نے نوح کے ساتھ سوار کیا! بے شک وہ بہت شکر گزار بندہ تھا۔''

﴿ إِلَّا آلَ لُوطٍ نَجَّيْنَاهُمْ بِسَحَرٍ ۝ نِعْمَةً مِنْ عِنْدِنَا كَذَلِكَ نَجْزِي مَنْ شَكَرَ ۝ ﴾ [القمر: ٣٤، ٣٥]

''سوائے لوط کے گھر والوں کے، انھیں ہم نے صبح سے کچھ پہلے نجات دی۔ اپنی طرف سے انعام کرتے ہوئے، اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں اسے جو شکر کرے۔''

﴿ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنَى عَلَى بَنِي إِسْرَائِيلَ بِمَا صَبَرُوا ﴾ [الأعراف: ١٣٧]

''اور تیرے رب کی بہترین بات بنی اسرائیل پر پوری ہوگئی، اس وجہ سے کہ انھوں نے صبر کیا۔''

قرآن کریم میں اس کی بہت زیادہ مثالیں ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بتایا ہے کہ اعمال کے ساتھ ہی خوش نصیبی یا بدنصیبی حاصل ہوگی، ارشاد ہے:

﴿ كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا أَسْلَفْتُمْ فِي الْأَيَّامِ الْخَالِيَةِ ۝ ﴾ [الحاقة: ٢٤]

''کھاؤ اور پیو مزے سے، ان اعمال کے عوض جو تم نے گزرے ہوئے دنوں میں آگے بھیجے۔''

﴿ وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝ ﴾ [الزخرف: ٧٢]

''اور یہی وہ جنت ہے جس کے تم وارث بنائے گئے ہو، اس کی وجہ سے جو تم عمل کرتے تھے۔''

﴿ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَا أَلَتْنَاهُمْ مِنْ عَمَلِهِمْ مِنْ شَيْءٍ ﴾ [الطور: ٢١]

''اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد کسی بھی درجے کے ایمان کے ساتھ ان کے پیچھے چلی، ہم ان کی اولاد کو ان کے ساتھ ملا دیں گے اور ان سے ان کے عمل میں کچھ کمی نہ کریں گے۔''

﴿ إِنِّي جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوا أَنَّهُمْ هُمُ الْفَائِزُونَ ۝ ﴾ [المؤمنون: ١١١]

''بے شک میں نے انھیں آج اس کے بدلے جو انھوں نے صبر کیا، یہ جزا دی ہے کہ بے شک وہی کامیاب ہیں۔''

﴿ وَجَزَاهُمْ بِمَا صَبَرُوا جَنَّةً وَحَرِيرًا ۝ ﴾ [الدهر: ١٢]

''اور انھیں ان کے صبر کرنے کے عوض جنت اور ریشم کا بدلہ عطا فرمایا۔''

اور یہ آیات:

﴿هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝﴾ [المطففين: ٣٦]

''کیا کافروں کو اس کا بدلہ دیا گیا جو وہ کیا کرتے تھے۔''

﴿مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ۝ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ۝ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ ۝ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ ۝ حَتَّى أَتَانَا الْيَقِينُ ۝ فَمَا تَنفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ ۝﴾ [المدثر: ٤٢ـ٤٨]

''تمھیں کس چیز نے (سقر) میں داخل کر دیا؟ وہ کہیں گے ہم نماز ادا کرنے والوں میں نہیں تھے اور نہ ہم مسکین کو کھانا کھلاتے تھے اور ہم بے ہودہ بحث کرنے والوں کے ساتھ مل کر فضول بحث کیا کرتے تھے اور ہم جزا کے دن کو جھٹلایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ہمارے پاس یقین آ گیا۔ پھر انھیں سفارش کرنے والوں کی سفارش نفع نہیں دے گی۔''

قرآن کریم میں اس جیسی آیات بہت زیادہ ہیں۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بیان کیا ہے کہ آخرت میں خوش نصیبی یا بدنصیبی ان اعمال کی وجہ ہی سے ہوگی جن کو کرنے اور جن سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی طرح اس نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ دنیا میں بھی وہ جو جزا یا سزا دینا مقرر کرتا ہے، اسی قانونِ مکافات کے مطابق ہے۔

دوسرا پہلو:

کسی چیز کے وقوع پذیر ہونے کے بارے میں علم ہونے، اس کے بارے میں بتانے اور اس کو لکھنے سے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ اس نے جن اسباب کے ساتھ مکمل ہونا ہے ان کی کوئی ضرورت نہیں رہتی، جیسے کام کرنے والا، اس کی قدرت اور اس کی مرضی، یہ عقیدہ غایت درجہ جہالت پر مبنی ہے۔

کیوں کہ یہ علم بذاتِ خود معلوم کے وجود کو مستلزم نہیں اور اس پر علما کا اتفاق ہے، بلکہ وہ (معلوم) اس کے مطابق ہے جس پر وہ علم مشتمل ہے۔ وہ (علم) اس (معلوم) کو کوئی صفت مہیا کرتا ہے نہ وہ (معلوم) اس (علم) سے کوئی صفت خود حاصل کرتا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ہمیں اپنے سے پہلے موجود اشیا کا علم ہے، مثلاً: وہ موجودات جو ہمارے وجود سے پہلے وجود رکھتی ہیں، جیسے ہمارا اللہ تعالیٰ، اس کے ناموں اور اس کی صفات کے بارے میں علم۔ یہ علم تمام علما کے اتفاق کے ساتھ معلوم کے وجود میں موثر نہیں، اگرچہ ہمارے علوم میں کچھ علم ہوتے ہیں جن کی معلوم کے وجود میں تاثیر ہوتی ہے، جیسے ہمارا وہ علم جو ہمیں کوئی فعل کرنے کی دعوت دیتا ہے اور ہمیں اس کی صفت اور قدرت

سے آشنا کرتا ہے، کیوں کہ اختیاری افعال اسی سے صادر ہوتے ہیں جو صاحبِ علم اور باشعور ہو۔ ارادہ علم کے وجود کے ساتھ مشروط ہے۔ ہمارے علم میں موجود یہ تفصیل، جو فعلی علم، جس کی معلوم میں تاثیر ہوتی ہے اور انفعالی علم، جس کی معلوم کے وجود میں کوئی تاثیر نہیں ہوتی، میں تقسیم ہوتی ہے۔ یہ علم میں فیصلہ کن بات کی حیثیت رکھتی ہے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں: علم انفعالی صفت ہے جس کی معلوم میں کوئی تاثیر نہیں۔ یہ متکلمین کے ایک گروہ کا نظریہ ہے۔ کچھ کہتے ہیں: یہ فعلی صفت ہے جس کی معلوم میں تاثیر ہوتی ہے۔ یہ فلاسفہ اور متکلمین کے ایک گروہ کا خیال ہے۔ درست یہ ہے کہ یہ دو انواع ہیں، جس طرح ہم نے بیان کیا ہے۔ اسی طرح رب تعالیٰ کا علم ہے۔ اس کے علم کی بذاتِ خود معلوم کے وجود میں تاثیر نہیں۔ البتہ اس کا اپنی مخلوقات کے بارے میں علم جن کو اس نے اپنے ارادے اور مشیت سے پیدا فرمایا، اس علم کی اس کی معلومات کے وجود میں تاثیر ہے۔

کلام اور کتاب (نوشتہ تقدیر) کے بارے میں بھی وہی بات ہے جو علم کے بارے میں ابھی بیان ہوئی ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ جب کسی چیز کو پیدا فرماتا ہے تو وہ اس کو اپنے علم، قدرت اور مشیت سے پیدا فرماتا ہے، اسی لیے پیدایش علم کو مستلزم ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ اَلَا یَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِیۡفُ الۡخَبِیۡرُ ﴾ [الملک: ۱۴]

"کیا وہ نہیں جانتا جس نے پیدا کیا ہے اور وہی تو ہے جو نہایت باریک بین ہے، کامل خبر رکھنے والا ہے۔"

لیکن اگر وہ کسی چیز کے رونما ہونے سے پہلے اس کے بارے میں بتائے تو ایسی صورت میں اس کا اس کے بارے میں علم اور اس کے بارے میں بتانا، محض اس کے بتانے اور اس کا اس کے بارے میں علم ہونے سے اس کے وجود میں تین وجوہ کی بنا پر موثر نہیں ہوتا:

① مستقبل کے بارے میں علم ہونا اور بتانا ماضی کے علم اور اس کو بتانے کی طرح ہی ہے۔

② موثر علم وہ ہے جو اس ارادے کو مستلزم ہو جو ارادہ پیدا کرنے کو مستلزم ہو، وہ نہیں جو خبر کو مستلزم ہو اور ہم نے عملی علم اور خبری علم کے درمیان فرق بیان کر دیا ہے۔

③ اگر فرض کیا جائے کہ علم اور خبر کی معلوم اور مخبر بہ (جس کے بارے میں خبر دی گئی ہے) کے وجود میں تاثیر ہے، تو بلاشبہہ اس کے ساتھ قدرت اور مشیت کا ہونا بھی ضروری ہے، قدرت اور ارادے کے بغیر محض علم اس کا سبب نہیں۔ لہٰذا معلوم ہوا علم وخبر اور لکھا ہوا ہونا کرنے والے، قدرت رکھنے والے اور ارادہ کرنے والے سے بے نیاز نہیں کر سکتا۔ یہ تو اس پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ہونے والے تمام مفعولات کا علم بھی رکھتا ہے اور ان کے بارے میں بتاتا بھی ہے۔ جس طرح وہ یہ جانتا ہے کہ قیامت قائم ہوگی اور وہ اس کی خبر بھی دیتا ہے،

لیکن اس کے باوجود یہ بھی معلوم ہے کہ محض یہ علم اور خبر معلوم اور مخبر بہ کے وجود کو ان اسباب کے بغیر لازم قرار نہیں دیتا جو اس نے اس کے وجود کے لیے اسباب بنائے ہیں۔

لہٰذا واضح ہو جاتا ہے کہ سائل کا یہ کہنا: ''نیک بخت بد بخت نہیں ہوتا اور بد بخت نیک بخت نہیں ہوتا'' صحیح بات ہے۔ یعنی جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اندازہ لگایا ہے کہ وہ نیک بخت ہوگا تو وہ نیک بخت ہی ہوگا، لیکن ان اعمال کے ساتھ جن کو اس نے اس کی نیک بختی کے اسباب بنایا ہے اور بد بخت بھی ان اعمال ہی کی وجہ سے بد بخت ہوگا جن کو اس نے بدبختی کے اسباب بنایا ہے۔ بدبختی کے ان جملہ اعمال میں سے ایک عمل تقدیر پر بھروسا کر کے واجب اعمال ترک کر دینا بھی ہے۔

سائل کا یہ کہنا: ''اعمال بذاتِ خود مراد نہیں، بلکہ یہ خوش بختی سمیٹنے اور بدبختی بھگانے کے لیے کیے جاتے ہیں، اعمال کا وجود ہم سے پہلے ہے۔'' اس سے کہا جائے گا: جو پہلے طے ہو چکا ہے وہ بذاتِ خود نیک بختی یا بدبختی ہے، یا علم، فیصلے اور نوشتہ تقدیر ہونے کے اعتبار سے نیک بختی اور بدبختی۔ اس مقام پر بہت سارے لوگ غلطی اور شبہے کا شکار ہو جاتے ہیں، کیوں کہ وہ کسی چیز کے علم اور اندازے میں ثبوت رکھنے اور حقیقت میں اس کے وجود رکھنے کے درمیان فرق نہیں کرتے۔

کسی چیز کے علم اور اندازے میں ثبوت کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کے بارے میں جانتا ہے، اس کے بارے میں بتاتا ہے اور اس کو اس نے لکھا ہوا ہے، لیکن ان میں سے کوئی ایک چیز بھی اس کی ذات میں داخل ہے نہ اس کی صفات میں۔

اسی لیے بہت سارے لوگ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں بھی غلطی کرتے ہیں جو صحیح حدیث میں حضرت میسرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے منقول ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا:

''اے اللہ کے رسول! ''آپ کب نبی تھے؟'' دوسری روایت میں ہے: ''آپ کو کب نبی لکھا گیا؟''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ابھی حضرت آدم علیہ السلام روح اور بدن کے درمیان تھے۔''[1]

وہ گمان کرتے ہیں کہ اسی وقت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بھی موجود تھی اور نبوت بھی، یہ جہالت ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو چالیس سال کی عمر میں نبی بنایا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا:

﴿بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝﴾ [یوسف: ۳]

''اس واسطے سے کہ ہم نے تیری طرف یہ قرآن وحی کیا ہے اور بے شک تو اس سے پہلے یقیناً بے خبروں سے تھا۔''

﴿وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝﴾ [الضحیٰ: ۷]

---

[1] مسند أحمد (۱۲۷/٤)

''اور اس نے تجھے راستے سے ناواقف پایا، پس راستہ دکھایا۔''

صحیحین میں ہے کہ جب آپ ﷺ کے پاس فرشتہ آیا اور اس نے کہا: ''پڑھ!'' آپ ﷺ نے تین مرتبہ جواب دیا: ''میں پڑھنے والا نہیں۔''[1]

جو شخص یہ کہتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ وحی سے پہلے ہی نبی تھے، وہ تمام مسلمانوں کے اتفاق کے ساتھ کافر ہے۔

اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی نبوت لکھی تو اس کو حضرت آدم علیہ السلام کا بدن پیدا کرنے کے بعد اور ان میں روح پھونکنے سے پہلے ظاہر کیا اور اس کا اعلان کیا، جس طرح اس نے بتایا ہے کہ وہ موجود کو پیدا کرنے کے بعد، لیکن اس میں روح پھونکنے سے پہلے اس کا رزق، عمر، عمل اور اس کی خوش بختی یا بدبختی لکھتا ہے۔

مسند احمد وغیرہ میں حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« إِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ وَخَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ »

''میں اللہ کا بندہ اور خاتم النبیین ہوں۔''

ایک روایت میں ہے:

« إِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ لَمَكْتُوْبٌ خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ، وَإِنَّ آدَمَ لَمُنْجَدِلٌ فِيْ طِيْنَتِهِ، وَسَأُنَبِّئُكُمْ بِأَوَّلِ ذٰلِكَ: دَعْوَةُ أَبِيْ إِبْرَاهِيْمَ، وَبُشْرٰى عِيْسٰى، وَرُؤْيَا أُمِّيْ رَأَتْ حِيْنَ وَلَدَتْنِيْ أَنَّهُ خَرَجَ مِنْهَا نُوْراً أَضَاءَتْ لَهُ قُصُوْرُ الشَّامِ »[2]

''میں اللہ کا بندہ ہوں اور اس وقت سے خاتم النبیین لکھا ہوا ہوں جب حضرت آدم علیہ السلام اپنی مٹی میں گندھے ہوئے تھے۔ میں تمھیں اس کی ابتدا (اپنی نبوت کی ابتدائی خبر) کے بارے میں بتاتا ہوں کہ میں اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی دعا، عیسیٰ علیہ السلام کی خوش خبری اور اپنی ماں کا خواب ہوں جو انھوں نے مجھے جنم دیتے وقت دیکھا کہ ان سے روشنی نکلی جس میں شام کے محلات روشن ہو گئے۔''

بہت سے جاہل مصنفین اور دیگر اس حدیث کو اس طرح نقل کرتے ہیں: « كُنْتُ نَبِيًّا وَ آدَمُ بَيْنَ الْمَاءِ وَالطِّيْنِ » نیز: « وَآدَمُ لَا مَاءَ وَلَا طِيْنَ » اور اس سے بعینہٖ آپ ﷺ کا وجود مراد لیتے ہیں، حالانکہ آدم علیہ السلام پانی اور مٹی کے درمیان نہیں تھے بلکہ پانی بعض مٹی تھا، اس کا مقابل نہیں۔

اگر بات ایسے ہی ہے تو جو اس نے کہا ہے: ''بذاتِ خود نیک بختی اور بدبختی پہلے سے ہے'' یہ جھوٹ ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٧٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٠)

[2] مسند أحمد (١٢٧/٤)

نیک بختی انسان کے وجود کے بعد ہوتی ہے، اسی طرح بدبختی بھی بدبخت انسان کے وجود کے بعد ہوتی ہے۔ جس طرح عمل کام کرنے والے کے وجود کے بعد اور رزق کمانے والے کے وجود کے بعد، عمل اور رزق بنتا ہے اسی طرح نیک بختی اور بدبختی بھی ہے۔ پہلے سے جو چیز موجود ہے، وہ اس کا علم اور اندازہ ہے، بذاتِ خود اس کا وجود اور ذات نہیں۔ اگر یہ بات واضح ہوگئی ہے تو عمل بھی انہی معنوں میں پہلے سے ہے جن معنوں میں نیک بختی اور بدبختی پہلے سے ہے۔ یہ دونوں چیزیں پہلے سے معلوم اور تقدیر میں لکھی ہوئی ہیں، لیکن وجود میں متاخر ہیں، یعنی بعد میں وجود میں آتی ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو علم بھی ہے اور اس نے اندازہ بھی کیا ہوا ہے کہ فلاں شخص فلاں کام کر کے نیک بخت ہو جائے گا اور فلاں شخص فلاں عمل کر کے بدبخت ہو جائے گا۔ وہ جانتا ہے کہ تمام اسباب اور ان کے نتائج کی طرح نیک عمل بھی نیک بختی کا باعث بنتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ فلاں زہر کھائے گا تو مر جائے گا، فلاں کھانا کھائے گا تو سیر ہو جائے گا، فلاں پانی پیے گا تو سیراب ہو جائے گا۔

بنا بریں سائل کی یہ بات غلط ثابت ہوتی ہے کہ نفس کو عمل میں تھکانے اور لذتوں سے دور رکھنے کی کوئی وجہ نہیں، جب یہ پہلے سے لکھا ہوا اور لامحالہ واقع ہونے والا ہے۔ کیوں کہ جو پہلے سے مکتوب اور لکھا ہوا ہے وہ یہ ہے کہ نیک بخت کی نیک بختی ان اعمالِ صالحہ کے مرہونِ منت ہے جو وہ اس کے لیے آسان بناتا ہے اور بدبخت کی بدبختی ان برے اعمال کا نتیجہ ہے جو اس کے لیے میسر ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک بھی دوسرے کے بغیر لکھا ہوا نہیں (نیک بختی اور بدبختی اپنے اسباب سمیت لکھی ہوئی ہے۔) لہٰذا اس نے بندے کو جو حکم دیا ہے، اس میں مشقت ہو یا شہوت سے رکنا ہو، وہ نیک بختی کے حصول کے اسباب میں سے ہے اور جو لکھا ہوا اور مقدر ہے وہ نیک بختی اور وہ عمل ہے جو اس کے حصول کا باعث ہے۔ جب کوئی بندہ نوشتہ تقدیر پر بھروسا کر کے کسی حکم کو چھوڑ دیتا ہے تو یہی اس کا نصیب اور لکھا ہوا ہے، جس کے ذریعے وہ بدبخت ہو جاتا ہے۔ اس وقت اس کا کہنا اس شخص کے کہنے کی طرح ہے جو کہتا ہے کہ اگر میرے نصیب میں سیر ہونا اور سیراب ہونا لکھا ہے تو میں نہ کھاؤں گا نہ پیوں گا اور اگر یہ میرے نصیب میں نہیں لکھا ہوا تو پھر میں اس سے محروم ہی رہوں گا یا جو کہتا ہے کہ میں اپنی بیوی سے مجامعت نہیں کروں گا، اگر میرے نصیب میں اولاد ہے تو مجھے مل جائے گی۔

اسی طرح جو انسان غلطی کرتا ہے تو تقدیر کو دیکھتے ہوئے دعا یا مدد طلب کرنا یا توکل چھوڑ دیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اسباب ترک کرنا خاص الخاص لوگوں کے مقامات سے ہے، ایسے سب لوگ جاہل اور گمراہ ہیں، اس کی دلیل یہ فرمانِ نبوی ہے:

''طاقت ور مومن کمزور مومن سے زیادہ بہتر ہے۔ اور دونوں ہی میں بہتری موجود ہے۔ جو تجھے فائدہ دے اس کی آرزو رکھ۔ اللہ سے مدد طلب کر اور عاجز نہ آ۔ اگر تجھے کوئی مصیبت آئے تو یہ نہ کہہ: اگر میں ایسا کرتا تو ایسا ویسا ہو جاتا، لیکن یہ کہہ: اللہ تعالیٰ نے جو مقدر کیا اور چاہا وہ ہو گیا۔ لفظ اگر شیطان کے عمل کو کھول دیتا ہے۔''[1]

اس حدیث میں آپ ﷺ نے مفید کام کے حصول کے لیے آرزو مند اور حریص ہونے اور اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنے کا حکم دیا اور عجز وکسل مندی سے منع کیا جو تقدیر پر بھروسے سے عبارت ہے۔ پھر فرمایا کہ اگر بندے کو کسی نقصان کا سامنا کرنا پڑے تو اس پر مایوس نہیں ہونا چاہیے، بلکہ تقدیر میں دیکھ کر معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دینا چاہیے، کیوں کہ یہاں اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ بعض دانش وروں کا کہنا ہے کہ امور دو طرح کے ہوتے ہیں: ایک وہ جن میں کوئی تدبیر کی جا سکے اور دوسرے وہ جن میں تدبیر اور چارہ گری ممکن نہیں ہوتی۔ جس میں تدبیر کرنا ممکن ہو اس میں سستی نہیں کرنی چاہیے اور جس میں حیلہ گری ممکن نہ ہو اس میں رونا دھونا نہیں چاہیے۔

سنن ابی داود میں ہے:

''دو آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس اپنا جھگڑا لے کر آئے۔ آپ نے ایک کے حق میں فیصلہ دے دیا تو دوسرے نے کہا: ''حسبنا الله ونعم الوكيل'' آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ عجز اور کسل مندی پر ملامت کرتا ہے، لیکن تجھے ہوشیاری سے کام لینا چاہیے۔ اگر تجھ پر معاملہ غالب آ جائے تو پھر کہہ: ((حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ))''[2]

دوسری حدیث میں ہے:

((اَلْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ، وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ، وَالْعَاجِزُ مَنِ أَتْبَعَ نَفْسَهُ هَوَاهَا، وَتَمَنّٰى عَلَى اللّٰهِ الْأَمَانِيَّ))[3] (رواه ابن ماجه والترمذي وقال حديث حسن)

''دانا اور ہوشیار وہ ہے جو اپنے نفس کو اپنا مطیع کر لیتا ہے اور آخرت کے لیے عمل کرتا ہے۔ اور عاجز وہ ہے جو اپنے نفس کی خواہش کے پیچھے پیچھے چلتا ہے اور اپنے آپ کو تمناؤں سے بہلاتا رہتا ہے۔''

عن شداد بن أوس قال: قال رسول الله ﷺ: ((اَلْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ، وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٦٤)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٢٧) ضعيف الجامع (١٧٥٩)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٥٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٦٠) یہ روایت ''ابوبکر بن ابی مریم'' کی وجہ سے ضعیف ہے۔

الْمَوْتِ، وَالْعَاجِزُ مَنِ اتَّبَعَ نَفْسَهُ هَوَاهَا، وَتَمَنّٰى عَلَى اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ » [1]

کچھ لوگ اس حدیث میں لفظ عاجز کو فاجر سے بدل کر پڑھتے ہیں، لیکن یہ صحیح نہیں۔ صحیح عاجز ہی ہے جو کیّس (دانا) کا متضاد ہے۔ ایک دوسری حدیث سے بھی اس کی وضاحت ہوتی ہے، جس میں ہے:

« كُلُّ شَيْئٍ بِقَدَرٍ حَتّٰى الْعَجْزُ وَالْكَيْسُ » [2]

''ہر چیز تقدیر کے ساتھ ہے، حتی کہ حماقت اور فراست بھی۔''

یہاں اکثر لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مکتوب (نوشتہ تقدیر) نے لامحالہ وقوع پذیر ہو کر رہنا ہے تو اگر بندہ عمل نہ کرے تو کیا مکتوب تبدیل ہو جائے گا؟

یہ سوال مقتول کے مسئلے میں بھی اٹھایا جاتا ہے کہ اگر وہ اس کو قتل نہ کرتا تو کیا پھر بھی اس نے مرنا ہی تھا؟

اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اگر یہ انسان اچھے عمل نہ کرتا تو نیک بخت نہ ہوتا اور دوسرا اگر برے اعمال نہ کرتا تو بد بخت نہ ہوتا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے یہ کہا جائے کہ جو ہوا، جو ہوتا ہے، جو نہیں ہوتا، اگر ہوتا تو کس طرح ہوتا، اس سب کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ یہ اس چیز کی خبر اور علم کے باب سے ہے جو نہیں ہوتی۔ اگر ہوتی تو کس طرح ہوتی، جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿ لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ﴾ [الأنبياء: ٢٢]

''اگر ان دونوں میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہوتے تو وہ دونوں ضرور بگڑ جاتے۔''

﴿ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ ﴾ [الأنعام: ٢٨]

''اور اگر انھیں واپس بھیج دیا جائے تو ضرور پھر وہی کریں گے جس سے انھیں منع کیا گیا تھا۔''

﴿ لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا ﴾ [التوبة: ٤٧]

''اگر وہ تم میں نکلتے تو خرابی کے سوا تم میں کسی چیز کا اضافہ نہ کرتے۔''

﴿ وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ﴾ [الأنفال: ٢٣]

''اور اگر اللہ ان میں کوئی بھلائی جانتا تو انھیں ضرور سنوا دیتا۔''

اس طرح کی دیگر آیات۔ اسی طرح یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ قبر میں جب بندے کے لیے جنت یا جہنم کا دروازہ کھولا جاتا ہے تو اس سے کہا جاتا ہے:

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٥٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٦٠)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٥٥)

''یہ ٹھکانا ہے، اگر تو فلاں فلاں عمل کرتا تو اللہ اس کے بدلے تجھے کوئی دوسرا ٹھکانا دیتا۔''

اسی طرح یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر اس انسان کو یہ انسان قتل نہ کرتا تو یہ نہ مرتا، بلکہ زندہ رہتا، اِلا یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کی موت کا دوسرا سبب مقرر کر دیتا۔ اس جملے کا لازم معلوم اور مقدر واقعاتی صورت حال کے خلاف ہے۔ ممتنع کا لازم بھی کبھی ممتنع حکم ہوتا ہے اور اس میں کوئی رکاوٹ اور قابلِ احتراز چیز نہیں۔

اسی مسئلے کے مشابہ یہ واقعہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بدر کے دن اپنے صحابہ کو مشرکوں کے قتل ہو کر گرنے کی جگہ کے بارے میں بتایا اور فرمایا:

''یہاں فلاں مرے گا، یہاں فلاں مرے گا، پھر آپ چھپر میں داخل ہو گئے اور بڑی شد و مد سے دعا میں مصروف ہو گئے، آپ ﷺ کہہ رہے تھے: «اَللّٰهُمَّ أَنْجِزْ لِيْ مَا وَعَدْتَنِيْ» ''اے اللہ! تو نے جو مجھ سے وعدہ کیا ہے اسے پورا کر!''[1]

کیوں کہ آپ ﷺ کو علم تھا کہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کی نصرت کرے گا، لیکن یہ علم نصرت حاصل کرنے کے سبب کو اختیار کرنے میں مانع نہیں ہوا اور وہ سبب اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنا تھا۔

یہاں بعض لوگ غلطی کھا جاتے ہیں اور گمان کر بیٹھتے ہیں کہ وہ دعا جس کے مضمون ومطلوب کے وقوع کا علم ہو جیسے سورت بقرہ کے آخر میں وارد ہونے والی دعا، وہ محض عبادت کے لیے مشروع ہے۔ یہ اسی طرح کی بات ہے جس طرح کچھ لوگ کہتے ہیں کہ دعا صرف عبادت ہے، کیوں کہ مقدور اور نوشتہ تقدیر واقع ہو کر رہے گا، خواہ کوئی دعا کرے یا نہ کرے۔ ان لوگوں سے کہا جائے گا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے کسی مطلوب کو حاصل کرنے کے لیے دعا کو سبب مقدر اور مقرر کیا ہے تو وہ دعا کے بغیر کس طرح رونما ہوسکتا ہے؟ یہ تو اس طرح کی بات ہے جو صحابہ نے کہی تھی: ''تو کیا ہم نوشتہ تقدیر پر اعتماد کر کے عمل کرنا چھوڑ نہ دیں؟'' (لیکن آپ ﷺ نے ان کو اس سے منع فرمایا اور عمل کرنے کا حکم دیا)

اس کی مزید وضاحت اس سے بھی ہو گی کہ اللہ تعالیٰ کو علم ہے اور اس نے لکھا ہے کہ وہ مخلوق پیدا کرے گا، ان کو رزق دے گا، ان کو مارے گا اور زندہ کرے گا۔ تو کیا یہ گمان کرنا صحیح ہو گا کہ علم اور نوشتہ تقدیر کا پہلے ہونا اس کائنات کو اس کی تخلیق، قدرت اور مشیت سے بے نیاز کرنے والا ہے؟!

اسی طرح بندوں کے افعال کے بارے میں بھی اس کا علم ہے کہ ان کو کر کے وہ نیک بخت ہوں گے یا بدبخت، یا جس طرح وہ مثال کے طور پر یہ جانتا ہے کہ فلاں آدمی زہر پی کر یا اپنے آپ کو زخمی کر کے یا اس طرح کا کوئی اور کام کر کے موت کے منہ میں چلا جائے گا یا بیمار ہو جائے گا۔

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۷۶۳)

یہ مذہب جو ہم نے ذکر کیا ہے سلف صالحین، ائمہ امت اور جمہور فقہا، محدثین، صوفیہ اور متکلمین کا مذہب ہے۔ اس میں غالی قدریہ نے اختلاف کیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ علم کا پہلے ہونا، امر و نہی میں مانع ہے، پھر اس میں ان کے دو گروہ بن گئے: ایک گروہ نے امر و نہی اور سزا و جزا کا اقرار تو کیا، لیکن انھوں نے اللہ تعالیٰ کے علم، قضا و قدر اور نوشتہ تقدیر کا امر و نہی اور سزا و جزا سے پہلے ہونے کا انکار کیا۔

یہ گروہ صحابہ کے زمانے کے آخری ایام میں ظاہر ہوا۔ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان کی بدعت کے بارے میں سنا تو انھوں نے ان سے براءت کا اظہار کیا۔ انھوں نے بھی ان سے براءت کا اظہار کیا۔ حضرت عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، جابر بن عبداللہ اور واثلہ بن اصقع رضی اللہ عنہم وغیرہ نے ان کی تردید کی۔ امام مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ نے ان کے کافر ہونے کا فتویٰ دیا جو اللہ تعالیٰ کے قدیم علم کا انکار کرتے ہیں۔

دوسرے گروہ میں کچھ اللہ تعالیٰ کے علم اور کتابت (نوشتہ تقدیر) کے قدیم ہونے کا اقرار کرتے ہیں، لیکن وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ امر و نہی اور عمل سے بے نیاز کرتا ہے، عمل کی کوئی ضرورت نہیں رہتی، بلکہ جس کے مقدر میں نیک بختی ہے وہ اصلاً عمل کے بغیر جنت میں داخل ہو جائے گا اور جس کے نصیب میں بدبختی ہے وہ بلا عمل ہی بدبخت ہے۔ یہ کوئی نظریاتی گروہ نہیں، بلکہ جاہلوں کا ایک ٹولہ ہے جو اس بات کا قائل ہے اور یہ ان سے بڑے کافر اور زیادہ گمراہ ہیں۔

ان لوگوں کے نظریے کا لبِ لباب امر و نہی، حلال و حرام اور وعد و وعید کو بے کار اور کالعدم قرار دینا ہے۔ یہ یہود و نصاریٰ سے بھی بہت بڑھ کر کافر ہیں اور سائل نے انھی کے نظریے کے بارے میں پوچھا ہے۔ جمہور قدریہ قدیم علم اور پہلے سے لکھی ہوئی تقدیر کا اقرار کرتے ہیں، لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کے افعال کا خالق ہونے اور موجودات کا ارادہ کرنے کا انکار کرتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں جبر کے قائل لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ بندے کی کوئی قدرت اور حقیقی ارادہ نہیں اور نہ وہ حقیقت میں فاعل ہے۔ یہ سب بدعتی گمراہ لوگ ہیں۔ ان سب سے برے وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے بندوں کے افعال کو پیدا کرنے اور کائنات کا ارادہ کرنے کو امر و نہی میں رکاوٹ قرار دیتے ہیں۔ یہ ان مشرکوں کی طرح ہیں جو کہتے تھے:

﴿ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ﴾ [الأنعام: ١٤٨]

”اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شریک بناتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کوئی چیز حرام ٹھہراتے۔“

یہ یہود و نصاریٰ سے بھی بڑے کافر ہیں۔ ان کے نظریے کا خلاصہ انبیا کے پیش کردہ امر و نہی پر مشتمل تمام احکام کو معطل قرار دینا ہے۔ ان کا یہ نظریہ متضاد ہے اور اس کا فاسد ہونا بالبداہت معلوم ہے، جو کسی دلیل کا محتاج

نہیں۔ اس کو اختیار کر کے لوگوں کے لیے زندہ رہنا ممکن نہیں، کیوں کہ اس کا لازمی نتیجہ فساد اور بربادی ہے۔ اگر بندے امر و نہی سے آزاد ہو جائیں تو جس کا جو دل چاہے کرتا پھرے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ ﴾ [المؤمنون: ۷۱]

''اور اگر حق ان کی خواہشوں کے پیچھے چلے تو یقیناً سب آسمان اور زمین اور جو کوئی ان میں ہے، بگڑ جائیں۔''

اگر کہا جائے: ہر ایک کے لیے لوگوں کو قتل کرنا، بدکاری کرنا، مال لوٹنا اور جو جی میں آئے کرنا ممکن اور درست ہے تو یہ بات بے پناہ فساد پر مبنی ہوگی، کیوں کہ آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے کوئی گروہ اور امت بھی امر و نہی پر مشتمل کسی نہ کسی طرح کے قانون اور شریعت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی، خواہ بادشاہوں کا بنایا ہوا فاسد قانون ہی کیوں نہ ہو۔

اگر کہا جائے: یہ جو آپ نے ذکر کیا ہے کہ بندے کے نیک بخت یا بد بخت ہونے یا دیگر امور کا اللہ تعالیٰ کو پہلے سے علم ہونا اور ان کو لکھ لینا ان کے ان اعمال اور اسباب پر موقوف ہونے میں مانع نہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ مشروط و مربوط کیا ہوا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ پہلے سے لکھا ہونا بندے کے لیے اس نیک عمل میں رکاوٹ نہیں جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ اس کو نیک بخت بنائے گا اور نہ یہ اس کے اس عمل پر قادر ہونے اور اس کا ارادہ کرنے ہی میں کوئی اڑچن ہے، اگرچہ یہ سب اللہ تعالیٰ کے بندے کے لیے آسان کرنے اور توفیق دینے کے نتیجے میں ہے۔ گو لوگوں کا اس کو جبر کہنے میں اختلاف ہے، لیکن کیا بندہ اس فعل کے علاوہ بھی جو اس نے پہلے سے اللہ کے علم میں ہونے اور نوشتہ تقدیر ہونے کی وجہ سے کیا، کوئی دوسرا فعل بھی کر سکتا ہے؟ اس میں لوگوں کا اختلاف ہے، جس طرح اس بات میں اختلاف ہے کہ کیا استطاعت (کام کرنے کی قوت) فعل کے ساتھ ہونی چاہیے یا اس سے پہلے ہونی چاہیے؟ صفات کا اثبات کرنے والوں میں سے جس نے کہا ہے کہ استطاعت فعل کے ساتھ ہی ہوتی ہے، وہ کہتا ہے کہ بندہ جو کرتا ہے اس کے علاوہ کسی دوسرے فعل کی استطاعت نہیں رکھتا، جو پہلے سے علم اور نوشتہ تقدیر میں ہے۔ جو یہ کہتا ہے کہ استطاعت فعل سے پہلے ہو سکتی ہے اور فعل کے بغیر بھی ہو سکتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ بندے نے جو نہیں کیا وہ اس کی استطاعت رکھتا ہے، لیکن علمِ الٰہی اور نوشتہ تقدیر میں یہ ہے کہ وہ اس کام کو نہیں کرے گا۔

استطاعت کی اقسام:

استطاعت کے مسئلے میں فیصلہ کن بات یہ ہے کہ قرآن کریم میں اس کی دو انواع ذکر ہوئی ہیں:

ایک استطاعت وہ ہے جو فعل کے لیے شرط ہے اور اسی پر امر و نہی کا دار و مدار ہے، جس طرح درج ذیل آیات میں ذکر ہوا ہے:

﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا﴾ [آل عمران: ٩٧]

''اور اللہ کے لیے لوگوں پر اس گھر کا حج (فرض) ہے، جو اس کی طرف راستے کی طاقت رکھے۔''

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ [التغابن: ١٦] ''سو اللہ سے ڈرو جتنی طاقت رکھو۔''

﴿وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ﴾ [النساء: ٢٥]

''اور تم میں سے جو مالی لحاظ سے طاقت نہ رکھے کہ آزاد مومن عورتوں سے نکاح کرے۔''

﴿فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا﴾ [المجادلة: ٤]

''پھر جو شخص نہ پائے تو دو پے در پے مہینوں کا روزہ رکھنا ہے، اس سے پہلے کہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں، پھر جو اس کی (بھی) طاقت نہ رکھے تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔''

﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ﴾ [البقرة: ١٨٤]

''اور جو لوگ اس کی طاقت رکھتے ہوں ان پر فدیہ ایک مسکین کا کھانا ہے۔''

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے کہا:

«صَلِّ قَائِماً، فَإِنْ لَّمْ تَسْتَطِعْ فَقَاعِداً، فَإِنْ لَّمْ تَسْتَطِعْ فَعَلٰى جَنْبٍ»[1]

''کھڑے ہو کر نماز پڑھ، اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو بیٹھ کر اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو پہلو کے بل۔''

ان نصوص میں استطاعت اگر فعل کے ساتھ ہی پائی جاتی تو لازم آتا کہ حج اسی پر فرض ہے جس نے حج کر لیا۔ دو مہینوں کے روزے اسی پر فرض ہیں جس نے روزے رکھ لیے۔ نماز میں قیام اسی کے لیے ہے جس نے قیام کر لیا اور روزے کی آیت کا یہ معنی ہوتا کہ جو رمضان کے روزے رکھتے ہیں، ان پر ایک مسکین کا کھانا کھلانا بھی فرض ہے، جب کہ یہ آیت اس وجہ سے نازل ہوئی تھی، جب انھیں رمضان کے مہینے میں روزہ رکھنے اور کھانا کھلانے میں اختیار دیا گیا تھا۔

وہ استطاعت جو فعل کے ساتھ ہوتی ہے، کہا جا سکتا ہے کہ یہی فعل کے ساتھ ملی ہوئی ہے اور اس کو لازم قرار دیتی ہے۔ یہ دوسری قسم ہے، اس میں انھوں نے یہ آیات ذکر کی ہیں:

﴿الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا﴾ [الكهف: ١٠١]

''وہ لوگ کہ ان کی آنکھیں میرے ذکر سے پردے میں تھیں اور وہ سن ہی نہ سکتے تھے۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٦٦)

اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان:

﴿ يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ ۝ ﴾ [ھود: ۲۰]

''ان کے لیے عذاب دگنا کیا جائے گا۔ وہ نہ سننے کی طاقت رکھتے اور نہ دیکھا کرتے تھے۔''

﴿ اِنَّا جَعَلْنَا فِيْۤ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ۝ وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۝ ﴾ [یٰسٓ: ۸، ۹]

''بے شک ہم نے ان کی گردنوں میں کئی طوق ڈال دیے ہیں، پس وہ ٹھوڑیوں تک ہیں، سو ان کے سر اوپر کو اٹھا دیے ہوئے ہیں اور ہم نے ان کے آگے سے ایک دیوار کر دی اور ان کے پیچھے سے ایک دیوار، پھر ہم نے انھیں ڈھانپ دیا تو وہ نہیں دیکھتے۔''

اس لیے کہ یہاں جس استطاعت کی نفی کی گئی ہے، خواہ اس کی نفی ابتدا ہے یا خبر کے طور پر، یہ وہ استطاعت نہیں جو امر و نہی کے لیے شرط ہے۔ اگر یہ غیر موجود اور زائل ہو جائے تو امر و نہی، وعد و وعید، تعریف و مذمت اور سزا و جزا بھی منتفی اور زائل ہو جاتی ہے۔

اور یہ بات جانی بوجھی ہے کہ وہ لوگ اس حالت میں (جس کا ان آیات میں ذکر ہوا ہے) مامور ہیں، نہی کے مخاطب ہیں، انھیں جنت کی خوش خبری دی جاتی ہے اور جہنم سے ڈرایا جاتا ہے تو معلوم ہوا یہاں جس استطاعت کی نفی کی گئی ہے، یہ وہ استطاعت نہیں جو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان:

﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ [التغابن: ١٦] ''سو اللہ سے ڈرو جتنی طاقت رکھو۔''

میں امر و نہی کے لیے بطور شرط مذکور ہے۔

ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس مقام پر استطاعت سے مراد اس طرح کی استطاعت ہے جس کی حضرت خضر علیہ السلام کے اس قول میں نفی کی گئی ہے جو انھوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا:

﴿ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴾ [الکھف: ٦٧] ''بے شک تو میرے ساتھ ہرگز صبر نہ کر سکے گا۔''

اگر اس میں نفی کی گئی استطاعت سے صرف فاعل (کرنے والے) اور تارک (چھوڑنے والے) کے درمیان تقابل کرنا مراد ہوتا تو ان مومنوں اور مذکورہ بالا آیات میں ذکر کردہ مذموم لوگوں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے درمیان کوئی فرق نہ ہوتا۔

ہر ایک شخص جس نے کوئی فعل کیا یا نہیں کیا اس کے فعل سے پہلے تقابل موجود نہیں ہوتا، قرآن دلالت کرتا ہے کہ اس استطاعت کی تارک سے نفی کی گئی ہے فاعل سے نہیں تو معلوم ہوا یہ ان رکاوٹوں کے متضاد ہے جو بندے

کے دل کو فعل کا ارادہ اور اس پر عمل کرنے سے روکتی ہے۔ بہر حال جس کے نصیب میں لکھا ہوا ہے کہ وہ یہ فعل نہیں کرے گا، اس کے حق میں یہ استطاعت زائل اور منتفی ہے۔

یہ تقسیم جان لینے کے بعد مطلقاً کہنا کہ بندہ جو کرتا ہے اس کے علاوہ کسی کام کی استطاعت نہیں رکھتا اور معلوم و مقدر کے خلاف کچھ کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا اور یہ مطلقاً کہنا کہ فاعل اور تارک کی استطاعت ایک جیسی ہے، فاعل کو تارک سے کوئی خصوصی استطاعت حاصل نہیں، یہ دونوں مطلق باتیں غلط اور بدعت ہیں۔

اسی لیے سلف صالحین، ائمہ امت اور متکلمین کے جمہور گروہوں کا اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ جس چیز کے بارے میں جانتا ہے اور اس نے اس کے بارے میں بتایا بھی ہے کہ وہ نہیں ہوگی وہ اس کو کرنے پر قادر ہے اور اس بات پر بھی ان سب کا اتفاق ہے کہ اگر وہ اس چیز کے صادر ہونے کا ارادہ نہ کرے تو وہ اس کی اس پر قدرت نہ ہونے کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس کا ارادہ نہ کرنے کی وجہ سے صادر نہیں ہوتی۔ جہمیہ، قدریہ اور صابی فلاسفہ جیسے گمراہ لوگوں نے اس کی مخالفت کی ہے۔ ان کا گمان ہے کہ مقدور، موجود میں محصور ہے (جو وجود میں آ گیا ہے وہی اس کی قدرت میں ہے جو وجود میں نہیں آیا وہ نہیں۔) وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کو اسی تک محدود کرتے ہیں جس کو اس نے چاہا اور جس کے وجود کا اس کو علم تھا، لیکن جس کے بارے میں اس نے بتایا ہے کہ وہ نہیں ہوگا تو وہ اس پر قدرت نہیں رکھتا۔ اس قول کو نظام اور اسواری نے راجح قرار دیا ہے۔ اسی طرح جو سمجھتا ہے کہ اس جہاں کے سوا اور کچھ اس کی مقدور میں نہیں اور نہ کوئی ایسی چیز مقدور ہے جس کے ذریعے گمراہ کو ہدایت دینا ممکن ہوتا ہے، وہ بھی نظام کے نظریے کا قائل ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ۝ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ۝ ﴾ [القيامة: ٣، ٤]

”کیا انسان گمان کرتا ہے کہ بے شک ہم کبھی اس کی ہڈیاں اکٹھی نہیں کریں گے۔ کیوں نہیں! (ہم انھیں اکٹھا کریں گے) اس حال میں کہ ہم قادر ہیں کہ اس (کی انگلیوں) کے پورے درست کر (کے بنا) دیں۔“

باوجودیکہ وہ اس کے پوروں کو برابر نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ﴾ [الأنعام: ٦٥]

”کہہ دے وہی اس پر قادر ہے کہ تم پر تمھارے اوپر سے عذاب بھیج دے، یا تمھارے پاؤں کے نیچے سے، یا تمھیں مختلف گروہ بنا کر گتھم گتھا کر دے اور تمھارے بعض کو بعض کی لڑائی (کا مزہ) چکھائے۔“

”حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت: ﴿ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا

﴿ مِّنۡ فَوۡقِكُمۡ ﴾ [الأنعام: ٦٥] نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «أَعُوذُ بِوَجْهِكَ» ''میں تیرے چہرے کی پناہ میں آتا ہوں۔'' ﴿ اَوۡ مِنۡ تَحۡتِ اَرۡجُلِكُمۡ ﴾ پھر فرمایا: ''میں تیرے چہرے کی پناہ میں آتا ہوں۔'' ﴿ اَوۡ يَلۡبِسَكُمۡ شِيَعًا وَّيُذِيۡقَ بَعۡضَكُمۡ بَاۡسَ بَعۡضٍ ﴾ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ دونوں عذاب پہلے دونوں عذابوں سے ہلکے ہیں۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَلَوۡ شِئۡنَا لَاٰتَيۡنَا كُلَّ نَفۡسٍ هُدٰٮهَا ﴾ [السجدة: ١٣]

''اور اگر ہم چاہتے تو ہم ہر نفس کو اس کی ہدایت دے دیتے۔''

جس متکلم نے اہلِ سنت والجماعت سے یہ نقل کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ بندہ جو کرتا ہے اس کے علاوہ کسی دوسرے فعل پر قادر نہیں جو خلافِ معلوم ہے تو وہ ان سے قدرت کی مطلقاً نفی کو نقل کرنے میں غلط ہے اور اس قدرت کی نفی کو ان سے نقل کرنے میں درست ہے جو فاعل کے ساتھ مختص ہوتی ہے، تارکِ فعل کے ساتھ نہیں۔ یہ تکلیف مالا یطاق کے جواز میں ان کے اختلاف کی بنیاد ہے۔۔ جو کہتا ہے کہ استطاعت فعل کے ساتھ ہی وجود رکھتی ہے پہلے نہیں تو تارکِ فعل کی استطاعت کسی صورت نہیں ہو گی، اس کے نزدیک ہر وہ انسان جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو ایسے کام کا مکلّف بناتا ہے جس کی وہ طاقت ہی نہیں رکھتا، اسی طرح یہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں: تمام بندوں کو ان کاموں کا مکلّف بنایا گیا ہے، جس کی وہ طاقت ہی نہیں رکھتے۔ کچھ کہتے ہیں: کرنے کی استطاعت ہی نہ کرنے کی استطاعت ہے، یعنی فعل کی استطاعت میں ترکِ فعل کی استطاعت ہے۔ بندوں کو انھی کاموں کا مکلّف بنایا گیا ہے جن کی طاقت، قدرت اور استطاعت میں وہ سب برابر ہیں۔ فاعل کو کسی مخصوص استطاعت کے ساتھ خاص نہیں کیا جا سکتا جو تارک میں نہ ہو۔ تو مطلقاً یہ کہنا کہ بندہ اس کا مکلّف بنایا گیا ہے جس کی طاقت نہیں رکھتا ایسے ہی ہے جس طرح مطلقاً یہ کہا جائے کہ وہ اپنے افعال میں مجبور ہے، کیوں کہ مامور (جس کام کا حکم دیا جائے) میں قدرت کی نفی کرنا ممنوع میں، جبر کا اثبات کرنے کے مانند ہی ہے، چنانچہ مطلقاً کہنا کہ بندہ قادر اور استطاعت رکھنے والا ہے، یہ بات اللہ تعالیٰ کے علم اور تقدیر کے خلاف ہے۔

سلف صالحین اور ائمہ امت ان تمام اطلاقات کو اچھا نہیں سمجھتے، بالخصوص جب نفی اور اثبات دونوں اطراف میں سے ہر ایک طرف باطل پر استوار ہو، اگرچہ ان میں یک گونہ حق ہو، وہی عبارتیں مطلق کہنی چاہییں جو اچھی ہوں اور نصوص میں منقول ہوں، جو مجمل اور مشتبہ عبارتیں ہوں ان کی تفصیل بیان کرنی چاہیے۔ اسی طرح اصولِ دین اور

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٨٨٣)

عقیدے کے تمام ابواب و مسائل میں جو مسئلہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے کلام اور صحابہ کرام کے اجماع سے ثابت ہو، اسی کو محکم اور واضح نص قرار دیا جائے۔ ایسی نئی عبارتیں جن میں نفی اور اثبات کا مقابلتاً ذکر ہو اور دونوں اطراف میں سے ہر طرف حق اور باطل کا احتمال رکھتی ہو، ان کو مجمل اور مشتبہ قرار دینا چاہیے جو اس بات کی محتاج ہوں کہ اگر نفی و اثبات کے دونوں اطراف کو مطلقاً بیان کیا جائے تو ممنوع احتمال کی تفصیل ذکر کی جائے۔

ہم نے کسی دوسری جگہ جبر کو مطلقاً بولنے اور اس کی نفی کرنے کی کراہت کے بارے میں امام اوزاعی، سفیان ثوری، عبدالرحمان بن مہدی اور احمد بن حنبل اور دیگر ائمہ رحمہم اللہ کے اقوال لکھے ہیں۔

تکلیف مالا یطاق میں سلف کا موقف:

اسی طرح ائمہ کرام نے تکلیف مالا یطاق (اس کام کا مکلّف اور پابند بنانا جو طاقت سے باہر ہو) کی کسی ایک طرف کو بھی مطلقاً ذکر نہیں کیا۔ امام خلال کے شاگرد ابوبکر بن عبد العزیز نے "کتاب المقنع" کے مقدمے، "کتاب القدر" میں لکھا ہے: اس مسئلے میں ہم تک ابوعبداللہ کا کوئی قول نہیں پہنچا جس کی ہم پیروی کر سکیں۔ اس میں لوگوں کا اختلاف ہے، کچھ تکلیف مالا یطاق کے قائل ہیں، کچھ اس کی نفی کرتے ہیں۔ اس مسئلے میں ہمارے موقف کی صحت کی شہادت قرآن کریم دیتا ہے اور وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ان کاموں کے ساتھ جن کی طاقت رکھتی ہے اور جن کی طاقت نہیں رکھتی، اس کی بندگی میں لگی رہتی ہے۔ پھر اس نے فصل کے آخر میں کہا: شاید کوئی قائل ہماری بات پر اعتراض کرے کہ اگر یہ جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کو اس کا مکلّف بناتا ہے جس کی وہ طاقت نہیں رکھتا تو پھر یہ بھی درست ہو گا کہ وہ اندھے کو رنگ سازی کا مکلّف بنا دے، جو چلنے کی طاقت نہیں رکھتا اس کو چلنے کا حکم دے، جس کا ہاتھ نہیں اس کو پکڑنے کا حکم دے۔ اس کو جواب دیا جائے گا: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت:

﴿ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ﴾ [بني إسرائيل: ٩٧]

''اور قیامت کے دن ہم انھیں ان کے چہروں کے بل اٹھائیں گے۔''

کی تفسیر میں کہا ہے کہ وہ اپنے چہروں کے بل چلیں گے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے اس جواب کے ساتھ ان کے سارے سوالات ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد اس نے کہا: ابو الحسن اشعری نے اس مسئلے کی تفصیل بیان کر دی ہے جو ہم نے پہلے ذکر کی ہے اور وہ کافی ہے۔ ابو الحسن اشعری نے بیان کیا ہے کہ بندہ جس فعل کو کرنے کی قدرت رکھتا ہے اور وہ بذاتہ مستحیل نہیں تو اس کا مکلّف بنانا درست ہے اور جو فعل مستحیل ہو اس کا مکلّف بنانا درست نہیں۔ ابو الحسن اشعری کے اس قول کے بارے میں قاضی ابو یعلیٰ نے کہا: ''ابو الحسن اشعری کے کلام کا ظاہر مفہوم یہی ہے کہ جس فعل کا وجود مستحیل ہو، اس کا مکلّف بنانا صحیح ہے کہ نہیں؟ پھر کہا: اور صحیح بات وہی ہے جس کی تفصیل ہم نے

بیان کی ہے، یعنی جو فعل مستحیل ہو اور وہ اس کو کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو، جیسے کسی محال کام کا حکم دینا، دو متضاد چیزوں کو یکجا کرنا، حادث کو قدیم اور قدیم کو حادث بنانا یا وہ ایسا کام ہو جس کو وہ اپنی کمزوری کی وجہ سے ادا کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو، جیسے اپاہج جو کھڑا ہونے کی طاقت نہیں رکھتا، گونگا جو بات کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اس پہلو کے اعتبار سے تکلیف درست نہیں۔

دوسرا پہلو: وہ فعل جس کو مستحیل ہونے یا اس کی صلاحیت نہ ہونے کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس کو ترک کر دینے اور اس کے مقابلے میں کسی دوسرے فعل میں مشغول ہونے کی وجہ سے اس کی طاقت نہ رکھے، جس طرح کافر جس کو اللہ تعالیٰ نے اس کے کفر کی حالت میں ایمان لانے کا مکلّف بنایا ہے، کیوں کہ یہ کام نہ تو اس کے لیے مستحیل ہے اور نہ یہ بات ہی ہے کہ وہ اس کو کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ یہ اس انسان کی طرح ہے جو کاروبار میں مصروف ہونے کی وجہ سے علم حاصل کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ یہ قول جو قاضی ابو یعلیٰ نے ذکر کیا ہے یہ جمہور فقہائے متکلمین اور امام احمد رحمہ اللہ کے جمہور اصحاب کا قول ہے۔

قاضی ابو یعلیٰ نے اس کو امام اشعری کے حوالے سے نقل کیا ہے اور انھوں نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ ابوبکر عبدالعزیز نے بھی اس مسئلے میں اشعری کا کلام نقل کیا ہے، مصنف نے ان کے ساتھ اتفاق رکھنے والوں اور ان کے شاگردوں کا قول بھی ذکر کیا ہے، کیوں کہ وہ امام احمد اور دیگر ائمہ سنت کی طرف منسوب متکلمین میں سے تھے اور انھوں نے اپنی کتابوں میں اس کا ذکر بھی کیا ہے۔

ابو الحسن اشعری کے پیروکاروں میں سے کچھ تو اسی بات سے اتفاق رکھتے ہیں جو قاضی ابو یعلیٰ نے ذکر کی ہے، ان میں ابو علی بن شاذان اور اس کے پیروکار شامل ہیں اور کچھ نے اس کی مخالفت کی ہے، ان میں ابو محمد اللبان، رازی اور کچھ گروہ ہیں، ان کا قول ہے: ممتنع محال کا مکلّف بنانا درست ہے، جیسے: دو متضاد چیزوں کو یکجا کرنے کا مکلّف بنانا، جس کی صلاحیت ہی نہ ہو اس کا مکلّف بنانا۔

ابوبکر عبدالعزیز نے تیسرا قول یہ ذکر کیا ہے کہ ہر ممکن فعل کا مکلّف بنانا درست ہے، اگرچہ وہ انسانی عادت میں ممتنع ہو، جیسے چہروں کے بل چلنا اور اندھے کا مصحف پر نقطے لگانا۔

حنابلہ کے اقوال:

قاضی ابو یعلیٰ کے استاذ ابو عبداللہ بن حامد نے اپنے ''اصول'' میں تفریق اور اطلاق کے اقوال امام احمد رحمہ اللہ کے اصحاب سے ذکر کیے ہیں، وہ کہتے ہیں:

فصل:

کیوں کہ جو امر میں موجود ہو چاہے وہ سوچ میں پایا جائے، یہ حکم شریعت میں وارد نہیں ہوا، جیسے بچوں، بے عقلوں کو حکم دینا، اندھے کو دیکھنے کا حکم دینا، فقیر کو خرچ کرنے کا حکم دینا، دائمی مریض کو حج کرنے کے لیے مکے جانے کے لیے کہنا۔ یہ تمام احکام شریعت میں وارد نہیں ہوئے۔ اگر شریعت میں ان کا حکم آیا ہوتا تو اس پر ایمان رکھنا اور اس کی تصدیق کرنا لازم ہوتا۔ اس میں کلام کو مقید نہ کیا جاتا۔ وہ کہتے ہیں: ہمارے اصحاب کا ایک گروہ اس خیال کی طرف مائل ہے کہ دائمی مریض اور اندھے وغیرہ پر مطلق تکلیف مالا یطاق کا اطلاق کرنا درست ہے۔ یہ جہم اور برغوث کا مذہب ہے۔

دوسری وجہ: آلات اور اعضا کا صحیح سلامت ہونا، لیکن عدمِ توفیق کی وجہ سے طاقت نہ ہونا۔ یہ ایک صورت میں اس معنی میں جائز ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ وہ حکمِ الٰہی پر عمل نہیں کرے گا اس کو مکلّف بنانا جائز ہے، معتزلہ نے اس کا انکار کیا ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا ابلیس سے یہ کہنا ہے:

﴿ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ﴾ [صٓ: ۷۵]

''تجھے کس چیز نے روکا کہ تو اس کے لیے سجدہ کرے جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا؟''

اور کہنا:

﴿ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ﴾ [الأعراف: ۱۲]

''تجھے کس چیز نے روکا کہ تو سجدہ نہیں کرتا، جب میں نے تجھے حکم دیا؟''

اس نے ابلیس کو حکم دیا، حالانکہ اس کو پہلے سے علم تھا کہ وہ اس فعل کو نہیں کرے گا۔ تو حکم کا مخاطب یہ امر تھا کہ اللہ تعالیٰ کو پہلے سے علم تھا کہ وہ اس کی طاقت نہیں رکھتا۔

دوسرا قول: یہ بھی ابو الحسن سے منقول ہے۔ ابو المعالی جوینی کا خیال ہے کہ ابو الحسن کے اکثر جوابات اسی کی طرف میلان رکھتے ہیں اور اس کے بہت سارے دوستوں نے بھی اسی کو پسند کیا ہے۔ ابو الحسن نے موجز میں اس کے جواب سے توقف کیا ہے۔ ابو المعالی پہلے اسی کو اختیار کرتا تھا، پھر اس نے اس سے رجوع کیا اور یقین کے ساتھ کہنا شروع کر دیا کہ تکلیف مالا یطاق محال ہے۔ یہ پہلا قول ابن عقیل، ابو الفرج، ابن جوزی اور ابو عبداللہ رازی وغیرہ کا قول ہے اور یہ دوسرا قول ابو اسحاق اسفرائینی، ابو بکر بن فورک، ابو القاسم اشعری اور غزالی کا قول ہے۔ ابو اسحاق اسفرائینی نے دعویٰ کیا ہے کہ یہی اس کے استاذ ابو الحسن کا قول ہے اور یہی اہلِ حق کا مذہب ہے۔

قاضی ابو بکر نے اپنی کچھ کتابوں میں اس کے جواز کا قول اختیار کیا ہے، لیکن انھوں نے زیادہ تر عاجز کو مکلّف بنانے اور ترک کرنے والے قادر کو مکلّف بنانے کے درمیان فرق کیا ہے، جس طرح جمہور کا قول ہے۔

اس مسئلے میں تیسرا قول بھی ہے، جو ابوبکر عبدالعزیز نے ذکر کیا ہے کہ ہر ممکن امر کا مکلّف بنانا جائز ہے، اگرچہ عادتاً محال ہو، مثلاً چہرے کے بل چلنا اور نابینا کا مصحف پر نقطے لگانا عکس اس کے جو ممتنع اور محال ہو۔ اس مسئلے میں فیصلہ کن بات یہ ہے کہ اس میں نزاع دو بنیادوں پر قائم ہے: ایک وہ واقع ہونے والی تکلیف (شرعی پابندی) جس کے شریعت میں واقع ہونے پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کا تمام بندوں کو اپنے اوپر اور اپنے رسول پر ایمان لانے اور تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دینا ہے۔ کیا اس کو یا اس میں سے کسی چیز کو تکلیف مالایطاق کہا جا سکتا ہے؟ جو کہتے ہیں کہ قدرت فعل کے ساتھ ہی ہوتی ہے، پہلے نہیں۔ ان کے مطابق نافرمان کو اس حکم کا پابند بنایا گیا ہے جس کی وہ طاقت نہیں رکھتا۔

یہ بھی ان کا کہنا ہے کہ ہر ایک کو جب مکلّف بنایا گیا ہے اس وقت وہ اس کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ اسی طرح جو یہ خیال کرتے ہیں کہ کسی چیز کا پہلے سے اللہ تعالیٰ کے علم میں ہونا اور اس کا لکھا ہوا ہونا اس کے خلاف کسی کام کو مقدر کرنے سے مانع ہے، یہ کہتے ہیں: اگر وہ خلاف معلوم (جو اللہ کے علم میں ہے، اس کے خلاف) کا مکلّف ہو تو وہ اس کا مکلّف ہوگا جس کی طاقت نہیں رکھتا۔ اسی طرح جو کہتا ہے: عرض دو زمانوں میں باقی نہیں رہتا اس کے مطابق متقدم استطاعت فعل کے وقت تک باقی نہیں رہتی۔

درحقیقت یہ ان افعال میں نزاع نہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور جن سے منع کیا ہے کہ یہ افعال تکلیف کے دائرے میں آتے ہیں یا نہیں؟

نزاع اس امر میں ہے کہ جو بندہ ان افعال کو نہیں کرتا یہ اس کی قدرت میں نہیں اور ان کو کرنے سے پہلے اس کی طاقت میں نہیں۔ ہم نے پہلے بیان کیا ہے کہ قدرت کی دو انواع ہیں۔ جو شخص مطلق کہتا ہے کہ استطاعت فعل کے ساتھ ہی ہوتی ہے، اس کا یہ مطلق کہنا کتاب و سنت میں وارد نصوص اور سلف صالحین اور ائمہ امت سے منقول آثار کے خلاف ہے، جیسے: جبر کا مطلقاً اطلاق کرنا، اگرچہ امام احمد کی طرف منسوب بعض لوگوں اور ابو الحسن، ابو بکر بن عبدالعزیز، ابوعبداللہ بن حامد، قاضی ابوبکر، قاضی ابویعلیٰ، ابو المعالی، ابو الحسن بن زاغونی وغیرہ جیسے دیگر ائمہ اہلِ سنت نے قدریہ کی تردید میں اس کا اطلاق کیا ہے، لیکن ابو العباس بن سریج ابو العباس قلانسی وغیرہ جیسے جمہور علما نے اس اطلاق سے منع کیا ہے، امام ابوحنیفہ سے بھی یہی منقول ہے اور یہ تمام امت کے قول کا مقتضا ہے۔ اسی لیے ابو اسحاق بن شاقلا نے اس کے اطلاق سے منع کیا ہے اور اس میں دو اقوال نقل کیے ہیں: وہ کہتا ہے، قاضی ابویعلیٰ نے بھی اس

سے یہ بات نقل کی ہے، استطاعت فعل کے ساتھ ہے یا اس سے پہلے؟

ایک کی حجت یہ ہے کہ جو نماز، حج اور جہاد کی استطاعت نہیں رکھتا اس کو اس کا حکم دینا جائز نہیں۔ دوسرے کی حجت ہے کہ فعل بھی اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ چیزوں میں سے ایک چیز ہے۔ جب وہ بندے میں فعل پیدا کرتا ہے تو وہ اس کو کرتا ہے۔

یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی نے کہا: بندے کے پاس ایک ہی قدرت ہے جس کے ساتھ وہ فعل کی بھی قدرت رکھتا ہے اور ترکِ فعل کی بھی، وہ فعل کی صورت میں، یعنی کام کرنے کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی مدد سے بے نیاز ہے اور اس کے بغیر ہی اس کو کرتا ہے۔ اس کے نزدیک مومن پر اس کی نعمت میں، کافر، نیک اور بد سب برابر ہیں۔ جو یہ عقیدہ رکھتا ہے وہ باطل ہے۔ یہ عقیدہ رکھنے والے قدریہ ہیں اور جادہ سے ہٹے ہوئے۔ یہ کہتے تھے: بندے کو نیکی کرتے وقت نیکی سے پہلے اللہ تعالیٰ کی کوئی ضرورت نہیں، جو ایمان لاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کرتا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کی نعمت کفر کرنے والے کی نعمت سے بڑی نہیں، یہ نظریہ قطعاً غلط ہے، اس لیے اہلِ سنت والجماعت متفقہ طور پر ایسا نظریہ رکھنے والے کو گمراہ قرار دیتے ہیں۔ اس کے بعد ان امور میں ان کا نزاع زیادہ تر لفظی ہے اور کچھ اعتباری، مثلاً: ان کا یہ اختلاف کہ عرض باقی رہتا ہے یا نہیں رہتا۔ اسی پر انھوں نے استطاعت کے باقی رہنے کو کھڑا کیا ہے، لیکن بہترین الفاظ اور اعتبارات وہ ہیں جو کتاب وسنت اور اجماعِ امت کے مطابق ہوں، کتاب وسنت کی نصوص ہی کو ہمیشہ قابلِ اعتماد بنیاد قرار دینا چاہیے، جس کی پیروی کرنا واجب ہے، وہ الفاظ جن میں نفی واثبات کے لحاظ سے لوگ اختلاف کریں، ان کے بارے میں استفسار کیا جائے اور ان کی تفصیل طلب کی جائے اور ان میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے جن امور کا اثبات کیا ہے، ان کی مطلق نفی نہ کی جائے اور جن کی اللہ اور اس کے رسول نے نفی کی ہے ان کا مطلق اثبات نہ کیا جائے۔

دوسری بنیاد: وہ فعل جس کے بارے میں علما کا اتفاق ہے کہ وہ بندے کی طاقت سے باہر ہے، اس کا مکلّف بنانے میں بھی اختلاف ہے۔ یہ فعل دو طرح کا ہوتا ہے: ایک وہ جو انسانی عادت میں ناممکن ہو، جیسے سر کے بل چلنا، اڑنا وغیرہ۔ دوسرا وہ جو فی نفسہ ممتنع اور مستحیل ہو، جیسے دو متضاد چیزوں کا یکجا ہونا۔ اس کے عقلاً درست ہونے میں تین اقوال ہیں جو پہلے گزر چکے ہیں۔ جہاں تک شریعت میں اس کے واقع ہونے یا شرعاً اس کے امکان کا تعلق ہے تو علمائے شریعت کا اتفاق ہے کہ اس جیسا فعل شریعت میں نہیں، اس پر بہت سارے لوگوں نے اجماع نقل کیا ہے، انھی میں ابو الحسن زاغونی بھی ہے، اس نے کہا ہے:

فصل (تکلیف مالا یطاق کی انواع):

تکلیف مالا یطاق کی دو اقسام ہیں:

پہلی قسم: ایسے فعل کا مکلّف بنانا جو صلاحیت نہ ہونے کی وجہ سے طاقت سے باہر ہو، جیسے: اپاہج کو کھڑا ہونے کا مکلّف بنانا اور نابینا کو لکھنے اور کتاب پر نقطے لگانے کا حکم دینا وغیرہ۔ اس کام کا مکلّف بنانا جائز نہیں اور اس پر اجماع ہے، کیوں کہ اس میں عدمِ طاقت اس کو ممتنع اور مستحیل فعل کے ساتھ جوڑ دیتی ہے، لہٰذا جو کام طاقت سے باہر ہو، اس کا مکلّف بنانا ممتنع ہے۔

دوسری قسم: ایسے فعل کا مکلّف بنانا جو طاقت کے دائرے سے باہر ہے، لیکن اس کی ضد (عجز) کے وجود کے سبب نہیں، جیسے: وہ کافر جس کے بارے میں پہلے سے اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو پسند نہیں کرے گا، جیسے فرعون اور ابوجہل وغیرہ، ایسے لوگوں کو مکلّف بنانا، یہ جائز ہے۔ معتزلہ کا مذہب ہے کہ تکلیف مالا یطاق ناجائز ہے، یہ مسئلہ اس مسئلے کے لیے بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ اجماع فقہا اور علما کا اجماع ہے۔ متکلمین کے ایک گروہ کا مذہب ہے کہ بذاتِ خود ممتنع کی تکلیف شریعت میں موجود ہے۔ یہ رازی اور اس سے پہلے ایک گروہ کا قول ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ابولہب وغیرہ کو مکلّف بنانا اسی باب سے تعلق رکھتا ہے، یعنی وہ اس کا مکلّف تھا کہ تمام خبروں کی تصدیق کرے جن میں یہ خبر بھی تھی کہ وہ ایمان نہیں لائے گا، یہ غلط ہے، جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے بتا دیا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی دعوت دینے کے باوجود ایمان نہیں لایا، لہٰذا وہ جہنم میں داخل ہوگا اور اس پر عذاب کا کلمہ سچا ثابت ہوگا، جیسے: جو شخص موت کے وقت فرشتوں کو دیکھ لیتا ہے، اس کے بعد ان دو متضاد امور کے ساتھ وہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے مخاطب نہیں رہتا۔

اسی طرح جو کہتا ہے کہ عاجز اور صلاحیت نہ رکھنے والے کو مکلّف بنانا بھی اس آیت:

﴿يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴾ [القلم: ٤٢]

''جس دن پنڈلی کھولی جائے گی اور وہ سجدے کی طرف بلائے جائیں گے تو وہ طاقت نہیں رکھیں گے۔''

کی روشنی میں حتمی طور پر واقع ہوا تو یہ اس اجماع کے مخالف ہے، کیوں کہ اجماع کا مضمون و مفہوم اس کے شریعت میں وقوع کی نفی ہے، نیز اس طرح کا خطاب اور حکم سزا کے طور پر عاجز کرنے کا خطاب ہے کہ جب وہ صحیح سالم تھے اور عبادت کی قدرت رکھتے تھے، اس کے باوجود انھوں نے عبادت ترک کی تو قیامت کے دن جب وہ اس کی طاقت نہیں رکھتے ہوں گے، اس وقت ان کو سزا کے طور پر سجدہ کرنے کا حکم دیا جائے گا، سزا اور جزا کا خطاب اور

حکم، تکوینی حکم کی جنس سے تعلق رکھتا ہے جس میں مخاطب کی قدرت شرط نہیں ہوتی، کیوں کہ اس کا فعل مطلوب نہیں ہوتا۔
اگر یہ انواع اور اقسام واضح ہو چکی ہیں تو تمام شبہات اور ابہام زائل ہو جائیں گے۔[1]

خلقِ افعال اور کسب کا مسئلہ

سوال بندوں کے اختیاری افعال اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے اور بندے کے پیدا کرنے سے حاصل ہوتے ہیں تو بندے کی کمائی اور اکتساب کی حقیقت کیا ہے؟ اس کے بعد کیا وہ فعل کے وجود میں موثر ہے یا نہیں؟ اگر موثر ہے تو بندہ فعل کو پیدا کرنے میں خالق کا شریک کار ہو جائے گا، لہٰذا وہ کاسب (کمانے والا) نہیں ہوگا، بلکہ خالق کا شریک ہو جائے گا، یہ اہلِ سنت کا نظریہ نہیں، وہ اس سے بری ہیں، اگر بندے کا کمانا فعل کے وجود میں موثر نہیں تو فعل مکمل کا مکمل حق سبحانہ وتعالیٰ کے پیدا کرنے سے وجود میں آئے گا جس میں بندے کا کوئی حصہ نہیں ہوگا، ایسی صورت میں نظریہ جبر لازم آتا ہے جو شریعت کی بساط لپیٹ دیتا ہے اور اہلِ سنت اس بدنما لفظ اور یک چشم عقیدے سے بھی بھاگتے ہیں، اس عقیدے کے ہوتے ہوئے فرماں برداری، نافرمانی، ایمان اور کفر کو بندے کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا، جس کے نتیجے میں وہ رضائے الٰہی یا غضبِ خدا کا مستحق ہو۔

آپ سے درخواست کی جاتی ہے کہ اس مسئلے کو تفصیل سے بیان کریں جس سے یہ معمہ حل ہو جائے اور دلوں کو اطمینان حاصل ہو، اللہ تعالیٰ آپ کی مدد فرمائے۔

(خلاصہ) **جواب** الحمد لله رب العالمين.

کسب کا معنی ہے کمانا، یہ وہ فعل ہے جس کا فائدہ یا نقصان اس کو کرنے والے ہی کو پہنچتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ﴾ [البقرة: ٢٨٦]

”اسی کے لیے ہے جو اس نے (نیکی) کمائی، اور اسی پر ہے جو اس نے (گناہ) کمایا۔“

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے کہ نفسِ انسان جو کماتا ہے اس کا فائدہ یا نقصان اسی کو ہوتا ہے، لوگ کہتے ہیں: فلاں نے مال کمایا، شہرت کمائی، عزت کمائی، تو وہ اس سے فائدہ بھی خود ہی اٹھاتا ہے۔

انسان پیدائش کے وقت ناقص پیدا ہوتے ہیں اور اپنے افعال کے ساتھ کمال اور صلاح پاتے ہیں، لہٰذا سبب کا اثبات کرنا درست ہوا، کیوں کہ ان کا کمال اور ان کی درستی ان کے افعال ہی پر مبنی ہے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٨/٢٧٢_٣٠٢)

اس کو اپنے کمال اور جلال سے بنایا اور کیا ہے، اس کے افعال اس کے اسما و صفات سے مشتق اور نکلے ہوئے ہیں، جیسا کہ اس نے فرمایا ہے:

«أَنَا الرَّحْمٰنُ خَلَقْتُ الرَّحِمَ وَشَقَقْتُ لَهَا مِنِ اسْمِيْ »[1]

''میں رحمان ہوں، میں نے رحم کو پیدا کیا اور اس کا نام اپنے نام سے مشتق کیا۔''

بندے کے اسما اور صفات اس کے افعال سے مشتق ہیں، تو جب اس میں علم اور کمال پیدا ہو تو اس کے بعد اس کے لیے عالم اور کامل کا نام پیدا ہوتا ہے۔

یہیں سے قدریہ گمراہ ہوئے، کیوں کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے افعال کو بندوں کے افعال سے تشبیہ دی ہے، جب کہ وہ اس سے بہت بلند ہے اور منزہ ہے۔ ان کے نظریے کے مطابق بندوں کا جو فعل اچھا سمجھا جاتا ہے اس کا صدور اس کی طرف سے بھی مستحسن ہوگا اور جس فعل کا صدور بندوں کے علم و عقل کے مطابق قبیح باور کیا جاتا ہے اس کا صدور اس سے بھی مطلقاً قبیح ہوگا۔ کیا ان کو اتنا بھی علم نہیں کہ ان کا وہ فعل اچھا ہوتا ہے جو ان کو ایسے نتیجے تک پہنچا دے جس میں ان کی کامیابی اور بہتری ہو اور ان کا وہ فعل قبیح ہوتا ہے جو ان کو اس نتیجے تک پہنچا دے جس میں ان کی بربادی ہو، جب کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس سے کہیں بلند ہے کہ اس کو ایسی چیز پہنچے جو اس کے لائق نہ ہو۔

سائل کا یہ کہنا: ''کیا بندے کا کسب فعل کے وجود پذیر ہونے میں موثر ہے یا غیر موثر'' تو اس کے جواب میں دو مقامات پر گفتگو ہوگی:

پہلا مقام: اس سوال کو اگر اس کے ظاہر کے مطابق لیا جائے تو یہ سوال ہی فاسد ہے، کیوں کہ بندے کا کسب اس کا فعل اور کام ہی ہے، لہٰذا یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اس کا کسب اس کے فعل میں موثر ہے؟ یا دوسرے لفظوں میں کیا کوئی چیز اپنی ہی ذات میں خود ہی موثر ہو سکتی ہے؟ اگر کوئی گمان کرنے والا یہ گمان کرے کہ کسب کوئی کام کرنے، کسی کام میں مصروف ہونے، کسی چیز کا قصد کرنے اور اس کے لیے کوشش کرنے کا نام ہے، تاہم یہ تمام افعال ہی ہیں، بدن کے اٹھنے بیٹھنے جیسے افعال کے بارے میں جو کہا جائے گا ان کے بارے میں بھی وہی کہا جائے گا۔

میرا گمان ہے کہ سائل اس کو سمجھتا ہے اور وہ اس نظریے کا حامل ہے کہ بندے کا فعل اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے اور بندے کے کمانے سے حاصل ہوتا ہے، لیکن تحقیقی بات یہ ہے جو کہنی چاہیے کہ بندے کا فعل اللہ تعالیٰ کا پیدا کردہ اور بندے کا کمایا ہوا ہے، بجز اس کے کہ یہ مراد ہو کہ اس کے بدن کے افعال اس کے کمانے، یعنی اس کے ارادے

[1] سنن أبي داو، رقم الحديث (١٦٩٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٩٠٧) السلسلة الصحيحة (٥٢٠)

اور قصد سے حاصل ہوتے ہیں۔ گویا وہ کہتا ہے کہ اس کے ظاہری افعال اس کے باطنی افعال سے حاصل ہوتے ہیں۔
اس سوال میں عدمِ تجدید عجیب چیز نہیں، کیونکہ یہاں پاؤں پھسلنے اور فہم کے بھٹکنے کا بھرپور امکان ہے۔
خوب صورت طریقے سے سوال کرنا نصف علم ہے۔ اگر سائل کے سوال کا تصور صحیح ہو تو وہ کسی چیز کی نفی یا اثبات کا مطالبہ کرتا ہے۔ اگر مسئلے کا مکمل تصور ہو تو نفی یا اثبات میں سے ایک چیز معلوم ہو جاتی ہے۔
دوسرا مقام: (سوال لکھنے اور اس کا جواب دینے میں) اس طرح کہنا چاہیے کہ کیا بندے کی قدرتِ مخلوقہ (پیدا شدہ) اس کے فعل کے وجود میں موثر ہے۔ اگر موثر ہے تو شرک لازم آئے گا ورنہ جبر لازم آئے گا۔
یہ بڑا معروف مقام ہے۔ یہاں بہت سارے محققین، اور اصحابِ کشف و بصیرت نے اپنی اپنی آرا پیش کی ہیں اور اکثر صحیح سمجھتے ہیں، لیکن ان میں سے بہت کم ایسے ہیں جو فصیح اور صاف زبان میں اس کی تعبیر کر پائے ہوں۔
تاثیر مشترک اسم ہے۔ کبھی اس سے کسی چیز کو تنِ تنہا پیدا کرنا اور بلا شرکت غیرے ایجاد کرنا مراد لیا جاتا ہے، اگر بندے کی قدرت کی تاثیر سے یہ قدرت مراد لی جائے تو حاشا وکلا یہ بات کسی سنی کے منہ سے نہیں نکلی۔ یہ گمراہوں کی طرف منسوب ہے۔ اگر تاثیر سے فعل کی صفات میں سے کسی صفت یا اس کے پہلوؤں میں سے کسی پہلو کی معاونت کی کوئی قسم مراد لی جائے، جس طرح بہت سے متکلمین، اہلِ اثبات کا قول ہے، تو یہ بھی باطل ہے، کیوں کہ اس کے ساتھ فعل کی ذات میں تاثیر باطل ہو جاتی ہے، کیوں کہ جب غیر اللہ کو مستقل بالتاثیر قرار دے دیا جائے تو پھر وہ ہاتھی ہو یا ذرہ اس میں کوئی فرق نہیں، یہ بہر حال شرک ہوگا۔ اگرچہ اس نظریے کا قائل حق ہی کی جانب چلا ہے۔
اگر تاثیر سے مراد یہ ہو کہ فعل کا عدم سے وجود کی طرف آنا نو پید قدرت کے توسط سے ہوا، یعنی قدرتِ مخلوقہ اللہ تعالیٰ کے اس فعل کو اس قدرت کے ساتھ پیدا کرنے کا سبب اور واسطہ ہے، جس طرح وہ نباتات کو پانی کے ساتھ اور بارش کو بادلوں کے ذریعے پیدا کرتا ہے، اسی طرح تمام مسببات اور مخلوقات کو اسباب اور واسطوں کے ذریعے پیدا کرتا ہے۔ یہ صحیح ہے اور تمام اسباب اور مسببات اسی طرح اس کے پیدا کردہ ہیں۔ اس تفسیر کے مطابق قدرت کو بندے کی طرف منسوب کرنا شرک نہیں، ورنہ تمام اسباب کا اثبات کرنا شرک ہوگا۔ اللہ حکیم و خبیر نے فرمایا ہے:

﴿ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ﴾ [الأعراف: ٥٧]

''پھر ہم اس سے پانی اتارتے ہیں، پھر اس کے ساتھ ہر قسم کے کچھ پھل پیدا کرتے ہیں۔''

﴿ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ﴾ [النمل: ٦٠]

''پھر ہم نے اس کے ساتھ رونق والے باغات اگائے۔''

﴿ قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ ﴾ [التوبة: ١٤]

''ان سے لڑو، اللہ انھیں تمھارے ہاتھوں سے عذاب دے گا۔''

اس آیت میں اس نے بیان کیا ہے کہ عذاب دینے والا وہی ہے، ہمارے ہاتھ تو ان تک عذاب پہنچانے کے اسباب، آلات اور ذرائع ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«لَا يَمُوْتَنَّ أَحَدٌ مِنكُمْ إِلَّا آذَنْتُمُوْنِي حَتّٰى أُصَلِّيَ عَلَيْهِ، فَإِنَّ اللّٰهَ جَاعِلٌ بِصَلَاتِي عَلَيْهِ بَرَكَةً وَرَحْمَةً »①

''جب تم میں سے کوئی فوت ہو تو مجھے ضرور بتاؤ، تاکہ میں اس کا جنازہ پڑھوں، اللہ تعالیٰ میرے اس کی نمازِ جناہ پڑھنے کو برکت اور رحمت (کا سبب) بنا دے گا۔''

رحمت اللہ تعالیٰ ہی بناتا ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ کی نمازِ جنازہ پڑھنے کو ذریعہ بناتا ہے۔ اس تفصیل کی بنا پر ہم کہتے ہیں:

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اعمالِ ابدان کو اعمالِ قلوب کے ذریعے پیدا کیا ہے۔ اس اعتبار سے ایک کسب کی دوسرے کسب میں تاثیر ہوتی ہے اور یہ کسب دوسرے کسب میں معتبر قدرت میں داخل ہے۔ یہاں قدرت سے صرف وہ چیز مراد ہے جس کے ساتھ فعل لامحالہ واقع ہوتا ہے، جیسے ارادہ، اعضا کا صحیح سلامت ہونا اور ان میں پیدا کردہ قوتوں کا صحیح کام کرنا وغیرہ۔ اس لیے ان کا فعل کے ساتھ ملا ہوا ہونا ضروری ہے اور ان کا فعل سے زمانے کے لحاظ سے پہلے ہونا ممتنع ہے۔

جہاں تک اس قدرت کا تعلق ہے جو امر و نہی کا محور اور مدار ہے تو یہ دوسرا موضوع ہے، یہ اس کی جگہ نہیں۔

ان دونوں قدرتوں کے درمیان فرق سے تمھیں واضح ہوگا کہ جو کہتے ہیں: قدرت فعل کے ساتھ ہے، اور جو کہتے ہیں: قدرت فعل سے پہلے ہے، اور جو کہتے ہیں: تمام افعال تکلیف مالا یطاق کے زمرے میں داخل ہیں اور جو اس کو منع قرار دیتا ہے۔ ان تمام اقوال میں کیا فرق ہے، نیز اس فرق کو مدِنظر رکھ کر آپ ان نظریات کے اسرار سمجھ جائیں گے۔

اگر یہ تفصیل آپ کو مشکل محسوس ہو تو اپنی ذات سے مثال لے لیں۔ آپ قلم سے لکھتے ہیں، لاٹھی سے مارتے ہیں اور چھری سے کاٹتے ہیں تو کیا وہ قلم آپ کا شریک ہوتا ہے یا اس کی طرف اس فعل اور اس کی صفات کو منسوب کیا جا سکتا ہے یا تمھارے لیے اس کا اثر زائل کرنا اس کی سیاہی ختم کرنا اور اس کے وجود کو عدم کی طرح کرنا ممکن اور صحیح ہے؟ یا یہ کہا جائے: اس کے ساتھ اس نے کیا، اس کے ساتھ بنایا۔

---

① المستدرك للحاكم (۵۹۱/۳) ابن لہیعہ راوی کی وجہ سے یہ روایت ضعیف ہے۔

﴿ وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ﴾ [النحل: ٦٠] ''اور اللہ کے لیے سب سے اونچی مثال ہے۔''

بندے کے ہاتھ میں جو اسباب ہیں وہ اس کا فعل نہیں۔ وہ ان کا محتاج ہے۔ ان کے بغیر اپنا کام نہیں کر سکتا۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی نے اسباب اور ان کے مسببات و نتائج پیدا کیے ہیں۔ اس نے بعض کو بعض کے لیے بطور شرط یا بطور سبب پیدا کیا ہے۔ وہ اس کے باوجود سبب اور شرط بنانے اور بعض کو بعض کے ساتھ مربوط کرنے سے بے نیاز ہے۔ لیکن اس نے کسی حکمت کے پیشِ نظر ان کو اسباب کے ساتھ جوڑا ہے جو وہی جانتا ہے۔ وہ عزیز اور حکیم ہے۔

سائل کا یہ کہنا: ''اگر ہم تاثیر کی نفی کریں تو فعل میں اللہ تعالیٰ کی استقلالیت لازم آئے گی، جبر لازم آئے گا اور امر و نہی پر مشتمل شریعت کی بساط الٹ جائے گی۔

ہم اس کے جواب میں کہیں گے: اگر تمھاری اس نفی کردہ تاثیر سے مراد نفسِ فعل یا اس کی صفات میں سے کسی چیز میں مستقل بالتاثیر ہونا ہے تو تم نے صحیح کہا ہے، اگرچہ بعض اہلِ سنت دوسری قسم میں تمھاری مخالفت کریں گے۔ اگر اس سے تمھاری مراد یہ ہے کہ قدرت کا ہونا نہ ہونا برابر ہے، فعل اس کے ساتھ وقوع پذیر ہوتا ہے، نہ اس کے ساتھ کچھ بنایا ہی جاتا ہے تو یہ باطل ہے۔ جس طرح اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔ اس سے نہ جبر لازم آتا ہے نہ شریعت کی بساط ہی الٹتی ہے، بلکہ امر و نہی کا علم پھیل جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی حجت پوری ہو جاتی ہے۔

لہٰذا تمھارے لیے واضح ہو چکا ہے کہ تفصیل طلب کیے بغیر مطلقاً تاثیر کا اثبات یا نفی کرنا اور اس کا معنی بیان کرنا جہالتوں کی پشت پر سوار ہونے اور گمراہیوں کا عقیدہ رکھنے کے مترادف ہے۔ کسی کہنے والے نے کیا سچ کہا ہے:

''حکما اور عقل پرستوں کا اکثر اختلاف اسما میں اشتراک کے پہلو سے ہے۔''

تمھارے لیے بھی یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ پیدا کردہ فعل، پیدا کردہ قدرت کے ساتھ وہی ربط و تعلق رکھتا ہے جو اسباب کا ان کے مسببات اور نتائج کا تعلق ہوتا ہے۔ اس عموم میں زمین و آسمان اور دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ کی تمام پیدا کردہ چیزیں داخل ہیں۔ اسباب کی مستقل اور از خود تاثیر کا عقیدہ رکھنا گمراہی میں داخل ہونا اور ان کے اثرات کی نفی کو زائل کرنا محال کی پشت پر سواری کرنا ہے، اگرچہ انسان کی قدرت کی ایک شان اور مقام ہے جو کسی دوسری کی نہیں، ہم اس کی طرف ان شاء اللہ اشارہ کریں گے۔ شاید اس تفصیل کے بعد تم یہ کہو: میں اسباب کو نہیں سمجھتا اور تقسیم کے دائرے اور ایک قسم کا مطالبہ کرنے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اگر تم نے یہ کہا ہے تو ایسا کہنے والے تم اولین شخص نہ ہو گے کہ تم سے پہلے بہت سے لوگ ہو چکے۔

﴿ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ﴾ [البقرة: ١١٨]

''ایسے ہی ان لوگوں نے جو ان سے پہلے تھے، ان کی بات جیسی بات کہی، ان کے دل ایک دوسرے جیسے ہو گئے ہیں۔''

تمھارا یہ موقف تجھ کو دوراہے کے بیچ کھڑا کر دینے والا ہے، جہاں سے راستہ ایک جنت کی طرف جاتا ہے اور دوسرا جہنم کی طرف۔ تمھیں دوبارہ بتایا جاتا ہے کہ اسباب کی سبب ہونے کے اعتبار سے تاثیر ہے جس طرح قلم کی لکھنے میں تاثیر ہوتی ہے۔ پیدا اور ایجاد کرنے کے اعتبار سے ان کی کوئی تاثیر نہیں۔ ہم ایک اور مثال بیان کرتے ہیں، شاید تم صورتِ حال سمجھ سکو اور تمھارے سامنے واضح ہو جائے گا کہ اسباب کو ایجاد کنندہ قرار دینا شرک ہے۔ ان کو مسببات تک پہنچانے والے اسباب قرار دینا عین حقیقتِ توحید ہے، شاید اللہ تعالیٰ تمھارے دل میں روشنی ڈال دے اور تم اس تفصیل و وضاحت کو سمجھ سکو:

﴿ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ﴾ [النور: ٤٠]

''اور وہ شخص جس کے لیے اللہ کوئی نور نہ بنائے تو اس کے لیے کوئی بھی نور نہیں۔''

اگر تم کہو: قدرت کا اثبات حقیقت میں تاثیر کی نفی کا سبب ہے تو فعل بندے کی طرف کیوں منسوب کیا جاتا ہے؟ اس کو کیوں حکم دیا جاتا ہے؟ کیوں منع کیا جاتا ہے؟ کیوں ثواب اور عذاب دیا جاتا ہے، کیا یہ خالص جبر نہیں؟ اگر تم انسان کی قدرت کو کاتب کے قلم اور مارنے والے کی لاٹھی سے تشبیہ دو تو کیا تم دیکھتے ہو کہ قلم کو ثواب یا لاٹھی کو سزا دی جاتی ہے؟

یہاں میں تجھ سے یہ کہنا چاہوں گا کہ تیرے آقا کی مدد سے تیری رہنمائی کرنا ضروری ہے، اگرچہ تم تقدیر کے اسرار سے اسی قدر واقف ہو جس قدر کوئی نقشِ قدم کو دیکھ کر علم حاصل کر پاتا ہے۔ تو اب کان کھول کر دل و دماغ کو حاضر کر کے سنو! بہت ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھاری دستگیری فرمائے۔

جان لو، بندہ حقیقت میں فاعل ہے۔ اس کی مشیت (مرضی) ثابت ہے۔ اس کا ارادہ پختہ ہے اور اس کی قوت صحیح ہے۔ قرآن کریم نے ایک سے زیادہ آیات میں بندے کی مشیت کا اثبات کیا ہے، جیسے:

﴿ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ۝ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾

[التکویر: ٢٨، ٢٩]

''اس کے لیے جو تم میں سے چاہے کہ سیدھا چلے اور تم نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ چاہے، جو سب جہانوں کا رب ہے۔''

﴿ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴾ [المزمل: ١٩] ''تو جو چاہے اپنے رب کی طرف راستہ بنا لے۔''

﴿ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۝ وَمَا يَذْكُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ۝ ﴾

[المدثر: ٥٥، ٥٦]

''تو جو چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے اور وہ نصیحت حاصل نہیں کریں گے مگر یہ کہ اللہ چاہے، وہی لائق ہے کہ (اس سے) ڈرا جائے اور لائق ہے کہ بخش دے۔''

قرآن کی عام آیات میں بندے کے فعل کا اثبات بھی ہے، جیسے: ﴿يُؤْمِنُوْنَ﴾، ﴿يَكْفُرُوْنَ﴾، ﴿يَعْمَلُوْنَ﴾، ﴿يَفْعَلُوْنَ﴾، ﴿يَتَفَكَّرُوْنَ﴾، ﴿يُحَافِظُوْنَ﴾، ﴿يَتَّقُوْنَ﴾۔

ہم اللہ تعالیٰ کو خالق قرار دے کر اس امت کے مجوسیوں سے جدا ہو جاتے ہیں اور بندے کا کاسب (کمانے والا) فاعل (کرنے والا) اور صانع (بنانے والا) ہونے کا اثبات کر کے جبریہ سے علاحدہ ہو جاتے ہیں۔

وہ معقول جبر جس کا سلف صالحین اور علمائے اہلِ سنت نے انکار کیا ہے، وہ یہ ہے کہ ارادے، مرضی اور اختیار کے بغیر فعل کسی چیز پر صادر ہو، جیسے: ہوا چلنے کی وجہ سے درختوں کا حرکت کرنا اور انسانوں میں سے بخار میں مبتلا انسان، فالج زدہ انسان اور رعشہ کے مریض کی لرزش۔ ہر عقل مند بدیہی طور پر انسان کے اٹھنے، بیٹھنے، نماز پڑھنے، جہاد کرنے، زنا کرنے، چوری کرنے اور مفلوج کی حرکت اور بخار زدہ کی کپکپی کے درمیان بدیہی طور پر فرق دیکھتا ہے۔ پہلا فعل پر قادر، اس کا ارادہ اور اختیار رکھنے والا ہے اور دوسرا اپنے فعل پر قادر ہے اور نہ اس کا ارادہ اور اختیار ہی رکھتا ہے۔

جہم اور اس کے پیروکاروں، یعنی جبریہ سے یہ عقیدہ منقول ہے کہ بندے کے تمام افعال کی ایک ہی قسم ہے، اس قول کا فاسد ہونا بالکل ظاہر اور عیاں ہے۔ دونوں قسموں میں فرق کی وجہ سے کچھ افعال اختیاری ہوتے ہیں اور کچھ اضطراری۔ امر و نہی بااختیار ہی کے لیے ثابت ہے۔ کسی شریعت یا کسی دانا آدمی نے کبھی اندھے کو نقطے لگانے، اپاہج کو کھڑا ہونے اور بخار میں ہذیان بکنے والے کو خاموش رہنے کا حکم نہیں دیا، اگرچہ ان کا اضطراری افعال کے عقلاً یا شرعاً جائز اور معقول ہونے میں اختلاف ہے، لیکن تمام حکما کا اس کے وقوع پذیر نہ ہونے پر اتفاق ہے۔

اگر کہا جائے: تصور کریں، میرا فعل جس کا میں نے ارادہ کیا اور اختیار کیا وہ میری مشیت (مرضی) اور میرے ارادے سے واقع ہوا تو کیا یہ ارادہ اور مرضی اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ نہیں؟ اگر اس نے فعل کا سبب بننے والی چیز کو پیدا کیا ہے تو کیا ترکِ فعل بھی اس کے ساتھ ہی آتا ہے؟ اس باب کا لبِ لباب یہی ہے کہ پہلا بندے کے ارادے کے توسط کے بغیر جبر ہے اور دوسرا ارادے کے توسط سے جبر ہے۔

اس کے جواب میں ہم کہیں گے: جس جبر کی نفی کی گئی ہے وہ پہلا ہے، جس طرح ہم نے اس کی تفسیر بیان کی ہے۔ جہاں تک دوسری قسم میں اس کا اثبات ہے تو بلاشبہہ یہ آثار و سنن کو ماننے والوں اور عقل و بصیرت رکھنے والوں کے ہاں ہے، لیکن پہلی قسم کے ساتھ خلط ملط ہونے کے خدشے کے پیشِ نظر اس پر جبر کا لفظ نہیں بولا جاتا۔

جب اس لفظ کو بولنے کا قصد معلوم ہو اور پہلی قسم کے ساتھ خلط ملط ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو اس وقت اسے جبر

کہا جا سکتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مشہور دعا کے الفاظ میں ہے:

"اللهم داحي المدحوات، و باري المسموكات، جبار القلوب علیٰ فطراتها شقاها أو سعدها"[1]

اس دعا میں انھوں نے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نیک بختی یا بدبختی کی فطرت پر دلوں کو پیدا اور مجبور کیا ہے۔ یہ دوسری فطرت پہلی فطرت نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان: ''ہر پیدا ہونے والا فطرت پر پیدا ہوتا ہے''[2] کی ان دونوں فطرتوں کے ساتھ تشریح کی گئی ہے۔ اس کی پہلی فطرت کے مطابق تفسیر بالکل واضح ہے۔ مدینے کے تابعین اور علما میں سے افضل تابعی اور نامور عالم محمد بن کعب القرظی کا "الجبار" کی تفسیر میں یہ قول ہے: ''اس نے جو ارادہ کیا اس پر بندوں کو مجبور کیا۔'' یہ کئی دوسرے ائمہ سے بھی مروی ہے۔

قرآن کریم، احادیثِ نبویہ، اہلِ بصیرت کی نظر اور کامل استدلال کی گواہی سے یہ ثابت ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ بندوں کے دلوں کو پھیرتا ہے، ان کو الٹ پلٹ کرتا ہے، ان میں نیکی اور گناہ کا الہام کرتا ہے، اور غالب حکمت والے کی جناب سے پلک جھپکنے سے بھی کم مدت میں تمام اہلِ جہان کے دلوں پر اس کا نافذ ہونے والا فیصلہ نازل ہوتا ہے، یہاں تک کہ اعضا اس فیصلے کے مطابق حرکت کرتے ہیں اور یہ سب کچھ بالکل واضح ہے، سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے جس کی آنکھ اور دل کو اندھا کر دیا ہو۔

اگر تم کہو: اس جبر کے مفروضے سے باہر نکل کر جس کی انھوں نے نفی کی ہے اور جو انھوں نے بیان کیا ہے، اس کا اقرار کر کے، میں اس مفروضے اور تقدیر کی بنا پر آپ سے یہ سوال کرتا ہوں کہ سزا اور جزا کس طرح اس کے فعل پر مبنی ہے، اس کو حقیقت میں فاعل کہنا کیوں صحیح ہے اور اس کا فعل اس کی قدرت پر کس طرح بنا رکھتا ہے؟

اس کے جواب میں میں کہوں گا: .... اور اللہ تعالیٰ ہی سیدھی راہ پر چلانے والا ہے۔ .... کہ اللہ تعالیٰ نے بندے کے فعل کو اچھے یا برے اثرات کا تقاضا کرنے والے سبب کے طور پر تخلیق کیا ہے۔ نیک عمل مثلاً نماز ہی کو لے لیں۔ وہ پورے دھیان اور خلوص کے ساتھ اس میں لگ جاتا ہے۔ وہ نماز کے اعمال اور ان میں پڑھی جانے والی دعاؤں اور کلمات کو سمجھتا ہے۔ اس کے نتیجے میں بہت جلد اس کے دل میں نور پیدا ہو جاتا ہے اور اس کا سینہ کھل جاتا ہے۔ اس کے دل کو اطمینان ملتا ہے۔ اس کے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کے یقین میں رسوخ پیدا ہوتا ہے۔ اس کی عقل

---

[1] علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد میں کہا ہے کہ طبرانی رحمہ اللہ نے اسے المعجم الأوسط میں روایت کیا ہے۔ سلامہ کندی کی علی رضی اللہ عنہ سے روایت مرسل ہے۔ باقی کے رجال صحیح کے رجال ہیں۔ (۱۰/۱۶۳، ۱۶۷)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٢٢٦) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٥٨)

مضبوط ہوتی ہے اور اعضائے بدن چست اور طاقتور ہو جاتے ہیں۔ چہرہ پرنور ہو جاتا ہے۔ وہ برائی اور فحاشی سے باز آ جاتا ہے۔ لوگوں کے دلوں میں اس کی محبت ڈال دی جاتی ہے۔ اس سے مصیبتیں دور ہو جاتی ہیں اور اس کو بے شمار فوائد حاصل ہوتے ہیں جن کو وہی جانتا ہے، ہم نہیں جان سکتے۔

پھر اس کو علم، نور اور یقین کے یہ اثرات جو حاصل ہوتے ہیں۔ وہ دیگر اثرات کا سبب بنتے ہیں جو انہی کی جنس سے یا ان سے کسی بلند مرتبہ جنس سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے: نیکی کا ایک ثواب یہ بھی ہے کہ انسان نیکی کے بعد نیکی کرتا چلا جاتا ہے اور برائی کی ایک سزا یہ بھی ہے کہ انسان اس کے بعد برائی پر برائی کرتا چلا جاتا ہے۔

اسی طرح انسان کو برے عمل کی سزا ملتی ہے۔ مثال کے طور پر جھوٹ ہی کو لے لیں۔ جھوٹ بولنے والے کو فوراً یہ سزا ملتی ہے کہ اس کے دل میں اندھیرا، منافقت اور اضطراب پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کا سینہ تنگ اور وہ سنگ دل ہو جاتا ہے۔ اس نے جو سیکھا ہوتا ہے اس کو بھول جاتا ہے۔ اس کے سامنے علم کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ اس کے یقین اور اس کی عقل میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اس کا چہرہ کالا ہو جاتا ہے۔ لوگوں کے دلوں میں اس کی نفرت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اسی طرح کا یا اس سے بھی بدتر ایک اور گناہ کرنے کی جسارت کرتا ہے اور پھر گناہ پر گناہ کرتا چلا جاتا ہے، اِلا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کو پا لے۔

یہی وہ اثرات ہیں جن کو اعمال جنم دیتے ہیں اور جو سزا اور جزا پر مشتمل ہیں۔ عمل کا ان کو پیدا کرنا تمام اسبا ، کے اپنے مسببات اور نتائج کو پیدا کرنے جیسا ہی ہے اور اللہ تعالیٰ ہی نے ان اسباب کو ان کے نتائج کے اسباب بنایا ہے۔

انسان جب کھانا کھاتا ہے تو اس کا پیٹ بھر جاتا ہے۔ جب پانی پیتا ہے تو اس کی پیاس مٹ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سیرابی اور شکم پروری کا کھانے پینے کے ساتھ بڑا مضبوط رشتہ قائم کیا ہے۔ اگر وہ چاہتا کہ بندے کو خوارک اور پانی کی موجودگی کے باوجود بھوکا اور پیاسا رکھے تو وہ ایسا بھی کر سکتا تھا۔ اس کے پاس اس کے کئی طریقے ہیں، چاہے تو کھانے میں طاقت ہی ختم کر دے، چاہے تو معدے میں کوئی رکاوٹ پیدا کر دے، اگر وہ کھانے پینے کے بغیر کسی انسان کی بھوک اور پیاس مٹانا چاہے تو وہ ایسا بھی کر سکتا ہے۔

اسی طرح اعمال میں ثواب اور عقاب، یعنی سزا اور جزا ایک دوسرے کے ساتھ چلتے ہیں۔ ثواب کا معنی ہے لوٹنا۔ عمل کا فائدہ عمل کرنے والے ہی کو پہنچتا ہے، اس لیے اس کو ثواب کہا جاتا ہے، یہ عمل کے بعد آتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ انسان کو اس عمل پر ثواب نہ دینا چاہے تو وہ ایسا کر سکتا ہے، چاہے عمل سے وہ خاصہ ہی ختم کر دے جو ثواب کا باعث ہوتا ہے یا ایسے اسباب پیدا کر دے جو اس ثواب کو ختم کر دیں، اسی طرح سزاؤں کا معاملہ ہے۔

اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ کھانا اور پینا تو بندے کے اختیار اور مرضی سے ہوتا ہے جو فی الوقت اللہ تعالیٰ کا

فعل بھی ہے، لیکن کھانے کے بعد بھوک مٹانے اور سیر ہونے میں بندے کا کوئی ہاتھ نہیں، حتی کہ اگر وہ شکم سیری کو ختم کرنے کا ارادہ کرے اور اس کے لیے لازمی اسباب بھی اختیار کرے تو بھی وہ اس کی طاقت نہیں رکھ سکتا۔ اسی طرح نفسِ عمل تو بندے کے ارادے اور اختیار کے ساتھ ہی ہوتا ہے اور اگر وہ عمل کے اثر اور ثواب کو ختم کرنا چاہے اور اس کا سبب بھی موجود ہو، پھر بھی وہ اس کو ختم کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔

یہ دنیا و آخرت کے تمام اسباب میں اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مشیت ہے، لیکن آخرت میں مفید اعمال اور نقصان دہ اعمال کا زیادہ تر علم لوگوں کی عقلوں سے اوجھل ہے۔ اسی طرح اس دنیا کو چھوڑ جانے کے بعد بندوں کی کون سی منزل ہوگی، لوگوں کو اس کا علم بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول بھیجے، انھوں نے لوگوں کو خوش خبریاں دیں، ان کو ڈرایا اور اس نے اپنی کتابیں نازل کیں، تاکہ رسول بھیجنے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ تعالیٰ کے خلاف کوئی حجت نہ رہے، اس میں اس کی حکمت تمام اسباب اور ان کے نتائج کو پیدا کرنے میں حکمت جیسی ہے اور وہ یہی ہے کہ اس کے ازلی علم، مشیتِ نافذہ اور قدرتِ غالبہ نے یہ تقاضا کیا کہ جن کا ٹھکانا جنت ہے۔ وہ ایسے اعمال کریں گے جو جنت میں جانے کا سبب ہیں۔ ان میں ایسے اعمال پیدا کیے جائیں گے جو ان کو اس کی جنت اور رضا کی طرف لے جائیں گے، اسی طرح جہنمیوں کا معاملہ ہے۔ جس طرح جب رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کیا ہم نوشتہ تقدیر پر بھروسا کر کے عمل کرنا چھوڑ دیں؟ تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

> ''نہیں، عمل کرو، ہر ایک کے لیے وہ عمل آسان کر دیا جاتا ہے جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے، جو نیک بختوں سے ہے اس کے لیے نیک بختوں کے اعمال آسان کر دیے جاتے ہیں اور جو بدبخت ہے اس کے لیے بدبختوں جیسے عمل آسان کر دیے جاتے ہیں۔''[1]

اس حدیث میں آپ ﷺ نے بیان کیا کہ نیک بخت کے لیے وہ عمل آسان بنا دیا جاتا ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ اس کو نیک بختی کی طرف لے جاتا ہے۔ اس عمل کو اس کے لیے آسان بنانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کو اس کے دل میں ڈال دیتا ہے اور اس کے لیے اسباب مہیا کرتا ہے۔ بندوں کے افعال کو پیدا کرنے کی یہ تفسیر ہے۔ بذاتِ خود اس عمل کو پیدا کرنا ہی وہ سبب ہے جو اس کو نیک بختی یا بدبختی کی طرف ہانک دیتا ہے۔ اگر وہ چاہتا تو اس کو بلا عمل ہی کر دیتا، بلکہ وہ اس کو کرنے والا ہے، وہ جنت کے لیے کوئی مخلوق بنا دے تو اس میں ان کی کوئی فضیلت نہ رہے۔ عاقل کے لیے یہ جاننا ہی کافی ہے کہ اللہ عزوجل علیم و حکیم ہے۔ اس کی حکمت نے عقلوں کو خیرہ کر دیا ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٦٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٨)

اس کی رحمت ہر چیز کو شامل ہے۔ اس کا علم ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس کے لوح وقلم نے ہر چیز کو شمار کیا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی تقدیر ایک محفوظ راز اور مخزون علم ہے۔ اس نے اس کو تمام مخلوق کی نظروں سے بچا کر اپنے پاس محفوظ رکھا ہے۔ اہلِ علم اور اس کے محبوب بندے ایک حد تک ہی اس تک پہنچ پاتے ہیں۔ کبھی انھیں اس میں سے کسی چیز کو ظاہر کرنے کی اجازت نہیں ہوتی اور کبھی وہ لوگوں کے ساتھ ان کی عقل وفہم کے مطابق اس کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔ حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ، حضرت عزیر علیہم السلام نے اللہ تبارک وتعالیٰ سے تقدیر کے راز کے بارے میں کچھ جاننا چاہا تھا کہ اگر وہ چاہتا کہ اس کی اطاعت کی جائے تو اس کی اطاعت کی جاتی، لیکن اس کے باوجود اس کی نافرمانی کی جاتی ہے تو اس نے بتایا کہ یہ اس کا راز ہے۔

اس مقام پر بہت سارے لوگوں کی عقلیں گم گشتہ راہ ہوگئی ہیں، اسی مقام پر وہ لوگ بھی بھٹکے جو جہاں کے قدیم ہونے کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک جہاں کو بنانے والا موجب بذاتہ ہے، یعنی اس کی ذات ہی موجب ہے، جس طرح علت معلول کی مقتضی ہوتی ہے۔ اس نے جو کچھ بنایا ہے اس سے بہتر ممکن ہی نہیں۔

اس بیماری کا کچھ حصہ اہلِ کتاب اور رسولوں کے پیروکاروں کے حصے میں بھی آیا ہے۔ انھوں نے ممکن کو موجود میں محصور کیا ہے، تاکہ خدائی افعال کی علت بیان کرنے اور حادث امور کے حادث اسباب کے وجود کا اقرار کرنے کی مشقت سے جان چھڑائی جائے۔ اہلِ قدر نے بھی اس کی کچھ تعلیلات پیش کی ہیں جن کا تعلق تعدیل وتجویز اور صالح یا اصلح کی رعایت رکھنے کے ساتھ ہیں مگر دونوں فریقوں میں سے کسی ایک کی اصل اور ضابطہ بھی درست نہیں اور قاعدہ بن کر قیاس کی راہ ہموار نہیں کر سکا۔

یہاں مجوسیوں اور ثنویت کے قائلین نے دو اصول اختیار کیے ہیں اور وہ اندھیرے اور روشنی کے قدیم ہونے کے قائل ہیں۔ اکثر متکلمین اہلِ اثبات معاملے کو خالص مشیت اور صرف ارادے کی طرف لوٹا کر کچھ ہی بچ پائے ہیں، اگرچہ اس میں بھی ایک گونہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں بدگمانی اور جفا کا شائبہ پایا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے ارادے نے تمام عقلاً جائز امور، تمام ممکنات کو ایک ہی طرز اور ایک ہی روش پر پیدا کیا ہے اور یہ بذاتِ خود اختصاص اور امتیاز کرتی ہے۔

اگر اس کلام کے ساتھ رحمت کے کچھ پہلوؤں اور حکمت کی کچھ صورتوں کو بھی ملا لیا جاتا، جس کو ہم جانتے ہیں یا نہیں جانتے، تو یہ بات قبول کرنے کے زیادہ لائق ہو جاتی۔

بہر حال اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے افعال میں لامِ تعلیل (وہ لام جو علت اور وجہ کا معنی دیتا ہے) کا وہ معنی اور مفہوم نہیں جو اکثر لوگ اپنے افعال میں اس (لام تعلیل) سے مراد لیتے ہیں۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنے اولیا اور اپنے منتخب بندوں کے دلوں کو جس علم اور حقیقت سے آشنا کیا ہے۔ ان لوگوں کی نگاہیں وہاں تک نہیں پہنچ پاتیں۔ یہ اہلِ علم ظاہر کلام میں سلف صالحین کی راہ پر چلتے ہیں اور جو فہم سے باطن ہو اس میں صاحبِ بصیرت حضرات کے نقشِ قدم پر قدم رکھتے ہیں۔ اس مقام پر عقل والے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے ان فرامین کے راز سے واقف ہوتے ہیں: «سَبَقَتْ رَحْمَتِي غَضَبِي» [1] ''میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی۔'' آپ ﷺ کا اقرار و بیان: «اَلشَّرُّ لَيْسَ إِلَيْكَ» ''شر تیری طرف منسوب نہیں کیا جاتا۔''

﴿ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ﴾ ''تیرے ہی ہاتھ میں ہر بھلائی ہے۔''

﴿ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ﴾ [الفلق: ۲] ''اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی۔''

﴿ وَ إِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ ﴾ [الشعراء: ۸۰] ''اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے۔''

﴿ وَّ اَنَّا لَا نَدْرِيْۤ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ﴾ [الجن: ۱۰]

''اور یہ کہ بے شک ہم نہیں جانتے کیا ان لوگوں کے ساتھ جو زمین میں ہیں، کسی برائی کا ارادہ کیا گیا ہے، یا ان کے رب نے ان کے ساتھ کسی بھلائی کا ارادہ فرمایا ہے۔''

اس طرح کی دیگر آیات میں شر کا یا فاعل حذف کر دیا جاتا ہے یا اس کو اسباب کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، یا وہ عموم کے ضمن میں درج ہو جاتا ہے۔

لیکن اس کو علاحدہ سے ہر چیز کے خالق کی طرف منسوب کر کے بیان کرنا کلامِ حکیم کے مقتضا کے خلاف ہے، کیوں کہ خالص امتیاز کے لیے نہیں، بلکہ ادب کا تقاضا کرنے والی حقیقت یہی لازم قرار دیتی ہے۔ یہیں سے بہت سارے لوگوں کا بلا عمل جنت میں جانے اور اس کے لیے بہت سارے لوگوں کو پیدا کرنے کا سبب بھی معلوم ہو جاتا ہے، لیکن جہنم میں کوئی بھی انسان عمل کے بغیر نہیں جائے گا اور اس میں صرف دنیا پرست ہی جائیں گے، لہٰذا:

﴿ وَمَاۤ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ﴾ [النساء: ۷۹]

''اور جو کوئی برائی تجھے پہنچے سو تیرے نفس کی طرف سے ہے۔''

﴿ وَمَاۤ اَصٰبَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ ﴾ [الشوریٰ: ۳۰]

''اور جو بھی تمھیں کوئی مصیبت پہنچی تو وہ اس کی وجہ سے ہے جو تمھارے ہاتھوں نے کمایا۔''

کی حقیقت بھی معلوم ہو جاتی ہے، حالاں کہ برائی اور مصیبت بھی نوشتہ تقدیر ہی ہے۔ حضرت ابو بکر اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ قول: "إن يكن صواباً فمن الله، وإن يكن خطأ فمني ومن الشيطان" ''اگر یہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٨٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٥١)

درست ہے تو اللہ کی طرف سے ہے اور اگر غلط ہے تو میری اور شیطان کی طرف سے ہے۔'' بھی اسی پر دلالت کرتا ہے۔ اس میں غور وفکر کرنے والا شخص دیکھتا ہے کہ اس میں حق کا ایک پہلو موجود ہے اور درست سبب کے ساتھ تعلق ہے۔ مکمل کتاب پر صرف عقل والے ہی ایمان رکھتے ہیں، لیکن وہ بہت تھوڑے ہیں۔ یہ کلی تقدیر کی طرف مختصر سا اشارہ تھا۔

جہاں تک بندے کی قدرت اور کسب کا تمام اسباب میں کوئی حیثیت رکھنے کا پہلو ہے تو اللہ عزوجل نے انسان کو یہ خصوصیت عطا کی ہے کہ اس کا علم اس کو دنیا میں اخلاق، حالات اور اثرات کا وارث بناتا ہے۔ آخرت میں بھی اس کو ایسے امور حاصل ہوں گے جو کسی دوسری مخلوق کو حاصل نہیں ہوں گے۔

وہ پہلو جو شخصی اور نوعی طور پر انسان کی ذات، صفات، اسما اور افعال کے ساتھ مخصوص ہیں وہ ناقابلِ شمار ہیں۔ ہر عقل مند ان کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور رکھتا ہے، اسی لیے اس کو امر و نہی کا مخاطب قرار دیا گیا ہے اور باوجودیکہ وہ اللہ تعالیٰ کا پیدا کردہ ہے، حقیقت اور کسب کے اعتبار سے اس کی طرف فعل کی نسبت کرنا درست ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بندے اور اس کے عمل کو پیدا کیا اور اس نے اس طرح یہ عمل اس کا عمل بنایا ہے کہ بندہ اس کو کرتا ہے، وہ اس سے صادر ہوتا ہے اور اس کی قدرت کے ساتھ وقوع پذیر ہوتا ہے۔

فعل کی کم از کم حالت یہ ہے کہ وہ بندے میں پیدا کردہ اخلاق اور صفات کے قائم مقام ہو جو دوسرے امور کا سبب بنتی ہیں تو کیا بندے کو ان سے علاحدہ کرنا درست ہے؟ کسی صورت نہیں۔

''امر'' اطاعت کرنے والوں کے لیے ان اسباب سے تعلق رکھتا ہے جن کے ساتھ ان سے فعل صادر ہوتا ہے۔ وہ ان کے محرک کو بیدار کرتا ہے، پھر وہ ان کے لیے فرماں برداری، اطاعت گزاری اور سپر اندازی کو لازم کرتا ہے۔ وہ اس جملہ تقدیر میں شامل ہے جس کے مطابق وہ پہلے سے نیک بخت لکھ دیے گئے ہیں اور وہ نافرمانوں کے حق میں وہ سبب ہے جس کی وجہ سے وہ نافرمانی کا مستحق بنتے ہیں، کیوں کہ اگر امر نہ ہو تو فرماں بردار اور نافرمان کی پہچان نہیں ہو سکتی۔

نیز وہ ان کی تقدیر میں پہلے سے لکھا ہے جس کے مطابق وہ گناہ کرتے ہیں اور وہ اس کے ساتھ، یعنی امر کے ساتھ بہت سارے لوگوں کو ہدایت دیتا ہے اور بہت سارے لوگوں کو گمراہ کرتا ہے۔

امر اور نہی کو جملہ تقدیروں میں داخل کرنے سے بہت سارے عقدے حل ہو جاتے ہیں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ عواقب اور انجام سے واقف ہے۔

جہاں تک بندوں کے حکم کا تعلق ہے تو ان کے علم میں ظاہراً گناہوں کا نہ ہونا ہے۔ تمام سے اسی فعل کے صادر ہونے کا قصد درحقیقت آسمانی کتابوں کے ذریعے انبیا کی زبانوں سے نکلنے والے شرعی حکم کا ظاہر مفہوم ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے حکم کو ظاہر کرنے والا ہے اور اس کا حکم چلتا ہے۔ ارادہ اور امر دونوں کی دو اقسام ہیں: عام ارادہ اور حکم اور شرعی ارادہ اور حکم۔ عام دونوں قسموں پر منطبق ہوتا ہے۔ شاید تقدیر اسی پر موقوف ہے۔ اس کے نافذ ہونے میں بھلائی ہی بھلائی ہے۔ وہ دونوں تقسیمات کے فرق کے ساتھ واقع ہونے کے ساتھ مخصوص ہے اور وہ اشیا کو ان کے مرتبے کے مطابق ہی رکھتا ہے۔

اگر فرماں برداری اور نافرمانی کی نسبت اس کی طرف کرنا صحیح ہے جس میں یہ پیدا کی گئی ہوں، چاہے وہ صفات کے پیدا کرنے کی طرح ہی ہوں تو کیا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ انسان کالا ہے، گورا ہے، چھوٹے قد کا ہے، لمبے قد کا ہے، ذہین ہے، کند ذہن ہے، عربی ہے، عجمی ہے؟ وہ تمام صفات اس کی طرف منسوب کی جائیں جن کو قائم کرنے میں اصلاً اس کا کوئی ارادہ ہی نہیں؟! پھر اس میں ان کی تاثیر کبھی اس کے مناسب حال ہوتی ہے اور کبھی مخالف۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر وہ فعل جو اس کے قصد اور ارادے کے ساتھ اس میں پیدا کیا جاتا ہے اس کی اس کی طرف نسبت کرنا کیوں کر بعید خیال کیا جاتا ہے؟ پھر کوئی کہنے والا کہتا ہے کہ بندے کا برائی میں کوئی حصہ یا اختیار نہیں۔ کیا یہ سب افعال اسی کے نہیں؟ بلکہ اسی کے ہیں اور ان میں کسی دوسرے کا کوئی حصہ نہیں، لیکن اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان کو اس کے لیے پیدا کیا اور فعل کی اس کے خالق کی طرف نسبت کرنا اس کے کرنے والے اور اس کے ظرف کی طرف نسبت کرنے کے منافی نہیں جو اس کا فاعل اور اس کا کاسب ہے، ہم نے پہلے قابلِ مذمت جبر کی تفصیل بیان کر دی ہے۔

ہم مختصر الفاظ میں خلق اور کسب کے سبب کا فرق بیان کر کے اپنی بات ختم کرتے ہیں۔

خلق کے دو معانی ہیں: ① از سرِ نو پیدا کرنا اور گھڑنا ڈھالنا۔ ② اندازہ کرنا اور صورت بنانا۔

اگر کہا جائے: خَلَقَ (اس نے پیدا کیا) تو ضروری ہے کہ اس نے اس کو صحیح اندازہ کر کے از سرِ نو پیدا کیا ہو۔ جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تمام اشیا کو عدم سے وجود بخشا اور ہر چیز کا اندازہ بنایا تو مطلقاً اس کی طرف خلق کی نسبت کرنا درست ہوا اور مخلوق میں تقدیر (اندازہ لگانا) لازم ہے، کیوں کہ وہ اس کی تحریر اور اس کا احاطہ کرنے سے عبارت ہے اور یہ تمام کائنات کو لازم ہے۔ اس طرح نہیں جس طرح وہ لوگ گمان کرتے ہیں جو خلق (پیدا کرنے) اور امر (حکم دینے) کے درمیان فرق کرتے ہوئے خلق کو صرف ان چیزوں کے ساتھ خاص کرتے ہیں جن کی مسافت ہوتی ہے، یعنی جو جسم رکھتی ہیں، یہ باطل اور خود ساختہ قول ہے۔ امر سے مراد اس کا کلام ہے اور یہی پہلے لوگوں نے اس کی تفسیر کی ہے۔ خلق کی تفسیر یہ ہے کہ اس کو ذہن میں صورتیں پیدا کرنے اور ان کا اندازہ لگانے کے مقابلے میں رکھا جاتا ہے۔ اس میں اختلاف ہے کہ کیا خلق محض ذہنی تصور ہے جس کی خارج میں کوئی حقیقت نہیں۔ خلق کو صرف اندازہ لگانے کے معنی میں لینا اور از سرِ نو پیدا کرنے سے صرفِ نظر کرنا۔

کسب کے بارے میں ہم نے بیان کیا ہے کہ اس میں اس کے ظرف میں اس کی تاثیر کی طرف دیکھا جاتا ہے، خواہ اس پر اس کی قدرت نہ ہی ہو۔ عربی زبان میں کہا جاتا ہے: "الثوب قد اكتسب من ريح المسك" ''کپڑے نے کستوری کی خوشبو کمائی۔'' (یعنی اس پر اس کا اثر ہے) "المسجد قد اكتسب الحرمة من أفعال العابدين" ''مسجد نے عبادت کرنے والوں کے افعال سے عزت و حرمت کمائی ہے۔'' "الجلد قد اكتسب الحرمة لمجاورة المصحف" ''جلد نے قرآن کریم کے ساتھ لگنے کی وجہ سے حرمت کمائی ہے۔'' "الثمرة قد اكتسبت لونا و ريحاً و طعماً" ''پھل نے رنگ بو اور ذائقہ کمایا ہے۔'' لہٰذا ہر ظرف جو کسی چیز سے متاثر ہو اور وہ اس پر اثر کرے، وہ اس کے مناسب ہو یا اس کے مخالف ہو، اس کے تاثر، تبدیلی اور ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلنے کی وجہ سے اس کو اکتساب کہنا درست ہے۔

جبکہ انسان اختیاری افعال سے متاثر ہوتا ہے، اضطراری افعال سے متاثر نہیں ہوتا، لہٰذا وہ جس حالت میں بھی ہو، وہ افعال اس کے اخلاق اور حالات پر اثر انداز ہوتے ہیں، حتیٰ کہ اس کے نزدیک بھی جو بندے کے مجموعی افعال کو جبر کا نام دیتا ہے، اس کو اپنی ذات میں اضطراری افعال کے برعکس اختیاری افعال کے اثرات کا یقین ہو جاتا ہے، لیکن اگر کسی صورت میں اضطراری افعال اس کی ذات میں کوئی معاملہ لازم کر دیں تو وہ اختیاری ہی ہوگا۔

پھر یہ بھی جاننا اہم ہے کہ اضطرار انسان کے بدن میں ہوتا ہے، اس کے دل میں نہیں۔ یہ یا تو اللہ تعالیٰ کے فعل کی وجہ سے ہوتا ہے، مثلاً وہ کسی کو بیمار کر دے، یا بندوں کے فعل سے، جیسے کسی کو قید کرنا، محبوس کرنا، لیکن انسان میں پھونکی گئی روح کے افعال سب اختیاری ہیں، مثلاً: اس کا اپنے ہاتھوں کو حرکت دینا۔ ایک پہلو کے اعتبار سے یہ سب اضطراری ہیں، جس طرح ہم نے بیان کیا ہے تو ان کا اضطرار تو بعینہٖ اضطرار ہے، لیکن ان کا اختیار اضطرار کے ساتھ ہے۔ اضطرار کی حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک پہلو سے تو محبوب ہوتا ہے اور ایک پہلو سے مکروہ، لیکن یہ سارے امور تکلیف کے وارد ہونے اور سزا و جزا کے تقاضے میں مانع نہیں۔ فی الحال اتنا لکھا جانا ہی ممکن ہو سکا ہے۔

والله يقول الحق وهو يهدي السبيل، والحمد لله وحده.[1]

کلمہ ''لَوْ'' (اگر) کا استعمال اور ایک شبہے کا ازالہ

سوال شیخ الاسلام سے سوال کیا گیا کہ ایک آدمی نے کہا: اگر تم نے یہ کام کیا ہوتا تو تمھیں یہ نتیجہ نہ بھگتنا پڑتا۔ دوسرے آدمی نے کہا: نبی اکرم ﷺ نے یہ کلمہ لَوْ (اگر) کہنے سے منع کیا ہے۔ یہ انسان کو کفر تک پہنچا دیتا ہے۔

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٨/٣٨٦-٤٠٥)

اس نے جواب دیا: نبی اکرم ﷺ نے یہ کلمہ خضر اور موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ سناتے وقت استعمال کیا تھا اور کہا تھا: ''اللہ موسیٰ علیہ السلام پر رحم فرمائے! ہماری یہ خواہش تھی کہ انھوں نے صبر کیا ہوتا، تا آنکہ اللہ تعالیٰ ہمیں ان دونوں کے معاملے کی مزید خبر دیتا۔'' دوسرے نے اس حدیث سے استدلال کیا: طاقت ور مومن ضعیف سے بہتر ہوتا ہے..... اور کلمہ لَوْ (اگر) شیطان کے عمل کی راہ کھول دیتا ہے۔ تو کیا یہ اس کے لیے ناسخ ہے یا نہیں؟

جواب الحمد للہ! اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے جو کچھ کہا ہے وہ سب حق ہے۔ کلمہ لَوْ (اگر) دو طرح استعمال ہوتا ہے:

1 ماضی پر غم زدہ ہونے اور تقدیر کا رونا رونے کے لیے اس لفظ کا استعمال کرنا۔ اس غرض کے لیے اس کا استعمال منع ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ﴾

[آل عمران: ١٥٦]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے کفر کیا اور اپنے بھائیوں کے بارے میں کہا جب انھوں نے زمین میں سفر کیا، یا وہ لڑنے والے تھے، اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ قتل کیے جاتے، تاکہ اللہ اسے ان کے دلوں میں حسرت بنا دے۔''

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے اسی مفہوم میں اسے استعمال کرنے سے منع کیا ہے کہ اگر تجھے کوئی مصیبت پہنچے تو یہ نہ کہہ: اگر میں ایسا کر لیتا تو اس طرح اور اس طرح ہو جاتا، لیکن یہ کہہ: ''قَدَّرَ اللّٰهُ وَمَا شَاءَ فَعَلَ'' ''اللہ نے مقدر کیا اور جو چاہا کیا۔ لفظ لَوْ (اگر) شیطان کے عمل کو کھول دیتا ہے۔''[1] یعنی تجھ پر غم اور رونے دھونے کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ یہ نقصان دہ ہوتا ہے۔ فائدہ مند نہیں۔ بلکہ یہ یقین رکھ جو تجھ پر مصیبت آئی وہ تجھ سے کبھی ٹل نہیں سکتی تھی اور جو تجھ سے ٹل گئی وہ تجھ تک پہنچ نہیں سکتی تھی، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ﴾ [التغابن: ١١]

''کوئی مصیبت نہیں پہنچی مگر اللہ کے اذن سے اور جو اللہ پر ایمان لے آئے وہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے۔''

مفسرین کہتے ہیں: اس سے وہ آدمی مراد ہے جس کو مصیبت آتی ہے اور وہ یقین رکھتا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، پھر وہ اس پر راضی ہو کر اسے تسلیم کر لیتا ہے۔

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٦٤)

2 دوسری صورت یہ ہے کہ مفید علم کو بیان کرنے کے لیے یہ لفظ استعمال کیا جائے، مثلاً قرآن میں ہے:

﴿ لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ﴾ [الأنبياء: ٢٢]

''اگر ان دونوں میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہوتے تو وہ دونوں ضرور بگڑ جاتے۔''

اسی طرح اچھائی کی محبت اور اس کا ارادہ بیان کرنے کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے، مثلاً: کوئی یہ کہے: اگر میرے پاس اتنا کچھ ہوتا جتنا فلاں کے پاس ہے تو میں بھی اس جیسے عمل کرتا۔ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

« وَدِدْتُ لَوْ أَنَّ مُوسىٰ صَبَرَ لِيَقُصَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا مِنْ خَبَرِهِمَا »[1]

''ہماری یہ خواہش تھی کہ موسیٰ علیہ السلام نے صبر کیا ہوتا ....الخ۔''

اسی باب سے تعلق رکھتا ہے، جس طرح یہ اس آیت میں ہے:

﴿ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ﴾ [القلم: ٩]

''وہ چاہتے ہیں کاش! تو نرمی کرے تو وہ بھی نرمی کریں۔''

نبی اکرم ﷺ نے یہ پسند کیا کہ اللہ ان کی خبر بیان کرتا رہتا، آپ ﷺ نے صبر کے لیے اپنی محبت بیان کرنے کے لیے ان دونوں کا ذکر کیا، کیوں کہ صبر کے نتیجے میں مفید باتوں کا علم ہوسکتا تھا، اس میں غم کرنے، جزع فزع کرنے اور تقدیر پر صبر کرنے کو ترک کرنے جیسی کوئی بات نہیں تھی۔

آپ ﷺ نے جو یہ الفاظ کہے تھے: « وَدِدْتُ لَوْ أَنَّ مُوسىٰ صَبَرَ » علمائے نحو نے اس کی یہ توجیہ پیش کی ہے کہ مقدر عبارت یوں تھی: « وَدِدْتُ أَنَّ مُوسىٰ صَبَرَ » ''میں نے چاہا کہ موسیٰ علیہ السلام صبر کرتے۔'' اسی طرح اس آیت: ﴿ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ﴾ [القلم: ٩] کے بارے میں بھی وہ کہتے ہیں کہ یہ مقدر عبارت یوں ہو گی: ''وَدُّوا أَنْ تُدْهِنَ'' کچھ نحویوں کا کہنا ہے کہ یہ لَوْ شرطیہ ہے، جس کا جواب محذوف ہے۔ دونوں مفروضوں کی بنا پر معنی معلوم ہی ہے، جو یہ ہے: اس فعل کی محبت اور اس کا ارادہ؛ اچھائی کی محبت اور اس کا ارادہ کرنا قابلِ تعریف کام ہے، مگر غم کرنا، رونا دھونا اور صبر کا دامن چھوڑنا قابلِ مذمت ہے۔ واللّٰه أعلم[2]

بندوں کے افعال قدیم ہیں یا حادث، نیز ماضی کے افعال میں ''ان شاء اللہ'' کہنے کی حقیقت

سوال کیا بندوں کے افعال قدیم ہیں یا اس وقت پیدا کیے جاتے ہیں جب انسان پیدا ہوتا ہے؟ جو شخص کہتا ہے بندوں کے تمام افعال، یعنی حرکات وغیرہ اس تقدیر سے تعلق رکھتے ہیں جو زمین و آسمان کی پیدائش کے پہلے

---

1 صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٤٨)

2 مجموع الفتاویٰ (١٨/٣٤٧-٣٤٩)

سے مقرر اور طے شدہ ہے اور جو شخص ماضی کے افعال میں ان شاء اللہ کہنے کا قائل نہیں، مثلاً کہتا ہے: یہ یقیناً کھجور کا درخت ہے، یا زیتون کا درخت ہے۔ وہ جو بات بھی کہتا ہے اس میں اللہ کی مرضی اور مشیت کا حوالہ دیتا ہے، اس کے خلاف کیا دلیل ہے؟ تفصیل سے بیان کریں۔

جواب الحمد لله رب العالمین. سلف صالحین اور ائمہ امت کا اس مسئلے پر اتفاق ہے کہ بندوں کے افعال مخلوق، یعنی پیدا کردہ ہیں، بشمول امام احمد تمام ائمہ اسلام رحمہم اللہ نے اس کی تصریح کی ہے۔ ان کے بعد کے ائمہ نے بھی اس کی صراحت کی ہے۔ بعض نے یہاں تک کہا ہے کہ جو شخص کہتا ہے کہ بندوں کے افعال پیدا کردہ نہیں وہ اس شخص کے قائم مقام ہے جو کہتا ہے: زمین و آسمان پیدا کردہ نہیں۔ یحییٰ بن سعید العطار کا قول ہے:

''میں ہمیشہ اپنے ساتھیوں کو یہ کہتے ہوئے سنتا آیا ہوں کہ بندوں کے افعال مخلوق ہیں۔''

جب قدریہ نے علانیہ کہنا شروع کیا کہ بندوں کے افعال اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ نہیں، اس وقت سلف صالحین نے بھی صراحت کے ساتھ یہ عقیدہ پیش کیا۔ قدریہ کا خیال تھا کہ بندہ خود اپنے افعال کو پیدا کرتا ہے یا وجود بخشتا ہے، اللہ تعالیٰ نہیں۔ تو سلف اور ائمہ نے بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ ہی بندوں کے تمام افعال وغیرہ کا خالق ہے۔

پھر جب اہلِ سنت کی طرف منسوب ایک گروہ نے یہ خیال پیش کیا کہ قرآن کریم کی تلاوت کرتے وقت بندوں کے الفاظ اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ نہیں تو امام احمد رحمہ اللہ نے ان لوگوں کی تردید کی اور اس قول کے قائلین کو بدعتی قرار دیا۔ جب وہ فوت ہو گئے تو ان کے بعد ان کے ساتھی ابوبکر مروزی نے اس موضوع پر ایک کتاب تصنیف کی۔ ابوبکر الخلال نے ''کتاب السنة'' میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اس میں انھوں نے ابو طالب کا یہ مسئلہ بھی ذکر کیا جس میں اس نے کہا: قرآن کریم کے ساتھ میرا تلفظ غیر مخلوق ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا پیدا کردہ نہیں۔ تو امام احمد رحمہ اللہ نے اس کی تردید و مخالفت کی۔ سب سے پہلے جہمیہ نے قرآن پڑھتے وقت قرآنی الفاظ کے مخلوق ہونے کا نظریہ پیش کیا۔

ان کے دونوں بیٹوں عبداللہ اور صالح اور ان کے چچا کے بیٹے حنبل نے ان سے یہ قول نقل کیا ہے۔ مروزی اور فوران وغیرہ ان کے جلیل القدر ساتھیوں میں سے ہیں۔

امام احمد رحمہ اللہ کے ساتھیوں میں سے ائمہ اور دیگر علمائے اہلِ سنت نے اس شخص کے قول کو دین میں اجنبی اور غیر معروف قرار دیا ہے جو کہتا ہے کہ بندوں کی آوازیں اور افعال غیر مخلوق ہیں۔ اس موضوع پر امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی ایک کتاب تصنیف کی ہے۔ ائمہ سنت نے اس شخص کو بدعتی اور جہمی قرار دیا ہے جو کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آواز کے ساتھ کلام نہیں کرتا، یا قرآن کے حروف مخلوق ہیں، یا قرآن پڑھتے وقت منہ سے نکلنے والے الفاظ مخلوق ہیں۔ ائمہ کرام نے اس بدعت کی تردید کی، ہم نے کسی دوسری جگہ اس کی تفصیل ذکر کی ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ کے مشہور ساتھیوں اور ان کے علاوہ دیگر معروف علمائے کرام میں سے کسی ایک نے بھی یہ نہیں کہا کہ بندوں کے افعال قدیم ہیں۔ البتہ میں نے سرزمینِ عجم اور مصر میں کچھ متاخر شافعیوں یا حنبلیوں کا یہ قول دیکھا ہے۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ کچھ مصری کہتے ہیں: بندوں کے اچھے یا برے افعال قدیم ہیں۔ وہ کہتے ہیں: ہماری افعال سے بعینہ حرکات مراد نہیں، بلکہ ان افعال کا ثواب مراد ہے، جس طرح حدیث میں ذکر ہوا ہے:

« إِنَّ الْمُؤْمِنَ يَرَى عَمَلَهُ فِي صُورَةِ رَجُلٍ حَسَنِ الْوَجْهِ طَيِّبِ الرِّيحِ »[1]

''مومن اپنے عمل کو خوب صوت چہرے اور پاکیزہ خوش بو والے آدمی کی شکل میں دیکھے گا۔''

انھوں نے اس کی دلیل یہ دی ہے کہ افعال کا تعلق تقدیر سے ہے اور تقدیر اللہ تعالیٰ کا راز اور اس کی صفات میں سے ایک صفت ہے اور اس کی صفات قدیم ہیں۔ انھوں نے یہ دلیل بھی دی ہے کہ شریعتیں غیر مخلوق ہیں، کیوں کہ یہ اللہ کا حکم اور اس کا کلام ہیں اور افعال شریعتیں ہی ہیں، لہٰذا یہ قدیم ہوں گے۔

یہ انتہا درجے کا فاسد نظریہ ہے اور بشمول امام احمد تمام ائمہ اسلام کی صریح عبارتوں کے خلاف ہے۔ امام احمد اور دیگر تمام ائمہ اسلام رحمہم اللہ نے یہ تصریح کی ہے کہ وہ ثواب جو اللہ تعالیٰ قرآن کریم کی تلاوت پر دیتا ہے وہ مخلوق ہے، تو باقی تمام اعمال کا ثواب کیوں کر مخلوق نہیں ہوگا؟!

جب جہمیہ نے امام احمد اور دیگر ائمہ کے خلاف رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان سے قرآن کے مخلوق ہونے پر استدلال کیا کہ آپ ﷺ نے فرمایا ہے:

''سورت بقرہ اور سورت آل عمران دو بادلوں کی صورت میں یا باجماعت پرندوں کے دو گروہوں کی شکل میں آئیں گی اور قرآن کریم بے رنگ اور دبلے آدمی کی صورت میں آئے گا۔''[2]

انھوں نے کہا کہ جو آتا اور جاتا ہے، وہ مخلوق کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ امام احمد نے اس کا جواب یہ دیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان آیات:

﴿ هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّآ أَن تَأْتِيَهُمُ ٱلْمَلَٰٓئِكَةُ أَوْ يَأْتِيَ رَبُّكَ أَوْ يَأْتِيَ بَعْضُ ءَايَٰتِ رَبِّكَ ۗ يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ ءَايَٰتِ رَبِّكَ ﴾ [الأنعام: ١٥٨]

''وہ اس کے سوا کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں، یا تیرا رب آئے، یا تیرے

---

[1] مسند أحمد (٤/٢٨٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٦٧٦)

[2] مسند أحمد (٥/٣٤٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٠٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٧٨١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٨٨٩)

رب کی کوئی نشانی آئے، جس دن تیرے رب کی کوئی نشانی آئے گی۔''

﴿ وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴾ [الفجر: ۲۲]

''اور تیرا رب آئے گا اور فرشتے جو صف در صف ہوں گے۔''

میں اپنے آنے اور اپنی تشریف آوری کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس کے باوجود یہ بالاتفاق اس کے مخلوق ہونے کی دلیل نہیں، بلکہ کہنے والا تو یہ بھی کہتا ہے: ''اس کا حکم آیا۔'' معتزلہ جو قرآن کریم کے مخلوق ہونے کے قائل ہیں یہی کہتے ہیں۔ وہ اس آیت کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ اس کے آنے سے اس کے حکم کا آنا مراد ہے۔ تو پھر قرآن کے آنے کی اس کے ثواب کے آنے کے ساتھ تاویل کیوں نہیں کی جا سکتی؟ اور آپ ﷺ کے اس فرمان: ''سورت بقرہ اور آل عمران آئے گی۔'' سے یہ کیوں نہ مراد لیا جائے کہ ان کا ثواب آئے گا اور ثواب مخلوق ہے؟

یہ مفہوم کئی علما نے بیان کیا ہے اور انھوں نے وضاحت کی ہے کہ حدیث شریف میں سورت بقرہ اور آل عمران کے آنے سے مراد ان کے ثواب کا آنا ہے، تاکہ جہمیہ کے شبہے کا جواب دیا جائے جو کہتے ہیں کہ قرآن کا آنا اور تشریف لانا اس کے مخلوق ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اگر ثواب بھی، جو بادل کی صورت میں یا نوجوان کی صورت میں آئے گا وہ غیر مخلوق ہوتا تو قرآن اور ثواب کے درمیان کوئی فرق نہ ہوتا اور ان کو یہ کہنے کی ضرورت نہ ہوتی کہ اس کا ثواب آئے گا؟ اور ان کا جواب جہمیہ کے لیے ٹھیک نہ بیٹھتا، بلکہ جہمیہ کہتے: تم ہی کہتے ہو وہ غیر مخلوق ہے اور تم ہی کہتے ہو اس کا ثواب بھی غیر مخلوق ہے تو تمھارا یہ جواب تمھارے لیے مفید نہیں۔

معلوم ہوا اہلِ سنت جہمیہ کے ساتھ اس بات پر متفق تھے کہ قرآن کریم کی تلاوت کا ثواب مخلوق ہے تو سارے اعمال کا ثواب مخلوق کیوں نہیں؟ یہ بالکل واضح ہے، کیوں کہ جزا وہ چیز ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو وعدہ دیا ہے اور سزا وہ ہے جس سے اس نے ان کو ڈرایا ہے۔ ثواب جنت اور جو کچھ اس میں ہے اس پر مشتمل ہے اور سزا جہنم اور جو کچھ اس میں ہے اس پر مشتمل ہے۔ جنت اپنے مشمولات سمیت اور جہنم اپنے مشمولات سمیت مخلوق، یعنی اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے زنادقہ اور جہمیہ کی تردید میں جو لکھا اس میں یہ دلیل بھی ذکر کی۔ انھوں نے کہا:

باب (قرآن کے مخلوق ہونے پر جہمیہ کا استدلال اور اس کی تردید):

جہمیہ کا قرآن کے مخلوق ہونے پر ان احادیث سے استدلال کا دعویٰ جو بیان کرتی ہیں کہ قرآن کریم بے رنگ اور دبلے نوجوان کی شکل میں آئے گا اور اپنے ساتھی (پڑھنے والے) سے کہے گا: کیا تم مجھے پہچانتے ہو؟ وہ اس سے کہے گا: تم کون ہو؟ وہ جواب دے گا: میں وہ قرآن ہوں جس نے تجھے دن میں پیاسا رکھا اور رات میں جگائے رکھا۔

آپ ﷺ نے فرمایا: پھر وہ اس کو اللہ کے پاس لے کر آئے گا اور کہے گا: اے رب!''[1] انھوں نے اس سے یہ دعویٰ کیا کہ قرآن مخلوق ہے۔ ہم نے ان کو جواب دیا: قرآن اس معنی میں نہیں آئے گا کہ وہ بنفسِ نفیس آئے گا۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ پڑھی، اس کو اتنا اتنا اجر ملے گا۔''[2] تو کیا تم دیکھتے نہیں کہ جو ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ پڑھتا ہے، وہ خود نہیں آئے گی، بلکہ اس کا ثواب آئے گا، کیوں کہ ہم قرآن پڑھتے ہیں اور ہم کہتے ہیں: وہ آئے گا، نہ ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہوگا۔

امام احمد رحمہ اللہ نے بیان کیا کہ جو آئے گا وہ ثواب ہوگا اور وہ عمل سے پیدا کردہ ہے۔ تو ان اعمال کی سزا کس طرح ہوگی جو ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلتے رہتے ہیں؟ اگر ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ کا یہ ثواب ہے اور یہ قرآن کا ثواب ہے تو دوسرے اعمال کا ثواب کس طرح ہوگا؟!

استدلال کرنے والے کا یہ استدلال کرنا کہ افعال اللہ تعالیٰ کی قدر ہیں تو لفظ قدر سے تقدیر بھی مراد ہوتی ہے اور اندازہ کردہ چیز بھی۔ اگر سائل کی مراد یہ ہے کہ بندوں کے افعال اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے تعلق رکھتے ہیں جو علم، کلام اور مشیت وغیرہ کی طرح کی اس کی صفات سے مرکب ہے تو یہ غلط اور باطل بات ہے۔ بندوں کے افعال میں سے کوئی چیز بھی اللہ تعالیٰ کی صفات سے تعلق نہیں رکھتی۔ اگر اس کی مراد یہ ہے کہ ان کے افعال اندازہ لگائے گئے اور اللہ تعالیٰ کے طے کردہ ہیں تو یہ بات صحیح ہے۔ جس طرح تمام مخلوقات مقدر اور طے کردہ ہیں، اسی طرح افعال بھی اس کے مقرر کردہ ہیں۔ صحیح میں یہ حدیث ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو پیدا کرنے میں سے پچاس ہزار سال پہلے مخلوقات کی تقدیریں مقرر کر دی تھیں اور یہ تمام تقدیریں مخلوق، یعنی پیدا کردہ ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے بتایا جو صادق (سچ بولنے والے) و مصدوق (جنھیں سچا سمجھا جاتا ہے) ہیں: ''تم میں سے ہر ایک کی پیدایش اس کی ماں کے پیٹ میں چالیس دن نطفے کی شکل میں رہتی ہے، پھر وہ اتنے ہی دن جما ہوا خون بنی رہتی ہے، اتنے ہی دن لوتھڑا بنی رہتی ہے، پھر اس کی طرف ایک فرشتے کو بھیجا جاتا ہے، جس کو چار باتوں کا حکم دیا جاتا ہے: ① اس کا رزق ② اس کی عمر ③ اس کا عمل ④ اس کا نیک بخت یا بدبخت ہونا لکھ، پھر اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔''[3]

لہٰذا جس طرح اس کا رزق اور اس کی عمر مقدر ہے، اسی طرح اس کا عمل بھی مقدر ہے۔ یہ سب کو معلوم ہے

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٧٨١) مسند أحمد (٣٥٢/٥) ضعيف الجامع (٦٤٣٣)

[2] مسند أحمد (٣٣٧/٣) سنن الدارمي (٤٥٩/٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٨٩٣) السلسلة الصحيحة (٥٨٩)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٣٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٣)

کہ انسان جو رزق کھاتا ہے وہ مقدر ہونے کے باوجود مخلوق، یعنی پیدا کردہ ہے۔ اسی طرح اس کا عمل ہے۔ اس کا نیک بخت ہونا اور بد بخت ہونا بھی، اس کی نیک بختی اور بد بختی اس کے عمل کا ثواب اور سزا ہے اور یہ سب مقدر ہے، جس طرح رزق مقدر ہے اور مقدر مخلوق ہے۔

ان کا یہ کہنا کہ اعمال شریعتیں ہی ہیں اور شریعتیں غیر مخلوق ہیں، اس کے جواب میں ان سے کہا جائے گا کہ لفظ شریعت سے بھی دو چیزیں مراد ہوتی ہیں: ایک اللہ تعالیٰ کا وہ کلام جس کے ذریعے اس نے دین کے احکام اور شریعت جاری کی اور دوسرے مشروع، یعنی جائز اور شریعت بنائے گئے اعمال۔ ان الفاظ سے مصدری معنی بھی مراد ہوتا ہے اور مفعولی معنی بھی، جس طرح لفظ خلق وغیرہ ہے۔

اگر تم کہو کہ بندوں کے اعمال وہ شرع ہے جو اللہ کا کلام ہے، یہ غلط بات ہے اور اس کا باطل ہونا عیاں ہے۔ اگر تم یہ مراد لو کہ اعمال اللہ کے حکم کے ساتھ مشروع ہیں تو یہ حق بات ہے، لیکن اللہ کا امر اور حکم غیر مخلوق ہے اور مامور بہ جو اللہ کے حکم کے نتیجے میں عمل میں آئے ہیں وہ مخلوق ہے، جس طرح بندہ جس کو حکم دیا جاتا ہے وہ بھی مخلوق ہے۔

لفظ امر سے مصدری معنی بھی مراد لیا جاتا ہے اور مفعولی معنی بھی۔ مفعول مخلوق ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اَتٰۤی اَمْرُ اللّٰهِ ﴾ [النحل:١] ''اللہ کا حکم آ گیا۔''

نیز فرمایا:

﴿ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَا ﴾ [الأحزاب: ٣٨]

''اور اللہ کا حکم ہمیشہ سے اندازے کے مطابق ہے، جو طے کیا ہوا ہے۔''

یہاں سے مامور بہ (جس کا حکم دیا گیا ہے) مراد ہے، اس کا امر مراد نہیں جو اس کا کلام ہے۔ یہ آیت جس سے انھوں نے استدلال کیا ہے، یہ شرع کو شامل ہے، امرِ الٰہی اور قدرِ الٰہی ہے۔ اس جگہ دو فریق گمراہ ہوئے ہیں:

جہمیہ جو کہتے ہیں کہ اللہ کا کلام مخلوق ہے اور وہ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں: ﴿ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَا ﴾ وہ کہتے ہیں جو مقدور ہے وہ مخلوق ہے اور دوسرے یہ حلول کے قائلین گمراہ جو بندے کے فعل کو اللہ کا امر اور قدر قرار دے کر قدیم کہتے ہیں، لیکن اس کا امر اور قدر غیر مخلوق ہے۔

یہاں شبہے کا باعث یہ چیز ہے کہ لفظ ''قدر''، ''شرع'' اور ''امر'' سے مصدری معنی بھی مراد لیا جاتا ہے اور مفعولی معنی بھی۔

اس آیت: ﴿ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَا ﴾ میں امر سے مراد مامور بہ مقدور ہے اور یہ مخلوق ہے، لیکن اس دوسری آیت:

﴿ ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗۤ اِلَيْكُمْ ﴾ [الطلاق: ۵] ''یہ اللہ کا حکم ہے جسے اس نے تمھاری طرف نازل کیا ہے۔''
میں اس کے امر سے اس کا کلام مراد ہے، کیوں کہ ہماری طرف وہ افعال نہیں اترتے جن کا ہمیں حکم دیا گیا ہے، بلکہ قرآن اتارا گیا ہے۔ یہ اس آیت کی طرح ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا ﴾ [النساء: ۵۸]

''بے شک اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے حق داروں کو ادا کرو۔''

تو یہ امر اس کا کلام ہے۔

اگر جہمی جس کا قول حلول پر منتج ہوتا ہے، اس آیت: ﴿ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَا ۙ﴾ سے استدلال کرے تو اس سے کہا جائے گا کہ اس سے مراد مامور بہ ہے جس طرح اس آیت میں ہے: ﴿ اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ﴾ نیز وہ حادثات جن کو اللہ تعالیٰ پیدا کرتا ہے، ان کے بارے میں کہا جاتا ہے: ''یہ امر عظیم ہے۔'' اگر حلول کا قائل جو رب تعالیٰ کی صفات کو اس کی ذات کے ساتھ ملی ہوئی اور مخلوقات میں اتری ہوئی، یعنی حلول کی ہوئی قرار دیتا ہے، وہ اس آیت: ﴿ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَا ۙ﴾ سے استدلال کرے اور کہے: افعال اللہ تعالیٰ کی قدر اور اس کا امر ہیں، اس کا امر غیر مخلوق ہے اور اس کی قدر بھی غیر مخلوق ہے تو اس سے کہا جائے گا، اس کا وہ امر اور قدر جو اس کی مشیت اور کلام کی طرح اس کی صفت ہے، وہ غیر مخلوق ہے، لیکن اس کا وہ امر جو قدرِ مقدور، یعنی اندازہ کیا گیا ہے، وہ مخلوق ہے، لہٰذا مقدور مخلوق ہے اور مامور بہ بھی مخلوق، اگرچہ ان دونوں کو امر اور قدر کہا جاتا ہے۔

پھر ان گمراہوں سے کہا جائے گا، مان لیا مامور بہ کو امر اور شرع کہا جاتا ہے، لیکن جس سے منع کیا گیا ہے وہ مامور بہ ہے نہ مشروع، بلکہ وہ امر اور شرع کے مخالف ہے اور اس سے منع کیا گیا ہے، لہٰذا تم کس طرح کفر، نافرمانی اور گناہ کو شرع کہتے ہو؟ یہ شریعتوں میں داخل نہیں، بلکہ شریعتوں نے ان سے منع کیا ہے۔ جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا:

﴿ ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ ﴾ [الجاثیة: ۱۸]

''پھر ہم نے تجھے (دین کے) معاملے میں ایک واضح راستے پر لگا دیا۔''

تو کیا کفر، نافرمانی اور گناہ اس شریعت میں داخل ہیں؟ کیا رسول نے ان امور سے بچنے اور ان سے دور رہنے کا حکم دیا ہے یا ان کے ارتکاب کا؟

سائل کا یہ سوال کہ جو کہتا ہے کہ بندوں کے افعال، یعنی حرکات وغیرہ اس تقدیر سے تعلق رکھتے ہیں جو زمین وآسمان کی پیدایش سے پہلے سے مقدر ہے اس کے خلاف کیا دلیل ہے؟

اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ جس نے یہ بات کہی ہے اس نے اچھی اور درست بات کہی ہے، اس کے

خلاف کوئی دلیل نہیں، بلکہ یہ بات اس کے مطلوب کی نقیض پر حجت ہے، رسولِ کریم ﷺ کے یہ الفاظ جو صحیح مسلم میں مروی ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی پیدایش سے پچاس ہزار سال پہلے مخلوقات کی تقدیریں بنا دیں۔''[1] اس نے ان کے اعمال، رزق، شکلیں اور رنگ مقرر کر دیے اور یہ سب مخلوق ہے تو یہ حدیث اعمال کے مقدور اور مخلوق ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ کیا کوئی عقل مند یہ کہتا ہے کہ بندے کا عمل اس کے وجود سے بھی پہلے موجود تھا؟ بندے کا عمل اس کی وہ حرکت ہوتی ہے جو اس سے پیدا ہوتی ہے تو وہ اس کے وجود سے پہلے کس طرح موجود ہو گی۔

جو اس کے کلام کی تفسیر کرتا ہے کہ ہم نے حرکت مراد نہیں لی، اس کا ثواب مراد لیا ہے تو اس سے کہا جائے گا: اللہ تعالیٰ کے سوا جو بھی ہے وہ مخلوق ہے، اس کا کلام اور اس کی صفات اس کے مسمیٰ سے خارج نہیں، بلکہ اس کا کلام اس کے نام کے مسمیٰ میں داخل ہے۔ اگر کوئی کہنے والا کہے: اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات کے سوا سب کچھ مخلوق ہے، تاکہ وہ اس شبہے کو زائل کر سکے تو اس نے صحیح معنی کا قصد کیا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی سلف صالحین کی طرح کہے: اللہ خالق ہے اور اس کے سوا سب کچھ مخلوق، سوائے قرآن کے کہ وہ اسی سے شروع ہوا اور اسی کی طرف لوٹے گا، انھوں نے قرآن کو مستثنیٰ کیا، تاکہ سننے والے کے دل میں یہ خیال پیدا نہ ہو جائے کہ قرآنِ منزل مخلوق ہے۔

جہمیہ لوگوں سے کہا کرتے تھے: کیا قرآن اللہ ہے یا اللہ کے علاوہ؟ جو ان کے مقصود سے نا آشنا ہوتا وہ کہتا: وہ اللہ کے علاوہ ہے، پھر وہ کہتے: اللہ کے سوا جو ہے وہ سب مخلوق ہے۔

چنانچہ سلف میں سے جس کسی نے یہ عبارت کہی، اس لیے کہی کہ جہمیہ کے قرآن کے مخلوق ہونے کے نظریے سے ناواقف شخص یہ گمان نہ کر بیٹھے کہ یہ اس کی عبارت: ''اللہ کے سوا سب مخلوق ہے'' کے عموم میں داخل ہے، اس لیے انھوں نے قرآن کو مستثنیٰ کیا۔ جہاں تک بندوں کے افعال کا تعلق ہے تو قدریہ کے علاوہ کسی نے بھی ان کو مخلوقات کے عموم سے مستثنیٰ نہیں کیا، وہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا نہیں کیا۔

لیکن یہ کہتے ہیں کہ یہ پہلے نہیں تھے، اس کے بعد وجود میں آئے، مگر یہ حلولیہ اس کا انکار کرتے ہیں۔ میں متقدمین اہلِ سنت اور اہلِ بدعت میں سے کسی کو بھی نہیں جانتا جس نے یہ کہا ہو کہ بندوں کے اچھے یا برے افعال قدیم ہیں، البتہ بعض متاخر مصریوں اور بعض متاخر عجمیوں کے بارے میں مجھے یہ معلوم ہے کہ وہ اس کے قائل ہیں۔ تاہم میں نے بعض شامی علما کو دیکھا ہے کہ وہ اس میں توقف کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: یہ فیصلہ شدہ اور طے شدہ ہے، ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ مخلوق ہیں یا غیر مخلوق۔ کچھ لوگوں نے اچھے افعال، جیسے کہ ایمان میں فرق کیا ہے۔

ایمان کے بارے میں سلف کا کلام کسی دوسری جگہ مذکور ہے۔

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٥٣)

افعال کے قدیم ہونے کے متعلق اقوال:

افعال کے قدیم ہونے یا اچھے افعال کے قدیم ہونے کے بارے میں یہ تین اقوال ہیں: ① یہ قدیم ہیں، ② نیک افعال قدیم ہیں، ③ اس مسئلے میں توقف کیا جائے۔ یہ تمام اقوال باطل ہیں جن کا مشہور ائمہ میں سے کوئی بھی قائل نہیں۔ جس انسان کو اس کا تصور ہو جو وہ کہتا ہے، وہ بھی ان کا قائل نہیں ہو سکتا۔ ان کو ان میں ان کے اس گمان نے ڈال دیا جو انھوں نے قرآن کے لفظ کے مسئلے، تلاوت اور متلو کے مسئلے اور ایمان کے مسئلے میں کیا۔ ہم نے کسی دوسری جگہ مسئلہ قران میں لوگوں کے مذاہب واضح کر دیے ہیں، وہ صحیح اور معتدل قول بھی بیان کر دیا ہے جو سلف صالحین کا عقیدہ تھا اور معقول و منقول کے مطابق تھا اور اس باب میں اثبات اور نفی کرنے والوں کا انحراف بھی بیان کر دیا ہے۔

بندے کی بعض صفات کو قدیم قرار دینے والوں میں سے ایک گروہ نے مآلِ کار یہ نظریہ اختیار کیا ہے کہ بندے کی بعض صفات قدیم ہیں، یہاں تک کہ اس میں موجود روح قدیم ہے اور وہ سورج اور چاند وغیرہ میں روشنی کو بھی قدیم قرار دیتے ہیں۔ ہم نے کسی دوسری جگہ ان جیسے نظریات کا باطل اور فاسد ہونا اور سلف صالحین اور ائمہ امت کے مذہب کے مخالف ہونا بیان کیا ہے۔ یہ اس نظریے میں بھی مشترک ہیں کہ خالق کی بعض صفات مخلوق میں حلول کر چکی ہیں، لیکن جہمیہ جو ان سے بھی برے ہیں وہ انجام کار خود خالق کو تمام مخلوقات میں اترا ہوا یا اس کو عین مخلوقات کا وجود قرار دیتے ہیں، چنانچہ ان حلولیہ جہمیہ کا شیخ و مرشد ان حلولیہ صفاتیہ کے شیخ و مرشد کا ہم نوا بن چکا ہے۔

یہ اور ان جیسی بدعات اور شریعت کی مخالفت کی وجہ سے امت مصیبتوں کا شکار در شکار ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ اور دیگر ائمہ کرام نے حلول کے نظریے کی تردید کی اور ان کو نصرانیوں کے مشابہ قرار دیا۔ امام صاحب نے ''زنادقہ اور جہمیہ'' کی تردید کرتے ہوئے کہا: اللہ کے دشمن جہم کے بارے میں ہمیں معلوم ہوا ہے کہ وہ خراسانی ترمذی تھا۔ وہ بہت زیادہ بحث مباحثہ کیا کرتا تھا اور اس کی اکثر گفتگو اللہ تعالیٰ کے بارے میں ہوتی تھی۔ اس کی سمنیہ نامی مشرکوں سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اس کو پہچانا اور یہ پیش کش کی کہ ہم تمھارے ساتھ گفتگو کرتے ہیں، اگر ہماری دلیل غالب ہوگئی تو تمھیں ہمارے دین میں داخل ہونا پڑے گا اور اگر تیری دلیل زیادہ وزنی ثابت ہوئی تو ہم تمھارا دین اختیار کر لیں گے۔ انھوں نے جہم سے جو بحث کی اس میں یہ بھی کہا: کیا تم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ تمھارا ایک معبود ہے؟ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ انھوں نے پھر یہ سوال کیا: کیا تم نے اپنے معبود کو دیکھا ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ انھوں نے کہا: کیا تم نے اس کا کلام سنا ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ انھوں نے کہا: کیا تم نے اس کی بو سونگھی ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ انھوں نے کہا: کیا تم نے اس کو محسوس کیا ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔

تو انھوں نے کہا: پھر تجھے کیسے معلوم ہوا کہ وہ معبود ہے؟ یہ سن کر جہم انگشت بدنداں رہ گیا اور چالیس دن تک

اس کو سجھائی نہ دیا کہ کس کی عبادت کرے! پھر اس نے زندیق عیسائیوں کی دلیل کی طرح ایک دلیل ڈھونڈ نکالی۔

زندیق عیسائیوں کا دعویٰ ہے کہ حضرت عیسیٰ میں جو روح ہے وہ اللہ کی روح ہے جو اس کی ذات سے تعلق رکھتی ہے۔ جب وہ کوئی حکم پیدا کرنا چاہتا ہے تو اپنی مخلوق میں سے کسی میں داخل ہو جاتا ہے، اس کی زبان سے گفتگو کرتا ہے اور جو حکم دینا ہوتا ہے دیتا ہے، جس سے منع کرنا ہوتا ہے، منع کرتا ہے اور یہ روح نظروں سے اوجھل ہے۔

چنانچہ جہم نے دلیل کا استدارک کیا اور سمنی سے کہا: کیا تو یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ تجھ میں ایک روح ہے؟ اس نے کہا: کیوں نہیں، اس نے کہا: کیا تم نے روح کو دیکھا ہے؟ اس نے کہا: نہیں، اس نے کہا: کیا تم نے اس کے ساتھ گفتگو کی ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ اس نے کہا: کیا تم نے اس کو محسوس کیا ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔

تو اس نے جواب دیا کہ اللہ بھی ایسے ہی ہے، اس کا چہرہ دیکھا جاتا ہے نہ اس کی آواز سنی جاتی ہے اور نہ اس کی بو ہی سونگھی جاتی ہے، وہ نظروں سے غائب ہے اور جگہ کی قید سے آزاد ہے۔ اس کے بعد امام صاحب نے ان کی تردید کی اور بات کرتے کرتے یہاں تک پہنچے: پھر جہم نے ایک اور بات کا دعویٰ کیا، اس نے کہا: ہم نے کتاب اللہ میں ایک آیت پائی ہے جو کہتی ہے کہ قرآن مخلوق ہے، ہم نے پوچھا: وہ کون سی آیت ہے؟ تو اس نے جواب دیا: یہ آیت:

﴿ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ﴾ [النساء: ۱۷۱]

''نہیں ہے مسیح عیسیٰ ابن مریم مگر اللہ کا رسول اور اس کا کلمہ۔''

عیسیٰ مخلوق ہے۔ ہم نے جواب دیا: اللہ تعالیٰ نے تجھے فہمِ قرآن سے محروم کیا ہے عیسیٰ علیہ السلام پر وہ الفاظ وارد ہوتے ہیں جو قرآن پر وارد نہیں ہوتے، کیوں کہ ان کو مولود، شیر خوار، بچہ اور لڑکا کہا جاتا ہے، جو کھاتا ہے، پیتا ہے، امر و نہی کا مخاطب ہے اور وعد و وعید کا مصداق ہے۔ پھر وہ حضرت نوح اور ابراہیم علیہما السلام کی اولاد سے ہے، لہٰذا جو ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق کہتے ہیں قرآن کے متعلق نہیں کہہ سکتے۔ کیا تم نے کبھی اللہ تعالیٰ کو سنا ہے کہ اس نے جو عیسیٰ کے بارے میں کہا ہے وہی قرآن کے بارے میں بھی کہا ہو؟ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ اَلْقٰهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ ﴾ [النساء: ۱۷۱]

''نہیں ہے مسیح عیسیٰ ابن مریم مگر اللہ کا رسول اور اس کا کلمہ، جو اس نے مریم کی طرف بھیجا۔''

یہاں کلمے سے مراد وہ کلمہ کُنْ ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے لیے حضرت مریم علیہا السلام کو القا کیا تھا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کلمہ کُنْ (ہو جا) کے ساتھ پیدا ہوئے، وہ بذاتِ خود کُنْ نہیں تھے، بلکہ کُنْ کے ساتھ وجود میں آئے تھے، لہٰذا اللہ کی طرف سے کُنْ اس کا قول اور کلام ہے، اللہ کی طرف سے لفظ کُنْ مخلوق نہیں۔

عیسائیوں اور جہمیہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملے میں اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھا ہے، کیوں کہ جہمیہ کہتے ہیں

کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی روح اور کلمہ ہے، لیکن کلمہ مخلوق، یعنی پیدا کردہ ہے۔ عیسائی کہتے ہیں: عیسیٰ علیہ السلام اللہ کی ذات سے اللہ کی روح ہے اور اللہ کی ذات سے اللہ کا کلمہ ہے، جس طرح کہا جاتا ہے کہ یہ اس کپڑے کا چیتھڑا ہے۔

ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کلمہ کن کے ساتھ وجود میں آئے، وہ بذاتِ خود کلمہ نہیں اور آیت میں ﴿ وَ رُوْحٌ مِّنْهُ ﴾ ''اور اس کی طرف سے روح ہے'' کا یہ معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان میں روح ڈالی گئی، جس طرح اس آیت میں ہے:

﴿ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ﴾ [الجاثية: ١٣]

''اور اس نے تمھاری خاطر جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو اپنی طرف سے مسخر کر دیا۔''

سب کچھ اس کی طرف سے، یعنی اس کے امر سے ہے۔ روح اللہ (اللہ کی روح) کی تفسیر یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے کلمے کے ساتھ روح ہے، جس کو اس نے پیدا کیا، جس طرح کہا جاتا ہے: عبداللہ (اللہ کا بندہ) سماء اللہ (اللہ کا آسمان)۔

امام احمد رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ بندوں کے اعمال تو ایک طرف رہے، ان کا کلام بھی مخلوق ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

جہمیہ کے اللہ تعالیٰ کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کلام کرنے کے انکار کا بیان:

ہم نے ان سے پوچھا: تم نے کیوں اس کا انکار کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا: اللہ تعالیٰ نے کبھی کلام کیا ہے نہ وہ کلام کرتا ہے۔ اس نے ایک چیز بنائی جس نے اللہ کی طرف سے بیان کیا اور ایک آواز پیدا کی تو سنا دی، کیوں کہ انھوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ کلام کرنے کے لیے پیٹ، زبان اور ہونٹوں کا ہونا لازمی ہے۔ ہم اس کے جواب میں پوچھتے ہیں کہ کیا اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی بنانے والے کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ کہے: اے موسیٰ! میں تیرا رب ہوں؟ یا یہ کہے:

﴿ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ﴾ [طٰہٰ: ١٤]

''بے شک میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کر اور میری یاد کے لیے نماز قائم کر۔''

جو انسان یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ کہنے والا اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی دوسرا تھا تو وہ ربوبیت کا دعویٰ کرتا ہے۔ اگر اسی طرح ہوا جس طرح جہم کا دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک چیز بنائی تو اس بنائی گئی چیز کو تو یہ کہنا چاہیے تھا: ''اے موسیٰ! بے شک اللہ تعالیٰ تمام جہانوں کا رب ہے۔'' اس کے لیے یہ کہنا درست نہیں: ''میں ہی اللہ تمام جہانوں کا رب ہوں۔'' حالانکہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے:

﴿ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ﴾ [النساء: ١٦٤] ''اور اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا، خود کلام کرنا۔''

﴿ وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ﴾ [الأعراف: ١٤٣]

''اور جب موسیٰ ہمارے مقررہ وقت پر آیا اور اس کے رب نے اس سے کلام کیا۔''

﴿ إِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِي وَبِكَلَامِي ﴾ [الأعراف: ١٤٤]

''بے شک میں نے تجھے اپنے پیغامات اور اپنے کلام کے ساتھ لوگوں پر چن لیا ہے۔''

یہ قرآنی نصوص ہیں۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ خود بات کرتا ہے نہ کسی سے بات کرتا ہے، وہ اس حدیث کا کیا کریں گے جس میں یہ ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« مَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا سَيُكَلِّمُ رَبَّهُ لَيْسَ بَيْنَهُ وَبَيْنَهُ تَرْجُمَانٌ »[1]

''تم میں سے ہر ایک اپنے رب سے کسی ترجمان کے واسطے کے بغیر خود گفتگو کرے گا۔''

اس کے بعد امام صاحب نے بڑی تفصیلی گفتگو فرمائی اور یہ کہا: تم نے یہ کہہ کر کہ اللہ تعالیٰ کلام نہیں کرتا، اس پر بہت بڑا بہتان باندھا ہے۔ تم نے اس کو ان بتوں سے تشبیہ دی ہے جن کی اس کے سوا پوجا کی جاتی ہے، کیوں کہ بت بھی بولتے ہیں نہ حرکت کرتے ہیں نہ ایک جگہ سے ہل کر دوسری جگہ جا سکتے ہیں۔

جب وہ دلیل سے مغلوب ہو گیا تو کہنے لگا: اللہ تعالیٰ کلام کر سکتا ہے، لیکن اس کا کلام مخلوق ہے۔ ہم نے اس کا جواب دیا کہ انسان کا کلام بھی تو مخلوق ہے اور یہ بات کہہ کر تم نے اللہ تعالیٰ کو اس کی مخلوق سے تشبیہ دی ہے، کیوں کہ تم نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس کا کلام مخلوق ہے۔

تمھارے مذہب کے مطابق وہ کسی وقت کلام نہیں کرتا تھا، پھر اس نے بولنے کو پیدا کیا، یہ بات کہہ کر تم نے کفر اور تشبیہ کو یکجا کر دیا ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ اس کیفیت سے بہت بلند ہے جو تم نے بیان کی ہے۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہمیشہ سے متکلم ہے اور جب چاہے کلام کر سکتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ پہلے بولتا نہیں تھا، حتی کہ اس نے بولنے کو پیدا کیا تو بولنے لگا۔

چنانچہ امام صاحب نے بیان کیا ہے کہ انسان کا کلام اللہ تعالیٰ کا پیدا کردہ ہے۔ ان کا یہ بیان ان کی عبارت سے زیادہ بلیغ ہے کہ بندوں کے افعال مخلوق ہیں، حالانکہ انھوں نے ان دونوں باتوں کی تصریح بھی کی ہے۔

امام صاحب فرماتے ہیں: اگر تم یہ جاننا چاہتے کہ جہمی نے یہ دعویٰ کر کے: ''اللہ تعالیٰ ہر جگہ ہے، وہ ایک جگہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ نہیں ہوتا، یعنی جگہ کی قید سے آزاد ہے'' اللہ تعالیٰ کی ذات پر جھوٹ باندھا ہے تو اس سے یہ پوچھو: کیا اللہ تعالیٰ اس وقت بھی نہیں تھا جب کوئی چیز نہیں تھی؟ وہ اثبات ہی میں جواب دے گا تو پھر اس سے پوچھنا: جب

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٠٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠١٦)

اس نے اپنی مخلوق پیدا کی تو کیا اس کو اپنے نفس میں پیدا کیا یا اس سے باہر؟ وہ تین اقوال میں سے کسی ایک کو ضرور اختیار کرے گا: اگر وہ یہ دعویٰ کرے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو اپنے نفس اور ذات میں پیدا کیا تو وہ یہ گمان کر کے کہ جن، انسان اور شیاطین اس کے نفس اور ذات میں ہیں، کافر ٹھہرے گا۔ اگر کہے: اس نے ان کو اپنے نفس سے باہر پیدا کیا، پھر ان میں داخل ہو گیا تو یہ بھی کفر ہو گا، کیوں کہ اس کے مطابق وہ گندی اور نکمی جگہوں میں بھی داخل ہے۔ اور اگر وہ یہ کہے کہ اس نے ان کو اپنے نفس سے باہر پیدا کیا، پھر ان میں داخل نہیں ہوا، (وہ اس سے علاحدہ ہے) تو اس نے اپنے نظریے سے رجوع کر لیا اور یہی اہلِ سنت کا نظریہ بھی ہے۔

اس طرح امام احمد رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ انسانوں کا کلام مخلوق ہے اور انھوں نے ایک سے زیادہ مقامات پر صراحت کی ہے کہ ان کے افعال بھی مخلوق ہیں، تاہم بندوں کے کلام کے مخلوق ہونے کے بارے میں ان کی تصریح زیادہ بلیغ ہے، کیوں کہ اس میں شبہے کا زیادہ امکان ہے۔

لہٰذا جو شخص کہتا ہے کہ انسانوں کا کلام یا ان کے افعال قدیم ہیں وہ بدعتی، کتاب و سنت اور اجماعِ امت کا مخالف ہے۔

فصل (ماضی کے افعال میں ان شاء اللہ کہنے کی حقیقت):

وہ کام جو ماضی میں یقینی طور پر ہو چکا ہو اور اس کا علم ہو اس میں ان شاء اللہ کہنا، مثال کے طور پر یہ کہنا: یہ ان شاء اللہ درخت ہے، یہ ان شاء اللہ انسان ہے، ان شاء اللہ آسمان ہمارے اوپر ہے، ان شاء اللہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، ان شاء اللہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، یا قطعیت کے ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ کہنے سے، یا یہ کہنے سے کہ یہ یقینی طور پر درخت ہے، احتراز کرنا، بدعت ہے جو عقل و دین کے مخالف ہے۔ ہمیں یہ بات شیخ ابو عمرو بن مرزوق کی طرف منسوب ایک گروہ کے سوا کسی بھی مسلمان سے نہیں پہنچی کہ وہ ان امور میں ان شاء اللہ کا قائل ہو، بلکہ خود شیخ اور ان کے عقل مند ساتھی بھی اس کے قائل نہیں تھے، لیکن مجھے کچھ باخبر افراد نے بتایا کہ ان کی وفات کے بعد ان کے دو شاگردوں حازم اور عبدالملک نے اس میں اختلاف کیا۔ حازم نے ماضی میں قطعی طور پر واقع ہونے والے امور میں ان شاء اللہ کہنے کی بدعت ایجاد کی اور ان کو قطعیت کے ساتھ کہنا چھوڑ دیا، لیکن عبدالملک نے اس کی مخالفت کی اور اہلِ سنت اور ائمہ اسلام کے مذہب کی موافقت کی۔ شیخ ابو عمرو اتنے کم عقل نہیں تھے کہ اس یاوہ گوئی میں پڑتے۔ وہ صاحبِ علم اور دین دار تھے، اگرچہ ان کی طرف یہ بات منسوب کی جاتی ہے کہ وہ بندوں کے اچھے یا برے افعال کے قدیم ہونے کے قائل تھے۔ مجھے کسی نے ان کی تحریر بھی دکھائی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اس موقف سے رجوع کر لیا تھا اور وہ شیخ ابو الفرج مقدسی شیرازی کے طریقے کے پیروکار تھے۔ ان سے یہ بھی منقول ہے کہ وہ اس

میں توقف کرتے اور یہ کہتے: یہ فیصلہ شدہ اور طے شدہ ہیں، اس کے بعد خاموش رہتے۔

شیخ ابو الفرج قاضی ابویعلیٰ کا ایک ساتھی تھا، لیکن قاضی ابویعلیٰ اس جیسے افکار کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے، بلکہ وہ قطعیت کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ بندوں کے افعال مخلوق ہیں، یہ کہنا تو ایک طرف رہا کہ بندوں کے اچھے اور برے افعال قدیم ہیں، اگر وہ کسی کے بارے میں یہ سنتے کہ وہ کفر، نافرمانی اور گناہ کے مخلوق ہونے میں توقف کرتا ہے تو اس کی بھی شدید مذمت کرتے، گو کچھ جگہوں پر قاضی صاحب کی باتوں میں اضطراب اور تناقض پایا جاتا ہے اور انھوں نے ایک جگہ ایسی باتیں کہی ہیں جن سے اتفاق رکھنے والے نے ان پر فاسد نظریات قائم کیے ہیں۔ عالم بسا اوقات کوئی ایسی بات کہہ جاتا ہے جس میں پھسل جاتا ہے، لیکن اس کے پیروکار اس سے بہت ساری فروعات نکال لیتے ہیں، جس طرح لفظی بالقرآن کے مسئلے، آدمیوں کے کلام کے مسئلے، ایمان اور بندوں کے افعال کے مسئلے میں ہوا ہے۔

سلف صالحین اور ائمہ دین بالخصوص امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ میں سے کسی ایک نے بھی یہ نہیں کہا کہ آدمیوں کا کلام غیر مخلوق ہے یا قدیم ہے، یا بندوں کے افعال غیر مخلوق ہیں یا قدیم ہیں۔ ایمان قدیم ہے، یا وہ غیر مخلوق ہے، یا قرآن کریم کی تلاوت کرتے وقت بندوں کے منہ سے نکلنے والے قرآنی الفاظ مخلوق ہیں، یا غیر مخلوق ہیں، لیکن انھوں نے مطلقاً ایمان کو مخلوق کہنے اور تلاوت کے وقت بندوں کے الفاظ کو مطلقاً مخلوق کہنے سے منع کیا ہے، کیوں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی بعض صفات بھی داخل ہوسکتی ہیں اور ان سے یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ خالق کا کلام مخلوق ہے یا یہ کلمہ مخلوق ہے۔ انھوں نے یہ کہنے سے بھی منع کیا ہے کہ حروفِ تہجی مخلوق ہیں، کیوں کہ ان باتوں کے قائل کو یہ لازم آئے گا کہ قرآن اللہ کا کلام نہیں اور اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام نہیں کیا۔ ان کے ردِ عمل کے طور پر کچھ لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا: ''لفظي بالقرآن غير مخلوق''، ''قرآن کریم پڑھتے وقت میرے الفاظ غیر مخلوق ہیں'' تو امام احمد اور دیگر ائمہ رحمہم اللہ نے یہ بات کہنے والے کو بدعتی قرار دیا۔

اسی طرح کچھ نے مطلقاً یہ کہنا شروع کر دیا کہ ایمان غیر مخلوق ہے، حتی کہ اس سے یہ سمجھا جانے لگا کہ بندوں کے افعال جو ایمان ہیں غیر مخلوق ہیں۔ اس کے بعد کچھ دوسرے لوگ آئے اور انھوں نے اس میں اضافہ کرتے ہوئے یہ کہنا شروع کر دیا کہ بندوں کا کلام ان حروف سے مرکب ہے جو غیر مخلوق ہیں، لہٰذا ان کا کلام بھی غیر مخلوق ہے۔ کچھ دوسروں نے یہ کہا کہ بندوں کے تمام افعال غیر مخلوق ہیں۔

بدعت کی یہ خصوصیت ہے کہ جیسے جیسے اس سے فروعات نکلتی ہیں اور اس کے لوازم ذکر ہوتے ہیں، اسی رفتار سے اس کی بدنمائی اور بدصورتی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور اس پر عمل کرنے والا آخر کار ان بدیہی امور کی مخالفت پر اتر آتا ہے جو عقل و دین سے ثابت ہیں۔

ہم نے اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو کی ہے اور مسئلہ خلقِ قرآن وغیرہ میں لوگوں کا اضطراب بیان کیا ہے۔

جس طرح کچھ لوگوں نے یہ بدعت ایجاد کی ہے کہ قرآن کے حروف اللہ کا کلام نہیں، اللہ کا کلام حقیقت میں ایک قائم بذاتہ معنی ہے اور وہ امر، نہی اور خبر پر مشتمل ہے۔ یہ بات صریح عقل اور صحیح نقل کی روشنی میں بالکل غلط اور فاسد ہے۔

ایک ہی معنی ہر مامور اور فرمان کے لیے حکم اور ہر خبر دی گئی بات کے لیے خبر نہیں ہوتا۔ تورات، انجیل اور قرآن کا معنی ایک ہی نہیں، جب کہ وہ کہتے ہیں: جب اس نے اس کلام کو عربی میں بیان کیا تو وہ قرآن بن گیا، عبرانی میں بیان کیا تو وہ تورات بن گئی۔

یہ غلط بات ہے، کیوں کہ تورات کا عربی میں ترجمہ بھی موجود ہے اور اس کے معانی قرآنی معانی نہیں، اسی طرح قرآن کو بھی عبرانی میں بیان کیا جاتا ہے، لیکن اس کے معانی تورات کے معانی نہیں بن جاتے۔

سب سے پہلے ابن کلاب نے یہ نظریہ ایجاد کیا، لیکن وہ اور اس بارے میں اس کے پیروکار، جیسے: اشعری وغیرہ اس کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ قرآن حقیقت میں دلوں میں محفوظ ہے۔ حقیقت میں زبانوں کے ساتھ اس کی تلاوت کی جاتی ہے اور وہ مصاحف میں حقیقت میں لکھا ہوا ہے۔

کچھ لوگ اس بات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ وہ اس طرح دلوں میں محفوظ ہے جس طرح اللہ تعالیٰ دلوں کے ساتھ معلوم ہے۔ اس کی زبانوں کے ساتھ تلاوت کی جاتی ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کا زبانوں کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے۔ اور وہ مصاحف میں لکھا ہوا ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ مصاحف میں مکتوب ہے۔

یہ تشریح ابن کلاب اور اشعری کے مذہب کے مطابق غلط ہے، کیوں کہ ان کے نزدیک قرآن کریم ایک معنی ہے جو اسی سے عبارت ہے، یعنی قرآن سے قرآن ہی مراد ہے اور حقائق یعنی صداقتوں کے چار درجات ہیں: (۱) عینی یعنی ذاتی وجود (۲) علمی وجود (۳) لفظی وجود (۴) رسمی وجود۔ علم بالمعنی کا دوسرا مرتبہ نہیں اور کتاب میں اس کا ثبوت اعیان کے کتاب میں ثبوت کی طرح نہیں۔ تو ان لوگوں نے ابن کلاب اور اشعری کے قول کی قباحت میں اضافہ کر دیا۔

پھر ان کے پیروکاروں میں بہت سارے لوگوں نے ایک اس صاحبِ مذہب کی پیروی کی اور کہا: قرآن صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم ایک معنی ہے، حروف اللہ تعالیٰ کے کلام سے تعلق نہیں رکھتے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں ہوا میں پیدا کیا، جبرائیل علیہ السلام یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تصنیف کیا۔ اس کے ساتھ انھوں نے اس بات کا اضافہ بھی کیا کہ مصحف میں صرف سیاہی اور اوراق ہیں۔ انھوں نے اپنے بزرگوں کی اس بات کو بالکل درخور اعتنا نہ سمجھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے کلام ہونے کی دلیل ہے، جس کا احترام کرنا ضروری ہے، کیوں کہ ان کے خیال میں اس کا صرف دلیل ہونا احترام کو لازم نہیں کرتا جس طرح کلام کے ساتھ متکلم خالق کی دلیل، تمام موجودات اس کی دلیل ہیں، لہٰذا ان کا

احترام لازم نہیں۔ چنانچہ ان لوگوں نے مصحف کی گستاخی کرنا شروع کر دی، اس کو اپنے پاؤں تلے روندتے، بلکہ کچھ تو اتنے بدبخت تھے کہ مصاحف اور اوراق میں اللہ تعالیٰ کے لکھے ہوئے ناموں اور آیات کی حرمت ساقط کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے اسما کو گندگی کے ساتھ لکھتے۔ تمام مسلمانوں کا اس مسئلے پر اتفاق ہے کہ جو شخص مصحف، یعنی قرآن کریم کو گندگی کی جگہ پھینک کر یا ٹانگ مار کر اس کی توہین کرتا ہے وہ کافر ہے اور اس کا قتل جائز ہے۔

بدعت آغاز میں ایک بالشت کے برابر ہوتی ہے، پھر پیروکاروں میں اس قدر بڑھ جاتی ہیں کہ میلوں تک پھیل جاتی ہے۔

یہ جواب اس مسئلے کی تفصیل کا متحمل نہیں، کسی دوسری جگہ اس کی تفصیل ذکر ہو چکی ہے۔

یہ لوگ جو ماضی میں قطعی طور پر رونما ہو جانے والی چیزوں میں ان شاء اللہ کہتے ہیں، یہ بدعتی، گمراہ اور جاہل ہیں۔ جب کوئی ان سے کہے: یہ درخت ہے تو جواب دیں گے: اگر اللہ چاہے تو اس کو حیوان بنا دے۔ اس سے کہا جائے گا: یہ اب قطعی طور پر درخت ہے، لیکن اگر یہ کہو: یہ منتقل ہوا ہے، جس طرح انسان پہلے نطفہ ہوتا ہے، پھر جما ہوا خون پھر لوتھڑا، پھر گوشت، پھر زندہ ہوتا ہے اور روح پھونکنے کے بعد وہ یقینی طور پر زندہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جب اس کو مارنا چاہے مار دے گا۔ اگر اللہ تعالیٰ مخلوق کو ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلنے پر قادر ہے تو اس میں کیا رکاوٹ ہے کہ وہ مخلوقات کو جس حالت میں پیدا کرتا ہے وہ ہر وقت اسی حالت میں رہیں؟

آسمان اللہ تعالیٰ کی قدرت اور مشیت اور تخلیق کے ساتھ آسمان ہے۔ انسان اللہ تعالیٰ کی مرضی، قدرت اور تخلیق کے ساتھ انسان ہے۔ گھوڑا اللہ تعالیٰ کی مرضی، قدرت اور تخلیق کے ساتھ گھوڑا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کسی چیز کو بدلنا چاہے تو وہ اپنی مرضی، قدرت اور تخلیق کے ساتھ بدل سکتا ہے۔

کتاب و سنت میں ماضی کے امور کے بارے میں ان شاء اللہ کہنے کا ذکر نہیں ملتا، بلکہ مستقبل کے امور کے بارے میں ان شاء اللہ کہنے کا حکم ہے، جیسے: درج ذیل نصوص میں ہے:

﴿ وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَاْیْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ۝ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ﴾ [الکهف: ۲۳، ۲۴]

''اور کسی چیز کے بارے میں ہرگز نہ کہہ کہ میں یہ کام کل ضرور کرنے والا ہوں۔ مگر یہ کہ اللہ چاہے۔''

﴿ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ ﴾ [الفتح: ۲۷]

''کہ تم مسجد حرام میں ضرور بالضرور داخل ہو گے، اگر اللہ نے چاہا۔''

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

« إِنَّا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَا حِقُوْنَ »[1] ''ہم بھی ان شاء اللہ تم سے آملیں گے۔''

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۴۹)

آپ ﷺ نے فرمایا:

''حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا: میں آج رات ستر بیویوں کے ساتھ مجامعت کروں گا۔ ہر عورت ایک شاہ سوار پیدا کرے گی جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرے گا۔ ان کے ساتھی نے کہا: ان شاء اللہ کہیے، لیکن انھوں نے نہ کہا۔ تو ان میں سے صرف ایک عورت نے بچے کو جنم دیا اور وہ بھی عجیب الخلقت تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر وہ ان شاء اللہ کہتے تو وہ سب شاہ سوار ہوتے اور اللہ کی راہ میں لڑتے۔''[1]

آپ ﷺ کا فرمان ہے:

''جس نے کوئی کام کرنے کی قسم کھائی اور ان شاء اللہ کہا، اگر چاہے تو وہ کام کرے چاہے تو نہ کرے۔''[2]

کیوں کہ قسم کھانے والا کسی مستقبل کے معاملے کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ یا کوئی دوسرا ضرور ایسا کرے گا یا نہیں کرے گا۔ تو جب وہ ان شاء اللہ کہتا ہے تو جو اللہ چاہتا ہے وہ ہو جاتا ہے اور جو نہیں چاہتا وہ نہیں ہوتا۔ اگر وہ کام ہو جائے تو اللہ نے اس کو چاہا ہے اور اس کی قسم نہیں ٹوٹتی، کیوں کہ اس نے ان شاء اللہ کہہ کر اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا ہے۔ اگر اللہ اس کو نہیں چاہتا تو وہ نہیں ہوتا تو چونکہ اس نے ان شاء اللہ کہہ دیا ہے اس لیے اس کی قسم نہیں ٹوٹتی۔

ایمان میں استثنا، یعنی ان شاء اللہ کہنا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور دیگر اسلاف سے منقول ہے، جس پر ایمان رکھنا واجب ہے، اس میں شک کرتے ہوئے نہیں، کیوں کہ اس میں شک کفر ہے، لیکن وہ اس خوف کے پیشِ نظر ان شاء اللہ کہا کرتے تھے کہ کہیں ایمان کے واجبات اور حقائق ادا کرنے میں تقصیر کا شکار نہ ہوئے ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ ﴾ [المؤمنون: ٦٠]

''اور وہ کہ انھوں نے جو کچھ دیا اس حال میں دیتے ہیں کہ ان کے دل ڈرنے والے ہوتے ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

''اس سے مراد وہ آدمی ہے جو نماز پڑھتا ہے، روزہ رکھتا ہے، صدقہ کرتا ہے اور ڈرتا ہے کہ کہیں اس سے یہ اعمال قبول نہ ہوں۔''[3]

اس وجہ سے بھی وہ ان شاء اللہ کہا کرتے تھے کہ وہ انجام سے بے خبر تھے، کیوں کہ فائدہ مند ایمان وہی ہوتا

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٤٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٥٤)

[2] سنن النسائي، رقم الحديث (٣٨٣٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢١٠٥) صحيح الجامع (٦٢١٠)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٧٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤١٩٨) السلسلة الصحيحة (١٦٢)

ہے جس پر انسان کی موت آتی ہے۔ پھر تزکیہ نفس اور اپنے آپ کو بہتر کہنے کے خوف اور اس طرح کے دیگر صحیح معانی کی وجہ سے بھی ان شاء اللہ کہا کرتے تھے۔

اسی طرح جو انسان نیک اعمال میں ان شاء اللہ کہتا ہے، مثلاً: کہتا ہے: میں نے ان شاء اللہ نماز پڑھی ہے تو یہ استثنا ان افعال میں ہے جن کا انجام معلوم نہیں، یا مستقبل میں استثنا کیا جاتا ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے ساتھ معلق کیا جاتا ہے، تا کہ یہ بات واضح کی جا سکے کہ تمام امور اللہ تعالیٰ کی مرضی ہی سے انجام پاتے ہیں، لیکن کسی ایسے امر میں استثنا کرنا جو ماضی میں ہوا ہو اور اس کا ہونا معلوم ہو تو یہ بدعت ہے اور دین و عقل کے خلاف ہے۔[1]

نیکی کرنے یا برائی چھوڑنے میں انسان کے ارادے کا عمل دخل

سوال کیا بندہ جب کوئی نیکی کرنا چاہے تو کر سکتا ہے یا نہیں؟ جب وہ کوئی گناہ چھوڑنا چاہے تو کیا اس کو چھوڑنے پر قادر ہو گا یا نہیں؟ جب وہ کوئی اچھا کام کرتا ہے تو اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتا ہے، لیکن جب کوئی برا کام کرتا ہے تو کیا اس کو اپنی طرف منسوب کرے؟

جواب الحمد لله. جب بندہ اس نیکی کا پختہ ارادہ کرے جو اللہ تعالیٰ نے اس پر فرض کی ہو تو وہ اس کو کرنے پر قادر ہوتا ہے۔ اسی طرح جب نافرمانی کو چھوڑنے کا پختہ ارادہ کرے جو اللہ تعالیٰ نے اس پر حرام کی ہو تو وہ اس کو چھوڑنے پر قادر ہوتا ہے۔ اس پر تمام مسلمانوں اور تمام آسمانی دینوں کو ماننے والوں کا اتفاق ہے، حتی کہ جبریہ کے اماموں کا موقف بھی یہی ہے، بلکہ یہ تو ان چیزوں میں سے ہے جو دینِ اسلام میں لازماً اور بداہتاً معلوم ہیں۔ اس مسئلے میں بعض غالی جبریہ اختلاف کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: وہ امر جو بذاتہ ممتنع اور ناممکن ہو شریعت میں واقع ہوتا ہے۔ اس کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابولہب کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ اس عقیدے پر ایمان لائے جو اس کے عدمِ ایمان کو مستلزم ہو (دوسرے لفظوں میں اللہ نے اس کو مشرک بننے کا حکم دیا) یہ قول ائمہ اسلام جیسے کہ ائمہ اربعہ وغیرہ ائمہ حدیث، ائمہ تصوف اور نفی اور اثبات کرنے والے ائمہ متکلمین کے قول کے خلاف ہے۔

اس پر معتزلہ وغیرہ کا اجماع تو بالکل ظاہر ہے، اسی طرح ابو محمد بن کلاب، ابو العباس قلانسی، ابو الحسن اشعری، قاضی ابوبکر باقلانی، ابوبکر بن فورک، ابو اسحاق اسفرائینی، ابو المعالی الجوینی، ابو حامد غزالی اور اسی طرح ابو عبداللہ محمد بن کرام اور اس کے شاگرد، جیسے: ابن الہیصم اور ابو منصور ماتریدی کی طرح تمام متکلمینِ حنفیہ جیسے اثبات کرنے والے متکلمین کا اتفاق بھی ہے۔

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٨/٤٠٦_٤٢٧)

ابو الحسن بن زاغونی اور دیگر کئی ائمہ نے اس پر تمام مسلمانوں کا اجماع نقل کیا ہے۔ اس میں ان کے بعض ساتھیوں نے اختلاف بھی کیا ہے۔ انہی میں سے ابوعبداللہ رازی بھی ہیں۔

ان کا ابولہب کے قصے سے استدلال کرنا باطل دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورت لہب نازل کرنے سے پہلے ابولہب کو ایمان لانے کا حکم دیا۔ جب اس نے اصرار کیا، دشمنی ظاہر کی تو وعید کا مستحق ٹھہرا، جس طرح جب نوح علیہ السلام سے کہا گیا:

﴿ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ ﴾ [هود: ٣٦]

''کہ بے شک حقیقت یہ ہے کہ تیری قوم میں سے کوئی ہرگز ایمان نہیں لائے گا، مگر جو ایمان لا چکا۔''

اس وقت ان کی قوم وعید کی مستحق ہوئی۔ جب وہ وعید، یعنی جہنم کا مستحق ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو وہ وعید بتا دی جو اس کو آ لینے والی تھی۔ اس وقت اس کو اس کا حکم نہیں دیا گیا تھا، جس پر عمل کرنا اس سے مطلوب ہوتا۔ شریعت اس بات سے بھری پڑی ہے کہ جن افعال کا حکم دیا جاتا ہے وہ استطاعت اور قدرت کے ساتھ مشروط ہیں، جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے کہا تھا: ''کھڑا ہو کر نماز پڑھ، اگر طاقت نہ ہو تو بیٹھ کر پڑھ، اگر طاقت نہ ہو تو پہلو کے بل پڑھ۔''

تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ نمازی جب قیام، قراءت، رکوع، سجدے، ستر ڈھانپنے، قبلہ رخ ہونے یا کسی دوسرے واجب کو ادا کرنے سے عاجز ہو تو وہ واجب اس سے ساقط ہو جاتا ہے۔ اس پر اسی وقت کوئی فعل واجب ہوتا ہے جب وہ اس کا پختہ ارادہ رکھتا ہو اور اس کو کرنے کی قدرت رکھتا ہو۔ اسی طرح علمائے اسلام کا اس مسئلے پر بھی اتفاق ہے کہ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورت جیسے عاجز سے روزہ ساقط ہو جاتا ہے، جو اس کو ادا کرنے سے بھی عاجز اور کمزور ہوتے ہیں اور اس کی قضا دینے سے بھی عاجز ہوتے ہیں۔ البتہ اس مسئلے میں ان کا اختلاف ہے کہ اس جیسے عاجز پر کھانے کی صورت میں فدیہ دینا لازم ہے کہ نہیں۔ جمہور فقہا، جیسے: امام ابوحنیفہ، شافعی اور احمد رحمہم اللہ نے اس کو واجب قرار دیا ہے، لیکن امام مالک رحمہ اللہ نے اس کو واجب نہیں کہا۔ اسی طرح حج کا مسئلہ ہے، ان کا اس پر اجماع ہے کہ حج عاجز، یعنی استطاعت نہ رکھنے والے پر واجب نہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ﴾ [آل عمران: ٩٧]

''اور اللہ کے لیے لوگوں پر اس گھر کا حج (فرض) ہے، جو اس کی طرف راستے کی طاقت رکھے۔''

مگر اس بات میں فقہا کا اختلاف ہے کہ کیا حج کے لیے استطاعت مالی استطاعت تک محدود ہے، جس طرح امام شافعی اور احمد رحمہما اللہ کا مذہب ہے یا صرف قدرت، خواہ بدنی ہی ہو، مراد ہے، یا دونوں، یعنی مالی اور بدنی

استطاعت کا ہونا ضروری ہے؟ یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب ہے۔ پہلے دو ائمہ نے مغصوب (بدنی طور پر عاجز) پر یہ واجب قرار دیا ہے کہ وہ اپنا مال دے کر کسی کو اپنا نائب بنائے اور اس سے حج کروالے، یعنی حجِ بدل کروالے، لیکن دوسرے دو ائمہ اس پر یہ واجب قرار نہیں دیتے۔

بلکہ یہ جاننا بھی اہم ہے کہ امر اور نہی میں جس شرعی استطاعت کی شرط رکھی گئی ہے، شریعت نے اس میں صرف قدرت رکھنے ہی پر حکم کو موقوف نہیں کیا، بلکہ اس میں ضرر اور نقصان کو بھی مدِ نظر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بندہ کوئی فعل کرنے پر قادر ہو، لیکن اس میں اس کو ضرر، یعنی کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو اس کو شریعت میں بہت ساری جگہوں پر عاجز کی طرح ہی خیال کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر بیماری کی حالت میں روزہ رکھنے کی رخصت ہے۔ اگر پانی کا استعمال کسی وجہ سے نقصان دہ ہو تو تیمّم سے طہارت حاصل کرنے کی رخصت ہے۔ نماز میں قیام کرنا تکلیف کا باعث ہو تو بیٹھ جانے کی رخصت ہے اور یہ تمام احکام اللہ تعالیٰ کے درج ذیل فرامین کے ضمن میں آتے ہیں:

﴿ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ﴾ [البقرة: ١٨٥]

''اللہ تمھارے ساتھ آسانی کا ارادہ رکھتا ہے اور تمھارے ساتھ تنگی کا ارادہ نہیں رکھتا۔''

﴿ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ﴾ [الحج: ٧٨]

''اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔''

﴿ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ ﴾ [المائدة: ٦]

''اللہ نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی تنگی کرے۔''

صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک دیہاتی نے مسجد میں پیشاب کر دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ سے کہا: ''اس کو درمیان میں نہ روکو، تم آسانی پیدا کرنے والے بھیجے گئے ہو، تنگی کرنے والے نہیں۔''[1] اسی طرح صحیح بخاری میں یہ حدیث بھی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ اور ابوموسیٰ رضی اللہ عنہما کو یمن بھیجا تو ان دونوں سے کہا: ''آسانی کرنا، تنگی نہ کرنا، خوش خبری دینا، دور نہ بھگانا، فرماں برداری کرنا، اختلاف نہ کرنا۔''[2] شریعت میں اس طرح کی نصوص بے شمار ہیں۔

لہٰذا جو شخص یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو وہ کام کرنے کا حکم بھی دیا ہے جس کا پختہ ارادہ کرنے کے باوجود وہ اس کو کرنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں تو وہ اللہ اور اس کے رسول پر جھوٹ باندھتا ہے۔ وہ ان الزام تراشوں

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٦٧٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨٧٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٣٣)

میں سے ہے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ ﴿١٥٢﴾﴾ [الأعراف: ١٥٢]

''بے شک جن لوگوں نے بچھڑے کو پکڑا عنقریب انھیں اللہ کی طرف سے بہت بڑا غضب پہنچے گا اور بڑی رسوائی دنیا کی زندگی میں اور ہم جھوٹ باندھنے والوں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں۔''

ابو قلابہ کا قول ہے: ''یہ آیت اس امت میں قیامت تک آنے والے ہر افترا پرداز کے لیے ہے۔''

لیکن اس کے اس قول کے ساتھ ساتھ یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ نیکی کی طاقت اور بدی سے بچنے کی قوت اللہ ہی کی مدد سے ہے۔ جو اللہ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے اور جو نہیں چاہتا وہ نہیں ہوتا۔ وہ ہر چیز کا خالق ہے۔ وہی بندوں کا، ان کی طاقتوں کا، ان کے ارادوں کا اور ان کے افعال کا خالق ہے۔ وہ ہر چیز کا رب اور مالک ہے۔ کوئی بھی چیز اس کی مرضی، اجازت، قضا و قدر، اس کی قدرت اور اس کے فعل کے بغیر وجود پذیر نہیں ہوتی۔ کتاب اللہ میں اللہ تعالیٰ کے ارادے کی دو انواع ذکر ہوئی ہیں: ایک دینی اور شرعی ارادہ، جیسے ان آیات میں ہے:

﴿يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ [البقرة: ١٨٥]

''اللہ تمھارے ساتھ آسانی کا ارادہ رکھتا ہے اور تمھارے ساتھ تنگی کا ارادہ نہیں رکھتا۔''

﴿يُرِيدُ اللَّهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ وَيَتُوبَ عَلَيْكُمْ﴾ [النساء: ٢٦]

''اللہ چاہتا ہے کہ تمھارے لیے کھول کر بیان کرے اور تمھیں ان لوگوں کے طریقوں کی ہدایت دے جو تم سے پہلے تھے اور تم پر مہربانی فرمائے۔''

﴿مَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُم مِّنْ حَرَجٍ وَلَٰكِن يُرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٦﴾﴾ [المائدة: ٦]

''اللہ نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی تنگی کرے اور لیکن وہ چاہتا ہے کہ تمھیں پاک کرے اور تاکہ وہ اپنی نعمت تم پر پوری کرے، تاکہ تم شکر کرو۔''

دوسرا تکوینی ارادہ، جیسے ان آیات میں ہے:

﴿فَمَن يُرِدِ اللَّهُ أَن يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ ۖ وَمَن يُرِدْ أَن يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ﴾ [الأنعام: ١٢٥]

''تو وہ شخص جسے اللہ چاہتا ہے کہ اسے ہدایت دے، اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے کہ اسے گمراہ کرے اس کا سینہ تنگ، نہایت گھٹا ہوا کر دیتا ہے، گویا وہ مشکل سے آسمان میں چڑھ رہا ہے۔''

﴿ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴾ [البقرة: ٢٥٣]

''اور اگر اللہ چاہتا تو وہ آپس میں نہ لڑتے، لیکن اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔''

﴿ وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ﴾ [هود: ٣٤]

''اور میری نصیحت تمھیں نفع نہ دے گی اگر میں چاہوں کہ تمھیں نصیحت کروں، اگر اللہ یہ ارادہ رکھتا ہو کہ تمھیں گمراہ کرے۔''

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴾ [يٰسٓ: ٨٢]

''اس کا حکم تو، جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے، اس کے سوا نہیں ہوتا کہ اسے کہتا ہے ''ہو جا'' تو وہ ہو جاتی ہے۔''

یہ بڑی عمدہ تقسیم ہے اور یہ کتاب اللہ میں اذن (اجازت)، امر (حکم)، کلمات، تحریم، حکم اور قضا میں بھی ذکر ہوئی ہے۔ ہم نے کسی دوسری جگہ اس کی تفصیل ذکر کی ہے۔ اس کو اچھی طرح جان لینے کے بعد بہت بڑے بڑے شبہات زائل ہو جاتے ہیں۔

غلطی اور شبہہ پیدا ہونے کا ایک مقام یہ بھی ہے کہ لوگوں نے قدرت کے بارے میں اختلاف کیا ہے کہ کیا یہ فعل کے ساتھ ملی ہوئی ہونی چاہیے یا فعل سے پہلے ہونی چاہیے؟ اس میں فقہا کا محققانہ مذہب یہ ہے کہ وہ استطاعت جو امر و نہی میں مشروط ہے، اس کا فعل کے ساتھ ملا ہوا ہونا ضروری نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس شخص پر حج فرض کیا ہے جو اس کی استطاعت رکھتا ہے۔ تو ان میں سے جو حج نہیں کرتا وہ تمام مسلمانوں کے اتفاق کے ساتھ گناہ گار ہے۔ اس کے حق میں فعل کے ساتھ ملی ہوئی استطاعت موجود نہیں۔ اسی طرح جو اللہ تعالیٰ کے تمام احکام اور نواہی کی نافرمانی کرتا ہے اس کے حق میں وہی استطاعت موجود ہے جو امر و نہی میں مشروط ہے۔

فعل کے ساتھ ملی ہوئی استطاعت اس شخص کے حق میں پائی جاتی ہے جو فعل کر لیتا ہے۔ فاعل کے لیے پختہ ارادہ رکھنا اور اس فعل کو کرنے کی قدرت رکھنا ضروری ہے۔ جب یہ دونوں چیزیں اس میں موجود ہوں، اس وقت اس فعل کو کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ جو کہتا ہے: استطاعت وہی ہے جو فعل کے ساتھ ملی ہوئی ہے تو یہ استطاعت ان چیزوں کے مجموعے سے عبارت ہے جن کا فعل کے لیے ہونا ضروری ہے اور اس میں ارادہ وغیرہ شامل ہیں۔ اس اصطلاح کے مطابق کہا جائے گا: اگر بندہ فعل کا ارادہ نہ کرے تو وہ اس پر قادر نہیں ہوگا۔ تو معلوم ہوا یہ سب لفظی نزاع ہے۔

جو اس کے ساتھ عدمِ قدرت کی تفسیر کرتا ہے اس کا مقصود ظاہر ہو جاتا ہے، جب معاملے کی تحقیق کی جائے

اور کہا جائے: بندہ جب کوئی کام کرنے کا پختہ ارادہ کر لے تو کیا وہ اس کو کرنے سے عاجز ہوگا؟ اس میں تحقیقی بات یہی سامنے آئے گی کہ اس وقت بندہ عاجز نہیں ہو گا، بلکہ اس کو کرنے پر قادر ہوگا، یعنی جب پختہ ارادہ کرے تو پھر عاجز نہیں ہوتا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس کا مکلّف نہیں بنایا۔ اللہ تعالیٰ کسی بھی جان کو اس کا مکلّف بناتا ہے جو اس کی وسعت میں ہو:

﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ﴾ [البقرة: ٢٨٦]

''اللہ کسی جان کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی گنجایش کے مطابق۔''

بندے کے لیے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ اس کے نیک اعمال اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت کا نتیجہ اور اس کی نعمت ہیں۔ اہلِ جنت کہیں گے:

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ﴾ [الأعراف: ٤٣]

''سب تعریف اللہ کی ہے جس نے ہمیں اس کی ہدایت دی اور ہم کبھی نہ تھے کہ ہدایت پاتے، اگر یہ نہ ہوتا کہ اللہ نے ہمیں ہدایت دی۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۝ ﴾ [الحجرات: ٧]

''اور لیکن اللہ نے تمھارے لیے ایمان کو محبوب بنا دیا اور اسے تمھارے دلوں میں مزین کر دیا اور اس نے کفر اور گناہ اور نافرمانی کو تمھارے لیے ناپسندیدہ بنا دیا، یہی لوگ ہدایت والے ہیں۔''

﴿ اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾ [الزمر: ٢٢]

''تو کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہے، سو وہ اپنے رب کی طرف سے ایک روشنی پر ہے (کسی سخت دل کافر جیسا ہو سکتا ہے؟) پس ان کے لیے ہلاکت ہے جن کے دل اللہ کی یاد کی طرف سے سخت ہیں۔''

﴿ اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ﴾ [الأنعام: ١٢٢]

''اور کیا وہ شخص جو مردہ تھا، پھر ہم نے اسے زندہ کیا اور اس کے لیے ایسی روشنی بنا دی جس کی مدد سے وہ

لوگوں میں چلتا پھرتا ہے، اس شخص کی طرح ہے جس کا حال یہ ہے کہ وہ اندھیروں میں ہے، ان سے کسی صورت نکلنے والا نہیں۔''

﴿ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ﴾ [الشوریٰ: ۵۲]

''اور اسی طرح ہم نے تیری طرف اپنے حکم سے ایک روح کی وحی کی، تو نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور نہ یہ کہ ایمان کیا ہے اور لیکن ہم نے اسے ایک ایسی روشنی بنا دیا ہے جس کے ساتھ ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں راہ دکھاتے ہیں۔''

اسی طرح بندے کو چاہیے کہ وہ برائیوں کو اپنی طرف منسوب کرے اور اس کے ساتھ اس کو یہ علم بھی ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہر موجود چیز کا خالق ہے، خواہ وہ اعیان (ذاتیں) ہوں یا صفات، حرکات ہوں یا سکنات، جس طرح حضرت آدم علیہ السلام نے کہا تھا:

﴿ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾ [الأعراف: ۲۳]

''اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ کیا تو یقیناً ہم ضرور خسارہ پانے والوں سے ہو جائیں گے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا:

﴿ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ ﴾ [القصص: ۱۶]

''اے میرے رب! یقیناً میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا، سو مجھے بخش دے۔''

ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے کہا تھا:

﴿ وَالَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓـــَٔتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ ﴾ [الشعراء: ۸۲]

''اور وہ جس سے میں طمع رکھتا ہوں کہ وہ جزا کے دن مجھے میری خطا بخش دے گا۔''

اور اللہ تعالیٰ نے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا:

﴿ فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ﴾ [محمد: ۱۹]

''پس جان لے کہ بے شک حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اپنے گناہ کی معافی مانگ اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کے لیے بھی۔''

اللہ تعالیٰ جن کو عذاب دے گا ان کے بارے میں فرماتا ہے:

﴿ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [الزخرف: ٧٦]

''اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا اور لیکن وہ خود ہی ظالم تھے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴾ [الأعراف: ٥]

''پھر ان کی پکار، جب ان پر ہمارا عذاب آیا، اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ انھوں نے کہا یقیناً ہم ہی ظالم تھے۔''

قرآن کریم میں اس طرح کی آیات بہت زیادہ ہیں۔

صحیح حدیث قدسی میں ہے:

''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے بندو! یہ تمھارے اعمال ہی ہیں جو میں نے تمھارے لیے شمار کر رکھے ہیں۔ پھر میں تمھیں ان کا پورا بدلہ دوں گا۔ جو اس میں بھلائی پائے وہ اللہ کی تعریف بیان کرے اور جو کوئی دوسری چیز پائے تو صرف اپنی ذات کو ملامت کرے۔''[1]

اس حدیث میں بیان ہوا ہے کہ جو نیک عمل کے نتیجے میں بہتری اور اچھا نتیجہ پائے تو وہ اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لائے کہ اس نے اس کو یہ نعمت بخشی اور اگر اس کے علاوہ کوئی دوسری چیز پائے، یعنی کوئی برائی جس کے نتیجے میں سزا کا مستحق ہوا ہو یا فضول کام جو بے فائدہ ہو تو صرف اپنی ذات کو ملامت کرے، کیوں کہ اس نے خود اپنی جان پر ظلم کیا اور حادثہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور مشیت کے ساتھ ہی رونما ہوتا ہے۔ اسی طرح سید الاستغفار میں بھی مذکور ہے۔ «أَبُوْءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ» ''میں تیری ان نعمتوں کا اعتراف کرتا ہوں جن سے تم نے مجھے نوازا ہے۔'' ان نعمتوں میں نیکیوں کی توفیق کی نعمت بھی شامل ہے اور «أَبُوْءُ بِذَنْبِي» ''میں اپنے گناہ کا اعتراف کرتا ہوں۔''[2] اس میں بندہ یہ اعتراف کرتا ہے کہ وہ خود گناہ کرتا ہے۔

یہ طریقہ مومنوں کا طریقہ ہے، (جس میں وہ اچھائی اور بھلائی کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں اور برائی کو اپنی ذات کی طرف منسوب کرتے ہیں) ان کے علاوہ لوگوں کی تین قسمیں ہیں:

پہلی قسم: ایک قسم ان لوگوں کی ہے جو اپنی ہی ذات کو اچھائیوں اور برائیوں کے خالق قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی دینی نعمت کافر اور مومن دونوں کے لیے برابر ہے۔ اس نے بندے کو صرف ایک قدرت دی ہے جو دونوں متضاد فعلوں کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ہدایت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں نہیں، جو صرف مومن کے لیے خاص ہو

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٧٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٩٤٧)

یا بندہ اس سے ﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴾ کہہ کر طلب کرے، اللہ تعالیٰ کسی گمراہ کو ہدایت دینے پر قادر ہے نہ کسی ہدایت یافتہ کو گمراہ کرنے ہی پر قادر۔ ان کو مجوسی قدریہ کہا جاتا ہے۔

دوسری قسم: ان لوگوں کی ہے جو بندے سے اس کا اختیار اور قدرت سلب کرتے ہیں اور اس کو اپنی حرکات پر جمادات کی طرح مجبورِ محض قرار دیتے ہیں۔ اس کے اختیاری اور غیر اختیاری افعال کو ایک ہی لڑی میں پروتے ہیں، حتی کہ ان کا کہنا ہے کہ وہ تمام احکامِ شریعت جن کا اللہ اور اس کے رسول نے حکم دیا ہے، وہ ایسا حکم ہے جو اس کی قدرت اور طاقت سے باہر ہے۔ یہ لوگ بندے کی قدرت کی مطلقاً نفی کرتے ہیں۔ وہ بندے کے لیے صرف ایک قدرت ثابت کرتے ہیں۔ یہ وہ قدرت ہے جو فعل کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ نافرمان کے لیے اصل میں کوئی بھی قدرت نہیں مانتے۔

امام عبدالرحمان بن عمرو الاوزاعی، سفیان بن سعید الثوری، محمد بن ولید الزبیدی، عبدالرحمان بن مہدی اور احمد بن محمد بن حنبل رحمہم اللہ جیسے ائمہ ہدایت نے ان لوگوں کے افکار و نظریات کی بھرپور تردید کی ہے۔

یہ جبر کے قائل مذکورہ افکار کے ساتھ اس بات کا اضافہ بھی کرتے ہیں کہ نافرمان کے لیے تقدیر عذر ہے، اس لیے وہ ملامت یا سزا کا مستحق نہیں۔ یا وہ سزا کو ظلم قرار دیتے ہیں۔ یہ کافر ہیں۔ اسی طرح غالی قدریوں میں سے جو اللہ تعالیٰ کے قدیمی علم کا انکار کرتا ہے وہ بھی کافر ہے۔ ان میں سے ایک فرقہ ہے جس کا نام مباحیہ ہے۔ یہ تقدیر کے ثبوت کو امر و نہی اور وعد و وعید، یعنی پوری شریعت کے سقوط اور انہدام کا باعث قرار دیتے ہیں۔ یہ یہود و نصاریٰ سے بھی بڑے کافر ہیں اور ان مشرکوں کی جنس سے تعلق رکھتے ہیں جنھوں نے کہا:

﴿ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ﴿١٤٨﴾ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿١٤٩﴾ ﴾ [الأنعام: ١٤٨، ١٤٩]

''اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شریک بناتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کوئی چیز حرام ٹھہراتے۔ اسی طرح ان لوگوں نے جھٹلایا جو ان سے پہلے تھے، یہاں تک کہ انھوں نے ہمارا عذاب چکھ لیا۔ کہہ کیا تمھارے پاس کوئی علم ہے کہ تم اسے ہمارے لیے نکالو، تم تو گمان کے سوا کسی چیز کی پیروی نہیں کر رہے اور تم اس کے سوا کچھ نہیں کہ اٹکل دوڑاتے ہو۔ کہہ دے پھر کامل دلیل تو اللہ ہی کی ہے، سو اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ضرور ہدایت دے دیتا۔''

یہ قول ہر امر و نہی کی مکمل بساط الٹ دینے کو مستلزم ہے۔ یہ نظریہ ان افکار میں سے ہے جو بالبداہت عقل و دین

کی روشنی میں دنیا و آخرت کے معاملات میں فساد کی جڑ ہے۔

تیسری قسم: یہ قسم ان میں سے سب سے زیادہ بری ہے، جس طرح شیخ ابو الفرج بن جوزی کہتے ہیں: تم نیکی کے وقت قدری بن جاتے ہو (یعنی یہ اللہ کی مشیت اور تقدیر سے نہیں، میرے اختیار سے ہوئی) اور گناہ کے وقت جبری بن جاتے ہو (یعنی تم اس پر مجبور ہو) جو مذہب تمھاری خواہش کی تسکین کرے، اس کو اختیار کر لیتے ہو؟!

یہ لوگ شیطان کے بدترین پیروکاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ کسی معروف گروہ کا مذہب نہیں، لیکن امر و نہی سے دور بھاگنے والے عام لوگوں کی یہ سوچ اور کیفیت ہے۔ اگر کوئی نیکی کر ہی لے تو اس کو اپنی طرف منسوب کرے گا۔ اس پر فخر کرے گا، حتی کہ اس کا عمل ضائع ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی گناہ کرے تو تقدیر اور قضا و قدر کو بہانہ اور حجت بنائے گا، لیکن یہ حجت بے کار اور یہ عذر نا قابلِ قبول ہے۔

لیکن عجیب تو یہ ہے کہ اگر کسی بندے کے عمل کے نتیجے میں اس کو کوئی مصیبت پہنچے تو اس وقت تقدیر کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتا، لیکن جب اپنی جان پر یا کسی دوسرے پر ظلم کرے تو اس وقت تقدیر کو حجت بناتا ہے اور کہتا ہے: بندہ تو بے چارہ ہے۔ وہ تو کچھ کرنے پر قادر نہیں اور نہ اس کا عذر قبول کیا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے ؏

القاه في البحر مكتوفاً وقال له إياك إياك أن تبتل بالماء

''اس نے اس کے دونوں ہاتھ باندھ کر دریا میں پھینک دیا اور کہا: پانی کے ساتھ گیلا ہونے سے بچنا۔''

لیکن اگر کوئی دوسرا شخص اس پر ظلم کرے، یا اس کو کوئی چھوٹی موٹی تکلیف پہنچائے یا اس کو یہ گمان ہی پیدا ہوا ہو کہ اس نے اس کو گزند پہنچانے کی کوشش کی ہے تو وہ اس سے دوگنا زیادہ انتقام لینے کے لیے اس پر چڑھ دوڑتا ہے اور دوسرے آدمی کو اس طرح تقدیر کے ساتھ معذور خیال نہیں کرتا جس طرح اپنے آپ کو معذور سمجھتا ہے، حالانکہ وہ دونوں برابر ہیں (اگر ایک کے لیے تقدیر حجت ہے تو دوسرے کے لیے بھی ہونی چاہیے)

چنانچہ ان امور کا مجمل عقیدہ رکھنا ضروری ہے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ گناہوں کو بندوں کی طرف کیوں منسوب کیا جاتا ہے حالانکہ ہر چیز کو اللہ تعالیٰ ہی نے پیدا کیا ہے اور یہ برائیاں تقدیر کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی کتاب میں اپنی طرف تین صورتوں میں منسوب کیا ہے:

1. عمومی صورت میں، جیسے اس آیت میں ہے:

﴿ اللّٰهُ خٰلِقُ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ [الرعد: ١٦] ''اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے۔''

2. ان کو ان کے سبب کی طرف منسوب کیا ہے، جیسے اس آیت میں ہے:

﴿ مِنۡ شَرِّ مَا خَلَقَ ۝ ﴾ [الفلق: ۲] ''اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی۔''

3 یا فاعل کو حذف کیا ہے، جیسے جنوں کی اس بات میں ہے:

﴿ وَّاَنَّا لَا نَدۡرِيۡۤ اَشَرٌّ اُرِيۡدَ بِمَنۡ فِى الۡاَرۡضِ اَمۡ اَرَادَ بِهِمۡ رَبُّهُمۡ رَشَدًا ۝ ﴾ [الجن: ۱۰]

''اور یہ کہ بے شک ہم نہیں جانتے کیا ان لوگوں کے ساتھ جو زمین میں ہیں، کسی برائی کا ارادہ کیا گیا ہے، یا ان کے رب نے ان کے ساتھ کسی بھلائی کا ارادہ فرمایا ہے۔''

پھر یہ بات بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اچھائی کی نسبت کرنے کو شامل ہیں اور برائی اس کے مفعولات (کیے گئے کام) میں داخل ہے، جس طرح ان آیات میں ہے:

﴿ نَبِّئۡ عِبَادِيۡۤ اَنِّيۡۤ اَنَا الۡغَفُوۡرُ الرَّحِيۡمُ ۝ وَاَنَّ عَذَابِيۡ هُوَ الۡعَذَابُ الۡاَلِيۡمُ ﴾ [الحجر: ۴۹، ۵۰]

''میرے بندوں کو خبر دے دے کہ بے شک میں ہی بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہوں اور یہ بھی کہ بے شک میرا عذاب ہی دردناک عذاب ہے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ۝ ﴾ [المائدۃ: ۹۸]

''جان لو! بے شک اللہ بہت سخت سزا دینے والا ہے اور بے شک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔''

لہٰذا ان عمدہ اور اعلیٰ حقائق کو تحریر میں لانا جو اگلے لوگوں اور بعد میں آنے والوں کے لیے عزت کا درجہ رکھتے ہیں، اس جواب کے علاوہ زیادہ تفصیل کا تقاضا کرتا ہے۔ اللہ ہی درست عمل کی توفیق دینے والا ہے۔

ولا حول ولا قوة إلا بالله، ولا ملجأ منه إلا إليه وهو حسبنا و نعم الوكيل.[1]

کیا مقتول اپنی موت آپ مرتا ہے؟

سوال کیا مقتول اپنی موت مرتا ہے یا قاتل اس کی عمر ختم کرتا ہے؟

جواب مقتول بھی دیگر مُردوں کی طرح ہی ہے۔ کوئی انسان بھی اپنی مقررہ مدت سے پہلے مرتا ہے نہ بعد میں۔ بلکہ تمام حیوانوں اور درختوں کی عمریں بھی ہیں، جن سے وہ آگے ہوتے ہیں نہ پیچھے۔

کسی چیز کی مقررہ مدت کا مطلب ہے اس کی عمر اور اس کے باقی رہنے کی مدت کا ختم ہونا۔ عمر زندہ رہنے کی مدت کا نام ہے اور اجل عمر کے ختم ہونے کا نام۔

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۸/۴۳۷-۴۴۷)

صحیح مسلم وغیرہ میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

''اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے سے پچاس ہزار سال پہلے مخلوقات کی تقدیریں لکھ دیں۔ اس وقت اللہ کا عرش پانی پر تھا۔''[1]

صحیح بخاری میں یہ حدیث ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ تھا اور اس سے پہلے کوئی چیز نہیں تھی۔ اس کا عرش پانی پر تھا۔ اس نے ذکر (لوحِ محفوظ) میں ہر چیز لکھ دی اور آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔''[2]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿فَإِذَا جَآءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ﴾ [الأعراف: ٣٤]

''پھر جب ان کا وقت آ جاتا ہے تو وہ ایک گھڑی نہ پیچھے ہوتے ہیں اور نہ آگے ہوتے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے اس کا علم ہوتا ہے۔ اس نے اس کو لکھا ہوا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ فلاں شخص پیٹ کی بیماری سے مر جائے گا، نمونیے سے مرے گا، ڈوب کر یا دیوار کے نیچے آ کر مرے گا، یا کسی دوسرے سبب سے مرے گا اور زہر کی وجہ سے یا تلوار کے ساتھ یا پتھر مار کر یا کسی بھی دوسری چیز کے ساتھ قتل کیا جائے گا اور مرے گا۔

اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ہے۔ اس نے اس کو لکھا ہوا ہے، بلکہ اس کی ہر چیز کے لیے مرضی اور ہر چیز کو پیدا کرنا تعریف و مذمت اور جزا و سزا سے مانع نہیں، بلکہ قاتل اگر کسی ایسے انسان کو قتل کرتا ہے جس کو قتل کرنے کا حکم اللہ اور اس کے رسول نے دیا ہے، جس طرح مجاہد اللہ کی راہ میں کافروں کو قتل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو ثواب دیتے ہیں۔ اگر وہ کسی ایسے انسان کو قتل کرے جس کو قتل کرنا اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے، جیسے: ڈاکوؤں اور زیادتی کرنے والوں کو قتل کرنا تو اللہ تعالیٰ اس کو اس کی سزا دے گا۔ اگر وہ کسی ایسے انسان کو قتل کرے جس کو قتل کرنا مباح ہو، جیسے: کسی کو قصاص میں قتل کرنا، اگر اس کی نیت اچھی ہو تو اس کو ثواب ملتا ہے اور اگر نیت بری ہو تو اس کو سزا ملے گی۔

اجل، یعنی عمر میں دو اقسام ہیں: ایک مطلق اجل، جس کو صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور دوسری مقید اجل۔ اس تفصیل کو مدِ نظر رکھ کر رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ سَرَّهُ أَنْ يُبْسَطَ لَهُ فِي رِزْقِهِ، وَيُنْسَأَ لَهُ فِي أَثَرِهِ فَلْيَصِلْ رَحِمَهُ»[3]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٥٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠١٩)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٦١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٥٧)

''جس کے لیے یہ بات مسرت انگیز ہو کہ اس کے رزق میں کشادگی کی جائے، اس کی عمر میں تاخیر کی جائے تو وہ صلہ رحمی کرے۔''

اللہ تعالیٰ فرشتے کو حکم دیتا ہے کہ اس کی عمر لکھے اور کہتا ہے: اگر یہ صلہ رحمی کرے تو اس کی عمر میں اتنا اضافہ کر دینا۔'' فرشتے کو بھی علم نہیں ہوتا کہ اس کی عمر میں اضافہ ہوگا یا نہیں ہوگا، لیکن یہ اللہ ہی جانتا ہے کہ معاملہ کہاں آ کر ٹھہرے گا۔ جب وہ متعین وقت آ جائے تو پھر اس میں کوئی تقدیم و تاخیر نہیں ہوتی۔

اگر مقتول کو قتل نہ کیا جاتا تو کیا ہوتا؟ کچھ قدریہ کہتے ہیں: وہ زندہ رہتا۔ اسباب کی نفی کرنے والے کچھ کہتے ہیں: وہ مر جاتا۔ یہ دونوں ہی غلط ہیں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کو علم ہوتا ہے کہ اس نے قتل ہو کر ہی مرنا ہے۔ اگر وہ اپنے معلوم کے خلاف تقدیر بنائے اور اندازہ کرے تو وہ ایسی تقدیر ہوگی جو وقوع پذیر نہیں ہوتی اور اگر ہوتی تو کس طرح ہوتی، اس طرح کا اندازہ تو لوگ بھی لگا لیتے ہیں، ان کو بسا اوقات علم ہوتا ہے کہ معاملہ ان کے اندازے کے مطابق ہوگا اور کبھی علم نہیں ہوتا۔ اگر ہم فرض کریں کہ اللہ تعالیٰ کو علم تھا وہ قتل نہیں ہوگا تو یہ ممکن ہے کہ اس نے اس وقت اس کی موت مقدر کی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے کسی دوسرے وقت تک اس کی زندگی مقدر کی ہو تو ان دونوں باتوں میں سے ایک کو وثوق کے ساتھ کہنا اسی تقدیر کے مطابق ہو سکتا ہے، جس میں جہالت نہ ہو۔

یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کوئی یہ کہے: اگر وہ چیز نہ کھاتا تو اس کے مقدر میں رزق نہ ہوتا تو وہ مر جاتا، یا کسی دوسری چیز سے خوراک حاصل کرتا۔ یا جیسے کوئی یہ کہے: اگر یہ آدمی اس عورت کو حاملہ نہ کر سکے تو کیا وہ بانجھ ہوگی؟ یا کوئی دوسرا آدمی اس کو حمل ٹھہرائے؟

اگر اس زمین کو کاشت نہ کیا جائے تو کیا کوئی دوسرا اس کو کاشت کرے گا یا بنجر اور بے کاشت ہی رہے گی؟ یہ شخص جس نے اس شخص سے قرآن سیکھا اگر وہ اس کو نہ سکھاتا تو کیا وہ کسی دوسرے سے سیکھتا یا بالکل نہ سیکھتا؟ اس طرح کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔[1]

قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کے عوامل اور خدائی تاثیر

سوال کیا قیمتوں میں اتار چڑھاؤ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے؟

جواب اللہ کے سوا جتنی ذاتیں (اعیان)، صفتیں اور حالات ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں۔ اس کی ملکیت میں ہیں، وہ ان کا رب، خالق، مالک اور تدبیر کرنے والا ہے، اس کے سوا ان کا کوئی رب ہے نہ معبود۔ اسی کی آفرینش

[1] مجموع الفتاویٰ (۸/۵۱۶_۵۱۸)

اور اسی کا حکم ہے، اس میں اس کا کوئی شریک ہے نہ مددگار، بلکہ وہ اس طرح ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ۝ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ﴾ [السبا: ٢٢،٢٣]

''کہہ دے پکارو ان کو جنھیں تم نے اللہ کے سوا گمان کر رکھا ہے، وہ نہ آسمانوں میں ذرہ برابر کے مالک ہیں اور نہ زمین میں اور نہ ان کا ان دونوں میں کوئی حصہ ہے اور نہ ان میں سے کوئی اس کا مددگار ہے اور نہ سفارش اس کے ہاں نفع دیتی ہے مگر جس کے لیے وہ اجازت دے۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بتایا ہے کہ اس کے سوا جس کو بھی پکارا جاتا ہے زمین و آسمان میں ایک ذرے کے برابر بھی اس کا کچھ نہیں، نہ وہ ملکیت میں شریک ہے اور نہ کسی چیز میں اس کی معاونت کرنے والا ہے۔ انہی تین وجوہ کی بنا پر کسی دوسرے کا حق ثابت ہوتا ہے۔ وہ یا تو اس کا مستقل مالک ہوتا ہے، یا برابر کا حصے دار ہوتا ہے۔ یا وہ ان دونوں میں سے کوئی حیثیت نہیں رکھتا، لیکن اپنے ساتھی کا معاون ہوتا ہے، جس طرح وزیر، مشیر، معلم اور مددگار وغیرہ ہوتے ہیں تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بیان کیا ہے کہ کوئی دوسرا زمین و آسمان میں سے نہ ایک ذرے کا مالک ہے، نہ تھوڑے یا زیادہ میں اس کا شریک ہے، لہٰذا وہ کسی چیز کے بھی مالک نہیں اور حصے دار بھی نہیں اور نہ اس کا کوئی مددگار ہی ہے، بلکہ وہی مدد کرنے والا، تعاون دینے والا ہے، اس کا کوئی وزیر، مشیر اور ظہیر (مددگار) نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ۝ ﴾ [بني اسرائيل: ١١١]

''اور کہہ دے سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے نہ کوئی اولاد بنائی ہے اور نہ بادشاہی میں اس کا کوئی شریک ہے اور نہ عاجز ہو جانے کی وجہ سے کوئی اس کا مددگار ہے اور اس کی بڑائی بیان کر، خوب بڑائی بیان کرنا۔''

مخلوق مخلوق کی کمزوری کی وجہ سے چارہ سازی کرتی ہے، لہٰذا جب کوئی کسی کا چارہ ساز اور مددگار ہوتا ہے تو وہ اس کو عزت بخشتا ہے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کمزور نہیں کہ اس کو کسی کی دوستی کی ضرورت پیش آئے، بلکہ وہ بذاتِ خود عزیز ہے، عزت کا منبع ہے:

﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ﴾ [الفاطر: ١٠]

''جو شخص عزت چاہتا ہو سو عزت سب اللہ ہی کے لیے ہے۔''

وہ اپنی رحمت، نعمت، حکمت، احسان، جود وفضل اور انعام کے ساتھ بندوں کی مدد کرتا ہے۔

بنا بریں قیمتوں میں اتار چڑھاؤ ان جملہ حادثات سے تعلق رکھتا ہے جن کا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی خالق نہیں اور ان میں سے کوئی چیز بھی اللہ تعالیٰ کی مرضی اور قدرت کے بغیر وقوع پذیر نہیں ہوتی۔

لیکن اللہ تعالیٰ بندوں کے بعض افعال کو بعض حادثات کا سبب بناتا ہے، جس طرح قاتل کا قتل کرنا مقتول کی موت کا سبب ہے۔ چنانچہ قیمتوں کا بلند ہونا کبھی بندوں کے ظلم کا نتیجہ ہوتا ہے اور کم ہونا احسان کا ثمر، اسی لیے بعض معتزلی قدریہ اور غالی لوگوں نے قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کو کچھ لوگوں کی طرف منسوب کیا اور اس پر چند فاسد اصول کی عمارت کھڑی کر دی:

1 بندوں کے افعال اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ نہیں۔

2 بندے کا فعل جس کا سبب ہو تو بندہ ہی اس کا موجد اور خالق ہوتا ہے۔

3 قیمتوں میں اتار چڑھاؤ اسی سبب کی وجہ سے ہوتا ہے۔

یہ اصول باطل ہیں۔ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے افعال سمیت ہر چیز کا خالق ہے۔ اس پر بہت سارے عقلی اور نقلی دلائل دلالت کرتے ہیں اور یہ تمام سلف صالحین کا اتفاقی مسئلہ ہے، لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ بندوں کی قدرت اور مرضی ہے، وہ اپنے افعال خود کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو اسباب اور حکمتیں پیدا کی ہیں ان کو ثابت کرتے ہیں۔

تقدیر کا مسئلہ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، جس میں لوگوں کے دو گروہ گمراہ ہوئے ہیں۔ ایک گروہ اس بات کا انکار کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے، اس نے جو چاہا ہو گیا اور جو نہیں چاہا نہیں ہوا۔ معتزلہ نے بھی ان امور کا انکار کیا ہے۔

دوسرے گروہ نے اس بات کا انکار کیا ہے کہ بندہ اپنے افعال کا فاعل اور کرنے والا ہے۔ اس کی کوئی قدرت ہو، جس کی مقدور میں تاثیر ہو یا مخلوقات میں کوئی ایسی چیز ہو جو کسی دوسری چیز کا سبب ہو اور اللہ تعالیٰ نے چیزوں کو کسی حکمت کے تحت پیدا کیا ہو۔ جہم بن صفوان اور اس کے پیروکار جبریہ نے ان تمام امور کا انکار کیا ہے جن میں کچھ اہل سنت کی طرف بھی منسوب ہیں۔ اس مسئلے پر تفصیلی گفتگو کسی دوسری جگہ گزر چکی ہے۔

''دوسرا قاعدہ'' کہ بندے کا فعل جو سبب ہو، جیسے کھانے کے نتیجے میں شکم سیر ہونا، قتل کے نتیجے میں جان کا ضائع ہونا وغیرہ، اکثر معتزلہ اس کو بندے کا فعل قرار دیتے ہیں کہ جبریہ بندے کے فعل میں تاثیر نہیں مانتے، بلکہ وہ اس کے سبب ہونے کے بارے میں بھی پر یقین نہیں۔ وہ کہتے ہیں وہ اسی کی طرف سے ہوا ہے، اس کے سبب نہیں ہوا، لیکن سلف اور ائمہ بندے کو اس کے فعل کی طرح اس کا فاعل قرار نہیں دیتے، جو اس کے ساتھ قائم ہوتا ہے، لیکن

وہ اس کو اس کے اسباب میں شریک ہونے سے نہیں روکتے، مثلاً: یہ کہ اللہ تعالیٰ نے دیگر اسباب کے ساتھ بندے کو بھی اس کام کے حصول کے لیے سبب بنایا ہو۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس آیت میں دونوں اقسام بیان کی ہیں:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١٢٠﴾ وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٢١﴾﴾ [التوبة: ١٢٠، ١٢١]

''یہ اس لیے کہ بے شک وہ، اللہ کے راستے میں انھیں نہ کوئی پیاس پہنچتی ہے اور نہ کوئی تکان اور نہ کوئی بھوک اور نہ کسی ایسی قوم پر قدم رکھتے ہیں جو کافروں کو غصہ دلائے اور نہ کسی دشمن سے کوئی کامیابی حاصل کرتے ہیں، مگر اس کے بدلے ان کے لیے ایک نیک عمل لکھ دیا جاتا ہے۔ یقیناً اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا اور نہ وہ خرچ کرتے ہیں کوئی چھوٹا خرچ اور نہ کوئی بڑا اور نہ کوئی وادی طے کرتے ہیں، مگر وہ ان کے لیے لکھ لیا جاتا ہے، تاکہ اللہ انھیں اس عمل کی بہترین جزا دے جو وہ کیا کرتے تھے۔''

خرچ کرنا اور چلنا بندوں کے اپنے اعمال ہیں جو ان کی ذات کے ساتھ قائم ہیں۔ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ﴾ [التوبة: ١٢٠] ''مگر یہ ان کے لیے لکھ لیا جاتا ہے۔''

یہ نہیں کہا:

﴿اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ﴾ [التوبة: ١٢٠]

''مگر اس کے بدلے ان کے لیے ایک نیک عمل لکھ دیا جاتا ہے۔''

کیوں کہ وہ بذاتِ خود عمل ہیں اور ان کے بذاتِ خود لکھا ہوا ہونے کے ساتھ مقصود حاصل ہو جاتا ہے۔ جہاد کے بغیر حاصل ہونے والی بھوک پیاس اور مشقت کے عکس، کافروں پر کامیابی حاصل کر کے ان کو غضب ناک کرنے کے خلاف، کیوں کہ یہ بذاتِ خود ان کے اعمال نہیں ہیں، بلکہ یہ ان اسباب کا نتیجہ ہیں جن اسباب میں ان کے یہ افعال بھی شامل ہیں۔ اسی لیے ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ﴾ [التوبة: ١٢٠]

''مگر اس کے بدلے ان کے لیے ایک نیک عمل لکھ دیا جاتا ہے۔''

تو معلوم ہوا کہ بندوں کے افعال سے آثار جنم لیتے ہیں، کیوں کہ ان کے افعال ان میں سبب ہوتے ہیں، جس طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

''جس نے ہدایت کی دعوت دی، اس کو اتنا ہی اجر ملے گا جتنا اجر اس کی پیروی کرنے والے کو ملے گا اور ان کے اجر میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ اور جس نے گمراہی کی دعوت دی تو اس پر بھی اتنا ہی بوجھ ہوگا جتنا بوجھ اس کی پیروی کرنے والوں پر ہوگا اور ان کے بوجھ میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔''[1]

''تیسرا قاعدہ'' قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کے اسباب ہمیشہ کچھ لوگوں کی زیادتی اور ظلم ہی میں منحصر نہیں ہوتے، بلکہ پیداوار میں کمی پیدا ہو جاتی ہے یا طلب و رسد میں عدمِ توازن پیدا ہو جاتا ہے۔ جب کسی چیز کی ڈیمانڈ بڑھ جائے اور اس کی قلت پیدا ہو جائے تو قیمتیں بڑھ جاتی ہیں، جب وہ چیز زیادہ ہو جائے اور لوگوں کی طلب کم ہو جائے تو ریٹ گر جاتا ہے۔ قلت و کثرت بھی ضروری نہیں کہ بندوں کی وجہ ہی سے ہو، کبھی وہ کسی ایسے سبب کی وجہ سے ہوتی ہے جو معقول ہوتا ہے اور اس میں کوئی ظلم نہیں ہوتا اور کبھی وہ کسی ظالمانہ سبب کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی دلوں میں چیزوں کی رغبت ڈالتا ہے۔[2]

اسبابِ رزق تلاش کرنے کا شرعی حکم اور غزالی کا موقف

سوال ابو حامد غزالی اپنی مشہور کتاب ''منہاج العابدین'' میں رزق پر توکل کے باب میں لکھتے ہیں کہ اگر کوئی کہے کہ کیا ہر حالت میں بندے کو رزق تلاش کرنا چاہیے؟ تو جان لو! وہ رزق جس کی اللہ تعالیٰ نے ضمانت دی ہے، وہ جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے والی غذا ہے، اس کو تلاش کرنا ممکن نہیں، کیوں کہ یہ وہ چیز ہے جو بندے کی زندگی اور موت کی طرح کا اللہ تعالیٰ کا فعل ہے۔ بندہ اس کو حاصل کرنے کی طاقت رکھتا ہے نہ اپنے سے دور کرنے کی قوت۔

جو مقسوم، یعنی قسمت میں لکھے ہوئے اسبابِ رزق ہیں، بندے کے لیے ان کی طلب و جستجو بھی لازمی نہیں، کیوں کہ اس کو ان کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کو صرف اس کی ضرورت ہے۔ جس کی اس کو ضمانت دی گئی ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اسی نے اس کی ضمانت دی ہے۔ جہاں تک یہ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ﴾ [الجمعة: ١٠] ''اور اللہ کے فضل سے (حصہ) تلاش کرو۔''

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٧٤)

[2] مجموع الفتاویٰ (٨/٥١٩۔٥٢٣)

تو اس سے علم اور ثواب کی تلاش مراد ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حکم وجوب کے معنی میں نہیں، کیوں کہ اس کا ممانعت کے بعد ذکر ہوا ہے، لہٰذا امر جب ممانعت کے بعد وارد ہو تو وہ اباحت (جواز) کے معنی میں ہوتا ہے، وجوب اور الزام کے معنی میں نہیں۔

اگر کہا جائے جس رزق کی ضمانت دی گئی ہے، اس کے اسباب ہیں تو کیا ہمارے لیے ان اسباب کی طلب وجستجو ضروری ہے؟

اس کے جواب میں کہا جائے گا: بالکل ضروری نہیں، کیوں کہ بندے کو اس کی کوئی ضرورت نہیں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ سبب کے ساتھ بھی کرتا ہے اور سبب کے بغیر بھی، لہٰذا سبب کی طلب ہم پر کہاں سے لازم ہوتی ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے جو ضمانت دی ہے وہ طلب اور کسب کی شرط سے آزاد ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا ﴾ [هود: ٦]

''اور زمین میں کوئی چلنے والا (جاندار) نہیں مگر اس کا رزق اللہ ہی پر ہے۔''

پھر یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ بندے کو اس چیز کی تلاش کا حکم دے جس کی جگہ کے بارے میں وہ نہ جانتا ہو، کیوں کہ اس کو علم ہی نہیں کہ کس سبب سے اس کو رزق حاصل ہو گا اور کون سا سبب اس کی غذا کا سبب ہو گا، لہٰذا جب کوئی انسان بعینہٖ اس سبب کو جانتا ہی نہیں تو اس کو اس کی تلاش کا مکلّف بنانا بھی درست نہیں، پھر یہ بات بھی یاد رکھیں کہ انبیاے کرام، اولیائے عظام جو اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے والے تھے۔ انھوں نے اکثر اور عام حالات میں رزق طلب نہیں کیا۔ انھوں نے اپنے آپ کو عبادت کے لیے وقف کر دیا تھا اور بالاجماع اس مسئلے میں وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے تارک تھے نہ اس کے نافرمان، لہٰذا رزق اور اس کے اسباب کی طلب بندے کے لیے کوئی ضروری چیز نہیں۔

ایک طرف امام غزالی کے یہ افکار ہیں اور دوسری طرف فقہا اور ائمہ کی کتابوں میں صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ بندے کے لیے رزق اور اس کے اسباب کی تلاش واجب ہے، بلکہ یہاں تک لکھا ہے کہ اگر بندے کو رزق کی ضرورت پیش آئے اور کسی دوسرے انسان کے پاس فاضل اور زائد رزق موجود ہو تو اس کے لیے اس سے طلب کرنا اور مانگنا ضروری ہے۔ اگر وہ اس کو روکے تو اس سے زبردستی چھین لے، خواہ اس کو قتل ہی کر دے۔ تو یہ بات جو انھوں نے ''منہاج العابدین'' میں کہی ہے کیا اس کا کسی مخصوص حالت سے تعلق ہے؟

آپ سے درخواست ہے کہ ان دونوں باتوں میں جو ہمیں تعارض محسوس ہو رہا ہے، اس کو تفصیل سے بیان اور دور فرمائیں، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔

جواب الحمد لله رب العالمين.

یہ جو موقف ابو حامد غزالی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے، لوگوں کے ایک گروہ کا مذہب یہی ہے، لیکن جمہور ائمہ اسلام کا مذہب اس کے خلاف ہے۔ کسب، یعنی کمانا کبھی واجب ہوتا ہے، کبھی مستحب، کبھی مکروہ، کبھی مباح تو کبھی حرام۔ لہٰذا مطلقاً نہ یہ کہنا درست ہے کہ اس میں کچھ بھی واجب نہیں، نہ یہ کہنا ہی درست اور صحیح ہے کہ اس میں کچھ بھی حرام نہیں۔

وہ سبب جس کو اختیار کرنے کا اللہ تعالیٰ نے بندے کو وجوباً یا استحباباً حکم دیا ہے، وہ اس کی عبادت اور اس کی اور اس کے رسول کی اطاعت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بندوں پر یہ فرض کیا ہے کہ وہ اسی کی عبادت کریں اور اسی پر توکل کریں۔ ارشاد ہے:

﴿ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ﴾ [هود: ١٢٣] ''سو اس کی عبادت کر اور اس پر بھروسا کر۔''

﴿ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ۝ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا ۝ ﴾ [المزمل: ٨]

''اور اپنے رب کا نام ذکر کر اور ہر طرف سے منقطع ہو کر اسی کی طرف متوجہ ہو جا۔ مشرق و مغرب کا رب ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، سو اس کو کارساز لے۔''

﴿ وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا ۝ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ ﴾ [الطلاق: ٢،٣]

''اور جو اللہ سے ڈرے گا وہ اس کے لیے نکلنے کا کوئی راستہ بنا دے گا اور اسے رزق دے گا جہاں سے وہ گمان نہیں کرتا اور جو کوئی اللہ پر بھروسا کرے تو وہ اسے کافی ہے۔''

تقویٰ اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل کرنے اور اس کے منع کردہ کام کو چھوڑنے کا مجموعہ ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''اے ابوذر! اگر تمام لوگ صرف اس ایک آیت پر عمل کر لیتے تو یہی ان کو کافی ہوتی۔''[1]

کسی بزرگ کا قول ہے: ''متقی انسان کبھی محتاج نہیں ہوتا۔'' اللہ تعالیٰ نے پرہیز گاروں کو ضمانت دی ہے کہ وہ ہر تنگی میں ان کے لیے راستہ بنا دے گا۔ ان کو ایسی جگہوں سے رزق دے گا۔ جہاں سے انھوں نے سوچا بھی نہ ہوگا، لہٰذا جو چیز ان کو نقصان دے اس کو ان سے دور کر دے گا اور جس چیز کی انھیں ضرورت ہو اس کو ان کے پاس لے آئے گا۔ اگر یہ نتیجہ حاصل نہ ہو تو تقویٰ میں کوئی خلل ہوگا، لہٰذا بندے کو استغفار کرنا چاہیے اور اللہ سے رجوع کرنا

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٢٠) ضعيف الجامع (٦٣٧٢)

چاہیے۔ اسی لیے صحیح حدیث میں ذکر ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو کثرت سے استغفار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی ہر پریشانی کو دور کر دیتا ہے، ہر تنگی سے نکلنے کا راستہ بنا دیتا ہے اور اس کو اس جگہ سے رزق دیتا ہے، جہاں سے اس نے سوچا بھی نہیں ہوتا۔"[1]

مقصودِ کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف توکل کا حکم نہیں دیا، بلکہ توکل کے ساتھ عبادت اور تقویٰ کا حکم بھی دیا ہے، جو اوامر کو بجا لانے اور نواہی سے بچنے پر مشتمل ہے۔ لہٰذا جو یہ گمان کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل کیے بغیر اس پر توکل کر کے اس کو خوش کرے گا وہ گمراہ ہے، اسی طرح وہ شخص بھی گمراہ ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر توکل کیے بغیر اس کے حکم پر عمل کر کے اس کو خوش کرے گا۔

بلکہ وہ عبادت جس کو کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے وہ فرض ہے۔ جب لفظ عبادت مطلقاً بولا جائے تو اس وقت اس میں توکل بھی شامل ہوتا ہے۔ جب ایک کو دوسرے کے ساتھ ملا کر ذکر کیا جائے اس وقت توکل کا مخصوص نام ہوتا ہے۔ اس کے نظائر میں بھی اسی طرح ہے، مثلاً: تقویٰ اور اطاعت الرسول میں بھی یہی تعلق ہے کہ جب مطلقاً تقویٰ بولا جائے تو اس میں اطاعتِ رسول بھی داخل ہوتی ہے اور کبھی وہ ایک دوسرے پر معطوف بھی ہوتے ہیں، جیسے: نوح علیہ السلام کے اس قول میں ہے:

﴿ اُعْبُدُوا اللّٰهَ ﴾ [نوح: ۳] "اللہ کی عبادت کرو۔"

اسی طرح اس آیت میں ہے:

﴿ اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ﴾ [الأحزاب: ۷۰] "اللہ سے ڈرو اور بالکل سیدھی بات کہو۔"

اللہ تعالیٰ نے بہت سارے مقامات پر اپنی عبادت اور توکل کو ایک ساتھ ذکر کیا ہے، جیسے درج ذیل آیات میں ہے:

﴿ قُلْ هُوَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ مَتَابِ ﴾ [الرعد: ۳۰]

"کہہ دے وہی میرا رب ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی پر میں نے بھروسا کیا اور اسی کی طرف میرا لوٹنا ہے۔"

شعیب علیہ السلام کا قول ہے:

﴿ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ﴾ [هود: ۸۸]

"میں نے اسی پر بھروسا کیا اور میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔"

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (۱۵۱۸) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۳۸۱۹) السلسلة الضعيفة (۷۰۵)

اللہ کی طرف رجوع کرنے کا مطلب ہے اس کی عبادت، فرماں برداری اور اس کے رسول کی فرماں برداری کے ذریعے اس کی طرف رجوع کرنا۔

اولیا اور متقین تو ایک طرف رہے، کوئی بندہ بھی اللہ اور اس کے رسول کا فرماں بردار اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب وہ ان کے حکم پر عمل کرے اور جس سے انھوں نے منع کیا ہے اس سے رک جائے۔ اسی میں توکل بھی داخل ہے، لیکن جو انسان یہ تصور کرتا ہے کہ توکل مامور بہا اسباب (وہ اسباب جن کا حکم دیا گیا ہے) سے بے نیاز کر دیتا ہے وہ گمراہ ہے۔ وہ اسی شخص کی طرح ہے جو یہ تصور کرتا ہے کہ اس کے نصیب میں جو نیک بختی یا بدبختی لکھی ہوئی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل کیے بغیر اسی پر توکل کرے گا۔

یہ مسئلہ ان مسائل میں سے ہے جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے بھی پوچھا گیا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے ہر ایک کا ٹھکانا لکھ دیا گیا ہے۔'' تو کہا گیا: اے اللہ کے رسول! کیا ہم عمل چھوڑ نہ دیں اور نوشتہ تقدیر پر توکل نہ کر لیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں! عمل کرو، ہر ایک کو وہ عمل میسر آ جائے گا جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔''[1] اسی طرح آپ ﷺ سے پوچھا گیا: لوگ جو عمل اور تگ و دو کرتے ہیں کیا یہ اس میں داخل ہے، جس کو لکھ کر قلم خشک ہو گئے ہیں اور صحیفے لپیٹ دیے گئے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ اسی میں ہے، لیکن تم عمل کرو.....''[2]

ان احادیث میں آپ ﷺ نے بیان فرمایا کہ پیدا کردہ اور شرعی اسباب تقدیر ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب آپ ﷺ سے ادویہ، علاج، پرہیز اور دم کے بارے میں پوچھا گیا کہ کیا یہ چیزیں تقدیر کو لوٹا سکتی ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ سب تقدیر ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔''[3]

لہٰذا اسباب کی طرف ہی توجہ مرکوز رکھنا توحید میں شرک ہے۔ اسباب کے اسباب ہونے کا انکار کرنا عقل میں کمی ہے اور مامور بہا اسباب سے اعراض کرنا شریعت پر تنقید ہے۔ اس لیے بندے کے دل کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر اعتماد کرنا چاہیے، کسی سبب پر نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی اس کے لیے وہ اسباب مہیا کرتا ہے جو اس کی دنیا اور آخرت میں بہتری پیدا کرتے ہیں۔ اگر اسباب اس کے مقدور میں ہوں اور اس کو ان کو اختیار کرنے کا حکم بھی دیا گیا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ پر توکل کر کے ان کو اختیار کرتا ہے اور مامور بہا کو سرانجام دیتا ہے۔ جس طرح وہ نماز پڑھتا ہے، جہاد کرتا

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٩٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٧)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٥٠)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٠٦٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٤٣٧) یہ روایت ابن ابی خزامہ راوی کے مجہول ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔

ہے، ہتھیار اٹھاتا ہے، ڈھال اور زرہ پہنتا ہے۔ وہ دشمن کو روکنے کے لیے جہاد کے بغیر توکل نہیں کرتا۔ جو انسان مامور بہا اسباب کو ترک کرتا ہے وہ عاجز، بے پروا اور قابلِ مذمت انسان ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ خَيْرٌ وَأَحَبُّ إِلَى اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِيفِ، وَفِي كُلٍّ خَيْرٌ، اِحْرِصْ عَلىٰ مَا يَنْفَعُكَ، وَ اسْتَعِنْ بِاللّٰهِ وَلَا تَعْجِزَنَّ، وَإِنْ أَصَابَكَ شَيْئٌ فَلَا تَقُلْ لَوْ أَنِّي فَعَلْتُ لَكَانَ كَذَا وَ كَذَا، وَلٰكِنْ قُلْ قَدَّرَ اللّٰهُ وَمَا شَاءَ فَعَلَ، فَإِنَّ لَوْ تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّيْطَانِ»[1]

''طاقت ور مومن اللہ کے نزدیک کمزور مومن کی نسبت بہتر اور زیادہ محبوب ہے، جب کہ خیر دونوں میں (موجود) ہے، جس چیز سے تمھیں (حقیقی) نفع پہنچے اس میں حرص کرو اور اللہ سے مدد مانگو اور کمزور نہ پڑ جاؤ (مایوس ہو کر نہ بیٹھ جاؤ)، اگر تمھیں کوئی (نقصان) پہنچے تو یہ نہ کہو: کاش! میں (اس طرح) کرتا تو ایسا ایسا ہوتا، بلکہ یہ کہو: (یہ) اللہ کی تقدیر ہے، وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، اس لیے (حسرت کرتے ہوئے) کاش (کہنا) شیطان کے عمل (کے دروازے) کو کھول دیتا ہے۔''

سنن ابی داود میں ہے کہ دو آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مقدمہ لے کر آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ جس کے خلاف فیصلہ دیا گیا اس نے کہا: مجھے اللہ ہی کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ حماقت اور کمزوری پر ملامت کرتا ہے، تجھے ہوشیار بننا چاہیے، پھر بھی اگر تم مغلوب ہو جاؤ تو کہو: «حسبنا الله ونعم الوكيل»''[2]

لوگوں نے حج اور دیگر سفروں کے لیے سامانِ سفر لے کر جانے کے بارے میں بھی گفتگو کی ہے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدین، صحابہ کرام، تابعینِ عظام اور اکابر مشائخ اپنے ساتھ سامانِ سفر لے کر جاتے تھے اور یہی ان کی سنت ہے، کیوں کہ اس میں اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری ہے، پھر انسان خود بھی اس سے فائدہ اٹھاتا ہے اور دوسرے لوگ بھی اس سے مستفید ہوتے ہیں۔

ایک گروہ کا خیال ہے کہ مکمل توکل کا تقاضا ہے کہ زادِ راہ نہ لیا جائے۔ اکابر ائمہ نے اس خیال کی تردید کی ہے، حارث المحاسبی نے ''کتاب التوکل'' میں اس قول کی تردید کی ہے اور اس کو شقیق بلخی سے نقل کیا ہے۔ اس نے بڑے بھرپور طریقے سے ان کی مذمت کی ہے اور دلائل کی روشنی میں ان کی غلطی، توکل کی حقیقت سمجھنے میں غلط فہمی اور

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٦٤)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٢٧) ضعيف الجامع (١٧٥٩)

اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کو چھوڑ کر ان کا اللہ تعالیٰ کا نافرمان ہونا ثابت کیا ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ کو بتایا گیا کہ ایک آدمی اس درجہ غلو پسند اور توکل کی حقیقت سے جاہل تھا کہ جب اس کے سامنے کھانا رکھا جاتا تو وہ اس کی طرف اپنا ہاتھ نہیں بڑھاتا تھا، تا آنکہ اس کو اس کے منہ میں ڈالا جاتا۔ جب کھانا اس کے منہ میں ڈال دیا جاتا تو وہ دوبارہ اس کے منہ میں لقمہ ڈالنے کے لیے اس کو کھولتے اور اس میں لقمہ ڈالتے۔ امام صاحب نے اس شخص کی بڑے سخت الفاظ میں تردید کی۔ انھی میں وہ لوگ ہیں جو کام کرنے کو حرام کہتے ہیں۔

یہ لوگ اللہ کی خلق و امر (پیدائش اور حکم) میں سنت کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مخلوقات کو اسباب کے ساتھ پیدا کیا اور بندوں کے لیے وہ اسباب مقرر کیے جن کو اختیار کر کے وہ دنیا اور آخرت میں اس کی بخشش، رحمت اور ثواب حاصل کرتے ہیں۔ جو شخص یہ تصور کرتا ہے کہ وہ ان اسباب کو چھوڑ کر جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، محض توکل کے سہارے اپنے مطلوب و مقصود کو حاصل کر سکتا ہے اور سمجھتا ہے کہ مقاصد اور نتائج ان اسباب پر موقوف نہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ان کے اسباب بنایا ہے تو وہ غلط ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اگرچہ بندے کو رزق کی ضمانت دی ہے اور وہ جب تک اس کو زندہ رکھتا ہے، بلاشبہہ اس وقت تک اس کو رزق دیتا رہتا ہے، لیکن یہ بات اس ضمانت دیے گئے رزق کے ان اسباب کے ساتھ معلق ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں جو بندے کے اپنے فعل یا کسی دوسرے کے فعل کے ذریعے وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ نیز امکان ہے کہ اللہ اس کو حرام رزق دے یا حلال۔ اگر بندہ وہ کام کرے جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے تو وہ اس کو رزقِ حلال دیتا ہے۔ جب وہ اس کے حکم کو چھوڑ دے تو امکان ہے کہ وہ اس کو حرام رزق دے۔

دعا اور توکل اسی باب سے تعلق رکھتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا یہ گمان ہے کہ اس کی مطلوب کے حصول یا غیر مرغوب کو دور کرنے میں کوئی تاثیر نہیں، یہ محض ایک عبادت ہے۔ جو اس کے ساتھ حاصل ہوا ہے، اس کے بغیر بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ کچھ دوسرے یہ گمان کرتے ہیں کہ یہ محض ایک علامت ہے، جب کہ صحیح اور درست موقف یہ ہے کہ دعا دنیا اور آخرت کی خوش بختیوں کے حصول کا سب سے بڑا سبب ہے اور یہی ائمہ سلف اور جمہور کا موقف ہے۔

جو امور اللہ تعالیٰ نے دعا، توکل اور کسب وغیرہ جیسے دیگر اسباب کے ساتھ مقدر کیے ہیں وہ انھی کے ساتھ رونما ہوتے ہیں۔

اگر کوئی کہنے والا کہے کہ اگر وہ سبب نہ ہو تو کیا ہوگا؟ یہ ایسے ہے جیسے کوئی کہے: اس مقتول کو اگر قاتل قتل نہ کرتا تو کیا یہ زندہ رہتا؟ بعض قدریہ اس کا جواب دیتے ہیں کہ وہ زندہ رہتا۔ بعض اہلِ سنت کی طرف منسوب لوگوں نے کہا: نہیں وہ مر جاتا، جب کہ صحیح جواب یہ ہے کہ یہ اس معاملے کی تقدیر ہے اور اللہ کو علم ہے کہ اس نے اسی طرح

ہونا ہے، اللہ تعالیٰ ہی نے اس کی موت کا یہ سبب مقرر کیا ہے، لہٰذا وہ اسی سبب کی وجہ سے مرے گا، جس طرح اللہ تعالیٰ نے دنیا اور آخرت کی سعادت کو اس کی عبادت، توکل، دعا، نیک عمل اور کمائی کے ساتھ مربوط کیا ہے۔ چنانچہ اس کے بغیر یہ حاصل نہیں ہو سکتی، اگر اللہ تعالیٰ نے اس سبب کے نہ ہونے کو مقدر کیا ہوتا تو اس کو علم ہی نہ ہوتا کہ اس کا مقدر کیا ہے؟ اگر فرض کیا جائے کہ وہ سبب جو اللہ تعالیٰ نے مقرر کیا تھا وہ رونما نہیں ہوا تو پھر دونوں امکان ہیں کہ وہ زندہ رہ سکتا ہے اور زندہ نہیں بھی رہ سکتا۔ ان دونوں امکانات میں سے کسی ایک کو یقین کے ساتھ کہنا درست نہیں ہوگا۔ اگر کوئی کہنے والا کہے: میں کھاتا ہوں نہ پیتا ہوں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے میری زندگی لکھی ہے تو وہ کھلانے پلانے کے بغیر ہی مجھے زندہ رکھ لے گا۔ یہ بات کہنے والا احمق اور یہ اسی شخص کی طرح ہے جو کہتا ہے: میں اپنی بیوی سے مجامعت نہیں کروں گا، اگر اللہ تعالیٰ نے میرے مقدر میں اولاد لکھی ہے تو وہ کسی مرد کے بغیر ہی حاملہ ہو جائے گی۔

فصل:

اگر توکل اور اسباب کی حقیقت واضح اور معلوم ہو گئی ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی راہ پر چلنے والے لوگ کچھ جہاد میں مصروف ہوتے ہیں، کچھ علم حاصل کرنے اور کچھ عبادت اور اس طرح کی دیگر شرعی مصروفیات میں مگن ہوتے ہیں جن کی وجہ سے کمانے سے عاجز ہوتے ہیں، ان لوگوں کی طرح جن کا اللہ تعالیٰ نے درج ذیل آیات میں تذکرہ کیا ہے:

﴿ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۫ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ﴾ [البقرة: ٢٧٣]

”(یہ صدقات) ان محتاجوں کے لیے ہیں جو اللہ کے راستے میں روکے گئے ہیں، زمین میں سفر نہیں کر سکتے، ناواقف انھیں سوال سے بچنے کی وجہ سے مال دار سمجھتا ہے، تو انھیں ان کی علامت سے پہچان لے گا، وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے۔“

﴿ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ ﴾ [الحشر: ٨]

”(یہ مال) ان محتاج گھر بار چھوڑنے والوں کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور اپنے مالوں سے نکال باہر کیے گئے۔ وہ اللہ کی طرف سے کچھ فضل اور رضا تلاش کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ ہیں جو سچے ہیں۔“

پہلی قسم سے تعلق رکھنے والے لوگ صدقات کے مستحق ہوتے ہیں اور دوسری قسم سے تعلق رکھنے والے لوگ

مالِ غنیمت اور مالِ فے کے مستحق ہیں، پہلی قسم کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِیَ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ وَیُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَیِّاٰتِكُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ﴿۲۷۱﴾ لَیْسَ عَلَیْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ یُّوَفَّ اِلَیْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾ [البقرة: ۲۷۱،۲۷۳]

''اگر تم صدقے ظاہر کرو تو یہ اچھی بات ہے اور اگر انھیں چھپاؤ اور انھیں محتاجوں کو دے دو تو یہ تمھارے لیے زیادہ اچھا ہے اور یہ تم سے تمھارے کچھ گناہ دور کرے گا اور اللہ اس سے جو تم کر رہے ہو، پوری طرح باخبر ہے۔ تیرے ذمے انھیں ہدایت دینا نہیں اور لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور تم خیر میں سے جو بھی خرچ کرو گے سو تمھارے اپنے ہی لیے ہے اور تم خرچ نہیں کرتے مگر اللہ کا چہرہ طلب کرنے کے لیے اور تم خیر میں سے جو بھی خرچ کرو گے وہ تمھیں پورا ادا کیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ (یہ صدقات) ان محتاجوں کے لیے ہیں جو اللہ کے راستے سے روکے گئے ہیں۔''

دوسری قسم کے بارے میں فرمایا:

﴿مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ كَیْ لَا یَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْكُمْ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۷﴾ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِیْنَ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّیَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۸﴾ وَالَّذِیْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْاِیْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ [الحشر: ۷۔۹]

''جو کچھ بھی اللہ نے ان بستیوں والوں سے اپنے رسول پر لوٹایا تو وہ اللہ کے لیے اور رسول کے لیے اور قرابت دار اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافر کے لیے ہے، تاکہ وہ تم میں سے مال داروں کے درمیان ہی گردش کرنے والا نہ ہو اور رسول تمھیں جو کچھ دے تو وہ لے لو اور جس سے تمھیں روک دے تو رک جاؤ اور اللہ سے ڈرو، یقیناً اللہ بہت سخت سزا دینے والا ہے۔ (یہ مال) ان محتاج گھر بار چھوڑنے والوں کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور اپنے مالوں سے نکال باہر کیے گئے۔ وہ اللہ کی طرف سے کچھ فضل اور رضا تلاش کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ ہیں جو سچے ہیں اور (ان کے لیے) جنھوں نے ان سے پہلے اس گھر میں اور ایمان میں جگہ بنا لی ہے۔''

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے مہاجرین اور انصار کا تذکرہ کیا۔ مہاجر تجارت پیشہ تھے اور انصار زراعت پسند، اللہ تعالیٰ نے دونوں گروہوں سے کہا:

﴿ اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ﴾ [البقرة:٢٦٧]

''ان پاکیزہ چیزوں میں سے خرچ کرو جو تم نے کمائی ہیں اور ان میں سے بھی جو ہم نے تمھارے لیے زمین سے نکالی ہیں۔''

تجارت کی زکات کا بھی ذکر کیا اور زمین کی پیداوار کی زکات کا بھی تذکرہ کیا جو عشر، آدھا عشر اور چوتھائی عشر کی صورت میں ہوتی ہے۔

اللہ کی راہ پر چلنے والے کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کے لیے ان شرعی ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ کمانا بھی ممکن ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب قیام اللیل کا حکم دیا تو کہا:

﴿ عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى وَ اٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَ اٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ [المزمل: ٢٠]

''اس نے جان لیا کہ یقیناً تم میں سے کچھ بیمار ہوں گے اور کچھ دوسرے زمین میں سفر کریں گے، اللہ کا فضل تلاش کریں گے اور کچھ دوسرے اللہ کی راہ میں لڑیں گے۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی چار اصناف ذکر کی ہیں: ایک اہلِ قرآن، اہلِ علم اور عبادت گزاروں کی جماعت، دوسری اللہ کا فضل، یعنی رزق تلاش کرنے کے لیے زمین میں گھومنے والوں کی جماعت، تیسری مجاہدین کی جماعت اور چوتھی معذوروں کی جماعت۔

سائل کا یہ کہنا کہ غذا اور قوام موت اور حیات کی طرح اللہ کا فعل ہے، لہٰذا اس کی طلب وجستجو ممکن نہیں ہوتی، تو بات اس طرح نہیں، بلکہ جو کام اللہ تعالیٰ نے اسباب کے ساتھ منسلک کیا ہے اس کو اسباب کے ساتھ ہی طلب کرنا ممکن ہے، جس طرح اس نے زندگی اور موت کی مثال دی ہے تو انھی کو لے لیں۔ موت کو ان اسباب کے ساتھ طلب کرنا اور ٹالنا ممکن ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے اسباب بنائے ہیں۔ اگر ہم چاہیں کہ اللہ کا دشمن مر جائے تو ہم اس کو قتل کرنے کی کوشش کریں گے۔ اگر ہم مومنوں سے موت کو روکنا چاہیں اور ان کا دفاع کرنا چاہیں تو اس سبب کو اختیار کر کے اس کو روکیں گے جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت داود علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

﴿ وَ عَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ﴾ [الأنبياء:٨٠]

''اور ہم نے اسے تمھارے لیے زرہ بنانا سکھایا، تاکہ وہ تمھاری لڑائی سے تمھارا بچاؤ کرے۔''

اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ فرمایا:

﴿ فَلْيُصَلُّوا مَعَكَ وَلْيَأْخُذُوا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ ﴾ [النساء: ۱۰۲]

''پس تیرے ساتھ نماز پڑھیں اور وہ اپنے بچاؤ کا سامان اور اپنے ہتھیار پکڑے رکھیں۔''

یہ اپنے آپ سے سردی اور گرمی کو دور کرنے کی مثال ہے جو اللہ تعالیٰ کا فعل ہے تو لباس اور اکتساب، اسی طرح بھوک اور پیاس جو اللہ کا فعل ہے، اس کو کھانے پینے کے ساتھ ختم کرنا مشروع ہے۔ اسی طرح جان نکالنا اللہ کا فعل ہے، لیکن قتل کے ذریعے اس کو طلب کرنا ممکن ہے۔ دل میں علم اور ہدایت ڈالنا اللہ کا کام ہے، لیکن دعا اور دیگر مامور بہا اسباب کے ذریعے اس کو طلب کرنا ممکن ہے۔

قائل کا یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ سبب کے ساتھ بھی کر سکتا ہے اور سبب کے بغیر بھی، لہٰذا یہ ہم پر کہاں سے فرض ہوتا ہے کہ سبب تلاش کریں؟

اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ معاملہ اس طرح نہیں، بلکہ وہ ساری چیزیں جن کو اللہ تعالیٰ پیدا کرتا ہے اور ان کا اندازہ لگاتا ہے، ان کو اسباب کے ساتھ پیدا اور مقرر کرتا ہے، لیکن کچھ اسباب بندے کی قدرت سے باہر ہوتے ہیں، کچھ اس کی قدرت میں ہوتے ہیں، کچھ ایسے اسباب ہوتے ہیں، جن کو بندہ کرتا ہے اور کچھ ایسے ہیں جن کو وہ نہیں کرتا۔ کچھ معمول کے مطابق ہوتے ہیں اور کچھ نادر ہوتے ہیں۔

کچھ سالوں میں بارش رک جاتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ ہوائیں بھیج کر فصلوں کو پکا دیتا ہے۔ کسی نیک آدمی کی دعا کے نتیجے میں کھانے پینے میں برکت پیدا ہو جاتی ہے۔ جس طرح رسول اللہ ﷺ کی دعا کے ساتھ برکت پیدا ہو جاتی تھی۔ یہ بھی ایک سبب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بسا اوقات کسی مخلوق کے ذریعے بھی انسان کو رزق مل جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کے پاس کسی جن، کسی فرشتے، کسی پرندے یا کسی چوپائے کے ذریعے رزق پہنچ جاتا ہے، لیکن یہ نادر ہے۔

لیکن اکثر اور زیادہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ لوگوں ہی کے ذریعے سے رزق دیتا ہے، مثلاً: اکثر ناداروں اور کمانے کی صلاحیت نہ رکھنے والوں کو ان لوگوں کے ہاتھ سے رزق ملتا ہے جو ان کو صدقے، تحفے اور نذر وغیرہ کی صورت میں دیتے ہیں۔

صحیح میں حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''اے آدم کے بیٹے! زائد مال خرچ کر دے یہ تمھارے لیے بہتر ہے۔ زائد مال کو روک کر رکھنا تمھارے لیے برا ہے۔ قابلِ کفایت پر ملامت نہیں کیا جاتا، اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔''[1]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٣٦)

ایک دوسری حدیث میں ہے:

''اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہی بلند ہے، دینے والے کا ہاتھ اس کے بعد ہے اور مانگنے والے کا ہاتھ اس کے نیچے۔''[1]

کچھ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ سائل اور لینے والے کا ہاتھ ہی اوپر والا ہوتا ہے، کیوں کہ صدقہ حق کے ہاتھ میں واقع ہوتا ہے، یہ رسول اللہ ﷺ کے مذکورہ بالا الفاظ کے خلاف ہے۔

قائل کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رزق کی مطلقاً ضمانت دی ہے۔ اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ جن کاموں کے لیے اسباب کا ہونا ضروری ہے یہ ان کے اسباب کے واجب ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ بچوں، بیویوں اور جانوروں کا رزق بھی اس میں شامل ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے ضمانت دی ہے۔ اس کے باوجود بندے پر اپنی اولاد، بیوی اور جانوروں پر خرچ کرنا فرض ہوتا ہے۔ اس پر مسلمانوں کا اجماع ہے کہ انسان کا اپنی ذات پر خرچ کرنا اس پر واجب ہے۔ قائل کا یہ سوال کہ جس کی جگہ کا علم نہیں اس کو کس طرح طلب اور تلاش کیا جا سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انسان وہ سبب اختیار کرے جس کو اختیار کرنے کا شریعت نے حکم دیا ہے اور جو اس کی طاقت سے باہر ہو اس میں اللہ پر توکل کرے، مثلاً: کسان زمین کھودتا ہے، اس کی بویائی کرتا ہے اور بارش اتارنے، فصل اگانے اور موذی اثرات کو زائل کرنے میں اللہ تعالیٰ پر توکل کرتا ہے۔ اسی طرح تاجر زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہے کہ سامان حاصل کرے، اس کو بازار میں لے کر آئے، لیکن گاہک کے دل میں رغبت پیدا کرنا، اس کا پیسے خرچ کرنا، جس سے اس کو نفع حاصل ہو، یہ امور بندے کی مقدور اور طاقت سے باہر ہیں۔

لٰہذا جو انسان وہ کام کرتا ہے جس کی قدرت رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اس کی سزا نہیں دے گا جس کو حاصل کرنے کی وہ قدرت نہیں رکھتا۔

طلب کے لیے کسی مخصوص رخ اور چیز کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ جتنا رزق اس کے لیے کافی ہوتا ہے اسی کی جستجو کرنی چاہیے۔ جس طرح انسان کسی چیز کو مخصوص کیے بغیر اللہ تعالیٰ سے کشائشِ رزق اور قابلِ کفایت روزی کے لیے دعا کرتا ہے۔

فصل (محنت مزدوری کا حکم):

مذکورہ باتوں کی وضاحت کے بعد یہ بیان کیا جاتا ہے کہ محنت مزدوری اور کمائی کرنا کبھی واجب ہوتا ہے، کبھی مستحب۔ واجب کی صورت یہ ہے کہ جس انسان کو اپنی ذات پر یا اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنے یا کوئی قرض چکانے

---

[1] مسند أحمد (٤٤٦/١، ٣٧٣/٣، ١٣٣٧/٤) صحيح الجامع (٢٧٩٤)

کے لیے مال کی ضرورت ہو اور وہ کمائی کر سکتا ہو کسی ایسے کام میں مشغول نہ ہو جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہو اور وہ اللہ کے ہاں کمائی کرنے سے زیادہ بہتر ہو تو اس انسان پر محنت اور کمائی کرنا فرض ہے۔ اس پر تمام علما کا اتفاق ہے اور اگر وہ اس صورت میں اس کو چھوڑ دے تو نافرمان اور گناہ گار ہو گا۔

مستحب کی صورت یہ ہے کہ انسان صدقہ و خیرات کرنے کی نیت سے محنت مزدوری کرے۔ اس کی دلیل یہ حدیث ہے جس کو حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ہر مسلمان پر صدقہ کرنا لازمی ہے۔'' انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! جو نادار ہو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ اپنے ہاتھ سے کام کرے، اپنے آپ کو بھی فائدہ پہنچائے اور صدقہ بھی کرے۔'' انھوں نے کہا: اگر وہ یہ بھی نہ کر پائے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ ضرورت مند، ستم رسیدہ کی مدد کرے۔'' انھوں نے کہا: جو یہ بھی نہ کر پائے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو نیکی کا حکم دے اور برائی سے رکے، یہی اس کے لیے صدقہ ہو گا۔''[1]

فصل (انبیا اور اولیا کی رزق کے لیے تگ و دو):

''قائل کا کہنا کہ انبیا اور اولیا نے رزق تلاش نہیں کیا۔''

تو بات اس طرح نہیں، بلکہ عام انبیائے کرام علیہم السلام رزق حاصل کرنے کے لیے اسباب اختیار کرتے تھے جس طرح ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

''مجھے قیامت تک تلوار دے کر بھیجا گیا ہے، حتی کہ اللہ وحدہ لا شریک کی عبادت کی جائے۔ میرا رزق میرے نیزے کے سائے میں رکھا گیا ہے۔ جو میرے حکم کی مخالفت کرتا ہے ذلت اور رسوائی اس کا مقدر ہے۔ جو کسی قوم سے مشابہت اختیار کرتا ہے وہ انھی میں سے ہوتا ہے۔''[2]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

''بہترین کھانا جو انسان کھاتا ہے وہ ہے جس کو خود کماتا ہے۔''[3]

حضرت داود علیہ السلام خود کما کر کھاتے تھے۔ وہ زرہیں بنایا کرتے تھے۔ حضرت زکریا علیہ السلام نجار تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس بہت زیادہ جانور تھے۔ وہ انجان مہمانوں کو بھی بچھڑا ذبح کر کے کھلاتے تھے۔ تاہم یہ فراوانی کی صورت میں ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٧٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٠٨)

[2] مسند أحمد (٢/٥٠، ٩٢) اس روایت کا ایک جز امام بخاری رحمہ اللہ نے تعلیقاً ذکر کیا ہے: (١٠٦٦/٣)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٦٦)

انبیائے کرام کے بعد توکل کرنے والے اولیا میں سے سب سے بہتر اور اعلیٰ مہاجرین اور انصار تھے اور ان کو مجموعی طور پر اللہ تعالیٰ ان اسباب کی بنا پر رزق دیتا تھا، جن کو وہ اختیار کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تجارت کرتے تھے اور اس سے نفع حاصل کرتے تھے۔ جب خلیفہ بنے تو ان کے لیے بیت المال سے ہر دن کے لیے دو درہم مقرر کیے گئے۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں انھوں نے سارا مال اللہ کی راہ میں دے دیا۔ آپ ﷺ نے ان سے کہا: ''گھر والوں کے لیے کیا چھوڑ کر آئے ہو؟ انھوں نے کہا: اللہ اور اس کا رسول۔''

اس کے باوجود وہ کسی سے صدقہ اور نذر وغیرہ کچھ قبول نہیں کرتے تھے، بلکہ خود کما کر زندگی بسر کرتے تھے۔

لیکن اس شخص کے عکس جو توکل کا دعویٰ کرتا ہے اور بزعم خویش حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اقتدا کرتے ہوئے سارا مال اللہ کی راہ میں دے دیتا ہے، پھر لوگوں سے مانگ کر یا مانگنے کے بغیر لیتا ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تو ایسا نہیں کرتے تھے، بلکہ مسند احمد میں روایت ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے اگر کوڑا گر جاتا تو کسی سے یہ نہیں کہتے تھے کہ مجھے پکڑا دیں۔ وہ فرمایا کرتے تھے: ''مجھے میرے خلیل ﷺ نے حکم دیا ہے کہ میں لوگوں سے کوئی چیز نہ مانگوں۔'' تو کہاں ہیں وہ لوگ جنھوں نے گداگری اور مانگنے ہی کو اللہ کی راہ قرار دے دیا ہے، حتیٰ کہ وہ مرید کو لوگوں سے مانگنے کا حکم دیتے ہیں؟!

متواتر احادیث میں ذکر ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ضرورت کے بغیر مانگنے کو حرام قرار دیا ہے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''مانگنا صرف اس کے لیے جائز ہے جس کو چٹی بھرنی پڑ جائے یا تکلیف دہ خون بہا دینا پڑے یا کمر توڑنے والے فقر سے واسطہ پڑے۔''[1] اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۞ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ ۞ ﴾ [الإنشراح: ۷، ۸]

''تو جب تو فارغ ہو جائے تو محنت کر اور اپنے رب ہی کی طرف پس رغبت کر۔''

اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو حکم دیا کہ آپ ﷺ کی رغبت صرف ایک اللہ کی طرف ہونی چاہیے۔

ان نام نہاد توکل کرنے والوں میں سے کچھ لوگ دعا اور اللہ تعالیٰ سے مانگنے کو نقص قرار دیتے ہیں، لیکن لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں اور ان سے مانگتے ہیں، حالانکہ بندے کا اپنی حاجت کے لیے اپنے رب سے سوال کرنا تمام عبادتوں میں سے بہترین عبادت ہے اور یہ انبیائے کرام کا راستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو اپنے سے سوال کرنے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد ہے:

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٦٤١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٥٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢١٩٨) ضعيف الجامع، رقم الحديث (١٧٨٠)

﴿ وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ﴾ [النساء: ٣٢] ''اور اللہ کے فضل میں سے مانگو۔''

ان لوگوں کی تعریف کی ہے جو اللہ تعالیٰ سے امید رکھتے ہوئے اور خوف کھاتے ہوئے دعا کرتے ہیں، بلکہ کچھ دعائیں کرنا تو ہر مسلمان پر فرض ہیں۔ انہی میں سے ایک وہ دعا بھی ہے جو سورت فاتحہ میں مذکور ہے۔ ان میں سے کچھ لوگ اس واقعے سے استدلال کرتے ہیں کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھینکا گیا تو جبرائیل علیہ السلام نے آپ سے کہا: ''کیا آپ کو کوئی ضرورت ہے؟'' انھوں نے کہا: ''تجھ سے تو کوئی حاجت نہیں۔'' انھوں نے کہا: ''تو اللہ سے مانگ لیں۔'' انھوں نے کہا: ''وہ میرے حال سے واقف ہے، اس لیے مجھے سوال کرنے کی ضرورت نہیں۔''

اس حدیث کا پہلا حصہ تو معروف ہے، صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

''حسبنا الله ونعم الوكيل'' پہلی دفعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا، جب ان کو آگ میں پھینکا گیا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت کہا تھا، جب لوگوں نے ان سے کہا:

﴿ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ ﴾ [آل عمران: ١٧٣]

''بے شک لوگوں نے تمھارے لیے (فوج) جمع کر لی ہے، سو ان سے ڈرو۔''[1]

لیکن یہ جملہ ''وہ میرے حال سے واقف ہے، اس لیے مجھے سوال کرنے کی ضرورت نہیں۔'' باطل ہے اور یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دیگر انبیا سے منقول دعاؤں اور ان کے اللہ تعالیٰ سے سوال کرنے کے خلاف ہے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بھی خلاف ہے، کیوں کہ اس نے بندوں کو دونوں جہانوں کی بہتری کے لیے سوال کرنے کا حکم دیا ہے، جس طرح اس دعا میں ہے:

﴿ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴾ [البقرة: ٢٠١]

''اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھلائی اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔''

اللہ تعالیٰ سے سوال کرنا، دعا کرنا اور اس پر توکل کرنا اس کی عبادت ہے جو اسباب کے ساتھ مشروع اور مقدر ہے، اس لیے صرف علم اور واقفِ حال ہونا کس طرح اس امر کو ساقط کر سکتا ہے جو اس نے پیدا کیا ہے اور جس کا حکم دیا ہے؟ والله أعلم، وصلى الله علىٰ محمد وسلم.[2]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٨٧)

[2] مجموع الفتاویٰ (٨/٥٢٤_٥٣٩)

رزق میں کمی بیشی اور اس کی انواع

سوال کیا رزق کم یا زیادہ ہوتا ہے؟ نیز کیا رزق وہی ہے جو بندہ کھالیتا ہے یا جس کو ملکیت بناتا ہے؟

جواب رزق کی دو اقسام ہیں:

① جو اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ وہ بندے کو رزق دے گا۔ یہ تو تبدیل نہیں ہوتا۔

② جو اس نے لکھا ہے یا فرشتوں کو بتایا ہے۔ اس میں اسباب کے اعتبار سے کمی بیشی ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ بندے کا رزق لکھ دیں اور اگر وہ صلہ رحمی کرے تو اس میں اضافہ کر دیں۔ بخاری شریف میں حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس کو اس بات کی خوشی ہو کہ اس کے رزق میں کشادگی اور اس کی عمر میں وسعت کر دی جائے وہ صلہ رحمی کرے۔''[1] اسی طرح حضرت داوٗد علیہ السلام کی عمر چالیس سال تھی، پھر اللہ تعالیٰ نے اس میں ساٹھ سال کا اضافہ کر کے اس کو پورے سو کر دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی اسی قبیل سے ہے کہ اے اللہ! اگر تو نے مجھے بدبخت لکھا ہے تو اس کو مٹا کر مجھے خوش بخت لکھ دے۔ بے شک تم جو چاہتے ہو مٹا سکتے ہو اور جو چاہتے ہو باقی رکھ سکتے ہو۔ نوح علیہ السلام کا یہ قول بھی اسی قسم سے تعلق رکھتا ہے:

﴿ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ ۞ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ﴾

[نوح: ۳،٤]

''کہ اللہ کی عبادت کرو اور اس سے ڈرو اور میرا کہنا مانو۔ وہ تمھیں تمھارے گناہ معاف کر دے گا اور ایک مقررہ وقت تک تمھیں مہلت دے گا۔''

اس کے شواہد بہت زیادہ ہیں۔

وہ اسباب جن سے رزق حاصل ہوتا ہے، وہ بھی جملہ تقدیر میں شامل ہیں، جس کو اللہ تعالیٰ نے مقرر کیا اور لکھا ہے۔ اگر تقدیر میں یہ لکھا ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کو اس کی کوشش اور محنت کے بدلے میں رزق دے گا تو وہ اس کے دل میں کوشش اور محنت کو ڈال دیتا ہے۔

جو اس نے اکتساب کے ساتھ مقدر کیا ہے وہ اکتساب کے بغیر حاصل نہیں ہوگا اور جو اکتساب کے بغیر لکھا ہے وہ اس کے اکتساب کے بغیر ہی حاصل ہوگا، مثلاً: اس کو اپنے موروث (جس کا وارث بن رہا ہے) کی موت کے نتیجے میں ملنے والا مال، جو اس کو اکتساب کے بغیر ملتا ہے۔

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٦١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٥٧)

سعی اور کوشش کی بھی دو اقسام ہیں: ایک اس کام میں کوشش جو رزق کے لیے مقرر ہوتا ہے، جیسے: صنعت و تجارت اور زراعت وغیرہ اور دوسری دعا، توکل اور لوگوں کے ساتھ نیکی کرنے کی کوشش، کیوں کہ اللہ تعالیٰ اس وقت تک بندے کی مدد کرتا رہتا ہے جب تک وہ اپنے بھائی کی مدد کرتا رہتا ہے۔

فصل:

رزق سے دو چیزیں مراد ہوتی ہیں: ایک جس سے بندہ فائدہ اٹھاتا ہے، دوسری جس کو بندہ حاصل کر کے اپنی ملکیت بناتا ہے۔

یہ دوسری قسم ان آیات میں مذکور ہے:

﴿ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴾ [البقرة: ٣] ''جو ہم نے انھیں دیا ہے، خرچ کرتے ہیں۔''

﴿ وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ ﴾ [المنافقون: ١٠] ''اور اس میں سے خرچ کرو جو ہم نے تمھیں دیا ہے۔''

یہ وہ حلال رزق ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے بندے کو مالک بنایا ہے۔ دوسری قسم اس آیت:

﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا ﴾ [هود: ٦]

''اور زمین میں کوئی چلنے والا (جاندار) نہیں مگر اس کا رزق اللہ ہی پر ہے۔''

اور اس حدیث:

((إِنَّ نَفساً لَنْ تَمُوْتَ حَتّٰى تَسْتَكْمِلَ رِزْقَهَا))[1]

''کوئی نفس اپنا رزق پورا کیے بغیر نہیں مرے گا۔'' میں مذکور ہے۔

بندہ حلال بھی کھاتا ہے اور حرام بھی، یہ اس اعتبار سے رزق ہے، لیکن دوسرے اعتبار سے رزق نہیں اور جو وہ کماتا ہے، لیکن اس سے فائدہ نہیں اٹھاتا وہ دوسرے اعتبار سے رزق ہے پہلے اعتبار سے نہیں۔ یہ حقیقت میں اس کے ورثا کا مال ہے اس کا نہیں۔ واللہ أعلم[2]

کیا حرام خور کا مقسوم رزق حرام ہی ہے؟

سوال جو آدمی چوری کرتا ہے، لوگوں کو لوٹتا ہے، حرام کھاتا ہے، یا اس طرح کا کوئی کام کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں جو رزق حاصل کرتا ہے کیا یہی اس کا مقسوم رزق ہے یا نہیں اور اسی کی اس نے اس کو ضمانت دی ہے؟

---

[1] شرح السنة (١٤/٣٠٣۔٣٠٤) السلسلة الصحيحة (٢٨٦٦)

[2] مجموع الفتاویٰ (٨/٥٤٠۔٥٤١)

جواب الحمد لله. یہ رزق اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے جائز نہیں کیا، نہ وہ اس کو پسند کرتا ہے اور نہ اس نے اس کو اس سے خرچ کرنے کا حکم دیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴾ [البقرة: ٣] ''جو ہم نے انھیں دیا ہے، خرچ کرتے ہیں۔''

﴿ وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ ﴾ [المنافقون: ١٠] ''اور اس میں سے خرچ کرو جو ہم نے تمھیں دیا ہے۔''

اس میں حرام داخل نہیں، بلکہ جو حرام سے خرچ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی مذمت کرتا ہے اور وہ اپنے دین کے اعتبار سے اس کی وجہ سے دنیا اور آخرت میں سزا کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ ﴾ [البقرة: ١٨٨]

''اور اپنے مال آپس میں باطل طریقے سے مت کھاؤ۔''

اور یہ باطل طریقے سے مال کھانے میں داخل ہے۔

لیکن جو اس کا رزق پہلے سے اللہ کے علم میں ہے اور اس نے اس کو مقرر کیا ہے، جس طرح حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ ماں کے پیٹ میں بچے کا رزق، اس کا عمل، اس کی عمر اور اس کا نیک یا بد ہونا لکھ دیا جاتا ہے۔[1] تو جس طرح اس نے یہ لکھا ہوتا ہے کہ وہ جو اچھائی یا برائی کرے گا اس کے مطابق اس کو جزا یا سزا دے گا، اسی طرح اس نے یہ بھی لکھا ہوتا ہے کہ وہ اس کو حرام رزق دے گا یا حلال۔ اس کے باوجود وہ اس کو حرام کھانے پر سزا دے گا، لہٰذا کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے اس کی مرضی اور اندازے کے مطابق ہی ہوتا ہے۔ جس طرح تمام اعمال رونما ہوتے ہیں، لیکن تقدیر کسی کے لیے بھی عذر نہیں، بلکہ تقدیر پر ایمان لانا ہوتا ہے، کوئی اللہ کے سامنے تقدیر کو حجت نہیں بنا سکتا، بلکہ اللہ کی حجت ہی پوری ہونے والی ہے۔ جو انسان گناہوں کے ارتکاب میں تقدیر کو حجت بناتا ہے اس کی دلیل بے کار ہے اور جو اس کو عذر بناتا ہے اس کا عذر غیر مقبول ہے۔ ان لوگوں کی طرح جنھوں نے کہا تھا:

﴿ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا ﴾ [الأنعام: ١٤٨]

''اگر اللہ چاہتا تو ہم شریک نہ بناتے اور نہ ہمارے باپ دادا۔''

جنھوں نے کہا:

﴿ لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ﴾ [الزخرف: ٢٠]

''اگر رحمان چاہتا تو ہم ان کی عبادت نہ کرتے۔''

اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے کہا ہے:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٣٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٣)

﴿ اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ وَاِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِيْنَ ۝ اَوْ تَقُوْلَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ۝ ﴾ [الزمر: ٥٦-٥٧]

''(ایسا نہ ہو) کہ کوئی شخص کہے ہائے افسوس! اس کوتاہی پر جو میں نے اللہ کی جناب میں کی اور بے شک میں تو مذاق کرنے والوں میں سے تھا۔ یا کہے کہ اگر واقعی مجھے اللہ ہدایت دیتا تو میں ضرور پرہیز گاروں میں سے ہوتا۔''

لیکن وہ رزق جس کی ضمانت اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو دی ہے وہ اس کے لیے ہے جو پرہیز گار ہوتا ہے۔ اس کے لیے وہ راستے بناتا ہے۔ اس کو اس جگہ سے رزق دیتا ہے جس جگہ سے اس نے سوچا بھی نہیں ہوتا، لیکن جو پرہیز گاروں سے نہیں ہوتا اس کو اس کی حالت کے مناسب رزق کی ضمانت دیتا ہے، مثلاً: اس کو دنیا کی زندگی گزارنے کے لیے مال دیتا ہے، پھر آخرت میں اس کا مواخذہ کرے گا، جس طرح حضرت خلیل علیہ السلام نے کہا تھا:

﴿ وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ ﴾ [البقرة: ١٢٦]

''اور اس کے رہنے والوں کو پھلوں سے رزق دے، جو ان میں سے اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائے۔ فرمایا اور جس نے کفر کیا تو میں اسے بھی تھوڑا سا فائدہ دوں گا، پھر اسے آگ کے عذاب کی طرف بے بس کروں گا اور وہ لوٹنے کی بری جگہ ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے رزق مباح کیا ہے جو اس سے اس کی اطاعت پر مدد حاصل کرتا ہے، اس کے لیے مباح نہیں کیا جو اس سے اس کی نافرمانی پر مدد حاصل کرتا ہے، بلکہ یہ لوگ اگر اس رزق کو کھا بھی لیں جس کی اس نے ان کو ضمانت دی ہے، پھر بھی ان کا مواخذہ ہوگا، جس طرح اس آیت میں فرمایا:

﴿ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴾ [البقرة: ١٢٦]

''اور جس نے کفر کیا تو میں اسے بھی تھوڑا سا فائدہ دوں گا، پھر اسے آگ کے عذاب کی طرف بے بس کروں گا اور وہ لوٹنے کی بری جگہ ہے۔''

﴿ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ﴾ [المائدة: ١]

''تمھارے لیے چرنے والے چوپائے حلال کیے گئے ہیں، سوائے ان کے جو تم پر پڑھے جائیں گے، اس حال میں کہ شکار کو حلال جاننے والے نہ ہو، جب کہ تم احرام والے ہو۔''

اس نے اس کے لیے چوپائے حلال کیے ہیں جس کے لیے احرام کی حالت میں شکار کرنا حرام ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ ﴾ [المائدة: ٩٣]

''ان لوگوں پر جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے اس چیز میں کوئی گناہ نہیں جو وہ کھا چکے، جب کہ وہ متقی بنے اور ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے، پھر وہ متقی بنے اور ایمان لائے، پھر وہ متقی بنے اور انھوں نے نیکی کی اور اللہ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔''

جس طرح ہر حیوان وہی رزق کھاتا ہے جو اس کے مقدر میں لکھا ہوتا ہے۔ جو مال انسان کے لیے جائز نہیں اس کو کھانے پر اس کا مواخذہ کیا جاتا ہے، خواہ وہ حرام جنس سے تعلق رکھتا ہو یا اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر مدد حاصل کی جائے، اسی لیے کافروں کے اموال مسلمانوں کے لیے چھینے گئے نہیں، بلکہ مباح ہوتے ہیں۔ اگر وہ مومنوں کے پاس پہنچیں تو انھیں مالِ فے کہا جاتا ہے، کیوں کہ اموال کا وہی مستحق ہوتا ہے جو اللہ کا فرماں بردار ہو، وہ نہیں جو نافرمان ہو۔ لہٰذا مومن ان اموال کو استحقاق کے اعتبار سے حاصل کرتے ہیں اور کافر جس طرح اپنے اعمال میں زیادتی کرتے ہیں، اسی طرح ان کو خرچ کرنے میں بھی زیادتی کرتے ہیں۔ اگر وہ اموال مسلمانوں کی طرف لوٹ آئیں تو وہ اسی طرح ان کی طرف لوٹ کر آتے ہیں جس طرح مال اپنے مستحق کے پاس آ پہنچتا ہے۔ [1]

شراب اور حرام چیز جاہلوں کا رزق ہے یا مقدر؟

سوال کیا شراب اور حرام چیزیں جاہلوں کا رزق ہے یا وہ وہی کھاتے ہیں جو ان کا مقدر ہوتا ہے؟

جواب رزق سے مراد ایک تو وہ مال ہے جو اللہ تعالیٰ نے بندے کے لیے جائز قرار دیا ہو اور وہ اس کو اپنی ملکیت میں لے لے اور دوسری وہ چیز ہے جس سے بندہ غذا حاصل کرتا ہے۔

پہلے کے بارے میں فرمایا:

﴿ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴾ [البقرة: ٣] ''جو ہم نے انھیں دیا ہے، خرچ کرتے ہیں۔''

﴿ وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ ﴾ [المنافقون: ١٠] ''اور اس میں سے خرچ کرو جو ہم نے تمھیں دیا ہے۔''

یہ رزقِ حلال ہے اور شراب اور حرام مملوک میں داخل نہیں۔ دوسرے کے بارے میں فرمایا:

﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا ﴾ [هود: ٦]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٨/٥٤٢۔٥٤٤)

''اور زمین میں کوئی چلنے والا (جاندار) نہیں مگر اس کا رزق اللہ ہی پر ہے۔''

اللہ تعالیٰ جانوروں کو رزق دیتا ہے لیکن انھیں اس کے مالک نہیں کہا جاتا اور نہ یہ کہا جاتا ہے کہ یہ جانوروں کے لیے شرعی طور پر حلال ہے، کیوں کہ جانور اور اسی طرح بچے اور پاگل بھی شریعت کے پابند نہیں، یہ رزق ان کی ملکیت میں ہوتا ہے اور نہ ان پر حرام ہی ہوتا ہے۔

حرام وہ کچھ رزق ہے جس سے بندہ غذا حاصل کرتا ہے اور یہ اس رزق سے تعلق رکھتا ہے جس کے بارے میں اللہ جانتا ہے کہ اللہ اسے غذا بنائے گا، اسی کو اس نے تقدیر میں لکھا ہے، اس رزق کے خلاف جو اللہ تعالیٰ نے بندے کے لیے حلال کیا ہے اور اس کی ملکیت میں دیا ہے۔ جس طرح حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مذکور ہے کہ بچہ ابھی ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے کہ اس کا رزق، عمل، عمر اور نیک یا بد ہونا لکھ دیا جاتا ہے۔[1]

لہٰذا وہ رزقِ حرام جو اللہ تعالیٰ نے اس کے مقدر میں کیا ہو اور اس کو فرشتوں نے لکھ دیا ہو وہ ان چیزوں میں داخل ہے جو اللہ تعالیٰ کی مرضی اور تخلیق کے ماتحت ہیں، لیکن اس کے باوجود اس نے اس کو حرام کیا ہے اور اس سے منع کیا ہے۔ جو اس کا ارتکاب کرتا ہے، اس کو اللہ تعالیٰ کے غصے، اس کی مذمت اور سزا سے اتنا حصہ ملتا ہے جتنے کا وہ اہل ہوتا ہے۔ واللہ أعلم[2]

شیخ عبدالقادر کے قول: ''نازعت أقدار الحق بالحق للحق'' کی شرح

سوال شیخ عبدالقادر کے اس قول: ''نازعت أقدار الحق بالحق للحق'' ''میں نے حق تعالیٰ کی تقدیروں کا حق کے ساتھ یعنی دین کے ساتھ حق کے لیے یعنی صحیح عقیدے کے لیے منازعہ، یعنی سمجھنے کی کوشش کی۔'' کا کیا معنی ہے؟

جواب الحمد للہ. تمام حادثات اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر کے ساتھ رونما ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں حسبِ امکان شر کو خیر کے ساتھ، کفر کو ایمان کے ساتھ، بدعت کو سنت کے ساتھ اور اپنی نافرمانی کو اپنی فرماں برداری کے ساتھ زائل کرنے کا حکم دیا ہے۔ لہٰذا ہر وہ انسان جو کفر کرتا ہے، نافرمانی کرتا ہے یا گناہ کرتا ہے، اگرچہ یہ تقدیر کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں، لیکن اس پر توبہ کرنا فرض ہے۔ حسبِ امکان نیکی کا حکم دینا اور برائی سے منع کرنا واجب ہے۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرنا فرض ہے، اگرچہ بندے کا گناہ کرنا، برائی کرنا، کفر کرنا اور نافرمانی کرنا اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے ماتحت ہے، لیکن انسان کو یہ اجازت نہیں کہ وہ تقدیر پر بھروسا کر کے ان کاموں کی کوشش ترک کر دے جو اس کے لیے مفید ہوں، بلکہ اس کو ہر حال میں اللہ اور اس کے رسول کے دیے گئے احکام کی پیروی کرنا ہوتی ہے۔

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٠٣٦) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٤٣)

[2] مجموع الفتاویٰ (٥٤٦_٥٤٥/٨)

صحیح مسلم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''طاقتور مومن اللہ تعالیٰ کو کمزور مومن سے زیادہ محبوب ہے اور وہ اس کے نزدیک زیادہ بہتر ہے، ہر وہ کام کرنے کی آرزو کر جو تیرے لیے مفید ہو، اللہ تعالیٰ سے مدد مانگ، عاجز نہ بن، اگر تجھے کوئی مصیبت پہنچے تو یہ نہ کہہ: اگر میں ایسا کرتا تو ویسا ہوتا، لیکن یہ کہہ: اللہ نے جو مقدر کیا اور جو چاہا ہو گیا۔ لفظ ''اگر'' شیطان کے عمل کو کھولتا ہے۔''[1]

اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کام کرنے کی ترغیب دی ہے جو کارآمد اور مفید ہو اور جو چیز مفید ہو وہ انسانی اور جناتی شیطانوں سے مقابلہ کرنے اور مقدر میں لکھے گئے شر کو مقدر میں لکھی گئی خیر کے ذریعے دور کرنے میں کارگر ثابت ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بندے کو اللہ تعالیٰ سے بھی مدد مانگتے رہنا چاہیے، کیوں کہ اس کی مدد کے بغیر نیکی کی طاقت ملتی ہے نہ بدی سے بچنے کی قوت حاصل ہوتی ہے۔ انسان کا عمل خالص اللہ کے لیے ہونا چاہیے، کیونکہ اللہ تعالیٰ صرف وہ عمل قبول کرتے ہیں جو خالص اس کی رضا کے لیے کیا جائے اور یہی ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ کی حقیقت ہے۔

بندے کو چاہیے کہ وہ کام کرے جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، اس کام سے بچے جس سے بچنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے اور اس سے اس پر مدد بھی طلب کرے۔

اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی اطاعت کے ذریعے اس شر کو دور کیا جا سکتا ہے جو انسان کے مقدر میں لکھا ہو، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ﴾ [البقرة: ٢٥١]

''اور اگر اللہ کا لوگوں کو ان کے بعض کو بعض کے ساتھ ہٹانا نہ ہوتا تو یقیناً زمین برباد ہو جاتی۔''

جس طرح جہاد اور جہاد کی تیاری کے ذریعے کافروں اور فاجروں کے شر کو روکا جاتا ہے اور صدقہ اور دعا مصیبت کو ٹال دیتے ہیں۔

حدیث میں ذکر ہوا ہے: ''دعا اور مصیبت کی زمین اور آسمان کے درمیان ملاقات ہوتی ہے تو وہ ایک دوسری سے نبرد آزما ہو جاتی ہیں۔''[2] چنانچہ بعض اوقات شر کا سبب واقع ہو جاتا ہے تو اس کو دور کیا جاتا ہے۔ کافر جب

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٦٤)

[2] مسند البزار (٢/٤١٣) علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد میں کہا ہے کہ اسے بزار نے روایت کیا ہے اور اس میں ابراہیم بن خثیم بن عراک راوی متروک ہے۔ (١٠/٢١٩)

اسلامی علاقوں پر چڑھ دوڑیں تو ان کو روکا جاتا ہے۔ کبھی وہ شر رونما ہو جاتا ہے۔ اس وقت اس کو زائل کیا جاتا اور برائیوں کو نیکیوں کے ساتھ بدلا جاتا ہے۔ یہ سارے امور تقدیر میں لکھے گئے شر کو تقدیر میں لکھی گئی خیر کے ذریعے ختم کرنے کے باب سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ کام کبھی واجب ہوتا ہے کبھی مستحب۔

شیخ عبدالقادر نے جو بات کہی ہے، اللہ اور اس کے رسول نے اسی کا حکم دیا ہے۔

مقصودِ کلام یہ ہے کہ بہت سارے اربابِ سلوک و طریقت رب تعالیٰ کی ربوبیت اور ان امور کا مشاہدہ کرتے ہیں جو اس نے تقدیر میں تو لکھے ہوئے ہیں، لیکن ان کاموں سے منع کیا ہے تو وہ اس تکوینی حقیقت کا مشاہدہ کرتے وقت یہ گمان کر لیتے ہیں کہ یہ تقدیر پر راضی رہنے اور اس کو تسلیم کرنے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ بات جہالت اور گمراہی پر مبنی ہے، جو بسا اوقات کفر کی حدود تک پہنچا دیتی ہے اور اسلام سے خارج کر دیتی ہے۔

دنیا میں جو کفر، نافرمانی اور گناہ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس پر راضی رہنے کا حکم نہیں دیا، بلکہ ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم اس کو ناپسند کریں اور قدرِ استطاعت اس کو روکیں، جس طرح رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

''تم میں سے جو برائی دیکھے تو اس کو اپنے ہاتھ سے تبدیل کرے، اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان سے اس کو برا کہے، اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھے تو اپنے دل میں اس کو برا جانے، یہ کمزور ترین ایمان ہے۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ﴾ [زمر: ۷] ''اور وہ اپنے بندوں کے لیے ناشکری پسند نہیں کرتا۔''

﴿ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴾ [البقرة: ۲۰۵] ''اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔''

لہٰذا وہ ہمیں کس طرح اپنے اس کام پر راضی رہنے کا حکم دے سکتا ہے، جس کو وہ خود ہمارے لیے پسند نہیں کرتا، اس نے برائی کو ہمارے لیے ابتلا اور آزمایش بنایا ہے۔ فرمایا:

﴿ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً اَتَصْبِرُوْنَ ﴾ [الفرقان: ۲۰]

''اور ہم نے تمھارے بعض کو بعض کے لیے ایک آزمایش بنایا ہے۔ کیا تم صبر کرو گے؟''

اللہ تعالیٰ نے لڑائی کا حکم دینے کے بعد فرمایا:

﴿ ذٰلِكَ وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ﴾ [محمد: ٤]

''(بات) یہی ہے اور اگر اللہ چاہے تو ضرور ان سے انتقام لے لے اور لیکن تاکہ تم میں سے بعض کو بعض کے

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٤٩)

ساتھ آزمائے اور جو لوگ اللہ کے راستے میں قتل کر دیے گئے تو وہ ہرگز ان کے اعمال ضائع نہیں کرے گا۔"

صحیح مسلم میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اللہ تعالیٰ مومن کے لیے جو فیصلہ بھی کرتا ہے وہ اس کے لیے بہتر ہی ہوتا ہے اور یہ صرف مومن کے لیے ہے، اگر اس کو کوئی مسرت پہنچے تو وہ شکر یہ ادا کرتا ہے اور یہ اس کے لیے بہتر ہے، اگر اس کو کوئی تکلیف پہنچے تو صبر کرتا ہے تو وہ اس کے لیے بہتر ہوتا ہے۔"[1]

لہٰذا مومن جب صبر شکر کرنے والا ہو تو اس کے خلاف جو فیصلہ بھی کیا جائے وہ اس کے لیے بہتر ہی ہوتا ہے۔ اگر وہ نیکی کا حکم دینے والا، برائی سے منع کرنے والا اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا ہو تو کافروں کے کفر سے جو بھی اس کے مقدر میں لکھا ہو وہ اس کے حق میں خیر کا سبب ہوتا ہے، اسی طرح جب شیطان اور خواہشِ نفس اس کو دعوت دے تو یہ اس کو ملنے والی خیر کا سبب ہوتا ہے۔

لہٰذا جو شر مقدر میں ہو اور وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے حکم کے مطابق اس کو دور کرے تو یہ اس کے لیے نیکی، تقوے، اچھائی اور ثواب کے حصول اور بلندیِ درجات کا سبب بن جاتا ہے۔

یہ اور اس طرح کی باتوں سے ان کے قول کے معنی کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ واللہ أعلم[2]

فطرت، بدبختی اور روزِ قیامت جانوروں کا زندہ ہونا

سوال «كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ» "ہر بچہ فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے" کا کیا مفہوم ہے؟ اس سے پیدایش کی فطرت مراد ہے یا اسلام کی فطرت؟ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد: «اَلشَّقِيُّ مَنْ شَقِيَ فِيْ بَطْنِ أُمِّهِ»[3] "بد بخت وہ ہے جو اپنی ماں کے پیٹ ہی میں بد بخت بنا دیا گیا" کیا یہ خاص ہے یا ہر بچے کے لیے عام ہے؟ چوپایوں اور وحشی جانوروں کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن زندہ کرے گا یا نہیں؟

جواب الحمد لله. نبی اکرم ﷺ کے ارشادِ گرامی: "ہر بچہ فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے، پھر اس کے والدین اسے یہودی، نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔"[4] کے تعلق سے درست بات یہ ہے کہ اس سے وہ فطرت مراد ہے، جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اور وہ اسلام کی فطرت ہے اور وہ وہی فطرت ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اس

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٩٩)

[2] مجموع الفتاویٰ (٥٤٧٨_٥٥٠)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٢٩٣)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٩٣) صحيح مسلم [illegible]

دن پیدا کیا تھا، جب اس نے کہا تھا:

﴿ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا ﴾ [الأعراف: ۱۷۲]

کیا میں واقعی تمھارا رب نہیں ہوں؟ انھوں نے کہا کیوں نہیں۔''

یہاں فطرت سے مراد باطل اعتقادات سے سلامتی اور صحیح عقائد کے قبول کرنے کی صلاحیت ہے۔

اسلام کی حقیقت یہ ہے کہ (بندہ) غیروں کے آگے نہیں صرف اللہ کے سامنے جھک جائے اور لا إله إلا الله کا معنی بھی یہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مثال دیتے ہوئے فرمایا: ''جس طرح جانور صحیح سالم بچہ پیدا کرتے ہیں، کیا تم ان میں کوئی ناک کان کٹا بچہ دیکھتے ہو؟''[1] اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح فرما دیا ہے کہ نقص اور عیب سے دل کا پاک ہونا بدن کے صحیح سالم ہونے کی طرح ہے اور عیب بعد میں پیدا ہوتا ہے۔

صحیح مسلم میں عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''میں نے اپنے بندوں کو ''حنفاء'' (اللہ کے لیے یکسو) بنا کر پیدا کیا تھا، لیکن شیطان نے ان کو اچک لیا، ان پر وہ چیزیں حرام کر دیں جو میں نے ان کے لیے حلال کی تھیں اور انھیں حکم دیا کہ میرے ساتھ ان چیزوں کو شریک کریں جس کے لیے میں نے کوئی دلیل نہیں نازل کی تھی۔''[2]

اسی لیے مشہور قول کے مطابق امام احمد رحمہ اللہ کا خیال یہ ہے کہ جس بچے کے والدین میں سے کوئی ایک مر گیا ہو تو اس پر اسلام کا حکم لگایا جائے گا، کیوں کہ اس کی اصل فطرت سے ہٹانے والا نہیں رہا۔ امام احمد اور ابن المبارک رحمہما اللہ سے یہ بھی روایت لوگوں نے بیان کی ہے کہ انھوں نے کہا: ''بچہ بدبختی اور سعادت مندی کی بنائی ہوئی فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے۔'' یہ قول پہلے قول کے منافی نہیں ہے، کیوں کہ بچہ تو سلیم الفطرت پیدا ہوتا ہے، لیکن اللہ کے علم میں ہوتا ہے کہ وہ آگے چل کر کفر کرے گا تو لازمی طور پر وہ اسی طرح ہو جاتا ہے جو ام الکتاب میں لکھا ہوا ہے۔ جس طرح جانور صحیح سالم بچہ پیدا کرتے ہیں، لیکن اللہ جانتا ہے کہ آگے چل کر اس کے ناک کان کاٹ دیے جائیں گے۔

یہی اس حدیث کا مفہوم ہے جو صحیح مسلم میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بچے کے بارے میں جسے خضر نے قتل کر دیا تھا، فرمایا: ''اول دن سے اس کی فطرت یہی بنائی گئی تھی۔ اگر اسے آزاد چھوڑ دیا جاتا تو اپنے والدین کو سرکشی اور ظلم سے تکلیف پہنچاتا۔''[3] مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ام الکتاب میں اس کیا

---

1. صحيح البخاري، رقم الحديث (۱۲۹۲) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٥٨)
2. صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۸٦٥)
3. صحيح مسلم، رقم الحديث (۲٦٦١)

یہی طبیعت بنائی تھی، یعنی اسے کافر لکھا تھا، یعنی اگر وہ زندہ رہا تو عملاً کفر کرے گا۔

یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ سے مشرکین کے ان بچوں کے بارے میں سوال کیا گیا جن کا انتقال بچپن میں ہو جائے تو آپ نے فرمایا: ''اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ کس طرح کا عمل کرنے والے تھے۔''[1] یعنی اللہ ہی کو علم ہے کہ بالغ ہونے کے بعد ان میں کون مومن ہوتا اور کون کافر بنتا۔ ایک حدیث میں جس کی سند مقارب ہے، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے دن اللہ ان کا امتحان لے گا۔ میدانِ حشر میں ان کے پاس رسول بھیجے گا۔ جو صحیح جواب دے پائے گا اسے جنت میں داخل کرے گا اور جس کا جواب نافرمانی پر مبنی ہوگا اسے اللہ جہنم میں داخل کرے گا۔''[2] یہاں ان کے بارے میں اللہ کا علم ظاہر ہوگا اور جو علم ظاہر ہوگا اسی کے مطابق ان کو بدلہ دے گا اور وہ ان کا ایمان اور کفر ہے نہ کہ مجرد علم۔ مشرکین کے بچوں کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے، ان میں یہی بات سب سے اچھی ہے اور اسی پر تمام احادیث کی تطبیق ہو جاتی ہے۔

حق کے ساتھ فطرت کی مثال سورج کے ساتھ آنکھ کی روشنی جیسی ہے۔ ہر آنکھ والے کو اگر بغیر حجاب کے آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ سورج کو دیکھے گا۔ یہودیت، نصرانیت اور مجوسیت پر مشتمل عقائدِ باطلہ اس حجاب کی طرح ہیں جو آنکھ اور سورج کو دیکھنے کے درمیان حائل ہے۔ اسی طرح سے ہر صحیح و سالم احساس رکھنے والا شخص میٹھا پسند کرتا ہے اِلا یہ کہ اس کی طبیعت میں ایسا فساد پیدا ہو جائے جو میٹھے کو اس کے منہ میں کڑوا بنا دے۔

فطرت پر ان کے پیدا ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اپنی پیدائش کے وقت سے ہی اسلام کا عملی طور پر اعتقاد رکھتے ہوں، کیوں کہ اللہ نے ہمیں اپنی ماؤں کے پیٹ سے اس حال میں نکالا ہے کہ ہم کچھ نہیں جانتے ہیں، لیکن دل کی سلامتی اور حق جو اسلام ہی ہے، کے لیے رغبت اور اس کو قبول کرنے کی قوت اس قدر پائی جاتی ہے کہ اگر اسے بغیر تبدیل کیے اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے تو وہ صرف مسلمان ہوگا۔ یہی علمی اور عملی قوت جو بذاتِ خود اسلام کا تقاضا کرتی ہے، بشرطیکہ کوئی مانع درمیان میں نہ ہو، اسی کا نام اللہ کی وہ فطرت ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔

سوال میں جس حدیث کا ذکر کیا گیا ہے، وہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی صحیح حدیث ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''بد بخت وہ ہے جو اپنی ماں کے پیٹ ہی میں بد بخت بنا دیا گیا ہو اور نیک بخت وہ ہے جو دوسروں کی نصیحت سے اپنے احوال درست کر لے۔''[3]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٢٦)

[2] مسند أحمد (٢٤/٤) المعجم الكبير (٨٤١) السلسلة الصحيحة (١٤٣٤)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٥) سنن ابن ماجه، رقم [illegible]

صحیحین میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہم سے صادق و مصدوق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا:

''تمھاری پیدائش کی تیاری تمھاری ماں کے پیٹ میں چالیس دن تک (نطفے کی صورت میں) کی جاتی ہے۔ اتنے ہی دنوں تک پھر علقہ (بستہ خون) کی صورت اختیار کیے رہتا ہے اور پھر وہ اتنے ہی دنوں تک ایک مضغۂ گوشت رہتا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ بھیجتا ہے اور اسے چار باتوں کے لکھنے کا حکم دیتا ہے۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ اس کی روزی، اس کی مدتِ حیات، اس کا عمل، اس کی شقاوت یا سعادت لکھ دے، پھر اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔''[1]

ایسا ہر شخص کے ساتھ ہوتا ہے، یعنی یہ ضابطۂ الٰہی ہر ایک کے لیے عام ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ اپنے اس علم سے جو اس کی صفت ہے، جانتا ہے کہ کون اس کے بندوں میں شقی ہے اور کون سعید ہے اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اسے لوحِ محفوظ میں لکھ دیا ہے اور فرشتے کو حکم دیتا ہے کہ ہر پیدا ہونے والے بچے کا حال لکھ دے اور یہ عمل اس کے جسم کی تخلیق اور اس میں روح ڈالے جانے کے درمیان انجام پاتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسری چیزیں بھی لکھی جاتی ہیں، لیکن ان کی تفصیل پیش کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ جو شخص اس علمِ قدیم کا انکار کرے وہ کافر ہے۔

چوپائیوں کی دوبارہ زندگی:

جہاں تک چوپایوں کا سوال ہے تو ان سب کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ دوبارہ زندہ کرے گا، جیسا کہ کتاب و سنت کے دلائل سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ﴾ [الأنعام: ٣٨]

''اور زمین میں نہ کوئی چلنے والا ہے اور نہ کوئی اڑنے والا، جو اپنے دو پروں سے اڑتا ہے مگر تمھاری طرح امتیں ہیں، ہم نے کتاب میں کسی چیز کی کمی نہیں چھوڑی، پھر وہ اپنے رب کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے۔''

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ﴾ [التكوير: ٥] ''اور جب جنگلی جانور اکٹھے کیے جائیں گے۔''

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ ﴾ [الشورىٰ: ٢٩]

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٣٦)

''اور اسی کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی پیدائش ہے اور وہ جو اس نے ان دونوں میں کوئی بھی جاندار پھیلا دیے ہیں اور وہ ان کو اکٹھا کرنے پر جب چاہے قادر ہے۔''

حرف ''اذا'' ان چیزوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو لازمی طور پر ہو کر رہتی ہیں۔

اس سلسلے میں احادیث مشہور ہیں۔ اللہ عزوجل قیامت کے دن چوپایوں کو دوبارہ زندہ کرے گا اور بعض کو بعض سے قصاص دلائے گا، پھر ان سے کہے گا کہ اب مٹی ہو جاؤ۔ چنانچہ سارے جانور مٹی بن جائیں گے۔ اس وقت کافر کہے گا:

﴿ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ﴾ [النبأ: ٤٠] ''اے کاش کہ میں مٹی ہوتا۔''

جو شخص یہ کہتا ہے کہ جانور دوبارہ زندہ نہیں کیے جائیں گے وہ اس مسئلے میں بدترین غلطی میں مبتلا ہے، بلکہ وہ گمراہ اور کافر ہے۔ واللہ أعلم[1]

[1] مجموع الفتاویٰ (٤/٢٤٥-٢٤٨)

علاماتِ قیامت، قیامت اور آخرت

بیت المقدس، یاجوج ماجوج اور قیامت کی نشانیوں سے متعلق سوالات

سوال (1) کیا کسی نبی نے مشرق، مغرب یا بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی ہے؟

(2) کیا اللہ نے کسی نبی کو دینِ اسلام کے علاوہ کوئی اور دین دے کر بھی بھیجا ہے؟

(3) ہمارے نبی ﷺ کے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کی وجہ کیا تھی؟

(4) کیا بیت المقدس کا معلق پتھر دیگر پتھروں سے افضل ہے؟

(5) کیا یاجوج و ماجوج آدم کی اولاد سے ہوں گے؟

(6) رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ ''قیامت کی پہلی نشانی سورج کا مغرب سے طلوع ہونا ہے۔'' کیا یہ نشانی دجال کے نکلنے، عیسیٰ علیہ السلام کے اترنے اور یاجوج و ماجوج کے ظہور سے پہلے ظاہر ہوگی یا بعد میں؟

جواب الحمد لله.

(1) کسی بھی نبی نے مشرق یا مغرب کو قبلہ قرار دے کر اس کی سمت نماز نہیں پڑھی، اسی طرح جو نبی بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے وہ اس پر تعمیر کردہ گنبدِ عہد کی وجہ سے تھا جس کو صخرہ بیت المقدس یا بیت المقدس کا معلق پتھر کہا جاتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام میدانِ تیہ میں بھی اس کی طرف رخ کر کے نمازیں پڑھا کرتے تھے۔

(2) اللہ کا جو نبی اور ولی ہوا ہے وہ دینِ اسلام ہی پر تھا۔ دینِ اسلام کا مطلب ہے ایک اللہ کی عبادت کرنا اور اس کے کسی امر میں کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرانا، یہی دینِ اسلام ہے جس کے سوا اللہ کسی زمانے اور کسی خطے میں کوئی اور دین قبول نہیں کرتا۔

(3) اللہ تعالیٰ نے ابتدائے اسلام میں اپنے رسول ﷺ کو بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا تھا۔ آپ ﷺ ہجرت کے بعد تقریباً ڈیڑھ سال تک اسی کی طرف رخ کر کے نمازیں پڑھتے رہے۔ اس کے بعد کعبہ کو قبلہ بنا دیا گیا اور اس کی حکمت اس آیتِ قرآنی سے واضح ہوتی ہے:

﴿ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَآ إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ﴾ [البقرة: ١٤٣]

''اور ہم نے وہ قبلہ جس پر تو تھا، مقرر نہیں کیا تھا مگر اس لیے کہ ہم جان لیں کون اس رسول کی پیروی کرتا ہے، اس سے (جدا کر کے) جو اپنی دونوں ایڑیوں پر پھر جاتا ہے۔''

پہلے ایک قبلے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے، پھر اس کو چھوڑ کر دوسرے کو قبلہ قرار دینے میں درحقیقت بندگانِ خدا کا امتحان مقصود تھا کہ کون رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرتا ہے اور کون ایڑھیوں کے بل پھر جاتا ہے، فرمایا:

﴿ وَاِنۡ كَانَتۡ لَكَبِيۡرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيۡنَ هَدَى اللّٰهُ ﴾ [البقرة: ١٤٣]

''اور بلاشبہہ یہ بات یقیناً بہت بڑی تھی مگر ان لوگوں پر جنھیں اللہ نے ہدایت دی۔''

4 بیت المقدس کے پتھر کی حیثیت بھی وہی ہے جو مسجدِ اقصیٰ کی ساری زمین کی ہے۔ منسوخ ہونے کے بعد اس کی کوئی فضیلت نہیں رہ جاتی جس طرح سبت اور اُحد یعنی ہفتے اور اتوار کے دن کی کوئی حیثیت اور تقدس باقی نہیں۔

5 یاجوج و ماجوج آدم علیہ السلام کی اولاد ہی سے ہوں گے، صحیحین کی احادیث سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ صحیح مسلم وغیرہ میں ان کی جو تفصیل منقول ہے، یہاں اسے نقل کرنے کی گنجایش نہیں۔

6 سورج کا مغرب سے طلوع ہونا پہلی آسمانی نشانی ہے۔ دجال وغیرہ کا خروج آسمانی نشانیوں میں داخل نہیں۔ اور دجال وغیرہ کا خروج وظہور سورج کے مغرب سے طلوع ہونے سے پہلے ہوگا، کیوں کہ سورج کا مغرب سے طلوع ہونا افلاک اور عالمِ بالا کے ٹوٹ جانے کی علامت ہے اور یہ قیامتِ کبریٰ کی صریح اور کھلی نشانی ہے۔ زمینی نشانیوں کے عکس کہ محض ان کا وجود قیامتِ کبریٰ کی دلیل نہیں، لیکن سچے اور تصدیق شدہ نبی ﷺ کی بتائی ہوئی باتوں اور پیشین گوئیوں کے مطابق یہ قیامت کی نشانیاں ہیں۔ واللہ أعلم [1]

موت کے وقت مذاہب کا پیش کیا جانا، قبر کی آزمایش اور مرتد کے قبل از ارتداد اعمالِ صالحہ کا بدلہ

سوال کیا مرتے وقت ایک انسان کے سامنے تمام مذاہب کو پیش کیا جاتا ہے؟ کتاب و سنت میں اس کی کوئی بنیاد ہے یا نہیں؟ نبی اکرم ﷺ کے اس ارشاد:

« إِنَّكُمْ لَتُفْتَنُوْنَ فِيْ قُبُوْرِكُمْ » [2] ''تمھارا اپنی قبروں میں امتحان ہوگا۔''

میں فتنے (آزمایش) سے کیا مراد ہے؟ جب کوئی شخص مرتد ہو جائے ...... العیاذ باللہ...... تو کیا اسے مرتد ہونے

---

1. جامع المسائل (٩/١٦٤۔١٦٦)
2. صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٠٩)

سے پہلے کے اعمالِ صالحہ کا بدلہ ملے گا یا نہیں؟ اس استفتا پر فتویٰ عنایت فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر عطا فرمائے۔

جواب بندے پر مختلف مذاہب کے پیش کیے جانے کا معاملہ ہر ایک کے لیے عام نہیں ہے اور نہ ایسا ہے کہ کسی پر مذاہب کو پیش ہی نہیں کیا جاتا ہے، بلکہ کچھ لوگوں پر ان کے مرنے سے پہلے مذاہب کو پیش کیا جاتا ہے اور کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان پر مذاہب پیش نہیں کیے جاتے ہیں۔ ایسا کچھ لوگوں ہی کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ سب زندگی اور موت کی آزمائشیں ہیں جن سے پناہ طلب کرنے کی ہمیں نماز میں تلقین کی گئی ہے۔ بعض احادیث ملاحظہ ہوں:

حدیث صحیح میں ہے کہ ''نبی اکرم ﷺ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم اپنی نماز میں چار چیزوں سے اللہ کی پناہ طلب کرتے رہیں: جہنم کے عذاب سے، قبر کے عذاب سے، زندگی اور موت کی آزمائشوں سے اور مسیح دجال کے فتنے سے۔''[1] البتہ موت کے وقت شیطان کی زیادہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ ابنِ آدم کو گمراہ کر دے، کیوں کہ گمراہ ہونے سے بچنے کی سب سے زیادہ ضرورت اسی وقت ہوتی ہے۔

ایک دوسری صحیح حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اعتبار ان اعمال کا ہوتا ہے جن پر زندگی کا خاتمہ ہوا ہے۔''[2] آپ ﷺ یہ بھی فرماتے ہیں: ''بندہ جنتیوں جیسے اعمال کرتا رہتا ہے، حتی کہ جب اس کے اور جنت کے درمیان صرف ایک گز کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو اس پر تقدیر غالب آجاتی ہے اور وہ جہنمیوں جیسے اعمال کرنے لگتا ہے اور اپنے ان اعمال کی وجہ سے جہنم میں داخل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک بندہ جہنمیوں جیسے اعمال کرتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جہنم کے درمیان صرف ایک گز کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ تقدیر اس پر غالب آجاتی ہے اور وہ جنتیوں جیسے اعمال کرنے لگتا ہے اور پھر جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔''[3]

اسی لیے یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ ''ابن آدم پر موت کے وقت شیطان کا حملہ شدید ترین ہوتا ہے۔ وہ اپنے چیلوں سے کہتا ہے کہ ذرا اس کو سنبھالو۔ اگر یہ تمھارے ہاتھ سے نکل گیا تو پھر کبھی تمھارے ہاتھ نہیں لگے گا۔''[4]

اس سلسلے میں امام احمد کا واقعہ بڑا مشہور ہے کہ جب ان کا آخری وقت چل رہا تھا تو وہ بار بار یہ لفظ دہرا رہے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣١١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٣٣)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٢١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٣)

[4] مكائد الشيطان لابن أبي الدنيا (٣١)

تھے: نہیں اب نہیں، نہیں اب نہیں (ان کے بیٹے عبداللہ نے پوچھا: آپ بار بار یہ الفاظ کیوں دہرا رہے ہیں؟ تو انھوں نے کہا کہ وہاں ابلیس بیٹھا ہے اور مجھے پھسلا رہا ہے)

اسی لیے کہا جاتا ہے کہ جو شخص حج نہیں کرتا اس کے لیے اس کا خطرہ سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ روایت ذکر کی جاتی ہے کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''جس کے پاس زادِ سفر ہے اور بیت اللہ الحرام تک پہنچا دینے والی سواری موجود ہے، لیکن اس کے باوجود اس نے حج نہیں کیا تو کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ یہودی ہو کے مرتا ہے یا نصرانی بن کر مرتا ہے۔''[1]

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيْلًا وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [آل عمران: ۹۷]

''اور اللہ کے لیے لوگوں پر اس گھر کا حج (فرض) ہے، جو اس کی طرف راستے کی طاقت رکھے اور جس نے کفر کیا تو بے شک اللہ تمام جہانوں سے بہت بے پروا ہے۔''

عکرمہ کہتے ہیں کہ جب آیتِ کریمہ:

﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾

[آل عمران: ۸۵]

''اور جو اسلام کے علاوہ کوئی اور دین تلاش کرے تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں خسارہ اٹھانے والوں سے ہوگا۔''

نازل ہوئی تو یہود و نصاریٰ نے کہا کہ ہم مسلمان ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے فرمایا: ﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ﴾ انھوں نے اس کے جواب میں کہا کہ ہم حج نہیں کریں گے۔ اس انکار کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ﴾ قبروں میں آزمائش (فتنے) سے مراد میت کا امتحان ہے۔ جب دونوں فرشتے اس سے سوال کرتے ہوئے پوچھتے ہیں: اس انسان (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں تم کیا کہتے ہو جو تمھارے درمیان بھیجے گئے تھے؟ اس وقت اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کے قدم قولِ ثابت کے ذریعے مضبوط بنا دیتا ہے اور بندۂ مومن جواب میں کہتا ہے: اللہ میرا رب ہے، اسلام میرا دین ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم میرے نبی ہیں اور وہ یہ بھی جواب دیتا ہے کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو واضح دلائل اور ہدایت لے کر ہمارے پاس تشریف لائے۔ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (۸۱۲) ضعيف الجامع (۵۸۷۲)

پر ایمان لائے اور آپ ﷺ کی اتباع کی۔ یہ سن کر فرشتے اسے بہت سختی کے ساتھ ڈانٹتے ہیں اور یہ آخری آزمائش ہوتی ہے جس میں بندۂ مومن کو آزمایا جاتا ہے۔ اس سے پوچھتے ہیں: کیا جیسا کہا ہے وہی صحیح ہے یا کچھ اور؟

اس آزمائش کے بارے میں نبی اکرم ﷺ سے متواتر احادیث منقول ہیں جن کی روایت حضرات براء بن عازب، انس بن مالک اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم وغیرہ نے کی ہے۔ اس آزمائش سے انبیا کے علاوہ ان تمام لوگوں کو گزرنا ہوگا جو احکامِ الٰہی کے مکلّف ہیں۔ انبیا علیہم السلام کے بارے میں اختلاف ہے۔ اسی طرح ان لوگوں کے بارے میں بھی اختلاف ہے جو شرعی احکام کے مکلّف نہیں ہیں، جیسے بچے اور دیوانے۔ ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس آزمائش سے محفوظ رہیں گے، کیوں کہ آزمایا وہی جاتا ہے جو مکلّف ہوتا ہے۔ یہ قاضی اور ابن عقیل کا قول ہے۔

اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد ان سے کوئی سوال نہیں کیا جائے گا۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ بچوں اور دیوانوں سے بھی سوال ہوگا اور وہ بھی آزمائے جائیں گے۔ یہ ابو حکیم، ابوالحسن بن عبدوس کا قول ہے، یہی قول ابن عبدوس کے اصحاب سے بھی منقول ہے۔ یہ قول ان حضرات کے قول کے مطابق ہے جو کہتے ہیں کہ وہ قیامت کے دن مکلّف بنائے جائیں گے، جیسا کہ یہی اہلِ سنت، محدثین اور متکلمین میں سے اکثر اہلِ علم کا قول ہے۔ ابوالحسن اشعری رضی اللہ عنہ نے اہلِ سنت کا یہی نقطۂ نظر بیان کیا ہے اور اسی کو خود بھی پسندیدہ قرار دیا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ سے جو نصوص ملتی ہیں، ان کا مقتضا بھی یہی ہے۔

مرتد کے قبل از ارتداد اعمال:

جہاں تک اس بات کا سوال ہے کہ اگر کوئی شخص مرتد ہوجائے، یعنی کافر مشرک ہوجائے یا یہودی اور نصرانی ہو جائے تو اگر اسی حال میں وہ مرجاتا ہے تو اس کے سارے اعمال برباد ہوجائیں گے۔ علما کا اس پر اتفاق ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ایک سے زیادہ مواقع پر یہ حقیقت واضح کی گئی ہے:

﴿وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ﴾ [البقرة: ٢١٧]

”اور تم میں سے جو اپنے دین سے پھر جائے، پھر اس حال میں مرے کہ وہ کافر ہو تو یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہوگئے۔“

﴿وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ﴾ [المائدة:٥]

”اور جو ایمان سے انکار کرے تو یقیناً اس کا عمل ضائع ہوگیا۔“

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَلَوْ أَشْرَكُوا لَحَبِطَ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴾ [الأنعام:٨٨]

''اور اگر یہ لوگ شرک کرتے تو یقیناً ان سے ضائع ہو جاتا جو کچھ وہ کیا کرتے تھے۔''

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ ﴾ [الزمر: ٦٥]

''اگر تو نے شریک ٹھہرایا تو یقیناً تیرا عمل ضرور ضائع ہو جائے گا۔''

البتہ علمائے اسلام کا اس بابت اختلاف ہے کہ مرتد ہونے والا اگر دوبارہ اسلام کی طرف پلٹ آئے تو کیا مرتد ہونے سے پہلے کیے گئے اس کے اعمال ضائع ہو جائیں گے یا صرف اسی صورت میں ضائع ہوں گے جب وہ ارتداد کی حالت میں مر جائے؟ اس مسئلے میں دو مشہور قول ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ کے مسلک میں دونوں ہی اقوال ہیں۔ امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہ اللہ کا مسلک ہے کہ اس کے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔ اس کے برعکس امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک اس کے اعمال باقی رہیں گے۔

مرتد کے سلسلے میں علما کے درمیان ایک اختلاف یہ بھی ہے کہ کیا یہ کہا جائے گا کہ اس کا ایمان صحیح تھا جو مرتد ہونے سے ضائع ہو گیا؟ یا یہ کہا جائے گا کہ بلکہ ارتداد نے یہ واضح کر دیا کہ اس کا ایمان فاسد تھا؟ صحیح ایمان کبھی بھی زائل نہیں ہوتا۔ مختلف گروہوں کے اس مسئلے میں دو قول ہیں۔ اسی اختلاف پر ''أنا مؤمن إن شاء اللّٰه'' استثنا کا قول بھی مبنی ہے۔ کیا استثنا کمال ایمان کی طرف راجع ہوتا ہے یا وہ انجام کار ایمان کی حالت میں خدا سے ملاقات کی طرف راجع ہے۔ واللّٰه أعلم[1]

قبر میں مردے کا بات کرنا

سوال کیا مردہ اپنی قبر میں بات کرتا ہے؟

جواب سائل کا یہ سوال کہ کیا مردہ اپنی قبر میں بات کرتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں مردہ اپنی قبر میں بات کرتا ہے، بلکہ وہ اس کی بات بھی سنتا ہے جو اس سے بات کرتا ہے، جیسا کہ صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''مردے تدفین میں شامل لوگوں کے جوتوں کی آواز سنتے ہیں۔''[1] نبی اکرم ﷺ سے صحیح حدیث میں یہ بھی ثابت ہے کہ مردے سے اس کی قبر میں سوال کیا جاتا ہے۔ اس سے پوچھا جاتا ہے کہ تمھارا رب کون ہے؟ تمھارا دین کیا ہے؟ تمھارے نبی کون ہیں؟ پھر اللہ صحیح اور ثابت قول کے ذریعے اہلِ ایمان کے قدم مضبوط

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٤/٢٥٥_٢٥٨)

کر دے گا اور ایک مومن ان سوالوں کے جواب میں کہے گا: اللہ میرا رب ہے، اسلام میرا دین ہے اور محمد ﷺ میرے نبی ہیں۔ جب اس سے یہ پوچھا جائے گا کہ اس انسان کے بارے میں تم کیا کہتے ہو جو تمھارے اندر بھیجے گئے تھے؟ وہ کہے گا: وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، ہمارے درمیان واضح دلائل اور ہدایت لے کر تشریف لائے، ہم ان پر ایمان لائے اور ان کی اتباع کی۔[2] اللہ تعالیٰ کے مندرجہ ذیل ارشاد کی یہی تفسیر ہے:

﴿ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ﴾ [إبراهيم: ٢٧]

''اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے، پختہ بات کے ساتھ خوب قائم رکھتا ہے، دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں بھی۔''

نبی اکرم ﷺ سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے کہ یہ آیت عذابِ قبر کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اسی طرح ایک منافق بھی قبر میں بات کرے گا اور وہ ان سوالوں کے جواب میں کہے گا: ہائے افسوس! ہائے افسوس! میں کچھ نہیں جانتا۔ لوگوں کو جیسے کہتے سنا میں نے بھی کہہ دیا۔ اس جواب پر اسے لوہے کے گرز سے مارا جائے گا اور وہ بہت زور سے چیخ مارے گا۔ اس کی یہ آواز انسان کے علاوہ ساری مخلوق سنے گی۔[3]

نبی اکرم ﷺ سے صحیح حدیث میں یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ تم میت کو دفن کرنا بند کر دو گے تو میں اللہ سے درخواست کرتا کہ تمھیں بھی قبر کا عذاب سنا دے جیسا کہ میں سنتا ہوں۔'' آپ ﷺ سے صحیح میں یہ بھی حدیث ملتی ہے کہ آپ ﷺ نے بدر کے دن مشرکین کی لاشیں قبر میں پھینکوا دیں اور پھر ان کو پکارا۔ صحابہ کے استفسار پر آپ ﷺ نے جواب دیا: ''میں ان سے جو کہہ رہا ہوں تم اس کو ان سے زیادہ نہیں سن رہے۔''[4] اس موضوع پر آثار بہت ہیں جو جگہ جگہ موجود ہیں۔ واللّٰہ أعلم[5]

قبر میں روح لوٹنے کی کیفیت

سوال جب منکر نکیر میت سے سوال کرتے ہیں تو میت کے بدن میں روح لوٹ کر آتی ہے، میت بیٹھتی ہے اور منکر نکیر کو جواب دیتی ہے۔ ایسی صورت میں کیا اسے دوبارہ موت آتی ہے؟

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٧٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٦، ١٢٧٣)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٦، ١٢٧٣)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٦، ١٢٧٣)

[5] مجموع الفتاویٰ (٢٧٣/٤) اس بارے میں راجح موقف یہ ہے کہ جن مواقع پر مردے کے سننے کی صراحت وارد ہوئی ہے اسی کو تسلیم کیا جائے اور باقی حالات میں عدمِ سماع ہی پر ایقان رکھا جائے۔

جواب قبر کے اندر میت کے بدن میں روح کا لوٹ کر آنا اس طرح نہیں ہوتا جس طرح اس دنیا کی زندگی میں اس کی روح اس کے بدن میں لوٹ کر آتی ہے۔ اگرچہ بعض حیثیتوں سے وہ دنیا سے زیادہ مکمل ہوتی ہے جس طرح موت کے بعد دوبارہ زندہ کیا جانا دنیا کی زندگی کی طرح نہیں ہوگا، اگرچہ دوسری بار کی زندگی پہلی زندگی سے بعض حیثیتوں سے زیادہ مکمل ہوگی، بلکہ اس دنیا کی زندگی، برزخ کی زندگی اور قیامت کی زندگی ہر ایک کی الگ الگ خصوصیات ہیں۔ اسی لیے نبی اکرم ﷺ نے خبر دی ہے کہ میت کے لیے اس کی قبر وسیع کر دی جاتی ہے،[1] اس سے سوال کیا جاتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ حالاں کہ قبر کی مٹی اپنی جگہ رہتی ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اسی طرح روحیں بدن میں لوٹائی جاتی ہیں اور اس سے جدا بھی کی جاتی ہیں۔

اس صورت کو کیا موت کا نام دیا جاسکتا ہے؟ اس سلسلے میں دو قول ہیں:

ایک قول یہ ہے کہ اسے موت سے تعبیر کیا جائے گا۔ جو حضرات یہ بات کہتے ہیں انھوں نے قرآن کی مندرجہ ذیل آیت کو دلیل میں پیش کیا ہے:

﴿ رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ ﴾ [غافر: ١١]

''اے ہمارے رب! تو نے ہمیں دو دفعہ موت دی اور تو نے ہمیں دو دفعہ زندہ کیا۔''

کہا جاتا ہے کہ اس آیت میں پہلی زندگی سے مراد دنیا کی زندگی ہے اور دوسری زندگی سے مراد قبر کی زندگی ہے۔ آیت میں جس دوسری موت کا ذکر ہے اس سے قبر کی موت مراد ہے، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ آیتِ کریمہ مندرجہ ذیل آیت کی طرح ہے:

﴿ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ﴾ [البقرة: ٢٨]

''تم بے جان تھے تو اس نے تمھیں زندگی بخشی، پھر وہ تمھیں موت دے گا، پھر تمھیں زندہ کرے گا۔''

پہلی موت اس زندگی سے پہلے کی حالت ہے اور دوسری موت اس زندگی کے بعد والی ہے۔ آیت میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ﴾ کا مطلب ہے کہ وہ تمھیں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ﴾ [طٰهٰ: ٥٥]

''اسی سے ہم نے تمھیں پیدا کیا اور اس میں تمھیں لوٹائیں گے اور اسی سے تمھیں ایک اور بار نکالیں گے۔''

ایک دوسری جگہ یہی مفہوم اس طرح بیان ہوا ہے:

﴿ قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ﴾ [الأعراف: ٢٥]

---

[1] مسند أحمد (٢٩٥٦/٤)

"فرمایا تم اسی میں زندہ رہو گے اور اسی میں مرو گے اور اسی سے نکالے جاؤ گے۔"

جب اللہ تعالیٰ چاہتا ہے روح بدن سے مل جاتی ہے اور جب چاہتا ہے اس سے جدا ہو جاتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس کے لیے ایک دوبار بدن سے ملنے اور جدا ہونے کا کوئی وقت مقرر ہے اور نیند موت کی بہن ہے۔

اسی لیے نبی اکرم ﷺ جب اپنے بستر پر سونے کے لیے لیٹتے تو یہ دعا پڑھتے تھے:

« بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ أَمُوْتُ وَأَحْيَا »[1]

"اے اللہ! میں تیرا نام لے کر سوتا اور جاگتا ہوں۔"

جب نیند سے بیدار ہوتے تو یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

« اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَحْيَانَا بَعْدَ مَا أَمَاتَنَا وَإِلَيْهِ النُّشُوْرُ »[2]

"تمام حمد و شکر اس اللہ کے لیے ہے جس نے سلانے کے بعد مجھے جگایا اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔"

آپ ﷺ نے اس دعا میں نیند کو موت اور نیند سے جاگنے کو زندگی کا نام دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ اَللّٰهُ یَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا وَ الَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِهَا فَیُمْسِكُ الَّتِیْ قَضٰى عَلَیْهَا الْمَوْتَ وَ یُرْسِلُ الْاُخْرٰۤى اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ﴾ [الزمر: ٤٢]

"اللہ جانوں کو ان کی موت کے وقت قبض کرتا ہے اور ان کو بھی جو نہیں مریں ان کی نیند میں، پھر اسے روک لیتا ہے جس پر اس نے موت کا فیصلہ کیا اور دوسری کو ایک مقررہ وقت تک بھیج دیتا ہے۔"

اللہ نے اس آیت میں بتا دیا ہے کہ وہ جانوں کو دو طرح کی وفات سے دوچار کرتا ہے۔ ایک طرح کی وفات تو وہ ہے جب اللہ کسی پر موت طاری کرتا ہے۔ جن کی موت نہیں ہوتی ہے انھیں بھی وہ نیند کے ذریعے وفات دیتا ہے، پھر جب لوگ سو جاتے ہیں تو جس کو اسی حالت میں موت آجاتی ہے اس کی روح اس نے روک لی ہوتی ہے اور جو نہیں مرا اس کی روح اس نے چھوڑ دی ہے۔

اسی لیے نبی اکرم ﷺ جب اپنے بستر پر لیٹتے تھے تو یہ دعا پڑھتے تھے:

« بِاسْمِكَ رَبِّيْ وَضَعْتُ جَنْبِيْ وَبِكَ أَرْفَعُهُ، فَإِنْ أَمْسَكْتَ نَفْسِيْ فَارْحَمْهَا وَإِنْ أَرْسَلْتَهَا فَاحْفَظْهَا بِمَا تَحْفَظُ بِهِ عِبَادَكَ الصَّالِحِيْنَ »[3]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٥٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٥٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧١١)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٥٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧١٤)

''میرے رب! تیرا نام لے کر میں اپنا پہلو رکھ رہا ہوں اور تیرا نام لے کر ہی اسے اٹھاؤں گا، نیند میں اگر تو میری روح روک لے تو اس پر رحم فرمانا اور اگر تو اسے چھوڑ دے تو اس کی ان چیزوں سے حفاظت کرنا جن سے تو اپنے صالح بندوں کی حفاظت فرماتا ہے۔''

سونے والے کو خواب میں لذت بھی حاصل ہوتی ہے اور تکلیف بھی ہوتی ہے۔ یہ لذت و تکلیف روح کو بھی ہوتی ہے اور بدن بھی اس سے دوچار ہوتا ہے، بلکہ بسا اوقات خواب میں اسے کوئی مار رہا ہوتا ہے اور صبح جب وہ بیدار ہوتا ہے تو اسے اپنا بدن دکھتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ خواب میں کبھی وہ دیکھتا ہے کہ وہ کوئی بہت اچھی چیز کھا رہا ہے، پھر صبح جب وہ اٹھتا ہے تو اس کا ذائقہ اپنے منہ میں پاتا ہے۔ یہ ساری باتیں عام ہیں۔ جب سونے والے کی روح اور بدن کو نعمت اور تکلیف ایسی مل سکتی ہے جو صرف اسے محسوس ہو اور اس کے پہلو میں لیٹے ہوئے انسان کو محسوس نہ ہو، یہاں تک کہ کبھی کبھی سونے والا شدت تکلیف سے چیختا ہے یا اسے سخت گھبراہٹ لاحق ہوتی ہے جسے جاگنے والا شخص سنتا ہے۔ اسی طرح وہ خواب میں کبھی قرآن پڑھتا ہے، کبھی ذکر کرتا ہے اور کبھی کسی کو جواب دیتا ہے اور جاگنے والا اسے سنتا ہے، حالاں کہ وہ سو رہا ہوتا ہے، اس کی آنکھیں بند ہوتی ہیں، اگر اسے پکارا جائے تو سن نہیں پائے گا، پھر قبر میں موجود میت کے ان حالات کا انکار کیوں کر کیا جا سکتا ہے، جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے خبر دی ہے کہ وہ تدفین میں شامل لوگوں کے جوتوں کی آواز سنتا ہے اور بدر کے مقتولین کے بارے میں آپ ﷺ کا یہ ارشاد کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ تم سے زیادہ سنتے ہیں۔

دل قبر کے مشابہ ہے، اسی لیے جب غزوہ خندق کے موقع پر آپ کی نمازِ عصر قضا ہو گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا تھا: ''اللہ ان کے پیٹوں اور قبروں کو آگ سے بھر دے۔''[1] ایک دوسری حدیث کے الفاظ یہ ہیں: ''ان کے دلوں اور قبروں کو آگ سے بھر دے۔''[2] یہی وجہ ہے کہ قرآن کی اس آیت میں دونوں کو الگ الگ ذکر کیا گیا ہے:

﴿ بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ ۝ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ ﴾ [العادیات: ۹-۱۰]

''جب قبروں میں جو کچھ ہے باہر نکال پھینکا جائے گا۔ اور جو کچھ سینوں میں ہے ظاہر کر دیا جائے گا۔''

یہاں قبروں اور دلوں کو ساتھ ساتھ ذکر کر کے اللہ نے یہ بتا دیا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے قریب ہیں اور ایسا ممکن بھی ہے۔

لیکن یہاں یہ کہنا جائز نہیں ہوگا کہ ایک میت کو جس طرح کا عذاب اور انعام اس کی قبر میں ملتا ہے وہ ٹھیک

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٧٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٢٧)

[2] صحيح ابن خزيمة (٢٨٩/٢)

اسی طرح ہے جو ایک سونے والے کو اس کے خواب میں ملتا ہے، بلکہ قبر میں ہونے والا عذاب اور حاصل ہونے والا انعام ہر لحاظ سے مکمل اور موثر ہوتا ہے۔ وہ حقیقی انعام اور حقیقی عذاب ہوتا ہے۔ یہاں سونے والے سے اس کی مثال صرف اس کے امکان کو واضح کرنے کے لیے دی گئی ہے، کیوں کہ سائل نے یہ کہا تھا کہ میت قبر میں حرکت نہیں کرتی ہے اور نہ مٹی ادھر سے ادھر ہوتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ یہ مسئلہ تفصیل چاہتا ہے اور اس کی مکمل تشریح ہونی چاہیے، لیکن یہ مختصر اوراق اس کے لیے کافی نہیں ہیں۔ واللہ أعلم وصلی اللہ علیٰ محمد و آلہ وصحبہ وسلم[1]

روح، وفاتِ مہدی اور ایک حدیث سے متعلق سوال

سوال جب ابن آدم کی روح نکل جاتی ہے اور اس کو قبر میں اتار دیا جاتا ہے تو کیا اس کے بعد اس کی روح اسی طرح اس میں واپس آ جاتی ہے جس طرح دنیا میں تھی؟ نیز ﴿ وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ ﴾ [بني إسرائيل: ٨٥] میں ابن آدم کی روح مراد ہے یا اللہ کی؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا مہدی عیسیٰ علیہ السلام کی امامت کرتے وقت نماز مکمل کرنے سے پہلے ہی فوت ہو جائے گا۔ اور تیسرا سوال اس روایت کی بابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس سے ایک جنازہ گزرا تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: اللہ کے رسول! یہ کیا خوب ہے! جنت کی چڑیوں میں سے ایک چڑی! رسول اللہ ﷺ نے جواب میں فرمایا: تجھے کیا معلوم اللہ نے ایک خلقت پیدا کی ہو اور کہا ہو: یہ جنت میں جائیں گے اور مجھے کوئی پروا نہیں اور یہ جہنم میں جائیں گے اور مجھے کوئی پروا نہیں؟

جواب یہ صحیح ہے کہ جب میت کو قبر میں رکھا جاتا ہے تو روح اس میں واپس آتی ہے اور اس سے اس کے رب، دین اور نبی کے بارے میں پوچھا جاتا ہے۔ جب جنازے کے ساتھ آئے ہوئے لوگ واپس جاتے ہیں تو میت ان کے قدموں کی چاپ بھی سنتی ہے اور جو انسان اپنے کسی جاننے والے کی قبر کے پاس سے گزرتا ہے اور اس کو سلام کہتا ہے تو اس کا جواب دینے کے لیے اللہ اس کی روح اس میں واپس بھیجتا ہے، اگرچہ مومنوں کی روحوں کا ٹھکانا جنت ہے، لیکن مرنے کے بعد روح کی ایک دوسری شان اور کیفیت ہوتی ہے جس کی اس دنیا میں کوئی نظیر اور مثال نہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام دمشق کے مشرق میں سفید منارے پر اتریں گے اور دجال کا پیچھا کرتے کرتے اس کو مشرقی بابِ لُدّ پر قتل کریں گے۔ دجال کے قتل کے بعد اللہ ان کو حکم دے گا، وہ لوگوں کو طور پر لے جا کر قلعہ بند ہو جائیں،

[1] مجموع الفتاویٰ (٤/ ٢٧٤_٢٧٦)

پھر ان سے کہا جائے گا: اے روح اللہ! آگے بڑھیے اور ہمیں نماز پڑھائیے، وہ کہیں گے: نہیں، تمھارا بعض بعض پر امیر ہے، تو مسلمانوں کا بعض ان کو نماز پڑھائے گا، وہ نماز مکمل کرے گا اور اس میں فوت نہیں ہو گا۔

﴿ وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ ﴾ میں جس روح سے متعلق پوچھا گیا ہے، اکثر علما کے نزدیک اس سے ابن آدم کی روح ہی مراد ہے۔ وہ اگرچہ اللہ کا حکم ہے مگر معتبر علما کے اتفاق کے ساتھ موجود ہے اور مخلوق ہے۔ بندہ از جسم تا روح سارے کا سارا اللہ کا بندہ ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث صحیح ہے کہ ہم کسی انسان کو متعین کر کے اس کے جنتی ہونے کا فیصلہ نہیں کر سکتے، ہاں اگر اس کے حق میں کوئی نص (آیت یا حدیث) گواہی دے یا علما کے دو اقوال میں سے ایک قول کے مطابق جس کی لوگ عام گواہی دیں۔ اللہ نے جنت کے اہل اور جہنم کے اہل لوگوں کو ان کے باپوں کی پشتوں ہی میں جنت اور جہنم کے لیے پیدا کر دیا ہے۔ اس لیے ہم عمومی طور پر تو کہہ سکتے ہیں کہ مومن جنت میں جائیں گے اور کافر جہنم میں، لیکن جب تک ہمیں کسی کا انجام معلوم نہ ہو سکے اس وقت تک ہم اس کے جنتی یا جہنمی ہونے کی تعیین نہیں کر سکتے۔ مہدی جس سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے، اس کا نام محمد بن عبداللہ ہو گا اور وہ حضرت حسن بن علی کی اولاد سے ہو گا، اور جب اللہ چاہے گا اس وقت اس کا ظہور ہو گا۔ وہ نیک خلیفہ ہو گا اور زمین کو اسی طرح عدل و انصاف سے بھر دے گا جس طرح وہ ظلم وستم سے بھری ہوئی تھی اور مال کی ریل پیل ہو جائے گی۔ ترمذی، سنن ابو داود اور مسند احمد میں اس کی خبریں مروی ہیں اور صحیحین میں اس کا اشارہ موجود ہے۔

وہ بات جو گمراہوں نے پھیلائی ہوئی ہے کہ حسن بن علی عسکری (متوفی سامراء) کا ایک بیٹا تھا جس کا نام محمد تھا وہ اپنے باپ کی موت کے بعد ابھی چھوٹا ہی تھا کہ سامراء کی غار میں چھپ گیا اور وہی مہدی ہے۔ یہ بات تمام علمائے بنی آدم اور اہلِ عقل و دانش کے نزدیک جھوٹی اور غلط ہے۔ احادیث میں اس کی خبر نہیں دی گئی۔ یہ حسینی ہے، یعنی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی نسل سے اور وہ حسنی یعنی حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی اولاد سے ہو گا۔ نیز محمد بن جریر طبری اور عبدالباقی بن قانع وغیرہما جیسے علمائے انساب کے نزدیک حسن بن علی عسکری کا سلسلہ نسل جاری ہی نہیں ہوا، اس لیے اس کا کوئی وارث ہی نہیں۔ جنھوں نے اس کا وارث ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ان کا عقیدہ ہے کہ وہ خلیفہ معصوم، اہلِ زمین پر اللہ کی حجت ہے اور آج تک باقی ہے۔ مگر یہ بات عقل اور کتاب وسنت کے خلاف ہے۔ اگر یہ حقیقت میں موجود ہوتا تو یتیم بچہ ہوتا جو اپنی ذات اور اپنے مال میں تصرف کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ اس عمر اور کیفیت کے بچے کو اصلاً والی بنانا جائز نہیں ہوتا۔ یاد رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی معصوم نہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا ہر معاملے میں اور ہمیشہ کوئی بھی واجب الاطاعت نہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے بندوں کو ایسے انسان کی اطاعت کا مکلف اور پابند نہیں بناتا جو مجہول ہو۔ یہ سارے استدلال بودے ہیں۔ واللہ أعلم [1]

---

[1] جامع المسائل (٤/١٨٣۔١٨٥)

منکر نکیر کے جواب دینے کے بعد دوبارہ موت کا مسئلہ

سوال جب مرنے کے بعد روح دوبارہ انسان کے جسم میں داخل ہوتی ہے اور وہ اٹھ کر بیٹھتا ہے، پھر منکر نکیر کے سوالات کا جواب دیتا ہے، کیا اس کے بعد وہ دوسری موت کا محتاج ہوتا ہے؟

جواب قبر میں میت کے بدن میں روح کا لوٹنا اس دنیا کی زندگی میں اس میں اس کے لوٹنے کی طرح نہیں ہوتا، اگرچہ وہ بعض حیثیتوں سے زیادہ کامل ہوتا ہے جس طرح آخرت کی زندگی اس دنیا کی زندگی کی طرح نہیں، گو وہ اس سے زیادہ کامل ہوتی ہے، بلکہ اس گھر، برزخ اور قیامت کے ہر مقام کا اپنا خاص حکم ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بتایا ہے کہ میت کی قبر کشادہ کر دی جاتی ہے اور اس سے سوالات کیے جاتے ہیں، اگرچہ ممکن ہے مٹی میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوتی ہو، تو روح بھی بدن کو چھوڑتی ہے اور واپس آتی ہے۔ اس کو موت کا نام دیا جا سکتا ہے؟ اس میں دو اقوال ہیں:

اس کو موت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس بات کے قائلین نے آیت کی یہی تاویل کی ہے:

﴿ رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ ﴾ [المؤمن: ١١]

''اے ہمارے رب! تو نے ہمیں دو دفعہ موت دی اور تو نے ہمیں دو دفعہ زندہ کیا۔''

پہلی زندگی اس دنیا میں اور دوسری زندگی قبر میں، اور دوسری موت قبر میں۔

حقیقت میں یہ آیت اس آیت کی ہم معنی ہے:

﴿ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ﴾ [البقرة: ٢٨]

''حالانکہ تم بے جان تھے تو اس نے تمھیں زندگی بخشی، پھر وہ تمھیں موت دے گا، پھر تمھیں زندہ کرے گا۔''

پہلی موت جو اس حیات سے پہلے ہے اور دوسری موت اس حیات کے بعد۔ اللہ نے کہا ہے: پھر تم کو زندہ کرے گا، یعنی موت کے بعد۔ فرمایا:

﴿ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ﴾ [طٰہٰ: ٥٥]

''اسی سے ہم نے تمھیں پیدا کیا اور اس میں تمھیں لوٹائیں گے اور اسی سے تمھیں ایک اور بار نکالیں گے۔''

فرمایا:

﴿ فِيهَا تَحْيَوْنَ وَفِيهَا تَمُوتُونَ وَمِنْهَا تُخْرَجُونَ ﴾ [الأعراف: ٢٥]

''تم اسی میں زندہ رہو گے اور اسی میں مرو گے اور اسی سے نکالے جاؤ گے۔''

لہٰذا روح، جب اللہ چاہے، بدن کو چھوڑ دیتی ہے اور جب چاہے اس کے ساتھ مل جاتی ہے۔ یہ ایک دو مرتبہ کے ساتھ متعین نہیں کی جا سکتی، نیند بھی موت کی بہن ہے، اسی لیے رسول اللہ ﷺ بستر پر لیٹتے وقت یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

«اَللّٰهُمَّ بِاسْمِكَ أَمُوتُ وَأَحْيَا»

''اے اللہ! میں تیرے نام کے ساتھ ہی مرتا اور زندہ ہوتا ہوں۔''

جب آپ بیدار ہوتے تو یہ کلمات ادا کرتے:

«اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَحْيَانَا بَعْدَ مَا أَمَاتَنَا وَإِلَيْهِ النُّشُوْرُ»[1]

''تمام تعریفات اس اللہ ہی کے لیے ہیں جس نے ہمیں مارنے کے بعد زندہ کیا اور اسی کی طرف اکٹھا ہونا ہے۔''

آپ ﷺ نے نیند کو موت اور بیداری کو حیات سے تعبیر کیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰۤى اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴾

[زمر: ٤٢]

''اللہ جانوں کو ان کی موت کے وقت قبض کرتا ہے اور ان کو بھی جو نہیں مریں ان کی نیند میں، پھر اسے روک لیتا ہے جس پر اس نے موت کا فیصلہ کیا اور دوسری کو ایک مقرر وقت تک بھیج دیتا ہے۔ بلاشبہہ اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں۔''

اس آیت میں بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نفوس کو دو انواع کی وفات دیتا ہے: ایک موت کے وقت ان کو فوت کرتا ہے اور دوسرے نیند کے وقت۔ پھر نیند کی حالت میں جس کی موت واقع ہو جائے اللہ اس کے نفس کو روک لیتا ہے اور جس کی موت واقع نہ ہو اس کے نفس کو چھوڑ دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نیند کے وقت یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

«بِاسْمِكَ رَبِّيْ وَضَعْتُ جَنْبِيْ وَبِكَ أَرْفَعُهُ، فَإِنْ أَمْسَكْتَ نَفْسِيْ فَارْحَمْهَا وَإِنْ أَرْسَلْتَهَا

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٩٥٣)

فَاحْفَظْهَا بِمَا تَحْفَظُ بِهِ عِبَادَكَ الصَّالِحِينَ »[1]

''تیرے نام کے ساتھ ہی، اے میرے رب! میں اپنا پہلو رکھتا اور اٹھاتا ہوں، اگر تو نے میرا نفس روک لیا تو اس پر رحم کرنا اور اگر چھوڑ دیا تو اس کی حفاظت فرمانا جس کے ساتھ تو اپنے نیک بندوں کی حفاظت فرماتا ہے۔''

سوئے ہوئے کو نیند میں لذت بھی حاصل ہوتی ہے اور تکلیف بھی۔ روح اور بدن بھی اس سے دوچار ہوتے ہیں۔ بعض اوقات انسان کو نیند میں کوئی مارتا ہے اور جب وہ بیدار ہوتا ہے تو بدن میں درد محسوس کرتا ہے۔ کبھی نیند میں اس کو کوئی مزیدار چیز کھلاتا ہے اور صبح انسان اپنے منہ میں اس کا ذائقہ محسوس کرتا ہے۔ اگر نیند کی حالت میں انسان کی روح اور جسم کو لذت ملتی یا تکلیف پہنچتی ہے اور اس کے پہلو میں سوئے ہوئے کو احساس تک نہیں ہوتا، بلکہ کبھی تو سویا ہوا تکلیف اور گھبراہٹ کی شدت سے چیخ اٹھتا ہے اور بیدار اس کی چیخ سنتا ہے، پھر کسی وقت سویا ہوا باتیں کرتا ہے۔ قرآن پڑھتا ہے یا ذکر کرتا ہے۔ بیدار یہ سب سن رہا ہوتا ہے، مگر اس کی آنکھیں بند ہوتی ہیں۔ اگر اس کو مخاطب کیا جائے تو وہ بالکل نہیں سنتا۔ تو قبر کے اندر دفن انسان کے اس حال کا انکار کیونکر کیا جا سکتا ہے جو رسول اللہ ﷺ نے بتایا ہے کہ وہ واپس جانے والوں کے جوتوں کی چاپ بھی سنتا ہے اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں ان سے جو کہہ رہا ہوں تم اس کو ان سے زیادہ نہیں سن رہے۔''[2]

دل کو بھی قبر کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے، اس لیے جب غزوۂ خندق کے موقع پر آپ ﷺ کی عصر کی نماز چھوٹ گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

« مَلَأَ اللّٰهُ أَجْوَافَهُمْ وَقُبُوْرَهُمْ نَاراً »[3] ''اللہ ان کے دلوں اور قبروں کو آگ سے بھر دے۔''

ایک حدیث میں ہے:

« مَلَأَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ وَقُبُوْرَهُمْ نَاراً »[4]

اللہ نے ان دونوں میں فرق کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ ۝ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ ﴾ [العاديات: ٩، ١٠]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٩٦١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧١٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٠٤، ٣٧٥٧، ٣٨٠٢)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٢٨)

[4] المعجم الأوسط (٢٧/٢) مسند أبي يعلىٰ (٣١٣/١) علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد (٢٠٣/٦) میں کہا ہے کہ اسے امام طبرانی رحمہ اللہ نے اپنے شیخ سے روایت کیا ہے جو مجہول ہیں، جب کہ باقی رواۃ ثقہ ہیں۔

''قبروں میں جو کچھ ہے باہر نکال پھینکا جائے گا۔ اور جو کچھ سینوں میں ہے ظاہر کر دیا جائے گا۔''

یہ اس کے امکان کو قریب کرنے اور تاکید کرنے کے لیے فرمایا۔ یہ کہنا درست نہیں کہ میت جس نعمت یا عذاب سے دوچار ہوتی ہے وہ خواب میں دیکھنے والی لذت یا تکلیف کی طرح ہے، کیوں کہ قبر کا عذاب اور نعمت زیادہ کامل اور زیادہ پورا ہے۔ وہ حقیقی نعمت اور حقیقی عذاب ہے۔ لیکن یہ مثال صرف اس کے امکان کو بیان کرنے کے لیے ذکر کی جاتی ہے، کیوں کہ اگر کوئی کہے کہ میت اپنی قبر میں حرکت نہیں کرتی یا مٹی نہیں ہلتی وغیرہ تو اس کو جواب دینے کے لیے یہ مثال دی جا سکتی ہے۔ یہ ایک تفصیل طلب مسئلہ ہے جس کی تفصیل و تفسیر یہاں نہیں سما سکتی۔ واللہ أعلم [1]

قبر میں غیر مکلّف سے سوال

سوال کیا نابالغ بچہ جس کی وفات ہو جائے، اسے بھی اس کی قبر میں زندہ کیا جاتا ہے اور اس سے سوال ہوتا ہے؟ یا صرف اسے زندہ کیا جاتا ہے اور سوال نہیں کیا جاتا؟ اگر سوال ہوتا ہے تو اس سے کیا پوچھا جاتا ہے؟ پھر کیا زندہ ہونے کے بعد وہ وہاں ہمیشہ زندہ ہی رہتا ہے؟ کیا مکلّف اور غیر مکلّف سب سے سوال کیا جاتا ہے؟

جواب الحمد لله رب العالمين. جو میت مکلّف نہیں ہے، جیسے: بچے یا مجنون، کیا اس سے بھی قبر میں امتحان ہوتا ہے اور اس سے منکر نکیر سوال کرتے ہیں؟ اس سلسلے میں علما کے دو قول ہیں:

① غیر مکلّف میت، جیسے: بچے یا مجنون سے بھی امتحان ہوتا ہے اور اہلِ سنت کی اکثریت کا یہی مسلک ہے۔ ابو الحسن بن عبدوس نے اہلِ سنت کا یہی موقف بیان کیا ہے۔ ابو حکیم نہروانی نے بھی یہی بات ذکر کی ہے۔ ان دونوں کے علاوہ دوسرے حضرات بھی اہلِ سنت کا یہی موقف ذکر کرتے ہیں۔

② غیر مکلّف سے اس کی قبر میں امتحان نہیں ہوتا ہے، جیسا کہ قاضی ابو یعلیٰ، ابن عقیل اور ان دونوں کے علاوہ بعض دوسرے حضرات نے ذکر کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ امتحان اس کا ہوتا ہے جو اس دنیا میں مکلّف رہا ہو۔

پہلے قول کے قائلین نے مؤطا کی اس روایت سے استدلال کیا ہے جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چھوٹے بچے کی نمازِ جنازہ پڑھائی جس نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعا میں فرمایا: ''اے اللہ! اسے قبر کے عذاب اور قبر کے امتحان سے بچا۔'' [2] یہ دعا اس بات کی دلیل ہے کہ غیر مکلّف میت کا بھی امتحان ہوتا ہے۔

---

① جامع المسائل (٤/٢٣٥_٢٣٨)

② موطأ (١/٢٢٨) تخريج أحاديث الإحياء (٤/٧٤)

مزید یہ کہ یہ رائے اس مسئلے پر بھی مبنی ہے کہ کافروں کے فوت شدہ وہ بچے جو دنیا میں مکلّف نہیں تھے، وہ آخرت میں مکلّف بنائے جائیں گے، جیسا کہ اس سلسلے میں متعدد احادیث موجود ہیں۔ یہی وہ قول ہے جسے ابو الحسن اشعری نے اہلِ سنت و الجماعت سے ذکر کیا ہے، حالاں کہ ائمہ، جیسے: امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ سے مروی اقوال میں یہ موقف ملتا ہے کہ مشرکین کے بچوں کے بارے میں توقف اختیار کیا جائے گا، جیسا کہ صحیحین میں حدیث ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے بچوں کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان سے کس طرح کے اعمال سرزد ہونے والے تھے۔''[1]

صحیح بخاری میں حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ثابت ہے کہ مشرکین کے بعض بچے جنت میں داخل ہوں گے۔[2] صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ جس بچے کو خضر نے قتل کر دیا تھا وہ پیدائشی کافر تھا۔[3] جب بچوں وغیرہ میں کچھ بد بخت ہوتے ہیں اور کچھ نیک بخت اور یہ دنیا میں ان کے امتحان کے لیے ہوسکتا ہے تو یہ امتحان قبر میں کیوں نہیں ہو سکتا، لیکن یہ ایک اور بات کی اساس ہے کہ مومنوں کے بچوں میں سے متعین طور پر کسی کے بارے میں یہ گواہی نہیں دی جا سکتی کہ وہ جنتی ہے۔ ہاں عمومی طور پر یہ بات کہی جا سکتی ہے، لیکن عمومی طور پر بھی یہ بات کہنے میں اس کا خیال رہے کہ جو بچہ مسلمانوں کے درمیان پیدا ہوا ہے بسا اوقات منافق ہوتا ہے۔ واللّٰہ أعلم[4]

روح و بدن کو عذابِ قبر

سوال کیا عذابِ قبر روح اور جسم دونوں کو ہوتا ہے یا صرف روح کو ہوتا ہے بدن کو نہیں ہوتا؟ میت کو قبر میں عذاب زندہ حالت میں دیا جاتا ہے یا مردہ حالت میں؟ کیا روح بدن میں لوٹ کر آتی ہے یا نہیں؟ کیا عذاب اور ثواب میں دونوں شریک ہوتے ہیں یا دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ یہ ہوتا ہے؟

جواب الحمد للّٰه رب العالمین. بلکہ عذاب اور ثواب روح اور بدن دونوں کو ایک ساتھ ہوتا ہے۔ اہلِ سنت و الجماعت کا اس پر اتفاق ہے۔ روح بدن سے الگ رہ کر تنہا بھی ثواب پاتی ہے اور عذاب سے بھی دوچار ہوتی ہے۔ اسی طرح بدن کے ساتھ مل کر بھی عذاب اور ثواب کا معاملہ اس کے ساتھ ہوتا ہے، جس طرح قبر میں عذاب اور ثواب روح اور بدن پر ایک ساتھ ہوتا ہے، اسی طرح بدن سے الگ تنہا روح پر بھی عذاب اور ثواب ہوتا ہے۔

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٣١٨) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٥٩)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٦٤٠)

[3] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٦١)

[4] مجموع الفتاویٰ (٤/ ٢٨٠۔٢٨١)

لیکن کیا عذاب اور ثواب روح سے ہٹ کر تنہا بدن پر بھی ہوتا ہے؟ اس سلسلے میں اہلِ حدیث وسنت اور متکلمین کے دو قول مشہور ہیں۔ اس مسئلے میں بہت سے شاذ اقوال بھی ہیں جو اہلِ سنت و حدیث کے اقوال نہیں ہیں، جیسے اس شخص کا قول جو کہتا ہے کہ ثواب اور عذاب صرف روح کو ہوتا ہے، بدن نہ ثواب پاتا ہے اور نہ عذاب سے دوچار ہوتا ہے۔ یہی قول ان فلسفیوں کا ہے جو بدن کے دوبارہ لوٹائے جانے کا انکار کرتے ہیں۔ یہ تمام لوگ مسلمانوں کے اجماع کے مطابق کافر ہیں۔

معتزلہ میں سے بیشتر متکلمین وغیرہ کہتے ہیں کہ عذاب اور ثواب برزخ میں نہیں ہوتا، بلکہ یہ سب اس وقت ہوگا، جب لوگ اپنی اپنی قبروں سے اٹھیں گے۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ تنہا روح کو نہ عذاب ہوتا ہے اور نہ ثواب ملتا ہے۔ روح ہی کا نام تو زندگی ہے۔ یہ قول معتزلہ میں سے متکلمین کے ایک گروہ کا ہے۔ ابوالحسن اشعری کے اصحاب، جیسے قاضی ابوبکر وغیرہ کا بھی یہی قول ہے۔ یہ لوگ اس بات کا انکار کرتے ہیں کہ جسم سے جدا ہونے کے بعد روح باقی رہتی ہے۔ یہ قول باطل ہے۔ اس کی مخالفت استاذ ابوالمعالی جوینی وغیرہ نے کی ہے، بلکہ کتاب وسنت اور امت کے اسلاف کا اس پر اتفاق ہے کہ روح بدن سے جدا ہونے کے بعد باقی رہتی ہے اور وہ انعام بھی پاتی ہے اور عذاب سے بھی دوچار ہوتی ہے۔ الٰہیات سے تعلق رکھنے والے فلاسفہ بھی یہی کہتے ہیں، لیکن وہ جسم کے دوبارہ لوٹائے جانے کا انکار کرتے ہیں اور یہ لوگ اس کے قائل ہیں، لیکن جسم کے دوبارہ لوٹائے جانے کا اقرار کرنے کے ساتھ ساتھ یہ حضرات اس بات کا انکار کرتے ہیں کہ روح بھی لوٹائی جاتی ہے اور صرف تنہا اسے عذاب اور ثواب ملتا ہے۔ یہ دونوں اقوال باطل ہیں، البتہ فلاسفہ کا قول اہلِ اسلام کے قول سے کہیں زیادہ بعید ہے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جو حضرات خود کو اہلِ معرفت اور تصوف، اہلِ تحقیق اور ماہر علمِ کلام کہتے ہیں اور جن کا دعویٰ ہے کہ وہ دینِ اسلام سے وابستگی رکھتے ہیں، ان کا قول فلاسفہ کے قول سے مطابقت رکھتا ہے۔

تیسرا قول شاذ ہے، جس کے قائل کا خیال ہے کہ برزخ میں نہ ثواب ہے اور نہ عذاب ہے، بلکہ عذاب و ثواب کا سارا معاملہ قیامتِ کبریٰ تک کے لیے ملتوی رکھا گیا ہے، جیسا کہ معتزلہ میں سے بعض حضرات اور ان جیسے دیگر لوگوں کا یہی خیال ہے جو قبر کے عذاب و ثواب کے منکر ہیں۔ اس بنا پر کہ بدن سے جدا ہونے کے بعد روح باقی نہیں رہتی اور تنہا بدن عذاب و ثواب سے عاری ہوتا ہے۔

یہ دونوں گروہ برزخ کے معاملے میں سخت گمراہی میں ہیں، لیکن فلسفیوں سے بہر حال اچھے ہیں، کیوں کہ یہ قیامتِ کبریٰ کے واقع ہونے کا اقرار کرتے ہیں۔

جب ان تینوں باطل فرقوں کے اقوال آپ کو معلوم ہو گئے تو یہ بھی جان لیجیے کہ امت کے اسلاف اور اس کے ائمہ کا اس بابت نقطہ نظر یہ ہے کہ میت کا جب انتقال ہو جاتا ہے، اس پر عذاب یا ثواب کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ عذاب یا ثواب اس کی روح کو بھی ہوتا ہے اور بدن کو بھی، بلکہ بدن سے جدا ہونے پر بھی روح کو عذاب یا ثواب سے سابقہ رہتا ہے اور وہ کبھی کبھی بدن سے ملتی ہے تو اسے بھی عذاب یا ثواب سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

پھر جب قیامتِ کبریٰ واقع ہوگی تو روحیں اپنے جسموں کی طرف لوٹائی جائیں گی اور سارے لوگ اپنی قبروں سے اللہ رب العالمین کے سامنے حاضر ہونے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے۔

جسموں کا دوبارہ اٹھ کھڑا ہونا ایک متفق علیہ مسئلہ ہے۔ اہلِ اسلام، یہود، نصاریٰ سب اس کے قائل ہیں اور یہ سب باتیں علمائے حدیث وسنت کے یہاں متفق علیہ ہیں۔

کیا روح کو چھوڑ کر صرف بدن کو عذاب یا ثواب ہوتا ہے؟ ایک جماعت اس کا جواب اثبات میں دیتی ہے، لیکن اکثر لوگ اس کا انکار کرتے ہیں۔

اب ہم آگے ان باتوں کا ذکر کریں گے جو مذکورہ بالا باتوں کو واضح کرتی ہیں۔ عذابِ قبر اور منکر نکیر سے متعلق نبی اکرم ﷺ سے جو احادیث منقول ہیں، وہ خاصی ہیں اور حدِ تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں۔ جیسا کہ صحیحین میں ہے: عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ دو قبروں سے ہو کر گزرے اور فرمایا:

''ان دونوں کو عذاب ہو رہا ہے، لیکن کسی بڑے گناہ کے جرم میں نہیں، بلکہ ان میں سے ایک چغل خوری کرتا تھا اور دوسرا پیشاب کے چھینٹوں سے نہیں بچتا تھا، پھر آپ ﷺ نے ایک تر شاخ منگوائی اور اسے دو حصوں میں پھاڑ دیا اور دونوں قبروں پر ایک ایک گاڑ دیا۔ لوگوں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! آپ نے ایسا کیوں کیا؟ فرمایا: اس امید پر کہ شاید اس شاخ کے سوکھنے تک ان کے عذاب میں تخفیف رہے۔''[1]

صحیح مسلم میں ہے، زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ قبیلہ بنو نجار کے باغ میں تھے۔ آپ ﷺ خچر پر سوار تھے اور ہم بھی آپ ﷺ کے ساتھ تھے۔ اتنے میں آپ ﷺ کا خچر اس زور سے بدکا کہ آپ ﷺ کو گرانے لگا تھا۔ وہاں چھے، پانچ یا چار قبریں تھیں۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ''ان قبروں کے بارے میں کسی کو علم ہے؟'' ایک صاحب نے بتایا کہ مجھے ان کے بارے میں معلوم ہے۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ''یہ لوگ کب مرے تھے؟'' اس نے جواب دیا: ان سب کا انتقال حالتِ شرک میں ہوا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ امت اپنی قبروں میں آزمائی جاتی ہے۔ اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ تم اپنی میت کو زمین میں دفن کرنا چھوڑ دو گے تو میں وہ عذابِ قبر تمھیں بھی سنا

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٢)

دیتا جو میں سنتا ہوں۔'' یہ کہہ کر آپ ﷺ ہماری جانب متوجہ ہوئے اور فرمایا: ''عذابِ قبر سے اللہ کی پناہ مانگو۔'' لوگوں نے کہا: ہم عذابِ قبر سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''عذابِ جہنم سے اللہ کی پناہ مانگو۔'' لوگوں نے کہا: ہم عذابِ جہنم سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمام ظاہری اور باطنی آزمایشوں سے اللہ کی پناہ مانگو۔'' لوگوں نے کہا: ہم تمام ظاہری اور باطنی آزمایشوں سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''دجال کے فتنے سے اللہ کی پناہ مانگو۔'' لوگوں نے کہا: ہم دجال کے فتنے سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔[1]

صحیح مسلم اور تمام کتبِ سنن میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''جب کوئی مسلمان آخری تشہد سے فارغ ہو تو اسے چار چیزوں: عذابِ جہنم، عذابِ قبر، زندگی اور موت کی آزمایش اور مسیح دجال کے فتنے سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے۔''[2]

صحیح مسلم وغیرہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ انھیں یہ دعا اسی طرح سکھاتے تھے جس طرح قرآن کی سورت سکھاتے تھے: ''اے اللہ! میں عذابِ جہنم سے تیری پناہ چاہتا ہوں، عذابِ قبر سے تیری پناہ چاہتا ہوں، مسیح دجال سے تیری پناہ چاہتا ہوں اور زندگی اور موت کی آزمایش سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔''[3]

صحیح بخاری و مسلم میں ہے، ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ باہر نکلے، جب سورج ڈوب چکا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہودیوں کو ان کی قبروں میں عذاب ہو رہا ہے۔''[4]

صحیحین میں عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، وہ بیان کرتی ہیں: ''میرے پاس مدینے کے یہودیوں میں سے ایک بوڑھی عورت آئی اور اس نے کہا کہ قبر والوں کو ان کی قبر میں عذاب ہوتا ہے۔ میں نے اس کی بات جھٹلا دی، میری طبیعت نہیں چاہتی تھی کہ میں اس کی بات کی تصدیق کروں۔ وہ جب چلی گئی اور رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لائے تو میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! اہلِ مدینہ کی ایک بوڑھی عورت میرے پاس آئی تھی، اس کا خیال ہے کہ قبر والوں کو ان کی قبروں میں عذاب دیا جاتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس نے سچ کہا ہے، ان کو عذاب ہوتا ہے، جسے سارے جانور سنتے ہیں۔'' پھر میں نے دیکھا کہ آپ اپنی ہر نماز میں عذابِ قبر سے اللہ کی پناہ مانگتے تھے۔''[5]

صحیح ابی حاتم البستی میں ہے کہ امِ مبشر رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لائے، اس

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٦٧)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٨٨)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٩٠)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٠٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٦٩)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٠٠٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٨٦)

وقت میں ایک باغ میں تھی۔ آپ ﷺ اس وقت فرما رہے تھے: ''عذابِ قبر سے اللہ کی پناہ مانگو۔'' میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! کیا قبر میں عذاب ہوتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''لوگوں کو ان کی قبروں میں عذاب دیا جاتا ہے اور اسے جانور سنتے ہیں۔''[1]

بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہی وجہ ہے کہ جب جانوروں کے پیٹ میں درد اٹھتا ہے تو لوگ اپنے جانوروں کو یہود و نصاریٰ اور منافقین کی قبروں پر لے جاتے ہیں۔ منافقین، جیسے: اسماعیلیہ، نصیریہ اور سارے قرامطہ جن کا تعلق بنو عبید وغیرہ سے ہے جو مصر و شام میں آباد تھے۔ گھوڑے والے جس طرح یہود و نصاریٰ کی قبروں پر اپنے گھوڑوں کو لے جاتے ہیں اسی طرح ان لوگوں کی قبروں پر بھی لے جاتے ہیں۔ جہلا یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا تعلق بنو فاطمہ سے ہے اور وہ اولیاء اللہ میں سے ہیں، لیکن وہ حقیقت میں اس قبیل کے لوگ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ گھوڑے جب قبر کا عذاب سنتے ہیں تو اس سے انھیں حرارت پہنچتی ہے اور ان کا درد جاتا رہتا ہے۔

بہر حال قبر کے عذاب سے متعلق احادیث بہت ہیں۔ اس سوال کے جواب میں گنجایش نہیں کہ تمام احادیث بیان کی جائیں۔ اسی طرح قبر میں سوال و جواب سے متعلق بھی احادیث بہت ہیں، جیسا کہ صحیحین اور سنن میں براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''ایک مسلمان سے جب اس کی قبر میں سوال کیا جاتا ہے تو وہ گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ یہی تفسیر ہے اللہ کے اس ارشاد کی:

﴿ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ﴾ [إبراهيم: ٢٧]

''اللہ مومنوں (کے دلوں) کو (صحیح اور) پکی بات سے دنیا کی زندگی میں بھی مضبوط رکھتا ہے اور آخرت میں بھی (رکھے گا)۔''

ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں:

قبر کے عذاب کے سلسلے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ میت سے قبر میں پوچھا جائے گا: تمھارا رب کون ہے؟ وہ جواب دے گا: میرا رب اللہ ہے۔ میرا دین اسلام ہے اور میرے نبی محمد ﷺ ہیں۔ آیت یہ ہے:

﴿ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ﴾ [إبراهيم: ٢٧]

'' اللہ مومنوں (کے دلوں) کو (صحیح اور) پکی بات سے دنیا کی زندگی میں بھی مضبوط رکھتا ہے اور آخرت

[1] مسند أحمد (٦/٣٦٢) ابن حبان في الزوائد (٧٨٧) السلسلة الصحيحة (١٤٤٤)

میں بھی (رکھے گا) اور اللہ بے انصافوں کو گمراہ کر دیتا ہے اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔''[1]

اس حدیث کو سنن و مسانید کے مولفین نے مطولاً روایت کیا ہے جیسا کہ سنن ابی داؤد وغیرہ میں براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہم ایک انصاری صحابی کے جنازے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے۔ جب ہم قبر کے پاس پہنچے تو ابھی لحد تیار کی جا رہی تھی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ گئے اور ہم بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد بیٹھ گئے۔ ہماری خاموشی کا عالم یہ تھا کہ جیسے ہمارے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ایک ٹہنی تھی جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم مٹی کرید رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سر مبارک اٹھایا اور فرمایا: عذابِ قبر سے اللہ کی پناہ مانگو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جملہ دو یا تین بار دہرایا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے روح قبض کیے جانے اور اس کے آسمان کی طرف چڑھنے کی کیفیت اور پھر میت کی جانب اس کے واپس آنے کی حالت بیان فرمائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں تک ذکر کیا کہ تدفین میں شریک لوگ جب لوٹتے ہیں تو مردہ ان کے جوتوں کی آواز سنتا ہے۔ اس سے پوچھا جاتا ہے: اے فلاں! تمھارا رب کون ہے؟ تمھارا دین کیا ہے؟ اور تمھارے نبی کون ہیں؟''[2]

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: ''اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں اور اسے بٹھاتے ہیں اور پھر اس سے پوچھتے ہیں: تمھارا رب کون ہے؟ وہ جواب دیتا ہے: میرا رب اللہ ہے۔ وہ دونوں اس سے دوسرا سوال کرتے ہیں: تمھارا دین کیا ہے؟ وہ جواب دیتا ہے: میرا دین اسلام ہے۔ وہ دونوں اس سے پھر پوچھتے ہیں: وہ آدمی کون ہیں جنھیں تمھارے درمیان بھیجا گیا تھا؟ وہ جواب میں کہتا ہے: وہ اللہ کے رسول ہیں۔ وہ پوچھتے ہیں: تمھیں یہ کیسے معلوم ہوا؟ وہ جواب دیتا ہے: میں نے اللہ کی کتاب پڑھی، اس پر ایمان لایا اور اس کی تصدیق کی۔'' یہی تفسیر ہے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی:

﴿ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ﴾ [إبراهيم: ٢٧]

''اللہ مومنوں (کے دلوں) کو (صحیح اور) پکی بات سے دنیا کی زندگی میں بھی مضبوط رکھتا ہے اور آخرت میں بھی (رکھے گا) اور اللہ بے انصافوں کو گمراہ کر دیتا ہے اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔''

پھر ایک منادی آسمان سے آواز دیتا ہے کہ میرے بندے نے سچ کہا، جنت میں اس کے لیے بستر آراستہ کر دو اور اسے جنت کا لباس پہنا دو اور جنت کی طرف اس کے لیے ایک دروازہ کھول دو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید فرمایا: پھر اس تک جنت کی ہوائیں اور خوشبو آتی رہتی ہے اور تا حدِ نظر اس کے لیے قبر کشادہ کر دی جاتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٢٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٧١)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧٥٣) مسند أحمد (٢٩٦/٤) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔

کے بعد کافر کی موت کا ذکر کیا اور فرمایا: قبر میں اس کی روح اس کے بدن میں لوٹائی جاتی ہے۔ دونوں فرشتے آ کر اسے بٹھاتے ہیں اور اس سے پوچھتے ہیں: تمھارا رب کون ہے؟ وہ جواب میں کہتا ہے: افسوس! افسوس! میں نہیں جانتا۔ وہ دوسرا سوال پوچھتے ہیں: تمھارا دین کیا ہے؟ وہ جواب میں کہتا ہے: افسوس! افسوس! میں نہیں جانتا، پھر ایک منادی آسمان سے آواز دیتا ہے کہ میرے بندے نے جھوٹ کہا۔ اس کے لیے آگ کا بستر بچھا دو، آگ ہی کا اسے لباس پہنا دو اور اس کے لیے جہنم کی کھڑکی کھول دو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آگے فرمایا: پھر اس کی قبر میں جہنم کی گرمی اور اس کی مسموم ہوائیں آنے لگتی ہیں۔ اس کی قبر اتنی تنگ کر دی جاتی ہے کہ اس کی پسلیاں اِدھر سے اُدھر ہو جاتی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید فرمایا: پھر اس پر ایک اندھا اور بہرہ فرشتہ متعین کر دیا جاتا ہے جس کے پاس لوہے کا ایک گرز ہوتا ہے، اگر اس سے پہاڑ پر مار دیا جائے تو وہ دھول بن جائے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ اس سے مردے کو مارتا ہے جس کی آواز مشرق و مغرب کے درمیان موجود جن و انس کے علاوہ ساری مخلوق سنتی ہے۔ اس مار سے وہ ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ پھر دوبارہ اس میں روح ڈالی جاتی ہے۔''[1]

اس حدیث میں یہ صراحت ہے کہ روح جسم میں لوٹائی جاتی ہے، اس کی پسلیاں اِدھر سے اُدھر ہو جاتی ہیں اور یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ عذاب روح اور بدن پر ایک ساتھ ہوتا ہے۔

روح قبض کیے جانے، قبر میں سوال و جواب ہونے اور قبر میں عذاب یا ثواب دیے جانے سے متعلق مذکورہ بالا حدیث براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی طرح ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی حدیث مسند وغیرہ میں مروی ہے۔ ابو حاتم بن حبان نے اپنی صحیح میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مردے کو جب اس کی قبر میں رکھ دیا جاتا ہے تو تدفین میں شریک لوگ جب وہاں سے واپس لوٹتے ہیں تو وہ ان کے جوتوں کی آواز سنتا ہے۔ اگر وہ مومن ہوتا ہے تو نماز اس کے سر کے پاس ہوتی ہے۔ روزہ اس کے دائیں طرف ہوتا ہے۔ زکات اس کے بائیں طرف ہوتی ہے۔ نیکیوں کے کام جیسے صدقہ و خیرات، صلہ رحمی، بھلے کام اور حسنِ سلوک اس کے پیروں کی طرف ہوتے ہیں۔ دونوں فرشتے اس کے سر کی جانب سے آتے ہیں تو نماز بول پڑتی ہے کہ میری طرف سے آنے کا کوئی راستہ نہیں۔ پھر فرشتے دائیں طرف سے آتے ہیں تو روزہ بول کھڑا ہوتا ہے کہ میری طرف سے آنے کا کوئی راستہ نہیں، پھر وہ بائیں جانب سے آتے ہیں تو زکات بول اٹھتی ہے کہ میری طرف سے آنے کا کوئی راستہ نہیں۔ پھر اس کے پیروں کی جانب سے آتے ہیں تو صدقہ و خیرات، صلہ رحمی، بھلائیاں اور حسنِ سلوک کے کام بول کھڑے ہوتے ہیں کہ ہماری طرف سے بھی کوئی راستہ نہیں۔ وہ مردے سے کہتے ہیں بیٹھ جاؤ۔ وہ بیٹھ جاتا ہے۔ اسی وقت سورج کی تمثیل اس کے سامنے اس

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧٥٣) مسند أحمد (٢٨٧/٤، ٢٨٨، ٢٩٦) صحيح الجامع (١٦٧٢)

طرح پیش کی جاتی ہے کہ گویا وہ غروب ہونے کے قریب ہے۔ وہ کہتا کہ مجھے چھوڑ دو، تا کہ میں نماز پڑھ لوں۔ وہ کہتے ہیں کہ ذرا دیر بعد پڑھنا پہلے ہمارے چند سوالوں کا جواب دے دو۔ اس شخصیت کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے جو تمھارے درمیان تھے، ان کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟ اور ان کے سلسلے میں تمھاری کیا گواہی ہے؟ وہ جواب میں کہتا ہے کہ وہ محمد ﷺ ہیں، ہم گواہی دیتے ہیں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں اور وہ اللہ کی طرف سے دینِ برحق لے کر آئے ہیں۔اس کا یہ جواب سن کر کہا جاتا ہے کہ اسی عقیدے پر تو نے زندگی گزاری ہے اور اسی پر ان شاء اللہ قیامت کے دن اٹھایا جائے گا، پھر اس کی قبر میں جنت کی کھڑکی کھول دی جاتی ہے اور اسے بتا دیا جاتا ہے کہ یہ تیرا ٹھکانا ہے اور یہ وہ نعمتیں ہیں جو اللہ نے تیرے لیے تیار کر رکھی ہیں۔ یہ سن کر اس کی مسرت و شادمانی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کی قبر ستر گز کشادہ کر دی جاتی ہے، اس میں روشنی کا انتظام کر دیا جاتا ہے اور اس کا جسم پہلے کی طرح لوٹا دیا جاتا ہے اور اس کی روح کو پرندے کی روح میں تبدیل کر دیا جاتا ہے جو جنت کے درخت سے لٹکا ہوا رہتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہی تفسیر ہے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی:

﴿ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ﴾ [إبراهيم: ٢٧]

''اللہ مومنوں (کے دلوں) کو (صحیح اور) پکی بات سے دنیا کی زندگی میں بھی مضبوط رکھتا ہے اور آخرت میں بھی (رکھے گا) اور اللہ بے انصافوں کو گمراہ کر دیتا ہے اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔''[1]

آپ ﷺ نے کافر کا تذکرہ کرتے ہوئے مومن کے برخلاف اس کا ذکر کیا اور کہا: اس کے لیے قبر تنگ کر دی جاتی ہے، یہاں تک کہ اس کی پسلیاں ادھر سے ادھر ہو جاتی ہیں۔ یہی وہ تنگ زندگی ہے، جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ کریمہ میں فرمایا ہے:

﴿ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴾ [طه: ١٢٤]

''اور جو میری نصیحت سے منہ پھیرے گا اُس کی زندگی تنگ ہو جائے گی اور قیامت کو ہم اُسے اندھا کر کے اٹھائیں گے۔''

یہ حدیث زیادہ مختصر ہے۔

براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا حدیث اس موضوع پر سنن کی تمام احادیث میں سب سے زیادہ طویل ہے۔

---

[1] ابن حبان (٣١١٣) المعجم الأوسط (٢٦٥١) مصنف عبد الرزاق (٦٧٠٣) المستدرك للحاكم (٣٧٩/١، ٣٨٠، ٣٨١) مسند أحمد (٢٩٢/٢، ٤٧٤، ٥٠٠)

مولفینِ سنن نے عذابِ قبر کا ذکر کرنے کے لیے اسے اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مسند وغیرہ میں یہ حدیث پوری تفصیل سے مذکور ہے۔ یہ حدیث حسن اور ثابت ہے۔ اس میں نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں: بندۂ مومن جب آخرت میں قدم رکھ رہا ہوتا ہے اور دنیا کو خیر باد کہنے والا ہوتا ہے تو روشن چہرے کے حامل فرشتے اس کے پاس حاضر ہوتے ہیں، جن کے چہرے سورج کی طرح چمک رہے ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ جنت کا کفن ہوتا ہے اور جنت کی خوشبو ہوتی ہے۔ وہ اس کے سامنے تا حدِ نظر بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر موت کا فرشتہ (ملک الموت) آتا ہے اور اس کے سرہانے بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے: اے پاکیزہ روح! چل مغفرت اور رضوان کی طرف۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں: اس پر روح جسم سے اسی طرح نکلتی ہے جس طرح چھاگل کے منہ سے قطرہ نکلتا ہے۔ فرشتہ اسے لے لیتا ہے اور جب ایک بار وہ اسے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے تو پھر ایک لمحہ کے لیے بھی اسے نہیں چھوڑتا، یہاں تک کہ ساتھ آئے ہوئے فرشتے اسے اپنے ہاتھوں میں لے لیتے ہیں، پھر اسے جنتی کفن اور جنتی خوشبو میں رکھ لیتے ہیں، پھر اس سے ایسی خوشبو پھوٹتی ہے جو روئے زمین پر پائی جانے والی سب سے اچھی خوشبو ہوتی ہے۔ آپ ﷺ آگے فرماتے ہیں: پھر فرشتے اسے لے کر اوپر چڑھتے ہیں اور جب جب ان کا گزر فرشتوں کی کسی جماعت سے ہوتا ہے تو وہ پوچھتے ہیں: یہ پاکیزہ روح کس کی ہے؟ فرشتے جواب دیتے ہیں: یہ فلاں بن فلاں ہے، اس وقت وہ اس کا اس سے بھی اچھا نام لیتے ہیں جس سے وہ دنیا میں پہچانا جاتا تھا، پھر اسے لے کر وہ آسمانِ دنیا تک پہنچتے ہیں اور دروازہ کھولنے کو کہتے ہیں۔ چنانچہ دروازہ اس کے لیے کھولا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہر آسمان کے مقرب فرشتے اس کے ساتھ ساتھ اپنے اوپر والے آسمان تک جاتے ہیں یہاں تک کہ اسے ساتویں آسمان تک پہنچا دیتے ہیں۔ وہاں اللہ فرماتا ہے کہ میرے بندے کا نام علیین کی کتاب میں لکھ دو اور اسے زمین پر واپس لے جاؤ، کیوں کہ میں نے اسی کی مٹی سے انھیں پیدا کیا ہے، اسی میں ان کو لوٹاؤں گا اور اسی سے ان کو دوبارہ نکالوں گا۔ آپ ﷺ آگے فرماتے ہیں: پھر اس کی روح اس کے بدن میں لوٹا دی جاتی ہے۔ اس کے بعد دو فرشتے اس کے پاس آتے ہیں اور اسے بٹھاتے ہیں۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے فرشتوں کے سوال و جواب کا ذکر کیا جو پہلے گزر چکا ہے۔ اس کے بعد اس کے پاس ایک خوبصورت چہرے والا خوشبو دار آدمی آتا ہے اور اس سے کہتا ہے: بشارت ہو اس شخص کے ذریعے جو تمھارے لیے سراپا بشارت ہے۔ یہی وہ دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ وہ اس سے پوچھتا ہے: تم کون ہو، کیا تمھارا چہرہ باعثِ خیر ہے؟ وہ جواب دیتا ہے: میں تمھارا عملِ صالح ہوں۔ یہ سن کر وہ کہتا ہے: میرے رب! قیامت برپا کر دے۔ میرے رب! قیامت برپا کر دے۔ میرے رب! قیامت برپا کر دے، تا کہ میں اپنے بچوں اور اپنی دولت و ثروت میں واپس لوٹ جاؤں۔

اس کے بعد آگے آپ ﷺ نے فرمایا: ایک کافر جب آخرت میں قدم رکھ رہا ہوتا ہے اور دنیا کو خیر باد کہنے

والا ہوتا ہے تو سیاہ چہرے کے حامل فرشتے اس کے پاس آتے ہیں، جن کے ساتھ بدبو دار ٹاٹ ہوتا ہے۔ وہ اس کے سامنے تا حدِ نظر بیٹھ جاتے ہیں، پھر موت کا فرشتہ (ملک الموت) آتا ہے اور اس کے سرہانے بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے: اے خبیث روح! چل اللہ کی ناراضی اور غضب کی طرف۔ یہ سن کر اس کی روح اس کے تمام اعضا میں بکھر جاتی ہے، فرشتے اسے اسی طرح کھینچ کر باہر نکالتے ہیں، جس طرح سیخ کو بھیگے ہوئے اون سے باہر نکالا جاتا ہے۔ اس سے اس کی رگیں اور اعصاب کھنچنے کی وجہ سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ فرشتہ اسے لے لیتا ہے اور جب ایک بار وہ اسے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے تو پھر ایک لحہ کے لیے بھی اسے نہیں چھوڑتا، یہاں تک کہ ساتھ آئے ہوئے فرشتے اسے اپنے ہاتھوں میں لے لیتے ہیں۔ پھر اسی بدبو دار ٹاٹ میں اسے رکھ لیتے ہیں۔ پھر اس سے ایسی بدبو پھوٹتی ہے جو روئے زمین پر پائی جانے والی سب سے بدترین بدبو ہوتی ہے۔ پھر فرشتے اسے لے کر اوپر چڑھتے ہیں اور جب جب ان کا گزر فرشتوں کی کسی جماعت سے ہوتا ہے تو وہ پوچھتے ہیں: یہ خبیث روح کس کی ہے؟ فرشتے جواب دیتے ہیں: یہ فلاں بن فلاں ہے، اس وقت وہ اس کا اس سے بھی برا نام لیتے ہیں جس سے وہ دنیا میں جانا جاتا تھا، پھر اسے لے کر وہ سمائے دنیا تک پہنچتے ہیں اور دروازہ کھولنے کو کہتے ہیں۔ چنانچہ دروازہ اس کے لیے نہیں کھولا جاتا ہے۔ اس کے بعد اللہ کے رسول ﷺ نے قرآن کی یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿ لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِيْنَ ﴾ [الأعراف: ٤٠]

''اُن کے لیے نہ آسمان کے دروازے کھولے جائیں گے اور نہ وہ جنت میں داخل ہوں گے، یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں سے نہ نکل جائے اور گناہ گاروں کو ہم ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں۔''

پھر اللہ فرماتا ہے کہ اس کا نام سب سے نیچے کی زمین میں موجود سجین کی کتاب میں لکھ دو، پھر اس کی روح پھینک دی جاتی ہے۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت پڑھی:

﴿ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ﴾ [الحج: ٣١]

''یا اس کو ہوا کسی دُور جگہ اُڑا کر پھینک دے۔''

آپ ﷺ آگے فرماتے ہیں: پھر اس کی روح اس کے بدن میں لوٹا دی جاتی ہے۔ اس کے بعد دو فرشتے اس کے پاس آتے ہیں اور اسے بٹھاتے ہیں۔ دونوں اس سے سوال کرتے ہیں: تمھارا رب کون ہے؟ وہ کہتا ہے: ہائے افسوس! ہائے افسوس! میں نہیں جانتا، اس کے بعد آپ ﷺ نے فرشتوں کے مزید سوال و جواب کا ذکر کیا جو پہلے گزر چکا ہے۔ پھر اس کے پاس ایک بدصورت اور بدبو دار آدمی آتا ہے اور اس سے کہتا ہے: بشارت ہو اس شخص کے

ذریعے جو تمھارے لیے سراپائے تکلیف ہے، یہی وہ تمھارا عمل ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ وہ اس سے پوچھتا ہے: تم کون ہو، تمھارا چہرہ باعثِ خیر نہیں ہے؟ وہ جواب دیتا ہے: میں تمھارا عملِ بد ہوں۔ پھر وہ کہتا ہے: میرے رب! قیامت نہ برپا کرنا۔ یہ جملہ وہ تین بار دہراتا ہے۔[1]

اس حدیث سے کئی علمی فوائد ہمیں حاصل ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض یہ ہیں:

ضلالت پر مبنی متکلمین کے خیال کے برعکس روح بدن سے جدا ہونے کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ فلسفیوں کے گمراہ کن عقیدے کے برعکس روح اوپر چڑھتی اور نیچے اترتی ہے۔ روح بدن میں دوبارہ لوٹائی جاتی ہے اور میت سے سوالات کیے جاتے ہیں۔ اس کے جواب کے مطابق اسے انعام یا عذاب دیا جاتا ہے۔ اسی طرح سوال کرنے والے اس سے سوال کرتے ہیں، اس کا عملِ صالح یا عملِ بد اچھی یا بری شکل میں اس کے پاس آتا ہے۔

صحیحین میں قتادہ رضی اللہ عنہ ،انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بندے کو جب اس کی قبر میں رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے احباب اور متعلقین واپس آنے لگتے ہیں تو وہ ان کے جوتوں کی آواز سنتا ہے، پھر اس سے اقرار کرانے کے لیے دو فرشتے اس کے پاس آتے ہیں اور پھر پوچھتے ہیں: محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟ اگر وہ مومن ہوتا ہے تو وہ جواب میں کہتا ہے: میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ فرشتہ کہتا ہے کہ تم جہنم میں اپنا ٹھکانا دیکھ لو، اللہ نے اس کے بدلے جنت میں تمھارا ٹھکانا بنا دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: وہ ان دونوں مقامات کو دیکھتا ہے۔ قتادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے ذکر کیا کہ اس کی قبر ستر گز کشادہ کر دی جاتی ہے اور اسے قیامت تک کے لیے سبزہ زار بنا دیا جاتا ہے۔ ایک بار پھر ہم حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث کا رخ کرتے ہیں۔ اس میں ہے کہ دونوں فرشتے کافر اور منافق کے پاس جب آتے ہیں تو اس سے پوچھتے ہیں: اس شخصیت کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟ جواب میں وہ کہتا ہے: مجھے نہیں معلوم، میں وہی کہا کرتا تھا جو دوسرے لوگ کہتے تھے۔ فرشتے کہتے ہیں: نہ تو نے جانا اور نہ تابعداری کی، پھر وہ لوہے کے ہتھوڑے سے اس کے دونوں کانوں کے درمیان مارتے ہیں، جس سے وہ ایسی چیخ مارتا ہے کہ جس کی آواز جن و انسان کے سوا ساری مخلوق سنتی ہے۔[2]

ترمذی نے اور ابوحاتم نے اپنی صحیح میں، روایت کے اکثر الفاظ ابو حاتم کے ہیں، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کسی کو قبر میں دفن کر دیا جاتا ہے تو اس کے پاس سیاہ زرد رنگ کے دو

---

[1] مسند أحمد (٤/٢٨٧، ٢٨٨، ٢٩٦) صحيح الجامع (١٦٧٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٠٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٧٠)

فرشتے آتے ہیں، جن کو منکر اور نکیر کہا جاتا ہے۔ وہ اس سے پوچھتے ہیں: محمد ﷺ کے بارے تم کیا کہتے ہو؟ پھر وہ اگر مومن ہوتا ہے تو جواب دیتا ہے: وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ یہ جواب سن کر دونوں فرشتے کہتے ہیں: ہم جانتے تھے کہ تم یہی جواب دو گے۔

پھر اس کی قبر ستر گز کشادہ کر دی جاتی ہے اور اسے روشن کر دیا جاتا ہے اور اس سے کہا جاتا ہے کہ سو جا۔ وہ کہتا ہے کہ میں اپنے اہل و عیال میں جا کر انھیں اس کی اطلاع دینا چاہتا ہوں، لیکن دونوں فرشتے کہتے ہیں کہ سو جا، جس طرح ایک دلہن سوتی ہے اور اسے صرف وہی جگاتا ہے جو اس کو سب سے زیادہ محبوب ہوتا ہے۔ اس کے بعد پھر اسے اللہ ہی قیامت کے دن اس کی قبر سے اٹھائے گا۔ اس کے برعکس اگر مرنے والا منافق ہوتا ہے تو وہ اپنے جواب میں کہتا ہے: مجھے نہیں معلوم، میں نے لوگوں کو کچھ کہتے سنا تھا وہی میں نے بھی کہہ دیا تھا۔ دونوں فرشتے کہتے ہیں: ہمیں معلوم تھا کہ تم اسی طرح کا جواب دو گے۔ پھر زمین کو حکم ہوتا ہے کہ اس کو دبوچ لے۔ چنانچہ وہ اسے اس طرح دبوچتی ہے کہ اس کی پسلیاں اِدھر سے اُدھر ہو جاتی ہیں۔ اس طرح وہ مسلسل عذاب میں مبتلا رہتا ہے، یہاں تک کہ اللہ اسے قیامت کے دن اس کی قبر سے اٹھا کھڑا کرے گا۔[1] اس حدیث میں اس کی پسلیوں کے باہم گتھم گتھا ہونے کا ذکر اس بات کو واضح کرتا ہے کہ بذاتِ خود بدن کو اس عذاب سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب مرنے والے کی موت کا وقت قریب آتا ہے تو سفید ریشمی کپڑا لے کر فرشتے حاضر ہوتے ہیں اور کہتے ہیں: کستوری کی پاکیزہ ترین خوشبو کی طرح باہر آ، چنانچہ اس کی روح باہر نکلتی ہے اور وہ اسے باہم ایک دوسرے کو پکڑاتے ہوئے سمائے دنیا کے دروازے پر پہنچتے ہیں۔ آسمان کے فرشتے کہتے ہیں: کیا ہی بہترین خوشبو ہے، یہ تمھارے پاس زمین سے کب آئی؟ فرشتے اس روح کو مومنوں کی ارواح میں لے جاتے ہیں۔ اس کی آمد سے انھیں اس سے کہیں زیادہ خوشی ہوتی ہے جتنی خوشی تمھیں کسی پردیسی کے آنے سے ہوتی ہے۔ وہ روحیں اس سے پوچھتی ہیں کہ فلاں کیسا ہے؟ پھر یہ بھی کہتی ہیں کہ اسے چھوڑو، وہ تو دنیاوی رنج و غم میں مبتلا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ وہ تو تمھارے پاس آچکا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ وہ اپنے ٹھکانے "ھاویہ" میں پہنچ چکا ہے۔ جب کافر کی موت کا وقت قریب آتا ہے تو عذاب کے فرشتے ایک ٹاٹ لے کر اس کے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں: اے روح! نکل اللہ کے عذاب کی طرف، اس حال میں کہ اللہ بھی تجھ سے ناراض ہے اور تو بھی اس سے خوش نہیں۔ چنانچہ وہ نکلتی ہے اور اس سے سڑی ہوئی لاش کی طرح بدبو آتی ہے، پھر اسے کفار کی ارواح کے پاس پہنچا دیتے

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٠٧١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٣٩١)

ہیں۔[1] اس حدیث کو امام نسائی اور بزار نے روایت کیا ہے اور مسلم نے اسے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مختصراً روایت کیا ہے۔ کافر کے پاس اس کی روح کی بدبو ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر ایک چادر پڑی ہوئی تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنی ناک پر رکھ کر اس کی بدبو کی کیفیت بیان فرمائی۔[2]

ابو حاتم نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب مومن کی موت کا وقت قریب آتا ہے تو رحمت کے فرشتے اس کے پاس آتے ہیں۔ پھر جب اس کی روح قبض کرتے ہیں تو اسے سفید ریشمی کپڑے میں رکھتے ہیں اور اسے لے کر سمائے دنیا کے دروازے پر پہنچتے ہیں۔ آسمان کے فرشتے کہتے ہیں کہ ہم نے آج تک اس سے بہترین خوشبو نہیں سونگھی۔ کہا جاتا ہے کہ اسے چھوڑ دو، تاکہ آرام کر لے، کیوں کہ وہ دنیاوی رنج وغم میں مبتلا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ فلاں کے ساتھ کیا ہوا اور فلاں عورت کے ساتھ کیا ہوا؟ اس کے برعکس جب فرشتے کافر کی روح قبض کرتے ہیں اور اسے زمین کی طرف لے جاتے ہیں تو زمین کے فرشتے کہتے ہیں کہ اس سے زیادہ بری بدبو ہم نے نہیں سونگھی۔ پھر فرشتے اس کی روح کو لے کر زمین کے نچلے طبقے میں پہنچا دیتے ہیں۔[3]

ان احادیث میں اور ان کی طرح دوسری احادیث میں بیان کیا گیا ہے کہ قبر کے ثواب یا عذاب میں روح اور بدن ساتھ ساتھ ہوتے ہیں۔ رہا اس بات کا سوال کہ کیا صرف تنہا روح کو بھی عذاب یا ثواب ہوتا ہے تو اس سلسلے میں بعض احادیث گزر چکی ہیں۔

کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مومن کی روح ایک پرندے کی شکل میں جنت کے درختوں سے کھاتی رہتی ہے، یہاں تک کہ قیامت کے دن اسے اس کے بدن میں لوٹا دیا جائے گا۔[4] اس حدیث کو امام نسائی نے روایت کیا ہے اور دو اماموں امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ نے بھی اس کی روایت کی ہے۔

ان نصوص نے واضح کر دیا کہ روح بھی اس بدن کے ساتھ جو قبر میں ہے ثواب پاتی ہے جب اللہ چاہتا ہے اور وہ تنہا جنت میں بھی ثواب سے ہم کنار ہوتی ہے۔ یہ دونوں باتیں حق ہیں۔

ابن ابی الدنیا نے "کتاب ذکر الموت" میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ روح کو چھوڑ دیا جاتا ہے وہ جہاں چاہتی ہے آتی جاتی ہے۔ یہ بات اس روایت کے مطابق ہے جس

---

[1] سنن النسائي، رقم الحديث (١٨٣٣) السلسلة الصحيحة (١٣٠٩)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٧٢)

[3] زوائد ابن حبان للهيثمي (ص: ١٨٦)

[4] سنن النسائي، رقم الحديث (٢٠٧٣) السلسلة الصحيحة (٩٩٥)

میں بیان کیا گیا ہے کہ روح بسا اوقات قبرستان کے میدان میں ہوتی ہے، جیسا کہ مجاہد کا قول ہے کہ روحیں تدفینِ میت کے بعد سات دنوں تک وہیں رہتی ہیں، اس سے الگ نہیں ہوتیں اور کبھی کبھی روح سوال و جواب کے علاوہ اوقات میں بھی بدن میں لوٹائی جاتی ہے، جیسا کہ اس حدیث میں ہے جس کو ابن عبدالبر نے صحیح قرار دیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جب بھی کوئی شخص کسی ایسے آدمی کی قبر سے ہو کر گزرتا ہے جسے دنیا میں وہ پہچانتا تھا اور وہ اسے سلام کرتا ہے تو اللہ اس کی روح اس کے بدن میں لوٹا دیتا ہے اور وہ سلام کا جواب دیتا ہے۔[1]

سنن ابی داود وغیرہ میں اوس بن اوس ثقفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''تمھارے لیے سب سے بہترین دن جمعے کا دن ہے، لہٰذا جمعے کے دن اور جمعے کی رات میں مجھ پر بہ کثرت درود بھیجا کرو، کیوں کہ تمھارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے۔ لوگوں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! ہمارا درود کیسے آپ پر پیش کیا جائے گا، جب کہ آپ کی ہڈیاں قبر میں بوسیدہ ہو چکی ہوں گی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ نے انبیائے کرام کے جسموں کا کھانا زمین کے لیے حرام کر دیا ہے۔''[2]

اس موضوع پر احادیث و آثار کی اتنی کثرت ہے کہ اس وقت ان کا احاطہ مشکل ہے۔ ان سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ جو جسم قبروں میں موجود ہیں، جب اللہ چاہتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے، ان کو عذاب اور ثواب ملتا ہے۔ روحیں بدن سے جدا ہونے کے بعد باقی رہتی ہیں، ان کو بھی عذاب اور ثواب ملتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے مردوں کو سلام کرنے کا حکم دیا ہے، جیسا کہ صحیح اور سنن میں ثابت ہے کہ نبی اکرم ﷺ اپنے اصحاب کو تعلیم دیا کرتے تھے کہ جب وہ قبروں کی زیارت کریں تو یہ کہیں: ''اے اہلِ ایمان کے گھر والو! تم پر اللہ کی سلامتی ہو، ہم بھی ان شاء اللہ تمھارے پاس آنے والے ہیں، اللہ تعالیٰ ان پر بھی رحم فرمائے، جو ہم میں سے یہاں پہلے آ چکے ہیں اور ان پر بھی جو بعد میں یہاں آئیں گے۔ ہم اپنے لیے بھی اور تمھارے لیے بھی اللہ تعالیٰ سے عافیت طلب کرتے ہیں۔ اے اللہ! ان کے اجر سے ہمیں محروم نہ رکھنا اور نہ ان کے بعد آزمائش میں مبتلا کرنا۔ ہماری بھی مغفرت فرما دے اور ان کی بھی۔''[3]

بہت سے لوگوں پر اس کا انکشاف ہوا ہے، یہاں تک کہ انھوں نے ان لوگوں کی آوازیں سنی ہیں جن کو ان کی قبروں میں عذاب دیا جا رہا ہے اور انھوں نے اپنی آنکھوں سے قبروں میں ان پر عذاب ہوتے دیکھا ہے۔ اس تعلق

---

[1] تهذيب تاريخ ابن عساكر (٢٩٢/٧) یہ حدیث ضعیف ہے، دیکھیں: السلسلة الضعيفة (٤٤٩٣)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٠٤٧) سنن النسائي، رقم الحديث (١٣٧٤) صحيح الجامع (٢٢٠٨)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٧٤، ٩٧٥) مگر "اللهم لا تحرمنا أجرهم ... الخ" کے الفاظ مسلم میں نہیں ہیں۔

سے بہت سے آثار معروف و مشہور ہیں، لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ بدن پر ہمیشہ اور ہر وقت عذاب ہو، بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ کبھی عذاب ہو اور کسی وقت عذاب نہ ہو۔

صحیحین میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتولینِ بدر کو تین دنوں تک چھوڑے رکھا۔ پھر آپ تشریف لائے اور ان کے سامنے کھڑے ہو کر فرمایا: اے ابوجہل بن ہشام! اے امیہ بن خلف! اے عتبہ بن ربیعہ! اے شیبہ بن ربیعہ! کیا تمھارے رب نے جو تم سے وعدہ کیا تھا، اس کو تم نے سچا نہیں پایا؟ میں نے اپنے رب کے کیے ہوئے وعدے کو سچا پایا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات سنی تو عرض کی: اے اللہ کے رسول! وہ کیوں کر سن سکیں گے، جب کہ ان کی لاشیں سڑ چکی ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں جو کچھ ان سے کہہ رہا ہوں، تم ان سے زیادہ اسے نہیں سنتے ہو۔ لیکن وہ جواب دینے کی سکت نہیں رکھتے۔[1] پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا اور ان سب کی لاشیں بدر کے کنویں میں پھینک دی گئیں۔

صحیحین میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بدر کے کنویں پر کھڑے ہوئے اور کہا: کیا تمھارے رب نے تم سے جو وعدہ کیا تھا، اسے تم نے سچ پایا؟ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اس وقت جو کچھ ان سے کہہ رہا ہوں وہ اسے سن رہے ہیں۔ اس بات کا ذکر جب عائشہ رضی اللہ عنہا سے کیا گیا تو انھوں نے فرمایا: ابن عمر رضی اللہ عنہما کو وہم ہوا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا: انھیں اب یہ بات معلوم ہو چکی ہو گی کہ میں جو کچھ ان سے کہا کرتا تھا وہ حق تھا۔ پھر انھوں نے اللہ کے اس قول کی تلاوت فرمائی:

﴿ اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى ﴾ [النمل: ۸۰] ''اے نبی! آپ مردوں کو نہیں سنا سکتے۔''

یہ آیت آخر تک انھوں نے پڑھی۔[2] ماہرینِ حدیث و سنت حضرات انس اور ابن عمر رضی اللہ عنہم کی حدیث کی صحت پر متفق ہیں، اگرچہ وہ دونوں حضرات غزوۂ بدر میں موجود نہیں تھے، کیوں کہ انس رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کو ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے اور ابوطلحہ رضی اللہ عنہ بدر میں شریک تھے، جیسا کہ ابو حاتم نے اپنی صحیح میں یہ حدیث انس رضی اللہ عنہ کے واسطے سے ابو طلحہ رضی اللہ عنہ سے بیان کی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے دن حکم دیا تھا کہ چودہ سردارانِ قریش کو بدر کے ایک کنویں میں ڈال دیا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ مبارکہ یہ تھی کہ جب کسی قوم پر فتح حاصل کرتے تھے تو ان کی سرزمین پر تین دنوں تک قیام کرتے تھے۔

جنگ کے تیسرے دن آپ نے سواریوں کو تیار کرنے اور ان پر ساز و سامان باندھنے کا حکم دیا۔ جب قافلہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٧٥٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٧٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٧٦٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٣٢)

روانہ ہوا تو نبی اکرم ﷺ چلے، آپ ﷺ کے اصحاب بھی پیچھے پیچھے روانہ ہوئے۔ لوگوں نے کہا: شاید آپ کسی ضرورت سے جا رہے ہیں، یہاں تک کہ آپ پانی کے کنویں کے کنارے تشریف لائے، پھر آپ مقتولینِ بدر کو ان کے باپوں کے ناموں سے آواز دینے لگے۔ اے فلاں بن فلاں! کیا تمھیں اب اچھا نہیں لگ رہا کہ اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے؟ ہمارے رب نے جو وعدہ کیا تھا ہم نے اس وعدے کو سچا پایا، کیا تم نے بھی اپنے ساتھ کیے گئے اپنے رب کے وعدے کو سچا پا لیا؟ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! جن جسموں میں روح نہیں ہے کیا آپ ان سے بات کر رہے ہیں؟ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، اسے تم ان سے زیادہ نہیں سن رہے۔

قتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: اللہ نے ان کو زندہ کر دیا اور انھیں سنا دیا۔ یہ ڈانٹنے، انھیں ذلیل کرنے، سزا دینے، حسرت اور ندامت کے لیے کیا گیا۔ عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کی تاویل کی ہے جس طرح انھوں نے بعض دوسری آیات کی تاویل کی ہے۔

نبی اکرم ﷺ سے جو نص صحیح ثابت ہو وہ آپ ﷺ کے صحابہ وغیرہ کی تاویل پر مقدم ہوگی۔ قرآن میں ایسی کوئی آیت نہیں ہے جس سے اس بات کی نفی ہوتی ہو۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: ﴿ اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى ﴾ ”اے نبی! (ﷺ) آپ مردوں کو نہیں سنا سکتے۔“ سے وہ عام سماع مراد ہے، جس سے سننے والے کو کوئی فائدہ ہو۔ یہ کفار کے لیے مثال پیش کی گئی ہے اور کفار آواز سنتے ہیں، لیکن اس طرح نہیں سنتے کہ اسے سن کر کوئی بات قبول کر سکیں اور اتباع کر سکیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَ مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً ﴾ [البقرة: ۱۷۱]

”جو لوگ کافر ہیں ان کی مثال اُس شخص کی سی ہے جو کسی ایسی چیز کو آواز دے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ سن نہ سکے۔“

یہی حال مردوں کا ہے جن کے لیے یہ مثال بیان کی گئی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ان سے عام اور خاص ہر قسم کے سماع کی نفی کی جائے۔ اسی طرح کفار سے بھی ہر قسم کے سماع کی نفی ضروری نہیں ہے، بلکہ ان سے صرف اس عام سماع کی نفی کی گئی ہے جو مفید ہو، رہا دوسرے قسم کا سماع تو اس کی نفی نہیں کی گئی ہے۔

صحیحین وغیرہ میں ثابت ہے کہ میت تدفین میں شریک لوگوں کے جوتوں کی آواز سنتی ہے جب وہ وہاں سے واپس آتے ہیں۔[1] یہ حدیث ہماری بات کے مطابق ہے۔ اس کا انکار کیسے کیا جا سکتا ہے؟ بعض علما کہتے ہیں کہ مردہ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۱۳۰۸) صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۸۷۰)

اپنی قبر میں جب تک مردہ ہے وہ کچھ نہیں سنتا ہے، جیسا کہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں اور انھوں نے قرآن سے استدلال کیا ہے، لیکن جب اللہ اسے زندہ کر دے تو وہ سنتا ہے جیسا کہ قتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اللہ نے یہ بات سننے کے لیے ان کو زندہ کر دیا تھا۔ اگر وہی حیات ہوتی تو نہیں سن پاتے، جس طرح ہم فرشتوں اور جنوں کو نہیں دیکھ سکتے اور سونے والا مردہ جو کچھ محسوس کرتا ہے، اس کا ہمیں علم نہیں ہے۔ اسی طرح ایک انسان دوسرے انسان کے دل کی بات کا علم نہیں رکھتا، اگرچہ بعض ایسے لوگ دل کی بات جان لیتے ہیں جن کو اللہ اس سے مطلع فرما دے۔

اس تفصیل سے شاید سائل کا مقصد پورا ہو جائے، اگرچہ اس کی شرح اور تفصیل کافی طویل ہے، لیکن یہ اس کا موقع نہیں ہے۔ سوال کے مطابق جو واضح دلائل ہم نے ذکر کیے ہیں، شاید اکٹھے کہیں نہ مل سکیں۔ واللہ أعلم

وصلی اللہ علی محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم[1]

روزِ قیامت کی زبان

سوال قیامت کے دن لوگوں کو کس زبان میں مخاطب کیا جائے گا؟ کیا اللہ تعالیٰ ان سے عرب کی زبان میں بات کرے گا؟ کیا یہ بات صحیح ہے کہ جہنمیوں کی زبان فارسی ہوگی اور جنتیوں کی زبان عربی ہوگی؟

جواب الحمد للہ رب العالمین. یہ معلوم نہیں ہے کہ اس دن لوگ کس زبان میں بات کریں گے اور نہ یہ معلوم ہے کہ وہ رب ذوالجلال کا خطاب کس زبان میں سنیں گے، کیوں کہ اللہ نے اس سلسلے میں ہمیں کوئی بات نہیں بتائی ہے اور نہ اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں کوئی خبر دی ہے۔ یہ بات بھی صحیح نہیں کہ فارسی جہنمیوں کی زبان ہو گی اور نہ یہ صحیح ہے کہ عربی ابدی نعمتوں میں رہنے والے جنتیوں کی زبان ہوگی۔ اس مسئلے میں صحابہ کے مابین ہمیں کسی اختلاف کا بھی علم نہیں ہے، بلکہ وہ سب اس مسئلے میں خاموش ہیں، کیوں کہ اس طرح کے مسائل میں زبان کھولنا فضول ہے۔ زمین کے باسیوں سے بھی اللہ نے کوئی بات اس سلسلے میں نہیں کہی ہے۔ یہ مسئلہ متاخرین کے یہاں زیرِ بحث آیا ہے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ قیامت کے دن لوگوں کو عربی زبان میں خطاب کیا جائے گا۔ بعض دوسرے حضرات کا خیال ہے کہ البتہ جہنمیوں کو فارسی زبان میں جواب دیا جائے گا اور جہنم میں ان کی یہی زبان ہوگی۔

ایک دوسرا گروہ کہتا ہے کہ ان کو سریانی زبان میں خطاب کیا جائے گا، کیوں کہ سریانی ہی حضرت آدم علیہ السلام کی زبان تھی اور اسی سے تمام زبانیں نکلی ہیں۔

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۸۲/٤-۲۹۹)

ایک تیسرے گروہ کا خیال ہے کہ صرف اہلِ جنت عربی زبان میں بات کریں گے، لیکن یہ سارے اقوال بے دلیل ہیں، ان اقوال کے قائلین کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ نہ کوئی عقلی دلیل ہے اور نہ نقلی، بلکہ یہ سب دلیل و ثبوت سے خالی محض دعوے ہیں۔ واللّٰہ سبحانه و تعالیٰ أعلم وأحکم[1]

میزان کا مفہوم

سوال میزان کا مطلب عدل و انصاف ہے یا واقعی ترازو کی طرح اس کے دو پلڑے ہوں گے؟

جواب میزان سے مراد وہ چیز ہے جس سے اعمال تولے جائیں گے، وہ عدل کے علاوہ ہے، جیسا کہ کتاب وسنت سے ثابت ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَٰزِينُهُۥ ﴾ [المؤمنون: ۱۰۲] ''جن کے عملوں کے ترازو بھاری ہوں گے۔''

پھر فرمایا:

﴿ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَٰزِينُهُۥ ﴾ [المؤمنون: ۱۰۳] ''جن کے عملوں کے ترازو ہلکے ہوں گے۔''

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَنَضَعُ الْمَوَٰزِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَٰمَةِ ﴾ [الأنبياء: ٤٧]

''اور ہم قیامت کے دن انصاف کے ترازو کھڑے کریں گے۔''

صحیحین میں حدیث ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: دو کلمے ہیں جو زبان پر انتہائی ہلکے ہیں، میزان میں بھاری ہوں گے اور رحمان کو بڑے پیارے ہیں اور وہ ہیں: « سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ، سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيمِ »[2]

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی دونوں پنڈلیوں کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا: دونوں میزان میں ہر کسی سے بھاری ہوں گی۔[3]

ترمذی وغیرہ میں حدیثِ بطاقہ ہے جسے امام ترمذی اور امام حاکم رحمہ اللہ وغیرہ نے صحیح قرار دیا ہے۔ یہ حدیثِ بطاقہ اس آدمی کے بارے میں ہے جسے قیامت کے دن لایا جائے گا۔ اس کے اعمال کے بڑے بڑے ننانوے رجسٹر کھولے جائیں گے۔ ہر ایک کی لمبائی تا حدِ نگاہ ہوگی۔ اسے ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا جائے گا۔ اس کے بعد اس کے پاس کاغذ کا ایک پرزہ لایا جائے گا، جس میں کلمہ شہادت ہوگا۔ نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ رجسٹروں والا پلڑا

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٤/٣٠٠۔٣٠١)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٠٤٣) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٩٤)

[3] مسند أحمد (١/١١٤، ٤٢١) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (٢٧٥٠، ٣١٩٢)

ہلکا پڑ جائے گا اور بطاقہ والا پلڑا بھاری ہو جائے گا۔[1]

کتاب وسنت کے یہ اور ان کے علاوہ دوسرے دلائل ثابت کرتے ہیں کہ اعمال میزانوں سے تولے جائیں گے، ان سے یہ معلوم ہوگا کہ برائیوں پر نیکیوں کا پلڑا بھاری ہے یا نیکیوں پر برائیوں کا پلڑا بھاری ہے۔ اسی سے عدل و انصاف ظاہر ہوگا۔ وزن کرنے کا مقصد عدل و انصاف ہے جس طرح دنیا کے میزان سے عدل و انصاف کیا جاتا ہے۔ رہا سوال قیامت کے موازین کی کیفیت کا تو یہ بھی دیگر غیب کی باتوں کی طرح ہے جن کی کیفیات کا ہمیں علم نہیں ہے۔[2]

قیامت کے دن کفار کا حساب

سوال کیا قیامت کے دن کفار کا حساب کتاب ہوگا یا نہیں؟

جواب امام احمد رحمہ اللہ کے متاخرین اصحاب وغیرہ نے اس مسئلے میں اختلاف کیا ہے۔ بعض حضرات، جیسے: ابوبکر عبدالعزیز، ابوالحسن تمیمی اور قاضی ابویعلیٰ وغیرہ کا خیال ہے کہ ان کا کوئی حساب کتاب نہیں ہوگا۔ اس کے برعکس امام احمد رحمہ اللہ کے اصحاب میں ابوحفص برمکی، ابوسلیمان دمشقی اور ابوطالب مکی کا نقطہ نظر ہے کہ ان کا حساب کتاب ہوگا۔

صحیح بات یہ ہے کہ حساب کتاب کا ایک مطلب کفار کے سامنے ان کے اعمال کا پیش کیا جانا اور اس پر ان کی زجر و توبیخ کرنا ہے اور اس کا دوسرا معنی نیکیوں اور برائیوں کا باہم موازنہ کرنا ہے۔ اگر کفار کے حساب کتاب کا مطلب پہلا ہے تو بلاشبہ اس اعتبار سے ان کا حساب کتاب ہوگا، لیکن اگر دوسرا معنی مراد ہے تو اس حساب کتاب سے اگر یہ سمجھا جا رہا ہے کہ کفار کی کچھ نیکیاں باقی ہوں گی جن کے بدلے وہ جنت کے مستحق ہوں گے تو اس کا غلط ہونا ظاہر ہے۔

لیکن اگر اس سے یہ سمجھا جا رہا ہے کہ وہ عذاب میں باہم ایک دوسرے سے متفاوت ہوں گے، جس کے گناہ سب سے زیادہ ہوں گے اس کو عذاب بھی سب سے زیادہ ملے گا اور جس کے پاس کچھ نیکیاں ہوں گی ان کے عذاب میں تخفیف ہوگی، جیسا کہ ابوطالب کو ابولہب کے مقابلے میں ہلکا عذاب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ ﴾ [النحل: ٨٨]

''جن لوگوں نے کفر کیا اور (لوگوں کو) اللہ کے رستے سے روکا ہم اُن کو عذاب پر عذاب دیں گے۔''

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٣٩) المستدرك للحاكم (٦/١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٣٠٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٣٥)

[2] مجموع الفتاویٰ (٣٠٢/٤)

﴿ إِنَّمَا النَّسِيٓءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ ﴾ [التوبة: ٣٧]

''امن کے کسی مہینے کو ہٹا کر آگے پیچھے کر دینا کفر میں اضافہ کرنا ہے۔''

جہنم کے کئی طبقات ہیں۔ جب بعض کافروں کو دوسرے کافروں کے مقابلے میں ان کے گناہوں کی کثرت اور نیکیوں کی کمی کے باعث سخت عذاب دیا جائے گا تو کفار کا حساب کتاب عذاب کے درجات کو بیان کرنے کے لیے ہوگا نہ کہ ان کو جنت میں داخل کرنے کے لیے۔[1]

اہلِ کبائر کی شفاعت اور جنت میں دخول

سوال کیا محمد ﷺ کی امت کے اہلِ کبائر کے سلسلے میں شفاعت قبول کی جائے گی اور کیا وہ جنت میں داخل ہوں گے یا نہیں؟

جواب اہلِ کبائر کی شفاعت کے سلسلے میں نبی اکرم ﷺ سے منقول احادیث ثابت اور متواتر ہیں۔ اس بات پر سلف صالحین صحابہ کرام، تابعین عظام اور ائمہ اسلام کا اتفاق ہے۔ اس میں خوارج اور معتزلہ وغیرہ میں سے اہلِ بدعت نے اختلاف کیا ہے۔

جہنم میں کوئی ایسا آدمی باقی نہیں رہے گا جس کے دل میں ذرہ برابر ایمان ہوگا، بلکہ ایسے تمام لوگ جہنم سے نکال لیے جائیں گے اور جنت میں داخل کر دیے جائیں گے، پھر بھی جنت میں جگہ خالی رہ جائے گی۔ پھر اللہ ایک دوسری مخلوق پیدا کرے گا اور اسے جنت میں داخل فرمائے گا، جیسا کہ صحیح حدیث میں نبی اکرم ﷺ سے ثابت ہے۔[2]

جنت کا وارث بننے کے بعد جہنم میں جانے کی صورت میں پہلے اعمالِ صالحہ کی حیثیت

سوال ایک آدمی ایسے اعمال کرتا ہے جن کے نتیجے میں اس کے لیے جنت میں محل بنا دیا جاتا ہے اور اس کے نام کے درخت لگا دیے جاتے ہیں، پھر وہ ایسے گناہ کرنے لگتا ہے جن کا لازمی نتیجہ جہنم ہے، اگر وہ جہنم میں داخل ہو گیا تو جنت میں اس کا نام کیسے رہے گا؟

جواب اگر ایسا انسان اپنے گناہوں سے سچی توبہ کر لیتا ہے تو اللہ بھی اس کو بخش دیتا ہے اور اس کو اس وعدے سے محروم نہیں کرتا جو اس نے اس سے کیا ہوتا ہے، بلکہ وہ سب کچھ اس کو عطا کرتا ہے۔ اگر وہ توبہ نہیں کرتا تو اس کی نیکیوں اور برائیوں کو تولا جائے گا، اگر اس کی نیکیاں برائیوں پر غالب آ گئیں تو وہ اہلِ ثواب سے ہوگا، اگر

---

1. مجموع الفتاویٰ (٣٠٥/٤۔٣٠٦)
2. صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٩٤٩) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٨٤٨) مجموع الفتاویٰ (٣٠٩/٤)

اس کی برائیاں اس کی نیکیوں سے زیادہ ہوگئیں تو وہ اہلِ عذاب سے ہوگا۔ ایسی صورت میں جو اس کا ثواب تیار کیا گیا تھا وہ ان برائیوں کی وجہ سے جو اس کی نیکیوں سے زیادہ ہوگئیں، مٹ جائے گا جس طرح انسان پہلے برائیاں کرتا ہے جن کی وجہ سے جہنم کا مستحق بن جائے گا۔ پھر نیکیاں کرنا شروع کر دے تو اس کی برائیاں مٹ جاتی ہیں۔ واللہ أعلم[1]

شہدا کی انواع اور ان کی سفارش

سوال ① کیا شہید اپنے گھر والوں میں سے چالیس افراد کی شفاعت کرے گا؟

② کیا شہید سات ہیں یا نو؟ اور کیا یہ سب شفاعت کریں گے؟

③ اگر شہید نافرمان ہو تو ان میں شمار ہوگا یا نہیں؟

④ اگر شہید پر قرض ہو یا اس نے کسی پر ظلم کیا ہو تو اس سے اس کا مطالبہ کیا جائے گا یا نہیں؟

جواب الحمد لله. جو اللہ کی راہ میں قتل ہو کر شہادت کے رتبے پر فائز ہو یہ وہ انسان ہوتا ہے جو اللہ کی راہ میں لڑتے ہوئے قتل ہو جاتا ہے، صبر کرتا ہے، ثواب کی امید رکھتا ہے، لڑائی میں آگے بڑھتا ہے اور منہ موڑ کر واپس نہیں بھاگتا، اس کی لڑائی اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے ہوتی ہے، کسی تعصب یا دنیاوی غرض وغیرہ کے لیے نہیں ہوتی، اس سے متعلق آیا ہے کہ یہ اپنے گھر والوں میں سے بہتر افراد کی سفارش کرے گا۔[2]

باقی دیگر شہدا بہت زیادہ ہیں، یہ بھی آیا ہے کہ وہ سات ہیں:[3]

1. پیٹ کی بیماری سے مرنے والا شہید ہے۔
2. ڈوب کر مرنے والا شہید ہے۔
3. دب کر مرنے والا شہید ہے۔
4. ذات الجنب کی بیماری سے مرنے والا شہید ہے۔
5. زچگی کے دوران میں مرنے والی عورت بھی شہید ہے۔

---

[1] جامع المسائل (٤/٣٣٥)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٦٦٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٧٩٩) السلسلة الصحيحة (٣٢١٣) ان میں بہتر (۷۲) کے بجائے ستر (۷۰) کا ذکر ہے۔

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣١١١) سنن النسائي، رقم الحديث (١٨٤٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٨٠٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٧٣٩)

اگر ان میں سے کوئی گناہ گار بھی ہو تو امید ہے کہ شہادت کی وجہ سے اس کا گناہ بخش دیا جائے گا، لیکن جو اس پر آدمیوں کے حقوق ہیں وہ اس پر قرض ہیں جن کو ادا کرنا ضروری ہے۔ واللہ أعلم [1]

جنت میں مومن بچوں اور بچیوں کی شادیاں

سوال کیا مومنوں کے بچے اسی حالت میں رہیں گے جس میں ان کی وفات ہوئی تھی؟ یا وہ بڑے ہوں گے اور شادیاں کریں گے؟ اسی طرح بچپن میں وفات پانے والی بچیاں بھی کیا شوہر والی ہوں گی؟

جواب الحمد للّٰه. جب وہ جنت میں جائیں گے تو اسی طرح جائیں گے جس طرح بڑے جائیں گے۔ ان کی صورتیں ان کے باپ آدم جیسی ہوں گی۔ لمبائی ساٹھ گز اور چوڑائی سات گز کی ہوگی اور وہ بھی اپنے بڑوں کی طرح شادیاں کریں گے۔

اسی طرح جن عورتوں کا نکاح نہیں ہوا تھا اور وہ وفات پا گئی تھیں تو وہ آخرت میں شادی کریں گی۔ اسی طرح جن مردوں کا انتقال بغیر شادی کیے ہوگیا تھا وہ بھی آخرت میں شادیاں کریں گے۔ واللہ تعالیٰ أعلم [2]

جنت میں سلسلۂ نسل اور غلمانِ جنت کی اصلیت

سوال کیا جنتیوں کے یہاں توالد و تناسل ہوگا، یعنی ان کے یہاں بچے پیدا ہوں گے؟ قرآن میں جو ''ولدان'' کا ذکر ہے کیا وہ جنتیوں کے ولدان (بچے) ہوں گے؟ اولاد کا اور جسم سے جدا ہونے والی جنتیوں اور جہنمیوں کی روحوں کا کیا حکم ہے، کیا وہ جنت میں نعمتوں سے سرفراز ہوں گی؟ یا اس وقت تک کسی خاص مقام پر رہیں گی جب اللہ ان کے جسم کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرے گا؟ ولدالزنا کا کیا حکم ہے، جب مر جائے تو کیا وہ اعراف والوں میں ہوگا یا جنتیوں میں ہوگا؟ مشرکین کی اولاد کے بارے میں صحیح حکم کیا ہے، کیا وہ جنتی ہوں گے یا جہنمی؟ کیا آخرت کے دنوں کے نام بھی دنیا کے دنوں کے ناموں، جیسے سنیچر اتوار وغیرہ ہوں گے؟

جواب وہ ''ولدان'' جو جنتیوں کے گرد خدمت کے لیے دوڑتے پھرتے ہوں گے، جنت کی مخلوق ہوں گے۔ وہ دنیا والوں کے بیٹے نہیں ہوں گے، بلکہ دنیا والوں کے بیٹے اگر جنت میں جائیں گے تو دوسرے جنتیوں کی طرح ان کی تخلیق مکمل ہوگی اور وہ آدم کی صورت میں تینتیس (۳۳) سال کے ہوں گے۔ ان کی لمبائی ساٹھ گز ہوگی۔ یہ روایت بھی بیان کی جاتی ہے کہ ان کی چوڑائی سات گز ہوگی۔

---

① جامع المسائل (٤/٢٤٠، ٢٤١)

② مجموع الفتاویٰ (٤/٣١٠)

مومنوں کی روحیں جنت میں ہوں گی اور کافروں کی روحیں جہنم میں ہوں گی۔ مومنوں کی روحیں نعمتوں سے لذت اندوز ہوں گی، جب کہ کافروں کی روحیں مبتلائے عذاب ہوں گی۔ یہاں تک کہ وہ اپنے جسموں کی طرف لوٹا دی جائیں۔

ولد الزنا اگر صاحبِ ایمان اور عملِ صالح والا ہے تو جنت میں جائے گا ورنہ دوسرے لوگوں کی طرح اسے بھی اپنے اعمال کی جزا یا سزا ملے گی۔ جزا اور سزا کی بنیاد عمل ہے نہ کہ نسب۔ ولد الزنا کی مذمت اس لیے کی گئی ہے کہ اس کے بارے میں زیادہ اندیشہ ہے کہ وہ برے کام کرے گا، جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے۔ اسی طرح بافضیلت نسب کی تعریف اس لیے کی گئی ہے کہ اس کے بارے میں غالب گمان یہی ہے کہ اس سے کارِ خیر سرزد ہوں گے۔ جب اعمال ظاہر ہوں تو اسی پر بدلہ ملے گا۔ اللہ کی نظر میں سب سے مکرم وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔

رہا سوال مشرکین کی اولاد کا تو اس کا صحیح ترین جواب وہ ہے جو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے، جیسا کہ صحیحین میں ہے کہ ہر پیدا ہونے والا بچہ اسلام کی فطرت پر پیدا ہوتا ہے ...الحدیث۔[1] رسول اکرم ﷺ سے پوچھا گیا کہ اے اللہ کے رسول! مشرکین کے جو بچے بچپن میں فوت ہو جاتے ہیں، ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کیسا عمل کرنے والے تھے۔[2] ان میں سے کسی متعین بچے کے بارے میں جنتی اور جہنمی ہونے کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ یہ روایت بھی بیان کی جاتی ہے کہ قیامت کے دن میدانِ حشر میں ان کا امتحان لیا جائے گا۔ اس وقت جو اللہ کی اطاعت کرے گا جنت میں جائے گا اور جو نافرمانی کرے گا وہ جہنم میں جائے گا۔[3]

صحیح احادیث سے یہ دلیل بھی ملتی ہے کہ ان میں سے بعض جنت میں جائیں گے اور بعض جہنم میں۔ جنت میں نہ سورج ہوگا نہ چاند، نہ دن ہوگا نہ رات، لیکن صبح اور شام کا علم اس نور سے ہوگا جو عرش کی طرف سے ظاہر ہوگا، واللہ أعلم[4]

جنت میں کھانے پینے کا ذکر اور منکر کا حکم

سوال اس آدمی کے بارے میں کیا خیال ہے جس سے جب کہا گیا کہ نبی اکرم ﷺ سے یہ حدیث منقول ہے کہ جنتی جنت میں کھائیں گے، پئیں گے اور اس کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوں گے تو اس نے جواب دیا کہ جو بھی کھاتا اور پیتا ہے وہ پیشاب پاخانہ بھی کرتا ہے۔ اس سے یہ بھی کہا گیا کہ جنت میں پرندے ہوں گے جب جنتی

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٢٩٣) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٥٨)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٣١٧) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٦٠)

[3] مسند أحمد (٢٤/٤) المعجم الکبیر (٨٤١) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (١٤٣٤)

[4] مجموع الفتاویٰ (٣١١/٤_٣١٢)

خواہش کریں گے تو وہ اس کھانے کی شکل میں ان کے سامنے آجائیں گے جو وہ چاہیں گے تو اس نے جواب دیا کہ یہ (فشار) بکواس ہے۔ اس بات کا انکار کرنے کی وجہ سے کیا وہ کافر ہو گیا اور اس کا قتل واجب ہے یا نہیں؟

جواب جنت میں کھانا پینا اللہ کی کتاب، اس کے رسول کی سنت اور مسلمانوں کے اجماع سے ثابت ہے۔ یہ دینِ اسلام کی بدیہیات میں سے ہے۔ اسی طرح اس میں کوئی شبہہ نہیں ہے کہ جنت میں پرندے اور محل ہوں گے، جیسا کہ اس کے اوصاف ان صحیح احادیث میں بیان کیے گئے ہیں جو نبی اکرم ﷺ سے ثابت ہیں۔ اسی طرح جنتی نہ پیشاب کریں گے نہ پاخانہ اور نہ وہ تھوکیں گے۔ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھنے والوں میں سے کوئی بھی اس کا مخالف نہیں ہے۔ اس مسئلے میں مخالف صرف دو لوگ ہو سکتے ہیں، کافر یا منافق۔

کافر جو اس کے مخالف ہیں، ان میں یہود و نصاریٰ جنت میں کھانے پینے اور نکاح کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جنتی سریلی اور خوش کن آوازوں اور روحوں کی نعمتوں کے ساتھ پاکیزہ روحوں سے لطف اندوز ہوں گے۔ اس عقیدے کے باوجود وہ اس کا اقرار کرتے ہیں کہ روحوں کے ساتھ جسموں کو اٹھایا جائے گا اور روحوں کے ساتھ ان کی نعمتیں بھی ہوں گی اور عذاب بھی ہو گا۔ جب کہ کافروں کے بعض دوسرے گروہ، جیسے صابیہ، فلاسفہ اور ان کے ہم خیال لوگ صرف روحوں کے حشر کے قائل ہیں اور وہ نعمت اور عذاب کو صرف روحوں تک محدود سمجھتے ہیں۔

کفار اور مشرکین وغیرہ کے بعض دوسرے گروہ کلی طور پر حشر (مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے) کے منکر ہیں، وہ نہ روح کے حشر کے قائل ہیں اور نہ جسم کے حشر کے۔ اللہ نے اپنی کتاب میں اپنے رسول کی زبان سے روحوں اور جسموں کے دوبارہ اٹھائے جانے کی بات واضح کر دی ہے اور کافروں اور ان میں سے کسی چیز کا انکار کرنے والوں کی مکمل تردید کر دی ہے۔

اس امت کے منافقین جو قرآن اور مشہور سنتوں کے الفاظ کا اقرار نہیں کرتے ہیں، وہ نصوصِ قرآن و سنت میں تحریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تمثیلات ہیں۔ ان کو اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ ہم روحانی معاد کو سمجھ سکیں۔ یہ لوگ ان باطنی قرامطہ کی طرح ہیں جن کا قول مجوس اور صابئہ سے ملتا جلتا ہے اور ان نام نہاد صابئ فلسفیوں کی طرح ہے جو خود کو اسلام کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ ادیب، طبیب، متکلم یا صوفی، جیسے ''رسائل اخوان الصفا'' کے مصنفین وغیرہ یا منافق کے مثل ہیں۔ اہلِ ایمان کا متفقہ فیصلہ ہے کہ یہ سب کے سب کافر ہیں، ان کا قتل واجب ہے۔ جناب محمد ﷺ نے اس مسئلے میں ہر طرح کے عذر ختم کر دینے والا شافی بیان فرما دیا ہے اور آپ ﷺ کی امت کے ہر خاص و عام کے نزدیک یہ تواتر سے ثابت ہے۔ بعض یہودیوں نے خاص اسی مسئلے میں نبی اکرم ﷺ سے مناظرہ کرتے ہوئے کہا کہ اے محمد! آپ کہتے ہیں کہ جنتی جنت میں کھائیں گے پییں گے اور جو بھی کھاتا پیتا ہے

اسے قضائے حاجت کی ضرورت ہوتی ہے؟ نبی اکرم ﷺ نے جواب دیا: ''جنتیوں کا پیشاب پاخانہ مشک کے چھڑکاؤ کی طرح ہوگا۔''[1]

ولی امر پر واجب ہے کہ جو اس کا منکر ہو اسے قتل کر دے، اگرچہ وہ اپنے الفاظ سے اس کی تصدیق کرتا ہو، پھر اس کا انجام تو زیادہ خطرناک ہے جو ان تمام باتوں کا منکر ہو۔ واللہ أعلم[2]

جنت میں کھانا پینا، مادی جسم، عیسیٰ علیہ السلام کی حیات و ممات اور دوبارہ نزول کی صورت میں شریعتِ محمدی کی پیروی

سوال کیا جنتی جنت میں کھائیں پئیں گے اور نکاح کریں گے اور دنیا کی طرح ان سے لذت اندوز ہوں گے؟ کیا بروز قیامت بعینہٖ یہی جسم اٹھائے جائیں گے؟ عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں یا مردہ؟ کیا جب دوبارہ ان کا نزول ہوگا تو محمد ﷺ کی شریعت کے مطابق حکم دیں گے یا اپنی پہلی والی شریعت کے مطابق یا پھر ان کے لیے کوئی نئی شریعت ظاہر ہوگی؟

جواب جنتی جنت میں کھائیں گے، پئیں گے اور نکاح کریں گے۔ ان تمام چیزوں سے وہ لطف اندوز بھی ہوں گے۔ اس بات پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے۔ اسی طرح کتاب و سنت بھی اس پر ناطق ہیں۔ اس کا انکار یہود و نصاریٰ نے کیا ہے۔ اسی جسم کو دوبارہ اٹھایا جائے گا، جیسا کہ کتاب و سنت میں بیان کیا گیا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ ہیں، ابھی ان کی وفات نہیں ہوئی ہے۔ جب وہ دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے تو وہ کتاب اور سنت ہی کے مطابق فیصلہ کریں گے، اس کی کسی بات کی مخالفت نہیں کریں گے۔ واللہ أعلم[3]

اصحابِ جنت و جہنم کے اعمال

سوال کون سے اعمال جنتیوں اور کون سے جہنمیوں والے ہیں؟

جواب الحمد للہ رب العالمین. ایمان اور تقویٰ اہلِ جنت کے اعمال سے ہیں اور کفر، نافرمانی اور گناہ اہلِ جہنم کے اعمال ہیں۔

---

[1] مسند أحمد (٤/٣٦٧، ٣٧١) اس میں مذکور قصے کے بغیر اس کی اصل صحیحین میں ہے۔ صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣١٤٩) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٨٣٤، ٢٨٣٥) صحیح الجامع (١٦٢٣)

[2] مجموع الفتاویٰ (٤/٣١٣۔٣١٥)

[3] مجموع الفتاویٰ (٤/٣١٦)

اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، کتابوں، رسولوں، آخرت کے دن اور تقدیر کی اچھائی یا برائی پر ایمان رکھنا، اللہ تعالیٰ کی توحید اور رسالتِ مآب ﷺ کی رسالت کی گواہی دینا، نماز قائم کرنا، زکات ادا کرنا، رمضان کے روزے رکھنا، بیت اللہ کا حج کرنا، اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کرنا گویا عابد اس کو دیکھ رہا ہو یا اگر یہ تصور ممکن نہ ہو تو دل میں یہ خیال ضرور رکھنا کہ وہ دیکھ رہا ہے، یہ سب جنتیوں والے اعمال ہیں۔

ان کے علاوہ سچ بولنا، امانت میں خیانت نہ کرنا، وعدہ پورا کرنا، والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، صلہ رحمی کرنا، پڑوسی کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا، یتیموں، مسکینوں، نوکروں اور جانوروں کے ساتھ بھی نیکی سے پیش آنا جنتیوں والے اعمال ہیں۔ اسی طرح توحیدِ خالص، اللہ تعالیٰ پر توکل کرنا، اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ محبت رکھنا، اللہ تعالیٰ سے ڈرنا، اس کی رحمت کی امید رکھنا، اس سے رجوع کرنا، اس کے فیصلے پر صبر کرنا، اس کی نعمت پر شکر کرنا، قرآن کریم کی تلاوت کرنا، اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا، اس سے دعا کرنا، اس سے مانگنا، اس کی طرف رغبت رکھنا، نیکی کا حکم دینا، برائی سے منع کرنا، اللہ تعالیٰ کی راہ میں کافروں اور منافقوں کے خلاف جہاد کرنا، جو قطع تعلقی کرے اس کے ساتھ بھی صلہ رحمی کرنا، جو نہ دے اس کو بھی دینا، جو ظلم کرے اس کو معاف کرنا، غصہ پی جانا، عفو و درگزر سے کام لینا، فراوانی اور تنگی میں خرچ کرنا، تمام امور میں اور تمام لوگوں کے ساتھ حتی کہ کافروں کے ساتھ بھی عدل سے پیش آنا۔ یہ اور ان جیسے دیگر اعمال اہلِ جنت کے اعمال ہیں۔

جہنمیوں کے اعمال درج ذیل ہیں: اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا، رسولوں کو جھٹلانا، کفر کرنا، حسد کرنا، جھوٹ بولنا، خیانت کرنا، ظلم کرنا، فحاشی میں مبتلا ہونا، دھوکا دینا، قطع تعلق کرنا، جہاد سے بزدلی دکھانا، بخل کرنا، ظاہر و باطن میں فرق ہونا، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید ہونا، اللہ تعالیٰ کی تدبیر سے بے خوف ہونا، مصیبتوں کے وقت رونا پیٹنا، آسایشوں کے وقت فخر و تکبر کرنا اور اکڑنا، فرائض چھوڑنا، اللہ تعالیٰ کی حدود پائمال کرنا، اس کی حرمتوں کی بے حرمتی کرنا، خالق کو چھوڑ کر مخلوق سے خوف کھانا، اس کو چھوڑ کر مخلوق سے امید لگانا اور اس کو چھوڑ کر مخلوق پر بھروسا کرنا، ریا کاری اور شہرت کے لیے عمل کرنا، کتاب و سنت کی مخالفت کرنا، خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی فرماں برداری کرنا، باطل اور جھوٹ کے لیے ہٹ دھرم بن جانا، اللہ تعالیٰ کی آیات کو مذاق بنانا، حق کا انکار کرنا، جس علم اور گواہی کو ظاہر کرنا ضروری ہو اس کو چھپانا، جادو ٹونے کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا، کسی کو ناحق قتل کرنا، یتیم کا مال کھانا، سود کھانا، میدانِ جنگ سے پشت پھیر کر بھاگ جانا اور باپردہ اور باعصمت ایمان دار عورتوں پر بہتان لگانا وغیرہ جہنمیوں کے اعمال ہیں۔

ان دونوں کی تفصیل ممکن نہیں، لیکن یہ ضابطہ ضرور ہے کہ اہلِ جنت کے تمام اعمال اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی فرماں برداری میں داخل ہیں اور جہنمیوں کے تمام اعمال اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی میں داخل ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿13﴾ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿14﴾ ﴾ [النساء: ١٣، ١٤]

''اور جو اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانے وہ اسے جنتوں میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان میں ہمیشہ رہنے والے اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے اور اس کی حدوں سے تجاوز کرے وہ اسے آگ میں داخل کرے گا، ہمیشہ اس میں رہنے والا ہے اور اس کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔'' واللّٰہ أعلم.[1]

•

[1] مجموع الفتاوی (١٠/٤٢٢_٤٢٤)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

خلفائے راشدین کی باہمی تفضیل اور مفضول کو فاضل پر فضیلت دینے کا حکم

سوال شیخ ابو محمد عبداللہ بن ابی زید کا اپنے تالیف کردہ عقیدہ میں یہ کہنا کہ تمام زمانوں سے بہتر زمانہ وہ ہے جس میں موجود لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا اور آپ ﷺ پر ایمان لائے۔ اس کے بعد ان حضرات کا زمانہ ہے جو پہلے زمانے سے متصل تھا اور پھر وہ لوگ ہیں جو اس دوسرے زمانے سے متصل تھے۔ تمام صحابہ میں سب سے افضل خلفاے راشدین مہدیین ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم ہیں۔ عمر رضی اللہ عنہ پر ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت کی کیا دلیل ہے؟ عثمان رضی اللہ عنہ پر عمر رضی اللہ عنہ کی فضیلت کی کیا دلیل ہے؟ علی رضی اللہ عنہ پر عثمان رضی اللہ عنہ کی فضیلت کی کیا دلیل ہے؟ جب یہ بات واضح ہوجائے تو کیا وہ شخص سزا کا مستحق ہے، جو کسی فاضل پر مفضول کو فضیلت دیتا ہے یا نہیں؟ اس مسئلے کو تفصیل سے بیان فرمائیں۔

جواب الحمد لله رب العالمين. ابوبکر رضی اللہ عنہ افضل ہیں، پھر عمر رضی اللہ عنہ افضل ہیں، پھر عثمان رضی اللہ عنہ افضل ہیں اور پھر علی رضی اللہ عنہ افضل ہیں۔ یہ بات صحابہ، تابعین اور تبع تابعین جو مسلمانوں کے امام اور علم اور دین میں جن کی امامت معروف ومشہور ہے، ان کے درمیان متفق علیہ ہے۔ یہی مسلک امام مالک، اہلِ مدینہ، لیث بن سعد، اہلِ مصر، اوزاعی، اہلِ شام، سفیان ثوری، ابوحنیفہ، حماد بن زید، حماد بن ابی سلمہ، اہلِ عراق میں ان کے جیسے حضرات کا ہے۔ امام شافعی، احمد، اسحاق، ابوعبید اور ان کے علاوہ دیگر ائمہ اسلام جن کی صداقت اور راست بازی امت میں تسلیم شدہ ہے، ان کا بھی یہی مسلک ہے۔ امام مالک نے تو اس مسئلے میں اہلِ مدینہ کا اجماع بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ میں نے اپنی مقتدیٰ شخصیات میں سے کسی کو نہیں پایا، جسے ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی تقدیم میں کوئی شک ہو۔

یہی بات امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے بھی مشہور ہے۔ صحیح بخاری میں محمد بن حنفیہ سے روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے اپنے والد محترم علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے پوچھا: اے اباجان! رسول اللہ ﷺ کے بعد تمام لوگوں میں سب سے بہتر کون تھا؟ فرمایا: میرے پیارے بیٹے! کیا تمھیں معلوم نہیں؟ میں نے عرض کی: نہیں۔ فرمایا: ابوبکر رضی اللہ عنہ۔ میں نے عرض کی: ان کے بعد؟ فرمایا: عمر رضی اللہ عنہ۔[1] علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے یہ روایت تقریباً اسی

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٦٨)

(۸۰) سندوں سے بیان ہوئی ہے۔ یہی بات آپ کوفے کے منبر سے فرمایا کرتے تھے، بلکہ آپ نے یہاں تک فرمایا تھا: میرے پاس اگر کوئی ایسا شخص لایا گیا جو مجھے ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما پر فضیلت دیتا ہو تو میں اس پر تہمت لگانے کی حد جاری کروں گا۔[1] علی رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق جو کوئی ان کو ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما سے افضل قرار دے تو اسے اسی کوڑے لگائے جائیں گے۔

سفیان فرمایا کرتے تھے کہ جس نے علی رضی اللہ عنہ کو ابوبکر رضی اللہ عنہ سے افضل قرار دیا، اس نے مہاجرین کی توہین کی اور میں نہیں سمجھتا کہ اس کا کوئی عمل اللہ تعالیٰ تک پہنچے گا اگر اس عقیدے پر قائم رہا۔ ترمذی وغیرہ میں یہ فضیلت بیان کی گئی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے علی! انبیا و رسل کو چھوڑ کر جنت میں اولین و آخرین میں جتنے بزرگ ہیں، یہ دونوں حضرات ان سب کے سردار ہیں۔[2] صحیحین وغیرہ میں ابوہریرہ، ابن عباس، جندب بن عبداللہ اور ابن زبیر رضی اللہ عنہم وغیرہ صحابہ کرام سے کئی ایک سندوں سے یہ حدیث ثابت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر میں زمین والوں میں سے کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بناتا، لیکن تمھارا ساتھی (نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ کا خلیل ہے۔[3]

صحیح میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر سے فرمایا: تمام لوگوں میں جس کی ہم نشینی اور دولت کا میرے اوپر سب سے زیادہ احسان ہے، وہ ابوبکر ہیں۔ اگر میں زمین والوں میں سے کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیل بناتا۔ لیکن تمھارا ساتھی اللہ کا خلیل ہے۔ سنو! ابوبکر کے سوا مسجد کی طرف جس کسی کے گھر کا جھروکا کھل رہا ہو، اسے بند کر دیا جائے۔[4] یہ حدیث بالکل واضح اور صریح ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں اہلِ زمین میں کوئی ایسا نہیں ہے جو خلیل بننے کا استحقاق رکھتا ہو اگر یہ ممکن ہوتا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیل بنتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ روے زمین پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ان سے زیادہ افضل کوئی نہیں تھا اور نہ آپ کی نظر میں کوئی ان سے زیادہ محبوب تھا۔ اسی طرح صحیح میں ہے کہ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے دریافت فرمایا: اے اللہ کے رسول! تمام انسانوں میں آپ کو سب سے زیادہ کون محبوب ہے؟ فرمایا: عائشہ رضی اللہ عنہا۔ پھر سوال کیا: مردوں میں کون زیادہ محبوب ہے؟ فرمایا: ان کے والد محترم۔[5]

اسی طرح صحیح میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: اپنے والد اور بھائی کو میرے پاس بلا دو، تاکہ میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے کوئی تحریر لکھ دوں، تاکہ میرے بعد لوگ ان سے اختلاف نہ کریں۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

[1] السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٨٢٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٨٨٢)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦٦٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٩٥، ١٠٠) السلسلة الصحيحة (٨٢٤)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث ٤٥٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨٢)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨٢)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٦٢)

فرمایا: اللہ اور اہلِ ایمان سوائے ابوبکر کے کسی پر راضی نہیں ہوں گے۔① صحیح میں ہے کہ ایک خاتون نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! اس وقت کیا کروں جب میں آؤں اور آپ ﷺ کو نہ پاؤں۔ (اس سے وہ آپ ﷺ کی وفات مراد لے رہی تھی) آپ ﷺ نے فرمایا: ابوبکر کے پاس آنا۔② سنن میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: میرے بعد ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی اقتدا کرنا۔③ صحیح میں ہے کہ ایک بار آپ ﷺ نے دورانِ سفر فرمایا: اگر قوم ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی اطاعت کرے گی تو رشد و ہدایت پر رہے گی۔④ سنن میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا گیا ہوں اور امت دوسرے پلڑے میں تو میرا پلڑا جھک گیا ہے۔ اس کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا گیا اور باقی ساری امت کو دوسرے پلڑے میں تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کا پلڑا جھک گیا ہے۔ پھر عمر رضی اللہ عنہ کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا گیا اور امت کو دوسرے پلڑے میں تو عمر رضی اللہ عنہ کا پلڑا جھک گیا ہے۔⑤

صحیح میں ہے کہ ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے درمیان کوئی بات ہوگئی۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عمر رضی اللہ عنہ سے مطالبہ کیا کہ ان کے لیے دعاے مغفرت کریں، لیکن عمر رضی اللہ عنہ نے نہیں کیا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کے پاس آئے اور ماجرا سنایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اے ابوبکر! بیٹھ جائیے، اللہ آپ کی مغفرت فرمائے گا۔ یہ دیکھ کر عمر رضی اللہ عنہ کو بڑی پشیمانی ہوئی اور وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے، لیکن وہاں وہ موجود نہیں تھے۔ پھر نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت نبی اکرم ﷺ سخت ناراض ہوئے اور فرمایا: اے لوگو! میں تمھارے پاس آیا اور میں نے کہا کہ میں اللہ کا رسول ہوں، لیکن تم نے مجھے جھٹلا دیا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے میری تصدیق کی۔ کیا تم میرے ساتھی کو میرے لیے چھوڑ سکتے ہو؟ کیا تم میرے ساتھی کو میرے لیے چھوڑ سکتے ہو؟ کیا تم میرے ساتھی کو میرے لیے چھوڑ سکتے ہو؟⑥ اس کے بعد پھر ان کو کوئی ایذا نہیں پہنچائی گئی۔ صحیح اور سنن میں تواتر سے ثابت ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب بیمار ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حکم دو کہ وہ نماز میں لوگوں کی امامت کریں۔ یہ بات آپ نے دو یا تین بار دہرائی۔ آگے اسی حدیث میں آپ نے فرمایا: تم یوسف علیہ السلام والی عورتیں ہو! ابوبکر کو حکم دو وہ نماز پڑھائیں۔⑦

---

① صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨٧)

② صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٢٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨٦)

③ سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦٦٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٩٧) السلسلة الصحيحة (١٢٣)

④ صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٨١)

⑤ مسند أحمد (٧٦/٢) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٣٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٢٨٧) صحيح الجامع (٦٨٨٢)

⑥ صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٦١)

⑦ صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤١٨)

حضرات عمر، عثمان، علی رضی اللہ عنہم وغیرہ کی موجودگی میں تمام صحابہ کی امامت کے لیے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو آگے بڑھانا اور اس کی تخصیص اور بار بار تاکید کرنا اس نے امت کے لیے یہ واضح کر دیا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں دوسروں سے مقدم ہیں۔ صحیح میں ہے کہ جب عمر رضی اللہ عنہ کا جنازہ رکھا گیا تو علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ صفیں چیرتے ہوئے تشریف لائے اور فرمایا: ''مجھے امید ہے کہ اللہ آپ کو آپ کے دونوں ساتھیوں کا ساتھ نصیب فرمائے گا، کیوں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے بہت بار یہ الفاظ سنے ہیں: میں، ابوبکر اور عمر داخل ہوئے، میں نکلا اور ابوبکر وعمر نکلے اور میں گیا اور ابوبکر وعمر گئے۔''[1] علی رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد واضح کرتا ہے کہ ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما دونوں حضرات کہیں داخل ہونے، باہر نکلنے اور جانے کے معاملے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ رہا کرتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ جب ہارون رشید نے امام مالک سے کہا: اے ابوعبد اللہ! مجھے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے مقام ومرتبے سے واقف کرائیں۔ امام مالک رحمہ اللہ نے جواب میں فرمایا: اے امیر المومنین! نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں دونوں کا مقام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں وہی تھا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہے۔ یہ جواب سن کر ہارون رشید نے کہا: اے امام مالک! آپ نے میری تشفی فرما دی۔ یہ بات واضح کرتی ہے کہ ان دونوں حضرات کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص صحبت حاصل تھی، دونوں آپ کے احکام بجا لاتے تھے اور راز دار تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اور اپنے صحابہ کے ساتھ آپ کے طرزِ عمل سے جو اچھی طرح واقفیت رکھتا ہے، اسے یہ تمام باتیں بدیہی طور پر معلوم ہیں۔

وہ اہلِ علم جنھیں آپ کی سیرت، سنت اور اخلاق کا علم ہے، اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کرتے۔ ان کی نفی یا ان کے بارے میں توقف وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملات کا علم نہیں رکھتے، خواہ علمِ کلام، فقہ اور ریاضی وغیرہ میں ان کو مہارت حاصل ہو یا جس نے ایسی جھوٹی روایتیں سن رکھی ہیں جو خواص اہلِ علم کے نزدیک بدیہی معلومات سے متعارض ہیں تو وہ اس مسئلے میں توقف کا رویہ اپناتا ہے یا ابوبکر رضی اللہ عنہ پر دوسرے کو ترجیح دیتا ہے۔

یہ مسئلہ بھی ان مسائل میں سے ایک ہے جو سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے واقفیت رکھنے والے اہلِ علم کے یہاں بدیہی طور پر معلوم ہے، خواہ دوسرے لوگ اس میں شک کریں یا اس کی نفی کریں، جیسے سنت کا علم رکھنے والوں کے نزدیک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت، آپ کا حوضِ کوثر، کبیرہ گناہوں کے مرتکبین کا جہنم سے نکالا جانا، اسی طرح صفاتِ الٰہیہ، تقدیر، علو باری تعالیٰ اور اللہ کی رؤیت وغیرہ اساسیاتِ اسلام، جن پر سنت کا علم رکھنے والوں کا اتفاق ہے اور ان کے سلسلے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٨٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨٩)

میں متواتر احادیث موجود ہیں، اگرچہ دوسروں کو اس کا علم نہیں ہے۔ اسی طرح خواص اہلِ علم کے یہاں حق شفعہ، مدعیٰ علیہ کا قسم کھانا، شادی شدہ کا رجم کیا جانا، سرقہ میں نصاب کا اعتبار وغیرہ کے احکام تواتر سے ثابت ہیں جن میں بعض اہلِ بدعت اختلاف کرتے ہیں۔

اسی لیے ائمہ اسلام اس شخص کو بدعتی قرار دینے پر متفق ہیں، جو اس طرح کے اصولوں کی مخالفت کرتا ہے۔ اس کے برعکس جن اجتہادی مسائل کی احادیث اس درجہ تواتر کو نہیں پہنچی ہیں، جیسے گواہ اور قسم کے ذریعے فیصلہ کرنا، قسامہ کا مسئلہ، قرعہ اندازی وغیرہ میں اختلاف کرنے والے کو بدعتی قرار نہیں دیتے۔

عثمان رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ کے درمیان باہمی تفضیل کا مسئلہ اس سے کم تر درجے کا ہے۔ اس مسئلے میں اہلِ علم کے یہاں اختلاف ہے۔ سفیان ثوری اور اہلِ کوفہ کی ایک جماعت نے علی رضی اللہ عنہ کو عثمان رضی اللہ عنہ سے افضل قرار دیا ہے لیکن سفیان ثوری وغیرہ نے اپنے اس موقف سے بعد میں رجوع کرلیا تھا۔ بعض اہلِ مدینہ عثمان اور علی رضی اللہ عنہما کے بارے میں توقف کرتے تھے۔ امام مالک رحمہ اللہ سے بھی ایک روایت یہی ملتی ہے، لیکن دوسری روایت کے مطابق وہ علی رضی اللہ عنہ پر عثمان رضی اللہ عنہ کو مقدم کرتے تھے، جیسا کہ دیگر تمام ائمہ امام شافعی، امام ابوحنیفہ، ان کے اصحاب اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ وغیرہ ائمہ اسلام کا نقطہ نظر ہے۔

ان ائمہ اسلام کے یہاں اس بات پر اختلاف ہے کہ جو شخص علی رضی اللہ عنہ کو عثمان رضی اللہ عنہ پر مقدم کرتا ہے کیا اس کا شمار اہلِ بدعت میں ہوگا یا نہیں؟ اس مسئلے میں دو قول ہیں اور دونوں طرح کی روایات امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے منقول ہیں۔ ایوب سختیانی، احمد بن حنبل اور امام دارقطنی رحمہم اللہ فرماتے ہیں: جس نے علی رضی اللہ عنہ کو عثمان رضی اللہ عنہ پر مقدم کیا اس نے مہاجرین اور انصار کی توہین کی۔ یہ ایوب اہلِ سنت کے امام اور اہلِ بصرہ کے بھی امام ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ نے ان سے موطا میں روایت نقل کی ہے۔ وہ اہلِ عراق سے روایت نہیں لیتے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب ان سے ایوب سے روایت کرنے کے مسئلے پر پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا: میں جس کسی سے بھی تم سے روایت بیان کروں گا تو ایوب اس سے افضل ہوں گے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے ایوب کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: میں نے انھیں مسجدِ نبوی میں ایک جگہ بیٹھے ہوئے دیکھا ہے۔ جب بھی انھیں یاد کرتا ہوں میرے بدن پر لرزہ طاری ہوجاتا ہے۔

اس مسئلے میں دلیل وہ حدیث ہے جو صحیحین وغیرہ میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہم عہدِ رسالت میں افضلیت کے سلسلے میں کہا کرتے تھے کہ ابوبکر، پھر عمر اور پھر عثمان رضی اللہ عنہم۔[1] اسی روایت کی بعض سندوں میں ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع پہنچتی تھی، لیکن آپ اس سے منع نہیں فرماتے تھے۔[2]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٥٥)

[2] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباري (٢٠/٧) میں اسے امام طبرانی رحمہ اللہ کی طرف منسوب کیا ہے۔

مزید یہ کہ صحیح سند سے صحیح بخاری اور دوسری کتبِ احادیث میں منقول ہے کہ امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے جب خلیفہ کے انتخاب کے لیے چھے صحابہ کرام: عثمان، علی، طلحہ، زبیر، سعد اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہم کی مجلسِ شوری قائم کی تو اس میں سعید بن زید کو جو عشرہ مبشرہ میں سے تھے اور آپ کے قبیلے بنو عدی سے تعلق رکھتے تھے، شامل نہیں کیا اور اپنے بیٹے عبداللہ کے بارے میں فرمایا: آپ کے ساتھ عبداللہ شامل رہیں گے، لیکن خلافت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔[1] آپ نے وصیت فرمائی کہ جب تک کسی ایک پر لوگوں کا اتفاق نہ ہو جائے اس وقت تک صہیب رضی اللہ عنہ نماز کی امامت فرمائیں گے۔

جب عمر رضی اللہ عنہ کی وفات ہوگئی تو یہ حضرات منبرِ رسول کے پاس جمع ہوئے۔ طلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اس معاملے میں جو اختیار مجھے حاصل ہے، میں اسے عثمان رضی اللہ عنہ کو تفویض کرتا ہوں۔ زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا: اس معاملے میں جو اختیار مجھے حاصل ہے، میں اسے علی رضی اللہ عنہ کو تفویض کرتا ہوں۔ سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: اس معاملہ میں جو اختیار مجھے حاصل ہے، میں اسے عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو تفویض کرتا ہوں۔ اس طرح تین شخصیات نے خلافت سے دست برداری کا اعلان کر دیا، باقی رہیں تین شخصیات۔ پھر یہ تینوں حضرات جمع ہوئے۔ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا: میں خلافت کی دعوے داری سے خود کو باہر کرتا ہوں۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے فرمایا: مجھ پر اللہ نے یہ ذمے داری ڈالی ہے اور میں اللہ سے وعدہ کرتا ہوں کہ خلیفہ اسے بناؤں گا جو دونوں میں افضل ہوگا۔ اس کے بعد اگلے تین دنوں تک وہ مہاجرین، انصار، تابعین عظام، امہات المومنین، مختلف شہروں کے امرا جنھوں نے عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حج کیا تھا اور جو مدینے میں ان کی شہادت کے موقع پر موجود تھے، مشورہ کرتے رہے۔ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: تین دنوں تک میں ذرا بھی نہیں سویا ہوں۔ پھر تیسرے دن انھوں نے عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا: آپ کو اللہ کی قسم دلاتا ہوں اور یہ وعدہ چاہتا ہوں کہ کیا اگر میں آپ کو خلیفہ بنا دوں تو آپ عدل و انصاف سے کام کریں گے اور اگر میں علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنا دوں تو آپ ان کی سمع و طاعت بجا لائیں گے؟ انھوں نے جواب دیا: ہاں۔ اس کے بعد انھوں نے علی رضی اللہ عنہ سے کہا: آپ کو اللہ کی قسم دلاتا ہوں اور یہ وعدہ چاہتا ہوں کہ کیا اگر میں آپ کو خلیفہ بنا دوں تو آپ عدل و انصاف سے کام کریں گے اور اگر میں عثمان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنا دوں تو آپ ان کی سمع و طاعت بجا لائیں گے؟ انھوں نے جواب دیا: ہاں۔ اس کے بعد عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے دیکھا ہے کہ لوگ عثمان رضی اللہ عنہ کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے۔ یہ سن کر علی، عبدالرحمٰن بن عوف اور تمام مسلمانوں نے بغیر کسی لالچ یا خوف کے پوری رضامندی کے ساتھ عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٩٧)

عثمان رضی اللہ عنہ کو علی رضی اللہ عنہ پر مقدم کرنے کے سلسلے میں یہ ان حضرات کا اجماع ہے۔ اسی لیے ایوب، امام احمد بن حنبل اور امام دارقطنی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جس نے علی رضی اللہ عنہ کو عثمان رضی اللہ عنہ پر مقدم کیا، اس نے مہاجرین اور انصار کی توہین کی، کیوں کہ اگر عثمان تقدیم کا استحقاق نہیں رکھتے تھے، اس کے باوجود انھوں نے ان کو مقدم کر دیا تو صرف دو ہی صورت ہو سکتی ہے یا تو وہ علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت سے جاہل تھے یا پھر ظالم تھے کہ بغیر کسی دینی ترجیح کے ایک غیر افضل کو افضل بنا دیا۔ ظاہر ہے کہ جہل اور ظلم کی نسبت جو بھی مہاجرین اور انصار کی طرف کرے گا وہ ان کی اہانت ہی کا مرتکب ہوگا۔

اگر کوئی یہ گمان کرتا ہے کہ انھوں نے عثمان رضی اللہ عنہ کو اس لیے مقدم کر دیا، کیوں کہ ان میں سے بعض کے دلوں میں علی رضی اللہ عنہ کے تعلق سے کینہ تھا اور یہ کینہ رکھنے والے لوگ طاقت و شوکت میں آگے تھے اور اسی طرح کی دوسری اور باتیں جو ہوا پرستوں نے وضع کر رکھی ہیں۔ وہ ان کی جانب یہ بات منسوب کر رہے ہیں کہ وہ حق قائم کرنے سے عاجز رہ گئے تھے اور ان کے اندر جو ظالم تھے وہ اہلِ حق پر غالب آ گئے تھے۔ یہ ان کا وہم ہے، کیوں کہ یہ وہ دور تھا کہ جب وہ سب پر غالب تھے اور سب سے زیادہ قوی تھے۔ عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت اہلِ اسلام کو جو قوت، اقتدار، غلبہ، اتحاد اور باہمی الفت و محبت حاصل تھی وہ ان کو کبھی حاصل نہیں ہوئی۔ عمر رضی اللہ عنہ نے اہلِ ایمان کو آخری حد تک غالب کر دیا تھا اور اسی طرح اہلِ کفر و نفاق کو آخری حد تک ذلیل و رسوا کر دیا تھا۔ عہدِ خلافتِ راشدہ کے حالات و واقعات سے واقفیت رکھنے والے کسی صاحبِ علم سے یہ حقائق مخفی نہیں ہیں۔

اس طرح کے مسائل اور حالات میں جو انھیں جاہل، ظالم یا حق کے نفاذ میں عاجز بتائے تو وہ ان کی توہین ہی کر رہا ہے اور جن حضرات کے خیر امت ہونے کی شہادت اللہ دے رہا ہے، وہ اللہ کی شہادت کو رد کرنے کا مرتکب ہو رہا ہے۔

یہ ہے رافضیوں کے مذہب کی حقیقت۔ جس شخص نے اس مذہب کا آغاز کیا وہ اصلاً یہودی تھا، نفاق کے طور پر اس نے اسلام ظاہر کیا اور جاہلوں کے سامنے مکر و فریب کی ایسی چالیں چلیں کہ ان سے ایمان کی اصل ہی متزلزل ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رافضیت، نفاق اور بے دینی کا سب سے بڑا دروازہ ہے۔ پہلے آدمی توقف اختیار کرتا ہے، پھر علی رضی اللہ عنہ کو سب سے افضل قرار دینے لگتا ہے، اس کے بعد بدزبان بن جاتا ہے پھر غالی بن جاتا ہے اور پھر آخر میں اسلام کا منکر بن کر شریعت کو معطل کر دیتا ہے۔ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ رافضیت میں بے دینوں کے سرغنہ، جیسے اسماعیلیہ، نصیریہ، ان کی بعض شاخیں، جیسے باطنی قرامطہ، درزیہ اور ان کی طرح کے بے دینوں اور منافقین کے گروہ ضم ہوتے گئے۔

خیر القرون کے وہ اصحاب جو صحبتِ نبوی سے فیض یاب ہوئے، ان پر طعنہ زنی خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر طعنہ زنی ہے، جیسا کہ امام مالک وغیرہ ائمہ علم نے کہا ہے: انھوں نے اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا ہے، تا کہ کوئی

بد باطن کہہ سکے کہ ایک برے آدمی کے یہ برے ساتھی تھے۔ اگر وہ صالح ہوتا تو اس کے اصحاب بھی صالح ہوتے۔

مزید یہ کہ یہی وہ حضرات ہیں جنھوں نے قرآن کو نقل کیا ہے، اسلام کو پہنچایا ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں کی روایت کی ہے، بلکہ انھوں نے ہی علی رضی اللہ عنہ وغیرہ کے فضائل نقل کیے ہیں، ان پر طعنہ زنی سے لازم آتا ہے کہ جو دین انھوں نے نقل کیا ہے، اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی صورت میں نہ علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت ثابت ہو سکتی ہے اور نہ کسی دوسرے کی۔ رافضی جاہل ہیں، عقل نام کی کوئی چیز ان کے اندر نہیں ہے، نہ وہ نقل صحیح اور دین صحیح کے حامل ہیں اور نہ کامیاب و کامران دنیا ہی ان کے پاس ہے۔ اگر ان سے کوئی ناصبی جو علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتا ہے، ان کے فاسق اور کافر ہونے کا عقیدہ رکھتا ہے، جیسے خوارج وغیرہ، یہ مطالبہ کر بیٹھے کہ علی رضی اللہ عنہ کا مومن ہونا اور ان کا صاحبِ فضیلت ہونا ثابت کریں تو وہ ثابت نہیں کر سکتے، بلکہ خوارج ان پر غالب آجائیں گے، کیوں کہ علی رضی اللہ عنہ کے فضائل بھی تو صحابہ کرام ہی نے نقل کیے ہیں جن پر روافض طعنہ زنی کرتے ہیں۔ ان کے ذریعے علی رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ فضیلت پر کیسے یقین کیا جا سکتا ہے۔ جب وہ بعض خلفاے راشدین پر طعنہ زنی کریں گے اور ان پر یہ الزام عائد کریں گے کہ انھوں نے ریاست اور حکومت کا مطالبہ کیا اور اس کے لیے جنگ کی تو یہی الزام علی رضی اللہ عنہ پر خوارج بھی تو عائد کرتے ہیں۔ علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں دوسرے خلفا کا حال تو یہ ہے کہ ان کی اطاعت بغیر کسی جدال و قتال کے کی گئی ہے، لیکن اس کو کیا کیجیے کہ روافض کی سمجھ میں بات نہیں آتی، کیوں کہ وہ جہالت میں ڈوبے ہوئے ہیں اور زنادقہ کے پیروکار بنے ہوئے ہیں۔

قرآن نے ایک سے زیادہ مقامات پر صحابہ کرام کی تعریف کی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ﴾ [التوبة: ١٠٠]

”جن لوگوں نے سبقت کی (یعنی سب سے) پہلے (ایمان لائے) مہاجرین میں سے بھی اور انصار میں سے بھی اور جنھوں نے نیکو کاری کے ساتھ اُن کی پیروی کی اللہ اُن سے خوش ہے اور وہ اللہ سے خوش ہیں۔“

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ﴾ [الحديد: ١٠]

”جس شخص نے تم میں سے فتح (مکہ) سے پہلے خرچ کیا اور لڑائی کی وہ (اور جس نے یہ کام پیچھے کیے وہ) برابر نہیں ان لوگوں کا درجہ ان لوگوں سے کہیں بڑھ کر ہے جنھوں نے بعد میں خرچ (اموال) اور

(کفار سے) جہاد و قتال کیا اور اللہ نے سب سے (ثواب) نیک (کا) وعدہ تو کیا ہے۔"

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ﴾ [الفتح: ۲۹]

"محمد (ﷺ) اللہ کے پیغمبر ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں کے حق میں تو سخت ہیں اور آپس میں رحم دل (اے دیکھنے والے!) تو ان کو دیکھتا ہے کہ (اللہ کے آگے) جھکے ہوئے سربسجود ہیں اور اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی طلب کر رہے ہیں (کثرتِ) سجود کے اثر سے ان کی پیشانیوں پر نشان پڑے ہوئے ہیں ان کے یہی اوصاف تورات میں (مرقوم) ہیں اور یہی اوصاف انجیل میں ہیں (وہ) گویا ایک کھیتی ہیں جس نے (پہلے زمین سے) اپنی سوئی نکالی پھر اس کو مضبوط کیا پھر موٹی ہوئی اور پھر اپنی نال پر سیدھی کھڑی ہوگئی اور لگی کھیتی والوں کو خوش کرنے تاکہ کافروں کا جی جلائے۔"

اسی سورت میں ذرا پہلے فرمایا ہے:

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا﴾ [الفتح: ۱۸]

"(اے پیغمبر!) جب مومن تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے تو اللہ ان سے خوش ہوا اور جو (صدق و خلوص) ان کے دلوں میں تھا وہ اس نے معلوم کر لیا تو ان پر تسلی نازل فرمائی اور انھیں جلد فتح عنایت کی۔"

صحیح مسلم میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: "درخت کے نیچے جن حضرات نے بیعت کی تھی ان میں سے کوئی بھی جہنم میں نہیں جائے گا۔"[1] صحیحین میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "میرے صحابہ کو گالی نہ دو۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تم اگر احد پہاڑ کے برابر سونا بھی راہِ خدا میں خرچ کر دو، پھر بھی اجر و ثواب میں ان کے ایک مد یا نصف مد کے برابر بھی نہیں پہنچ گا۔"[2] صحیح میں یہ حدیث کئی سندوں سے موجود ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: "سب سے بہترین زمانہ وہ ہے جس میں میری بعثت ہوئی، اس کے بعد وہ لوگ ہیں جو میرے زمانے سے متصل ہیں اور پھر وہ لوگ ہیں جو دوسرے زمانے سے متصل ہیں۔"[3]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٩٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٧٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٤٠_٢٥٤١)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٩٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٣٣_٢٥٣٦)

یہ مشہور، بلکہ متواتر احادیث صحابہ کرام کے فضائل بیان کرتی ہیں، ان کی تعریف ان میں کی گئی ہے اور یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ ان کا زمانہ بعد کے زمانوں سے بہتر ہے۔ ان پر طعنہ زنی کا مطلب ہے کہ قرآن اور سنت کو مطعون کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض حضرات نے روافض کی تکفیر پر گفتگو کی ہے جس کی تفصیل میں نے کسی دوسرے مقام پر بیان کی ہے۔ واللہ سبحانه وتعالیٰ أعلم[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلافت کا زیادہ حق دار قرار دینے والے کا حکم

سوال ایک شخص کا کہنا ہے کہ حضرت علی، حضرت ابوبکر وعمر سے زیادہ خلافت کا حق رکھتے تھے اور ان دونوں نے ان کو دبا کر اور ان پر غلبہ پا کر خلافت پر قبضہ جمایا تھا، کیا اس کی یہ بات درست ہے یا غلط؟ نیز ایسا نظریہ رکھنے والے کا کیا حکم ہے؟

جواب الحمد لله رب العالمين. یہ بات کہنے والا غلط، بدعتی اور گمراہ ہے اور کتاب وسنت اور سابقین اولین، مہاجرین وانصار صحابہ اور تابعین کے اجماع کا مخالف ہے، بلکہ کھلا افترا پرداز ہے اس کی بات کا جھوٹ ہونا متواتر روایات اور دیگر دلائل سے حاصل ہونے والے یقینی اور بدیہی علم سے ثابت ہو جاتا ہے۔

ایوب سختیانی، احمد بن حنبل اور دارقطنی وغیرہم کا کہنا ہے: ”جس انسان نے حضرت علی کو حضرت عثمان پر مقدم قرار دیا، اس نے مہاجرین وانصار پر انگلی اٹھائی، تو جو ان کو حضرت ابوبکر وعمر پر مقدم کہتا ہے اس سے متعلق ان کے کتنے سخت الفاظ ہو سکتے ہیں؟ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کو تنقید کا نشانہ بنانے والا ان کے نزدیک مہاجرین و انصار پر انگلی اٹھانے والا ہے تو ابوبکر وعمر کی خلافت کو نشانۂ عیب بنانے والا کیا حکم رکھتا ہوگا؟

سلف صالحین میں سے کسی نے بھی، خواہ اس کا تعلق شیعانِ علی سے ہو یا کسی دوسرے گروہ سے، خلفائے ثلاثہ میں سے کسی کی خلافت کو ہدفِ طعن وتشنیع نہیں بنایا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے پہلے سالوں میں کسی نے ان پر کبھی کوئی الزام نہیں لگایا، البتہ ان کی خلافت کے آخری سالوں میں کچھ چیزوں کے حوالے سے ان پر اعتراض کیا گیا۔

ابوبکر وعمر کے عثمان وعلی پر مقدم ہونے میں پہلے شیعہ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں تھا، البتہ عثمان وعلی کی تقدیم وتفضیل میں کچھ اختلاف تھا۔ بلکہ اسّی سے زیادہ طرق اور اسناد سے حضرت علی کا یہ قول منقول ہے:

”خير هذه الأمة بعد نبيّها أبو بكر، ثم عمر“[2]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٤/٤٢١۔٤٣٠)

[2] مسند أحمد (١/١٠٦) شعیب ارناؤوط رحمہ اللہ نے اسے حسن قرار دیا ہے۔

''اس امت کے نبی کے بعد سب سے بہتر شخص ابوبکر ہے پھر عمر۔''

صحیح بخاری میں محمد بن حنفیہ کی حدیث میں آیا ہے کہ انھوں نے اپنے والد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا:

"يا أبت من خير الناس بعد رسول الله؟ فقال: أبو بكر، قل: ثم من؟ قال: عمر"[1]

''اے ابا جان! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے بہتر شخص کون ہے؟ فرمایا: ابوبکر۔ انھوں نے پوچھا: پھر کون؟ انھوں نے جواب دیا: عمر۔''

ہمدان نے، جو شیعانِ علی سے تھا، حضرت علی کے بیٹے محمد بن حنفیہ سے روایت کیا کہ ان کے والد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے یہ بات کہی تھی۔ لہٰذا اپنے بیٹے سے ان کا یہ بات تقیہ کرتے ہوئے کہنا ناممکن ہے، حالانکہ وہ اس جھوٹ گوئی اور نفاق سے مبرا ہیں جس کو رافضی تقیہ کا نام دیتے ہیں، بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تو یہاں تک کہا تھا کہ اگر میرے پاس کسی ایسے شخص کو لایا گیا جو مجھ کو ابوبکر وعمر پر فضیلت دیتا ہو تو میں اس پر افترا پرداز کی حد جاری کروں گا۔[2] یہ تو عام بات ہے کہ جو مسلمان سچ بولتا ہو اس کو الزام تراشی کی سزا کے طور پر کوڑے نہیں لگائے جاتے، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایسے شخص کو مفتری یعنی جھوٹا الزام لگانے والا کہا ہے۔

جس شخص کو تاریخ کا واجبی سا علم بھی ہے وہ یہ جانتا ہے کہ علم، دین، شجاعت اور سخاوت میں ابوبکر وعمر کی دوسروں پر فضیلت ایسی عیاں ہے کہ محتاجِ دلیل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساری امت سے زیادہ عالم، دین دار، بہادر اور فیاض ہونے پر معتبر علما کا اتفاق ہے۔ البتہ صفات و فضائل میں عثمان وعلی رضی اللہ عنہما کے ایک دوسرے کے قریب ہونے کی وجہ سے کچھ لوگوں کو شبہہ ہوا، لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تقدیم پر سلف کا اجماع ہے۔ صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ درج ہے۔ انھوں نے چھے افراد پر مشتمل شوریٰ کی کمیٹی بنائی اور ان سب پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مقدم رکھا۔ یہ بات خاص و عام کے نزدیک تواتر کے ساتھ ثابت ہے اور بخاری وغیرہ نے اس کی تفصیل ذکر کی ہے۔[3]

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلافت کے لیے چھے افراد کی ایک مجلسِ شوریٰ بنائی، اس مجلس کے لیے عثمان، علی، طلحہ، زبیر، عبدالرحمٰن بن عوف اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم کو چنا۔ انھوں نے اس کمیٹی میں اپنے بیٹے عبداللہ اور چچا زاد بھائی سعید بن زید کو شامل نہیں کیا تھا، حالانکہ وہ عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دفن کر دیا

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٦٨)

[2] فضائل الصحابة لأحمد بن حنبل (٨٣/١)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٢٨)

گیا تو یہ چھے افراد مسجد میں اکٹھے ہوئے، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا: مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں، میں عثمان رضی اللہ عنہ کا نام دیتا ہوں۔ زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا: مجھے بھی اس میں کوئی دلچسپی نہیں، میں علی رضی اللہ عنہ کا نام دیتا ہوں۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے کہا: مجھے بھی اس میں کوئی دلچسپی نہیں، میں عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا نام دیتا ہوں۔ ہم میں سے کوئی ایک نکلے اور دو آدمیوں میں سے ایک کو خلیفہ بنا دے، اس کو خدا کا وعدہ اور میثاق ہے کہ وہ ان دونوں میں سے افضل کو چنے۔ عثمان و علی رضی اللہ عنہما دونوں خاموش رہے۔ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نکل جاتا ہوں اور مجھ کو اللہ کا وعدہ اور میثاق ہے میں ان دونوں میں سے افضل کو مقرر کروں گا۔ وہ دونوں اس بات پر راضی ہو گئے۔ اور عبدالرحمٰن بن عوف تین دن اور تین راتوں تک امت سے مشاورت کرتے رہے، مدینہ میں مہاجرین و انصار اور امرائے انصار کی شکل میں امت کے بہترین افراد موجود تھے۔

مسور بن مخرمہ کہتے ہیں: عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے تین راتوں کے بعد میرا درواز کھٹکھٹایا اور کہا: تم ہو کہ سو رہے ہو، میں نے تین راتوں سے آنکھ نہیں جھپکی! پھر مجھ سے کہا: علی رضی اللہ عنہ کو بلاؤ، میں نے ان کو بلایا تو انھوں نے ان کے ساتھ طویل سرگوشی کی، پھر کہا: عثمان رضی اللہ عنہ کو بلاؤ، میں نے عثمان رضی اللہ عنہ کو بلایا تو انھوں نے ان کے ساتھ بھی طویل سرگوشی کی۔ پھر جب لوگوں نے فجر کی نماز پڑھی، صہیب نے حلف اٹھایا، عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے لوگوں سے مشورہ کیا، حتی کہ بادیہ نشینوں سے بھی اور باپردہ کنواریوں سے بھی، میں نے ان کو دیکھا وہ عثمان رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی اور کی طرف مائل نہیں ہو رہے۔ پھر کیا تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ، عبدالرحمٰن بن عوف اور تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے مشاورت اور اتفاق کے بعد اپنی مرضی، خوشی اور اختیار سے اور کسی بھی طرح کے جبر، لالچ اور شرط کے بغیر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی۔

معلوم ہوا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہی خلافت کے صحیح حق دار تھے۔ اگر وہ ان کے علاوہ کسی دوسرے کو ترجیح دے دیتے تو یہ اس بات کی دلیل ہوتی کہ ان کو یا تو افضل کے حق کا علم نہیں تھا یا وہ غیر افضل کو افضل کی جگہ خلیفہ متعین کر کے ظلم کے مرتکب ٹھہرتے۔ اور وہ ایسا کر بھی کس طرح سکتے تھے جب انھوں نے یہ حدیث سن رکھی تھی:

«أَنَّهُ مَنْ قَلَّدَ رَجُلًا عَمَلًا عَلَى عَصَابَةٍ وَهُوَ يَجِدُ فِي تِلْكَ الْعَصَابَةِ مَنْ هُوَ أَرْضَى لِلّٰهِ مِنْهُ، فَقَدْ خَانَ اللّٰهَ وَخَانَ رَسُولَهُ وَخَانَ الْمُؤْمِنِينَ» [1]

''جو انسان کسی جماعت پر ایسے شخص کو عامل مقرر کرے کہ اس جماعت میں اس سے زیادہ خدا کو راضی کرنے والا موجود ہو تو اس نے اللہ، رسول اور مومنوں سے خیانت کی۔''

متواتر روایات سے یہ فرمانِ نبوی منقول ہے: ''بہترین زمانہ وہ ہے جس میں، میں مبعوث ہوا، پھر وہ جو ان

[1] المستدرك للحاكم (٤/٩٢، ٩٣، ١٠٤) السلسلة الضعيفة (٤٥٤٥)

کے بعد ہیں، پھر وہ جو ان کے بعد ہیں۔''[1] یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے دس پندرہ سال بعد اور پہلی صدی میں، جو مسلمانوں کی تمام صدیوں سے افضل ہے، رونما ہوا۔ انھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو فوقیت دی تھی، اگر انھوں نے اس فوقیت دینے میں غلطی کی، یا ظلم کیا تو اس کا مطلب ہے کہ امامت و خلافت کے معاملے میں اس امت کے بہترین لوگ ہی غلطی کا شکار ہوئے یا ظلم کے مرتکب؟!

رافضہ کا کہنا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جہاد فی سبیل اللہ کی وجہ سے ان لوگوں کے دلوں میں ان کے خلاف حسد و بغض اور جاہلی عداوتوں کی آگ بھری ہوئی تھی، اس لیے انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پیچھے رکھا اور دوسروں کو ان پر فوقیت و تقدیم دی۔ اگر وہ ایسے ہی لوگ تھے پھر تو ان سے بدتر کوئی نہیں ہوگا، اگر اس امت کے بہترین لوگ اتنے بدتر تھے تو پھر یہ امت تو بہترین امت نہ ہوئی جو لوگوں کے لیے نکالی گئی، بلکہ تمام امتوں سے بدتر ٹھہری! یہ ہے رافضہ کے نظریے کی حقیقت اور یہ بات کتاب و سنت اور اجماعِ امت سے ثابت شدہ حقائق کے خلاف اور تضاد پر مبنی ہے۔

علما کا کہنا ہے: رافضیت کا عقیدہ ایجاد کرنے والا زندیق تھا جس کا مقصد امت کے دین کو تباہ کرنا تھا، ان کا کہنا ہے: وہ یہودی تھا اور اس نے اسلام کا لبادہ اوڑھا، اس کا نام عبداللہ بن سبا ہے۔ سبائیہ فرقہ اسی کی طرف منسوب ہے۔

یہ بھی نقل کیا جاتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کو حاضر کرنے کا حکم دیا تھا، تاکہ اس کو قتل کر دیں مگر وہ بھاگ نکلا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عقیدے کے مطابق غالی شیعہ کی سزا قتل، تفضیلی شیعہ (علی رضی اللہ عنہ کو ابوبکر رضی اللہ عنہ سے افضل قرار دینے والے) کی سزا کوڑے اور گالیاں دینے والے فرقے کی سزا قتل ہے۔ یہ مسائل تفصیل سے کسی دوسری جگہ ذکر کیے گئے ہیں۔ جہاں تک حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی خلافت اور عثمان و علی رضی اللہ عنہما پر ان کی فضیلت کے ثبوت کی بات ہے تو اس کے دلائل نا قابلِ شمار ہیں۔

صحیح مسلم میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا: ''اپنے باپ اور بھائی کو بلاؤ، میں ابوبکر کے لیے ایک نامہ لکھوا دوں، تاکہ میرے بعد لوگ ان سے متعلق اختلاف نہ کریں۔''

پھر فرمایا: ''اللہ بھی اور مومن بھی، ابوبکر کے سوا ہر کسی کا انکار کرتے ہیں۔''[2]

ایک دوسری صحیح حدیث سے اس حدیث کی مراد واضح ہو جاتی ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا تھا: ''میرے پاس دوات اور کاغذ لے کر آؤ، تاکہ میں تمھارے لیے ایک مکتوب لکھ جاؤں، اس کے بعد تم کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔''[3]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٠٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٣٥)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨٧)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨٨٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨٦)

صحیح بخاری میں ہے کہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور کہنے لگی: آپ کا کیا خیال ہے اگر میں آپ کے پاس آؤں اور آپ کو نہ پاؤں؟ (گویا وہ آپ کا فوت ہونا مراد لے رہی تھی) آپ ﷺ نے فرمایا: ''ابوبکر کے پاس آجانا۔''[1]

سنن میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میرے بعد ان دونوں کی اقتدا کرنا۔''[2] یعنی ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی۔

صحیح بخاری میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں نے خواب دیکھا، گویا میں ایک کنویں سے ڈول کھینچ رہا ہوں۔ ابن ابی قحافہ (ابوبکر) آیا، اس نے ایک یا دو ڈال کھینچے۔ اس کے کھینچنے میں کمزوری تھی۔ اللہ اس کو بخش دے، پھر اس کو ابن خطاب نے پکڑا اور وہ چھوٹے سے بڑے ڈول میں تبدیل ہو گیا، میں نے کوئی ایسا طاقتور نہیں دیکھا جو اس کے کام کرنے کی طرح عمدہ کام کرتا ہو، یہاں تک کہ لوگ سیراب ہو گئے اور ان کے حوض بھر گئے۔''[3]

امام شافعی ان کے کھینچنے میں کمزوری کی تفسیر ان کی خلافت کی مدت تھوڑی ہونے سے کرتے ہیں، کم ہمتی سے نہیں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر میں نے اہلِ زمین میں سے کسی کو خلیل بنانا ہوتا تو ابوبکر کو بناتا۔''[4]

ایک روایت میں ہے: ''لیکن اسلامی اخوت ہے، مسجد میں ابوبکر کے چھوٹے دروازے کے سوا باقی سب چھوٹے دروازے بند کر دیے جائیں۔''[5]

اس متواتر حدیث سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ آپ ﷺ کے نزدیک اہلِ زمین میں سے کوئی بھی ابوبکر سے زیادہ فضیلت نہیں رکھتا تھا۔

صحیح بخاری میں ہے کہ جب حضرت عمر فوت ہو گئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ کی قسم! مجھے امید ہے اللہ تمھیں تمھارے صاحبوں کے ساتھ ہی اکٹھا کرے گا۔ میں اکثر آپ ﷺ سے سنا کرتا تھا، آپ ﷺ کہتے: ''میں اور ابوبکر وعمر داخل ہوئے، میں اور ابوبکر وعمر نکلے۔''[6]

ہارون الرشید نے امام مالک سے کہا: اے ابو عبداللہ! مجھے بتایئے، ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ کے نزدیک کیا مقام رکھتے تھے؟ انھوں نے جواب دیا: جو آپ ﷺ کی حیات میں دونوں کا مقام تھا۔ آپ ﷺ کی وفات کے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٢٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨٦)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦٦٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٩٧) السلسلة الصحيحة (١٢٣٣)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٦٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٩٢)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٥)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨٢)

[6] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٧٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨٩)

بعد بھی آپ ﷺ کے نزدیک ان کا وہی مقام ہے۔ اس نے کہا: اے مالک! آپ نے تسلی بخش جواب دیا ہے۔

لہٰذا جو انسان سوال میں پوچھی گئی بات کا قائل ہے، اس سے توبہ کروائی جائے، اگر توبہ نہ کرے تو اس کو سخت سے سخت سزا دی جائے، جو علما کے ایک قول کے مطابق قتل ہے اور دوسرے قول میں قتل کے سوا کوئی بھی سخت سزا۔ واللہ أعلم[1]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو گالی دینے والے کا حکم

سوال ان دو آدمیوں کے بارے میں کیا حکم ہے جو ابوبکر رضی اللہ عنہ کو گالی دینے والے کے بارے میں جھگڑا کر رہے ہیں: ایک کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ گالی دینے والے کی توبہ قبول کرے گا اور دوسرا کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول نہیں کرے گا؟

جواب اس مسئلے میں درست اور صحیح بات جس کے قائل تمام ائمہ اسلام ہیں، یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر توبہ کرنے والے کی توبہ قبول فرماتا ہے جیسا کہ اس کا ارشاد ہے:

﴿ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴾ [الزمر: ٥٣]

''(اے پیغمبر! میری طرف سے) کہہ دو کہ اے میرے بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہونا اللہ تو سب گناہوں کو بخش دیتا ہے (اور) وہ تو بخشنے والا مہربان ہے۔''

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتا دیا ہے کہ وہ توبہ کرنے والے کا ہر گناہ معاف کر دیتا ہے۔ اس لیے اس نے گناہوں کو مطلق ذکر کیا ہے اور اسے عموم کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾ [النساء: ٤٨]

''اللہ تعالیٰ اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے اور اس کے سوا اور گناہ جس کو چاہے معاف کر دے۔''

یہ آیت اس شخص کے لیے ہے جو توبہ نہیں کرتا۔ اسی لیے اس میں قید اور تخصیص دونوں ہے۔

بعض صحابہ کرام کو گالی دینا، انبیائے کرام یا اللہ تعالیٰ کو گالی دینے سے بڑا گناہ نہیں ہے۔ یہود و نصاریٰ جو آپس میں چپکے چپکے ہمارے نبی کو گالیاں دیا کرتے تھے، اگر توبہ کرلیں اور دائرۂ اسلام میں داخل ہو جائیں تو ان کی

---

[1] جامع المسائل (٧/٢٦١-٢٧١)

توبہ اور اسلام دونوں کو قبول کیا جائے گا۔ اس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ "سب صحابتي ذنب لا يغفر" (میرے صحابہ کو گالی دینا ایک ایسا گناہ ہے جس کی معافی نہیں) کے الفاظ سے جو حدیث بیان کی جاتی ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر افترا ہے۔ جس شرک کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ وہ اسے معاف نہیں کرے گا، مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ توبہ کرنے والے سے شرک کو بھی معاف کر دیتا ہے۔

یہ بات کہ گالی دینے سے ایک انسان کا حق پامال ہوتا ہے تو اس کا جواب دو طرح سے دیا جا سکتا ہے:

① اللہ نے چوری کرنے والے، دوسروں کو برے القاب سے یاد کرنے والے اور ان جیسے دیگر گناہ گاروں کو توبہ کرنے کا حکم دیا ہے، جن کے گناہوں کا تعلق بندوں کے حقوق سے ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد:

﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٣٨﴾ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾

[المائدة: ٣٨_٣٩]

''اور جو چوری کرے مرد ہو یا عورت اُن کے ہاتھ کاٹ ڈالو یہ اُن کے فعلوں کی سزا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے عبرت ہے اور اللہ زبردست حکمت والا ہے اور جو شخص گناہ کے بعد توبہ کر لے اور نیکوکار ہو جائے تو اللہ اس کو معاف کر دے گا کچھ شک نہیں کہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَلَا تَلْمِزُوٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ [الحجرات: ١١]

''اور نہ ایک دوسرے کا بُرا نام رکھو ایمان لانے کے بعد بُرا نام (رکھنا) گناہ ہے اور جو توبہ نہ کریں وہ ظالم ہیں۔''

اس طرح کے گناہوں سے توبہ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ مظلوم کو جس قدر تکلیف و اذیت پہنچی ہے، اس کے برابر اس کے ساتھ حسنِ سلوک کیا جائے۔

② صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو گالیاں دینے والے تاویل کرتے ہیں، لہٰذا جب کوئی رافضی اس سے توبہ کر لے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عظمت و فضیلت کا عقیدہ اپنے دل میں بٹھا لے، ان سے محبت کرنے لگے اور ان کے حق میں دعا گو رہے تو دوسرے گناہ گاروں کی طرح اللہ اس کے گناہ کو بھی نیکی سے بدل دے گا۔[1]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٥٢٨/٤_٥٢٩)

شیخین بڑے عالم وفقیہ تھے یا حضرت علی رضی اللہ عنہ؟

سوال دو آدمیوں نے باہم اختلاف کیا۔ ایک نے کہا کہ ابوبکر اور عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے زیادہ بڑے عالم اور زیادہ بڑے فقیہ ہیں۔ دوسرے نے کہا کہ نہیں، بلکہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما سے علم اور فقاہت میں بڑھ کر ہیں۔ دونوں میں سے کون سا قول درست ہے؟ کیا یہ دونوں حدیثیں صحیح ہیں: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سب سے بڑے قاضی علی ہیں۔ دوسری حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں شہرِ علم ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں؟ اگر یہ دونوں حدیثیں صحیح ہیں تو کیا ان میں اس بات کی دلیل ہے کہ علی رضی اللہ عنہ ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما سے علم اور فقہ میں بڑھے ہوئے ہیں؟ اگر کوئی دعویٰ کرنے والا اس بات کا دعویٰ کرے کہ مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ علی رضی اللہ عنہ ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما سے علم اور فقہ میں بڑھ کر ہیں تو کیا اس کا دعویٰ صحیح ہو گا یا غلط ہو گا؟

جواب الحمد للہ. معتبر مسلم علما میں سے کسی نے یہ نہیں کہا ہے کہ علی رضی اللہ عنہ ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما سے علم اور فقہ میں بڑھے ہوئے ہیں، بلکہ کوئی اس بات کا بھی قائل نہیں ہے کہ علی رضی اللہ عنہ علم اور فقاہت میں تنہا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بڑھے ہوئے ہیں۔ اس پر اجماع کا دعویٰ کرنے والا سب سے بڑا جاہل اور سب سے زیادہ جھوٹا ہے، بلکہ ایک سے زیادہ علما نے اس بات پر علما کا اجماع نقل کیا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ علی رضی اللہ عنہ سے زیادہ بڑے عالم ہیں۔ ان میں سے ایک منصور بن عبدالجبار سمعانی مروزی ہیں، جن کا شمار امام شافعی کے اصحاب میں ہوتا ہے اور جو امامِ سنت ہیں، وہ اپنی کتاب "تقويم الأدلة على الإمام" میں ذکر کرتے ہیں کہ علمائے سنت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ علی رضی اللہ عنہ سے زیادہ بڑے عالم ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ مشہور ائمہ میں سے کسی نے اس مسئلے میں اختلاف کیا ہو۔

ایسا کیونکر ممکن ہے جب کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں فتویٰ دیتے تھے، حکم دیتے تھے، منع کرتے تھے، فیصلہ کرتے تھے اور خطبہ دیتے تھے۔ اسی طرح اس وقت بھی ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ سارے کام انجام دیے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ عنہ لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے نکلے، جب ایک ساتھ ہجرت کی اور غزوۂ حنین کے موقع پر، اس کے علاوہ دوسرے غزوات میں، حالانکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم موجود تھے، آپ کی باتوں پر خاموش رہتے تھے اور جو کچھ ابوبکر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے، اس پر موافقت ظاہر فرماتے تھے۔ آپ کے سوا دوسرے کسی کو یہ مقام حاصل نہیں تھا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب میں سے اہلِ علم، فقیہ اور صائب الرائے حضرات سے جب مشورہ فرماتے تو مشورے میں ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کو مقدم کرتے۔ یہی وہ دونوں حضرات ہیں جو تمام صحابہ میں نبی کی موجودگی میں آپ کے سامنے سب سے پہلے زبان کھولتے اور علم پر اظہارِ خیال فرماتے۔ مثال کے طور پر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر کے قیدیوں کے بارے میں مشورہ طلب کیا تو سب سے پہلے ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما نے اس مسئلے میں بات کی۔ اس کے

علاوہ دوسرے مقامات پر بھی یہی صورت حال رہی ہے۔

حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے دونوں سے فرمایا: جب تم دونوں کا کسی معاملے میں اتفاق ہو جائے تو میں اس کی مخالفت نہیں کروں گا۔[1] اسی لیے علما کے ایک قول کے مطابق دونوں کا قول شرعی طور پر حجت ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ سے بھی ایک روایت یہی ملتی ہے، لیکن یہ مقام عثمان اور علی رضی اللہ عنہما کے قول کو حاصل نہیں ہے۔

سنن میں حدیث ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میرے بعد جو لوگ رہیں گے ان میں ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی اقتدا کرنا''[2] آپ ﷺ نے یہ بات ان کے علاوہ کسی دوسرے کے لیے نہیں فرمائی، بلکہ آپ ﷺ سے یہ ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''میری سنت اور میرے بعد ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت کو لازم پکڑنا، ان کو مضبوطی سے تھامے رہنا اور دانتوں سے پکڑے رہنا، دین میں نئی نئی باتوں سے بچنا، کیوں کہ دین میں نکالی ہوئی ہر نئی بات گمراہی ہے۔''[3]

آپ ﷺ نے خلفاے راشدین کی سنت کی پیروی کرنے کا حکم دیا۔ خلفائے راشدین میں چاروں خلفا شامل ہیں، ان میں اقتدا کے لیے آپ نے ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کو خاص فرمایا ہے۔ مقتدیٰ کا مقام و مرتبہ اپنے افعال میں اور مسلمانوں کے لیے جو سنتیں وہ رائج کرے، متبع کی سنت سے فوقیت رکھتا ہے، جس کو وہ فقط رائج کرے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ صحابہ کرام نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر قوم کے لوگ ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کی اقتدا کریں گے تو راہِ راست پر رہیں گے۔''[4]

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت ہے کہ وہ کتاب اللہ کے مطابق فتویٰ دیتے تھے۔ اگر کتاب اللہ میں مسئلے کا حل نہیں ملتا تھا تو رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق فتویٰ دیتے تھے۔ اگر سنت میں بھی مسئلہ نہیں ملتا تھا تو ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق فتویٰ دیتے تھے، لیکن عثمان اور علی رضی اللہ عنہما کے قول کے ساتھ یہ معاملہ نہیں کرتے تھے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما حبر الأمة ہیں۔ صحابہ میں سب سے بڑے عالم ہیں اور اپنے دور کے سب سے بڑے فقیہ ہیں۔ وہ ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے قول پر فتویٰ دیتے ہیں۔ دوسرے صحابہ پر ان کے قول کو مقدم رکھتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ سے

---

[1] ہمیں یہ روایت نہیں ملی۔

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦٦٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٩٧) السلسلة الصحيحة (١٢٣٣)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٠٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٧٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٥٤٦)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٨١)

ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے لیے یہ دعا فرمائی:

''اے اللہ! ان کو دین میں فقاہت سے بہرہ ور فرما اور قرآن کی تاویل کا علم عطا فرما۔''[1]

مزید یہ کہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے خاص تعلق تھا جو دیگر صحابہ کرام کے تعلق سے اوپر تھا۔ دونوں میں ابوبکر کو خاص الخاص ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے راتوں میں عام طور پر علمی، دینی اور مسلمانوں کے مصالح کے تعلق سے گفتگو کیا کرتے تھے، جیسا کہ ابوبکر بن ابی شیبہ نے بسند أبومعاویه عن الأعمش عن إبراهيم عن علقمة روایت نقل کی ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس مسلمانوں کے معاملات سے متعلق راتوں کو گفتگو فرمایا کرتے تھے اور میں بھی آپ کے ساتھ رہتا تھا۔''[2]

صحیحین میں عبد الرحمان بن ابی بکر سے روایت ہے کہ اصحابِ صفہ غریب اور تہی دست لوگ تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس کسی کے پاس دو آدمیوں کا کھانا ہو وہ تیسرے کو اپنے ساتھ لے جائے، جس کے پاس چار آدمیوں کے کھانے کا انتظام ہے وہ پانچویں یا چھٹے کو ساتھ لے جائے۔'' ابوبکر رضی اللہ عنہ تین آدمیوں کو ساتھ لے کر چلے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دس کو ساتھ لے گئے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شام گزاری اور وہیں ٹھہرے رہے، یہاں تک کہ میں نے عشا کی نماز ادا کی پھر واپس آئے اور اتنی دیر وہاں ٹھہرے رہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اونگھ آنے لگی، پھر دیر رات گئے جب گھر آئے تو آپ کی اہلیہ نے عرض کی: مہمانوں کو چھوڑ کر کہاں رہ گئے تھے۔ آپ نے پوچھا: کیا تم نے انھیں کھانا نہیں کھلایا؟ انھوں نے بتایا کہ وہ آپ کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ چنانچہ انھیں کھانا پیش کیا گیا، (مگر) وہ (انکار کر کے) ان پر غالب ہے، اس کے بعد آگے کی روایت ذکر کی۔[3] ایک دوسری روایت میں ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دیر رات گئے تک بات چیت کرتے رہے۔[4]

سفرِ ہجرت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ غزوۂ بدر کے موقع پر کھجور کے چھپر کے نیچے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کوئی نہیں رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہمارے اوپر تمام لوگوں کے مقابلے میں سب سے بڑا احسان ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ہم نشینی اور ان کے مالی تعاون کا ہے، اگر میں زمین والوں میں سے کسی کو اپنا خلیل بناتا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بناتا۔''[5] یہ حدیث ان صحیح ترین احادیث میں سے ایک ہے جو مختلف سندوں سے صحاح میں منقول ہیں۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٧٧)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٦٩) مسند أحمد (٢٦/١، ٣٤)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٥٧)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٥٧)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨٢)

صحیحین میں ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اتنے میں ابوبکر رضی اللہ عنہ گھٹنوں تک اپنا کپڑا اٹھائے تشریف لائے۔ یہ منظر دیکھ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ضرور تمھارے ساتھی کا کسی سے جھگڑا ہوا ہے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سلام کیا اور عرض کی: میرے اور عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے درمیان کچھ باتیں ہوگئیں، میں نے کچھ تیزی کی، پھر اپنے رویے پر مجھے ندامت ہوئی اور میں نے ان سے معافی طلب کی، لیکن انھوں نے مجھے معاف کرنے سے انکار کر دیا۔ اسی سلسلے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تمھیں معاف کرے۔ یہ جملہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار دہرایا۔ ادھر عمر رضی اللہ عنہ کو اپنے رویے پر ندامت ہوئی اور وہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے گھر پہنچے، لیکن وہاں ملاقات نہیں ہوئی، پھر سیدھے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ غصے سے متغیر ہو رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ کیفیت دیکھ کر ابوبکر رضی اللہ عنہ ڈر گئے اور عرض کی: اے اللہ کے رسول! زیادتی میری طرف سے ہوئی ہے، زیادتی میری طرف سے ہوئی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ نے مجھے تمھاری طرف مبعوث کیا تو تم لوگوں نے میری تکذیب کی اور ابوبکر نے تصدیق کی اور جان و مال سے میرا ساتھ دیا، کیا تم میری خاطر میرے ساتھی کو معاف نہیں کر سکتے۔[1] اس کے بعد پھر کسی کی طرف سے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ امام بخاری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ''غامر'' کا ایک معنی ''نیکی میں سبقت کرنا'' ہے۔

صحیحین میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ شہادت کے بعد جب عمر رضی اللہ عنہ کا جنازہ چارپائی پر رکھا گیا تو جنازہ اٹھانے سے پہلے لوگوں نے انھیں گھیر لیا، ہر شخص کی زبان پر ان کے لیے دعا تھی، ان کی تعریف تھی اور اللہ سے رحمت کی التجا تھی۔ میں بھی مجمع میں موجود تھا۔ اچانک کسی نے پیچھے سے میرا شانہ پکڑ لیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ علی رضی اللہ عنہ تھے۔ انھوں نے عمر رضی اللہ عنہ کے لیے دعائے رحمت کی اور ان سے مخاطب ہو کر کہا: آپ نے اپنے پیچھے اپنے سے بڑھ کر کسی کو نہیں چھوڑا جس کے متعلق مجھے یہ آرزو ہو کہ اس جیسا عمل لے کر میں اللہ کے حضور پیش ہوں۔ اللہ کی قسم! مجھے تو پہلے سے یقین تھا کہ اللہ آپ کو آپ کے دونوں ساتھیوں کے ساتھ ہی رکھے گا۔ میرا یہ یقین اس وجہ سے تھا کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے اکثر یہ الفاظ سنے تھے: میں، ابوبکر اور عمر گئے، میں، ابوبکر اور عمر داخل ہوئے، میں، ابوبکر اور عمر باہر آئے۔ مجھے قوی امید ہے کہ اللہ آپ کو آپ کے دونوں ساتھیوں کے ساتھ ہی رکھے گا۔[2]

صحیحین وغیرہ میں ہے کہ جب غزوہ احد کے دن مسلمان تکلیف سے دوچار ہوئے تو ابوسفیان نے آواز لگا کر

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٦١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٧٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨٩)

پوچھا: کیا قوم میں محمد (ﷺ) موجود ہیں؟ کیا قوم میں محمد (ﷺ) موجود ہیں؟ کیا قوم میں محمد (ﷺ) موجود ہیں؟ نبی اکرم ﷺ نے اس کی آواز سن کر فرمایا: اس کی بات کا جواب نہ دو۔ ابوسفیان نے پھر آواز لگا کر پوچھا: کیا قوم میں ابن ابی قحافہ (رضی اللہ عنہ) موجود ہیں؟ کیا قوم میں ابن ابی قحافہ (رضی اللہ عنہ) موجود ہیں؟ کیا قوم میں ابن ابی قحافہ (رضی اللہ عنہ) موجود ہیں؟ نبی اکرم ﷺ نے اس کی آواز سن کر فرمایا: اس کی بات کا جواب نہ دو۔ ابوسفیان نے تیسری بار آواز لگا کر پوچھا: کیا قوم میں ابن الخطاب (رضی اللہ عنہ) موجود ہیں؟ کیا قوم میں ابن الخطاب (رضی اللہ عنہ) موجود ہیں؟ کیا قوم میں ابن الخطاب (رضی اللہ عنہ) موجود ہیں؟ نبی اکرم ﷺ نے اس کی آواز سن کر فرمایا: اس کی بات کا جواب نہ دو۔ آواز نہ پا کر ابوسفیان نے اپنے ساتھیوں سے کہا: ان تمام لوگوں کا کام (نعوذ باللہ) تمام ہوگیا۔ اس کی یہ بات سن کر عمر رضی اللہ عنہ کو خود پر قابو رکھنا مشکل ہوگیا اور انھوں نے کہا: دشمنِ خدا تم جھوٹ کہتے ہو، جن لوگوں کو تم نے پکارا ہے، سب بحمد اللہ حیات ہیں اور ابھی ہماری فوجی طاقت باقی ہے جو تجھے تکلیف پہنچانے کے لیے کافی ہے۔[1] اس وقت کافروں کے سردار نے نبی اکرم ﷺ، ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کی بابت دریافت کیا، کسی اور کے بارے میں نہیں پوچھا، کیوں کہ انھیں معلوم تھا کہ مسلمانوں کے سربراہ نبی اکرم ﷺ اور آپ کے دونوں وزیر ہیں۔

اسی لیے جب ہارون رشید نے امام مالک رحمہ اللہ سے پوچھا تھا کہ آپ یہ بتائیں کہ ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کا مقام و مرتبہ آپ کی نظر میں آپ کی حیاتِ طیبہ میں کیا تھا تو انھوں نے جواب دیا تھا کہ دونوں حضرات کا آپ کی حیاتِ طیبہ میں وہی مقام تھا جو آپ کی وفات کے بعد دونوں کا ہے۔ دونوں حضرات کی خصوصیت، صحبتِ نبوی مزید برآں کمال محبت و الفت اور علم اور دین میں شرکت اس کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ دوسروں سے کہیں زیادہ نبی اکرم ﷺ سے قربت رکھتے ہیں، جس کو بھی صحابہ کرام کے حالات کی خبر ہے، وہ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتا ہے۔

علم اور فقاہت کے کئی ایک مسائل جن کو حل کرنے سے دوسرے عاجز تھے، ان کو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کے سامنے واضح کیا، اس کے ساتھ ساتھ ایسی کوئی بات ریکارڈ پر نہیں ہے کہ انھوں نے کبھی کوئی ایسی بات کہی ہو جو نص کے خلاف ہو۔ یہ ان کی علمی برتری اور فقاہت کی دلیل ہے۔ ان کے علاوہ دوسروں کے یہاں ہمیں ایسے بہت سے اقوال ملتے ہیں جن سے نص کی مخالفت لازم آتی ہے، کیوں کہ ان تک وہ نصوص نہیں پہنچ سکی تھیں۔

عمر رضی اللہ عنہ کی موافقت میں جس قدر نصوص پائی جاتی ہیں، وہ اس سے کہیں زیادہ ہیں جو علی رضی اللہ عنہ کی موافقت میں ہیں۔ یہ بات ہر اس شخص کو معلوم ہے جو علمی مسائل اور ان سے متعلق علما کے اقوال سے واقف ہے۔ اس کی ایک مثال متوفی عنہا زوجہا کا نفقہ ہے۔ اس مسئلے میں نص عمر رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق ہے، دوسروں کے اقوال کے مطابق

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨٧٤)

نہیں ہے۔ اسی طرح مسئلہ حرام میں عمر رضی اللہ عنہ اور دوسروں کے اقوال نصوص سے زیادہ قریب ہیں جب کہ کچھ دوسرے لوگوں کے اقوال کی یہ حیثیت نہیں ہے۔

صحیحین میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم سے پہلی امتوں میں محدثین ''مُلہمین'' ہوا کرتے تھے۔ اگر میری امت میں کسی کو یہ مقام حاصل ہوا تو وہ عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔''[1] صحیحین ہی میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں نے خواب میں دیکھا کہ مجھے دودھ کا پیالہ پیش کیا گیا۔ میں نے اسے اتنا پیا کہ اس کی تراوٹ میرے ناخون سے بہنے لگی۔ پھر میں نے بچا ہوا دودھ عمر رضی اللہ عنہ کی طرف بڑھا دیا۔ لوگوں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! اس خواب کی کیا تعبیر ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کی تعبیر علم ہے۔''[2] ترمذی وغیرہ میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر نبی بنا کر میں تمھارے درمیان مبعوث نہ کیا جاتا تو عمر مبعوث کیے جاتے۔''[3]

مزید یہ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیق رضی اللہ عنہ کو امامتِ نماز میں اپنا جانشین مقرر فرمایا جو اسلام کا ستون ہے۔ اسی طرح مناسکِ حج کے لیے ان کو اپنا جانشین متعین کیا جو عبادات میں سب سے زیادہ مشکل مسائل پر مبنی ہے۔ انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کرنے سے پہلے مناسک حج کی تکمیل کرائی۔ آپ نے وہاں منادی کرائی کہ اب آئندہ کوئی مشرک حج کرنے نہیں آئے گا اور نہ کوئی بے لباس ہو کر بیت اللہ کا طواف کر سکے گا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پیچھے علی رضی اللہ عنہ کو مشرکین کا معاہدہ ختم کرنے کا اعلان کرنے کے لیے بھیجا۔[3]

جب علی رضی اللہ عنہ صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے تو انھوں نے پوچھا: امیر بن کر آئے ہیں یا مامور بن کر؟ علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: نہیں، بلکہ مامور بن کر آیا ہوں۔ اس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو علی رضی اللہ عنہ کے اوپر امیر مقرر فرمایا اور علی رضی اللہ عنہ بھی ان لوگوں میں تھے جن کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ حج اور مسافرین کے احکام وغیرہ مسائل میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اطاعت کریں اور ان کا حکم بجا لائیں۔ یہ واقعہ غزوۂ تبوک کے بعد کا ہے جس میں علی رضی اللہ عنہ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے میں اپنا جانشین مقرر فرمایا تھا۔ اس وقت مدینے میں مردوں میں منافق، معذور یا گناہ گار ہی رہ گئے تھے۔ علی رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی اور عرض کی: کیا آپ مجھے عورتوں اور بچوں پر اپنا جانشین مقرر فرما رہے ہیں۔ یہ سن کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم اس بات سے راضی نہیں ہو کہ میری نظر میں تمھارا وہی مقام ہے جو موسیٰ علیہ السلام کی نظر میں ہارون علیہ السلام کا تھا۔[4]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٨٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٩٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٧٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٩١)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٢)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤١٥٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٠٤)

اس موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح فرمایا کہ علی رضی اللہ عنہ کو مدینے میں اپنا جانشین بنانا، ان کے مقام اور مرتبے کو کم کرنا نہیں تھا، بلکہ یہ اسی طرح کی جانشینی تھی جس طرح کی جانشینی موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام کو عطا فرمائی تھی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ عادت مبارکہ تھی کہ ہمیشہ اپنی غیر موجودگی میں مدینے میں کسی کو اپنا جانشین مقرر فرما دیا کرتے تھے، لیکن ان تمام مواقع پر مدینے میں مرد بھی ہوا کرتے تھے، لیکن غزوۂ تبوک کے موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام مردوں کے ساتھ جہاد کے لیے نکلے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو پیچھے رہنے کی اجازت نہیں دی تھی، کیوں کہ دشمن بہت طاقت ور تھا اور راستہ بھی دور اور دشوار گزار تھا۔ اسی موقع پر اللہ نے سورۂ براءت نازل فرمائی تھی۔

صدقات کے متعلق ابوبکر رضی اللہ عنہ کی کتاب تمام کتابوں سے زیادہ جامع اور مختصر ہے۔ اسی لیے عام فقہا نے اس پر عمل کیا ہے۔ ان کے علاوہ دیگر صحابہ کی کتابوں میں منسوخ احکام بھی ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سنت کے سب سے بڑے عالم تھے۔ صحیحین میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے درمیان علومِ نبوت کے سب سے بڑے عالم ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔[1]

مزید یہ کہ عہدِ صدیقی میں مسلمانوں کے درمیان جب بھی کسی مسئلے میں اختلاف ہوتا تھا تو آپ اس کا فیصلہ کر دیا کرتے تھے۔ ان کے دورِ حکومت میں کوئی بھی ایسا مسئلہ نہیں پیدا ہوا جس میں لوگوں کا اختلاف ہو اور وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وجہ سے ختم نہ ہوا ہو۔ آپ کے دور میں جو مسائل متنازعہ فیہ سامنے آئے، جیسے وفاتِ نبوی کا تیقن، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے مدفن، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث، لشکرِ اسامہ کی روانگی، مانعینِ زکات سے قتال وغیرہ بڑے بڑے مسائل سب آپ نے حل فرمائے، بلکہ آپ صحابہ کرام کے درمیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ کی حیثیت سے تھے، انھیں تعلیم دیتے تھے، ان کو درستی کی راہ پر چلاتے تھے اور ان کے درمیان پیدا ہونے والے شبہات کا ازالہ فرما دیا کرتے تھے۔ صحابہ بھی آپ سے اختلاف نہیں کرتے تھے۔

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد کسی کا علم اور کمال ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علم اور ان کے کمال کو نہیں پہنچا۔ اسی لیے کئی ایک مسائل میں ان میں باہم اختلافات واقع ہوئے، جیسے دادا اور بھائیوں کی میراث، حدودِ حرم، ایک مجلس کی تین طلاقیں وغیرہ مشہور مسائل میں ان کے درمیان اختلافات ہوئے، حالانکہ ان مسائل میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ لوگ عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم سے ان کی بہت سی باتوں میں اختلاف کرتے تھے، لیکن یہ پتا نہیں چلتا کہ لوگوں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ان کے فتاویٰ اور فیصلوں میں کبھی اختلاف کیا ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ علم کے مقامِ بلند پر فائز تھے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨٢)

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم مقامی کا شرف حاصل کیا اور اسلام کو قائم رکھا۔ اس میں کسی قسم کی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی، بلکہ انھوں نے لوگوں کو اسی دروازے سے اسلام میں داخل کیا جس سے وہ باہر نکل گئے تھے جب کہ مرتدین وغیرہ مخالفینِ اسلام اور اسلام ترک کرنے والوں کی خاصی بڑی تعداد تھی، لیکن آپ نے اپنی دینی بصیرت کے ذریعے صحابہ کے دین اور علم کی تکمیل فرمائی اور ان مخالفتوں کا اس پامردی سے مقابلہ کیا کہ اس میدان میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے، یہاں تک کہ دین اسی جگہ پر آ گیا جہاں عہدِ رسالت میں تھا۔ لوگ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفۂ رسول اللہ کہہ کر پکارتے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ کو امیر المومنین کا خطاب دیا۔ سہیلی وغیرہ علما کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ [التوبة: ٤٠] میں جس طرح لفظوں میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت کا اظہار ہوتا ہے اسی طرح معنی کے لحاظ سے بھی ان کی فضیلت کا اظہار ہوتا ہے کہ لوگ کہا کرتے تھے: محمد رسول اللہ و ابوبکر خلیفۃ رسول اللہ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور ابوبکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ لفظی اتصال ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ختم ہوگیا۔ آپ کے بعد خلیفہ بنائے جانے والے حضرات کو صحابہ نے اس لفظ سے یاد نہیں کیا۔

مزید یہ کہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بعض سنتوں کا علم حاصل کیا ہے۔ اس کے برعکس ابوبکر رضی اللہ عنہ نے علی رضی اللہ عنہ سے کوئی علم نہیں حاصل کیا، جیسا کہ نمازِ توبہ سے متعلق سنن کی مشہور حدیث علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ جب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے حدیث سنتا تھا تو اللہ تعالیٰ اس سے مجھے حسبِ توفیق نفع دیتا تھا، لیکن جب آپ کی حدیث کوئی دوسرا بیان کرتا تھا تو میں اس سے حلف لیتا تھا۔ جب وہ حلف اٹھا لیتا تھا تو میں اس حدیث کی تصدیق کرتا تھا، مگر مجھ سے حدیث بیان کی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اور ابوبکر نے سچ کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس کسی مسلمان سے گناہ سرزد ہوجائے پھر وہ وضو کرے اور اچھی طرح وضو کرے اور دو رکعت نماز ادا کرے، پھر اللہ سے مغفرت طلب کرے تو اللہ اس کے گناہ کو معاف کر دیتا ہے۔“[1]

اس کی مزید وضاحت اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ کوفے کے وہ ائمہ اور علما جنھوں نے عمر اور علی رضی اللہ عنہما کی صحبت پائی ہے، جیسے علقمہ، اسود اور شریح قاضی وغیرہ، یہ تمام حضرات عمر رضی اللہ عنہ کے قول کو علی رضی اللہ عنہ کے قول پر ترجیح دیتے تھے۔ مدینہ، مکہ اور بصرہ کے تابعین کے یہاں تو یہ بات اتنی ظاہر اور مشہور تھی کہ اس کا ذکر کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ کوفے میں علی رضی اللہ عنہ کا علم اور ان کی فقہ تو ظاہر ہی تھی، کیوں کہ وہ اپنے دورِ خلافت میں وہیں تھے۔

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٢١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٠٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٣٩٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٦١٤)

علی رضی اللہ عنہ کے وہ شیعہ جنھوں نے آپ کی صحبت پائی تھی، ان میں ایک بھی ایسا نہیں ہے جو علی رضی اللہ عنہ کو ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما پر فوقیت دیتا ہو، نہ فقہ میں، نہ علم میں اور نہ دوسرے معاملات میں، بلکہ ان کے سارے شیعہ جنھوں نے ان کے ساتھ قتال کیا تھا، وہ تمام مسلمانوں کی آواز میں آواز ملا کر ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما ہی کو مقدم قرار دیتے تھے، ہاں ایک چھوٹا سا گم نام گروہ عہدِ علی میں ضرور تھا، جس پر علی رضی اللہ عنہ خود نکیر فرماتے تھے اور اس کی مذمت کرتے تھے۔ اس گروہ میں تین جماعتیں تھیں:

ایک جماعت علی رضی اللہ عنہ کے سلسلے میں غلو کرتی تھی، جیسے کہ ان کے اندر الوہیت کا دعوی کرتی تھی۔ اس جماعت سے وابستہ لوگوں کو علی رضی اللہ عنہ نے آگ میں جلوا دیا تھا۔

ایک دوسری جماعت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہتی تھی۔ اس جماعت کا سرغنہ عبداللہ بن سبا تھا۔ جب علی رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع ملی تو انھوں نے اس کو قتل کرنے کے لیے گرفتار کرنے کا حکم دیا، لیکن وہ فرار ہوگیا۔

ایک تیسری جماعت علی رضی اللہ عنہ کو ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما پر فضیلت دیتی تھی۔ اس کے بارے میں علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر مجھے کسی کے بارے میں پتا چلا کہ وہ مجھ کو ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما پر فضیلت دیتا ہے تو میں اس پر بہتان لگانے کی حد لگاؤں گا۔ علی رضی اللہ عنہ سے اسی یا اس سے کچھ زیادہ سندوں کے ساتھ روایت نقل کی گئی ہے کہ انھوں نے کوفے کے منبر سے فرمایا: اس امت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔ صحیح بخاری [1] وغیرہ میں بطورِ خاص ہمدان کے راویانِ حدیث سے جن کے بارے میں علی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

ولو كنت بوابا على باب جنة لقلت لهمدان ادخلي بسلام

''اگر میں بابِ جنت کا دربان ہوا تو اہلِ ہمدان سے کہوں گا کہ جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔''

سفیان ثوری منذر ثوری سے روایت کرتے ہیں اور وہ دونوں ہمدانی ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے بسند محمد بن کثیر قال: حدثنا سفيان الثوري حدثنا: أبويعلىٰ منذر الثوري عن محمد بن الحنفية نقل کیا ہے، محمد بن حنفیہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے پوچھا: ابا جان! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے بیٹے! کیا تم نہیں جانتے؟ میں نے عرض کی: نہیں۔ فرمایا: ابوبکر رضی اللہ عنہ۔ میں نے عرض کی: اس کے بعد کون؟ فرمایا: اس کے بعد عمر رضی اللہ عنہ۔

علی رضی اللہ عنہ یہ بات اپنے بیٹے اور اپنے خاص الخواص سے کہہ رہے ہیں، جن سے ڈرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شیخین پر جو انھیں فضیلت دے اسے سزا دینے کی بات کرتے ہیں۔ تواضع اور خاکساری کے بطور کہنے والا شخص کسی ایسے شخص کو سزا نہیں دے سکتا جس نے حق بات کہی ہو اور نہ اس پر بہتان تراشی کا الزام عائد کر سکتا ہے۔ فضائل کی

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٦٨)

بنیاد علم ہے۔ انبیاء اور صحابہ وغیرہ میں جو علی رضی اللہ عنہ سے افضل تھے، وہ ان سے زیادہ علم والے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ﴾ [الزمر: ٩]

''کیا علم رکھنے والے اور علم نہ رکھنے والے دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔''

اس پر بہت سے دلائل ہیں اور علما کے اقوال بھی اس پر بہت سے ہیں۔

رہی وہ حدیث جس میں بیان کیا جاتا ہے: «أقضاكم علي» ''تم میں سب سے بڑے قاضی علی رضی اللہ عنہ ہیں۔'' اس روایت کے سلسلے میں معلوم ہونا چاہیے کہ مولفین کتبِ ستہ میں سے کسی محدث نے اسے روایت نہیں کیا ہے، نہ مشہور مسانید کے مولفین نے اس کی روایت کی ہے، نہ امام احمد رحمہ اللہ نے اسے نقل کیا ہے اور نہ ان کے علاوہ دوسرے کسی محدث نے، نہ صحیح سند سے اور نہ ضعیف سند سے، بلکہ اس کی روایت ایسی سند سے کی جاتی ہے جس کا جھوٹ ہونا مشہور ہے، البتہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے یہ ضرور فرمایا ہے کہ ہم میں سب سے بڑے قاری ابی بن کعب رضی اللہ عنہ ہیں اور سب سے بڑے قاضی علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ بات انھوں نے صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد فرمائی تھی۔

وہ حدیث جو ترمذی وغیرہ میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت میں حلال و حرام کے سب سے بڑے عالم معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ہیں اور فرائض کے سب سے بڑے واقف کار زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ہیں،[1] اس میں علی رضی اللہ عنہ کا ذکر نہیں ہے۔ جس حدیث میں علی رضی اللہ عنہ کا ذکر ہے، وہ ضعیف ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس میں یہ بھی ہے کہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ حلال و حرام کے سب سے بڑے عالم ہیں اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرائض کے سب سے زیادہ جاننے والے ہیں۔ اگر اس حدیث کو صحیح تسلیم بھی کر لیا جائے تو حلال و حرام کا سب سے زیادہ جاننے والا اس شخص سے زیادہ وسیع علم والا کہلائے گا جو قضا کا سب سے بڑا عالم ہے، کیوں کہ قضا کے ساتھ جو چیز مخصوص ہے وہ ہے ظاہر میں مقدمات کا فیصلہ کرنا، اس میں اس بات کے امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا کہ باطن میں فیصلہ خلافِ حق ہو، جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''تم میرے پاس جھگڑتے ہوئے آتے ہو، ممکن ہے تم میں سے بعض لوگ اپنے فریق کے مقابلے میں اپنی دلیل زور دار انداز میں پیش کر دیں اور میں فیصلہ اسی کے مطابق کرتا ہوں جیسا سنتا ہوں۔ اگر میں کسی کے بھائی کے حق میں سے فیصلے کے ذریعے کچھ اسے دلا دوں تو وہ اسے ہرگز نہ قبول کرے، میں اسے جہنم کا ایک ٹکڑا دے رہا ہوں۔''[2] تمام قاضیوں کے سردار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتا دیا ہے کہ آپ کا بھی کوئی فیصلہ حرام کو حلال نہیں کر سکتا، بلکہ

---

[1] مسند أحمد (١٨٤/٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٧٩٠۔٣٧٩١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٥٤) سنن النسائي الکبریٰ (٧٨/٥) علی رضی اللہ عنہ کا ذکر ابن ماجہ کی روایت میں آتا ہے جسے شیخ البانی رحمہ اللہ نے السلسلة الصحيحة (١٢٢٤) میں ذکر کیا ہے۔ نیز دیکھیں: صحيح الجامع (٩٠٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٣٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧١٣)

ایک مسلمان کے لیے آپ کے فیصلے کے مطابق بھی دوسرے کا حق لینا حرام ہے۔ اس کے برعکس حلال وحرام کے علم کا تعلق ظاہر اور باطن دونوں سے ہے۔ اس طرح جو حلال وحرام کا زیادہ علم رکھتا ہے وہ دین کا بھی زیادہ علم رکھتا ہے۔

مزید یہ کہ قضا کی دو نوعتیں ہیں:

ایک یہ کہ دو جھگڑنے والے جب ایک دوسرے کے حق کا انکار کر رہے ہوں، مثال کے طور پر ایک کسی حق کا دعویٰ کرے اور دوسرا اس کو جھوٹا بتائے۔ ایسی صورت میں گواہی وغیرہ کے ذریعے فیصلہ کرنا۔

قضا کی ایک نوعیت یہ بھی ہوتی ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے کے حق کا انکار نہ کریں، لیکن انھیں یہ معلوم نہ ہو کہ کس کا کتنا حق ہے، جیسے دونوں کا اختلاف وراثت کی تقسیم کے معاملے میں ہو، میاں بیوی کے باہمی حقوق کی تعیین کا معاملہ ہو یا دو شریکوں میں سے ہر ایک کو کتنا کتنا حصہ ملنا ہے۔

یہ موخر الذکر قضا کی نوعیت حلال وحرام کے شعبے سے تعلق رکھتی ہے۔ جب ایسے فریق کسی ایسے شخص سے فتویٰ طلب کریں جس کے فتوے پر انھیں اطمینان ہو تو یہی فتویٰ ان کے لیے کافی ہوگا۔ انھیں ضرورت نہیں ہے کہ کسی فیصلہ کرنے والے کے پاس جائیں۔ حاکم کی ضرورت انکار کرنے کی صورت میں پیش آتی ہے۔ ایسا عموماً ظلم و زیادتی کے ساتھ ہوتا ہے یا پھر سہو ونسیان کے ساتھ ہوتا ہے، لیکن حلال وحرام کے معاملات کی ضرورت نیک و بد سبھی کو پڑتی ہے۔ اس کے برعکس وہ معاملات جن میں قضا کی ضرورت پیش آتی ہے، ان کی ضرورت نیک لوگوں کو شاذ و نادر ہی پڑتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عمر رضی اللہ عنہ کو قضا کا منصب تفویض کیا تو پورے ایک سال میں بھی دو مقدمات ان کے سامنے نہیں آئے۔ صرف یہی نہیں اگر خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کیے ہوئے مقدمات شمار کیے جائیں تو مشکل سے دس کی تعداد پوری ہوگی۔ پھر قضا کے اس علم کا مقابلہ حلال وحرام کے علم سے کیوں کر کیا جاسکتا ہے جس پر دینِ اسلام کے قیام کا انحصار ہے اور جو ہر خاص و عام کی بنیادی ضرورت ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ صحابہ میں حلال وحرام کے سب سے بڑے عالم معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ہیں، محدثین کے متفقہ فیصلے کے مطابق آپ کے اس ارشاد سے زیادہ صحت کے قریب ہے جس میں آپ نے یہ فرمایا ہے کہ تم میں سب سے بڑے قاضی علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ بشرطیکہ علی رضی اللہ عنہ سے متعلق حدیث قابلِ حجت ہو اور اگر وہ سند کے اعتبار سے صحیح ترین ہو اور اس کی دلالت بھی واضح ہو، پھر بھی اس سے یہ دلیل لینے والا کہ علی رضی اللہ عنہ معاذ بن جبل سے زیادہ علم والے ہیں، جاہل ہے، پھر علی رضی اللہ عنہ کا مقابلہ ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما سے کرنا کیوں کر درست ہوسکتا ہے، جو معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے بھی بڑے عالم تھے؟! یہ بات درست ہے کہ جس حدیث میں معاذ اور زید کا ذکر آیا ہے، اس کو بعض لوگوں نے ضعیف کہا ہے، لیکن بعض محدثین نے اسے حسن قرار دیا ہے، لیکن جس حدیث میں علی رضی اللہ عنہ کا ذکر ہے وہ تو ضعیف ہے۔

رہا سوال اس حدیث کا جس میں آتا ہے کہ ''میں شہرِ علم ہوں۔'' وہ تو انتہائی ضعیف اور واہی حدیث ہے۔ اسی لیے اس کا شمار موضوعات اور مکذوبات میں ہوتا ہے اگرچہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس کی روایت کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابن الجوزی نے اسے موضوعات میں بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ روایت اپنی تمام سندوں کے ساتھ موضوع ہے۔[1]

اس روایت کا جھوٹ خود اس کے متن سے نمایاں ہے۔ اس کی سند پر غور وفکر کی چنداں حاجت نہیں، کیوں کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم علم کا شہر تھے تو پھر اس شہر کا ایک ہی دروازہ نہیں تھا، کیونکہ یہ جائز نہیں ہے کہ آپ کی طرف سے پیغامِ رسالت پہنچانے والا صرف ایک ہو، بلکہ یہ ضروری ہے کہ آپ کا پیغام پہنچانے والے تواتر کے درجے تک پہنچے ہوئے ہوں، تاکہ غیر موجود لوگوں تک ان کی پہنچائی ہوئی بات سے علم حاصل ہو۔ صرف ایک آدمی کی روایت سے قرائن کے بغیر علم کا فائدہ نہیں ہوتا۔ قرائن یا تو موجود ہی نہ ہوں یا ہوں لیکن اکثر لوگوں سے مخفی ہوں تو انھیں قرآن اور سنتِ متواترہ کا علم حاصل ہی نہیں ہوگا، اس کے برعکس نقلِ متواتر سے ہر خاص و عام کو علم حاصل ہوتا ہے۔

اس حدیث کو زندیقوں نے وضع کیا ہے یا اس کو وضع کرنے والا جاہل ہے۔ وہ اسے مدح سمجھ رہا ہے جب کہ یہ زندیقوں کے لیے دین میں طعن و تشنیع کا ایک چور دروازہ ہے، کیوں کہ ایسی صورت میں دین صرف ایک صحابی سے پہنچے گا۔

پھر جو ہمیں تواتر سے معلوم ہے، اس کے بھی یہ خلاف ہے، کیوں کہ مسلمانوں کے تمام شہروں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے علم علی رضی اللہ عنہ کی سند کے علاوہ دوسری سندوں سے پہنچا ہے۔ اہلِ مدینہ اور اہلِ مکہ کا معاملہ تو بالکل واضح ہے۔ یہی حال اہلِ شام اور اہلِ بصرہ کا ہے، کیوں کہ یہاں کے لوگ علی رضی اللہ عنہ سے بہت ہی کم روایت کرتے ہیں۔ ان کے علم کا غالب حصہ اہلِ کوفہ میں رہا ہے، لیکن یہاں بھی انھوں نے قرآن اور سنت کا علم عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت سے پہلے حاصل کیا تھا چہ جائے کہ وہ علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں یہ علم حاصل کرتے۔

مدینے کے تمام بڑے فقہا اور علما نے عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں دین کا علم حاصل کیا ہے۔ اس سے پہلے ان میں سے کسی ایک نے بھی علی رضی اللہ عنہ سے تعلیم نہیں حاصل کی، ہاں جب علی رضی اللہ عنہ یمن میں تھے تو وہاں کے لوگوں نے ان سے اسی طرح علم حاصل کیا تھا جس طرح اسی دور میں انھوں نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے علم حاصل کیا تھا۔ اہلِ یمن میں معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا قیام اور ان کی مدتِ تعلیم علی رضی اللہ عنہ کے وہاں قیام اور مدتِ تعلیم سے زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یمن کے لوگ علی اور قاضی شریح وغیرہ اکابر تابعین جنھوں نے معاذ رضی اللہ عنہ سے فقاہت حاصل کی تھی، اُن کے مقابلے میں معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے زیادہ روایت کرتے ہیں، پھر جب آپ کوفہ تشریف لائے تو اس سے پہلے ہی سے قاضی شریح

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٧٢٣) السلسلة الضعيفة (٢٩٥٥) ضعيف الجامع (١٤١٠)

وہاں کے قاضی تھے۔ اپنے دورِ خلافت میں علی رضی اللہ عنہ نے شریح اور عبیدہ سلمانی کو منصبِ قضا پر فائز دیکھا ہے اور ان دونوں حضرات نے علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ دوسروں سے تفقہ حاصل کیا تھا۔

علی رضی اللہ عنہ کے کوفہ پہنچنے سے پہلے اسلام کا علم اسلامی شہروں حجاز، شام، یمن، عراق، خراسان، مصر اور مغرب میں پھیل چکا تھا اور جب وہ کوفہ پہنچے ہیں تو علم کا بیشتر حصہ ان کے علاوہ دوسرے صحابہ کے ذریعے وہاں پہنچ چکا تھا۔ تبلیغِ علم کے سلسلے میں ان کو جو بھی خصوصیت حاصل ہے، اس سے زیادہ خصوصیات دوسرے صحابہ کو حاصل ہیں۔

تبلیغِ عام کی سعادت جو خلافت و ولایت سے حاصل ہوتی ہے وہ ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کو علی رضی اللہ عنہ سے کہیں زیادہ حاصل ہوئی ہے اور خاص تبلیغ کے معاملے میں تو ابن عباس رضی اللہ عنہما فتاویٰ کے میدان میں اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایتِ حدیث کے میدان میں علی رضی اللہ عنہ سے آگے ہیں، ہاں مگر علی رضی اللہ عنہ ان دونوں سے زیادہ بڑے عالم تھے، جس طرح ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما ان دونوں سے زیادہ بڑے عالم تھے۔ خلفائے راشدین نے بعض حضرات کو خاص علم کی تبلیغ کرنے کے مقابلے میں اس عام علم کی اشاعت کا فریضہ انجام دیا تھا جس کی لوگوں کو زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

بعض جھوٹے اور جاہل جو یہ روایت بیان کرتے ہیں کہ علی رضی اللہ عنہ کو دوسرے صحابہ کی بہ نسبت کوئی خاص علم حاصل تھا تو یہ بالکل باطل ہے۔ علی رضی اللہ عنہ سے صحیح میں ثابت ہے کہ ان سے دریافت کیا گیا: کیا آپ لوگوں کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی خاص علم ہے؟ انھوں نے جواب دیا: نہیں، قسم ہے اس ذات کی جس نے دانے کو پھاڑا ہے اور روح کو پیدا کیا ہے، سوائے اس فہم کے جو اللہ اپنے کسی بندے کو اپنی کتاب کا عطا کرتا ہے اور جو کچھ اس صحیفے میں ہے، اس کے علاوہ ہمیں کوئی خاص علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ملا ہے۔ اس صحیفے میں دیت میں ادا کیے جانے والے اونٹوں کی عمریں درج تھیں، قیدیوں کی رہائی کے مسائل تھے اور یہ حکم تھا کہ کسی مسلمان کو کافر کے بدلے میں قتل نہ کیا جائے۔ [1]

ایک دوسری روایت میں ہے: کیا آپ حضرات کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ ایسی وصیتیں کی تھیں جو دوسروں کو نہیں کی تھیں؟ علی رضی اللہ عنہ نے اس کی نفی فرمائی۔ اس کے علاوہ بھی بعض روایات ہیں جو یہ واضح کرتی ہیں کہ جس کسی نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علی رضی اللہ عنہ کو بطورِ خاص کوئی علم عطا فرمایا تھا، اس نے آپ پر جھوٹ باندھا ہے۔

بعض جاہلوں کا یہ کہنا تو بدترین جھوٹ ہے کہ علی رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے غسلِ جنازہ کا پانی پی لیا تھا جس کی وجہ سے اللہ نے آپ کو اولین و آخرین کے علم کا وارث بنا دیا تھا۔ میت کے غسل کا پانی پینا تو ویسے بھی جائز نہیں ہے اور نہ علی رضی اللہ عنہ نے اس طرح کا کوئی پانی پیا تھا۔ اگر ایسا کرنے سے علم حاصل ہوتا تو اس وقت وہاں جتنے حضرات موجود تھے، سب اس میں برابر کے شریک ہوتے۔ کسی صاحبِ علم نے اس قسم کی کوئی روایت نقل نہیں کی ہے۔

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢٨٨٢)

اسی طرح سے یہ جو ذکر کیا جاتا ہے کہ علی رضی اللہ عنہ کے پاس علم باطن تھا جس کی وجہ سے وہ حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما اور دیگر لوگوں سے ممتاز تھے۔ یہ ملحد باطنیوں اور ان جیسے لوگوں کی باتوں میں سے ہے جو ان سے بھی بڑے کافر ہیں، بلکہ ان کے اندر بعض کفر تو ایسے ہیں جو یہود و نصاریٰ کے یہاں بھی نہیں ہیں جیسے ان لوگوں کا کفر جو علی رضی اللہ عنہ کی الوہیت اور ان کی نبوت کا عقیدہ رکھتے ہیں اور یہ کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی زیادہ علم رکھتے تھے، بلکہ باطنی علوم میں وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے استاذ تھے۔ اس طرح کی اور بہت سی باتیں جو کفر و الحاد میں غلو کرنے والے کہتے ہیں۔ واللہ سبحانہ و تعالی أعلم[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ زیادہ بہادر تھے یا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ؟

سوال ایک آدمی نے کہا: حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہما سے زیادہ بہادر تھے۔ دوسرے نے کہا: ابوبکر رضی اللہ عنہ تمام صحابہ سے زیادہ بہادر تھے، ان دونوں میں سے کس کی رائے درست ہے؟

جواب الحمد للہ. اسلافِ امت اور ائمہ امت کا مذہب یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے زیادہ عالم، زیادہ دین دار، زیادہ بہادر اور زیادہ سخی تھے۔ اس کی تفصیل بڑی کتابوں میں دلائل کے ساتھ مذکور ہے۔

اہلِ علم کے ہاں شجاعت کا تعلق جسمانی قوت یا ہاتھ سے زیادہ قتل کرنے سے نہیں۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سارے انسانوں سے زیادہ بہادر تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے: ''جب جنگ زوروں پر ہوتی اور دشمن سے آمنا سامنا ہوتا تو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنا بچاؤ کرتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری نسبت دشمن کے سب سے زیادہ قریب ہوتے۔''[2] غزوۂ حنین کے موقع پر مسلمانوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی خچر دشمن کی طرف دوڑا رہے تھے اور اپنے آپ کو چھپائے بغیر، بلکہ اپنا نام لے کر یہ رجزیہ (شعر) پڑھ رہے تھے:

أنا النبي لا كذب أنا ابن عبد المطلب

''میں نبی ہوں، اس میں کوئی جھوٹ نہیں، میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔''[3]

اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے صرف ایک آدمی قتل کیا۔ یہ اُبی بن خلف تھا جس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ اُحد کے دن قتل کیا۔

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٣٩٨/٤_٤١٣)

[2] مسند أحمد (١٥٦/١) مسند أبي يعلىٰ (٢٥٨/١) صحیح مسلم، میں یہ براء رضی اللہ عنہ کا قول مروی ہے: (١٧٧٦)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٧٥، ١٧٧٦)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ایسے بھی تھے جنھوں نے ابوبکر و عمر اور عثمان و علی رضی اللہ عنہم سے زیادہ لوگوں کو قتل کیا تھا، گو وہ بہادری میں ان سے افضل نہیں تھے، مثلاً: براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے سو آدمیوں کو جنگ میں دعوتِ قتال دے کر قتل کیا تھا اور وہ ان کے علاوہ تھے جن کا خون کرنے میں وہ دوسروں کے ساتھ شریک تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں کسی خلیفہ نے بھی اتنی تعداد میں کافروں کو قتل نہیں کیا تھا، بلکہ سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ جو شیرِ خدا اور شیرِ رسول کا لقب رکھتے ہیں، انھوں نے بھی اتنی تعداد میں کافروں کو قتل نہیں کیا تھا، حالانکہ وہ شجاعت کی انتہا کو پہنچے ہوئے تھے۔ حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ بھی انتہا کے بہادر تھے۔ ان سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر نبی کا ایک حواری (مددگار) ہوتا ہے اور میرا حواری زبیر ہے۔''[1] انھوں نے بھی عہدِ نبوی میں اتنے لوگوں کو قتل نہیں کیا تھا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات سیرت و حدیث کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ محفوظ ہیں۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ اپنے نبی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے غزوات میں برکت ڈالتا تھا، تھوڑے عمل کے ساتھ اسلام غالب آ گیا، دعوت پھیل گئی اور لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہو گئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاتھوں قتل ہونے والے کافروں کی مجموعی تعداد ایک ہزار تک بھی نہیں پہنچی۔ یہ ایمان کی برکت تھی کہ ساری سرزمین عرب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں فتح ہو گئی۔

اسلام کی پہلی جنگ، غزوۂ بدر میں ستر کے قریب کافر مارے گئے اور تقریباً اتنے ہی قیدی بنائے گئے۔ جنگِ اُحد کے موقع پر بھی بہت تھوڑے کافر قتل ہوئے۔ اسی طرح غزوۂ خندق، فتح مکہ، خیبر اور حنین میں قتل ہونے والے کافروں کی تعداد بھی بہت زیادہ نہیں تھی۔ ایک ساتھ قتل ہونے والوں میں سب سے زیادہ تعداد بنو قریظہ کے مقتولوں کی تھی، یہ تین یا چار سو تھے اور ان سب کو قتل کر دیا گیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام غزوات کی تعداد بیس اکیس کے قریب ہے۔ لڑائی صرف ان نو میں ہوئی: بدر، اُحد، خندق، بنی مصطلق، قریظہ، خیبر، فتح مکہ، حنین اور طائف۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسلمانوں کی سب سے زیادہ تعداد غزوۂ تبوک میں تھی، اس میں دس ہزار نفوس شریک ہوئے، لیکن اس میں لڑائی نہ ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبوک کے مقام پر بیس دن قیام کیا اور نمازِ قصر پڑھتے رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم روم اور عرب کے عیسائیوں سے لڑنے کے لیے آئے، لیکن وہ لڑنے کے لیے نہ آئے۔ جہاں تک ان لڑائیوں کی بات ہے جن کا ذکر اور ان میں مرنے والوں کی کثیر تعداد کا چرچا یہ جھوٹے اور الزام تراش کرتے ہیں، ان کا جھوٹ ہر عالم کو معلوم ہے۔ اگر مقتولوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی جو یہ ذکر کرتے ہیں اور مہاجر و انصار صحابہ میں حضرت عمر، علی، حمزہ، زبیر، مقداد وغیرہم اور ابو ایوب، ابو طلحہ، ابو قتادہ، ابو دجانہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٩١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤١٥)

اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہم جیسے بہت زیادہ لڑنے والے تھے اور ان سب میں سے ایک کے ہاتھوں قتل ہونے والوں کی تعداد عمر و علی رضی اللہ عنہما کے ہاتھوں قتل ہونے والوں کی تعداد کے کم و بیش قریب تھی۔ دلیل یہ ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ آئے، انھوں نے اپنی تلوار حضرت فاطمہ کو دی اور کہا: اس سے ان کا خون دھو دے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا: ''اگر تم نے خوب کام (قتل) کیا ہے تو فلاں فلاں نے بھی خوب کیا ہے۔''[1] پھر تو یہ ماننے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے کہ ہر خلیفہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سو کافر قتل کیے ہوں!

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور براء بن مالک وغیرہما میں سے ایک ایک نے اس وجہ سے سو سے زیادہ لوگوں کو قتل کیا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی لڑتے رہے۔ جب انھوں نے مرتدوں، ایرانیوں اور رومیوں کے خلاف لڑائیوں میں حصہ لیا تو چونکہ کافروں کی تعداد بہت زیادہ تھی، اس لیے ان کے ہاتھوں مارے جانے والوں کی تعداد بھی زیادہ تھی۔ خلفائے راشدین میں سے کسی خلیفہ نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کافروں کے خلاف کسی جنگ میں بنفس نفیس شرکت نہیں کی، بلکہ ان کے ہاتھ میں زمامِ کار حکومت تھی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم وغیرہم سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی ان سے اور دوسروں سے مشورہ کیا کرتے تھے، لیکن حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ فتح مصر میں شریک ہوئے، سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فتح عراق میں شریک ہوئے اور عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ فتح شام میں کارگاہِ زار میں اترے۔ اس وضاحت کے بعد معلوم ہوا کہ شجاعت دل کی قوت و ثابت قدمی دشمن پر حملہ کرنے کی قوت اور جزع فزع اور خوف سے دور رہنے کا نام ہے۔ اس صفت کا تعلق دل سے ہے، کیوں کہ بہت سے ایسے لوگ ہوتے ہیں جو جسمانی طور پر بڑے مضبوط ہوتے ہیں اور تلوار بازی، نیزے بازی اور تیر اندازی میں بڑے مشاق ہوتے ہیں، لیکن دل کے بڑے کمزور اور پست ہمت ہوتے ہیں۔ یہ عاجز اور کمزور انسان ہوتا ہے۔ کبھی کوئی آدمی اپنے ہاتھوں سے سیکڑوں لوگ قتل کر دیتا ہے، مگر جب اس کو اہم امور سے واسطہ پڑے، دشمن اس کے خلاف اتر آئے تو یہ ان کے سامنے کمزور بن جاتا ہے یا ان سے ڈر محسوس کرنے لگتا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سب سے زیادہ مضبوط اعصاب اور دل کے مالک، ثابت قدمی میں سب سے آگے، جرأت مندی میں بے مثال اور رونے دھونے، کمزور پڑنے اور بزدلی سے کوسوں دور تھے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوف ناک مقامات میں اکیلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنے ساتھ رکھتے تھے، جس طرح ہجرت کے سفر میں آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ غارِ حراء میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم نشین تھے۔ دشمن ان دونوں کو تلاش کر رہے تھے اور انھوں نے دونوں ہی کے سر کی قیمت رکھی تھی۔ بدر کے دن عریش (عارضی جھونپڑی) میں بھی

---

[1] سیرة ابن هشام (۱۰٦/۳) الدلائل النبوة للبیهقي (۲۱۵/۳) البدایة والنهایة (٤٤٩/٥، ٤٥٠)

آپ اکیلے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے اور کافر خصوصی طور پر رسول اللہ ﷺ کو نشانہ بنانا چاہتے تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی، اس وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی جو شجاعت، بسالت، صبر، ثابت قدمی، سیاست، تدبیر، سمجھ داری، دین کی امامت، مرتدوں کی بیخ کنی، ان کے پھیلاؤ کا خاتمہ اور مسلمانوں کی معاونت ظاہر ہوئی، اس کا ذکر اس ورقے میں سما نہیں سکتا۔ جس کو شجاعت کا ذرہ بھر تجربہ ہے وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ مسلمانوں میں کوئی بھی شجاعت میں ان کے برابر تو کیا، قریب بھی نہیں تھا۔ اسی طرح ان کے بعد سب سے زیادہ شجاع حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے۔ پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سب سے زیادہ عالم بھی تھے۔ امام منصور بن عبدالجبار سمعانی نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد امت میں سب سے زیادہ علم رکھنے والے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے۔ اس مسئلے کی تفصیل کسی دوسری جگہ ہے۔ واللہ أعلم[1]

تفضیلِ علی رضی اللہ عنہ اور شبہات کا ازالہ

سوال اہلِ سنت سے وابستگی رکھنے والے اس شخص کے بارے میں کیا خیال ہے جس کے دل میں علی رضی اللہ عنہ پر خلفائے ثلاثہ کی افضلیت کے مسئلے میں مندرجہ ذیل نصوص کی وجہ سے شبہات پیدا ہوگئے ہیں:

نبی کریم ﷺ نے علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمھاری مجھ سے وہی نسبت ہے جو موسیٰ علیہ السلام سے ہارون علیہ السلام کی تھی۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: میں جہاد کا علم اس شخص کے ہاتھ میں دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے ....الخ۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں جس کا مولیٰ ہوں علی بھی اس کے مولیٰ ہیں۔ اے اللہ! اس سے محبت فرما جو علی سے محبت کرتا ہے اور اس سے نفرت کر جو علی سے نفرت کرتا ہے ....الخ۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: میں تمھیں اپنے اہلِ بیت کے سلسلے میں اللہ کی یاد دہانی کراتا ہوں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنفُسَنَا وَأَنفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَل لَّعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ ﴾ [آل عمران: ٦١]

''آؤ! ہم اپنے بیٹوں اور تمھارے بیٹوں کو بلا لیں اور اپنی عورتوں اور تمھاری عورتوں کو بھی اور اپنے آپ کو اور تمھیں بھی، پھر گڑگڑا کر دعا کریں، پس جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجیں۔''

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

---

[1] جامع المسائل (٣/٢٤٧_٢٥٠)

﴿ هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ﴾ [الدهر: ١]

''کیا انسان پر زمانے میں سے کوئی ایسا وقت گزرا ہے کہ وہ کوئی ایسی چیز نہیں تھا جس کا (کہیں) ذکر ہوا ہو؟''

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ﴾ [الحج: ١٩]

''یہ دو جھگڑنے والے ہیں، جنھوں نے اپنے رب کے بارے میں جھگڑا کیا، تو وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، ان کے لیے آگ کے کپڑے کاٹے جا چکے، ان کے سروں کے اوپر سے کھولتا ہوا پانی ڈالا جائے گا۔''

جواب سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ صاحبِ فضیلت کے لیے ثابت شدہ تفضیل ان امتیازات میں سے ہے کہ اس جیسے امتیازات مفضول میں نہ پائے جائیں۔ جب دونوں ایک مرتبے کے ہوں اور کسی ایک کے اندر کچھ منفرد امتیازات ہوں تو وہ افضل ہو گا، لیکن جو امتیازات دونوں میں مشترک ہوں ان کی وجہ سے ایک دوسرے سے افضل نہیں کہلائے گا۔

جب صورت حال یہ ہے تو معلوم ہونا چاہیے کہ صدیق رضی اللہ عنہ کے امتیازی فضائل ایسے ہیں جن میں کوئی ان کا شریک نہیں ہے، جب کہ علی رضی اللہ عنہ کے فضائل مشترک ہیں۔ مثال کے طور پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر میں اہلِ زمین میں سے کسی کو اپنا خلیل بناتا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیل بناتا۔[1] آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے: ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر کے علاوہ مسجد کی طرف کھلنے والے تمام گھروں کے جھروکے بند کر دیے جائیں۔[2] ایک ارشاد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ہے: تمام انسانوں میں مجھ پر سب سے بڑا احسان ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مصاحبت اور ان کی دولت کا ہے۔[3] ان احادیث میں صدیق رضی اللہ عنہ کے تین امتیازات ایسے ذکر کیے گئے ہیں جن میں کوئی ان کا شریک نہیں ہے:

① مصاحبت اور دولت کے اعتبار سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے زیادہ احسان ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ہے۔

② مسجد کی طرف کھلنے والے تمام جھروکے بند کر دیے گئے، صرف ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر کا جھروکا کھلا رہا۔ یہ بھی ابوبکر رضی اللہ عنہ کا امتیاز ہے۔ بعض کذابوں نے اسی جیسی روایت علی رضی اللہ عنہ کے لیے روایت کرنے کی کوشش کی ہے، جب کہ صحیح حدیث کے مقابلے میں موضوع روایت کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨٢)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨٢)

④ صدیق کو خلیل بنانے والی حدیث اس بات پر واضح دلیل ہے کہ انسانوں میں سے کوئی خلیل بننے کا مستحق نہیں ہے، اگر کسی کو استحقاق حاصل ہوتا تو وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ ہوتے۔ اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اگر کوئی صدیق سے زیادہ مستحق ہوتا تو اس کا نام آپ صلی اللہ علیہ وسلم ذکر فرماتے۔

اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے مرضِ وفات میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کو نماز پڑھانے کا حکم دینا بھی ان کا ایک امتیاز ہے۔ اسی طرح حج کے موقع پر ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مدینے میں امیر مقرر کرنا، تاکہ وہ سنت کو قائم کریں اور جاہلیت کے آثار ونقوش مٹا دیں، بھی ان کا ایک امتیاز ہے۔ اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک صحیح حدیث میں یہ ارشاد: اپنے والد اور بھائی کو بلاؤ، تاکہ میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے ایک تحریر لکھ دوں، بھی صدیقِ اکبر کا امتیاز ہے۔ اس طرح کی احادیث کی تعداد بہت زیادہ ہے، جن سے یہ صاف ظاہر ہے کہ صحابہ میں کوئی ایسا نہیں جو صدیق رضی اللہ عنہ کی ہم سری کا دعویٰ کر سکے۔

رہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا علی رضی اللہ عنہ کے لیے یہ کہنا کہ تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں،[1] یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ بعض دوسرے لوگوں، جیسے سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اور اشعری قبیلہ والوں سے بھی فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَيَحْلِفُونَ بِاللَّهِ إِنَّهُمْ لَمِنكُمْ وَمَا هُم مِّنكُمْ ﴾ [التوبة: ٥٦]

''اور اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ وہ تمھیں میں سے ہیں، حالانکہ وہ تم میں سے نہیں ہیں۔''

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو ہمیں فریب دے وہ ہم میں سے نہیں اور جو ہمارے خلاف تلوار اٹھائے وہ ہم میں سے نہیں۔[2] یہ حدیث بتاتی ہے کہ جو شخص ان کبیرہ گناہوں کو ترک کر دیتا ہے، وہ ہم میں سے ہے۔ لہٰذا ہر مومن کامل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کے بارے میں فرمایا: تو مجھ سے ہے اور میں تجھ سے ہوں۔[3] اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہا: تو ہمارا بھائی اور مولیٰ ہے۔[4] آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد صرف زید کے لیے خاص نہیں ہے، بلکہ آپ کے تمام موالی کی یہی حیثیت ہے۔

علی رضی اللہ عنہ سے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کہنا کہ ''میں کل جہاد کا علم اس شخص کے ہاتھ میں دوں گا .... الخ''[5] فضائلِ علی میں روایت کی جانے والی سب سے زیادہ صحیح حدیث ہے۔ بعض کذابین نے اس حدیث میں یہ جو اضافہ کر

---

① سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٧١٦) صحيح الجامع (١٤٩٧)

② صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠١)

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٥٢)

④ صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٥٢)

⑤ صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٩٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٠٥)

دیا ہے کہ جہاد کا علم پہلے ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما نے تھاما، لیکن دونوں بھاگ کھڑے ہوئے، حالانکہ صحیح میں ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرے اندر امارت کی خواہش اس دن کے سوا کبھی نہیں جاگی۔[1] یہ حدیث ناصبیوں کی تردید کرتی ہے جو علی رضی اللہ عنہ کی ذات کو نشانہ بناتے ہیں، لیکن یہ علی رضی اللہ عنہ کے امتیازات میں سے نہیں ہے، بلکہ ہر مومن جس کا ایمان کامل و مکمل ہے، اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے اور اللہ اور اس کے رسول اس سے محبت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ﴾ [المائدة: ٥٤]

''اللہ ایسے لوگ پیدا کر دے گا جن کو وہ دوست رکھے اور جسے وہ دوست رکھیں۔''

آیت میں جن لوگوں کا ذکر ہے، یہ وہی ہیں جنھوں نے مرتدین سے جنگ کی اور ان کے امام اور قائد ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے۔ صحیح میں ہے کہ انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا: لوگوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ کون محبوب ہے؟ فرمایا: عائشہ رضی اللہ عنہا۔ پوچھا: مردوں میں کون؟ فرمایا: ان کے والدِ محترم۔[2] یہ بھی صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے امتیازات میں سے ہے۔

علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کہنا میرے ساتھ تمھاری وہی نسبت ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حضرت ہارون علیہ السلام کی تھی۔ یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ تبوک کے موقعے پر ارشاد فرمائی تھی جب ان کو مدینے میں اپنا جانشین مقرر کیا تھا اور یہ کہا جانے لگا تھا کہ آپ نے علی رضی اللہ عنہ سے نفرت کرنے کی وجہ سے ان کو مدینے میں اپنا جانشین مقرر کر دیا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی غزوہ میں تشریف لے جاتے تھے تو اپنی امت میں سے کسی کو اپنا جانشین متعین کر کے جاتے تھے۔ مدینے میں اہلِ ایمان میں کئی حضرات ایسے تھے جو اس ذمے داری کو اٹھانے کے اہل تھے۔ غزوۂ تبوک میں آپ نے کسی کو پیچھے رہ جانے کی اجازت نہیں دی۔ پیچھے صرف وہی رہے جن کو کوئی شرعی عذر تھا یا وہ جو نافرمان تھے۔ چونکہ یہ جانشینی کمزور تھی اس لیے منافقین نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر طعنہ زنی کی۔ اس موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے تمھیں اپنا جانشین اس لیے نہیں بنایا ہے کہ میری نظر میں تمھارے اندر کوئی کمی ہے، بلکہ موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام کو اپنا جانشین بنایا تھا جب کہ وہ رسالت میں ان کے شریک تھے۔ کیا تم اس بات سے راضی نہیں ہو؟ یہ بات معلوم ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پہلے علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ دوسروں کو اپنا جانشین بنایا ہے اور وہ سب آپ کی نظر میں ہم مرتبہ تھے۔ لہٰذا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی علی رضی اللہ عنہ کے امتیازات میں سے نہیں ہے۔ اگر اس جانشینی کا معاملہ علی رضی اللہ عنہ کو دوسروں سے افضل قرار دینے کا ہوتا تو علی رضی اللہ عنہ سے یہ بات پوشیدہ نہ رہتی اور

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٠٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٦٢)

وہ آپ ﷺ سے روتے ہوئے ملاقات نہ کرتے۔

اس کی مزید وضاحت اس سے بھی ہوتی ہے کہ اس کے بعد آپ نے نو ہجری میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو علی رضی اللہ عنہ پر امیر مقرر فرمایا۔ عہد کے خاتمے کا اعلان کرنے کے لیے علی رضی اللہ عنہ کا بھیجا جانا آپ کے امتیازات میں سے نہیں تھا، کیوں کہ یہ دستور چلا آرہا تھا کہ معاہدہ کرنے اور معاہدہ توڑنے کا کام اہلِ بیت میں سے ہی کوئی کرتا تھا۔ آپ کے اہلِ بیت میں سے جو بھی معاہدے کے اختتام کا اعلان کرتا مقصد پورا ہو جاتا، لیکن چونکہ علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے بعد بنو ہاشم میں سب سے افضل تھے، اس لیے وہ دوسروں کے مقابلے میں اس کے زیادہ مستحق تھے، پھر جب آپ ﷺ نے علی رضی اللہ عنہ سے یہ فرمانے کے بعد کہ: ''کیا تم اس بات سے راضی ....الخ۔'' ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر کیا، اس سے ہمیں معلوم ہوا کہ اس حدیث میں اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ ہر پہلو سے آپ کی نظر میں علی رضی اللہ عنہ کا وہی مقام تھا جو موسیٰ علیہ السلام کی نظر میں ہارون علیہ السلام کا تھا، یہاں مشابہت صرف جانشینی کے مسئلے میں آپ ﷺ نے بیان کی تھی اور یہ جانشینی بھی علی رضی اللہ عنہ کے امتیازات میں سے نہیں ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تشبیہ ابراہیم اور عیسیٰ علیہما السلام سے دی ہے اور عمر رضی اللہ عنہ کو نوح اور موسیٰ علیہما السلام کے مشابہ قرار دیا ہے، جیسا کہ دونوں نے شبِ معراج میں اشارہ کیا تھا۔ یہ تشبیہ، علی رضی اللہ عنہ کی ہارون علیہ السلام کے ساتھ تشبیہ سے بڑی ہے، لیکن اس تشبیہ سے یہ لازم نہیں آتا کہ دونوں حضرات ان رسولوں کے مقام و مرتبے پر فائز ہیں۔ ایک چیز کی تشبیہ دوسری چیز کے ساتھ بعض وجوہات کی بنا پر ہوتی ہے اور اس کی مثالیں کتاب وسنت اور کلام عرب میں بھری پڑی ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی: ''میں جس کا مولیٰ ہوں علی بھی اس کے مولیٰ ہیں۔ اے اللہ اس سے محبت فرما جو علی سے محبت کرتا ہے ...... الخ۔'' ترمذی کے سوا دیگر امہات کتبِ حدیث میں یہ روایت نہیں ہے اور ترمذی میں بھی صرف اتنا ہے: ''میں جس کا مولیٰ ہوں علی بھی اس کے مولیٰ ہیں۔''[1] اضافی الفاظ حدیث میں نہیں ہیں۔ اس بابت جب امام احمد رحمہ اللہ سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے فرمایا: یہ کوئی اضافہ ہے اور بلاشبہ یہ مندرجہ ذیل وجوہات سے جھوٹ ہے:

1. نبی اکرم ﷺ کے علاوہ حق کسی ایک معین شخص میں محدود نہیں ہوتا۔ اگر یہ بات ہوتی تو اس کی ہر بات واجب الاتباع ہوتی۔ اور یہ حقیقت معلوم ہے کہ علی رضی اللہ عنہ سے صحابہ اور آپ کے پیروکاران مسائل میں اختلاف کرتے ہیں جن میں نص مخالفین کے نقطہ نظر کی تائید کرتی ہے، جیسے وہ حاملہ عورت جس کے شوہر کا انتقال ہو جائے۔

آپ ﷺ کا یہ ارشاد: ''اے اللہ! اس کی مدد فرما جو علی رضی اللہ عنہ کی مدد کرے۔'' حقیقتِ واقعہ کے خلاف ہے۔

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٧١٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٢١) السلسلة الصحيحة (١٧٥٠)

جنگِ صفین میں کئی ایک گروہوں نے ان کے ساتھ قتال کیا، لیکن وہ کامیاب نہیں ہوئے اور کئی گروہوں نے ان کے ساتھ قتال نہیں کیا، لیکن وہ نامراد نہیں ہوئے، جیسے سعد رضی اللہ عنہ جو فاتح عراق ہیں، علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جنگ میں شامل نہیں ہوئے۔ اسی طرح معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھی اور بنو امیہ کے جن لوگوں نے ان سے جنگ کی، انھوں نے کفار کے کئی ممالک فتح کیے اور اللہ نے ان کی مدد کی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد: ''اے اللہ! اس سے محبت فرما جو علی رضی اللہ عنہ سے محبت کرتا ہے اور اس سے نفرت فرما جو علی رضی اللہ عنہ سے نفرت کرتا ہے۔'' اساسیاتِ اسلام کے خلاف ہے، کیوں کہ قرآن نے بیان کیا ہے کہ اہلِ ایمان باہم قتال کرنے اور ایک دوسرے پر ظلم کرنے کے باوجود ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد: ''میں جس کا دوست ہوں علی رضی اللہ عنہ بھی اس کے دوست ہیں۔'' کے بارے میں بعض محدثین جیسے، امام بخاری رحمہ اللہ وغیرہ نے کلام کیا ہے اور بعض محدثین نے اس کو حسن بتایا ہے، اگر یہ حدیث صحیح تسلیم کرلی جائے تو اس سے ایسی محبت مراد نہیں لی جاسکتی جو علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ خاص ہو، بلکہ یہ محبت مشترکہ ہے اور وہ ہے ایمان کی محبت جو تمام مومنوں کے لیے ہوتی ہے۔ محبت کی ضد دشمنی ہے اور بلاشبہہ وہ مومنوں کی محبت کو غیر مومنوں کی محبت پر عزیز رکھتے تھے۔ اس سے ناصبیوں کی تردید ہوتی ہے۔

وہ حدیث جس میں یہ ذکر ہے کہ علی رضی اللہ عنہ نے نماز میں اپنی انگوٹھی صدقے میں دے دی تھی، حدیث کی معرفت رکھنے والوں کی نظر میں متفقہ طور پر یہ ایک جھوٹی حدیث ہے۔ اس کا جھوٹ ہونا کئی وجوہات سے ثابت ہوتا ہے۔ اس کی تفصیلات کسی دوسرے مقام پر ذکر کی گئی ہیں۔

غدیرِ خم کے دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد: ''میں اپنے اہلِ بیت کے سلسلے میں تمھیں اللہ کا واسطہ دیتا ہوں۔'' علی رضی اللہ عنہ کے خصائص میں سے نہیں ہے، بلکہ وہ تمام اہلِ بیت میں مساوی ہے۔ اس وصیت سے سب سے زیادہ دور روافض ہیں، کیوں کہ وہ عباس رضی اللہ عنہ اور ان کی نسلوں سے عداوت رکھتے ہیں، بلکہ تمام اہلِ بیت سے دشمنی کرتے ہیں اور ان کے خلاف کافروں کی مدد کرتے ہیں۔

آیتِ مباہلہ بھی علی رضی اللہ عنہ کے امتیازات میں سے نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے علی، فاطمہ اور ان کے دونوں بیٹوں کو بلایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بلانا اس لیے نہیں تھا کہ وہ امت میں افضل حضرات تھے، بلکہ اس لیے بلایا کہ وہ آپ کے اہلِ بیت میں سب سے خاص لوگ تھے، جیسا کہ حدیثِ کساء میں ہے: ''اے اللہ! یہ میرے اہلِ بیت ہیں، تو ان سے گندگی دور فرما دے اور ان کو پاکیزہ بنا دے۔''[1]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں دعا فرمائی اور ان کو اس دعا کے لیے خاص فرمایا۔ آیت میں لفظ ''النفس'' سے

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٨٧١) مسند أحمد (٣٣١/١) صحيح الترمذي (٢٥٦٢)

ایک ہی نوع کے لوگ مراد ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا﴾ [النور: ١٢]

''مومن مردوں اور عورتوں نے کیوں اپنے دلوں میں نیک گمان نہ کیا۔''

ایک دوسری جگہ فرمایا:

﴿فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ [البقرة: ٥٤] ''اور اپنے آپ کو قتل کرو۔''

یعنی تم میں سے بعض لوگ بعض لوگوں کو قتل کریں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: ''میں تم سے ہوں اور تم مجھ سے ہو۔''[1] سے مراد یہ نہیں ہے کہ علی رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ہیں۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ وہ اقارب میں سب سے زیادہ قدر و منزلت کے حامل تھے۔ ان کو قرابت اور ایمان دونوں کی خصوصیت حاصل تھی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے اقارب کو حاصل نہیں تھی۔ اسی لیے مباہلے میں یہ داخل تھے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا غیر اقارب میں ایسے لوگ نہ ہوں جو ان سے افضل ہوں، کیوں کہ مباہلہ اقربا ہی کے ذریعے ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ''یہ دو (فریق) ایک دوسرے کے دشمن اپنے پروردگار (کے بارے) میں جھگڑتے ہیں۔'' [الحج: ١٩] علی، حمزہ، عبیدہ، بلکہ تمام بدری صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان مشترک ہے۔ یہ تمام حضرات اس آیت میں شریک ہیں۔

رہا سوال سورت ﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ﴾ کا تو جس کسی نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت علی، فاطمہ اور ان کے دونوں بیٹوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے تو یہ جھوٹ ہے، کیوں کہ یہ سورت مکی ہے اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کی ولادت مدینے میں ہوئی ہے۔ اگر صحیح تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ جو کسی مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلائے وہ تمام صحابہ سے افضل ہے، بلکہ آیت ہر اس شخص کے لیے عام اور مشترک ہے جو یہ کارِ خیر انجام دے۔ یہ آیت اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ اس عمل پر ثواب ملے گا، جب کہ اس کے علاوہ دیگر اعمال، جیسے اللہ تعالیٰ پر ایمان، وقت پر نماز کا ارادہ کرنا اور جہاد اس سے افضل اعمال ہیں۔[2]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٥٢)

[2] مجموع الفتاویٰ (٤/٤١٤-٤١٩)

درود بھیجنے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خاص کرنا

سوال اس شخص کا کیا حکم ہے جو کہتا ہے کہ میں کسی دوسرے کو علی رضی اللہ عنہ سے افضل نہیں قرار دیتا، اور جب علی رضی اللہ عنہ کا ذکر کرتا ہے تو صرف تنہا ان پر درود بھیجتا ہے۔ کیا اس کے لیے جائز ہے کہ دوسروں کو شامل کیے بغیر تنہا علی رضی اللہ عنہ پر درود بھیجے؟

جواب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کوئی ایسا نہیں کہ جس پر تنہا درود بھیجنا جائز ہو۔ نہ ابوبکر، نہ عمر، نہ عثمان اور نہ علی رضی اللہ عنہم۔ جو کوئی ایسا کرتا ہے وہ بدعتی ہے، بلکہ یا تو سب پر درود بھیجے یا پھر کسی پر نہ بھیجے، بلکہ اس کے لیے سنت یہ ہے کہ کہے:

«اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيمَ وَعَلٰى آلِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّكَ حَمِيدٌ مَجِيدٌ، وَبَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيمَ وَعَلٰى آلِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّكَ حَمِيدٌ مَجِيدٌ »[1]

''اے اللہ! رحمت نازل فرما محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آل پر، جس طرح تو نے رحمت نازل کی ابراہیم علیہ السلام اور ان کی آل پر۔ بلاشبہہ تو ہر تعریف کا سزاوار اور بزرگ ہے۔ اے اللہ! برکت نازل فرما محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آل پر جس طرح تو نے برکت نازل کی ابراہیم علیہ السلام اور ان کی آل پر۔ بلاشبہہ تو ہر تعریف کا سزاوار اور بزرگ ہے۔''

اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ میں کسی دوسرے کو علی رضی اللہ عنہ پر فضیلت نہیں دیتا، وہ غلطی پر ہے اور شرعی دلائل کا مخالف ہے۔ واللہ أعلم[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طاقت کے دیو مالائی قصوں کی حقیقت

سوال کیا اہلِ علم کے نزدیک یہ بات صحیح ہے کہ علی رضی اللہ عنہ نے ایک کنویں میں جنوں سے جنگ کی تھی؟ خیبر کے دن انھوں نے اپنا ہاتھ پھیلایا تو پورے لشکر نے ان کے ہاتھ سے راستہ عبور کیا۔ انھوں نے غزوۂ احزاب میں حملہ کیا تو ان کے سامنے کا حصہ سترہ جماعتوں میں تقسیم ہو گیا اور ہر جماعت کے پیچھے ایک آدمی تھا جو شمشیر زنی کرتے ہوئے ''میں علی ہوں، میں علی ہوں!'' کے نعرے لگا رہا تھا۔ علی رضی اللہ عنہ کے پاس ایک تلوار تھی جس کا نام ذوالفقار تھا جو حسبِ ضرورت پھیلتی اور سمٹتی رہتی تھی۔ انھوں نے مرحب کو ایک ضرب لگائی، اس کے سر پر سنگِ مرمر کی خود تھی، اسی ایک ضرب نے اسے بھی کاٹ دیا اور اس کے گھوڑے کو بھی، بلکہ اس کی دھمک زمین نے بھی محسوس

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٩٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٠٦)

[2] مجموع الفتاویٰ (٤/٤٢٠)

کی۔ ایک منادی فضا میں یہ آواز لگا رہا تھا: لا سيف إلا ذوالفقار، لا فتى إلا علي (تلوار تو صرف ذوالفقار ہے اور جوان تو صرف علی ہیں)۔ انھوں نے حصن غراب پر منجنیق چلائی۔ وہ تمام انبیا کے پاس خفیہ طور پر بھیجے گئے تھے، لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس علانیہ بھیجے گئے۔ پچاس ہزار، بیس ہزار اور تیس ہزار کی فوج پر تنہا حملہ کرتے تھے۔ خیبر کا مرحب جب ان کے سامنے آیا تو آپ نے اپنی ایک ہی ضرب میں اسے لمبا چیر ڈالا اور اس کے گھوڑے کو چوڑائی میں کاٹ دیا۔ آپ کی تلوار دو یا تین گز زمین کے اندر چلی گئی۔ انھوں نے بابِ خیبر کی زنجیر پکڑی اور اسے ہلایا تو مدینے تک زلزلہ آ گیا اور قلعے کے سارے کنگرے زمیں بوس ہو گئے۔ کیا ان میں سے کوئی بات صحیح ہے؟

جواب الحمد لله. اہلِ ایمان اور اہلِ علم کے متفقہ فیصلے کے مطابق سوال میں ذکر کردہ تمام باتیں جھوٹ اور جعلی ہیں۔ نہ علی نے کبھی جنوں سے جنگ کی ہے اور نہ کسی صحابی نے، بلکہ جنوں نے بھی کسی انسان سے کبھی جنگ نہیں کی، نہ کسی معلوم کنویں میں اور نہ کسی دوسری جگہ۔

ماہرینِ فنِ حدیث کے نزدیک علی رضی اللہ عنہ کی جنوں سے جنگ کرنے کی جو حدیث مروی ہے وہ موضوع اور جھوٹ ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں علی رضی اللہ عنہ نے کسی ایسی فوج سے جنگ نہیں لڑی جس کی تعداد پچاس یا تیس ہزار رہی ہو، چہ جائے کہ انھوں نے اکیلے یہ جنگ لڑی ہو۔ جن غزوات میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد میں شریک تھے، ان کی تعداد کل نو ہے اور وہ یہ ہیں: بدر، احد، خندق، خیبر، فتح مکہ اور غزوۂ حنین وغیرہ۔

مشرکین کی سب سے بڑی فوج غزوۂ احزاب میں تھی جسے غزوۂ خندق بھی کہا جاتا ہے۔ انھوں نے مدینے کا محاصرہ کر رکھا تھا، لیکن اس غزوے میں تمام کافروں نے جنگ کی اور نہ سارے مسلمانوں نے جنگ کی۔ چند مسلمانوں نے قتال کیا، اسی طرح چند مشرکین نے جنگ کی۔ اسی غزوے میں علی رضی اللہ عنہ نے عمرو بن عبدود عامری کو قتل کیا۔ ایک بار کے علاوہ علی رضی اللہ عنہ نے کبھی بھی تنہا کسی کافر کو دعوتِ مبارزت نہیں دی اور نہ کبھی تنہا دو آدمیوں کو مقابلے کے لیے للکارا۔

جہاں تک خیبر میں مرحب کا معاملہ ہے تو اس سلسلے میں صحیح میں ثابت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں جہاد کا علَم ایسے شخص کو دوں گا جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے اور جس سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول محبت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسی کے ہاتھ سے فتح عطا فرمائے گا۔''[1] چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے علی رضی اللہ عنہ کو علم دیا۔ غزوۂ خیبر میں کئی روز تک جنگ جاری رہی اور اس کے بعض قلعے علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں فتح ہوئے۔

ایک اثر میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ علی رضی اللہ عنہ نے مرحب کو قتل کیا تھا۔ یہ بھی روایت ملتی ہے کہ اسے محمد بن مسلمہ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٩٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٠٤، ٢٤٠٧)

نے قتل کیا تھا۔ ممکن ہے مرحب نام کے دو آدمی رہے ہوں۔ جس طرح ایک عام آدمی کو قتل کیا جاتا ہے اسی طرح علی رضی اللہ عنہ نے مرحب کو قتل کیا تھا۔ نہ تو اسے لمبائی میں چیرا تھا اور نہ اس کے گھوڑے کو چوڑائی میں کاٹا تھا۔ نہ ان کی تلوار زمین میں اتری تھی اور نہ آسمان سے علی رضی اللہ عنہ یا کسی دوسرے کے لیے کوئی تلوار آئی تھی۔ نہ علی رضی اللہ عنہ نے ہاتھ پھیلا کر پوری فوج کو اس پر سے گزارا، نہ دروازہ اکھاڑنے سے خیبر کی فصیلیں ہلی تھیں اور نہ اس کے کنگرے زمیں بوس ہوئے تھے۔ خیبر کوئی شہر نہیں تھا، بلکہ الگ الگ کئی ایک قلعوں پر مشتمل تھا، جن میں ان کے کھیت تھے۔

لیکن یہ بھی مروی ہے کہ قلعے کا دروازہ اس وقت تک نہیں اکھاڑا گیا جب تک مسلمانوں نے خیبر کو فتح نہیں کر لیا۔ علی رضی اللہ عنہ نے منجنیق کبھی نہیں چلائی۔ علی رضی اللہ عنہ وغیرہ سے متعلق عام طور پر جتنی جنگوں کی روایات بیان کی جاتی ہیں، اس میں لوگوں نے جھوٹ بہت شامل کر دیا ہے جس طرح وہ عنترہ اور پہلوانوں کے بارے میں جھوٹی باتیں بیان کرتے رہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد علی رضی اللہ عنہ نے صرف تین جنگیں جنگِ جمل، جنگِ صفین اور جنگِ اہلِ نہروان لڑی ہیں۔ واللہ أعلم[1]

سوال اس شخص کا کیا حکم ہے جو کہتا ہے کہ علی رضی اللہ عنہ نے جنوں سے کنویں میں جنگ کی تھی اور بارہ ہزار کی فوج پر تنہا حملہ کیا تھا اور اسے شکست دی تھی؟

جواب کسی صحابی نے تنہا نہ کبھی کسی بارہ ہزار کی فوج پر حملہ کیا، نہ دس ہزار کی فوج پر اور نہ اس سے کم یا زیادہ پر، بلکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ کرنے کے لیے سب سے بڑی فوج جو اکٹھی ہوئی تھی وہ احزاب کی تھی جنھوں نے ایک ساتھ مل کر غزوۂ خندق کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا محاصرہ کیا تھا۔ ان کی تعداد سوال میں مذکور تعداد کے ضرور قریب تھی، لیکن اس غزوہ میں علی رضی اللہ عنہ نے صرف عمرو بن عبدود العامری نام کے ایک آدمی کو قتل کیا تھا۔

کسی انسان نے جنوں سے کبھی بھی جنگ نہیں کی، نہ علی رضی اللہ عنہ نے اور نہ کسی دوسرے صحابی نے بلکہ علی رضی اللہ عنہ کا مقام اس سے کہیں بلند تھا کہ وہ جنوں سے قتال کرتے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ جو جن تھے وہ ان جنوں سے جنگ کر رہے تھے جو کافروں کے ساتھ تھے۔ وہ اس جنگ کے سلسلے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے محتاج نہیں تھے کہ وہ ان کے ساتھ جنگ کریں۔[2]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٤/٤٩١۔٤٩٣)

[2] مجموع الفتاویٰ (٤/٤٩٤)

کیا ہر جمعہ کی شب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روح اٹھالی جاتی ہے؟

سوال ایک حدیث بیان کی جاتی ہے کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کی: اے اللہ کے رسول! علی رضی اللہ عنہ شبِ جمعہ کو چھوڑ کر دیگر ایام کی تمام راتوں میں رات بھر قیام کرتے ہیں۔ شبِ جمعہ کو وتر پڑھ کر سو جاتے ہیں اور طلوعِ فجر تک سوتے رہتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ہر جمعے کی شب میں علی رضی اللہ عنہ کی روح اٹھا لیتا ہے۔ پھر ان کی روح طلوعِ فجر تک آسمان میں تسبیح پڑھتی رہتی ہے۔

کیا یہ حدیث صحیح ہے یا نہیں؟ اسی طرح کیا علی رضی اللہ عنہ کی طرف اس بات کا انتساب صحیح ہے کہ انھوں نے فرمایا: مجھ سے آسمان کے راستوں کے بارے میں سوال کرو۔ میں آسمان کے راستوں کے ذریعے زمین کے راستوں کو جانتا ہوں؟

جواب علی رضی اللہ عنہ سے متعلق مذکورہ بالا حدیث جھوٹی ہے۔ اہلِ علم میں سے کسی نے اس کی روایت نہیں کی ہے۔ جہاں تک ان کے قول: ''مجھ سے آسمان کے راستوں کے بارے میں سوال کرو۔'' کا تعلق ہے تو یہ بات انھوں نے کہی ہے، لیکن اس سے ان کی مراد عام راستہ نہیں ہے، بلکہ اس طرح کے کلام سے ان کی مراد ان اعمالِ صالحہ سے ہوتی ہے جن کے ذریعے اللہ کا تقرب حاصل کیا جاتا ہے۔ واللہ أعلم[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے آلِ بیت ہونے اور ان پر درود پڑھنے کا انکار کرنے والا

سوال اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جو کہتا ہے کہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اہلِ بیت میں سے نہیں ہیں اور نہ ان پر درود بھیجنا جائز ہے، بلکہ ان پر درود بھیجنا بدعت ہے؟

جواب علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا اہلِ بیت میں سے ہونا اہلِ اسلام کی نظر میں اختلافی مسئلہ نہیں ہے۔ یہ بات اس قدر واضح ہے کہ اس پر کسی دلیل کی حاجت نہیں، بلکہ وہ اہلِ بیت میں افضل ترین شخصیت ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بنو ہاشم میں بھی سب سے افضل وہی ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چادر علی، فاطمہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم پر کھینچی اور فرمایا: ''اے اللہ! یہ میرے اہلِ بیت ہیں، ان سے گندگی دور فرما دے اور ان کو پاکیزہ تر بنا دے۔''[2]

رہا سوال تنہا علی رضی اللہ عنہ پر درود بھیجنے کا تو اس کا جواب ایک دوسرے سوال پر موقوف ہے اور وہ یہ کہ کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی دوسرے پر تنہا درود بھیجا جا سکتا ہے یا نہیں؟ مثال کے طور پر کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اے اللہ! درود بھیج

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٤/٤٩٥)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٨٧١) مسند أحمد (١/٣٣١) صحيح الترمذي، رقم الحديث (٢٥٦٢)

عمر رضی اللہ عنہ پر یا علی رضی اللہ عنہ پر؟ اس مسئلے میں علمائے اسلام کی آرا مختلف ہیں۔

امام مالک، امام شافعی اور حنابلہ کی ایک جماعت کا نقطہ نظر یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی پر تنہا درود نہیں بھیجا جائے گا، جیسا کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی جاتی ہے کہ انھوں نے فرمایا: مجھے نہیں معلوم کہ سوائے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی دوسرے پر درود بھیجنا مناسب ہے۔ امام احمد اور ان کے اکثر اصحاب کا خیال ہے کہ تنہا کسی پر درود بھیجنے میں کوئی حرج نہیں ہے، کیوں کہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے کہا تھا: "صلى الله عليك" (آپ پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوں) یہی قول صحیح تر اور بہتر ہے۔

لیکن صرف کسی ایک صحابی یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت داروں میں سے کسی ایک، جیسے علی یا کسی اور کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح درود کے لیے خاص کر لینا اور اس کے نام کے لیے ایک معروف شعار بنا لینا صحیح نہیں ہے اور یہی بدعت ہے۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اصلی قبر، اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت، سر و مدفن اور یزید کا انکار

سوال کیا کسی اہلِ علم، واقفِ حدیث یا دینِ اسلام کے مقتدی حضرات کے نزدیک یہ بات صحیح سند سے ثابت ہے کہ امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا تھا کہ جب میری وفات ہو جائے تو مجھے میری اونٹنی پر سوار کر کے آزاد چھوڑ دینا۔ جہاں وہ بیٹھ جائے وہیں مجھے دفن کر دینا۔ چنانچہ اونٹنی آپ کو لے کر روانہ ہو گئی اور کسی کو آپ کی قبر کی خبر نہ ہو سکی۔ یہ بات صحیح ہے یا نہیں؟ کیا کسی اہلِ علم کو ان کا مدفن معلوم ہے یا نہیں؟ انھیں کس وجہ سے شہید کیا گیا؟ واقعہ شہادت کب پیش آیا؟ ان کا قاتل کون تھا؟

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو کس نے شہید کیا؟ انھیں کس وجہ سے شہید کیا گیا؟ کیا یہ بات صحیح ہے کہ اہلِ بیت کو قیدی بنا لیا گیا تھا؟ اہلِ بیت کو ننگے بدن اونٹوں پر سوار کیا گیا تھا، کوئی پردہ نہیں تھا جس سے وہ ستر پوشی کر سکتے۔ جس اونٹ پر یہ سوار تھے اللہ نے اس کے دو کوہان بنا دیے جس کی آڑ لے کر انھوں نے اپنی پردہ پوشی کی۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سر جب تن سے جدا کر دیا گیا تو اسے تمام شہروں میں گھمایا گیا، دمشق لے جایا گیا اور پھر مصر پہنچایا گیا اور وہیں اس کی تدفین عمل میں آئی؟ یزید بن معاویہ ہی وہ شخص ہے جس نے اہلِ بیت کے ساتھ یہ سلوک کیا۔ کیا یہ بات صحیح ہے یا نہیں؟

کیا ان باتوں کا قائل اللہ کے دین میں بدعت پھیلا رہا ہے؟ اگر یہ باتیں وہ لوگوں کے درمیان بیان کرے تو اس کا کیا حکم ہے؟ اگر کوئی شخص جو ان باتوں کا منکر ہے، ان پر نکیر کرتا ہے تو کیا اسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کو ادا کرنے والا قرار دیا جائے گا یا نہیں؟

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٤/٤٩٦۔٤٩٧)

جواب الحمد للہ رب العالمین. امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی جس وصیت کا ذکر کیا گیا ہے کہ انھوں نے کہا تھا کہ وفات کے بعد انھیں ان کی سواری پر رکھ دیا جائے اور اسے آزاد چھوڑ دیا جائے اور جہاں وہ بیٹھ جائے وہیں ان کو دفن کر دیا جائے، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ یہ اہلِ علم کے متفقہ فیصلے کے مطابق سراسر جھوٹ اور موضوع ہے۔علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے ایسی کوئی وصیت نہیں کی تھی اور نہ ان کے ساتھ ایسا کچھ کیا گیا تھا۔علم و ثقاہت میں معروف کسی شخصیت نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ یہ باتیں وہی لوگ کہتے اور لکھتے ہیں جو کذابوں سے روایات بیان کرنے میں نمایاں شہرت رکھتے ہیں۔

کسی مسلمان میت کے ساتھ یہ رویہ اپنانا ناجائز اور حرام ہے اور کسی مرنے والے کے لیے اس قسم کی وصیت کرنا بھی جائز نہیں ہے، بلکہ یہ ایک طرح سے میت کا مثلہ کرنا ہے۔ ایسا کرنے میں کوئی فائدہ بھی نہیں ہے، کیوں کہ اگر اس کا مقصد ان کی قبر کو نگاہوں سے پوشیدہ رکھنا تھا تو اونٹنی جب بیٹھتی تو بہر حال ان کی قبر کھودی جاتی اور اس میں ان کو دفن کیا جاتا۔ ایسی صورت میں بغیر اس بری طرح کا مثلہ کیے بھی قبر کھودنا اور اس میں ان کو دفن کرنا ممکن تھا، پھر کیا ضرورت تھی کہ لاش اونٹ پر رکھ کر صحرا میں پھرنے کے لیے اسے آزاد چھوڑ دیا جائے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قبر کہاں ہے، اس مسئلے میں علما کے درمیان اختلاف ہے۔ اہلِ علم کے یہاں مشہور بات یہ ہے کہ ان کو کوفہ میں قصرِ امارت میں دفن کیا گیا تھا۔ ان کی قبر پوشیدہ رکھی گئی تھی کہ کہیں خوارج اسے اکھیڑ نہ دیں جو ان کی تکفیر کرتے تھے اور ان کا قتل جائز سمجھتے تھے، کیوں کہ خوارج ہی میں سے ایک شخص نے انھیں شہید کیا تھا جس کا نام عبدالرحمٰن بن ملجم مرادی تھا۔ اس نے اور دو دوسرے لوگوں نے باہم یہ طے کیا تھا کہ علی، معاویہ اور عمرو بن عاص کو قتل کر دیا جائے۔ یہ لوگ ان حضرات کو کافر کہتے تھے اور انھیں بھی کافر کہتے تھے جو ان کی خواہشات کے مطابق ان کی رائے سے موافقت نہیں رکھتے تھے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی مذمت میں تواتر سے احادیث منقول ہیں۔ امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ان کے تعلق سے حدیث دس سندوں سے، امام بخاری نے متعدد سندوں سے اور سنن و مسانید کے مولفین نے اس سے کہیں زیادہ سندوں سے ان کی مذمت میں احادیث نقل کی ہیں۔ ان کے سلسلے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

''تم میں سے ایک شخص ان کی نمازوں کے مقابلے میں اپنی نمازیں، ان کے روزوں کے مقابلے میں اپنے روزے اور ان کی تلاوت کے مقابلے میں اپنی تلاوت کو حقیر سمجھے گا۔ وہ قرآن پڑھیں گے، لیکن قرآن ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا۔ وہ اسلام سے ایسے نکل بھاگیں گے جس طرح شکار کے جسم سے تیر آر پار ہو جاتا ہے۔ اگر وہ مجھے مل گئے تو میں قومِ عاد کی طرح انھیں قتل کروں گا۔ ایک روایت میں

یہ الفاظ ہیں: اگر وہ تمھیں مل جائیں تو انھیں قتل کر دو، کیوں کہ جو انھیں قتل کرے گا وہ قیامت کے دن اللہ کے یہاں اجر و ثواب پائے گا، وہ اہلِ اسلام کو قتل کریں گے۔‘‘[1]

ان سے قتال کرنے کے مسئلے میں صحابہ کا اتفاق ہے، لیکن جس شخصیت کو ان سے قتال کرنے کا موقع ملا اور جس نے ان سے قتال کرنے کا حکم دیا وہ علی رضی اللہ عنہ ہیں، جیسا کہ صحیحین میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’ایک فرقہ لوگوں سے جدا ہو کر اسلام سے نکل بھاگے گا۔ ان سے قتال دو جماعتوں میں سے وہ جماعت کرے گی جو حق سے زیادہ قریب ہو گی۔‘‘[2] علی رضی اللہ عنہ نے انھیں نہروان میں قتل کیا۔ حروراء نامی ایک جگہ پر یہ سب اکٹھے ہوئے تھے، اسی لیے انھیں حروریہ کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔

علی رضی اللہ عنہ نے ان سے مناظرہ کرنے کے لیے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو بھیجا تھا۔ انھوں نے ان سے مناظرہ کیا۔ اس کے نتیجے میں تقریباً آدھے لوگ اسلام کی طرف واپس آ گئے، پھر جو آدھے بچے ہوئے تھے انھوں نے عبداللہ بن خباب کو قتل کر دیا اور مسلمانوں کے جانوروں پر دھاوا بول دیا۔ علی رضی اللہ عنہ نے ان سے قتال کے لیے نکلنے کا حکم دیا اور ان کے سامنے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث بیان کی جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے قتال کا حکم دیا تھا اور ان میں جو علامت پائی جائے گی اس کا ذکر فرمایا: ان میں ایک ناقص الید آدمی ہو گا، اس کی چھاتی پر گوشت کا ایک ٹکڑا ہو گا جس پر بال ہوں گے۔ جب علی رضی اللہ عنہ کی فوج نے ان سے جنگ کی تو اس علامت کا حامل آدمی انھیں ان میں ملا۔

جب تینوں خارجیوں نے مسلمانوں کے تینوں امرا کو قتل کرنے پر باہم اتفاق کر لیا تو عبدالرحمن بن ملجم نے علی رضی اللہ عنہ کو جمعہ کے دن ۱۷ رمضان ۴۰ھ کو شہید کر دیا۔ وہ پہلے سے چھپا بیٹھا تھا۔ جب علی رضی اللہ عنہ نمازِ فجر کے لیے نکلے تو اس نے آپ پر کاری ضرب لگائی۔ سنت یہ تھی کہ خلفا اور ان کے نائب امرا ہی مسلمانوں کی پنج وقتہ نمازوں میں امامت کرتے تھے۔ جمعہ، عیدین، استسقا اور سورج گرہن کی نماز اور نمازِ جنازہ وغیرہ میں وہی امامت فرماتے تھے۔ اس طرح جو سپہ سالار جنگ ہوتا تھا وہی نماز کا بھی امام ہوا کرتا تھا۔

لیکن جس خارجی نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ صرف زخمی کرنے میں کامیاب ہو سکا۔ طبیب نے عرض کی: آپ کا علاج ممکن تو ہے، لیکن آپ اب صاحبِ اولاد نہیں بن سکتے۔ کہا جاتا ہے کہ یہی وہ وقت تھا جب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے مسجد کے اندر مقصورہ (کمرہ) تعمیر کرایا اور ان کی اقتدا میں دوسرے امرا نے بھی مسجد کے اندر کمرے بنوائے، تاکہ وہ اور ان کے خاص لوگ اس میں نماز ادا کر سکیں۔ یہ کام اس اندیشے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٥٣٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٦٤)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٦٤)

کے پیشِ نظر کیا گیا تھا کہ کہیں امیر المومنین پر کوئی حملہ کر کے انھیں قتل نہ کر دے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کمروں میں جس طرح کی تزئین کی گئی اس کے جواز پر سوالیہ نشان لگتا ہے اور بعض لوگوں نے اس طرح کے کمروں میں نماز کو مکروہ قرار دیا ہے۔

جس خارجی نے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کا ارادہ کیا تھا، تو اتفاق سے اس دن انھوں نے اپنی جگہ پر خارجہ نام کے ایک صاحب کو نماز پڑھانے کے لیے کہہ دیا تھا۔ خارجی نے خارجہ کو عمرو بن عاص سمجھ کو انھیں قتل کر دیا، لیکن جب اس کے سامنے حقیقت کھلی تو اس نے کہا: أردت عمراً وأراد الله خارجة (میں نے عمرو کا ارادہ کیا، لیکن اللہ نے خارجہ کا ارادہ کیا) اسی دن سے اس کا یہ جملہ ضرب المثل بن گیا۔

کہا جاتا ہے کہ لوگوں نے تینوں حضرات کی قبروں کو خوارج کے ڈر سے پردہ خفا میں رکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے معاویہ رضی اللہ عنہ کو قصرِ امارت میں جامع مسجد کے قبلے کی طرف کے احاطے میں دفن کیا، جسے خضرا کے نام سے جانا جاتا ہے، یہی وہ قبر ہے جس کے بارے میں عوام میں یہ مشہور ہو گیا ہے کہ وہ حضرت ہود علیہ السلام کی قبر ہے، حالانکہ علما کا اتفاق ہے کہ ہود علیہ السلام دمشق کبھی نہیں آئے، بلکہ ان کی قبر بلادِ یمن میں ہے جہاں کے لیے ان کی بعثت ہوئی تھی۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ہود علیہ السلام کی قبر مکے میں ہے جہاں وہ ہجرت کر گئے تھے، لیکن کسی نے ان کی قبر دمشق میں نہیں بتائی ہے۔

بابِ صغیر سے باہر جس معاویہ کی قبر ہے اس سے حضرت معاویہ بن یزید مراد ہیں جو تقریباً چالیس دنوں تک گورنر رہے۔ وہ ایک زاہد انسان تھے اور ان میں خاصا تدین تھا۔ علی رضی اللہ عنہ مذکورہ بالا جگہ میں دفن کیے گئے، ان کی قبر پوشیدہ رکھی گئی تھی اسی لیے ان کی قبر کا پتا نہیں چلتا۔

نجف میں جو ''زیارت'' ہے، اس کے متعلق واقف کار متفق ہیں کہ وہ علی رضی اللہ عنہ کی نہیں بلکہ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی قبر ہے۔ تین صدیوں سے زیادہ عرصے تک کوئی یہ ذکر بھی نہیں کرتا تھا کہ یہ علی رضی اللہ عنہ کی قبر ہے اور نہ وہاں کوئی آتا جاتا تھا، حالانکہ وہاں اہلِ بیت، شیعہ اور دوسرے مسلمانوں کی کثرت تھی اور ان کی وہاں حکومت بھی تھی۔

اسے مشہد کی حیثیت بنو بویہ کی حکومت کے دور میں ملی جو عجمی تھے اور یہ واقعہ علی رضی اللہ عنہ کی وفات کے تین سو سال سے زیادہ عرصے کے بعد وقوع پذیر ہوا ہے۔ اس کے بارے میں لوگوں نے ایک حکایت بیان کی ہے کہ عباسی خلیفہ ہارون اس مقام پر آیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی حکایتیں بیان کی جاتی ہیں جو نا قابلِ حجت ہیں۔

جہاں تک سوال اہلِ بیت کے قیدی بنانے اور انھیں اونٹ پر بٹھانے کا ہے اور یہ کہ اونٹ کے دو کوہان اسی وقت نکلے اور وہ وہی بختی اونٹ ہے جو آج پایا جاتا ہے، تاکہ ان سے ان کی ستر پوشی ہو جائے تو یہ بدترین جھوٹ ہے اور اس کا جھوٹ بالکل واضح ہے۔ اسے زندیقوں اور منافقوں نے گھڑا ہے۔ اس سے ان کا مقصد اسلام، اہلِ اسلام،

اہلِ بیت اور دیگر حضرات کو مطعون کرنا ہے۔ اگر کوئی اس قسم کی بات، اس کی شہرت اور اس کا جھوٹا ہونا سنے گا تو وہ یہ خیال کرسکتا ہے یا اپنی زبان سے یہ کہہ سکتا ہے کہ انبیا کے جو معجزات اور اولیا کی جو کرامات ہم تک منقول ہو کر پہنچی ہیں، وہ بھی اسی طرح کی ہے۔ پھر جب یہ بات مشہور ہوگی کہ امت نے اپنے نبی کے اہلِ بیت کو قیدی بنایا ہے تو امت کا خیر امت ہونا طعن و تشنیع کا موضوع بنے گا اور اس سے علمِ الٰہی زیرِ بحث آئے گا، حالانکہ عقل و بصیرت رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ بختی اونٹ دنیا میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے اور اہلِ بیت کے وجود میں آنے سے پہلے دوسرے اونٹوں، بکریوں، گائے، گھوڑے، خچر اور مینڈھوں کی طرح موجود تھا۔

یہ جھوٹ ان کے اس جھوٹ کی طرح ہے کہ علی رضی اللہ عنہ نے خیبر میں اپنا ہاتھ اٹھایا تو خچر نے انھیں پیر مار دیا۔ اس پر انھوں نے خچر کو بد دعا دے دی کہ اللہ تیری نسل کا سلسلہ ختم کر دے، کیوں کہ ہر صاحبِ عقل جانتا ہے کہ خچر کی نسل ہوتی ہی نہیں ہے۔ مزید دل چسپ بات یہ ہے کہ خیبر میں مسلمانوں کے ساتھ خچر تھا ہی نہیں، بلکہ ان دنوں مسلمانوں کے پاس خچر ہی نہیں تھے۔ پہلا خچر جو ان کے پاس آیا وہ وہی تھا جسے بادشاہِ مصر مقوقس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدیہ کیا تھا اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہا۔

صحیح مسلم میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری امت میں دو طرح کے جہنمی ایسے ہیں جن کے مانند میں نے ابھی تک کسی کو نہیں دیکھا: ایسی عورتیں جو لباس میں ہونے کے باوجود ننگی رہیں گی، خود رَجھیں گی اور دوسروں کو رجھائیں گی۔ ان کے سروں پر بختی اونٹ کی طرح جوڑے ہوں گے۔ وہ نہ جنت میں جائیں گی اور نہ اس کی خوشبو پا سکیں گی اور ایسے مرد جن کے پاس گائے کی دم کی طرح کوڑے ہوں گے جن سے وہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کو ماریں گے۔''[1]

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان عورتوں کو جو سروں پر بڑے بڑے اور اونچے جوڑے باندھا کریں گی اور جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ظاہر ہوں گی، بختی اونٹ کے کوہان سے تشبیہ دی ہے۔ اگر صحابہ ایسے اونٹ پہچانتے نہ ہوتے تو اس تشبیہ کو کیسے سمجھ پاتے۔ یہ جوڑے والیاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ایک طویل مدت بعد اس دور میں ظاہر ہوئی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ بختی اونٹ اپنے ایسے سوار کی پردہ پوشی نہیں کرسکتا جو ننگے بدن ہو، لیکن اگر اللہ چاہے تو ناحق ننگے کیے ہر شخص کی مناسب پردہ پوشی کرسکتا ہے، جیسے ابراہیم خلیل علیہ السلام کی پردہ پوشی کی تھی جب انھیں ننگا کر کے منجنیق میں ڈال دیا گیا تھا۔

اس واقعے کا جھوٹ ہونا اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان برابر اہلِ کتاب وغیرہ کو قیدی بناتے رہے،

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢١٢٨)

لیکن کبھی یہ سننے میں نہیں آیا کہ انھوں نے عورتوں کو اس طرح ننگا کر کے سواری پر بٹھایا ہو کہ ان کا جسم ظاہر ہو رہا ہو، بلکہ زیادہ سے زیادہ ایک قیدی خاتون کا چہرہ، اس کے ہاتھ اور اس کے پیر کھلے رہتے تھے۔

اسلامی تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ دیدہ و دانستہ کسی مسلمان نے اہلِ بیت میں سے کسی شخصیت کو قیدی بنایا ہو اِلا یہ کہ جس وقت مسلمان قیدی بنا رہے ہوں اور نادانستہ طور پر کسی اہلِ بیت کو قیدی بنا لیں جیسے وہ عورت جسے دشمن نے قیدی بنا لیا تھا، پھر مسلمانوں نے اسے چھڑایا اور جب یہ پتا چلا کہ وہ اصلاً آزاد ہے تو اسے چھوڑ دیا۔ ممکن ہے کسی نے اہلِ بیت کے کسی فرد کے ساتھ ایسا کیا ہو جس نے اپنا نسب مخفی رکھا ہو اور اس نے محرماتِ الٰہیہ کو اپنے لیے حلال کر لیا ہو، ظاہر ہے ایسا کرنے والا کوئی زندیق اور منافق ہی ہو سکتا ہے۔ بہر حال اس کی حقیقت اللہ ہی کو معلوم ہے، لیکن اسلامی تاریخ میں کھلے عام ایسا کبھی نہیں ہوا۔

اسی طرح بعض جہلا یہ بھی کہتے ہیں کہ حجاج بن یوسف نے اشراف کو قتل کیا، بلکہ وہ ان کی نسل ختم کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔ یہ سب سے بڑی جہالت ہے اور لوگوں کے حالات سے بے خبری کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ حجاج نے ظالم ہونے اور خاصی بڑی تعداد میں لوگوں کا خون بہانے کے باوجود اشرافِ بنو ہاشم میں سے کسی ایک کو بھی قتل نہیں کیا ہے، بلکہ اس کے بادشاہ عبدالملک بن مروان نے اسے سختی کے ساتھ منع کیا تھا کہ اشراف بنو ہاشم سے کوئی تعرض کرے، بلکہ یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ جب لوگوں نے اشراف بنو ہاشم سے تعرض کیا اور حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تو وہ جنگ کے لیے آیا تھا۔ عبدالملک کے دورِ خلافت میں جب حجاج عراق میں اس کا گورنر تھا تو اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اس نے بنو ہاشم میں سے کسی کو قتل کیا ہو۔

جو قیدیوں کا ذکر کرتا ہے، وہ اس سے کہیں زیادہ مقتلِ حسین اور ان کے اہلِ بیت کو یزید کے پاس لے جانے کا ذکر کرتا ہے، لیکن یہ سب لوگ حقیقی صورتِ حال سے ناواقف ہیں۔ حتیٰ کہ ان کا گمان یہ بھی ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اہلِ بیت مصر لائے گئے اور سب کو وہاں قتل کر دیا گیا اور وہ خاصی بڑی تعداد میں تھے۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں کا ذہن تو ایسا بن گیا تھا کہ اگر وہ بعض مردوں کو دیکھتے کہ ان پر قتل کے کہیں نشانات نظر آ جاتے تو کہہ اٹھتے کہ یہ بھی ان قیدیوں میں سے تھے جنھیں قتل کر دیا گیا تھا۔ حالانکہ یہ ساری باتیں جھوٹ اور جہالت پر مبنی ہیں۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ ۱۰ محرم ۶۱ ھ کو شہید کیے گئے، ان کے قاتل پر اور اس پر بھی اللہ کی لعنت ہو جس نے ان کے قتل پر اظہارِ رضا مندی کیا تھا۔

جس شخص نے حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے پر ابھارا اس کا نام شمر بن ذی الجوشن تھا۔ یہی شخص ہے جو عراق کے گورنر عبیداللہ بن زیاد کو خط لکھ لکھ کر اس سلسلے میں ورغلاتا رہا اور جب حسین رضی اللہ عنہ نے ان کے سامنے وہی مطالبہ رکھا جو

دوسرے تمام مسلمان جو ان کے ساتھ جنگ میں شامل نہیں تھے، کر رہے تھے تو عبید اللہ بن زیاد نے اپنے نائب عمر بن سعد بن ابی وقاص کو حکم دیا کہ حسین سے جنگ کرے۔ حسین نے ان کے سامنے مطالبہ رکھا کہ وہ انھیں چھوڑ دیں، تاکہ وہ مدینے واپس لوٹ جائیں، یا انھیں ان کے ابن عم یزید کے پاس لے چلیں یا انھیں اسلامی سرحد پر کفار سے جنگ کرنے کے لیے جانے دیں، لیکن انھوں نے ان کا مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا اور گرفتار کرنے یا جنگ کرنے پر اصرار کرتے رہے، چنانچہ انھوں نے حسین سے جنگ کی اور انھیں، ان کے اہلِ بیت اور ان کے ساتھ کے کچھ دوسرے لوگوں کو شہید کر دیا۔

شہادت کے بعد انھوں نے ان کا ساز و سامان اور ان کے اہلِ بیت کو یزید بن معاویہ کے پاس دمشق پہنچا دیا، حالانکہ یزید نے انھیں حسین کو قتل کرنے کا حکم نہیں دیا تھا اور نہ اس خبر پر اس نے اظہارِ مسرت کیا اور نہ اپنی رضا مندی ظاہر کی، بلکہ اس موقع پر جو بات کہی، اس میں قتل کرنے والوں ہی کی مذمت کی، جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے کہا: میں اہلِ عراق سے حسین کو قتل کیے بغیر بھی راضی ہو جاتا، اللہ کی لعنت ہو ابن مرجانہ یعنی عبید اللہ بن زیاد پر اگر اس کے اور حسین کے درمیان رحمی رشتہ ہوتا تو وہ انھیں قتل نہ کرتا۔ اس سے یزید کا مقصد اس استلحاق کو مطعون کرنا تھا جو اس کا باپ زیاد کرتا تھا کہ اپنا نسب ابوسفیان صخر بن حرب سے جوڑتا تھا جب کہ بنو امیہ اور بنو ہاشم دونوں بنو عبد مناف سے تعلق رکھتے تھے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جب حسین رضی اللہ عنہ کا ساز و سامان اور ان کے اہلِ بیت یزید کے پاس لائے گئے تو اس کے گھر میں آہ و بکا برپا ہو، اس نے ان کے اہلِ بیت کی تکریم کی اور انتہائی قدر و منزلت سے انھیں رکھا۔ ان کے صاحب زادے علی کو یہ اختیار دیا کہ وہ چاہیں تو اس کے پاس رہیں اور چاہیں تو مدینہ چلے جائیں۔ انھوں نے مدینے جانے کو ترجیح دی۔ جامع دمشق میں جس جگہ کو علی بن حسین کا قید خانہ کہا جاتا ہے، وہ جھوٹ ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

لیکن ان سب کے باوجود یزید نے حسین رضی اللہ عنہ کے قاتل پر حد نافذ نہیں کی اور نہ حسین کا بدلہ لیا، بلکہ الٹا اپنی حکومت کے استحکام کے لیے ان کے اعوان و انصار کو قتل کرایا۔ اس کے بارے میں نقل کیا جاتا ہے کہ اس نے قتلِ حسین کی تمثیل پیش کرتے ہوئے چند ایسے اشعار پڑھے جن کا قائل کفرِ صریح کا مرتکب ہوا ہے۔ اس کے اشعار یہ ہیں ع

لما بدت تلك الحمول وأشرفت   تلك الرؤوس على رُبى جيرون
نعق الغراب فقلت نح أو لا تنح   فلقد قضيت من النبي ديوني

''جب جیرون کے ٹیلوں پر وہ سواریاں اور وہ سر نمودار ہوئے تو کوا کائیں کائیں کرنے لگا۔ میں نے کہا:
تو نوحہ کر یا نہ کر، میں نے تو نبی ﷺ سے اپنے قرضے چکا لیے ہیں۔''

یہ شعر سراپائے کفر ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یزید کے بارے میں لوگوں کی آرا مختلف ہیں۔ ایک گروہ نے انھیں کافر قرار دیا ہے۔ صرف یہی نہیں، بلکہ یہ گروہ ان کے ساتھ ساتھ ان کے والدین کو بھی کافر بتاتا ہے، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ ابوبکر، عمر، عثمان اور جمہور مہاجرین اور انصار رضی اللہ عنہم کو کافر قرار دیتا ہے۔ یہ گروہ رافضیوں کا ہے جو خلقِ خدا میں سب سے زیادہ جاہل اور سب سے زیادہ گمراہ ہے۔ اللہ عزوجل، اس کے رسول، صحابہ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت داروں اور دوسرے لوگوں کے تعلق سے جھوٹ بولنے میں سب سے زیادہ آگے ہے۔ انھوں نے یزید کے تعلق سے اسی طرح جھوٹی باتیں بنائی ہیں، جس طرح وہ ابوبکر، عمر اور عثمان کے سلسلے میں جھوٹ گھڑتے رہے ہیں، بلکہ یزید کے سلسلے میں ان کا جھوٹ تو نسبتاً آسان ہے۔

اس کے برعکس ایک دوسرا گروہ ہے جو یزید کو ہدایت یاب ائمہ، عدل و انصاف کرنے والے خلفا اور صالح مسلمانوں میں شمار کرتا ہے، بلکہ بعض حضرات تو اسے صحابہ کی جماعت کا فرد سمجھتے ہیں اور کچھ لوگ اسے نبی بنا دیتے ہیں۔ یہ بھی ایک کھلی ہوئی جہالت اور گمراہی ہے، بلکہ بدترین جھوٹ اور ایک ناممکن بات ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ یزید دیگر بادشاہوں کی طرح ایک بادشاہ تھا، اس نے کار ہائے خیر بھی کیے ہیں اور گناہوں سے بھی اس کا دامن محفوظ نہیں ہے۔ جس طرح دیگر بادشاہوں کے بارے میں ہم تبصرہ کرتے ہیں، اسی طرح کا تبصرہ ہم یزید کے متعلق بھی کرتے ہیں۔ ہم نے اس مسئلے کو کئی جگہوں پر شرح و بسط سے ذکر کیا ہے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ دریائے فرات کے قریب کربلا میں شہید کیے گئے اور اسی جگہ ان کا جسدِ پاک دفن کیا گیا جب کہ ان کا سر عبیداللہ بن زیاد کے پاس لے جایا گیا۔ یہی بات امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں اور دیگر ائمہ حدیث نے ذکر کی ہے۔

رہی یہ بات کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سر شام لے جایا گیا تھا تو اس سلسلے کی تمام روایات کی سندیں منقطع ہیں۔ کوئی ایک بھی سند درست نہیں ہے، بلکہ ان روایات کے بین السطور سے خود پتا چلتا ہے کہ یہ جھوٹی اور من گھڑت ہیں۔ ذکر کیا جاتا ہے کہ یزید حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سامنے کے دونوں دانتوں کو چھڑی سے کرید رہا تھا اور اس کی اس حرکت پر وہاں موجود بعض صحابہ جیسے حضرات انس بن مالک اور ابو برزہ رضی اللہ عنہما نے اس پر نکیر فرمائی تھی۔ یہ ایک کھلا ہوا دھوکا اور تلبیس ہے، کیوں کہ دانتوں کو کریدنے والا عبیداللہ بن زیاد تھا، جیسا کہ صحیح میں ہے اور کتبِ مسانید میں اس کا ذکر ہے۔ جھوٹوں نے عبیداللہ بن زیاد کی جگہ یزید کو رکھ دیا۔ اس میں شک نہیں کہ عبیداللہ بن زیاد نے حضرت حسین کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا اور اسی کے سامنے ان کا سر لا کر رکھا گیا تھا اور پھر اسی وجہ سے عبیداللہ بن زیاد کو قتل بھی کیا گیا

تھا۔ اس بات کا جھوٹ ہونا اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ انس بن مالک اور ابو برزہ رضی اللہ عنہما جیسے صحابہ کرام جن کا نام اس روایت میں لیا گیا ہے۔ اس وقت شام میں نہیں، بلکہ عراق میں تھے۔ ان لوگوں کی جہالت کی انتہا یہ ہے کہ جس روایت کو اپنی دلیل بناتے ہیں، وہ ان کے جھوٹ کا پردہ خود فاش کر دیتی ہے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سر مبارک مصر لے جایا گیا۔ یہ بات بھی لوگوں کے متفقہ فیصلے کے مطابق باطل ہے۔ علما کا اتفاق ہے کہ قاہرہ، مصر میں مشہدِ حسین کے نام سے جو مشہد ہے، وہ باطل ہے، اس میں نہ حسین کا سر ہے اور نہ کوئی اور چیز۔ یہ مشہد بنو عبیداللہ بن القداح کے آخری دورِ حکومت میں وجود میں آیا ہے، جنھوں نے مصر کے علاقوں پر دوسو سال تک حکمرانی کی تھی۔ پھر ان کی حکومت کا خاتمہ نورالدین محمود کے ایام میں ہوا۔ یہ کہا کرتے تھے کہ ہم فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد ہیں اور اپنے اشراف ہونے کے مدعی تھے، لیکن ماہرینِ انساب کہتے ہیں کہ ان کا یہ نسب صحیح نہیں ہے، بلکہ کہا یہ جاتا ہے کہ ان کے اجداد میں کوئی شریف حسینی کا ربیب تھا، اسی تعلق سے انھوں نے خود کو اشراف لکھنا شروع کر دیا۔

ان کے افکار و نظریات اور عقائد و خیالات منکر ہیں۔ دینِ اسلام سے واقفیت رکھنے والے اہلِ علم کا اس پر اتفاق ہے۔ یہ تشیع کا اظہار کرتے تھے، لیکن ان کے اکابرین اور پیروکاروں کی اکثریت اندرونِ خانہ باطنی قرامطہ کا مذہب اختیار کیے ہوئے تھی جو روئے زمین پر ایک خبیث ترین مذہب ہے۔ یہ مذہب یہود و نصاریٰ کے مذہب سے بھی زیادہ برا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ ان میں شامل ہوئے ان میں عام طور پر اہلِ زندقہ، منافقین اور اہلِ بدعت جیسے فلسفی، مباحی، رافضی اور ان کی طرح کے دوسرے لوگ تھے، جن کے بارے میں اہلِ علم اور اہلِ ایمان کو کوئی شبہہ نہیں ہے کہ ان کا تعلق نہ علم سے ہے اور نہ ایمان سے۔

یہ مشہد پانچویں صدی ہجری میں ایجاد کیا گیا اور اسے عسقلان سے منتقل کیا گیا تھا۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد ان لوگوں کی حکومت ان کے آخری بادشاہ عاضد کی وفات کے ساتھ ہی ختم ہوگئی جنھوں نے یہ بدعت ایجاد کی تھی۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سر کہاں ہے؟ اس تعلق سے اہلِ علم نے جس بات کو راجح قرار دیا ہے، وہ ہے جس کا ذکر زبیر بن بکار نے کتاب ''انسابِ قریش'' میں کیا ہے اور اس طرح کی باتوں میں زبیر سب سے زیادہ علم رکھنے والے اور سب سے زیادہ ثقہ تھے۔ انھوں نے ذکر کیا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر مدینہ لایا گیا اور وہیں اس کی تدفین عمل میں آئی، کیوں کہ مدینے ہی میں ان کے بھائی حسن، ان کے والد کے چچا عباس، ان کے بیٹے علی اور دیگر متعلقین کی قبریں تھیں۔

ابوالخطاب بن دحیہ نے جن کو ''ذوالنسبين بين دحية والحسين'' (دحیہ اور حسین کے درمیان دو نسب والے) کہا جاتا ہے، کتاب ''العلم المشهور في فضل الأيام والشهور'' میں محمد بن حسن کی سند سے زبیر بن بکار

کی ذکر کردہ روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سر لایا گیا اور بنو امیہ عمرو بن سعید کے پاس جمع تھے، انھوں نے زور زور سے رونے کی آواز سنی۔ پوچھا: یہ کیا ہو رہا ہے؟ بتایا گیا کہ بنو ہاشم کی خواتین ہیں جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سر دیکھ کر رو رہی ہیں۔ چنانچہ حسین رضی اللہ عنہ کا سر عمرو کے پاس لایا گیا۔ اس نے کہا: واللہ! میں تو چاہتا یہ تھا کہ امیر المومنین میرے پاس حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سر نہ بھیجتے۔ ابن دحیہ کہتے ہیں کہ یہ اثر اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سر مدینے لایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ جتنی روایات بیان کی جاتی ہیں، ان میں سے کوئی بھی صحیح نہیں ہیں۔ زبیر تمام ماہرینِ انساب سے بڑے عالم اور اس فن کی افضل ترین شخصیت ہیں۔ یہ جو ذکر کیا جاتا ہے کہ حسین رضی اللہ عنہ کا سر عسقلان کے مشہد میں تھا، ایک غلط بات ہے، اسے کوئی ایسا شخص تسلیم نہیں کر سکتا جس کے اندر ذرا بھی عقل و ادراک موجود ہے، کیوں کہ بنو امیہ، خواہ وہ قتل، عداوت اور نفرت میں کتنا ہی آگے کیوں نہ ہوں، ان کے بارے میں یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سر پر مشہد تعمیر کریں گے، تاکہ اس کی زیارت کی جائے۔

یہ ہے واقعہ کی اصل نوعیت اور قاسم عیسیٰ بن ظافر کے دورِ حکومت میں جب ان کی حکومت تباہی کے دہانے پر کھڑی تھی اور وہ مرمٹ رہے تھے، جو کچھ بنو عبید نے اپنے دورِ زوال میں جعل سازی کی، اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور نہ وہ قابلِ ذکر ہے۔ قاسم عیسیٰ بن ظافر وہ شخص ہے جو اس وقت خلیفہ بنایا گیا جب اس کی عمر کل پانچ سال اور چند ماہ کی تھی۔ اس کی ولادت جمعے کے دن ۱۱ محرم ۵۴۴ھ کو ہوئی تھی اور اس کے ہاتھ پر بیعت اس کے باپ ظافر کے قتل کے دوسرے دن جمعرات کو ۳۰ محرم ۵۴۹ھ کو کی گئی تھی اور اس کی عمر وہی تھی جو اوپر ذکر کی گئی۔ اس کی وفات اس وقت ہوئی تھی جب اس کی عمر ۱۱ سال چھ ماہ اور چند ایام کی تھی، کیوں کہ وہ جمعے کی رات میں ۱۳ رجب ۵۵۵ھ کو فوت ہوا تھا۔ اسی کے ایامِ حکومت میں قاہرہ کے اس بدعی مشہد کی تعمیر ہوئی اور لوگوں کے سامنے عسقلان کے دونوں مشہدوں کے ساتھ یہاں بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سر کی تدفین کا ڈھونگ رچایا گیا، تاکہ لوگوں کے دلوں میں اس کا تقدس پیدا کر دیا جائے۔ یہ جعل سازی دانستہ کی گئی اور اس کے پیچھے خاص مقاصد تھے، انھوں نے لوگوں کی توجہ مبذول کرانے کے لیے ان کے جذبات کا استحصال کیا تھا۔ اسے طلائع بن رزیک نام کے رافضی نے بنایا تھا اس کا ذکر ان تمام مولفین نے کیا ہے جنھوں نے مقتلِ حسین پر لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ حسین کا سر مبارک کبھی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہوا۔ اس مشہد کی یہ تفصیلات ابوالخطاب بن دحیہ نے فراہم کی ہیں اور تمام اہلِ علم کا اتفاق ہے کہ یہ سراسر جھوٹ اور افترا پردازی ہے۔

اس موضوع اور اس کے متعلقات پر گفتگو بہت طویل اور منتشر ہے۔ حضرت عثمان اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کی شہادت اور ان کی طرح کے دیگر واقعات کی وجہ سے بڑے بڑے فتنے اٹھ کھڑے ہوئے، جھوٹی باتیں پھیلائی جانے

لگیں بے سروپا عقائد ونظریات وجود میں آئے۔ اس طرح کی باتوں میں متقدمین اور متاخرین کی کئی ایک جماعتیں مبتلا اور ملوث رہیں۔ امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ پر طرح طرح کے جھوٹ باندھے گئے۔ دونوں کے بعض طرف دار ایک جانب سے جھوٹ بولتے رہے تو دوسری جانب سے ان سے بغض و عداوت رکھنے والے جھوٹ بول کر اس کا جواب دیتے رہے۔ خاص طور پر یہ صورتِ حال شہادتِ عثمان کے بعد پیدا ہوئی، جھوٹ اور غلط نظریات کا بازار گرم ہوا۔

امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے متعلق دونوں جانب سے ایسی ایسی باتیں کہی گئیں جن سے ان کا دامن پاک ہے اور وہ ان سے بری الذمہ ہیں، پھر تو بدعت، بے بنیاد آرا اور جھوٹ بڑھتا ہی چلا گیا، یہاں تک کہ ایسے معاملات سامنے آئے جن کا تذکرہ باعثِ طوالت ہوگا۔ مثال کے طور پر اکثر متاخرین نے یومِ عاشورا کی بدعت ایجاد کی۔ ایک قوم اسے یومِ ماتم قرار دے کر نوحہ اور جزع وفزع کرنے لگی، اپنی جانوں پر اور جانوروں پر ظلم ڈھانے لگی، وفات پا جانے والے اللہ کے ولیوں پر سب وشتم کرنے لگی، اہلِ بیت کی طرف جھوٹی باتیں منسوب کرنے کا ایک سلسلہ چل پڑا اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ منکرات اور بدعات کا ظہور ہونے لگا جن سے اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت میں منع کیا گیا تھا اور جو اہلِ اسلام کے متفقہ فیصلے کے مطابق ناجائز تھیں۔

اللہ تعالیٰ نے عاشورا کے دن حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو شہادت عطا فرما کر ان کو عزت بخشی، ان کے قاتل کو ذلیل اور رسوا کیا، اسی طرح ذلت و رسوائی اس کے ہاتھ بھی آئی جس نے ان کے قتل میں معاونت کی اور اس سے خوش ہوا۔ متقدمین شہدائے اسلام کی سیرت ان کے لیے اسوہ حسنہ بنی، وہ اور ان کے بھائی نوجوانانِ اہلِ جنت کے سردار ہیں، غلبۂ اسلام کے دور میں ان کی تربیت ہوئی، البتہ چونکہ اپنے اہلِ بیت کے دیگر افراد کی طرح ہجرت، جہاد اور مصائب پر صبر کا شرف حاصل نہیں کر سکے تھے، اس لیے اللہ نے ان کے عز وشرف کی تکمیل کے لیے انھیں شہادت کے درجہ علیا پر فائز فرمایا اور ان کا مقام اونچا کیا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا قتل کیا جانا کسی مصیبتِ عظمیٰ سے کم نہیں تھا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مصیبت کے موقع پر "إنا لله وإنا إليه راجعون" پڑھنے کا حکم دیا ہے جیسا کہ اس کا ارشاد ہے:

﴿وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿١٥٥﴾ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿١٥٦﴾ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَّاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ﴾ [البقرة: ١٥٥-١٥٧]

''صبر کرنے والوں کو (اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی) بشارت سنا دو۔ ان لوگوں پر جب کوئی مصیبت واقع ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کا مال ہیں اور اُسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر اُن کے رب کی مہربانی اور رحمت ہے اور یہی سیدھے رستے پر ہیں۔''

صحیحین میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''جو بھی مسلمان کسی مصیبت سے دوچار ہونے پر "إنا لله وإنا إليه راجعون" پڑھے اور کہے: اے اللہ! میری اس مصیبت پر مجھے اجر عطا فرما اور اس سے بہتر بدلہ دے تو اللہ تعالیٰ اسے اس کی مصیبت پر اجر دیتا ہے اور اس کا اسے بہترین بدلہ عطا کرتا ہے۔''[1]

اس موقع پر کتنی اچھی روایت بیان کی جاتی ہے۔ امام احمد اور امام ابن ماجہ رحمہما اللہ نے نقل کیا ہے کہ فاطمہ بنت حسین اپنے والد حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے روایت کرتی ہیں، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بندہ مسلم کو جو بھی مصیبت پہنچے، جب وہ اسے یاد کرے خواہ ماضی کی کوئی مصیبت ہو اور وہ اس وقت "إنا لله وإنا إليه راجعون" پڑھے تو اللہ اسے اسی طرح کا ثواب عطا کرتا ہے جس طرح اس نے مصیبت کے وقت "إنا لله وإنا إليه راجعون" پڑھنے پر دیا تھا۔''[2] اس حدیث کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے ان کی صاحب زادی فاطمہ نے بیان کیا ہے جو میدانِ کربلا میں موجود تھیں۔

یہ بات تو معلوم ہی ہے کہ عہد گزرنے کے ساتھ ساتھ حسین رضی اللہ عنہ پر گزری مصیبت کا تذکرہ ہوتا رہے گا۔ ایسی حالت میں اسلام کے محاسن میں سے ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی اس سنت کی تبلیغ ہو اور وہ یہ کہ جب جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر گزری مصیبت کا ذکر آئے تو "إنا لله وإنا إليه راجعون" پڑھا جائے۔ ایسا کرنے سے ایک مسلمان کو وہی اجر ملے گا جو اس مصیبت عظمیٰ کے دن پڑھنے سے اس وقت کے مسلمانوں کو ملا تھا۔

البتہ زمانہ گزرنے کے ساتھ اس مصیبت کو یاد کر کے ان کاموں کا ارتکاب کرنا جن سے اللہ کے رسول ﷺ نے منع فرمایا ہے تو اس کی بڑی سخت سزا ہے جیسے گالوں پر طمانچے مارنا، گریبان پھاڑنا اور عہدِ جاہلیت کی طرح دہائی دینا۔ صحیحین میں عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وہ ہم میں سے نہیں جو گالوں پر طمانچے مارے، گریبان پھاڑے اور جاہلیت کی طرح دہائی دے۔''[3]

صحیحین میں ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: انھوں نے فرمایا کہ میں بھی ان چیزوں سے اظہارِ براءت کرتا ہوں جن سے رسول اللہ ﷺ نے اظہارِ براءت فرمایا ہے۔ رسول اللہ ﷺ سر منڈانے والی، مصیبت میں چیخ پکار مچانے والی اور گریبان پھاڑنے والی سے بریٔ الذمہ ہیں۔[4]

صحیح مسلم میں ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میری امت جاہلیت کی چار

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩١٨)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٦٠٠) مسند أحمد (٢٠١/١) السلسلة الضعيفة (٤٥٥١)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٣٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٣)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٣٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٤)

باتوں کا ارتکاب کرتی رہے گی، اسے ترک نہیں کر پائے گی: حسب ونسب پر فخر کرنا، نسب میں طعنہ زنی کرنا، ستاروں سے بارش طلب کرنا اور میت پر نوحہ کرنا۔'' آپ نے یہ بھی فرمایا: ''نوحہ کرنے والی اگر بغیر توبہ کیے مرگئی تو قیامت کے دن اس حال میں کھڑی ہوگی کہ اس کے بدن پر تارکول کا کرتا ہوگا اور خارش پیدا کرنے والی چادر ہوگی۔''[1] اس موضوع پر آثار و روایات بہت ہیں۔

ان برائیوں کی شدت اس وقت مزید بڑھ جاتی ہے جب ان میں مومنوں پر ظلم شامل ہو جائے، انھیں لعن طعن اور سب وشتم کیا جائے اور ان بدبختوں اور بے دینوں کی مدد کی جائے جو دین کو برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کے اندر کتنی برائیاں چھپی ہوئی ہیں۔

بعض نام نہاد سنیوں نے کچھ ایسی موضوع روایات بیان کی ہیں اور ان کے لیے بعض ایسی روایات وضع کی گئی ہیں جن پر انھوں نے اپنے ان کاموں کی بنیاد رکھی ہے جو وہ عاشورا کے دن ایک شعار کی حیثیت سے انجام دیتے ہیں اور اپنے مخالفین کے شعار کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اس طرح انھوں نے ایک باطل کا مقابلہ باطل سے کرنے کی سعی نامسعود کی ہے اور ایک بدعت کی تردید دوسری بدعت سے کی ہے۔ اگرچہ دونوں میں سے ایک کا فساد زیادہ ہے اور اس کی ان حرکتوں سے بے دینوں کو زیادہ تقویت ملتی ہے۔ مثال کے طور پر وہ طویل حدیث جس میں بیان کیا گیا ہے کہ جس نے یومِ عاشورا کو غسل کیا وہ پورے سال بیمار نہیں پڑے گا، جس نے یومِ عاشورا کو سرمہ لگایا، پورے سال اسے آشوبِ چشم کی شکایت نہیں ہوگی۔ اسی طرح اس دن خضاب لگانے اور مصافحہ کرنے کی فضیلت میں بھی حدیثیں گھڑی گئی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ احادیث اور ان جیسی دیگر احادیث حدیثِ رسول کی معرفت رکھنے والے اہلِ علم کے نزدیک جھوٹی اور بناوٹی ہیں اگرچہ ان کو بعض محدثین نے ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ صحیح ہیں اور ان کی اسناد صحیح کی شرط کے مطابق ہے۔ اس کے غلط ہونے میں کوئی شبہہ نہیں ہے، جیسا کہ اس کی تفصیل دوسری جگہ بیان کی گئی ہے۔

ائمہ اسلام میں سے کسی نے یومِ عاشورا کو غسل کرنے، سرمہ اور خضاب لگانے وغیرہ کو مستحب نہیں قرار دیا ہے۔ جن ائمہ مسلمین کی اقتدا کی جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کی معرفت حاصل کرنے کے لیے جن کی طرف رجوع کیا جاتا ہے، ان میں سے کسی نے ان باتوں کا ذکر نہیں کیا ہے۔ یہ کام نہ رسول اللہ ﷺ نے کیے ہیں اور نہ ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم نے کیے ہیں۔

دواوینِ سنت کے مرتب محدثین نے اس طرح کی احادیث کا ذکر نہیں کیا ہے اور نہ کتبِ مسانید جیسے مسند احمد،

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٣٤)

مسند اسحاق، مسند احمد بن منیع حمیدی، مسند دالانی، مسند ابو یعلیٰ موصلی وغیرہ میں یہ احادیث پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح وہ کتبِ احادیث بھی ان احادیث کے ذکر سے خالی ہیں جو ابواب پر مرتب ہیں، جیسے صحاح اور کتبِ سنن۔ اسی طرح احادیث و آثار کی جامع کتبِ احادیث میں بھی ان روایات کا تذکرہ نہیں ہے، جیسے موطا امام مالک، مسند وکیع، مصنف عبدالرزاق، سنن سعید بن منصور اور مصنف ابن ابی شیبہ وغیرہ۔

مزید یہ کہ ہوا پرستوں نے یہ گمان کر لیا کہ جو یہ کام کر رہا ہے وہ اہلِ بیت کی عداوت اور دشمنی (اور ان سے نجات پانے کی خوشی) میں کر رہا ہے۔ اہلِ تسنن نے ان کی اس بات کی مخالفت کی اور جواب دیا کہ ناصبیت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ انھیں اہلِ بیت سے محبت کا استحقاق حاصل ہے اور وہ دوسروں سے کہیں زیادہ اس کا حق رکھتے ہیں۔ ان کی یہ بات حق اور درست ہے، لیکن انھیں یہ غلط فہمی لاحق ہو گئی اور وہ اس شبہہ میں گرفتار ہو گئے کہ یہ کام اچھے اور مستحب ہیں۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس طرح کے کاموں کی ابتدا کس نے کی اور کس نے یہ بدعت ایجاد کی۔ کیا اس کا مقصد اہلِ بیت سے اظہارِ عداوت تھا یا اس کے ذریعے وہ دوسروں سے اپنی عداوت کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی ہدایت چھوڑ کر دوسری راہ اپنانا بہر حال گمراہی ہے۔

ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم اس کتاب و حکمت کی اتباع کریں جو ہمارے رب نے نازل فرمائی ہے اور اس صراطِ مستقیم کو لازم پکڑیں، جو ان انبیا، صدیقین، شہدا اور صالحین کا راستہ ہے جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنا انعام نازل کیا ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کی رسی کو اجتماعی صورت میں مضبوطی کے ساتھ تھامیں، فرقہ بندی نہ پھیلائیں، اس معروف کا حکم دیں جس کا اللہ نے حکم دیا ہے اور اس منکر سے منع کریں جس سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے، ہم اپنے تمام کاموں میں اخلاص پیدا کریں، کیوں کہ یہی دینِ اسلام ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۱۱۲]

''ہاں جو شخص اللہ کے آگے گردن جھکا دے (یعنی ایمان لے آئے) اور وہ نیکو کار بھی ہو تو اُس کا صلہ اُس کے پروردگار کے پاس ہے اور ایسے لوگوں کو (قیامت کے دن) نہ کسی طرح کا خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔''

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا﴾ [النساء: ۱۲۵]

''اور اُس شخص سے کس کا دین اچھا ہوسکتا ہے جس نے حکمِ الٰہی کو قبول کیا اور وہ نیکو کار بھی ہے اور ابراہیم کے دین کا پیرو ہے جو یکسو (مسلمان) تھے اور اللہ نے ابراہیم کو اپنا دوست بنایا تھا۔''

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿28﴾ قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ وَأَقِيمُوا وُجُوهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ كَمَا بَدَأَكُمْ تَعُودُونَ ﴿29﴾ فَرِيقًا هَدَى وَفَرِيقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلَالَةُ إِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيَاطِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ مُهْتَدُونَ ﴾

[الأعراف: ٢٨۔٣٠]

''اور جب کوئی بے حیائی کا کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے اور اللہ تعالیٰ نے بھی ہم کو یہی حکم دیا ہے۔ کہہ دو کہ اللہ بے حیائی کے کام کرنے کا حکم ہرگز نہیں دیتا بھلا تم اللہ کی نسبت ایسی بات کیوں کہتے ہو جس کا تمھیں علم نہیں۔ کہہ دو کہ میرے رب نے تو انصاف کرنے کا حکم دیا ہے اور یہ کہ ہر نماز کے وقت سیدھا (قبلے کی طرف) رخ کیا کرو اور خاص اسی کی عبادت کرو اور اُسی کو پکارو اُس نے جس طرح تمھیں ابتدا میں پیدا کیا تھا اُسی طرح تم پھر پیدا ہو گے۔ ایک فریق کو تو اُس نے ہدایت دی اور ایک فریق پر گمراہی ثابت ہو چکی۔ ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیطانوں کو رفیق بنا لیا اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہدایت یافتہ ہیں۔''

اللہ تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿102﴾ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلَى شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿103﴾ وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿104﴾ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَأُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿105﴾ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ ﴾

[آل عمران: ١٠٢۔١٠٦]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو، جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تم ہرگز نہ مرو، مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو اور سب مل کر اس اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور جدا جدا نہ ہو جاؤ اور اپنے اوپر

اللہ کی نعمت یاد کرو، جب تم دشمن تھے تو اس نے تمھارے دلوں کے درمیان الفت ڈال دی تو تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے اور تم آگ کے ایک گڑھے کے کنارے پر تھے تو اس نے تمھیں اس سے بچا لیا۔ اس طرح اللہ تمھارے لیے اپنی آیات کھول کر بیان کرتا ہے، تاکہ تم ہدایت پاؤ اور لازم ہے کہ تم میں ایک ایسی جماعت ہو جو نیکی کی طرف دعوت دیں اور اچھے کام کا حکم دیں اور برائی سے منع کریں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو الگ الگ ہو گئے اور ایک دوسرے کے خلاف ہو گئے، اس کے بعد کہ ان کے پاس واضح احکام آ چکے اور یہی لوگ ہیں جن کے لیے بہت بڑا عذاب ہے، جس دن کچھ چہرے سفید ہوں اور کچھ چہرے سیاہ ہوں گے۔''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اہلِ سنت والجماعت کے چہرے سفید اور اہلِ بدعت و افتراق کے چہرے سیاہ ہوں گے۔

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ﴾ [الأنعام: ١٥٩]

''جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ در گروہ ہو گئے، ان سے تمھیں کچھ کام نہیں۔''

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ﴾ [البينة: ٥]

''اور ان کو حکم تو یہی ہوا تھا کہ اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت کریں (اور) یکسو ہو کر نماز پڑھیں اور زکات دیں اور یہی سچا دین ہے۔''

جھوٹ صرف اسی ایک ''زیارت گاہ'' تک محدود نہیں ہے، بلکہ مختلف انبیا کی جانب منسوب ''زیارت گاہیں'' جھوٹ ہیں جیسے وہ قبر جسے نوح علیہ السلام کی قبر بتایا جاتا ہے اور جو لبنان کے پہاڑ کی چوٹی پر بعلبک کے قریب واقع ہے۔ اسی طرح وہ قبر جو دمشق کی جامع مسجد کے قبلے کی طرف ہے جسے حضرت ہود علیہ السلام کی قبر کہا جاتا ہے، حالانکہ وہ حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کی قبر ہے۔ اسی طرح دمشق کے مشرق میں موجود قبر جسے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قبر کہا جاتا ہے، حالانکہ علما کا اتفاق ہے کہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کبھی دمشق نہیں گئے۔ اسی طرح دمشق میں بعض ازواجِ مطہرات کی قبروں کی نشان دہی کی جاتی ہیں، حالانکہ ان سب کی وفات مدینے میں ہوئی۔

مصر میں علی بن حسین، جعفر صادق اور ان جیسے دوسرے حضرات کی جن قبروں کے بارے میں بیان کیا جاتا

ہے وہ بھی اہلِ علم کے متفقہ فیصلے کے مطابق جھوٹ ہے۔ حضرت علی بن حسین اور جعفر صادق کا انتقال مدینے میں ہوا۔ عبدالعزیز کنانی لکھتے ہیں اور جیسا کہ یہ بات معروف ہے کہ ہمارے نبی ﷺ کی قبر کے علاوہ دوسرے انبیا کی قبروں میں سے کسی قبر کی نشان دہی نہیں کی جا سکتی۔ بعض دوسرے حضرات نبی ﷺ کے علاوہ حضرت خلیل علیہ السلام کی قبر کی جگہ کا بھی تعین کرتے ہیں۔

قبروں کے معاملے میں اہلِ علم کا یہ اضطراب اور تذبذب کچھ اس وجہ سے ہے کہ قبروں کی تعیین یا اسے یاد رکھنے کی روایت دین کا حصہ نہیں ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے قبروں کو مسجد بنانے کی ممانعت فرمائی ہے۔ چوں کہ اس کا کوئی تعلق دین سے نہیں ہے اسی لیے اس کی تعیین بھی غیر ضروری ہے۔

رہا وہ علم جسے دے کر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو مبعوث فرمایا ہے، وہ بحمد اللہ منضبط اور محفوظ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُوْنَ ﴾ [الحجر: ۹]

''بے شک یہ ''ذِکر'' ہم نے ہی اتارا ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔''

صحاح میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا، اس کی مخالفت کرنے والے اور اسے بے یار و مددگار چھوڑنے والے اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکیں گے یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔''[1]

اس جھوٹ کی اصل گمراہی، بدعت اور شرک ہے۔ گمراہ لوگ یہ خیال کیے بیٹھے ہیں کہ ان مشاہد کے لیے سفر کرنا، وہاں جا کر نماز ادا کرنا، دعا کرنا اور اس کے لیے نذر ماننا، اسے بوسہ دینا اور اس کا استلام کرنا وغیرہ نیکی اور دین داری کے کام ہیں۔ میں نے ایک بڑی کتاب دیکھی ہے جسے رافضیوں کے ایک امام محمد بن نعمان نے تحریر کیا ہے جو شیخ مفید کے نام سے جانا جاتا ہے، جس کا لقب مرتضیٰ ہے اور جس کی کنیت ابوجعفر طوسی ہے۔ اس نے کتاب کا نام ''الحج إلی زيارة المشاهد'' رکھا ہے۔ اس نے اس کتاب میں نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے اہلِ بیت کے آثار ذکر کیے ہیں اور ان مشاہد کی زیارت کرنے اور ان کا حج کرنے کا اس انداز میں تذکرہ کیا ہے کہ ویسا تذکرہ حج بیت اللہ الحرام کا بھی نہیں کیا جاتا۔

اس نے اس کتاب میں جو کچھ بیان کیا ہے، اس کا بیشتر حصہ کھلا ہوا کذب اور واضح طور پر بہتان ہے۔ میں نے اس کے اندر کذب و بہتان کی ایسی باتیں دیکھی ہیں کہ اس طرح کی باتیں یہود و نصاریٰ کی اکثر کتابوں میں بھی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٤٢)

نہیں ملتیں۔ یہ ساری باتیں اصل میں منافقین اور بے دینوں نے وضع کی تھیں، تاکہ وہ عام لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ پر آنے سے روک سکیں، دینِ اسلام کو ان کی نظروں میں برباد کر دیں اور ان کے لیے توحید و اخلاص کے بجائے الٹا شرک ایجاد کر دیں جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ اسلاف نے قومِ نوح سے متعلق اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی تفسیر میں فرمایا ہے:

﴿وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا ۝ وَقَدْ أَضَلُّوا كَثِيرًا﴾ [نوح: ٢٣،٢٤]

''اور کہنے لگے کہ اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا اور وَدّ اور سواع اور یغوث اور یعوق اور نسر کو کبھی ترک نہ کرنا۔ (پروردگار!) انھوں نے بہت لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے۔''

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جیسے حضرات اسلاف کہتے ہیں کہ یہ قومِ نوح کے صالح لوگوں کے نام ہیں۔ جب ان کی وفات ہوگئی تو لوگ ان کی قبروں پر مجاور بن کر بیٹھ گئے، اس کے بعد ان کے بت بنا ڈالے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں یہ روایت ذکر فرمائی ہے۔ اس کی پوری تفصیل اور وضاحت انھوں نے قصص الانبیا وغیرہ میں کی ہے۔

مشرک صابی فلسفیوں نے اس شرک کی تفصیلات اپنی تصانیف میں بیان کیں اور باطنی قرامطہ کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے۔ اپنی ان حرکتوں سے انھوں نے بہتوں کو گمراہ کیا، انھیں آزمائش میں ڈالا اور اللہ کے دین سے انھیں روکے رکھا۔

ان کا کم ترین شعار مسجدوں کو بے رونق کرنا اور زیارات کی تعظیم کرنا ہے۔ مشاہد کی تعظیم، ان کے حج اور ان مقامات پر شرک کے ایسے ایسے کاموں کے لیے لوگ آنے لگے جن کا اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول نے حکم نہیں دیا تھا اور نہ ائمہ دین نے اس کی اجازت دی تھی، بلکہ ان کاموں سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مومن بندوں کو منع فرمایا تھا۔

جن مساجد کو بلند رکھنے اور جن میں ذکرِ الٰہی کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، اس کو یہ ویران کرتے ہیں۔ اس میں نہ جمعہ پڑھتے ہیں اور نہ جماعت میں حاضری دیتے ہیں۔ دلیل ان کی نفاق پر مبنی یہ اصول ہے کہ نماز صرف معصوم شخصیت کی اقتدا میں درست ہوتی ہے، نیز اسی قسم کی گمراہی پر مشتمل باتیں۔

جس شخص نے سب سے پہلے علی رضی اللہ عنہ کی عصمت کا دعویٰ کیا اور ان کی خلافت کو منصوص قرار دیا، وہ ان منافقین کا سردار عبداللہ بن سبا تھا جو اصلاً یہودی تھا اور ظاہراً خود کو مسلمان کہتا تھا۔ اس نے دینِ اسلام کو اسی طرح برباد کرنے کی سازش کی تھی جس طرح پولس نے نصاریٰ کے دین کو برباد کر کے رکھ دیا تھا۔ امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو جب یہ خبر ملی کہ عبداللہ بن سبا حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو گالی دیتا ہے تو اس کی گردن مار دینے کا ارادہ کیا، لیکن وہ فرار

ہو گیا اور ان کے ہاتھ نہیں آیا۔ اسی طرح علی رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو زندہ جلا دیا تھا جو غلو کر کے آپ کے متعلق الوہیت کا دعویٰ کر رہے تھے۔ آپ نے سب سے افضل قرار دینے والوں کے متعلق فرمایا تھا کہ اگر کوئی ایسا شخص گرفتار کر کے میرے پاس لایا گیا جو مجھے حضرات ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما سے افضل قرار دیتا ہو تو میں بہتان لگانے کی حد اس پر جاری کروں گا۔

یہ گمراہ، افترا پرداز اور بے دینوں کے پیروکار منافقین اس طرح کے الزام و بہتان سے شعائرِ اسلام کو معطل کر دینا چاہتے ہیں، اور ان سنتوں کو منہدم کرنا چاہتے تھے جن پر یہ دین قائم ہے اور عظیم ترین شعار تو ہدایت پر مبنی وہ سنتیں ہیں جنھیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمایا۔ اس لیے وہ جمعہ پڑھتے ہیں نہ نماز باجماعت۔

اس قسم کے عقائد رکھنے والا مشاہد اور مساجد کو یکساں سمجھ لیتا ہے، حتی کہ نماز، دعا، تلاوت اور ذکر وغیرہ عبادات کو مساجد کی طرح مقابر کے قریب مشروع سمجھنے لگتا ہے، بلکہ اپنے حال و قال سے بسا اوقات قبروں کے پاس عبادت کرنے کو مساجد میں عبادت کرنے سے افضل باور کراتا ہے۔ آپ ان میں سے بہتوں کو دیکھیں گے کہ جب کسی حاجت پر دعا کی سخت ضرورت ہو یا کسی گناہ پر توبہ وغیرہ کی حاجت ہو تو اس شخص کی قبر پر جانے کا ارادہ کرتا ہے جس کی وہ تعظیم بجا لاتا ہے۔ مثال کے طور پر اپنے پیر یا کسی دوسری شخصیت کی قبر پر جاتا ہے۔ وہاں خوب الحاح سے دعا کرتا ہے، آہ وزاری کرتا ہے، خشوع اور رقت کی وہ کیفیت ظاہر کرتا ہے کہ ویسی کیفیت نہ مسجد میں ظاہر ہوتی ہے، نہ اوقاتِ سحر میں اور نہ اللہ واحد و قہار کے حضور سجدہ میں۔

معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ ان کے بیشتر جہلاء مردوں کو پکارنے لگے اور ان سے اسی طرح فریاد کرنے لگے جس طرح نصاریٰ مسیح علیہ السلام اور ان کی والدہ سے کرتے ہیں۔ وہ مردوں سے مصیبتوں میں راحت، حاجات کی برآری، دشمنوں کے خلاف مدد اور مصائب و مشکلات کو دور کرنے کی درخواست کرنے لگے جب کہ آسمان و زمین کے رب کے سوا کوئی ان باتوں کی قدرت نہیں رکھتا ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ اگر کوئی ان میں سے حج کا ارادہ کرتا ہے تو اس کی زیادہ توجہ حج بیت اللہ الحرام کے، جو وابستگان دینِ الٰہی کے امام حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملتِ حنیفی کا شعار ہے، فریضے کے ادا کرنے پر نہیں ہوتی ہے، بلکہ وہ مدینے کا ارادہ رکھتا ہے۔

مدینے میں بھی اس کا مقصد مسجدِ نبوی میں نماز ادا کرنا نہیں ہوتا، جس کی ترغیب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دلائی ہے جیسا کہ صحیح حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''میری اس مسجد میں ایک نماز مسجدِ حرام کے سوا دوسری مساجد میں پڑھی گئی ایک ہزار نمازوں سے افضل ہے۔'' اللہ تعالیٰ نے یہ جو حکم دیا ہے کہ جہاں کہیں بھی رہو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام پڑھتے رہو، اس کا ذرا بھی اہتمام نہیں کرتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی اطاعت، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی اتباع اور

آپ ﷺ کی عزت و توقیر یہ ہے کہ اس کی نظر میں آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی اس کے اہل و عیال، اس کی دولت و ثروت، دوسرے تمام انسانوں، بلکہ خود اپنی ذات سے زیادہ محبوب نہ بن جائے۔ اس کا مقصد مدینے جا کر آپ ﷺ کی اور آپ ﷺ کے علاوہ بعض دوسروں کی قبروں کی زیارت ہوتا ہے جس کا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے قطعاً حکم نہیں دیا ہے۔ آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ کام نہیں کیا اور نہ ائمہ دین میں سے کسی نے اس کو مستحسن قرار دیا ہے۔

بسا اوقات اس کے حج پر جانے کا بڑا مقصد خود حج نہیں، بلکہ آپ ﷺ کی قبر کی زیارت ہوتا ہے اور کبھی دونوں مقاصد کو وہ یکساں سمجھتا ہے۔ اہلِ اسلام کا اتفاق ہے کہ یہ سب ضلالت اور گمراہی ہے، بلکہ جمہور علما کے نزدیک تو کسی بھی قبر کی خواہ وہ کسی نبی ہی کی کیوں نہ ہو، زیارت کے لیے سفر کرنا ممنوع ہے، یہاں تک کہ وہ نماز کے ارادے سے بھی ان مقامات پر سفر کر کے جانے کو جائز نہیں قرار دیتے، کیوں کہ یہ سفر معصیت کا سفر ہے، جیسا کہ صحیحین میں نبی اکرم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''علاوہ تین مقامات مسجد حرام، مسجد اقصی اور میری اس مسجد کے کہیں کا رختِ سفر باندھنا جائز نہیں ہے۔''[1] آپ ﷺ اس قسم کے مسائل میں تمام امت سے زیادہ علم رکھتے تھے۔

قبرِ نبوی کی زیارت کے سلسلے میں جو بھی حدیث بیان کی جاتی ہے وہ ضعیف، بلکہ موضوع ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ اور مدینے کے دیگر ائمہ نے تو کسی کے یہ کہنے کو بھی مکروہ قرار دیا ہے کہ میں نے قبرِ نبوی کی زیارت کی۔ سنت یہ ہے کہ جب آپ ﷺ کی قبر پر پہنچے تو آپ ﷺ کو سلام کرے جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ کا معمول تھا جب وہ آپ ﷺ کی قبر پر آتے تھے۔ اس کی مزید تفصیلات کسی دوسری جگہ ذکر کی گئی ہیں۔

ایک مسئلہ غیر کعبہ کے طواف کرنے کا ہے۔ مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ بیتِ معمور کے علاوہ کسی دوسرے گھر کا طواف جائز نہیں ہے۔ لہٰذا صخرہ بیت المقدس کا طواف جائز نہیں، حجرۂ نبوی کا طواف جائز نہیں، اسی طرح جبلِ عرفات پر موجود قبہ کا طواف کرنا جائز نہیں ہے اور نہ کسی اور مقام کا طواف کرنا جائز ہے۔

اسی طرح مسلمان اس بات پر بھی متفق ہیں کہ بوسہ دینا اور استلام کرنا صرف دونوں یمانی رکنوں کا جائز ہے، حجرِ اسود کا استلام بھی کیا جائے گا اور اس کو بوسہ بھی دیا جائے گا اور رکنِ یمانی کا استلام کیا جائے گا۔ بعض لوگوں نے اس کو بوسہ دینے کی بات بھی کہی ہے، لیکن یہ قول ضعیف ہے۔ ان کے علاوہ دیگر جگہوں جیسے بیت اللہ کے کنارے، دونوں شامی رکن، مقام ابراہیم، صخرہ، حجرہ نبویہ اور انبیا و صالحین کی قبروں کا نہ استلام جائز ہے اور نہ ان کو بوسہ دینا جائز ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٣٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٩٧)

صحیحین میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ یہود و نصاریٰ کو ہلاک کرے! انھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو مسجد بنا لیا۔''[1] مسلم کی ایک روایت میں ہے: ''یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو، انھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو مسجد بنا لیا۔''[2]

صحیحین ہی میں عائشہ رضی اللہ عنہا اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔ دونوں بیان کرتے ہیں کہ جب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر مرض الوفات میں نزع کی حالت طاری ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی چادر کو بار بار اپنے چہرے پر ڈالتے تھے اور جب جی گھبراتا تو اسے چہرے سے ہٹا لیتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حال میں فرمایا: ''یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو، انھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو مسجد بنا لیا۔''[3] آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی روش پر چلنے سے خبردار فرما رہے تھے۔

صحیحین ہی میں عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، وہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہود و نصاریٰ پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو، انھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو مسجد بنا لیا۔'' اگر یہ بات نہ ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر نمایاں کی جاتی مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اندیشہ تھا کہ کہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مسجد نہ بنا لی جائے۔[4]

صحیح مسلم میں جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے سنا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں اللہ کے حضور اس بات سے اپنی براءت کا اظہار کرتا ہوں کہ تم سے کوئی میرا خلیل ہے۔ اللہ نے مجھے اپنا خلیل بنایا ہے جس طرح اس نے ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنایا تھا۔ اگر میں اپنی امت میں سے کسی کو اپنا خلیل بناتا تو ابوبکر کو خلیل بناتا۔ غور سے سنو! جو لوگ تم سے پہلے گزرے ہیں انھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو مسجد بنا لیا۔ خبردار! تم قبروں کو مسجد نہ بنانا، میں اس سے تمھیں منع کرتا ہوں۔''[5]

صحیح مسلم میں ابو مرثد غنوی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قبروں کے اوپر نہ بیٹھو اور نہ ان کی طرف رخ کر کے نماز پڑھو۔''[6]

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قبرستان اور حمام کے علاوہ ساری روئے زمین مسجد ہے۔''[7] اس حدیث کی روایت اہلِ سنن جیسے امام ابوداود، امام ترمذی اور امام ابن ماجہ رحمہ اللہ نے کی ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٦)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٣٠)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٦)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٢٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢٩)

[5] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٣٢)

[6] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٧٢)

[7] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٤٥) صحيح الجامع (٢٧٦٤)

بعض لوگوں نے اسے مرسل قرار دیا ہے، لیکن حافظ نے اسے صحیح کہا ہے۔

صحیحین میں ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوئے تو آپ کی بعض ازواجِ مطہرات نے ذکر کیا کہ انھوں نے سرزمینِ حبشہ میں ماریہ نام کا ایک کنیسہ دیکھا۔ امِ سلمہ اور ام حبیبہ رضی اللہ عنہما حبشہ سے آئی تھیں، انھوں نے اس کی خوبصورتی کا ذکر کیا اور اس میں موجود تصویروں کا تذکرہ کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا سر مبارک اٹھایا اور فرمایا: ''یہ وہ لوگ تھے کہ جب ان میں کوئی نیک انسان مر جاتا تھا تو اس کی قبر پر مسجد بنا دیتے تھے اور اس میں وہ تصویریں بنا دیتے تھے جن کا ذکر تم کر رہی ہو۔ ایسا کرنے والے اللہ کی نظر میں انتہائی بدترین لوگ ہیں۔''[1]

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کی بکثرت زیارت کرنے والی عورتوں اور ان پر مساجد تعمیر کرنے اور ان پر چراغ جلانے والوں پر لعنت فرمائی ہے۔''[2] یہ حدیث اہلِ سنن جیسے ابوداود، نسائی اور ترمذی نے روایت کی ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ حدیث حسن ہے۔ ترمذی کے بعض نسخوں میں صحیح کا لفظ ہے۔

موطا امام مالک میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے اللہ! میری قبر کو بت نہ بنانا کہ اس کی پرستش کی جانے لگے۔''[3] سنن ابی داود میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری قبر کو عید نہ بنانا اور نہ اپنے گھروں کو قبرستان بنانا۔''[4]

رہا سوال مساجد میں عبادات جیسے نماز، تلاوت اور دعا وغیرہ کے انجام دینے کا تو اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ﴾ [البقرة: ١١٤]

''اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ کی مسجدوں میں اللہ کے نام کا ذکر کیے جانے کو منع کرے اور ان کی ویرانی میں ساعی ہو۔''

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ ﴾ [التوبة: ١٨]

''اللہ کی مسجدوں کو تو وہ لوگ آباد کرتے ہیں جو اللہ پر اور روزِ قیامت پر ایمان لاتے اور نماز پڑھتے ہیں۔''

ترمذی میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم کسی شخص کو پابندی سے مسجد میں آتے جاتے دیکھو تب اس

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢٨)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٣٦)

[3] الموطأ للإمام مالك (٨٨)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٤٢) صحيح الجامع (٧١٠٣)

کے ایمان کی شہادت دو، کیوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ ﴾ [التوبة: ١٨]

''اللہ کی مسجدوں کو تو وہ لوگ آباد کرتے ہیں جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں۔''[1]

اللہ تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد ہے:

﴿ قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ وَأَقِيمُوا وُجُوهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ ﴾ [الأعراف: ٢٩]

''کہہ دو کہ میرے رب نے تو انصاف کرنے کا حکم دیا ہے اور یہ کہ ہر نماز کے وقت سیدھا (قبلے کی طرف) رخ کیا کرو۔''

ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا ہے:

﴿ وَأَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلَّهِ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللَّهِ أَحَدًا ﴾ [الجن: ١٨]

''اور یہ کہ مسجدیں (خاص) اللہ کی ہیں تو اللہ کے ساتھ کسی اور کی عبادت نہ کرو۔''

اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ یہ فرمایا ہے:

﴿ فِي بُيُوتٍ أَذِنَ اللَّهُ أَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ ﴾ [النور: ٣٦]

''ان گھروں میں (ہے) جن کے بارے میں اللہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ بلند کیے جائیں اور وہاں اللہ کے نام کا ذکر کیا جائے۔''

اللہ تعالیٰ کا ایک ارشاد یہ بھی ہے:

﴿ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ ﴾ [البقرة: ١٨٧]

''اور جب مسجدوں میں اعتکاف بیٹھے ہو تو اُن سے مباشرت نہ کرو۔''

صحیحین میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایک مسلمان کا مسجد میں نماز پڑھنا، اس کے گھر اور بازار میں نماز پڑھنے سے پچیس درجے زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔'' ایک دوسری روایت کے الفاظ ہیں: ''جماعت سے نماز پڑھنا تنہا نماز پڑھنے سے پچیس درجے زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔''[2] صحیح میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''منافقین کے لیے سب سے دشوار نماز عشا اور فجر کی نماز ہے۔ اگر انھیں اس کی فضیلت معلوم ہو جائے تو مسجد میں ضرور آئیں گے خواہ سرین کے بل ہی کیوں نہ آنا پڑے۔ میں نے ارادہ کیا کہ نماز کا حکم دوں اور اس کے لیے اقامت کہی جائے پھر

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٩٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٨٠٢) ضعيف الجامع (٦٠٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٤٠)

میں کسی کو نماز پڑھانے کے لیے کہہ کر چند لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر جاؤں جن کے ہاتھ میں لکڑیوں کا گٹھا ہو اور ان لوگوں کے گھروں میں آگ لگا دوں جو جماعت میں شریک نہیں ہوتے۔''[1]

صحیح مسلم میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک نابینا صحابی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: اے اللہ کے رسول! میرے پاس کوئی ہاتھ پکڑنے والا نہیں جو مجھے مسجد تک لے جائے۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گھر میں نماز ادا کرنے کی رخصت طلب کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں رخصت دے دی، لیکن جب وہ جانے لگے تو انھیں واپس بلا کر پوچھا: کیا تم نماز کے لیے اذان کی آواز سنتے ہو؟ انھوں نے جواب دیا: ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پھر تو جماعت میں شرکت ضروری ہے۔''[2]

صحیح مسلم ہی میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں: جو آنے والے کل میں اللہ سے مسلمان کی حیثیت سے ملنے میں اپنی خوشی سمجھتا ہو اسے اذان سن کر پانچوں نمازوں کی محافظت کرنا چاہیے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے تمھارے نبی کو سننِ ہدیٰ کی تعلیم دی ہے اور یہ پانچوں نمازیں سننِ ہدیٰ میں سے ہیں۔ اگر اس سست اور پیچھے رہ جانے والے شخص کی طرح تم بھی اپنے گھروں میں فرض نمازیں پڑھنے لگو گے تو اپنے نبی کی سنت چھوڑ بیٹھو گے اور اگر اپنے نبی کی سنت چھوڑ بیٹھو گے تو گمراہ ہو جاؤ گے۔ جو شخص اچھی طرح وضو کرتا ہے، پھر ان مساجد میں سے کسی مسجد کا رخ کرتا ہے تو جتنے قدم اٹھاتے ہوئے وہاں پہنچتا ہے، اللہ تعالیٰ ہر قدم کے بدلے اسے نیکیاں عطا کرتا ہے اور وہ اس طرح کہ ہر قدم کے بدلے اس کا درجہ بلند کرتا ہے اور ہر قدم کے بدلے اس کے گناہ مٹاتا ہے۔ تم لوگوں نے ہمیں دیکھا ہے، ہمارے دور میں نماز سے پیچھے صرف وہی رہتا تھا جو منافق ہوتا تھا اور جس کا نفاق ظاہر ہوتا تھا۔ اس وقت صورتِ حال یہ تھی کہ ایک معذور و مجبور بھی دو آدمیوں کے سہارے لایا جاتا تھا اور نماز کی صف میں کھڑا کر دیا جاتا تھا۔''[3]

غرضیکہ یہ ایک بڑا وسیع موضوع ہے۔ اس معاملے میں جو راہِ ہدایت ہے وہ میں نے واضح کر دی ہے، تاکہ اہلِ توحید، یکسو ہو کر ملتِ ابراہیمی کی پیروی کرنے والے اور اللہ نے جس دین کے ساتھ اپنے رسولوں کو مبعوث فرمایا ہے اور اپنی کتابیں نازل کی ہیں، ان کے متبعین اور ان لوگوں کے درمیان فرق کو سمجھا جا سکے جنھوں نے حق کو باطل کے ساتھ گڈمڈ کر دیا ہے اور ملتِ حنیفی کو شرک سے آلودہ کرنے کی ناروا جسارت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ﴾

[الزخرف: ٤٥]

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦١٨) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٥٦١)

[3] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٦٥٤)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٦٥٣)

''اور (اے محمد!) جو اپنے پیغمبر ہم نے تم سے پہلے بھیجے ہیں ان سے دریافت کر لو کیا ہم نے (اللہ) الرحمٰن کے سوا اور معبود بنائے تھے کہ ان کی عبادت کی جائے؟''

ایک دوسری جگہ اس نے فرمایا:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴾ [الأنبياء: ٢٥]

''اور ہم نے تم سے پہلے جو پیغمبر بھی معبوث کیا تو اُس کی طرف یہی وحی بھیجی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں تو میری ہی عبادت کرو۔''

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ﴾ [النحل: ٣٦]

''اور ہم نے ہر جماعت میں پیغمبر بھیجا کہ اللہ ہی کی عبادت کرو اور بتوں (کی پرستش) سے اجتناب کرو۔''

اللہ تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد ہے:

﴿ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ ﴾ [البينة: ٥]

''اور ان کو حکم تو یہی ہوا تھا کہ اخلاص کے ساتھ یکسو ہو کر اللہ کی عبادت کریں۔''

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٣٠﴾ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿٣١﴾ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴾ [الروم: ٣٠-٣٢]

''تو تم یک سو ہو کر دینِ (الٰہی کی سمت) اپنا رخ جما دو (اور) اللہ کی فطرت کو جس پر اُس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے (اختیار کیے رہو) اللہ کی بنائی ہوئی (فطرت) میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا یہی سیدھا دین ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (مومنو!) اُسی (اللہ) کی طرف رجوع کیے رہو اور اُس سے ڈرتے رہو اور نماز پڑھتے رہو اور مشرکوں میں نہ ہونا۔ (اور نہ) ان لوگوں میں (ہونا) جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور (خود) فرقے فرقے ہو گئے سب فرقے اُسی سے خوش ہیں جو اُن کے پاس ہے۔''

واللّٰه سبحانه وتعالىٰ أعلم.[1]

[1] مجموع الفتاویٰ (٤/٤٩٨-٥٢٦)

قتلِ حسین رضی اللہ عنہ، قاتلِ حسین اور یزید کا حکم

سوال ① قتلِ حسین (رضی اللہ عنہ) اور قاتلِ حسین (رضی اللہ عنہ)، نیز یزید کا کیا حکم ہے؟

② حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کیے جانے کی کیفیت، ان کے اہلِ خانہ کو جنگی اسیر بنا کر دمشق لے جائے جانے اور ان کے ساتھ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سر روانہ کرنے سے متعلق صحیح واقعات کیا ہیں؟

③ حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما، حضرت علی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے قتل ایسے معاملات میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا کیا حکم ہے؟

جواب الحمد لله. حضرت عثمان، علی اور حسین رضی اللہ عنہم اہلِ سنت کے اتفاق کے ساتھ ظلم کی بھینٹ چڑھائے گئے اور منصبِ شہادت پر فائز ہیں۔ حضرت عثمان اور علی رضی اللہ عنہما سے متعلق صحیح احادیث میں ذکر ہوا ہے کہ وہ شہید اور جنتی ہیں، بلکہ طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما سے متعلق بھی یہی ہے۔

صحیح حدیث میں ہے: جبلِ اُحد پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ابوبکر و عمر اور عثمان و علی رضی اللہ عنہم کھڑے تھے کہ اس نے ہلنا شروع کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کہا: «اُثْبُتْ حِرَاءُ أَوْ أَحَدُ فَإِنَّمَا عَلَيْكَ نَبِيٌّ وَّصِدِّيْقٌ وَّشَهِيْدَانِ»[1] ''ٹھہر جا احد! تجھ پر ایک نبی، ایک صدیق اور دو شہید کھڑے ہیں۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جنت کی بشارت دی، جن میں چاروں خلفا کے ساتھ طلحہ، زبیر، سعد بن ابی وقاص، سعید بن زید، عبدالرحمٰن بن عوف اور ابو عبیدہ بن جراح بھی شامل ہیں۔[2]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب بے شمار اور مشہور ہیں۔ کئی سندوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ثابت ہے:

«لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذاً مِنْ أَهْلِ الْأَرْضِ خَلِيْلًا لَاتَّخَذْتُ أَبَا بَكْرٍ خَلِيْلًا، وَلٰكِنْ صَاحِبُكُمْ خَلِيْلُ اللّٰهِ»[3]

''اگر میں اہلِ زمین میں سے کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکر کو بناتا، لیکن تمھارے صاحب اللہ کے خلیل ہیں۔''

یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے خلیل ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحديث (٣٤٧٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤١٧)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٤٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٧٤٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٣٣) صحيح الجامع (٤٠١٠)

[3] صحیح البخاري، رقم الحديث (٤٥٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨٢)

«إِنَّ أَمَنَّ النَّاسِ عَلَيْنَا فِيْ صُحْبَتِهِ وَذَاتِ يَدِهِ أَبُوْ بَكْرٍ»[1]

''ہم پر لوگوں میں سے سب سے زیادہ ابوبکر کی صحبت اور معاونت کا احسان ہے۔''

فرمایا: ''مسجد میں ابوبکر کے چھوٹے دروازے کے سوا سب چھوٹے دروازے بند کر دیے جائیں۔''[2]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا: ''اپنے والد اور اپنے بھائی کو بلاؤ، میں ابوبکر کے لیے ایک نامہ لکھوا دوں، تاکہ میرے بعد لوگ ان کے بارے میں مختلف الرائے نہ ہو جائیں۔'' پھر فرمایا: «يَأْبَى اللّٰهُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ إِلَّا أَبَا بَكْرٍ»[3] ''اللہ بھی اور مومن بھی ابوبکر کے سوا ہر ایک کا انکار کرتے ہیں۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک عورت آئی اور اس نے آپ سے کچھ مانگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پھر آنے کا کہا۔ اس نے پوچھا: اگر میں آئی اور آپ کو نہ پایا تو؟ یعنی اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ نہ رہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر تو مجھے نہ پائے تو ابوبکر کے پاس آ جانا۔''[4] آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لوگو! میں تمھارے پاس آیا اور میں نے کہا: میں تمھاری طرف اللہ کا رسول ہوں، تم نے کہا: تم جھوٹ کہتے ہو، ابوبکر نے کہا: آپ سچ کہتے ہیں، اس نے اپنے مال و جان سے میری دلجوئی کی، کیا تم میرے صاحب کو میرے لیے چھوڑ نہیں دیتے؟''[5]

یہ تمام احادیث صحاح میں ہیں اور علمائے حدیث و روایت کے نزدیک ثابت ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے مرض الموت میں ان کو مصلائے امامت پر کھڑا کرنا تواتر سے ثابت ہے۔ چنانچہ آپ حکم نبوی سے متعدد دنوں تک لوگوں کو نماز پڑھاتے رہے۔

حضرت عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم سمیت تمام صحابہ موجود تھے، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ان سب پر ترجیح دی۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مہاجرین و انصار کی موجودگی میں حضرت ابوبکر سے کہا: "أَنْتَ خَيْرُنَا، وَسَيِّدُنَا وَأَحَبُّنَا إِلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ"[6] ''تم ہم سب سے بہتر، ہمارے سردار اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہو۔'' صحیح بخاری میں ہے: ''حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ کو مردوں میں سب سے زیادہ محبوب کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: ابوبکر۔''[7]

---

(1) صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٥٤) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٣٨٢)

(2) صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٥٤) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٣٨٢)

(3) صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٧٩١) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٣٨٧)

(4) صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٩٢٧) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٣٨٦)

(5) صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٤٦١)

(6) صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٤٦٧)

(7) صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٤٦٢) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٣٨٤)

اسی طرح حضرت عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کے فضائل بھی بے شمار ہیں، یہاں تفصیل کا موقع نہیں۔ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو طلحہ، زبیر، سعد و سعید اور عبدالرحمن بن عوف جیسے صحابہ سے بھی، جو ان مذکورہ بالا صحابہ سے کم رتبہ رکھتے ہیں، اپنی وفات کے وقت راضی تھے۔[1] بلکہ صحیح بخاری میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، حاطب بن ابی بلتعہ سے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ بدر میں شریک ہوا۔ تجھے کیا معلوم اللہ نے اہلِ بدر کے دلوں کو جھانکا تو کہہ دیا: جو چاہو عمل کرو میں نے تمھیں بخش دیا ہے۔''[2] بدر میں شریک ہونے والے تین سو تیرہ تھے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « لَا يَدْخُلُ النَّارَ أَحَدٌ بَايَعَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ »[3] ''درخت کے نیچے بیعت کرنے والوں میں سے کوئی ایک بھی جہنم میں نہیں جائے گا۔'' یہ وہ چودہ سو مہاجر اور انصاری صحابہ تھے جو سابقین اولین میں سے تھے۔ اللہ ان سب سے راضی ہوا اور یہ اس سے۔ انھوں ہی نے فتح مکہ سے پہلے اپنا مال خرچ کیا اور جہاد کیا۔ یہ فتح مکہ کے بعد خرچ اور جہاد کرنے والوں سے زیادہ فضائل کے مالک ہیں۔

صحیح بخاری میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میرے اصحاب کو گالی نہ دو۔ اگر تم میں سے کوئی ایک احد برابر سونا خرچ کرے تو وہ ان میں سے کسی ایک کے مد اور نصف کو بھی نہیں پہنچ پائے گا۔''[4]

صحیح مسلم میں ہے کہ حاطب کے غلام نے کہا: اللہ کی قسم! اے اللہ کے رسول! حاطب ضرور بضرور آگ میں داخل ہوگا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کہا: تو نے جھوٹ کہا، وہ بدر میں بھی شریک تھا اور حدیبیہ میں بھی۔''[5] حالانکہ حاطب غلاموں سے اچھا سلوک نہیں کرتا تھا اور اس نے غزوۂ فتح مکہ کی خبریں مشرکوں تک پہنچانے کے لیے خط کتابت بھی کی تھی۔ ان گناہوں کے باوجود نبیِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ وہ جنت میں داخل ہونے والوں میں سے ہے، جہنم میں داخل نہیں ہوگا۔ تو عثمان، علی، طلحہ، زبیر، سعد اور عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہم جو اس سے کئی درجے افضل ہیں، کس طرح جہنم میں جائیں گے؟!

حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے بھائی حضرت حسن رضی اللہ عنہ دونوں جنتی نوجوانوں کے سردار ہیں۔[6] وہ دونوں دنیا میں

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٩٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨٤٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٩٤)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٩٦)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٧٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٤١)

[5] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٩٥)

[6] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٧٦٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١١٨) سنن النسائي الكبرىٰ (٥/٥٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٧٩٦)

رسول اللہ ﷺ کے پھول تھے، دیکھیے صحیح بخاری۔[1] صحیح مسلم میں ہے: آپ ﷺ نے علی، فاطمہ اور حسن و حسین رضی اللہ عنہم پر اپنی چادر ڈالی اور فرمایا: ''اے اللہ! یہ میرے اہلِ بیت ہیں۔ ان سے گندگی دور کر دے اور ان کو اچھی طرح پاک کر دے۔''[2]

گو حضرت حسن جو بڑے بھی ہیں، زیادہ حلیم الطبع، صلح جو اور مسلمانوں کا خون روکنے کے خواہش مند ہونے کی وجہ سے افضل ہیں۔ صحیح بخاری میں حضرت ابوبکرہ سے مروی ہے: میں نے نبی اکرم ﷺ کو منبر پر دیکھا، حسن بن علی رضی اللہ عنہ آپ کے ایک پہلو میں تھے، آپ ایک مرتبہ لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے اور دوسری مرتبہ اس کی طرف اور فرمایا:

((إِنَّ ابْنِي هٰذَا سَيِّدٌ، وَلَعَلَّ اللّٰهَ أَنْ يُّصْلِحَ بَيْنَ فِئَتَيْنِ عِظْمَتَيْنِ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ))[3]

''میرا یہ بیٹا سردار ہے، شاید اللہ اس کے ذریعے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کروائے گا۔''

صحیح بخاری میں حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: نبی اکرم ﷺ مجھے پکڑ کر اپنی ایک ران پر بٹھاتے اور حسن کو دوسری پر بٹھاتے اور کہتے:

((اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أُحِبُّهُمَا فَأَحِبَّهُمَا، وَأَحِبَّ مَنْ يُّحِبُّهُمَا))[4]

''اے اللہ! میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں، تو بھی ان دونوں سے محبت کر اور ان دونوں سے محبت کرنے والوں سے بھی۔''

یہ دونوں امت کی باہمی لڑائی میں شریک ہونے سے سب سے زیادہ گریز کرتے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ مظلوم مقتول ہیں اور وہ شہید ہیں۔ ظالموں اور انتہا پسندوں نے ان کو قتل کیا۔

گو کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ ناحق قتل نہیں ہوئے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

((مَنْ جَاءَ كُمْ وَأَمْرُكُمْ عَلٰى رَجُلٍ وَّاحِدٍ، يُرِيْدُ أَنْ يُّفَرِّقَ بَيْنَ جَمَاعَتِكُمْ فَاضْرِبُوْا عُنُقَهٗ بِالسَّيْفِ كَائِناً مَنْ كَانَ)) (رواه مسلم)[5]

''جو اس عالم میں تمھارے پاس آئے کہ تم ایک شخص کی بیعت پر متفق و مجتمع ہو جاؤ اور وہ تمھاری جماعت میں پھوٹ ڈالنا چاہتا ہو تو تلوار سے اس کی گردن اڑا دو، وہ جو کوئی بھی ہو۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٥٤٣)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٢٤)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٥٧)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٥٣٧)

[5] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٥٢)

ان لوگوں کا گمان ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ جب امت کے پاس آئے تو وہ سب متفق ہو چکے تھے، لہٰذا انھوں نے امت میں پھوٹ ڈالنا چاہی، اس لیے وہ (نعوذ باللہ) واجب القتل ٹھہرے، برخلاف اُس کے جو امام کی بیعت سے پیچھے رہتا ہے اور اس کے خلاف خروج یعنی بغاوت نہیں کرتا اس کا یہ حکم نہیں، یعنی وہ واجب القتل نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی بیعت سے پیچھے رہنے کی وجہ سے قتل نہیں کیا تھا۔ یہ موقف جھوٹ اور جہالت پر مبنی ہے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے قتل ہونے سے پہلے قاتل پر حجت قائم کر دی تھی، انھوں نے اس کے سامنے تین مطالبے رکھے:

① ان کو یزید کے پاس جانے دیا جائے۔

② ان کو مدینہ واپس جانے دیا جائے۔

③ ان کو کسی سرحد پر بھیج دیا جائے، جہاں جہاد ہو رہا ہو۔

یہ ایسے سادہ مطالبے تھے کہ اگر کوئی عام آدمی بھی کرتا تو ان کو قبول کرنا ضروری ہوتا۔ تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ان مطالبات کو تسلیم کرنا کیوں ضروری نہیں تھا، حالانکہ وہ جنگ سے ہاتھ روکنے کی مانگ کر رہے تھے؟!

اصل میں ان کا آنا عراق کے ان کچھ شیعہ حضرات کے بے شمار خطوط کا نتیجہ تھا جن میں انھوں نے وہاں شریعت میں رد و بدل ہونے اور ظلم و عدوان کی شکایت کی اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے یہ درخواست کی کہ وہ عراق آئیں، تاکہ وہ ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے شریعت اور عدل کے نفاذ میں ان کا ساتھ دیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر اور ابوبکر بن عبدالرحمان بن حارث بن ہشام رضی اللہ عنہم جیسے اہلِ علم اور دین کے پیکر افراد نے انھیں وہاں نہ جانے کا مشورہ دیا اور بتایا کہ وہ لوگ دھوکا دیں گے، اپنے وعدے کی پاس داری نہیں کریں گے، اس لیے ان کو مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوں گے، بلکہ ان سے پہلے ان کے والد محترم جو ان سے زیادہ قابلِ احترام و اتباع تھے، وہ بھی اپنا مقصد حاصل نہیں کر پائے تھے، مگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو یہ گمان ہو چلا تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔ انھوں نے وہاں جانے سے پہلے اپنے چچا زاد بھائی مسلم بن عقیل کو بھیجا۔ اہلِ عراق نے پہلے تو ان کو پناہ دی، پھر قتل کر دیا۔ جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو اس واقعے کی اطلاع ملی تو انھوں نے واپسی کا ارادہ کر لیا مگر اس ظالم دستے نے ان کو آ پکڑا اور نہ یزید کے پاس جانے دیا، نہ اپنے علاقے میں واپس جانے کی اجازت دی اور نہ کسی سرحدی علاقے کی طرف نکلنے کی بات قبول کی، اس طرح وہ اللہ و رسول کی اطاعت کے کسی حکم پر عمل کرنے پر قادر نہ ہو سکے۔ اگر حسین رضی اللہ عنہ سے یزید کی ملاقات ہو جاتی تو وہ ان کی عزت و تکریم کرتا اور ان کے حق کا پورا لحاظ کرتا، کیوں کہ اس کے نزدیک حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے زیادہ معزز کوئی مسلمان نہیں تھا۔ جب ان ظالموں نے ان کو قتل کر دیا تو ان

کا سر عبیداللہ بن زیاد کے سامنے پیش کیا۔ وہ اپنی چھڑی کے ساتھ ان کے دندان پر ضرب لگانے لگا تو پاس ہی حضرت انس رضی اللہ عنہ بھی بیٹھے تھے۔ وہ کہنے لگے: جہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لب مبارک رکھتے تھے تو وہاں چھڑی سے ضرب لگا رہا ہے؟ یہ صحیح بخاری میں ہے۔[1] مسند احمد میں ہے: ابو برزہ اسلمی بھی اس کے گواہ ہیں، یہ واقعہ عراق میں ابن زیاد کے پاس پیش آیا۔[2]

یہ جو کہا جاتا ہے کہ ان کا سر شام لے جایا گیا وغیرہ وغیرہ، سب جھوٹ ہے۔ جن روایات میں یہ نقل کیا گیا ہے کہ ان کا سر یزید کے سامنے پیش کیا گیا اور وہ چھڑی سے اس پر ضرب لگانے لگا، یہ سب کمزور اور غیر ثابت ہیں، بلکہ یہ ثابت ہے کہ جب علی بن حسین رضی اللہ عنہما اور ان کے اہلِ خانہ کو یزید کے پاس لایا گیا تو اس مصیبت کی وجہ سے یزید کے گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی، کیوں کہ ان کی آپس میں قرابت داری تھی۔

یہ بھی مروی ہے کہ یزید نے کہا: ابن مرجانہ یعنی ابن زیاد پر خدا کی لعنت! اگر اس کے اور حسین رضی اللہ عنہ کے درمیان کوئی قرابت ہوتی تو کبھی ان کو قتل نہ کرتا۔ اس نے کہا: میں قتلِ حسین کے بغیر بھی اہلِ عراق کی اطاعت گزاری پر خوش تھا۔ اس نے علی بن حسین کو اپنے پاس ٹھہرنے یا مدینہ واپس جانے کا اختیار دیا مگر اس نے واپس جانا ہی پسند کیا تو اس نے اس کو ساز و سامان سے لیس کر کے اچھے طریقے سے رخصت کیا۔ یزید نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کا حکم نہیں دیا تھا، بلکہ اپنی حکومت میں منازعت و مداخلت سے روکنے کا حکم دیا تھا، البتہ اس نے قاتلینِ حسین سے انتقام نہیں لیا۔ اس کا یہ کام اسی طرح قابلِ مذمت ہے جس طرح اہلِ حرۃ کے ساتھ اس کا برتاؤ قابلِ مذمت و نفرت ہے۔ ان لوگوں نے اس کی بیعت توڑ دی تو اس نے ان پر قابو پانے کے بعد تین دن تک مدینہ طیبہ کی حرمت پائمال رکھی۔ بنابریں جب حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ کیا یزید سے حدیث لی جا سکتی ہے؟ انھوں نے کہا: نہیں اور اس کی کوئی حرمت نہیں۔ یہ وہی شخص نہیں جس نے اہلِ مدینہ کے ساتھ جو جو کیا؟ ان سے کہا گیا: کچھ لوگ کہتے ہیں: ہم یزید سے محبت کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا: کیا کوئی مومن یزید سے محبت کر سکتا ہے؟ تو کہا گیا: کیا آپ اس پر لعنت نہیں بھیجیں گے؟ کہا: تو نے کب اپنے باپ کو کسی پر لعنت بھیجتے ہوئے دیکھا ہے؟! اس سب کے باوجود یزید ایک نامور مسلمان بادشاہ تھا اور دیگر بادشاہوں کی طرح اس کی بھی اچھائیاں اور برائیاں ہیں۔ صحیح بخاری میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَوَّلُ جَيْشٍ يَغْزُو الْقُسْطَنْطُنِيَّةَ مَغْفُورٌ لَهُ»[3]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٥٣٨)

[2] مسند احمد میں یہ روایت نہیں ملی۔

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٦٦) مگر بخاری میں یہ روایت ام حرام بنت ملحان سے مروی ہے۔

’’قسطنطنیہ پر سب سے پہلے یلغار کرنے والا لشکر بخشا ہوا ہے۔‘‘

جس فوج نے سب سے پہلے قسطنطنیہ پر لشکر کشی کی اس کا امیر یزید تھا۔ اس نے اپنے باپ معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت میں یہ جنگ لڑی اور اس کے ساتھ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی گئے جو وہیں فوت اور دفن ہوئے۔ یہ یزید صحابی نہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں اس کی ولادت ہوئی، البتہ اس کا چچا یزید بن ابو سفیان صحابی اور پاکباز انسان تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے شام فتح کرنے کے لیے اس کو امیر بنایا اور وقتِ رخصت ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے انھیں وہ مشہور نصیحتیں کیں جن سے فقہا نے کئی مسائل میں استدلال کیا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ان کا انتقال ہوگیا تو انھوں نے ان کی جگہ ان کے بھائی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو والیِ شام بنا دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خلیفہ بننے کے بعد ان کی گورنری برقرار رکھی اور وہ ان کی شہادت تک شام کے حکمران رہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت ہی میں ان کا بیٹا یزید پیدا ہوا۔

اسلام کے کسی زمانۂ حکومت میں خواہ وہ یزید کی خلافت کا دور ہو یا کسی اور کا، کسی علوی یا غیر علوی ہاشمی عورت کو لونڈی نہیں بنایا گیا۔ یہ گھٹیا کام مشرک کافروں اور اہلِ کتاب نے کیا۔ جب مشرک ترک بغداد پر حملہ آور ہوئے تو انھوں نے کئی ہاشمیوں کو غلام اور لونڈی بنایا۔ اس کا سب سے بڑا سبب ابن علقمی جیسے رافضیوں کی معاونت تھی۔ غلام لونڈی بنانا تو ایک طرف رہا، بنی مروان نے زید بن علی کے سوا جن کو ہشام کی خلافت میں قتل کیا گیا، کسی علوی یا عباسی ہاشمی کو قتل نہیں کیا۔

عبدالملک نے حجاج کو یہ پیغام بھجوایا تھا، بنی ہاشم کے خون سے دور رہنا، چنانچہ اس نے کسی علوی یا عباسی ہاشمی کو قتل نہ کیا، بلکہ جب اس نے عبداللہ بن جعفر کی بیٹی سے شادی کی تو عبدالملک نے حجاج کو اس کو چھوڑنے کا حکم دیا، کیوں کہ وہ اس کے برابر کا نہیں تھا، یعنی انھوں نے اس کو کسی ہاشمی کے ساتھ شادی کرنے کے قابل بھی نہ سمجھا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا معاملہ یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ظلم کرتے ہوئے شہید کر دیا گیا۔ دراصل انھوں نے لوگوں کو اپنے ساتھ لڑنے سے روک دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی وجہ سے کوئی مسلمان مارا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس آزمایش کے پہنچنے کے نتیجے میں پیشگی جنت کی بشارت دے دی تھی،[1] لہٰذا انھوں نے چاہا کہ وہ جب اللہ سے ملیں تو ان پر مسلمانوں کے خون کا کوئی داغ اور الزام نہ ہو، اس لیے انھوں نے مظلوم بننا تو پسند کرلیا مگر ظالم بننا نہیں، آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں میں سے بہتر کی طرح جس نے کہا تھا:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٧١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٤٠٣)

﴿ لَئِنۡۢ بَسَطۡتَّ اِلَیَّ یَدَكَ لِتَقۡتُلَنِیۡ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیۡكَ لِاَقۡتُلَكَ ۚ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴾ [المائدۃ: ۲۸]

''اگر تو نے اپنا ہاتھ میری طرف اس لیے بڑھایا کہ مجھے قتل کرے تو میں ہرگز اپنا ہاتھ تیری طرف اس لیے بڑھانے والا نہیں کہ تجھے قتل کروں، بے شک میں اللہ سے ڈرتا ہوں، جو سارے جہانوں کا رب ہے۔''

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ان کے خون سے بری ہیں۔ انھوں نے ان کے خون کرنے میں شرکت کی نہ معاونت کی اور نہ پسند ہی کیا، بلکہ وہ قسم کھا کر کہتے تھے، حالانکہ وہ ویسے ہی سچے تھے: میں نے عثمان کو قتل کیا نہ اس میں کوئی مدد دی اور نہ ان کے قتل کرنے کو پسند ہی کیا، لیکن جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا گیا تو عام مسلمان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بردباری، سخاوت اور حسنِ کردار کی وجہ سے ان سے محبت کرتے ہی تھے، مگر اہلِ شام کے دل میں آپ کی محبت بہت زیادہ تھی، جس کے نتیجے میں وہ شیعانِ عثمان کا مرکز بن گیا اور بکثرت جذباتی باتیں ہونے لگیں، جس طرح ایسے پُرفتن حالات میں بالعموم ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں نے جھوٹی قسمیں کھا کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قتلِ عثمان میں معاون قرار دیا۔ اس وجہ سے شیعانِ عثمان کے دل حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف کینے اور غصے کی لپیٹ میں آ گئے اور انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نہ کی۔ کچھ دوسرے یہ کہتے سنے گئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا تھا اور جو ان کی مدد کرنی چاہیے تھی وہ نہ کی۔ قاتلوں کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کیمپ میں پناہ پکڑنے کی وجہ سے ان کا شبہہ تقویت پا گیا۔ حضرت علی، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم نے اندرونی طور پر قاتلینِ عثمان کو پکڑنے کا تہیہ اور کوشش کی جس کے نتیجے میں ان بلوائیوں نے جنگِ جمل کا فتنہ کھڑا کر دیا۔ ان لوگوں نے حضرت علی، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم کی اجازت اور ارادے کے بغیر ہی لڑائی شروع کر دی، بلکہ لڑائی کے محرک وہی بلوائی تھے جنھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف فتنہ کھڑا کیا تھا۔

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے معاویہ اور ان کی رعایا سے بیعت کا مطالبہ کیا تو انھوں نے انکار کر دیا۔ انھوں نے معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت بھی نہ کی، بلکہ کسی نے یہ بھی نہیں کہا تھا کہ معاویہ علی کی طرح ہے یا علی سے زیادہ بیعت کے حق دار ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے افضل اور زیادہ حق دار ہونے پر سب کا اتفاق تھا۔ ان کا صرف ایک مطالبہ تھا کہ حضرت علی قاتلینِ عثمان پر حد قائم کریں، لیکن حضرت علی لوگوں کے عدمِ اتفاق، رعایا کے انتشار اور ان لوگوں کی جنگی قوت کے سامنے بے بس تھے، جس کی وجہ سے شیعانِ عثمان نے بیعت کرنے سے انکار کر دیا، خواہ انکار کی وجہ ان کا حضرت علی کو حق دلانے میں بے بس سمجھنا تھا یا ان کو ان کا طرف دار گمان کرنا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیعت نہ کرنے کی وجہ سے ان سے جنگ کی تھی، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو امیر بنانے کی وجہ سے نہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کا لشکر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے لشکر سے بہر طور اولیٰ ہے، صحیح مسلم میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«تَمْرُقُ مَارِقَةٌ عَلَى حِيْنِ فُرْقَةٍ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ تَقْتُلُهُمْ اَوْلَى الطَّائِفَتَيْنِ بِالْحَقِّ »[1]

''مسلمانوں کے افتراق کے وقت ایک جماعت دین سے نکل جائے گی جس کو دو گروہوں میں سے حق کے زیادہ نزدیک گروہ قتل کرے گا۔''

یہ علی اور ان کے پیروکاروں کے معاویہ اور ان کے پیروکاروں سے حق کے زیادہ قریب ہونے کی صریح نص ہے۔ صحیح مسلم وغیرہ میں یہ فرمانِ نبوی بھی ہے:

« يَقْتُلُ عَمَّاراً الفِئَةُ الْبَاغِيَةُ »[2] ''عمار کو باغی گروہ قتل کرے گا۔''

لیکن یہاں یہ سوال ہے کہ کیا باغی گروہ سے ابتداءً ہی لڑنا ضروری ہے یا اس وقت جب وہ امامِ وقت سے لڑائی میں پہل کرے؟ یہ اختلافی مسئلہ ہے اور اکثریت دوسری رائے کی قائل ہے۔

بنابریں اکابر صحابہ، تابعین اور علما کا یہ مذہب ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا لڑائی چھوڑ دینا دین و دنیا کی سیاست میں کامل تر اور افضل فیصلہ تھا، تاہم حضرت علی رضی اللہ عنہ امامِ ہدایت اور خلیفہ راشد تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

''نبوت کی خلافت تیس سال تک رہے گی، پھر ملوکیت میں تبدیل ہو جائے گی۔'' (رواه أهل السنن)[3]

امام احمد وغیرہ نے اسی حدیث سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے صحیح ہونے اور اس پر اعتراض کرنے والوں کے جواب میں استدلال کیا ہے، ان کا قول ہے:

''من لم يُربع بِعَلِيٍّ في خلافته فهو أضل من حمار أهله''

''جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو چوتھا خلیفہ تسلیم نہیں کرتا وہ اپنے گھریلو گدھے سے بھی زیادہ گمراہ ہے۔''

قرآن نے بھی باغیوں سے لڑائی کرنے میں پہل کرنے کا حکم نہیں دیا، بلکہ فرمایا:

﴿ وَاِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ ﴾

[الحجرات: ٩، ١٠]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٦٥)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩١٥، ٢٩١٦)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٤٦، ٤٦٤٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٢٢٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٢٥٧)

''اور اگر ایمان والوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو دونوں کے درمیان صلح کرا دو، پھر اگر ان دونوں میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو اس (گروہ) سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے، یہاں تک کہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے، پھر اگر وہ پلٹ آئے تو دونوں کے درمیان انصاف کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کرو، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ مومن تو بھائی ہی ہیں، پس اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کراؤ اور اللہ سے ڈرو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔''

بغاوت وقتل جیسا حرام کام اگر کوئی شخص تاویل و اجتہاد کی بنا پر کرتا ہے اور اس کو حرام نہیں سمجھتا تو اس کی وجہ سے وہ کافر و فاسق نہیں ہو جاتا، بلکہ اس میں قصاص، دیت اور کفارہ بھی نہیں۔ امام زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جب فتنہ پیدا ہوا اس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وافر تعداد میں موجود تھے اور اس پر ان کا اجماع ہو چکا تھا کہ ہر خون، مال اور شرم گاہ جس کو تاویلِ قرآن کی بنا پر بہایا اور لوٹا گیا وہ رایگاں ہے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما نے ایک کافر کو کلمہ پڑھنے کے بعد قتل کر دیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا: اے اسامہ! تو نے اس کو کلمہ پڑھنے کے بعد قتل کر دیا؟! انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! اس نے اپنی جان بچانے کے لیے کلمہ پڑھا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: کیا تو نے اس کا دل ٹٹول لیا تھا؟[1] آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار یہ بات کہی، تو نے اس کو کلمہ پڑھنے کے بعد قتل کر دیا! مگر اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے قصاص لیا نہ دیت اور نہ کفارہ ہی، کیوں کہ انھوں نے تاویل کی بنا پر یہ کام کیا اور انھوں نے اس کے باوجود یعنی اس حالت میں کلمہ پڑھنے کے باوجود اس کو قتل کرنا جائز سمجھا۔

اس کے ساتھ یہ بات بھی مروی ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: اگر کوئی کافر میرا ہاتھ کاٹ دیتا ہے، پھر مسلمان ہو جاتا ہے، جب میں اس کو قتل کرنا چاہوں تو وہ مجھ سے بچنے کے لیے کسی درخت کی پناہ لے لیتا ہے، کیا میں اس کو قتل کر دوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: ''اگر تو اس کو قتل کرتا ہے تو اس کے کچھ کہنے سے پہلے تو اس کی جگہ پر تھا اور تیرے قتل کرنے سے پہلے وہ تیری جگہ پر تھا۔''[2] آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ جس طرح اس کا خون بہانا جائز تھا اسی طرح تیرا خون بہانا بھی جائز تھا۔

اس کے باوجود چونکہ حضرت اسامہ نے تاویل کی وجہ سے یہ کام کیا تھا اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا خون بہانا جائز قرار نہ دیا۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٠٢١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٧٩٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٥)

حدیث میں یہ واقعہ بھی مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے خالد بن ولید کو بنی جذیمہ کے پاس بھیجا، ان کو اچھے طریقے سے ہم مسلمان ہوئے کہنا نہ آیا اور انھوں نے اس کی جگہ یہ کہہ دیا کہ ''ہم صابی یعنی بے دین ہوئے۔'' خالد نے ان کی اس بات کو اسلام سے تعبیر قرار نہ دیا، بلکہ ان کو قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ جب رسول اللہ ﷺ تک یہ بات پہنچی تو آپ نے آسمان کی طرف اپنے ہاتھ بلند کیے اور کہا: ''اے اللہ! خالد نے جو کیا میں اس سے تیرے سامنے بری ہوں۔''[1] آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان کی طرف بھیجا اور ان سے آدھی دیت پر معاملہ طے کیا، مگر خالد کو سزا دی نہ امارت سے معزول ہی کیا، کیوں کہ انھوں نے یہ کام تاویل کی بنا پر کیا تھا۔

ایسے ہی جب انھوں نے مالک بن نویرہ کو قتل کیا تو حضرت ابوبکر نے ان کو کوئی سزا نہ دی، کیوں کہ انھوں نے تاویل کرتے ہوئے اس کو قتل کیا تھا۔ حضرت خالد مشرکوں پر مسلط اللہ کی تلوار تھی اور اسلام کو انھوں نے بہت زیادہ فائدہ پہنچایا، اگرچہ وہ کبھی غلطی بھی کر جاتے تھے اور علی، طلحہ اور زبیر تو خالد اور اسامہ وغیرہما سے افضل تھے۔

جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسن سے متعلق یہ فرمایا کہ میرا یہ بیٹا سردار ہے، جس کے ذریعے اللہ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں کے درمیان صلح کروائے گا تو درحقیقت آپ نے صلح کروانے کی وجہ سے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی تعریف کی، فتنے کی لڑائی میں کودنے کی بنا پر نہیں۔ اس سے معلوم ہوا، خدا اور رسول بھی صلح جوئی ہی پسند کرتے ہیں، لڑائی نہیں۔

خوارج سے متعلق جو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ان کو وہ گروہ قتل کرے گا جو حق کے زیادہ نزدیک ہوگا۔''[2] اس میں بتایا جو ان سے لڑے گا وہ خدا اور رسول کے حکم کی وجہ سے لڑے گا۔ اس میں نہروان کے خارجیوں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی نے جنگ کی تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ کے اس کام کی تعریف کی گئی تھی اور اللہ کے ہاں بھی آپ کو اس کا اجر و ثواب ملے گا اور ان سے لڑنے پر سب صحابہ کا اتفاق بھی تھا۔ مگر فتنے کی لڑائی میں شریک نہ ہونا ہی بہتر ہے، کیوں کہ حدیث میں آیا ہے: ''عن قریب فتنہ ہوگا جس میں بیٹھا ہوا فتنے کی طرف چلنے والے سے اور چلنے والا بھاگنے والے سے بہتر ہوگا۔''[3] آپ ﷺ نے محمد بن مسلمہ سے کہا تھا: «هَذَا لَا تَضُرُّهُ الْفِتْنَةُ»[4] ''اس کو فتنہ نقصان نہیں پہنچائے گا۔'' چنانچہ محمد بن سلمہ فتنے سے علاحدہ رہے۔ یہ بہترین انصاری تھے۔ یہ نہ علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ لڑے اور نہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٠٨٤، ٦٧٦٦)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٦٤)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٠٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٨٦)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٦٣) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔

ساتھ، ایسے ہی سعد بن ابی وقاص، اسامہ بن زید، عبداللہ بن عمر اور عمران بن حصین رضی اللہ عنہم جیسے اکثر سابقین صحابہ نے بھی لڑائی میں شرکت نہ کی۔ دونوں لشکروں میں علی کے بعد سعد بن ابی وقاص سے کوئی افضل نہیں تھا، مگر انھوں نے بھی اس جنگ میں حصہ نہ لیا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، زید بن ثابت، ابوبکرہ رضی اللہ عنہم اور دیگر نامور صحابہ اس سے دور رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہبان بن صیفی سے کہا: ﴿ خُذْ هَذَا السَّيْفَ فَقَاتِلْ بِهِ الْمُشْرِكِيْنَ فَإِذَا اقْتَتَلَ الْمُسْلِمُوْنَ فَاكْسِرْهُ ﴾ ''یہ تلوار پکڑ! اس کے ساتھ مشرکوں سے لڑ۔ اگر مسلمان آپس میں لڑ پڑیں تو اس کو توڑ دے۔'' چنانچہ انھوں نے ایسے ہی کیا اور فتنے میں نہ لڑے۔[1]

صحیحین میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قریب ہے مسلمان کا بہترین مال بکریاں ہوں گی۔ وہ ان کو پہاڑیوں کی چوٹیوں اور پانی کی جگہوں پر لے کر پھرتا رہے گا، اپنے دین کو فتنوں سے بچائے گا۔''[2] صحیح بخاری و مسلم میں حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿ إِنِّيْ لَأَرَى الْفِتْنَةَ تَقَعُ خِلَالَ بُيُوْتِكُمْ مَوَاقِعَ الْقَطْرِ ﴾[3]

''میں دیکھ رہا ہوں فتنہ تمھارے گھروں کے درمیان ایسے اتر رہا ہے جیسے بارش۔''

ایسی بہت سی احادیث ہیں جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت میں واقع ہونے والے فتنوں کی پیشین گوئی فرمائی ہے اور ساتھ ہی یہ رہنمائی بھی فرمائی ہے کہ قتالِ فتنہ میں کودنے سے گریز کیا جائے اور اس لڑائی میں شریک نہ ہونا شریک ہونے سے بہتر ہے۔

صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''میں نے اپنے رب سے اپنی امت کے لیے تین چیزیں مانگیں، اس نے دو عنایت کر دیں اور ایک روک دی۔ میں نے یہ مانگا کہ ان پر ان کے علاوہ (باہر سے) کسی دشمن کو مسلط نہ کیا جائے۔ اس نے مجھے یہ عنایت کر دی۔ میں نے یہ مانگا کہ ان کو عمومی قحط کے ساتھ ہلاک نہ کیا جائے۔ اس نے میری یہ مانگ بھی پوری کر دی۔ اور میں نے یہ مانگا کہ ان کے آپس کے درمیان لڑائی نہ پڑے، اس نے اس سے مجھے روک دیا۔''[4] آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیش گوئیاں درحقیقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی دلیلیں اور اس امت کے فضائل ہیں۔ انسانی نشأۃ و حیات میں افتراق، اختلاف اور خون بہانا لکھ دیا گیا ہے، جیسے فرشتوں نے کہا تھا:

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٢٠٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٩٦٠) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٨٨)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٧٧٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٨٥)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٩٠)

﴿ اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ﴾ [البقرۃ: ۳۰]

''کیا تو اس میں اس کو جائے گا جو اس میں فساد کرے گا اور بہت سے خون بہائے گا۔''

یہ امت چونکہ افضل اور آخری امت ہے، اس لیے اللہ نے اس کو گمراہی پر اکٹھا ہو جانے اور مکمل طور پر کسی غیر قوم (دشمن) کے تسلط میں جانے سے، جس طرح بنی اسرائیل چلے گئے، بچا لیا، بلکہ اگر اس امت میں ایک گروہ مغلوب ہو جائے تو دوسرا ایسا گروہ ضرور موجود ہوتا ہے جو قیامت تک دین پر قائم اور ظاہر رہے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے: ''اس میں ایک گروہ ہمیشہ حق پر ظاہر و غالب رہے گا، یہاں تک کہ اللہ کا حکم آ جائے۔''[1] اگر افتراق اور جنگ و جدال انسانی جبلت کے لوازم میں ہے تو اللہ نے اس کو ان کے آپس میں رکھ دیا، کسی دوسرے کو ان پر مکمل تسلط جمانے کی طاقت نہیں بخشی، جس طرح بنی اسرائیل پر ایسے دشمن کو مسلط کر دیا جس نے اس پوری قوم کو مقہور کر لیا، اس امت کو بحمد اللہ کوئی مکمل طور پر مقہور و مغلوب نہیں کر سکتا، اس میں ان شاء اللہ قیامت تک ایک گروہ ایسا ضرور موجود رہے گا جو حق پر اور منصور و مظفر ہو گا۔ واللہ أعلم[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق غلط عقیدہ

سوال ایک گروہ نے قسم قسم کے فاسد عقائد اختیار کر لیے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جب سے حضرت علی سے خلافت لی گئی ہے اس وقت سے دین میں فساد برپا ہو گیا۔ جو ان کی جگہ حکمران بنے وہ حکمرانی کے اہل نہیں تھے، اس لیے انھیں حکمران بنانا صحیح نہیں تھا۔ اس کے بعد مسلمانوں کے لیے ان کے عقود (معاہدات) میں سے کوئی عقد بھی صحیح نہیں۔ نہ عقدِ نکاح نہ کوئی دوسرا عقد۔ وہ تمام لوگ جنھوں نے اس واقعے کے بعد نکاح کیا۔ ان کا نکاح فاسد ہے۔ اسی طرح تمام عقود اور تمام حکمرانیاں فاسد ہیں۔

اس بات کا قائل یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ صلیب ہے۔ لفظ اللہ کا ہر حرف صلیب کے خطوط میں سے ہر خط کے سر پر ہے۔ وہ لوگوں کے سامنے اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ یہود و نصاریٰ اور اسی طرح مجوسی وغیرہ سب حق پر ہیں۔ ان کے بارے میں اہلِ علم کی رائے کیا ہے؟

جواب یہ جاہل اپنی جہالت میں رافضہ کے مشابہ ہیں جو جھوٹ بولتے ہیں اور ان کی خرافات صرف جاہل اور اسلام کے اصول سے ناواقف انسان کے ہاں ہی رواج پکڑ سکتی ہیں، جیسے یہ لوگ ہیں جن کا اس سوال میں ذکر کیا گیا ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٩٤٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٢١)

[2] جامع المسائل (٦/٢٥٥_٢٦٧)

جو کہتے ہیں کہ دین اسی وقت خراب ہو گیا تھا جب حضرت علی رضی اللہ عنہ سے خلافت لی گئی، یعنی رسول اللہ ﷺ کی وفات کے وقت ہی سے خلفائے راشدین خلافت کی اہلیت نہیں رکھتے تھے۔ مسلمانوں کے عقود باطل ہیں۔ اللہ تعالیٰ صلیب ہے۔ یہ یہود و نصاریٰ اور مجوسیوں کے دین کا اقرار کرتا ہے تو یہ شخص باطنی فرقے قرامطہ، نصیریہ، اسماعیلیہ اور ان کے پیروکاروں کی طرح کے بدترین زندیقوں میں سے ایک ہے۔

اس لیے یہ تضاد پر مبنی گفتگو کرتا ہے جو یہود و نصاریٰ اور مجوسیوں کے دین کا اقرار کرتا ہے اور خلفائے راشدین، مہاجرین و انصار میں سے پہلے سبقت لے جانے والوں کے دین پر طعن و تنقید کرتا ہے۔ ایسا شخص تمام لوگوں میں سے سب سے زیادہ جاہل اور کافر ہی ہوسکتا ہے۔ اگر وہ ان مومنوں سے تعلق رکھتا جو جانتے ہیں کہ یہ امت جو لوگوں کے لیے نکالی گئی ہے، تمام امتوں میں سے بہترین ہے۔ امت کے بہترین لوگ پہلی صدی سے تعلق رکھتے ہیں، پھر ان کے بعد آنے والے، پھر ان کے بعد آنے والے، تو وہ کافروں کے دین کا اقرار کرتا نہ مہاجرین و انصار کے دین پر حملہ آور ہوتا۔ اس کا تفصیلی جواب کسی دوسری جگہ بیان کر دیا گیا ہے۔ رافضہ کے جواب کے ضمن میں بھی ہم نے اس کے متعلق گفتگو کی ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

جو شخص حضرت محمد ﷺ کے رسول ہونے کا اقرار کرتا ہے وہ اس جیسی بات نہیں کہہ سکتا۔ ہم محمد ﷺ کے رسول ہونے کا اقرار کرنے والے کو جواب دیتے ہیں، اور اس کے شبہے کو زائل کرتے ہیں، لیکن جو آپ کی نبوت پر طعن و تنقید کرتا ہے، ہم اس کے ساتھ ایک دوسرے انداز میں بات کرتے ہیں، کیونکہ ہر مقام کے مناسب گفتگو ہوتی ہے۔[1]

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ایمان قبول کرنا اور فضیلت

سوال حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کب اسلام لائے؟ کیا ان کا ایمان بھی دوسروں کے ایمان جیسا تھا یا نہیں؟ ان کے بارے میں مزید کیا باتیں کہی گئی ہیں؟

جواب حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کا ایمان لانا متواتر روایات سے ثابت ہے۔ اس پر اہلِ علم کا اجماع ہے۔ ان کا ایمان بھی ان لوگوں جیسا تھا جو فتح مکہ کے موقعے پر ایمان لائے تھے، جیسے ان کے بھائی یزید بن ابی سفیان، سہیل بن عمرو، صفوان بن امیہ، عکرمہ بن ابی جہل، حارث بن ہشام، ابو اسد بن ابی العاص بن امیہ اور ان کی طرح دوسرے حضرات۔ یہ حضرات طلقا کہے جاتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے جب مکہ فتح کیا اس وقت یہ ایمان لائے۔ آپ ﷺ نے انھیں آزاد کیا اور ان پر احسان فرمایا۔ انھیں عطیات سے نوازا اور ان کی دل جوئی فرمائی۔

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٤/٤٨٩۔٤٩٠)

یہ روایت بھی بیان کی جاتی ہے کہ حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما اس سے پہلے ہی ایمان لا چکے تھے اور ہجرت سے بھی مشرف ہوئے تھے، جیسے کہ فتح مکہ سے پہلے خالد بن ولید، عمرو بن عاص، عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہم بھی اسلام لا چکے تھے اور مدینے کی طرف ہجرت کی تھی۔ اگر یہ روایت صحیح ہے تو معاویہ رضی اللہ عنہ کا شمار مہاجرین میں ہوگا۔

فتح مکہ کے موقعے پر مذکورہ حضرات کے ساتھ ان کا ایمان لانا علما کے درمیان متفق علیہ ہے۔ بہرحال وہ اس سے پہلے اسلام لائے ہوں یا انھوں نے فتح مکہ کے سال اسلام قبول کیا ہو البتہ بعض کذابین کا یہ کہنا کہ معاویہ نے اپنے والد کو اسلام قبول کرنے پر عار دلائی تھی، یہ سراسر جھوٹ ہے۔ اس پر تمام اہلِ علم اور محدثین کا اتفاق ہے۔

مذکورہ بالا تمام حضرات بہت اچھے مسلمان تھے، ان کی سیرت عمدہ تھی، کسی پر برائی کا کوئی الزام نہیں ہے اور نہ کسی اہلِ علم نے ان میں سے کسی پر نفاق کی تہمت لگائی ہے، جیسا کہ کچھ لوگ ان حضرات کو مطعون کرتے ہیں، بلکہ ان کی طرف سے اچھے اسلام، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت، اللہ اور اس کے رسول سے محبت، اللہ کی راہ میں جہاد اور حدودِ الٰہی کی نگہداشت کا ہی مظاہرہ ہوا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ باطن میں ان کا ایمان و اسلام حسین اور خوبصورت تھا۔ ان میں سے بعض حضرات کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امیر مقرر کیا ہے اور اپنا نائب بنایا ہے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عتاب بن اسید کو مکے کے لیے اپنا نائب مقرر فرمایا تھا جو بہترین مسلمان تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اے مکہ والو! اللہ کی قسم! اگر کسی کے بارے میں مجھے یہ خبر ملی کہ وہ نماز سے پیچھے رہ گیا ہے تو میں اس کی گردن مار دوں گا۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاویہ رضی اللہ عنہ کے والد ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ کو نجران کا والی مقرر کیا اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک نجران کے والی رہے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے والد سے زیادہ اچھے مسلمان تھے۔ اس پر اہلِ علم کا اتفاق ہے۔ اسی طرح ان کے بھائی یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما ان سے اور اپنے والد سے بھی اچھے مسلمان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عیسائیوں سے شام میں جہاد کرنے کے لیے ان کو امیرِ لشکر مقرر فرمایا تھا۔ یہ ان امرا میں سے ایک تھے جن کو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مقرر کیا تھا اور وصیت فرمائی تھی۔ یہ وصیتیں معروف ہیں اور اہلِ علم نے ان کو نقل کیا ہے اور ان کے استناد پر اعتماد کیا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے موطا میں اور بعض دوسرے حضرات نے نقل کیا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کی سواری کی مشایعت فرمائی۔ یہ دیکھ کر یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما نے عرض کی: اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ! یا تو آپ سوار ہو جائیں ورنہ میں اپنی سواری سے نیچے آرہا ہوں۔ آپ نے کہا: نہ تم اپنی سواری سے نیچے اترو گے اور نہ میں سواری پر بیٹھوں گا۔ میں اپنے ان قدموں کو اللہ عزوجل کی راہ میں اٹھنے والے قدم سمجھ رہا ہوں۔

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بھی امرائے اسلام میں سے تھے۔ اسی طرح کے ایک امیر ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ

تھے۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان سب پر خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو اس لیے مقدم کیا تھا کہ وہ بہادر تھے اور ان سے جہاد میں زیادہ فائدے کی امید تھی۔ جب ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات ہوگئی تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ان تمام حضرات پر ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر کردیا، کیوں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ احکامِ الٰہی کی تنفیذ میں بہت سخت تھے۔ آپ نے ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر کیا، کیوں کہ وہ نرم طبیعت تھے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نرم طبیعت تھے اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کفار کے لیے بہت سخت تھے۔ اس طرح نرم نے سخت کو اور سخت نے نرم کو امیر مقرر کیا، تاکہ توازن اور اعتدال برقرار رہے۔ دونوں حضرات نے وہی کیا جو اللہ تعالیٰ کو اس کے حق کی ادائی کے لیے محبوب تھا۔ ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مخلوق میں سب سے زیادہ کامل تھے۔ کفار و منافقین کے لیے انتہائی سخت تھے۔ جس طرح اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو کامل ترین شریعت قرار دیا ہے، اسی طرح اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ﴾ [الفتح: ٢٩]

''وہ کافروں کے حق میں تو سخت ہیں اور آپس میں رحم دل۔''

ان کے بارے میں اللہ ایک دوسری جگہ فرماتا ہے:

﴿ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ﴾ [المائدة: ٥٤]

''جو مومنوں کے حق میں نرمی کریں اور کافروں سے سختی سے پیش آئیں، اللہ کی راہ میں جہاد کریں اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں۔''

صحیح میں ثابت ہے کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بدر کے قیدیوں کے بارے میں مشورہ کیا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فدیہ لے کر انھیں چھوڑ دینے کا مشورہ دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مشورہ تھا کہ سب کی گردن ماردی جائے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ بعض لوگوں کے دل اتنے نرم بنا دیتا ہے کہ وہ ریشم سے بھی زیادہ ملائم ہو جاتے ہیں جب کہ بعض لوگوں کے دل اتنے سخت کر دیتا ہے کہ وہ چٹان سے بھی زیادہ سخت ہوجاتے ہیں۔ اے ابوبکر! تمھاری مثال ابراہیم خلیل علیہ السلام جیسی ہے جب انھوں نے یہ فرمایا تھا:

﴿ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [إبراهيم: ٣٦]

''سو جس شخص نے میرا کہا مانا وہ میرا ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو تو بخشنے والا مہربان ہے۔''

اور عیسیٰ بن مریم جیسی ہے جب انھوں نے یہ کہا تھا:

﴿ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ [المائدة: ١١٨]

''اگر تو ان کو عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر بخش دے تو (تیری مہربانی ہے) بے شک تو غالب (اور) حکمت والا ہے۔''

اور اے عمر! تمھاری مثال نوح علیہ السلام جیسی ہے جب انھوں نے یہ فرمایا تھا:

﴿ وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ﴾ [نوح: ٢٦]

''اور (پھر) نوح نے (یہ) دعا کی کہ میرے پروردگار کسی کافر کو زمین پر بسا نہ رہنے دے۔''

اور موسیٰ بن عمران جیسی ہے جب انھوں نے یہ کہا تھا:

﴿ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴾ [یونس: ٨٨]

''اے اللہ! ان کے مال کو برباد کر دے اور اُن کے دلوں کو سخت کر دے کہ ایمان نہ لائیں جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔''[1]

یہ دونوں حضرات حیاتِ نبوی میں ٹھیک اسی طرح تھے، جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اوصاف بیان کیے ہیں اور زمین والوں میں یہی دونوں حضرات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وزیر تھے۔

صحیح میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے ثابت ہے کہ جب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی چارپائی نمازِ جنازہ کے لیے رکھی گئی اور لوگ نمازِ جنازہ پڑھنے کے لیے حاضر ہوئے تو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہاں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کھڑے تھے۔ انھوں نے فرمایا: اللہ کی قسم! روئے زمین پر اس میت کے علاوہ کوئی نہیں کہ جس کے جیسے اعمال کرتے ہوئے اللہ سے ملاقات کرنا مجھے محبوب ہو۔ اللہ کی قسم! مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کا حشر آپ کے دونوں ساتھیوں کے ساتھ فرمائے گا، کیوں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ بکثرت سنے ہیں کہ میں داخل ہوا اور ابوبکر و عمر داخل ہوئے، میں نکلا اور ابوبکر و عمر نکلے اور میں گیا اور ابوبکر و عمر گئے۔[2]

پھر صحیح میں یہ بھی ثابت ہے کہ غزوۂ احد کے دن جب بیشتر مسلمان پسپا ہو گئے تو ابوسفیان نے اس وقت آواز لگائی جب قوم سراسیمہ تھی: کیا اس جماعت میں محمد ہیں؟ کیا اس جماعت میں محمد ہیں؟ کیا اس جماعت میں محمد ہیں؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسے کوئی جواب نہ دو۔ پھر اس نے پکار کر کہا: کیا اس جماعت میں ابوقحافہ ہیں؟ کیا اس

---

[1] مسند أحمد (٣٨٣/١، ٣٨٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٨٤) السنن الكبرىٰ للبيهقي (٣٢١/٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٧٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨٩)

جماعت میں ابو قحافہ ہیں؟ کیا اس جماعت میں ابوقحافہ ہیں؟ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اسے جواب نہ دو۔ پھر اس نے پکارا: کیا اس جماعت میں ابن خطاب ہیں؟ کیا اس جماعت میں ابن خطاب ہیں؟ کیا اس جماعت میں ابن خطاب ہیں؟ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اسے کوئی جواب نہ دو .... [1] (حدیث طویل ہے) دشمن کی مختلف افواج کے قائد ابو سفیان نے صرف ان تین حضرات کے بارے میں پوچھا، نبی اکرم ﷺ کے بارے میں، ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں اور عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ لشکرِ اسلام کی سرکردہ شخصیات یہی ہیں۔

ہارون رشید نے امام مالک سے عرض کی: مجھے بتائیں کہ نبی اکرم ﷺ کی نگاہوں میں حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا کیا مقام تھا؟ امام مالک نے فرمایا: دونوں کا آپ ﷺ کی نگاہوں میں وہی مقام تھا جو آپ ﷺ کی وفات کے بعد دونوں کا ہے۔ یہ سن کر ہارون رشید نے کہا: اے امام مالک! آپ نے میری تشفی فرما دی۔

جب نبی اکرم ﷺ کی وفات ہوگئی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنائے گئے تو اللہ نے ان کے دل میں شدت پیدا فرما دی جو اس سے پہلے نہیں تھی، یہاں تک کہ وہ اس معاملے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی فوقیت لے گئے اور لشکرِ اسامہ کو بھیج کر مرتدین سے جہاد کیا اور یہ اس نبیِ اطہر کے کام کی تکمیل تھی جس کے آپ خلیفہ تھے۔

اسی طرح جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ مقرر کیے گئے، اللہ نے ان کے دل میں نرمی اور رحمت پیدا فرما دی جو اس سے پہلے نہیں تھی۔ اس طرح اللہ نے ان کی شخصیت کی تکمیل فرما دی، یہاں تک کہ وہ امیر المومنین بن گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک نے خالد رضی اللہ عنہ کو امیر لشکر بنایا اور دوسرے نے ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو۔

یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خلیفہ بننے تک شام کے والی رہے۔ جب ان کا انتقال ہو گیا تو عمر رضی اللہ عنہ نے معاویہ رضی اللہ عنہ کو ان کے بھائی یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کی جگہ پر والی مقرر فرمایا۔ پورے عہدِ فاروقی میں وہی وہاں کے والی رہے اور عمر رضی اللہ عنہ اور ان کی رعیت معاویہ کی شکر گزار رہی۔ اہلِ شام میں ان کی سیرت و کردار پر ان کا شکریہ ادا کیا جاتا رہا۔ ان کا حلم اور ان کا عدل دیکھ کر رعیت ان سے محبت کرتی رہی، یہاں تک کہ عمر رضی اللہ عنہ نے ان میں سے کسی کی معاویہ کے خلاف شکایت نہیں سنی اور نہ ضرورت محسوس کی کہ کسی مظلوم کی دادرسی کریں۔ یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہما نبی اکرم ﷺ کے اصحاب میں سے نہیں تھے، بلکہ ان کی ولادت عہدِ عثمانی میں ہوئی تھی اور ان کا نام ان کے چچا صحابی یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کے نام پر رکھا گیا تھا۔

فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کرنے والے حضرات معاویہ، ان کے بھائی یزید، سہیل بن عمرو، حارث بن ہشام رضی اللہ عنہم وغیرہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ غزوۂ حنین میں شریک ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں شامل قرار پائے:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٨١٧)

﴿ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ﴾ [التوبة: ٢٦]

''پھر اللہ نے اپنے پیغمبر پر اور مومنوں پر اپنی طرف سے تسکین نازل فرمائی (اور تمھاری مدد کو فرشتوں کے) لشکر جو تمھیں نظر نہیں آتے تھے (آسمان سے) اتارے اور کافروں کو عذاب دیا اور کفر کرنے والوں کی یہی سزا ہے۔''

یہ حضرات ان اہلِ ایمان میں سے تھے جن پر اللہ نے اپنی طرف سے نبی اکرم ﷺ کے ساتھ تسکین نازل فرمائی۔ اسی طرح یہ حضرات غزوہ طائف میں شریک ہوئے جب مسلمانوں نے ان کا محاصرہ کیا اور طائف پر منجنیق سے پتھر پھینکے گئے۔ یہ حضرات شام میں نصاریٰ سے جنگ کے موقع پر بھی موجود تھے اور اسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے سورت براءت نازل فرمائی۔ اسی کو غزوہ عسرہ کہا جاتا ہے، جس میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے اللہ کی راہ میں ایک ہزار اونٹ مع ساز و سامان دیے تھے۔ محتاجگی اور ضرورت کے پیشِ نظر پچاس اونٹ مزید عطا کیے۔ ان کا جذبہ ایثار دیکھ کر اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: آج کے بعد عثمان کو کوئی چیز نقصان نہیں پہنچا سکے گی، وہ جو چاہیں کریں۔[1] یہ نبی اکرم ﷺ کا آخری غزوہ تھا، لیکن اس میں قتال کی نوبت نہیں آئی تھی۔

نبی اکرم ﷺ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں بیس سے زیادہ غزوات میں بہ نفسِ نفیس شرکت کی ہے، لیکن قتال کی نوبت صرف نو غزوات: بدر، احد، بنوالمصطلق، خندق، ذی قرد، غزوہ طائف میں پیش آئی ہے۔ سب سے بڑا لشکر جو نبی اکرم ﷺ نے جمع کیا وہ حنین اور طائف میں تھا۔ اس موقع پر لشکرِ اسلام کی تعداد بارہ ہزار تھی۔ سب سے بڑا لشکر جو نبی اکرم ﷺ کے ساتھ قتال کرنے کے لیے نکلا وہ تبوک کا لشکر تھا۔ اس میں شامل فوجیوں کی تعداد بہت زیادہ اور شمار سے پرے تھی، لیکن اس میں جنگ نہیں ہوئی۔

یہ مذکورہ لوگ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں شامل ہیں:

﴿لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ﴾ [الحديد: ١٠]

''جس شخص نے تم میں سے فتح (مکہ) سے پہلے خرچ کیا اور لڑائی کی وہ (اور جس نے یہ کام پیچھے کیے وہ) برابر نہیں ان لوگوں کا درجہ ان لوگوں سے کہیں بڑھ کر ہے جنھوں نے بعد میں خرچ (اموال) اور (کفار سے) جہاد و قتال کیا اور اللہ نے سب سے (ثواب) نیک (کا) وعدہ تو کیا ہے اور جو کام تم کرتے ہو اللہ ان سے واقف ہے۔''

---

[1] مسند أحمد (٥/٦٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٧٠١) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے حسن قرار دیا ہے۔

یہ فتح مکہ کے موقعے پر اسلام لانے والے طلقا، ان حضرات میں شامل ہیں جنھوں نے فتح مکہ کے بعد اللہ کی راہ میں انفاق کیا اور جہاد میں شریک ہوئے۔ اللہ نے ان کے لیے بہترین وعدہ فرمایا ہے۔ انھوں نے غزوہ حنین اور غزوہ طائف کے موقع پر انفاق کیا اور ان میں قتال کیا۔ اللہ ان سے راضی ہو۔

یہ حضرات ان لوگوں میں بھی شامل ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے اپنی رضامندی کا اظہار فرمایا ہے، جیسا کہ اس کا ارشاد ہے:

﴿ وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ﴾ [التوبة: ١٠٠]

''جن لوگوں نے سبقت کی (یعنی سب سے) پہلے (ایمان لائے) مہاجرین میں سے بھی اور انصار میں سے بھی اور جنھوں نے نیکوکاری کے ساتھ اُن کی پیروی کی اللہ اُن سے خوش ہے اور وہ اللہ سے خوش ہیں۔''

سابقین سے مراد وہ لوگ ہیں جو صلح حدیبیہ سے پہلے مسلمان ہوئے۔ یہ ان حضرات کی طرح ہیں جنھوں نے درخت کے نیچے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

﴿ لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ ﴾ [الفتح: ١٨]

''(اے پیغمبر!) جب مومن تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے تو اللہ ان سے خوش ہوا۔''

ان حضرات کی تعداد چودہ سو سے زیادہ تھی۔ یہ سب کے سب جنتی ہیں، جیسا کہ صحیح میں ثابت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جن حضرات نے درخت کے نیچے بیعت کی ہے ان میں سے کوئی ایک بھی دوزخ میں نہیں جائے گا۔[1] ان میں سے ایک حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ تھے، ان کی کچھ غلطیاں تھیں جو معروف و مشہور تھیں، جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور واقعات سے متعلق مشرکین مکہ سے خط کتابت کرنا اور اپنے غلاموں سے برا سلوک کرنا۔ صحیح میں ثابت ہے کہ ان کا ایک غلام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! اللہ کی قسم! حاطب ضرور جہنم میں جائے گا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو جواب دیا: تیری یہ بات غلط ہے۔ وہ غزوہ بدر اور حدیبیہ میں شریک رہے ہیں۔[2]

صحیح میں یہ بھی ثابت ہے کہ جب انھوں نے مشرکین کو اس بات کی اطلاع دینے کے لیے خط لکھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف کوچ کرنے والے ہیں تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے علی بن ابی طالب اور زبیر رضی اللہ عنہما کو اس عورت کو گرفتار کرنے کے لیے بھیجا جس کے پاس خط تھا۔ چنانچہ وہ دونوں حضرات اس عورت کو پکڑ لائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: حاطب! یہ

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٩٦)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٩٥)

سب کیا ہے؟ انھوں نے عرض کی: اللہ کی قسم! اے اللہ کے رسول! میں نے یہ کام اپنے دین سے مرتد ہو کر نہیں کیا اور نہ ایسا ہے کہ اسلام کے بعد کفر مجھے پسند آ گیا ہو، بلکہ میں ایک ایسا شخص تھا جس کا قریش سے میل ملاقات کا تعلق تھا۔ میں ان کے قبیلے کا فرد نہیں تھا۔ جب کہ آپ کے اصحاب میں سے بہت سے حضرات کی مکے میں قرابت داریاں ہیں، جن سے وہ اپنے اہل و عیال کی حفاظت کراتے ہیں۔ میں نے چاہا کہ چونکہ میں مکہ میں کسی سے قرابت داری نہیں رکھتا تو ان پر ایسا احسان کر دوں جس کی وجہ سے وہ میرے اہل و عیال کی حفاظت کریں۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: مجھے اجازت دیں میں اس منافق کی گردن مار دوں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ بدر میں شریک رہے ہیں اور تمھیں کیا معلوم کہ اللہ نے شرکائے بدر کے بارے میں کہا ہے کہ جو چاہو عمل کرو، میں نے تمھاری مغفرت فرما دی ہے۔[1]

اس حدیث میں بیان کر دیا گیا ہے کہ شرکائے بدر و حدیبیہ جیسے سابقون الاولون کے بعض بڑے بڑے گناہ اللہ تعالیٰ نے ان کی سبقتِ اسلام، ان کے ایمان اور ان کے جہاد کی وجہ سے معاف فرما دیے ہیں۔ کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ ان کی وجہ سے انھیں نشانہ تنقید بنائے، جیسا کہ حاطب کو اس گناہ کی سزا نہیں دی گئی جس کے وہ مرتکب ہوئے تھے۔

اسی سے استدلال کیا جا سکتا ہے کہ علی، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم اور ان کے جیسے دیگر حضرات کے درمیان جو کچھ ہوا، اگر وہ اجتہاد کی وجہ سے تھا تو پھر اس کا کوئی گناہ نہیں ہے اور نہ اس پر کلام کرنے کی گنجایش ہے، کیوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب حاکم اجتہاد کرے اور درستی تک پہنچے تو اسے دوہرا ثواب ملتا ہے، لیکن اگر وہ اجتہاد کرے اور غلطی کر بیٹھے تب بھی اسے ایک ثواب ملتا ہے۔[2]

اگر یہاں کوئی غلطی ہے بھی تو یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ یہ وہ حضرات ہیں جن سے اللہ راضی ہو چکا ہے اور یہ جو کچھ کریں گے، اس کی مغفرت کی جا چکی ہے۔ ایسی صورت میں جو گناہ ان سے ہوئے بشرطیکہ وہ گناہ ہوں تو ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا، بلکہ اگر ان میں سے کسی سے گناہ ہوئے بھی ہوں تو اللہ تعالیٰ نے ان اسباب میں سے کسی سبب سے اسے مٹا دیا ہوگا جن سے وہ گناہوں کو مٹا دیتا ہے، جیسے اس نے توبہ کر لی ہے اور اللہ نے اس کی توبہ قبول کر لی ہو، یا اس کی اتنی نیکیاں ہوں جو گناہوں کو دھو ڈالتی ہیں یا اللہ نے کسی ابتلا اور آزمایش میں مبتلا کر کے اسے اس گناہ کے لیے کفارہ بنا دیا ہو، کیوں کہ صحیح حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بندہ مومن کو جو بھی مرض لاحق ہوتا ہے، تکلیف پہنچتی ہے، غم ہوتا ہے، افسوس و ملال ہوتا ہے اور اذیت پہنچتی ہے تو اللہ تعالیٰ

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٤٩٤)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٩١٩) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٧١٦)

اسے اس کی خطاؤں کا کفارہ بنا دیتا ہے۔‘‘[1]

رہے وہ حضرات جو ان سابقون اولون کے بعد آئے، یعنی وہ لوگ جو صلح حدیبیہ کے بعد اسلام لائے تو یہ حضرات اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں داخل ہیں:

﴿ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ﴾ [الحدید: ۱۰]

’’اور اللہ نے سب سے (ثواب) نیک (کا) وعدہ تو کیا ہے۔‘‘

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں بھی وہ داخل ہیں:

﴿ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ﴾ [التوبۃ: ۱۰۰]

’’اور جنھوں نے نیکوکاری کیساتھ اُن کی پیروی کی اللہ اُن سے خوش ہے اور وہ اللہ سے خوش ہیں۔‘‘

فتح مکہ سے پہلے حضرات خالد بن ولید، عمرو بن عاص اور عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہم وغیرہ اسلام لائے اور طلقا کے بعد اہلِ طائف نے اسلام قبول کیا۔ اسلام قبول کرنے والوں میں سب سے بعد کے لوگ یہی ہیں۔ ان میں عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ ثقفی بھی تھے، جن کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ طائف پر امیر مقرر کیا تھا اور آخر میں اسلام لانے کے باوجود ان کا شمار خیار صحابہ میں ہوتا ہے۔

بسا اوقات ایک شخص تاخیر سے اسلام لانے میں موخر ہوتا ہے، لیکن وہ پہلے اسلام لانے والوں میں سے بعض لوگوں سے افضل ہوتا ہے۔ جیسا کہ عمر رضی اللہ عنہ دیر میں اسلام لائے۔ کہا جاتا ہے کہ ان سے پہلے چالیس لوگ اسلام قبول کر چکے تھے، لیکن اس کے باوجود اللہ نے ان کو ان سے پہلے اسلام لانے والوں میں سے بیشتر لوگوں پر فضیلت عطا فرمائی۔ حضرات عثمان، طلحہ، زبیر، سعد اور عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر اسلام لا چکے تھے، لیکن ان تمام حضرات پر عمر رضی اللہ عنہ کو فوقیت حاصل ہے۔

اس بات پر اہلِ علم کا اتفاق ہے کہ آزاد بالغ مردوں میں سب سے پہلے ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا۔ آزاد بچوں میں سب سے پہلے علی رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا۔ غلاموں میں سب سے پہلے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا اور عورتوں میں سب سے پہلے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا مشرف بہ اسلام ہوئیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٣١٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٧٣)

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْٓا اُولٰٓىِٕكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ ۝ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْٓا اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓىِٕكَ مِنْكُمْ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ [الأنفال: ٧٢۔٧٥]

''بے شک جولوگ ایمان لائے اورانھوں نے ہجرت کی اوراپنے مالوں اوراپنی جانوں کے ساتھ اللہ کے راستے میں جہاد کیا اور وہ لوگ جنھوں نے جگہ دی اور مدد کی، یہ لوگ! ان کے بعض کے دوست ہیں اور جولوگ ایمان لائے اور ہجرت نہ کی تمھارے لیے ان کی دوستی سے کچھ بھی نہیں، یہاں تک کہ وہ ہجرت کریں اور اگر وہ دین کے بارے میں تم سے مدد مانگیں تو تم پر مدد کرنا لازم ہے، مگراس قوم کے خلاف کہ تمھارے درمیان اور ان کے درمیان کوئی معاہدہ ہو اور اللہ اسے جو تم کر رہے ہو، خوب دیکھنے والا ہے۔اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے بعض بعض کے دوست ہیں، اگر تم یہ نہ کرو گے تو زمین میں بہت بڑا فتنہ اور بڑا فساد ہو گا اور جولوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے جگہ دی اور مدد کی وہی لوگ سچے مومن ہیں، انہی کے لیے بڑی بخشش اور باعزت رزق ہے اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کی اور تمھارے ساتھ مل کر جہاد کیا تو وہ تم ہی سے ہیں اور رشتے دار اللہ کی کتاب میں ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں۔ بے شک اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔''

یہ آیت عام ہے۔ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ [الحشر: ٨۔١٠]

''(اور) ان مفلسانِ تارک الوطن کے لیے بھی جو اپنے گھروں اور مالوں سے خارج (اور جدا) کر دیے

گئے ہیں (اور) اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کے طلب گار اور اللہ اور اس کے پیغمبر کے مددگار ہیں یہی لوگ سچے (ایماندار) ہیں اور (ان لوگوں کے لیے بھی) جو مہاجرین سے پہلے (ہجرت کے) گھر (یعنی مدینے) میں مقیم اور ایمان میں (مستقل) رہے (اور) جو لوگ ہجرت کر کے ان کے پاس آتے ہیں ان سے محبت کرتے ہیں اور جو کچھ ان کو ملا اس سے اپنے دل میں کچھ خواہش (اور) خلش نہیں پاتے اور ان کو اپنی جانوں سے مقدم رکھتے ہیں خواہ ان کو خود احتیاج ہی ہو اور جو شخص حرصِ نفس سے بچا لیا گیا تو ایسے ہی لوگ مراد پانے والے ہیں اور (ان کے لیے بھی) جو ان (مہاجرین) کے بعد آئے (اور) دعا کرتے ہیں کہ اے پروردگار! ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں گناہ معاف فرما اور مومنوں کی طرف سے ہمارے دل میں کینہ (وحسد) نہ پیدا ہونے دے، اے ہمارے پروردگار! تو بڑا شفقت کرنے والا مہربان ہے۔''

یہ اور اس سے پہلے والی آیت ان تمام حضرات کو اپنے عموم میں شامل کیے ہوئے ہے جو سابقون الاولون کے بعد قیامت تک دائرۂ اسلام میں داخل ہوں گے، پھر وہ اصحابِ رسول اس میں کیوں نہیں داخل ہوں گے جو آپ ﷺ پر ایمان لائے اور آپ ﷺ کے ساتھ جہاد کیا۔ صحیح حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے: ''مہاجر وہ ہے جو ان باتوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے۔''[1] جو طلقا مسلمان ہوئے اور جنھوں نے اللہ کی منع کردہ چیزیں چھوڑ دیں، ان پر اس ہجرت کا اطلاق ہوگا اور وہ قرآن کی اس آیت میں شامل ہوں گے:

﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ﴾ [الأنفال: ٧٥]

''اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور وطن سے ہجرت کر گئے اور تمھارے ساتھ ہو کر جہاد کرتے رہے وہ بھی تمھیں میں سے ہیں۔''

اسی طرح وہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں داخل ہوں گے:

﴿ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ﴾ [الحديد: ١٠]

''اور اللہ نے سب سے (ثواب) نیک (کا) وعدہ تو کیا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠)

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا﴾ [الفتح: ٢٩]

''محمد (ﷺ) اللہ کے پیغمبر ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں کے حق میں تو سخت ہیں اور آپس میں رحم دل (اے دیکھنے والے!) تو ان کو دیکھتا ہے کہ (اللہ کے آگے) جھکے ہوئے سربسجود ہیں اور اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی طلب کر رہے ہیں (کثرتِ) سجود کے اثر سے ان کی پیشانیوں پر نشان پڑے ہوئے ہیں ان کے یہی اوصاف تورات میں (مرقوم) ہیں اور یہی اوصاف انجیل میں ہیں (وہ) گویا ایک کھیتی ہیں جس نے (پہلے زمین سے) اپنی سوئی نکالی پھر اس کو مضبوط کیا پھر موٹی ہوئی اور پھر اپنی نال پر سیدھی کھڑی ہو گئی اور لگی کھیتی والوں کو خوش کرنے، تا کہ کافروں کا جی جلائے جو لوگ ان میں سے ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان سے اللہ نے گناہوں کی بخشش اور اجرِ عظیم کا وعدہ کیا ہے۔''

یہ آیت ان تمام لوگوں کو مشتمل ہے جو آپ ﷺ پر مطلق طور پر ایمان لائے۔

صحاح وغیرہ میں نبی اکرم ﷺ سے کئی ایک سندوں سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''سب سے بہترین زمانہ وہ ہے جس میں میری بعثت ہوئی۔ اس کے بعد ان لوگوں کا زمانہ ہے جو میرے زمانے سے متصل ہے اور پھر وہ زمانہ ہے جو اس تیسرے زمانے سے متصل ہے۔''[1]

صحیح میں نبی اکرم ﷺ سے ثابت ہے کہ عبد الرحمٰن اور خالد کے درمیان کوئی بات ہو گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے خالد! میرے اصحاب کو سب وشتم نہ کرو۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر تم میں سے کوئی اُحد کے برابر سونا اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرے پھر بھی ان کے ایک مد اور نصف مد کے برابر بھی ثواب نہیں پا سکتا۔''[2] سابقون الاولون کی نسبت سے یہ بات آپ نے خالد اور ان کے جیسے ان حضرات کے متعلق فرمائی تھی جو صلح حدیبیہ کے بعد اسلام لائے تھے۔ آپ ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ تم میں سے کوئی اُحد پہاڑ کے برابر سونا اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر دے تو بھی اسے اتنا ثواب نہیں ملے گا جتنا ان حضرات نے ایک مد اور آدھا مد اناج خرچ کر کے ثواب حاصل کیا تھا۔

یہ لوگ جو صلح حدیبیہ کے بعد اسلام میں داخل ہوئے، اللہ تعالیٰ کے مندرجہ ذیل ارشاد میں شامل ہیں:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٠٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٣٣_٢٥٣٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٧٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٤٠_٢٥٤١)

﴿ لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِنَ الَّذِينَ أَنْفَقُوا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوا وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ ﴾ [الحدید: ۱۰]

"جس شخص نے تم میں سے فتح (مکہ) سے پہلے خرچ کیا اور لڑائی کی وہ (اور جس نے یہ کام پیچھے کیے وہ) برابر نہیں ان لوگوں کا درجہ ان لوگوں سے کہیں بڑھ کر ہے جنھوں نے بعد میں خرچ (اموال) اور (کفار سے) جہاد و قتال کیا اور اللہ نے سب سے (ثواب) نیک (کا) وعدہ تو کیا ہے۔"

یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر ایک سے اس مقام بلند کا وعدہ کیا ہے۔

آپ ﷺ کے اصحاب کے بعد صورت حال کیا ہوگی؟ لفظ "الصحبة" اسم جنس ہے۔ اس کا اطلاق ہر اس شخص پر ہوتا ہے جس نے نبی اکرم ﷺ کی صحبت اختیار کی ہے خواہ یہ صحبت کم مدت کی رہی ہو یا زیادہ کی، لیکن ہر ایک کے لیے اسی مدت کی صحبت ہو گی جو اسے حاصل رہی ہو۔ مثال کے طور پر جس نے ایک سال، ایک ماہ، ایک دن یا ایک لمحہ کی صحبت اختیار کی تو اسے اسی قدر صحبت حاصل ہو گی یا جس نے ایمان کی حالت میں نبی اکرم ﷺ کو دیکھا ہو، جیسا کہ صحیح میں نبی اکرم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "کچھ لوگ جہاد کریں گے اور پوچھیں گے کہ کیا تم میں کوئی ہے جسے نبی اکرم ﷺ کی صحبت کا شرف حاصل ہو؟ ایک دوسری روایت کے الفاظ ہیں: کیا تم میں کوئی ایسا ہے جس نے نبی اکرم ﷺ کو دیکھا ہے؟ وہ جواب دیں گے: ہاں۔ پھر اللہ تعالیٰ انھیں فتح عطا کرے گا۔ کچھ لوگ مزید جہاد کریں گے اور پوچھیں گے کہ کیا تم میں کوئی ایسا ہے جس نے اصحابِ رسول کی صحبت اختیار کی ہو؟ ایک دوسری روایت میں ہے: کیا تم میں کوئی ایسا ہے جس نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھنے والوں میں سے کسی کو دیکھا ہے؟ وہ کہیں گے: ہاں۔ پھر اللہ انھیں فتح عطا کرے گا۔ کچھ لوگ جہاد کریں گے اور پوچھیں گے کہ کیا تم میں کوئی ہے جس نے اصحابِ رسول کو دیکھنے والوں کو دیکھا ہو؟ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: کیا تم میں کوئی ایسا ہے جس نے اصحابِ رسول کی صحبت اختیار کرنے والوں کی صحبت اختیار کی ہو؟ وہ کہیں گے: ہاں۔ پھر اللہ تعالیٰ انھیں فتح عطا کرے گا۔"[1] اس حدیث کے بعض طرق میں چوتھے طبقے کا بھی اسی طرح ذکر آیا ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے اپنی صحبت اور رویت پر حکم معلق کر دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے مسلمانوں کو ملنے والی فتح کا سبب ان حضرات کو قرار دیا ہے، جنھوں نے آپ ﷺ کو دیکھا ہے۔ یہ خصوصیت کسی غیر صحابی کو حاصل نہیں ہے خواہ ان کے اعمال نبی اکرم ﷺ کے کسی ایک صحابی کے عمل سے کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں۔

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٣٢)

فصل:

جب یہ بات واضح ہوگئی تو معلوم ہونا چاہیے کہ جس طریقے سے کسی ایک صحابی کے ایمان کا علم ہوسکتا ہے، اسی طریقے سے اس کے ہم عصروں کے ایمان کا علم ہوگا اور جس طریقہ سے کسی ایک صحابی کی صحبتِ نبوی کا علم ہوسکتا ہے اسی طریقہ سے اس کے جیسوں کی صحبت کا علم ہوگا۔

جن طلقا نے فتح مکہ کے موقعے پر اسلام قبول کیا تھا، جیسے حضرات معاویہ، ان کے بھائی یزید، عکرمہ بن ابی جہل، صفوان بن امیہ، حارث بن ہشام اور سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہم، ان تمام حضرات کا اسلام خواص کے نزدیک تواتر سے ثابت ہے۔ یہ بھی ثابت ہے کہ زندگی کی آخری سانس تک یہ حضرات اپنے اسلام پر باقی رہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا اسلام دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ظاہر ہے۔ وہ چالیس سال تک والی رہے۔ بیس سال حضرات عمر و عثمان رضی اللہ عنہما کے نائب کی حیثیت سے اور اسی عرصے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں باہمی خانہ جنگی ہوئی۔ اس کے بعد بیس سال تک وہ خود مختار حکمراں رہے۔ ان کی وفات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے پچاس سال بعد ۶۰ ھ میں ہوئی۔ ۴۰ھ میں حسن بن علی رضی اللہ عنہ ان کے حق میں خلافت سے دست بردار ہوگئے اور اسی سال کو عام الجماعۃ کہا جاتا ہے، کیوں کہ مسلمان متحد ہوگئے تھے اور ان کے درمیان فتنے ختم ہوگئے تھے۔

حسن رضی اللہ عنہ نے جو اقدام فرمایا، اس کی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پیش گوئی کے طور پر تعریف فرمائی تھی، جیسا کہ صحیح بخاری وغیرہ میں ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میرا یہ بیٹا سردار ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرائے گا۔''[1] نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس کام پر اپنے نواسے کی مدح اور تعریف فرمائی وہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرا دی اور یہ صلح اس وقت ظہور میں آئی جب انھوں نے خلافت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دی اور عظیم لشکروں کے ساتھ دونوں ایک دوسرے سے مل گئے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی صلح کرنے اور قتال ترک کرنے پر تعریف فرمانا اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان دونوں گروہوں کے درمیان صلح ہو جانا ان کے درمیان قتال ہونے کے مقابلے میں زیادہ محبوب تھا۔ یہ اس کی بھی دلیل ہے کہ قتال کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ اگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کافر ہوتے تو کافر کو ولایت سونپنا اور خلافت کو اس کے سپرد کر دینا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو محبوب نہ ہوتا، بلکہ حدیث اس بات پر بھی دلیل ہے کہ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٥٧)

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے اصحاب مومن تھے، جس طرح حضرت حسن اور ان کے اصحاب مومن تھے اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے جو اقدام فرمایا وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں محمود اور پسندیدہ تھا۔

یہ حدیث اسی طرح کی ہے جس طرح کی حدیث صحیحین میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگوں کا ایک گروہ جماعت سے نکل جائے گا اور ان سے وہ گروہ جنگ کرے گا جو حق سے زیادہ قریب ہوگا۔[1] ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: جو گروہ حق سے زیادہ قریب ہوگا، وہ اس سے جنگ کرے گا۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جنگ کرنے والے دونوں گروہ، یعنی علی اور ان کے اصحاب اور معاویہ اور ان کے اصحاب، حق پر ہوں گے، تاہم علی اور ان کے اصحاب، معاویہ اور ان کے اصحاب کے مقابلے میں حق سے زیادہ قریب ہوں گے۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہی نے جماعت سے علاحدہ ہوجانے والے گروہ "خوارج حروریہ" سے جنگ کی۔ یہ لوگ پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے طرف دار تھے، لیکن بعد میں ان کے خلاف بغاوت کی، انھیں کافر قرار دیا، ان کی حمایت کرنے والوں کو کافر گردانا، ان سے عداوت اور دشمنی کا اعلان کیا، ان سے اور ان کے ساتھیوں سے قتال کیا۔ یہی وہ لوگ تھے جن کے بارے میں صحیح مشہور، بلکہ متواتر احادیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اطلاع دی تھی کہ تم میں سے ایک شخص ان کی نماز کے مقابلے میں اپنی نماز کو، ان کے روزے کے مقابلے میں اپنے روزے کو اور ان کی تلاوت کے مقابلے میں اپنی تلاوت کو حقیر سمجھے گا۔ وہ قرآن پڑھیں گے، لیکن وہ ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا۔ وہ اسلام سے اسی طرح نکل جائیں گے، جس طرح تیر ہدف سے آر پار ہو جاتا ہے۔ انھیں جہاں کہیں پاؤ ان سے جنگ کرو، کیوں کہ ان کا قتل کرنا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے یہاں اجرِ عظیم کا باعث ہوگا۔ ان کی علامت یہ ہے کہ ان کے درمیان ایک ایسا آدمی ہوگا جس کے دونوں ہاتھ ناقص ہوں گے، اس کے بازو پر سخت قسم کے بال تھے۔[2]

یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے علی رضی اللہ عنہ اور ان کے طرف داروں سے دشمنی کا اعلان کیا، انھوں نے ہی علی رضی اللہ عنہ کے قتل کو جائز قرار دیا، آپ کو کافر گردانا اور آخر انہی کے ایک سردار "عبدالرحمن بن ملجم مرادی" نے ان کو شہید کر دیا۔ یہی لوگ ناصبی، خارجی اور دینِ اسلام سے نکل جانے والے ہیں جب انھوں نے یہ کہا کہ عثمان رضی اللہ عنہ اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور ان کے تمام ساتھی کافر اور مرتد ہو چکے ہیں۔ ان کے خلاف مسلمانوں کی دلیل یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایمان تواتر سے ثابت ہے، کتاب اللہ اور صحیح احادیث میں موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح کی ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف فرمائی ہے، ان سے اپنی رضامندی کا اظہار کیا ہے اور یہ خبر دی ہے کہ وہ جنتی ہیں۔ ان کے علاوہ

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٠٦٤)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٥٣٤) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٠٦٤)

دوسری بہت سی نصوص ہیں۔ جو شخص ان دلائل کو تسلیم نہیں کرتا اس کے لیے ممکن نہیں کہ وہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور ان کے جیسے دیگر حضرات کا ایمان ثابت کر سکے۔

اگر یہ ناصبی، رافضی سے کہتے کہ علی رضی اللہ عنہ کافر تھے یا فاسق اور ظالم تھے، انھوں نے دین کی خاطر نہیں، بلکہ اقتدار کے لیے جنگ لڑی، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے ہزاروں افراد کو جنگِ جمل، جنگِ صفین اور حرورا میں قتل کیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد انھوں نے کسی کافر سے جنگ نہیں کی اور نہ کوئی شہر فتح کیا، بلکہ اہلِ قبلہ ہی سے قتال کرتے رہے اور اس طرح کی بعض دیگر باتیں کرے جو ناصبی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھنے والے بکتے ہیں تو ان ناصبیوں کا جواب صرف اہلِ سنت والجماعت کے لوگ ہی دے سکتے ہیں جو تمام سابقون الاولون سے محبت کرتے ہیں اور ان سے دوستی کا اظہار کرتے ہیں۔

اہلِ سنت ان سے کہیں گے کہ حضرات ابوبکر، عمر، عثمان، طلحہ، زبیر رضی اللہ عنہم اور ان کی طرح کے دیگر لوگوں کا ایمان، ان کی ہجرت اور ان کا جہاد تواتر سے ثابت ہے۔ قرآن سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف کی ہے اور ان سے اپنی رضامندی کا اظہار فرمایا ہے۔ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عام صحابہ کی بھی تعریف کی ہے اور بعض خاص حضرات کی بھی تعریف فرمائی ہے۔ جیسا کہ ایک مشہور حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر میں اہلِ زمین میں سے کسی کو اپنا خلیل بناتا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بناتا۔''[1] آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد یہ بھی ہے: ''تم سے پہلے کی امتوں میں محدثین ہوا کرتے تھے، میری امت میں اگر کوئی محدث ہوتا تو وہ عمر رضی اللہ عنہ ہوتے۔''[2] عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بھلا میں اس سے حیا کیوں نہ کروں جس سے فرشتے حیا کرتے ہیں۔''[3] علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں جہاد کا عَلَم ایسے شخص کے ہاتھ میں دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اس سے محبت کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھوں ضرور فتح عطا فرمائے گا۔''[4] آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یہ بھی ہے: ''ہر نبی کے حواری ہوئے ہیں اور میرے حواری زبیر رضی اللہ عنہ ہیں۔''[5] اس طرح کی احادیث اور بھی ہیں۔

اہلِ سنت جو تمام صحابہ سے محبت کرتے ہیں، وہ جس طرح حجت قائم کرسکتے ہیں، ایک رافضی کے لیے ممکن

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٨٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٩٨)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٠١)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٩٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٠٥)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٥١٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤١٥)

نہیں ہے کہ وہ علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھنے والے ناصبیوں کے خلاف حجت قائم کر سکے، کیوں کہ اگر وہ کہے کہ علی رضی اللہ عنہ کا اسلام تواتر سے معلوم ومشہور ہے تو وہ جواب میں کہے گا کہ ابوبکر، عمر، عثمان اور معاویہ رضی اللہ عنہم وغیرہ کا بھی تو اسلام تواتر سے معلوم ومشہور ہے جب کہ تم ان کے اسلام اور ان کی عدالت پر طعنہ زنی کرتے ہو۔

اگر رافضی یہ کہے کہ علی رضی اللہ عنہ کا اسلام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ان کی تعریف کیے جانے سے ثابت ہے تو ہم اس سے کہیں گے کہ یہ احادیث انھیں صحابہ نے نقل کی ہیں جن پر تم طعنہ زنی کرتے ہو۔ صحابہ کے فضائل کے راوی جیسے سعد بن ابی وقاص، عائشہ اور سہل بن سعد رضی اللہ عنہم وغیرہ ہیں جب کہ روافض ان سب کو مطعون کرتے ہیں۔ اگر ان کی اور ان کی طرح کے دیگر صحابہ کی روایات ضعیف ہیں تو علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت میں روایت کردہ ہر روایت باطل ہو جائے گی اور روافض کے لیے کوئی دلیل نہیں بچے گی، لیکن اگر ان کی روایات صحیح ہیں تو ان سے علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت بھی ثابت ہوگی اور ان حضرات کی فضیلت بھی ثابت ہوگی جن کی فضیلت میں یہ روایات بیان کرتے ہیں، جیسے: ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہ وغیرہ۔

لیکن اگر رافضی یہ کہے کہ شیعوں کے نزدیک علی رضی اللہ عنہ کے فضائل تواتر سے ثابت ہیں جیسا کہ وہ کہتے ہیں کہ علی رضی اللہ عنہ کی امامت منصوص ہے تو اس سے کہا جائے گا کہ جو شیعہ صحابہ میں سے نہیں ہیں، انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی روایت نہیں بیان کی ہے اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام سنا ہے، ان کی جو بھی نقل ہے وہ مرسل اور منقطع ہوگی۔ اگر صحابہ کا درمیان میں واسطہ نہیں ہے تو وہ روایت کیوں کر صحیح ہوسکتی ہے۔

جن صحابہ سے روافض اظہارِ محبت کرتے ہیں، ان کی تعداد بہت مختصر ہے۔ یہی کل تقریباً اٹھارہ انیس صحابی ہیں اور اتنی مختصر تعداد سے بشرطیکہ سب کسی روایت پر متفق ہوں، تواتر ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ جمہور صحابہ جو ان کے فضائل نقل کرتے ہیں، ان پر روافض طعن وتشنیع کرتے ہیں پھر جب وہ جمہور صحابہ پر جن کی تعریف قرآن نے کی ہے، کذب اور کتمان کا الزام عائد کرنا جائز سمجھتے ہیں تو اس مختصر تعداد پر یہی الزام بدرجہ اولیٰ عائد کرنا جائز ہوسکتا ہے۔

مزید یہ کہ اگر رافضی کہے کہ ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کا مقصد ریاست اور بادشاہت کا حصول تھا، اپنی ریاست قائم کر کے انھوں نے دوسروں پر ظلم کیے تو ناصبی ان سے کہے گا کہ ان حضرات نے حکومت و ریاست کے لیے کسی مسلمان سے جنگ نہیں کی بلکہ انھوں نے مرتدین اور کفار سے جنگ کی۔ یہی وہ حضرات ہیں جنھوں نے قیصر وکسریٰ کا غرور توڑ دیا، فارس کے شہروں کو فتح کیا، اسلام کو مستحکم کیا، ایمان اور اہلِ ایمان کو غلبہ دلایا اور کفر اور اہلِ کفر کو رسوا کیا۔

عثمان رضی اللہ عنہ جو مقام اور مرتبے میں ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے فروتر ہیں، اس کے باوجود لوگوں نے ان کی خلافت

میں ان کے قتل کا مطالبہ کیا پھر بھی انھوں نے نہ مسلمانوں سے قتال کیا اور نہ اپنے دورِ خلافت میں کسی مسلمان کو قتل کیا۔ اگر تم ان حضرات پر یہ الزام لگاؤ گے کہ انھوں نے اپنے دورِ خلافت میں ظلم کیے ہیں، رسول اللہ ﷺ سے اپنی دشمنی نبھائی ہے تو تمھارے خلاف ایک ناصبی کی دلیل اس سے کہیں زیادہ ظاہر اور مضبوط ہوگی۔

جب تم ان حضرات کو برا کہو گے، ان کی طرف ظلم منسوب کرو گے اور انھیں رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کی جماعت کا دشمن بتاؤ گے تو یہ تو خوارج اور ناصبیوں کے لیے بڑی مستحکم دلیل بنے گی اور وہ تم پر چڑھ دوڑیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ حکومت حاصل کرنے کا شوق کس میں تھا، کس پر یہ الزام عائد کرنا اولیٰ ہوگا؟ اس پر جس نے اپنی سلطنت کے لیے ہزاروں ہزار مسلمانوں سے جنگ کی اور کافروں سے کوئی جنگ نہیں کی، قتال کا آغاز مسلمانوں سے کیا، تاکہ وہ ان کے مطیع ہو جائیں، اہلِ قبلہ کو قتل کیا جو نماز قائم کرتے تھے، زکات دیتے تھے، اللہ تعالیٰ کے قدیم گھر کا حج کرتے تھے، ماہِ رمضان کے روزے رکھتے تھے اور قرآن کی تلاوت کرتے تھے یا وہ جس نے کسی مسلمان سے جنگ نہیں کی، بلکہ اہلِ نماز و زکات کو غلبہ دلایا، ان کی مدد کی، ان کے لیے تحفظ فراہم کیا یا وہ جو اپنی خلافت میں شہید کر دیا گیا، اس کے باوجود جنگ نہیں کی اور نہ اپنی جان کا دفاع کیا، یہاں تک کہ اپنے ہی گھر میں اپنی اہلیہ کے سامنے شہید کر دیا گیا؟ اگر ایسے انسان پر ظالمانہ طور پر حکومت پر قبضہ کرنے اور اپنی خلافت میں مسلمانوں پر ظلم کرنے کا الزام عائد کرنا جائز ہے تو اس شخص پر یہ الزام عائد کرنا بدرجہ اولیٰ جائز ہوگا، جس نے خلافت کے لیے جنگ کی اور اس کی خاطر مسلمانوں کو قتل کیا۔

یہ اور اسی طرح کے دوسرے دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ روافض وہ گروہ ہے جس کے پاس عقل صریح ہے نہ نقل صحیح، نہ دینِ مقبول نہ دنیا منصور، بلکہ یہ تمام جماعتوں میں سب سے زیادہ جھوٹی اور جاہل جماعت ہے۔ ان کا دین ہر زندیق اور مرتد کو مسلمانوں میں شامل کرتا ہے جیسا کہ ان کے اندر نصیریہ اور اسماعیلیہ وغیرہ داخل ہو گئے۔ وہ دیدہ و دانستہ اخیارِ امت سے عداوت رکھتے ہیں، جب کہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین سے ان کی گاڑھی چھنتی ہے۔ یہ جان بوجھ کر تواتر کے درجے میں موجود ایک کھلی سچائی کا انکار کرتے ہیں اور وضع کردہ جھوٹ جس کا فساد ظاہر ہے، اس کو قائم رکھتے ہیں۔ ان کے بارے میں امام شعبی رحمہ اللہ نے جو ان کے بارے میں سب سے زیادہ واقفیت رکھتے ہیں، کس قدر مبنی بر حقیقت بات کہی ہے کہ یہ اگر جانور ہوتے تو گدھے بنتے اور اگر پرندہ ہوتے تو گدھ بنتے۔

روافض دنیا میں سب سے زیادہ تہمت لگانے والا اور جھوٹ بولنے والا گروہ ہے۔ مثلاً وہ باتیں جو یہ گروہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہتا ہے، جبکہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں تواتر سے ثابت ہے کہ ان کو نبی اکرم ﷺ نے امارت سونپی تھی۔ اسی طرح آپ ﷺ کے علاوہ دوسروں نے بھی ان کو امیر مقرر کیا تھا۔ انھوں نے نبی اکرم ﷺ کے

ساتھ جہاد کیا۔ آپ کی نظر میں وہ امین تھے۔ وحی کی کتابت فرماتے تھے۔ کتابتِ وحی کے دوران میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر کوئی تہمت نہیں لگائی۔ ان کو عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے جو حد درجہ مردم شناس تھے اور اللہ نے ان کی زبان اور دل پر حق جاری فرما دیا تھا، والی مقرر کیا اور اپنے دورِ خلافت میں معاویہ رضی اللہ عنہ پر کسی شک وشبہہ کا اظہار نہیں کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے والدِ محترم کو والی مقرر کیا تھا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا اس وقت وہ اپنی ولایت پر برقرار تھے۔ تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے والد سے بہتر تھے اور ان کا اسلام بھی اپنے والد سے بہتر تھا۔ جب ان کے والد کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے والی مقرر کیا تو ان کا والی مقرر کیا جانا کہیں زیادہ اولیٰ اور مناسب تھا۔ وہ کبھی مرتد نہیں ہوئے اور نہ کسی اہلِ علم نے ارتداد کی نسبت ان کی طرف کی ہے۔ جو لوگ ان حضرات کو مرتد قرار دیتے ہیں وہی لوگ ابوبکر، عمر، عثمان، عام اہلِ بدر اور اہلِ بیعت رضوان وغیرہ سابقون الاولون مہاجرین، انصار اور تابعین عظام رضی اللہ عنہم کی طرف ارتداد کی نسبت کرتے ہیں جو ان کی شان کے قطعی منافی ہے۔

جن لوگوں نے ان حضرات کی طرف ارتداد کی نسبت کی ہے، ان میں سے بعض کہتے ہیں: معاویہ کا انتقال اس حال میں ہوا کہ ان کا چہرہ مشرق کی طرف تھا اور صلیب ان کے منہ پر تھی۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس کے بارے میں ہر صاحبِ عقل سمجھ سکتا ہے کہ سب سے بڑا جھوٹ ہے اور انتہائی سنگین تہمت ہے، بلکہ مرتد ہونے اور دینِ نصاریٰ پر مرنے کی بات اگر کوئی کہنے والا خلفائے بنو امیہ، خلفائے بنو عباس کے بارے میں کہے جو معاویہ رضی اللہ عنہ سے فروتر تھے جیسے عبدالملک بن مروان، اس کی اولاد، ابوجعفر منصور، اس کے دونوں بیٹے جن کا لقب مہدی اور ہادی تھا، ہارون رشید اور ان کے جیسے دوسرے خلفا جو تختِ خلافت پر متمکن ہوئے اور مسلمانوں پر اپنے حکم جاری کیے تو ہر عقل رکھنے والا اسے تمام انسانوں میں سب سے بڑا مفتری قرار دے گا، پھر یہ بات معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں کیوں کر کہی جا سکتی ہے!!

بلکہ ان کے بیٹے یزید کے بارے میں ان حادثات کے باوجود جو وقوع پذیر ہوئے، جس نے یہ کہا ہے کہ وہ کافر اور مرتد تھا، اس نے ایک بڑی تہمت اس پر لگائی ہے۔ وہ دیگر مسلم بادشاہوں کی طرح ایک مسلم بادشاہ تھا۔ بادشاہوں کی اکثریت کا حال یہ ہے کہ ان کی نیکیاں بھی ہیں اور انھوں نے گناہ بھی کیے ہیں، ان کی حسنات بھی عظیم ہیں اور سیئات بھی عظیم ہیں، پھر سب کو چھوڑ کر کسی ایک کو مطعون کرنے والا کوئی جاہل یا ظالم ہی ہو سکتا ہے۔

ان مسلم بادشاہوں کا معاملہ بھی وہی ہو گا جو دوسرے مسلمانوں کا ہے۔ ان میں سے بعض ایسے ہوں گے جن کی نیکیاں گناہوں سے زیادہ ہوں گی۔ بعض ایسے بھی ہوں گے جنھوں نے اپنے گناہوں سے توبہ کر لی ہو گی۔ بعض کے گناہوں کو اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا ہو گا۔ بعض کو اللہ جنت میں داخل کرے گا۔ بعض کو ان کے گناہوں کی سزا

دے گا۔ بعض کے سلسلے میں نبی اور دوسرے شفاعت کرنے والوں کی شفاعت قبول فرمائے گا۔ ان میں سے کسی ایک کے بارے میں یہ گواہی دینا کہ وہ جہنم میں جائے گا، یہ بدعتیوں اور گمراہوں کا قول ہے۔

اسی طرح ان میں سے کسی ایک پر متعین کر کے لعنت بھیجنا صالحین اور ابرار کا شیوہ نہیں ہے۔ نبی اکرم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے شراب، اس کے نچوڑنے والے، اس کو نچڑوانے والے، اسے ڈھونے والے، اس کو پلانے والے، اسے پینے والے، اسے بیچنے والے، اسے خریدنے والے اور اس کی قیمت کھانے والے پر لعنت فرمائی ہے۔''[1] اسی طرح آپ ﷺ سے یہ حدیث بھی ثابت ہے کہ عہدِ رسالت میں ایک صاحب تھے جن کو حمار کہہ کر پکارا جاتا تھا، وہ بکثرت شراب پیتے تھے۔ جب بھی رسول اللہ ﷺ کے پاس لائے جاتے، آپ انھیں کوڑے مارتے تھے۔ ایک بار کوڑے مارنے کے لیے لائے گئے تو ایک شخص نے کہا: اللہ تعالیٰ کی اس پر لعنت ہو، نبی اکرم ﷺ کے پاس اب تک کتنی بار لایا جا چکا ہے۔ یہ سن کر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اس پر لعنت مت بھیجو، کیوں کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کرتا ہے۔[2] حالانکہ نبی اکرم ﷺ نے عمومی طور پر شراب پینے والے پر لعنت کی ہے، لیکن آپ ﷺ نے کسی متعین مومن پر لعنت بھیجنے سے منع کیا ہے۔

ہم وہی کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں فرمایا ہے:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا ﴾ [النساء: ١٠]

''جو لوگ یتیموں کا مال ناجائز طور پر کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں۔''

لہٰذا کسی کے لیے مناسب نہیں ہے کہ کسی متعین شخص کے بارے میں یہ گواہی دے کہ وہ جہنم میں جائے گا، کیوں کہ اس بات کا امکان ہے کہ وہ توبہ کر لے، اللہ تعالیٰ گناہوں کو مٹا دینے والی اس کی نیکیوں، کفارہ بننے والے آلام و مصائب، قابلِ قبول شفاعت کی وجہ سے اس کی مغفرت فرما دے یا اسے از خود معاف فرما دے وغیرہ۔

یہی حال ایک بادشاہ اور دوسرے عام مسلمانوں کا ہے۔ اگرچہ اس سے ظلم کے بعض کام سرزد ہوئے ہوں، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہم اس پر لعنت بھیجیں اور اس کے جہنمی ہونے کی گواہی دیں۔ اگر کوئی شخص اس طرح کی بات کرتا ہے تو اس کا شمار گمراہوں اور اہلِ بدعت میں ہوگا، پھر کیوں کر ایک ایسے آدمی کے بارے میں اس قسم کی بات کی جا سکتی ہے، ظلم کے باوجود جس کی مغفرت کی امید کی جا سکتی ہے، جیسا کہ صحیح بخاری میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اسلامی فوج کا وہ پہلا دستہ جو قسطنطنیہ پر حملہ آور ہوگا، اس کے تمام شرکا کی مغفرت ہو

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٧٤) صحيح الجامع (٤٩٦٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣٩٨)

جائے گی۔''[1] اسلامی فوج کے جس پہلے دستے نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا تھا، اس کی قیادت یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہما نے کی تھی۔ مجاہدین میں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ ان کی وفات وہیں ہوئی تھی اور آج بھی ان کی قبر وہیں ہے۔

اسی لیے ائمہ سلف میں معتدل نقطہ نظر کی حامل شخصیات یزید اور اس کی طرح کے دوسرے افراد کے بارے میں کہتی ہیں: ہم نہ انھیں برا بھلا کہتے ہیں اور نہ ان سے محبت کرتے ہیں، یعنی جو ظلم اس سے ہوئے ہیں انھیں ہم پسند نہیں کرتے۔[2] ایک ہی شخص میں نیکیاں اور برائیاں، فرماں برداری اور نافرمانی اور کارہائے خیر و کارہائے شر و فجور سب جمع ہوسکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کی نیکیوں کا اسے ثواب دے گا، اس کے گناہوں پر اگر چاہے گا تو سزا دے گا اور چاہے گا تو معاف کر دے گا۔ وہ اس کی نیکیوں پر اس سے محبت کرتا ہے اور جو برائیاں اس نے کی ہیں، ان سے اسے نفرت ہے۔

جس شخص نے گناہِ صغیرہ کا ارتکاب کیا ہے تو معتزلہ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ اس کو معاف کر دے گا، لیکن جس نے گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کیا ہے، اس کے بارے میں امت کے اسلاف، اس کے ائمہ اور تمام اہلِ سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ وہ اس کے جہنمی ہونے کی گواہی نہیں دیتے، بلکہ اس بات کو جائز سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت کرسکتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾ [النساء: ٤٨]

''اللہ تعالیٰ اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے اور اس کے سوا اور گناہ جس کو چاہے معاف کر دے۔''

یہ اس شخص کے حق میں ہے جس نے شرک نہ کیا ہو، اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت پر موقوف رکھا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد:

﴿ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ﴾ [الزمر: ٥٣]

''(اے پیغمبر! میری طرف سے) کہہ دو کہ اے میرے بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہونا اللہ تو سب گناہوں کو بخش دیتا ہے۔''

اس شخص کے حق میں ہے جو توبہ کر لے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اسے مطلق اور عام رکھا ہے۔

اس کے برعکس خوارج اور معتزلہ کا کہنا ہے: کبیرہ گناہوں کا مرتکب ہمیشہ کے لیے جہنم میں داخل کیا جائے گا۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٦٦)

[2] یعنی یزید سے عدمِ محبت کا تعلق اس کے مظالم سے عدمِ محبت ہے۔

پھر وہ بعض اخیارِ امت کے بارے میں اپنے دل میں یہ وہم پالے ہوئے ہیں کہ وہ کبیرہ گناہوں کے مرتکبین میں سے ہیں، جیسا کہ حضرات عثمان، علی رضی اللہ عنہما اور ان کے متبعین کے بارے میں خوارج یہ وہم رکھتے ہیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ اسی طرح بعض لوگ حضرات معاویہ، عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما اور ان کے جیسے دیگر لوگوں کے بارے میں یہ خیال رکھتے ہیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ ان کے اس وہم کی بنیاد دو باطل مقدمے ہیں:

① متعین طور پر فلاں شخص کبیرہ گناہ کا مرتکب ہوا ہے۔

② گناہ کبیرہ کا ہر مرتکب ہمیشہ کے لیے جہنم میں جائے گا۔

ان کے یہ دونوں اقوال باطل ہیں۔ دوسرا قول تو مطلقاً باطل ہے۔ پہلے قول کا باطل ہونا معلوم کیا جاسکتا ہے اور کبھی اس تعلق سے توقف اختیار کیا جانا چاہیے۔

معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے جیسے حضرات کے بارے میں جو یہ کہتا ہے کہ یہ لوگ ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے بظاہر اسلام قبول کر لیا تھا، نماز بھی پڑھتے تھے، حج بھی کرتے تھے اور روزے بھی رکھتے تھے، لیکن وہ حقیقت مین اسلام نہیں لائے تھے، بلکہ پہلے کی طرح کفر پر قائم تھے، اس شخص کی یہ بات بالکل اس کی طرح ہے جو یہی دعویٰ عباس، جعفر، عقیل، ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے بارے میں کرے، بلکہ اس کے یہ دعوے بھی اسی کے مماثل ہیں کہ حضرات حسن اور حسین رضی اللہ عنہما علی رضی اللہ عنہ کے نہیں، بلکہ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے بیٹے تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کی بیٹیوں سے نکاح نہیں کیا تھا اور اپنی دو بیٹیوں کی شادی عثمان رضی اللہ عنہ سے نہیں کی تھی، بلکہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے اسلام کا انکار ان باتوں کے انکار سے زیادہ سنگین ہے، کیوں کہ ان میں بعض باتیں ایسی ہیں جن کو صرف علما جانتے ہیں۔

رہا معاویہ رضی اللہ عنہ کا مسلمان ہونا، ان کا مسلمانوں کا گورنر ہونا اور پھر امارت و خلافت پر فائز ہونا تو یہ ایک ایسا معاملہ ہے جسے سارے ہی لوگ جانتے ہیں۔ اگر کوئی شخص علی رضی اللہ عنہ کے مسلمان ہونے کا انکار کر دے یا یہ دعویٰ کرے کہ وہ کفر پر باقی رہے تھے تو اس کے خلاف بھی وہی دلیل دی جاسکتی ہے جو ابوبکر، عمر، عثمان اور معاویہ رضی اللہ عنہم کے مسلمان ہونے کا انکار کرنے والے کو دی جائے گی۔ اگرچہ ان میں بعض حضرات دوسروں سے افضل ہیں، لیکن ان کی باہمی افضلیت مسلمان ہونے کے مشترک مسئلے میں کوئی حارج نہیں ہے۔

کہنے والے کا یہ خیال کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کا ایمان نفاق پر مبنی تھا، اس کی یہ بات بھی وضع کردہ جھوٹ ہے، کیوں کہ علمائے اسلام میں سے کسی نے معاویہ رضی اللہ عنہ کو نفاق سے متہم نہیں کیا ہے، بلکہ وہ ان کے حسنِ اسلام پر متفق ہیں۔ بعض لوگوں نے ان کے والد ابوسفیان کے حسنِ اسلام پر ضرور توقف اختیار کیا ہے، لیکن معاویہ اور ان کے بھائی یزید رضی اللہ عنہما کے حسنِ اسلام پر کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اسی طرح فتح مکہ کے موقع پر اسلام لانے والے حضرات عکرمہ

بن ابی جہل، سہیل بن عمرو اور صفوان بن امیہ وغیرہ کے حسنِ اسلام پر کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص چالیس سال تک گورنر اور خلیفہ کی حیثیت سے مسلمانوں کا سربراہ رہے، ان کی نمازوں کی امامت کرے، انھیں خطبہ سنائے، انھیں نصیحت کرے، معروف کا حکم دے، منکر سے روکے، ان میں حدود وتعزیرات کا نفاذ کرے، ان کے اندر، مالِ فئی، مالِ غنیمت اور زکات وصدقات تقسیم کرے اور اپنی قیادت میں ان کو حج کرائے، ان سب کاموں کے باوجود اس کا نفاق سب پر پوشیدہ رہے جب کہ ان کے درمیان اعیان صحابہ کی ایک بڑی تعداد بھی موجود رہی ہو؟

بلکہ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ الحمد للہ خلفائے بنوامیہ اور بنوعباس میں سے جن حضرات کو ولایتِ عامہ حاصل تھی، ان میں سے کسی ایک پر بھی الحاد ونفاق کا الزام نہیں لگایا گیا ہے۔ ہاں بعض لوگوں پر کسی خاص بدعت اور ظلم کرنے کا الزام لگا ہے، لیکن کسی اہلِ علم نے ان میں سے کسی ایک پر بھی زندقہ اور نفاق کی تہمت نہیں لگائی ہے۔

زندقہ اور نفاق میں نمایاں شہرت کے حامل بنوعبید القداح تھے جو مصر اور مغرب میں تھے اور خود کو علوی کہتے تھے، حالانکہ یہ سب کفار کی ذریت تھے۔ اہلِ علم نے متفقہ طور سے ان پر زندقہ اور نفاق کا الزام عائد کیا ہے۔ اسی طرح زندقہ اور نفاق کا الزام بعض ایسے ناصبی بادشاہوں پر بھی لگایا گیا ہے جن کا تعلق بنو بویہ وغیرہ سے تھا، لیکن اسلام میں جن خلفا کو ولایتِ عامہ حاصل رہی ہے تو الحمد للہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس سے پاک صاف رکھا ہے کہ ان کا خلیفہ کوئی زندیق اور منافق ہو۔ اس بات کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے اور اس کی معرفت ہر مسلمان کو ہونی چاہیے، کیوں کہ اس مسئلے میں یہ بات خصوصی اہمیت رکھتی ہے۔

علما کا اس بات پر اتفاق ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ اس امت کے باشاہوں میں سب سے افضل ہیں، کیوں کہ ان سے پہلے کے چاروں حضرات خلفائے نبوت تھے اور وہی پہلے بادشاہ ہیں، لیکن ان کی بادشاہت امت کے لیے رحمت تھی، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: ''پہلے حکومت نبوت و رحمت ہوگی، پھر خلافت و رحمت ہوگی، اس کے بعد ملوکیت و رحمت ہوگی، اس کے بعد ملوکیت اور جبر کا دور آئے گا، پھر ملوکیت اور کاٹ کھانے والا زمانہ شروع ہوگا۔''[1] معاویہ رضی اللہ عنہ کے دورِ بادشاہت میں رحمت تھی، بردباری تھی اور مسلمانوں کو فائدے حاصل ہو رہے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسروں کے مقابلے میں ان کی بادشاہت بہت بہتر تھی۔

ان سے پہلے کے سربراہانِ مملکت اسلامی خلفائے نبوت کہلاتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خلافتِ نبوت تیس سال تک رہے گی پھر اس کے بعد بادشاہت آجائے گی۔[2] ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم

---

[1] مسند أحمد (٥/٢٧٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٢٥٧)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٤٦) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔

خلفائے راشدین اور ہدایت یافتہ ائمہ مسلمین ہیں، جن کے بارے میں نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: ''میری سنت اور میرے بعد خلفائے راشدین کی سنت کو لازم پکڑو، اس سے چمٹے رہو اور دانتوں سے مضبوطی کے ساتھ تھامے رہو۔ نئی نئی بدعات سے بچو، کیوں کہ ہر نئی چیز بدعت ہے۔''[1]

بہت سے لوگوں نے علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے سلسلے میں اختلاف کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ ان کا دورِ خلافت فتنوں کا دور رہا ہے، ان کے زمانے میں مسلمانوں میں اتحاد نہیں تھا۔ اس کے برعکس ایک دوسری جماعت کہتی ہے کہ ایک ہی وقت میں دو خلفا کا ہونا صحیح ہے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ بھی خلیفہ ہیں، کیوں کہ امت، علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر متفق نہیں تھی اور نہ ان کی خلافت میں کوئی نظم تھا۔

لیکن صحیح بات جس پر ائمہ کا اتفاق ہے، یہ ہے کہ علی رضی اللہ عنہ خلفائے راشدین میں سے تھے۔ گذشتہ حدیث اس پر دلیل ہے۔ علی رضی اللہ عنہ اپنے دورِ خلافت میں خود کو امیر المومنین کہتے تھے اور صحابہ بھی ان کو اسی خطاب سے مخاطب فرماتے تھے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جو شخص علی رضی اللہ عنہ کو اسلام کا چوتھا خلیفہ نہ تسلیم کرے وہ اپنے گھر کے گدھے سے بھی زیادہ گمراہ اور گیا گزرا ہے۔'' اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ ہر خلیفہ کا اپنا مقام و مرتبہ ہے۔

ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا مقابلہ کسی سے نہیں کیا جا سکتا، جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے: ''میرے بعد ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی اقتدا کرنا۔''[2] علی رضی اللہ عنہ کے جو شیعہ ان کے ساتھ رہے اور ان کی صحبت اٹھائی ہے، ان کے درمیان اس مسئلے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما علی رضی اللہ عنہ سے مقدم ہیں۔ خود علی رضی اللہ عنہ سے متعدد سندوں سے ثابت ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ ''میرے پاس اگر کوئی ایسا شخص لایا گیا جو مجھ کو ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما پر فضیلت دیتا ہو گا تو میں اس پر تہمت لگانے کی حد جاری کروں گا۔''

لوگوں نے عثمان اور علی رضی اللہ عنہما کی باہمی تقدیم و تفضیل کے مسئلے میں اختلاف کیا ہے، لیکن ثابت یہ ہے کہ عثمان رضی اللہ عنہ علی رضی اللہ عنہ سے مقدم اور افضل ہیں۔ اس مسئلے پر اتفاق اس وقت ظاہر ہوا جب عمر رضی اللہ عنہ نے چھے آدمیوں: عثمان، علی، طلحہ، زبیر، سعد اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہم پر مشتمل مجلسِ شوریٰ بنا دی تھی اور بغیر کسی جبر و اکراہ کے مسلمانوں نے متفقہ طور پر عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ پہلے تین صاحبان: طلحہ، زبیر اور سعد رضی اللہ عنہم نے دعوائے خلافت سے اپنی دست برداری کا اعلان کر دیا تھا۔ اس کے بعد تین صاحبان: عثمان، علی اور عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہم باقی بچے تھے۔ اس کے

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٠٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٧٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٥٤٦)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦٦٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٩٧) السلسلة الصحيحة (١٢٣٣)

بعد عبدالرحمن نے ایک کو خلیفہ بنا دیا، لیکن اس طرح کہ عبدالرحمن رضی اللہ عنہ مسلسل تین دنوں تک مہاجرین، انصار اور تابعین عظام سے مشورے کرتے رہے اور بتایا کہ لوگ عثمان رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں کسی کو نہیں سمجھتے۔

معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات اور ان کے دورِ خلافت کے حالات اور واقعات کے لیے ثقہ راویانِ حدیث کی روایات کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ واللہ أعلم[1]

یزید بن معاویہ اور یزید بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما کی صحابیت کی وضاحت

سوال یزید بن معاویہ کے صحابی ہونے کے بارے میں علمائے کرام کی کیا رائے ہے؟ جو اس کو صحابی یا نبی سمجھتا ہے، اس کا کیا حکم ہے؟ نیز کیا کسی صحابی کا نام بھی یزید تھا؟

جواب الحمد للّٰہ رب العالمین. یزید بن معاویہ بن ابوسفیان جو اپنے والد معاویہ بن ابوسفیان کے بعد مسلمانوں کا خلیفہ بنا، صحابی نہیں تھا، البتہ اس کا چچا یزید بن ابوسفیان صحابی تھا۔ ابوسفیان بن حرب کے کئی بیٹے تھے۔ ان میں یزید بن ابوسفیان اور معاویہ بن ابوسفیان کا نام آتا ہے۔ بیٹیوں میں ام المومنین امِ حبیبہ رضی اللہ عنہا تھی۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حبالۂ عقد میں آئیں۔ انھوں نے اپنے باپ اور دونوں بھائیوں سے پہلے اسلام قبول کیا۔ اپنے خاوند کے ساتھ ہجرتِ حبشہ کی، پھر اپنے خاوند کی زوجیت سے آزاد ہونے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغامِ نکاح کو قبول کرتے ہوئے آپ کی زوجیت میں داخل ہوگئیں۔ ان کے چچا زاد بھائی خالد بن سعید ولی بنے اور نجاشی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حق مہر ادا کیا۔

ابوسفیان کی بیوی کا نام ہند بنت عتبہ بن ربیعہ ہے۔

فتح مکہ کے موقع پر ابوسفیان اپنی بیوی اور اولاد سمیت مسلمان ہوگیا اور دیگر رؤسائے قریش بھی دائرۂ اسلام میں داخل ہوگئے جن میں سہیل بن عمرو، ابوجہل بن ہشام کا بھائی حارث بن ہشام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا زاد بھائی ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب، عکرمہ بن ابوجہل، صفوان بن امیہ اور بہت سے نامور افراد شامل ہیں۔ یہ سب لوگ بدر میں مرنے والوں کے بعد قریش کے معززین اور بڑے تھے۔ یہ اس سے پہلے کفر کی حالت میں اللہ اور رسول سے لڑتے رہے۔ اُحد میں بھی انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف لڑائی لڑی اور احزاب میں بھی۔ جب مکہ فتح ہوگیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر احسان کرتے ہوئے انھیں آزاد کر دیا اور یہ لوگ طلقاء (آزاد کیے گئے) کے نام سے معروف ہوئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت اللہ کی چوکھٹ پکڑی اور کہا: تم کیا کہتے ہو؟ کہنے لگے: کریم بھائی اور کریم بھتیجا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تم سے وہی بات کہنے لگا ہوں جو یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی:

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٤/٤٥٣-٤٨٠)

﴿ لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللَّهُ لَكُمْ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ﴾ [یوسف: ۹۲]

''آج تم پر کوئی ملامت نہیں، اللہ تمھیں بخشے اور وہ رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔''[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی مکہ میں داخل نہیں ہوئے تھے اور مر الظہران پر پہنچے تھے کہ ابو سفیان مسلمان ہو گیا۔ عکرمہ بھاگ نکلا، پھر واپس آیا اور مسلمان ہو گیا۔ صفوان وغیرہ کفر کی حالت میں جنگِ حنین میں شریک ہوئے، اور اس کے بعد مسلمان ہوئے۔ فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہونے والے عموماً حسنِ نیت سے مسلمان ہوئے اور سہیل بن عمرو، عکرمہ بن ابو جہل، یزید بن ابو سفیان، حارث بن ہشام اور ابو سفیان رضی اللہ عنہم یہ سب بہترین مسلمانوں میں شمار ہو گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے۔ آپ نے مرتدوں اور کافروں سے جہاد کیا، شام میں عیسائیوں سے جنگ کرنے اور شام فتح کرنے کے لیے امیر متعین کیے۔ انھوں نے جو امیر متعین کیے، ان میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بھائی اور ان کے جانشین یزید بن معاویہ کے چچا یزید بن ابو سفیان بھی تھے۔ ان امراء میں حضرت خالد بن ولید، عمرو بن عاص اور شرحبیل بن حسنہ شامل ہیں۔ یہ سب صحابی تھے۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب یزید بن ابو سفیان کو امیر مقرر کیا تو اس کے ساتھ چلتے چلتے اس کو وہ مشہور وصیت کی، جس کا ذکر امام مالک، شافعی، احمد بن حنبل اور ابو حنیفہ نے کیا ہے، اور علما نے جہاد کے مسائل میں اس پر اعتماد کیا ہے۔ موطا امام مالک میں یحییٰ بن سعید کی روایت ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے شام کی طرف لشکر روانہ کیے۔ ان کے ساتھ یزید بن ابو سفیان نکلا۔ وہ شام کے ایک چوتھائی حصے کا امیر تھا۔ بیان کرنے والے خیال کرتے ہیں کہ یزید بن ابو سفیان نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے کہا: آپ بھی سوار ہو جائیے یا میں اتر جاتا ہوں۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: نہ تم اترو گے نہ میں سوار ہوں گا۔ میں اپنے ان قدموں کو جہاد فی سبیل اللہ میں شمار کرتا ہوں۔ پھر فرمایا: تو کچھ لوگوں کو پائے گا انھوں نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے لیے وقف کر لیا ہے، یعنی رُہبان اور تارکینِ دنیا، تو ان کو ان کے اس عقیدے سمیت چھوڑ دینا۔ تو کچھ لوگوں کو پائے گا جنھوں نے اپنے بالوں کے ایسے گڑھے بنائے ہوں گے جس طرح مرغی انڈہ دینے کے لیے گڑھا بناتی ہے، یعنی کنیسے کے خادم، ان کے ان بنائے ہوئے جوڑوں کو تلوار سے اڑا دینا۔ میں تمھیں دس باتوں کی وصیت کر رہا ہوں:

کسی عورت، بچے اور سال خوردہ بوڑھے کو قتل نہ کرنا۔ کوئی پھل دار درخت نہ کاٹنا۔ کسی آباد مقام کو ویران نہ کرنا۔ کسی بکری یا اونٹ کو کھانے کے علاوہ ذبح نہ کرنا۔ کھجور کے کسی درخت کو جلانا نہ برباد کرنا۔ بزدلی نہ دکھانا اور مالِ غنیمت میں بددیانتی نہ کرنا۔ اور ایک اور وصیت کی۔

---

[1] السنن الكبرىٰ للبيهقي (۱۱۸/۹) سنن النسائي الكبرىٰ (۳۸۲/٦)

یہ یزید بن ابوسفیان جس کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے امیر مقرر کیا تھا، صحابیِ رسول اور بہترین مسلمانوں میں سے تھا۔ یہ نیک انسان تھا اور مسلمانوں کے نزدیک اپنے باپ ابوسفیان اور اپنے بھائی معاویہ سے بہتر تھا۔

مسلمانوں نے حضرت ابوبکر و عمر کے زمانۂ خلافت میں شام کے علاقے فتح کیے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو ابوعبیدہ بن جراح، یزید بن ابوسفیان، عمرو بن عاص اور شرحبیل بن حسنہ شام میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نمائندے تھے۔ شام چار حصوں میں منقسم تھا۔ ایک حصہ فلسطین پر مشتمل تھا جو بیت المقدس سے دریائے اردن تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ دریا ''الشریعۃ'' کے نام سے موسوم تھا۔

دوسرا حصہ اردن پر مشتمل تھا جو الشریعہ سے شروع ہو کر عجلون کے مضافات اور دمشق کے نواحی علاقوں تک پھیلا ہوا تھا۔

تیسرا حصہ دمشق تھا اور چوتھا حمص۔ سیس اور ارضِ شمال حمص کے مضافاتی علاقے تھے۔

اس کے بعد حضرت معاویہ یا یزید کے عہد میں شام کے پانچ حصے بنا دیے گئے اور قنسرین اور عواصم کو پانچواں ضلع بنا دیا گیا۔ مسلمانوں نے سیس تک سارا شام اور قبرص بھی فتح کر لیا تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں یہ سارے علاقے فتح کر لیے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سمندری غزوات کی بشارت دی تھی اور یہ بھی بتایا تھا کہ ام حرام بنت ملحان ان میں شریک ہو گی اور ایسا ہی ہوا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ایام ہی میں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت یزید بن ابوسفیان فوت ہو گئے، جب مسلمان یزید بن ابوسفیان کی ماتحتی میں کافروں سے جنگیں لڑ رہے تھے، اس وقت ان کے بھائی معاویہ اور والد ابوسفیان رضی اللہ عنہما بھی ان کے جھنڈے تلے لڑے تھے۔ ایک جنگ میں ابوسفیان رضی اللہ عنہ زخمی ہوئے اور ان کی آنکھ متاثر ہوئی۔

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں یزید بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما کی وفات ہو گئی تو امیر المومنین نے ان کی جگہ ان کے بھائی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو شام کے ایک حصے پر والی مقرر کر دیا۔ وہ اسی عہدے پر کام کرتے رہے، تاآنکہ حضرت عمر فاروق شہید کر دیے گئے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ انتہائی بردبار اور کریم انسان تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی ان کی امارت برقرار رکھی اور شام کے سارے حصے اور اضلاع ان کی ولایت میں ضم کر دیے اور وہ سارے شام کے گورنر بن گئے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دنوں میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا اور انھوں نے اپنے بھائی یزید کے نام پر اس کا نام یزید رکھا۔ یہ یزید بن معاویہ جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں پیدا ہوا، اپنے باپ معاویہ کے بعد بادشاہ بنا۔ اسی کی خلافت کے دنوں میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کیا گیا اور اسی کے زمانے میں

معروف واقعہ حرہ رونما ہوا۔ یہ صحابی ہے نہ خلیفۂ راشد، بلکہ خلفائے راشدین کے بعد خلیفہ بننے والوں میں سے ایک خلیفہ ہے، جس طرح بنو امیہ اور بنو عباس کے خلفا تھے۔

ان خلفا میں سے کوئی بھی کافر نہیں تھا، بلکہ سارے مسلمان تھے، لیکن اکثر مسلمانوں کی طرح ان کی اچھائیاں بھی ہیں اور برائیں بھی۔ یہ سب بھی برابر نہیں تھے، بلکہ ان میں سے کچھ دوسروں سے بہتر سیرت اور کردار کے حامل تھے، مثلاً: بنو امیہ میں سلیمان بن عبدالملک جس نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کو اپنا ولی عہد نامزد کیا تھا، دیگر سے بہت بہتر تھا۔ بنو عباس میں مہدی اور مہتدی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے کچھ زیادہ بااثر، بااقتدار اور دشمنوں کو نابود کرنے والے تھے، مثلاً: عبدالملک بن مروان بنو امیہ سے اور منصور بنو عباس سے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز مسلمانوں کے ہاں ان سب سے افضل تھے، حتی کہ سفیان ثوری جیسے بہت سے جید علما تو کہا کرتے تھے کہ خلفائے راشدین پانچ ہیں اور وہ پانچویں نمبر پر حضرت عمر بن عبدالعزیز کا نام لیتے تھے۔ جب سیرتِ عمرین (دو عمروں کی سیرت) کا لفظ بولا جاتا تو امام احمد بن حنبل وغیرہ اس سے حضرت عمر بن خطاب اور عمر بن عبدالعزیز مراد لیتے تھے۔ اگر کوئی کہتا کہ دو عمروں سے مراد ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما ہیں تو امام احمد اس کی تردید کرتے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے سنت کا احیا کیا۔ بدعت کو موت کی نیند سلایا۔ عدل و انصاف کا پھریرا لہرایا۔ اپنے خاندان اور خاندان سے باہر کے ظالموں کا قلع قمع کیا۔ حجاج بن یوسف وغیرہ نے مسلمانوں پر ظلم کرتے ہوئے جو کچھ ان سے چھینا ہوا تھا، سب کو واپس لوٹایا۔ اپنے علم، دین اور عدل سے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر تبرا کرنے والے بدعتیوں، عثمان وعلی رضی اللہ عنہما اور ان سے محبت کرنے والوں کی تکفیر کرنے والے خارجیوں غیلان قدری جیسے قدریوں، اور فتنے بھڑکانے والے شیعوں کا خاتمہ کیا، لیکن دوسرے خلفا علم، دین اور عدل میں ان کے رتبے اور مقام سے بہت پیچھے تھے، مگر ظاہر و باطن میں مسلمان تھے، کفر یا نفاق کی شہرت نہیں رکھتے تھے، ان کی اچھائیاں بھی تھیں اور برائیاں بھی، بلکہ اکثر کی اچھائیاں برائیوں سے زیادہ تھیں، لیکن ان کی صحیح مقدار کا اندازہ اللہ کے علم کے سوا کہیں نہیں۔ یہ یزید جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد بادشاہ بنا۔ اس نے سب سے پہلے اور اپنے والد حضرت معاویہ کے ایامِ خلافت میں قسطنطنیہ پر حملہ کیا۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "پہلا لشکر جو قسطنطنیہ پر حملہ کرے گا، بخش دیا گیا ہے۔"

جس شخص کا کہنا ہے کہ یہ یزید صحابی تھا، جھوٹ بولتا ہے۔ اس کو بتایا جائے کہ یہ صحابی نہیں تھا، اگر وہ پھر بھی اس بات پر اصرار کرے تو اس کو عبرت ناک سزا دی جائے۔

جس کا کہنا ہے کہ یہ یزید کوئی نبی تھا، وہ کافر اور مرتد ہے۔ اس سے توبہ کروائی جائے، اگر توبہ کر لے تو صحیح، ورنہ قتل کر دیا جائے۔

جو اس کو خلفائے راشدین میں شمار کرتا ہے، وہ بھی گمراہ، بدعتی اور جھوٹا ہے۔ نیز جو اس یزید یا اس کے والد محترم حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو کافر کہتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو اپنے رشتے داروں کا بدلہ لینے اور اپنا سینہ ٹھنڈا کرنے کے لیے شہید کیا تھا، وہ بھی جھوٹا اور افترا پرداز ہے۔

اسی طرح جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ جب اس کے پاس حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سر لایا گیا تو اس نے یہ شعر پڑھا:

لَمَّا بَدَتْ تِلْكَ الحمول وأشرفت　　　تلك الرؤس على رُبى جيرون

نعق الغراب، فقلت: نح أو، لا تُنح　　　فلقد قضيت من النبي أو من الحسين ديوني

''جب جیرون کے ٹیلوں سے وہ سر اور قافلے ظاہر ہوئے تو کوے نے کائیں کائیں کرنا شروع کر دیا، میں نے کہا: تو کائیں کائیں کر یا نہ کر، میں نے نبی یا حسین سے اپنے حساب چکا لیے ہیں۔''

یاد رہے کہ اس کی طرف منسوب شاعری کا دیوان بالعموم جھوٹ پر مشتمل ہے۔ یہود جیسے دشمنانِ اسلام، اسلام کو بدنام کرنے کے لیے ایسے اشعار گھڑتے ہیں جو صاف جھوٹ ہوتے ہیں۔ اسی طرح یہ شعر بھی ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے:

ليت أشياخي ببدر شهدوا　　　جزع الخزرج من وقع الأسل

قد قتلنا الكبش من أقرانهم　　　وعدلناه ببدر فاعتدل

''کاش بدر میں میرے بزرگ نیزے کے وار کی وجہ سے خزرج کا رونا دھونا دیکھ سکتے، ہم نے ان کے اقران اور معاصرین سے کبش (اہم شخصیت) کو قتل کر دیا اور بدر کا بدلہ چکا دیا۔''

کہا جاتا ہے کہ واقعہ حرہ کی راتوں میں وہ یہ شعر پڑھتا تھا۔ یہ بھی جھوٹ ہے۔ یہ درحقیقت عبداللہ بن زبعری کا شعر ہے۔ جب اُحد میں مشرکوں نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تو اس وقت اس نے یہ شعر پڑھا۔ بعد میں وہ مسلمان ہو گیا اور اسلام پر ثابت قدم رہا۔ اس نے اپنے اسلام اور توبہ سے متعلق بھی شعر کہے ہیں۔

قصہ مختصر! یزید ہو یا کوئی اور، غلو سے کام نہیں لینا چاہیے، بلکہ کسی کے بارے میں بھی علم وعدل کے بغیر بات کرنا روا نہیں۔ جو یہ کہتا ہے کہ وہ امام ابن امام تھا، اگر اس کی مراد یہ ہے کہ جس طرح دیگر بنو امیہ اور بنو عباس کے خلفا، منصبِ خلافت پر متمکن ہوئے، اس طرح وہ بھی خلیفہ بنا تو یہ بات صحیح ہے، لیکن صرف اس وجہ سے وہ تعریف و توصیف اور تعظیم و تقدیم کے قابل نہیں، کیوں کہ ہر خلیفہ، خلیفہ راشد اور امامِ ہدایت نہیں ہوتا۔ کوئی انسان محض لوگوں کا

حکمران بننے کی وجہ سے قابلِ تعریف اور ثواب کا مستحق نہیں ہوتا۔ تعریف اور ثواب کا تعلق اس کے عدل و انصاف اور حق و صداقت کا بول بالا کرنے، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، جہاد اور حدود اللہ کو نافذ کرنے جیسے افعال پر مبنی ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر وہ ظلم کا بازار گرم کرتا ہے، جھوٹ کا سہارا لیتا ہے، برائی عام کرتا ہے اور اچھائی سے روکتا ہے، حدود اللہ کو معطل رکھتا ہے، حقوق سے بے پروائی برتتا ہے اور جہاد چھوڑ دیتا ہے تو قابلِ مذمت بن جاتا اور سزا کا مستحق ٹھہرتا ہے۔

امام احمد بن حنبل سے پوچھا گیا: کیا یزید سے حدیث لکھی جائے؟ انھوں نے کہا: نہیں، اس کی کوئی عزت نہیں۔ کیا یہ وہی شخص نہیں جس نے اہلِ حرہ کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا؟!

ان کے بیٹے نے کہا: کچھ لوگ کہتے ہیں: ہم یزید سے محبت کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا: کیا کوئی ایسا شخص جس میں بھلائی کی کوئی رمق ہو یزید سے محبت کر سکتا ہے؟! اس نے کہا: پھر آپ اس پر لعنت کیوں نہیں بھیجتے؟ انھوں نے جواب دیا: تو نے کب اپنے بابا کو کسی پر لعنت بھیجتے ہوئے دیکھا ہے؟!

اس سب کے باوجود یزید نے نہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا، نہ ان کا سر اس کے سامنے پیش ہوا تھا اور نہ اس نے چھڑی سے ان کے دندان کو مس ہی کیا تھا، بلکہ یہ عبیداللہ بن زیاد نے کیا تھا۔ اسی طرح ان کے سر کو کہیں گھمایا نہیں گیا تھا اور ان کے اہلِ خانہ میں سے کسی کو لونڈی یا غلام بھی نہیں بنایا گیا تھا۔ یہ شیعانِ عراق تھے جنھوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو اس پر آمادہ کرنے کے لیے مراسلت کی تھی اور پھر دھوکا دے دیا۔ علما اور خیر خواہوں نے ان کو ان کی دعوت قبول نہ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے پہلے اپنے چچا زاد مسلم بن عقیل کو بھیجا تو ان کی اکثریت اس مراسلت اور خطوط سے منکر ہوگئی اور ان کے چچا زاد شہید کر دیے گئے۔ اس کے بعد عمر بن سعد کی قیادت میں ایک لشکر آیا جس کی حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے مڈبھیڑ ہوئی اور انھوں نے ان کو ظلم کرتے ہوئے شہید کر دیا۔ اللہ نے جس طرح ان کے والد محترم اور دیگر بزرگوں کو شہادت سے مشرف کیا ان کو بھی اس بلند رتبے سے نواز دیا۔

عراق میں دو گروہ تھے: ایک ناصبی جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتے تھے اور ان کو سب و شتم کرتے تھے۔ حجاج بن یوسف اسی گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ دوسرے شیعانِ علی جو اہلِ بیت سے موالات و محبت کا اظہار کرتے تھے، مختار بن عبید ثقفی ان کا سرخیل تھا۔ صحیح مسلم میں حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: ''عن قریب ثقیف سے ایک کذاب اٹھے گا اور دوسرا مُبیر (سفاک)۔''[1]

کذاب مختار بن عبید ثقفی تھا اور مُبیر یعنی سفاک اور ظالم حجاج بن یوسف ثقفی۔

مختار بن عبید نے شروع شروع میں تشیع اور حبِ حسین کا چولا پہنا اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے اور ان کا

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٤٥)

سر لانے کا حکم دینے والے اور ان کے دندان پر چھڑی مارنے والے امیر، یعنی عبید اللہ بن زیاد کو قتل کیا۔ اس کے بعد اپنے اوپر وحی اترنے اور اپنے پاس جبرائیل علیہ السلام کے آنے کا دعویٰ کر دیا۔ اس کی سرکوبی کے لیے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے اپنے بھائی مصعب کو بھیجا جس نے اس کا سر قلم کر دیا اور اس کے بہت سے ماننے والوں کو بھی تہ تیغ کر دیا۔ اس کے بعد عبدالملک بن مروان آیا جس نے مصعب بن زبیر کو قتل کر دیا۔ اس طرح نواصب اور روافض عاشورا کے دن کے حوالے سے دو گروہ بن گئے۔ ایک اس دن کو رونے پیٹنے، ماتم کرنے اور نوحہ گری کے لیے منانے لگا اور دوسرا خوشی، عید اور جشن کے طور پر، حالانکہ یہ دونوں کام ہی بدعت اور گمراہی ہیں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے رخسار کوبی کی، گریبان چاک کیے اور جاہلیت کے بول بولے، ہم سے نہیں۔''[1]

امام احمد نے حضرت فاطمہ بنت حسین سے نقل کیا ہے، وہ اپنے والد حضرت حسین سے نقل کرتی ہیں اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو مسلمان بھی کسی مصیبت سے دوچار ہوا ہو، چاہے مصیبت پرانی ہی ہو، پھر از سر نو اس کے لیے انا للہ پڑھے تو اللہ اس کو اتنا ہی اجر دیتے ہیں، جتنا مصیبت کے دن إنا لله وإنا إليه راجعون پڑھنے پر دیا تھا۔''[2]

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ مصیبت کا جب بھی ذکر کیا جائے، چاہے وہ پرانی ہو جائے تو اس وقت مسنون عمل إنا لله وإنا إليه راجعون پڑھنا ہے، اگر مصیبت پہنچتے وقت بھی إنا لله وإنا إليه راجعون پڑھنا مسنون ہے تو مصیبت پرانی ہونے پر بھی إنا لله پڑھنا ہی زیادہ مناسب اور مسنون ہے۔ کتنے انبیا، صحابہ اور صلحا مظلوم شہید کیے گئے ہیں، لیکن کسی کے قتل کے دن کو ماتم کے طور پر منانا مسلمانوں کے دین کی تعلیم نہیں، اسی طرح اس دن کو جشن اور خوشی کے طور منانا بھی بدعت ہے۔

عاشورا کے دن کے حوالے سے روزے کے علاوہ جو کچھ بھی بطورِ حدیث ذکر کیا جاتا ہے، سب جھوٹ ہے۔ مثلاً عاشورا کے دن غسل کرنے، سرمہ لگانے، نمازِ عاشورا پڑھنے، اہل وعیال پر کھلا خرچ کرنے، کھانے پکانے اور قربانی کے گوشت کو عاشورا کے دن پکانے کے لیے ذخیرہ کرنے جیسی تمام مرویات ناصبیوں اور رافضیوں کی بدعات ہیں۔

مختلف اسلامی فرقوں میں اہلِ سنت کی وہی حیثیت ہے جو مختلف ادیان میں دینِ اسلام کی ہے۔ اہلِ سنت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اہلِ بیت سے محبت رکھتے ہیں اور اللہ اور رسول کے فرامین کے مطابق صحابہ اور قرابتِ رسول کے حقوق

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٣٢) المعجم الأوسط (١٥٤/٣)

[2] مسند أحمد (٢٠١/١) علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد (٧٧/٣) میں کہا ہے کہ اس کا راوی ہشام بن زیاد ضعیف ہے۔

کا پورا خیال رکھتے ہیں۔ یہ حدیث صحیح بخاری اور مسلم میں ایک سے زیادہ سندوں سے مروی ہے کہ بہترین زمانہ وہ ہے جس میں، میں مبعوث ہوا، پھر ان کے بعد آنے والے، پھر ان کے بعد آنے والے۔"[1]

صحیح بخاری و مسلم میں ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: "میرے صحابہ کو گالی نہ دو، اس ذات کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر تم میں سے کوئی ایک احد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرے تو ان میں سے کسی ایک کے مد کے یا آدھے مد کو بھی نہ پہنچ پائے گا۔"[2]

صحیح مسلم میں حضرت زید بن اسلم سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع سے واپسی پر، مکہ اور مدینہ کے درمیان غدیرِ خم نامی جگہ پر خطبہ ارشاد فرمایا اور کہا: "لوگو! میں تم میں دو بیش قیمت چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں، ایک کتاب اللہ (کتاب اللہ کا ذکر کیا اور اس کی ترغیب دی) پھر فرمایا: اور اپنے گھر والے، میں تمھیں اپنے گھر والوں کے حقوق کا خیال رکھنے کے حوالے سے خوفِ خدا یاد دلاتا ہوں۔"

زید بن ارقم سے پوچھا گیا: آپ کے اہلِ بیت کون ہیں؟ کہا: جن پر صدقہ حرام ہے۔ آلِ علی، آلِ عباس، آلِ جعفر اور آلِ عقیل۔ پوچھا گیا: کیا یہ سب آلِ بیت ہیں، کہا: ہاں۔[3]

یہاں ان امور کی تفصیل کا موقع نہیں، تاہم یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ یزید بن معاویہ جو اپنے والد معاویہ کے بعد مسلمانوں کا حکمران بنا، صحابی نہیں تھا، بلکہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دور میں پیدا ہوا، لیکن اس کا چچا یزید بن ابوسفیان نہ صرف صحابی تھا، بلکہ صحابہ کے اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتا تھا، اسلام میں ان کا کوئی قابلِ مذمت کام معروف نہیں، بلکہ وہ مسلمانوں کے نزدیک اپنے باپ ابوسفیان اور بھائی معاویہ رضی اللہ عنہما سے بھی بہتر تھا۔ جب یزید بن ابوسفیان کی وفات ہوئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی جگہ ان کے بھائی معاویہ کو گورنر بنا دیا اور وہ خلافتِ عمر اور خلافتِ عثمان میں اسی منصب پر کام کرتے رہے۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا اور مشہور فتنہ رونما ہوا تو دو گروہ بن گئے، ایک حضرت علی رضی اللہ عنہ کا گروہ اور دوسرا معاویہ رضی اللہ عنہ کا گروہ، لیکن علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کی نسبت حق کے زیادہ نزدیک تھے، کیوں کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: "مسلمانوں کے افتراق کے وقت ایک گروہ اسلام سے نکل جائے گا اور جو جماعت حق کے زیادہ نزدیک ہو گی ان سے لڑے گی۔"[4] اس افتراق کے وقت خوارج دین سے نکل گئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے ان سے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٠٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٣٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٧٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٤٠)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٠٨)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٦٤)

جنگ کی۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کی نسبت حق کے زیادہ قریب تھے۔

اس کے بعد جب حضرت علی رضی اللہ عنہ شہید کر دیے گئے تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر کے خلافت ان کو سونپ دی۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی اس فضیلت کی پیش گوئی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کر دی تھی۔ صحیح بخاری میں حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسن رضی اللہ عنہ سے کہا: ''میرا یہ بیٹا سید (سردار) ہے اورعن قریب اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھ پر مسلمانوں کے دو بہت بڑے گروہوں کی صلح کروائے گا۔''[1]

حضرت حسن رضی اللہ عنہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں وفات پا گئے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ان کا بیٹا یزید خلیفہ بنا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد فتنوں، فرقہ بندیوں اور اختلافات کا وہ سیلاب اُمڈ آیا جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات سچ ثابت ہوئی کہ ''نبوت و رحمت ہوگی، پھر خلافتِ نبوت اور رحمت ہوگی، پھر بادشاہت اور رحمت ہوگی، پھر کاٹ کھانے والی ظالم بادشاہت ہوگی۔''[2]

نبیِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت، نبوت اور رحمت تھی۔ خلفائے راشدین کی خلافت، خلافتِ نبوت اور رحمت تھی۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی امارت، بادشاہت اور رحمت تھی اور اس کے بعد کاٹ کھانے والی بادشاہت قائم ہوگئی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جنگِ صفین سے واپسی پر امیر معاویہ کو گالی دینے سے منع کیا تھا اور فرمایا تھا: ''اگر معاویہ رضی اللہ عنہ فوت ہو گئے تو تم سروں کو گردنوں سے گرتے ہوئے دیکھو گے۔'' لہٰذا ایسے ہی ہوا جیسے امیر المومنین نے فرمایا تھا۔

صحیح مسلم میں ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ستارے اہلِ آسمان کا سہارا ہیں۔ جب ستارے ختم ہو جائیں گے تو آسمان پر موعود آفت ٹوٹ پڑے گی۔ میں اپنے صحابہ کا سہارا ہوں۔ جب میں چلا جاؤں گا تو میرے صحابہ پر موعود وقت آ جائے گا۔ میرے صحابہ میری امت کا سہارا ہیں۔ جب وہ چلے جائیں گے تو میری امت پر موعود وقت آ جائے گا۔''[3]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان بھی حرف بہ حرف سچ ثابت ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بہت سے لوگ بلکہ اکثر

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٥٧)

[2] مسند أبي يعلىٰ (١٧٧/٢) السلسلة الصحيحة (٣٢٧٠)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٣١)

بادیہ نشین مرتد ہو گئے۔ اور اسلام پر اہلِ مکہ، اہلِ مدینہ اور اہلِ طائف ثابت قدم رہے۔ یہ حجاز کے تین شہر تھے اور ہر شہر کا ایک بڑا بت تھا جس کی پوجا کی جاتی تھی۔ قرآن میں ان کا ذکر ہوا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ۝ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ۝ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ۝ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ۝ ﴾ [النجم: ۱۹۔۲۲]

''پھر کیا تم نے لات اور عزیٰ کو دیکھا۔ اور تیسری ایک اور (دیوی) منات کو۔ کیا تمھارے لیے لڑکے ہیں اور اس کے لیے لڑکیاں؟ یہ تو اس وقت ناانصافی کی تقسیم ہے۔''

لات اہلِ طائف کا بت تھا، عزیٰ اہلِ مکہ کی دیوی تھی اور منات اہلِ مدینہ کا صنم۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے رسول کی برکت سے ان سے یہ شرک دور کر دیا۔ جب بہت سے لوگ اسلام سے پھر گئے تو اکثر مسلمان خوف اور کمزوری محسوس کرنے لگے تو ان پر وہ وقتِ موعود آ گیا، پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو کھڑا کیا اور ان میں وہ ایمان و یقین، قوت و تائید اور علم و شجاعت رکھ دی، جس کے ساتھ وہ اسلام پر ثابت قدم رہے اور اسی بصیرت کے ساتھ انھوں نے مرتدوں کا خاتمہ کر دیا۔ سب اسلام کی طرف لوٹ آئے۔ نبوت کے جھوٹے دعوے دار مسیلمہ کذاب کو قتل کیا گیا اور زکات دینے سے انکار کرنے والوں سے بھی سختی سے نپٹا گیا۔

بعد ازاں انھوں نے ایرانیوں اور رومیوں، یعنی مجوسیوں اور عیسائیوں کے خلاف جہاد کا آغاز کیا اور اللہ نے ان کے دور میں کچھ فتوحات کا دروازہ کھول دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں فتوحات اور جہاد کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا اور سارے کا سارا شام، مصر، عراق اور خراسان کے کچھ علاقے فتح ہو گئے۔ اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں سارا خراسان، قبرص، مغرب کے بعض علاقے اور دیگر بہت سے شہر فتح ہو گئے۔

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا تو مسلمان فتنے میں مشغول ہو گئے اور کافروں کے خلاف جہاد کرنے اور ان کے علاقے فتح کرنے کے لیے فارغ نہ رہے، بلکہ کچھ کافروں نے سرکشی دکھانا شروع کر دی اور مسلمانوں کو ان کو راضی کرنے کے لیے اور ان کے شر سے بچنے کے لیے مال خرچ کرنا پڑا۔ جب وہ یعنی مسلمان پھر اکٹھے ہو گئے تو انھوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دور میں شام وغیرہ کے بچے ہوئے تمام علاقے فتح کر لیے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پہلے بادشاہ تھے اور ان کی حکومت بادشاہت اور رحمت کی حکومت تھی۔ پھر ان کی امارت کے بعد بے شمار فتنوں نے امت میں سر اٹھا لیا۔ ۶۰ ہجری میں ان کی وفات ہوئی۔ ان سے پہلے حضرت عائشہ، حسن، سعد بن ابی وقاص، ابو ہریرہ اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم جیسے نامور اور جلیل القدر صحابہ وفات پا چکے تھے، پھر ان کے بعد عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس اور ابوسعید جیسے علما صحابہ بھی فوت ہو گئے تو صحابہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مصداق

بہت سی بدعتوں اور فتنوں نے جنم لے لیا۔ مسلمان جب ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کی خلافت میں متحد تھے تو بدعتیوں اور فاجروں کے لیے کھل کر کھیلنے کا کوئی موقع نہیں تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد مسلمانوں کا اتحاد پارہ پارہ ہو گیا تو بدعتی اور فاجر بھی کھل کر سامنے آ گئے، چنانچہ ایک طرف خارجی ظاہر ہوئے جنھوں نے علی بن ابو طالب، عثمان غنی اور ان دونوں سے محبت رکھنے والوں کو کافر قرار دیا جس کی بنا پر حضرت علی کو اللہ اور رسول کے حکم کی پاسداری کرتے ہوئے اور جہاد کا کلمہ بلند کرنے کے لیے ان کے خلاف لڑنا پڑا۔ ان کے خلاف لڑنے پر سب صحابہ کا اتفاق تھا اور جس طرح جمل اور صفین کے حوالے سے ان کا اختلاف تھا، خوارج سے متعلق ایسا کوئی اختلاف نہیں تھا، کیوں کہ صحیح حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خلاف لڑنے کا حکم دیا تھا۔ اس حدیث کو امام احمد نے دس سے زیادہ طرق سے روایت کیا ہے اور یہ بخاری و مسلم میں بھی کئی سندوں سے مروی ہے۔

دوسری طرف شیعہ نے سر اٹھایا، ان میں سے کچھ علی کو ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما پر فضیلت دیتے تھے، کچھ دوسرے علی رضی اللہ عنہ کو امام معصوم اور وصی کہتے تھے۔ ان کے نزدیک خلفا اور مسلمانوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ظلم کیا۔ ایک تیسرا گروہ بھی تھا جو غالی شیعہ کہلاتا تھا۔ ان کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ اللہ یا نبی تھے۔ غالی شیعہ اہلِ اسلام کے اتفاق کے ساتھ کافر ہیں، کیوں کہ جو کسی نبی سے متعلق بھی معبود ہونے کا عقیدہ رکھتا ہے جس طرح عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق عیسائیوں کا عقیدہ ہے یا کسی صحابی سے متعلق یہ نظریہ رکھتا ہے جس طرح علی رضی اللہ عنہ سے متعلق غالی شیعہ کا نظریہ ہے یا کسی پیر سے متعلق یہ عقیدہ رکھتا ہے جس طرح شیخ عدی کے ماننے والے اس کو معبود سمجھتے ہیں یا وہ ان مقدس ہستیوں میں خدا کی کوئی بھی صفت اور خصوصیت داخل سمجھتا ہے، وہ کافر ہے۔ اس سے توبہ کروائی جائے۔ اگر توبہ کر لے تو صحیح، ورنہ قتل کر دیا جائے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شیعہ کے ان تینوں گروہوں کو سزا دی تھی۔ انھوں نے غالیہ فرقے کو، جو ان سے متعلق الٰہ ہونے کا عقیدہ رکھتا تھا، آگ میں جلا دیا۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ ابن سبا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو گالیاں بکتا ہے تو انھوں نے اس کو قتل کرنے کے لیے طلب کیا، مگر وہ بھاگ نکلا۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ ''اگر میں کسی شخص کو دیکھوں کہ وہ مجھے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما پر فضیلت دیتا ہے تو میں اس پر افترا پردازی کی حد جاری کر دوں گا۔'' ان سے تواتر سے ثابت ہے کہ اس امت کے نبی کے بعد سب سے بہتر ابوبکر ہیں پھر عمر۔ اس لیے ان کے اصل شیعہ ساتھی ان پر ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی فضیلت کے متفقہ طور پر قائل ہیں۔

صحابہ کے آخری زمانے میں پھر مرجئہ اور قدریہ نے جنم لیا۔ تابعین کے آخری دور میں جہمیہ کا آغاز ہوا۔ جب صحابہ کے آثار مٹ گئے تو بدعتوں اور فتنوں نے جنم لیا اور فروغ پایا، کیوں کہ ان کا زمانہ امت کے تمام زمانوں

سے بہتر اور افضل تھا۔ رضي الله عنهم وأرضاهم.

والحمد لله وحده، وصلى الله على محمد وآله وصحبه وسلم.[1]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے متعلق غلط عقیدہ

سوال ایک گروہ نے قسم قسم کے فاسد نظریات اختیار کر لیے ہیں۔ ان میں سے ایک شخص کو جب وہ احادیث سنائی جاتی ہیں جو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہیں یا کہا جائے: یہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا مذہب ہے تو وہ ان کی شان گھٹانا شروع کر دیتا ہے، ان پر جرح کرتا ہے اور انھیں روایت میں ضعیف ٹھہراتا ہے۔ وہ یہ گمان کرتا ہے کہ وہ صحابہ میں ناقص خیال کیے جاتے تھے، حتی کہ بعض نے مصاحف میں ان کی قراءت کا اقرار و اثبات نہیں کیا اور وہ قرآن میں معوذتین ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾ کو حذف کرتے تھے۔ ایسے شخص کے بارے میں شریعت کا حکم کیا ہے؟

جواب حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جلیل القدر اور اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے تھے، حتی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے بارے میں کہا کرتے تھے: وہ علم سے بھرا ہوا باڑا ہیں۔

حضرت ابوموسیٰ کہتے ہیں: ہم حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کثرت کے ساتھ آنے جانے کی وجہ سے یہ سمجھتے تھے کہ وہ آلِ بیتِ رسول ہی کا ایک فرد ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرما رکھا تھا: ''تمھارے لیے میرے پاس آنے کی یہی اجازت ہے کہ تم پردہ اٹھاؤ اور میرا وجود دیکھو، یہاں تک کہ میں تجھ کو منع کروں۔''[2]

سنن میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میرے بعد ان دو: ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کی اقتدا کرو اور ابن ام عبد (حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ) کی سیرت اپناؤ۔''[3] صحیح حدیث میں ہے: ''جس کو یہ پسند ہے کہ وہ قرآن کو اسی طرح تازہ سنے، جس طرح وہ نازل ہوا تو وہ ابن ام عبد (عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ) کی قراءت کے مطابق پڑھے۔''[4]

جب عراق فتح ہوا تو ان کو وہاں لوگوں کو کتاب وسنت کی تعلیم دینے کے لیے بھیجا۔ وہ ان تمام صحابہ رضی اللہ عنہم سے زیادہ عالم تھے جنھیں عراق بھیجا گیا۔ ان کے بارے میں حضرت ابوموسی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''جب تک یہ حبر (متبحر عالم) تم میں موجود ہے، مجھ سے کسی چیز کے بارے میں مت پوچھو۔''

---

[1] جامع المسائل (٤/١٣٩۔١٥٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٥٥٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٦٠)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦٦٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٩٧) السلسلة الصحيحة (١٢٣٣)

[4] مسند أحمد (١/٧، ٢٦، ٣٨، ٤٤٥، ٤٥٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٣٨) السلسلة الصحيحة (٢٣٠١)

حضرت ابن مسعود کہا کرتے تھے: ''اگر میں کسی ایسے شخص کو جانتا جو مجھ سے زیادہ کتاب اللہ کا علم رکھتا ہو اور اس تک پہنچنے کے لیے اونٹ پر بیٹھ کر جایا جا سکتا ہو تو میں اس کے پاس آتا۔''

جب حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا آخری وقت آیا تو مالک بن یخامر سکسکی نے رونا شروع کر دیا۔ حضرت معاذ نے ان سے کہا: آپ کیوں رو رہے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا: اللہ کی قسم! میں اس وجہ سے نہیں رو رہا کہ تمھارے اور میرے درمیان کوئی قرابت داری تھی، نہ کسی دنیاوی مفاد کے پیشِ نظر ہی رو رہا ہوں جو میں آپ سے حاصل کر سکتا تھا، لیکن میں تو اس علم اور ایمان کی وجہ سے رو رہا ہوں جو میں آپ سے سیکھا کرتا تھا۔ انھوں نے جواب دیا: علم اور ایمان کی جگہ موجود ہے، جو ان کو تلاش کرنا چاہتا ہے، پا لیتا ہے۔ علم چار لوگوں کے پاس جا کر سیکھ، اگر یہ تم کو تھکا دیں (یعنی صحیح راہنمائی نہ کر سکیں) تو پھر سارے اہلِ زمین ہی عاجز ہوں گے۔ انھوں نے ان کے سامنے ان چار: ابنِ مسعود، ابی بن کعب، عبداللہ بن سلام اور میرے خیال میں چوتھے نمبر پر حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہم کا نام لیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لوگوں کے علما کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے جواب دیا: ''ایک عراق میں ہے، یعنی ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ۔'' حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، علم میں حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابی اور حضرت معاذ (رضی اللہ عنہم) کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور وہ علما صحابہ کے پہلے طبقے میں شمار ہوتے تھے۔ جس نے ان پر جرح کی یا کہا: ''وہ روایت میں ضعیف تھے۔'' وہ ان رافضہ کی جنس سے تعلق رکھتا ہے جو حضرت ابو بکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم پر جرح کرتے ہیں۔ یہ اس کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں کثرتِ جہالت یا زندیقیت اور منافقت پر دلالت کرتا ہے۔[1]

کیا صحابہ کا باہمی تنازعات پر مواخذہ ہوگا؟

سوال حضرات صحابہ علی، معاویہ، طلحہ اور عائشہ رضی اللہ عنہم کے درمیان جو اختلافات ہوئے، کیا ان سے اس کا مواخذہ کیا جائے گا یا نہیں؟

جواب صحیح نصوص سے ثابت ہے کہ حضرات عثمان، علی، طلحہ، زبیر اور عائشہ رضی اللہ عنہم اہلِ جنت میں سے ہیں، بلکہ صحیح حدیث میں یہاں تک ثابت ہے کہ (بیعتِ رضوان کے موقع پر) درخت کے نیچے جن جن حضرات نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، ان میں سے کوئی بھی جہنم میں نہیں جائے گا۔[1] اسی طرح حضرات ابو موسیٰ اشعری، عمرو بن عاص اور معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہم صحابہ میں سے ہیں، ان کے فضائل و محاسن ہیں۔

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٤/٥٣٠-٥٣١)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٤٩٦)

ان سے متعلق جو کچھ بیان کیا جاتا ہے، اس میں بیشتر حصہ جھوٹ ہے۔ کچھ باتیں سچی ہیں، لیکن ان میں وہ اجتہاد کرنے والے تھے اور مجتہد کا حکم یہ ہے کہ اگر اس کا اجتہاد صحیح ہوتا ہے تو اسے دہرا اجر ملتا ہے، لیکن اگر اس میں غلطی ہوتی ہے تو صرف ایک اجر ملتا ہے اور اس کی غلطی معاف کر دی جاتی ہے۔

لیکن اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ان سے گناہ سرزد ہوئے ہیں تو اس سے مطلقاً جہنم میں داخل کیا جانا ضروری نہیں ہوتا اِلا یہ کہ وہ اسباب موجود نہ ہوں جو اس سے مانع ہیں اور وہ دس ہیں:

1. توبہ۔
2. استغفار۔
3. گناہوں کو مٹا دینے والی نیکیاں۔
4. گناہوں کا کفارہ بننے والے مصائب۔
5. نبی اکرم ﷺ کی شفاعت۔
6. نبی ﷺ کے سوا دوسروں کی شفاعت۔
7. مومنوں کی دعائیں۔
8. صدقہ اور غلام وغیرہ آزاد کر کے میت کے لیے ایصالِ ثواب۔
9. قبر کی آزمایش۔
10. قیامت کی ہولناکی۔

صحیحین میں ثابت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''تمام زمانوں میں سب سے بہتر زمانہ وہ ہے جس میں میری بعثت ہوئی ہے، پھر ان لوگوں کا زمانہ ہے جو اس سے متصل ہے، اس کے بعد ان لوگوں کا زمانہ ہے جو دوسرے زمانے سے متصل ہے۔''[1]

ایسی صورت میں اگر کوئی ان حضرات صحابہ میں سے کسی کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کہتا ہے کہ اس سے گناہ سرزد ہوا تھا اور وہ جہنم میں جائے گا تو ایسا شخص جھوٹا اور مفتری ہے، کیوں کہ اگر اس نے یہ بات بغیر کسی علم کے کہی ہے تو وہ باطل ہے، پھر وہ کیسے ایسی بات کہہ سکتا ہے جس کے خلاف بہت سے دلائل موجود ہیں۔ جو شخص ان مشاجراتِ صحابہ کے بارے میں زبان کھولتا ہے جن پر گفتگو کرنے سے اللہ نے منع کیا ہے، ان کی مذمت کرتا ہے یا ان میں سے بعض سے باطل طریقے پر اظہارِ تعصب کرتا ہے تو وہ ظالم اور حد سے تجاوز کرنے والا ہے۔

صحیح میں ثابت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''مسلمانوں میں سے ایک جماعت دین سے نکل بھاگے گی، اسے مسلمانوں کے دو گروہوں میں سے وہ گروہ قتل کرے گا جو حق سے زیادہ قریب ہوگا۔''[2] صحیح میں یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا: ''میرا یہ نواسا سردار ہے۔ عنقریب اللہ اس کے ذریعے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں کے درمیان صلح کرائے گا۔''[3]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٠٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٣٣_٢٥٣٦)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٦٤)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٥٧)

صحیحین میں ہے کہ آپ ﷺ نے عمار رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا: ''انھیں ایک باغی جماعت قتل کرے گی۔''

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے:

﴿ وَاِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴾ [الحجرات: ۹]

''اور اگر مومنوں میں سے کوئی دو فریق آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو اور اگر ایک فریق دوسرے پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو، یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع کرے پس جب وہ رجوع کرے تو دونوں فریق میں مساوات کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف سے کام لو کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

اس طرح کتاب و سنت اور اجماعِ سلف سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ مومن اور مسلم تھے اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی اس جماعت سے زیادہ حق سے قریب تھے جس نے ان سے جنگ کی تھی۔ واللہ أعلم [1]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو گالی دینے والے کی تکفیر کرنے والے فرقے کا حکم

سوال مسلمانوں کا ایک فرقہ ہے جس سے وابستہ افراد شہادتین کا اقرار کرتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں، حج کرتے ہیں، زکات نکالتے ہیں، اللہ کی رضا کے لیے جہاد کرتے ہیں، لیکن ان سب کے باوجود نبی اکرم ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو گالی دینے والے کو کافر قرار دیتے ہیں۔ ایسا شخص اگر توبہ کرے تو اس کی توبہ کی امید نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ اس پر مصر رہنے والا مخلد فی النار ہے۔ جو ان کی توبہ کا قائل ہے، اسے یہ لوگ ''رجویہ'' کا نام دیتے ہیں۔ نماز صرف اسی کے پیچھے پڑھتے ہیں جس کے عقیدے کی درستی ان پر واضح ہوتی ہے۔ اس فرقے کا کوئی شخص جب کوئی بات کہتا ہے یا اس سے کچھ پوچھا جاتا ہے تو وہ ان شاء اللہ کہتا ہے۔ کیا یہ لوگ اپنے ان افعال میں صحیح ہیں یا اپنے اقوال میں غلطی پر ہیں؟

جواب الحمد للہ. اس فرقے کے لوگ مسلمان ہیں۔ ان کے بھی وہی حقوق ہیں جو ان کے جیسے دوسرے مسلمانوں کے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے اور ان کی اطاعت کرنے پر اللہ تعالیٰ انھیں ثواب عطا کرے گا۔ ان مسائل میں جو غلطیاں یہ کر رہے ہیں ان سے ان کا ایمان اور ان کا تقویٰ ضائع نہیں ہوگا۔ یہ ان مسلمانوں کی طرح ہیں جو اپنے بیشتر معتقدات اور اعمال میں راہِ راست پر ہیں، لیکن تھوڑے مسائل میں ان سے غلطی

[1] مجموع الفتاویٰ (٤/٤٣١۔٤٣٣)

سرزد ہو رہی ہے۔ اس فرقے کے لوگ بھی ان مسلمانوں کی طرح ہیں۔

ان کا یہ کہنا غلط ہے کہ صحابہ کو گالی دینے والے کی توبہ قبول نہیں ہو گی اور وہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں جائے گا، بلکہ سلف صالحین اور چاروں ائمہ جیسے دیگر ائمہ دین کا مسلک یہ ہے کہ دوسروں کی طرح رافضی کی بھی توبہ قبول کی جائے گی۔ جو حدیث روایت کی جاتی ہے کہ میرے صحابہ کو گالی دینا ایک ایسا گناہ ہے جس کی مغفرت نہیں ہے، وہ باطل ہے، اہلِ علم میں سے کسی نے اسے روایت نہیں کیا ہے۔ اگر اس کی صحت تسلیم بھی کر لی جائے تو اس سے وہ شخص مراد ہو گا جو توبہ نہ کرے۔ ایسے شخص سے اللہ تعالیٰ صحابہ کا حق وصول کرے گا۔

لیکن جو شخص توبہ کر لے، اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا﴾

[الزمر: ۵۳]

"(اے پیغمبر! میری طرف سے) کہہ دو کہ اے میرے بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے نا امید نہ ہونا اللہ تو سب گناہوں کو بخش دیتا ہے۔"

توبہ کرنے والے کے حق میں یہ آیت ہے کہ اللہ اس کے تمام گناہ بخش دے گا۔ صحابہ کو گالی دینے والا اگر اس کے جواز کا عقیدہ رکھتا ہے تو وہ بدعتی اور دوسرے گمراہوں کی طرح گمراہ ہے۔ اس مسئلے میں انصاف دلانا اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ جیسے کوئی شخص اس عقیدے کے ساتھ رسول کو گالی دیتا ہے کہ وہ ساحر اور کاذب ہیں، لیکن جب مسلمان ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا اسلام قبول کر لیتا ہے۔ یہی حال رافضی کا ہے، جب اس پر حق واضح ہو جائے اور وہ توبہ کر لے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمائے گا۔ اگر وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو گالی دینے کی حرمت کا اقرار کرتا تھا تو وہ ظالم ہے۔ وہ اس شخص کی طرح ہے جو دوسرے پر بہتان لگاتا اور اس کی غیبت کرتا ہے۔ بندے آپس میں جو ایک دوسرے پر ظلم کرتے ہیں، اس سے توبہ صحیح ہے۔ وہ ان کے لیے دعا کرتا رہے اور ان کی تعریف کرتا رہے جس قدر وہ ان پر لعنت کرتا اور اس کو برا بھلا کہتا رہا ہے، کیوں کہ نیکیاں برائیوں کے لیے کفارہ بن جاتی ہیں۔

جب کوئی کہنے والا کہے کہ یہ پتھر ہے اور یہ بھی کہے کہ میں قطعیت کے ساتھ نہیں کہتا کہ یہ پتھر ہے تو وہ غلطی پر ہے۔ لیکن اگر اس کی مراد یہ ہے کہ اگر میں نے قطعیت کے ساتھ کہہ دیا کہ یہ پتھر ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں نے اللہ تعالیٰ کو اس بات سے عاجز بنا دیا کہ وہ اس کو تبدیل کرنے پر قادر نہیں ہے۔ اس وقت اس سے کہا جائے گا کہ بلکہ اس وقت وہ پتھر ہی ہے اور اللہ اس کو تبدیل کرنے پر قادر ہے۔ اگر ان شاء اللہ سے اس فرقے کی مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو تبدیل کرنے پر قادر ہے تو یہ معنی صحیح ہے، لیکن اگر وہ اس کے پتھر ہونے میں شک کر رہا ہے تو وہ خود

ساختہ جاہل ہے۔ اس پر اسے سزا دی جائے گی۔

ائمہ اربعہ اور دیگر تمام ائمہ اسلام کے متفقہ فیصلے کے مطابق نماز ہر اس مسلمان کے پیچھے پڑھنا جائز ہے، جس کے حالات پردۂ خفا میں ہیں۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ میں جس کے باطن کے عقیدے کو نہیں جانتا اس کے پیچھے نہ جمعہ پڑھوں گا اور نہ کوئی فرض نماز ادا کروں گا، وہ بدعتی، صحابہ، تابعین، ائمہ اسلام اور ائمہ اربعہ رحمہم اللہ وغیرہ کا مخالف ہے۔ واللہ أعلم[1]

مسئلہ مصراۃ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو غیر فقیہ قرار دینے کی تردید

سوال اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جس نے ایک دوسرے شخص سے ''مسئلہ مصراۃ'' اور ''خریدنے والا اگر چاہے تو ایسے جانور کو واپس کرنے'' کے مسئلے میں مناظرہ کیا جو اس بات کا دعوے دار تھا کہ ایسے جانور کو واپس کرنا جائز ہے۔ اس نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی متفق علیہ حدیث سے استدلال کیا، لیکن مخالف نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فقہائے صحابہ میں سے نہیں تھے۔ بکثرت حدیث بیان کرنے کی وجہ سے سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ان پر نکیر کی تھی اور انھیں حدیث بیان کرنے سے روک دیا تھا، بلکہ یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر آیندہ حدیث بیان کی تو تمھیں سزا دوں گا۔ اسی طرح سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ان پر نکیر کی تھی اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کئی ایک باتوں میں ان کی مخالفت کی تھی۔ کیا معترض نے جو کچھ کہا ہے، وہ صحیح ہے؟ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے سلسلے میں اس طرح کی باتیں کہنے والے کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے؟

جواب الحمد لله. یہ معترض کئی وجوہات سے غلطی پر ہے:

1. اس کا یہ کہنا کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فقہائے صحابہ میں سے نہیں تھے تو پھر سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ان کو کیسے بحرین کا والی مقرر فرمایا؟ یہی وہ بحرین ہے جہاں بہترین مسلمان رہتے تھے۔ اسی بحرین کے وفد نے، جسے وفد عبدالقیس کے نام سے جانا جاتا ہے، ہجرت کی تھی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تھے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ان کے امیر تھے اور انھیں بڑے دقیق فقہی مسائل سے متعلق بھی فتویٰ دیتے تھے۔ مثال کے طور پر یہ مسئلہ کہ جس عورت کو تین سے کم طلاق دی گئی ہو، جب وہ دوسرے شوہر سے نکاح کر لے اور وہ اس سے ہم بستر ہو جائے تو کیا دوسرے شوہر سے طلاق پانے کے بعد پہلے شوہر کے پاس جب لوٹے گی تو اس کے شوہر کو تین طلاقوں کا حق حاصل ہو گا جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس اور سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم کا قول ہے اور یہی مسلک ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا ہے اور ایک روایت کے مطابق سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا بھی یہی قول ہے۔ اس دلیل کی بنیاد پر کہ دوسرے

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٤/٥٤٠-٥٤٢)

شوہر کی ہم بستری اسی طرح تین سے کم دی ہوئی طلاق کو ختم کر دے گی، جس طرح وہ تین طلاقوں کو ختم کر دیتی ہے یا شوہرِ اول کو صرف باقی ماندہ طلاق کا حق حاصل ہو گا جیسا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا قول ہے اور جو امام مالک اور امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک ہے اور امام احمد رحمہ اللہ کا بھی مشہور مسلک یہی ہے۔ اس دلیل کی بنیاد پر کہ دوسرے شوہر کی ہم بستری اس حرمت کی انتہا ہے جو تین طلاقوں سے ثابت ہوتی ہے، لٰہذا یہاں صرف اسی کا حکم ختم ہو گا اور وہ عورت جسے تین سے کم طلاقیں دی گئی تھیں وہ حرام نہیں ہو گی، لٰہذا دوسرے شوہر کی ہم بستری سے پہلے شوہر کی دی گئی طلاقیں ختم نہیں ہوں گی۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اسی دوسرے قول کے مطابق فتویٰ دیا۔ اس کے بعد انھوں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے سوال کیا تو انھوں نے ان کے فتوے کو برقرار رکھا اور فرمایا: اگر آپ نے اس کے علاوہ کچھ دوسرا فتویٰ دیا ہوتا تو میں تمھیں مارتا۔

اسی طرح سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ جیسے دیگر فقہاے صحابہ کے ساتھ بعض مشہور معاملات میں دقیق فقہی مسائل سے متعلق فتاویٰ دیے ہیں۔ ان کے فتاویٰ کی فہرست میں ان کے منقول اقوال اس پر دلیل ہیں۔ جب سیدنا عمر و علی رضی اللہ عنہما سیدنا عمران بن حصین اور سیدنا ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہم سے زیادہ بڑے فقیہ تھے، لیکن اس کے باوجود موخر الذکر دونوں حضرات کو فقاہت سے خارج نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح سیدنا معاذ اور سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما وغیرہ سے بڑے فقیہ تھے، لیکن اس کے باوجود ان دونوں کو فقاہت سے باہر نہیں کیا جا سکتا۔

۲ اس معترض سے کہا جائے گا کہ امت کے تمام علما نے قیاس اور ظاہر کے خلاف سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث پر عمل کیا ہے جیسا کہ انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کردہ اس حدیث پر عمل کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ عَلَى عَمَّتِهَا وَلَا عَلَى خَالَتِهَا »[1]

''کسی عورت سے نکاح اس کی پھوپھی اور خالہ کے حبالہ عقد میں رہتے نہ کیا جائے۔''

امام شافعی اور امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ کے ساتھ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ اس حدیث پر عمل کیا ہے:

«مَنْ أَكَلَ أَوْ شَرِبَ نَاسِياً فَلْيُتِمَّ صَوْمَهُ فَإِنَّمَا أَطْعَمَهُ اللهُ وَسَقَاهُ »[2]

''جس کسی نے بھول کر کھا پی لیا ہو اسے اپنا روزہ مکمل کر لینا چاہیے، کیوں کہ اسے اللہ ہی نے کھلایا پلایا ہے۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٨٢١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٠٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٩٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٥٥)

حالانکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک قیاس کا تقاضا یہ تھا کہ اسے روزہ توڑ دینا چاہیے، لیکن سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کی وجہ سے انھوں نے قیاس ترک کر دیا۔ اس قسم کی دوسری مثالیں بھی دی جا سکتی ہیں، لیکن ان کا تذکرہ طوالت کا باعث ہوگا۔

امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے ساتھ امام مالک رحمہ اللہ نے بھی سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث پر عمل کیا ہے جس میں یہ ذکر ہے کہ اگر کتا برتن میں منہ ڈال دے تو اسے سات بار دھویا جائے، حالانکہ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک قیاس کا تقاضا یہ تھا کہ اسے دھویا نہ جائے، کیوں کہ ان کی نظر میں وہ پاک ہے، بلکہ ائمہ کرام کا حال تو یہ ہے کہ وہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے کم تر درجے کی حدیث کی موجودگی میں بھی قیاس ترک کر دیتے ہیں، جیسے کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے مسئلہ قہقہہ میں ایک ایسی مرسل حدیث کی وجہ سے قیاس ترک کر دیا جس کے بارے میں معلوم نہیں کہ اسے کس صحابی نے بیان کیا ہے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث تو ائمہ حدیث کے متفقہ فیصلے کے مطابق اس سے کہیں زیادہ مضبوط ہے۔

۳ جواب میں یہ بھی کہا جائے گا کہ محدث جب سنی ہوئی حدیث کے الفاظ یاد رکھے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ فقیہ نہیں ہے جیسا کہ قرآن کے حروف، تشہد کے الفاظ اور اذان کے کلمات سکھانے والا ہوتا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

«نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَءاً سَمِعَ حَدِيْثاً فَبَلَّغَهُ إِلىٰ مَنْ لَّمْ يَسْمَعْهُ، فَرُبَّ حَامِلِ فِقْةٍ غَيْرُ فَقِيْهٍ، وَرُبَّ حَامِلِ فِقْةٍ إِلىٰ مَنْ هُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ »[1]

''اللہ اس بندے کو سرسبز و شاداب رکھے جس نے کوئی حدیث سنی، پھر اسے اس شخص تک پہنچا دیا، جس نے وہ حدیث سنی نہیں تھی، کیوں کہ بہت سے حاملِ فقہ غیر فقیہ ہوتے ہیں اور بہت سے حاملِ فقہ وہ حدیث اپنے سے زیادہ فقیہ تک پہنچا دیتے ہیں۔''

یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ فقہ پر مشتمل حدیث اس کے ایسے حامل سے اخذ کی جا سکتی ہے جو فقیہ نہیں ہے اور اپنے سے کم تر فقیہ سے حدیث لی جا سکتی ہے۔ روایت میں فقاہت کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب راوی اس حدیث کو بالمعنی بیان کرے۔ وہاں اندیشہ اس بات کا ہوتا ہے کہ غیر فقیہ راوی حدیث کا معنی بدل دے اور اسے اس کا ادراک بھی نہ ہو۔

ادھر سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا حال یہ ہے کہ وہ امت میں سب سے زیادہ بڑے حافظ تھے۔ ان کے حفظ کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور خاص دعا فرمائی تھی۔ اسی لیے وہ فرماتے ہیں: "فَلَمْ أَنسَ شيئاً سَمِعْتُهُ بَعدُ"[2] (اس

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٦٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٥٦) السلسلة الصحيحة (٤٠٣)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٩٢)

دعائے نبوی کے بعد میں نے جو کچھ سنا اسے بھولا نہیں) یہی وجہ ہے کہ انھوں نے حدیث مصراۃ وغیرہ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔

④ تمام صحابہ کرام، جیسے عمر، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس اور عائشہ رضی اللہ عنہم سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث قبول کرتے ہیں۔ کتبِ احادیث پر جو بھی غور وفکر کرے گا اس پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔

⑤ کسی ایک صحابی نے بھی سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ کسی حدیث پر طعنہ زنی کرتے ہوئے یہ نہیں کہا ہے کہ انھوں نے اس حدیث میں غلطی کی ہے، نہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اور نہ کسی دوسرے صحابی نے، بلکہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے کے پاس خاص مجلس تھی جہاں وہ حدیث بیان کیا کرتے تھے اور فرماتے تھے: اے حجرہ میں رہنے والی ام المومنین! کیا میں جو کچھ بیان کر رہا ہوں، اس سے آپ کو انکار ہے؟ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا جب نماز سے فارغ ہوئیں تو انھوں نے ان کی روایت کردہ کسی حدیث سے انکار نہیں کیا، صرف یہ ارشاد فرمایا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح جلدی جلدی حدیث نہیں بیان فرماتے تھے جس طرح آپ لوگ بیان کرتے ہیں، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح حدیث بیان فرماتے تھے کہ اگر کوئی شمار کرنے والا چاہتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ایک لفظ شمار کر سکتا تھا۔[1] اس طرح انھوں نے بیان کردہ حدیث پر نہیں بلکہ حدیث بیان کرنے کے طریقے پر تنقید فرمائی۔

اسی طرح سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا کہ کیا سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ کسی حدیث سے آپ کو اختلاف ہے؟ انھوں نے جواب میں ارشاد فرمایا: نہیں، لیکن انھوں نے احادیث بیان کیں اور ہم بزدل ثابت ہوئے۔ یہ سن کر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر میں نے یاد رکھا اور لوگ بھول گئے، اس میں میری کیا خطا ہے۔ لوگ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی کثرتِ روایت کو بڑی حیرت سے دیکھتے تھے، یہاں تک کہ بعض حضرات نے کہا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بہت زیادہ حدیث بیان کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں انھوں نے فرمایا: لوگ کہتے ہیں کہ ابو ہریرہ بہت احادیث بیان کرتا ہے۔ اللہ کی قسم! اسی کی ذات پر بھروسا ہے۔ میرے مہاجر بھائی بازاروں میں کاروبار اور خرید و فروخت میں مصروف رہتے تھے اور انصار بھائیوں کو ان کی دولت مصروفِ عمل رکھتی تھی۔ میں ایک نادار اور غریب آدمی تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لگا رہتا تھا۔ میں اس وقت بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہتا تھا جب لوگ وہاں نہیں ہوتے تھے اور میں یاد رکھتا تھا جب کہ لوگ بھول جایا کرتے تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے ایک حدیث بیان فرمائی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کون اپنا دامن پھیلاتا ہے۔ میں نے اپنا دامن پھیلا دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا دی۔ اس کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣٧٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٩٣)

سے سنی ہوئی کوئی بات میں نہیں بھولا۔[1]

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ رات کے تین حصے کر لیا کرتے تھے۔ ایک تہائی حصے میں نماز پڑھتے تھے، دوسرے تہائی حصے میں احادیثِ رسول دہراتے تھے اور تیسرے تہائی حصے میں سوتے تھے۔

اس طرح ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے اپنے حفظِ حدیث کا سبب یہ بیان کیا کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لگے رہتے تھے، دنیا کے جھمیلوں سے خود کو الگ تھلگ رکھتے تھے اور یہ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حفظ کی وسعت اور استحکام کے لیے دعا فرمائی تھی۔

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے احادیث سننے کے خواست گار رہتے تھے۔ احادیث کے بارے میں ان سے پوچھتے تھے۔ انھوں نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو کبھی بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوئی کسی ایسی حدیث کو بیان کرنے سے منع نہیں کیا جو ضروری علم پر مشتمل ہو اور جس کی ضرورت رہا کرتی ہے۔ یہ بات بھی درست نہیں ہے کہ انھوں نے حدیث بیان کرنے پر ان کی سرزنش کی ہو۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ چاہتے تھے کہ حدیث بیان کرنے میں احتیاط اور تثبت کو ملحوظ رکھا جائے، تاکہ کوئی شخص احادیث میں اپنی طرف سے کچھ بڑھانے گھٹانے کی جراءت نہ کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے سیدنا ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ سے مطالبہ کیا کہ حدیثِ استئذان پر کوئی ایسا گواہ پیش کریں جو ان کی بیان کردہ حدیث کی تائید کرے، حالانکہ ائمہ کا اتفاق ہے کہ سیدنا ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ کا شمار اکابر صحابہ اور امت کے ثقہ ترین اصحاب میں ہوتا ہے۔

٦ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فقہی مسائل میں ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف بھی رجوع کیا کرتے تھے جو فقہی بصیرت میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے فروتر تھے، جیسا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے جنین کی دیت کے مسئلے میں حمل بن مالک رضی اللہ عنہ وغیرہ کی طرف رجوع کیا تھا۔ سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے متوفی عنہا زوجہا کے مسئلے میں فریعہ بنت مالک رضی اللہ عنہا کی طرف رجوع کیا تھا کہ ایسی عورت اپنے شوہر کے اس گھر میں عدت گزارے گی، جہاں اس کے شوہر کا انتقال ہوا ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ نے اپنے شوہر کی دیت سے بیوی کے ورثہ پانے کے مسئلے میں ضحاک بن سفیان کلابی کی طرف رجوع کیا تھا اور اسی طرح سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ وغیرہ نے حائضہ عورت سے طواف وداع کے ساقط ہونے کے مسئلے پر قبیلہ انصار کی ایک خاتون کی طرف رجوع کیا تھا۔

اسی طرح جب سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے مفوضہ متوفی عنہا سے متعلق مہرِ مثل کا فتویٰ دیا تو قبیلہ اشجع کے لوگ کھڑے ہوئے اور انھوں نے شہادت دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بروع بنت واشق کے بارے میں وہی فیصلہ فرمایا تھا جو

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٨، ١١٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٩٢، ٢٤٩٣)

آپ نے فیصلہ کیا ہے۔ یہ سن کر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بہت زیادہ خوش ہوئے۔ اسی طرح سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے دادی کو وراثت میں حصہ سیدنا مغیرہ بن شعبہ اور محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہما کی حدیث کی بنا پر دلایا تھا۔ اس طرح کی مثالیں بے شمار ہیں۔

7 مصراۃ کے سلسلے میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کی مخالفت کرنے والا کہتا ہے کہ وہ اصول یا قیاسِ اصول کے خلاف ہے۔ اس کو جواب دیا جائے گا کہ اس مسئلے کے بارے میں بھی وہی بات ہے جو اس کے جیسے مسائل کے بارے میں ہے جن میں تم بھی نصوص کی پیروی کرتے ہو۔ اس حدیث کا تعلق ایسے مسئلے سے ہے جو دوسرے مسئلے سے الگ ہے نہ کہ اپنے جیسے مسئلے کے مماثل ہے۔ قیاس دو متماثل اشیا کے درمیان مساوات کا نام ہے اور دو الگ الگ چیزوں کے درمیان تفریق کرنا اس کی غایت ہے۔ جس کسی نے بھی اس حدیث کی مخالفت کی ہے اس کا خیال ہے کہ اس مسئلے میں جانور کی واپسی عیب کی بنا پر کی گئی ہے اور جو کچھ نقصان ہوا ہے اس کا بدل مقرر کر دیا گیا ہے، بلکہ اگر یہ مثلیات میں سے ہے تو ضمانت میں مثل ادا کیا جاتا یا پھر اس کی قیمت ادا کی جاتی۔ یہاں یہ مضمون نہ مثل ہے اور نہ قیمت، تاوان مشتری کے ذمہ کیا گیا ہے اور خراج تاوان سے ہے۔

اس کو جواب دیا جائے گا کہ جانور کی واپسی دھوکے کی وجہ سے ثابت ہو رہی ہے اور ائمہ کا اتفاق ہے کہ اختلافِ صفت سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ مدلس وہ ہے جس نے یہ ظاہر کیا کہ اس کا جانور اس خاص صفت کا حامل ہے، جب کہ وہ صفت اس کے جانور میں موجود نہیں تھی جو اس نے اپنی زبان سے بیان کی تھی۔ اس طرح کی بیع میں جس نوعیت کا خیار حاصل ہوتا ہے، وہ اس خیار سے الگ ہے جو عیب کی وجہ سے کسی مشتری کو حاصل ہوتا ہے۔

اس سے یہ بھی کہا جائے گا کہ مشتری اس دودھ کا ضامن نہیں جو اس کی ملکیت کے دوران میں پیدا ہوا ہے، بلکہ وہ تو اسی کا ضامن ہے جو تھن میں تھا، اس لیے کہ جب اس نے مصراۃ کو خریدا اور اس میں دودھ تھا جو اس کے یہاں تلف ہوا وہ اس کا ضامن ہے۔ یہاں شارع نے ایک بدل کا تخمینہ لگایا ہے، کیوں کہ نیا اور پرانا دونوں دودھ خلط ملط ہو گیا ہے جس کی وجہ سے پرانے دودھ کا اندازہ کرنا مشکل ہو گیا ہے۔

چونکہ دودھ کے مثل یا اس کی قیمت کی ضمانت ممکن نہیں ہے اس لیے شارع نے بدل کا ایک اندازہ مقرر کر دیا، تاکہ نزاع ختم ہو جائے۔ جس طرح شارع نے جان، اعضائے جسم اور ان کے منافع کی دیتیں مقرر کی ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی مسائل ہیں جن میں شارع نے اندازے مقرر کیے ہیں، تاکہ فریقین کے درمیان پیدا ہونے والی نزاع دور ہو جائے۔ اگر حق کا صحیح اندازہ ممکن ہو تو پھر وہی واجب ہو گا، لیکن اگر صحیح اندازہ لگانا کسی بھی حال میں ممکن نہ ہو، بلکہ مشکل ہو تو شارع نے ایک ایسا اندازہ مقرر کر دیا ہے جو حق سے زیادہ قریب ہے۔

جب ناپ تول مشکل ہو تو شارع نے تخمینہ لگانے کا حکم دیا ہے۔ جب علم مشکل ہو تو گمان کو علم کے قائم مقام

تسلیم کیا ہے۔ ابہام کی صورت میں مستحق کی تعیین کے لیے قرعہ اندازی کرنے کا حکم ہے۔ اختلاف کو دور کرنے کے لیے کبھی کبھی بدلِ استحقاق کا ضابطہ طے کیا ہے۔ استعمال کردہ دودھ کے بدل کے طور پر مشتری کا ایک صاع اناج واپس کرنا اسی باب سے ہے۔

اسی مسئلے کے سلسلے میں ایک دوسری حکایت بھی ہے جسے ابوسعید بن سمعانی نے شیخ عارف یوسف بن ہمدانی سے۔ انھوں نے شیخ فقیہ ابواسحاق شیرازی سے اور انھوں نے ابوطیب طبری سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم جامع بغداد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک خراسانی آیا اور ہم سے مصراۃ کا مسئلہ دریافت کیا۔ ہم نے اس کو جواب دیا۔ دلیل میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث پیش کی۔ حدیث سن کر اس نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ پر طعنہ زنی کی۔ اچانک چھت سے اس پر ایک سانپ گرا، مجلس کی طرف لپکا اور اس اعجمی کی طرف جا کر اسے ڈس لیا جس سے اس کی موت واقع ہوگئی۔

اسی جیسا ایک واقعہ امام طبرانی نے "كتاب السنة" میں زکریا بن یحییٰ ساجی سے نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے سماع کے لیے بعض اساتذۂ حدیث کے پاس جایا کرتے تھے۔ ہم ایک دن آرام سے چلے جا رہے تھے۔ ہمارے ساتھ ایک نوجوان تھا جو مخول کرنے میں طاق تھا۔ اس نے کہا: فرشتوں کے پروں کے اوپر سے اپنے پیر اٹھا لو کہیں انھیں توڑ نہ ڈالنا۔ اس کے بعد اس کا پیر جہاں تھا وہیں رک گیا اور سوکھ گیا۔ اس طرح کے اور بھی واقعات ہیں۔ ہم اللہ سے دست بہ دعا ہیں کہ وہ ہمیں اپنی کتاب اور اپنے رسول کی سنت کو مضبوطی کے ساتھ تھامنے کی توفیق مرحمت فرمائے اور کتاب وسنت کی دلیل کی پیروی کرنے کی سعادت بخشے۔ واللّٰه سبحانه أعلم [1]

ازواجِ مطہرات میں سے افضل کون؟

سوال (1) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں میں سے سب سے افضل کون سی ہے؟

(2) کیا فاطمہ کی فضیلت بھی ان کے برابر ہے اور فرشتوں کے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے حیا کرنے کی وجہ کیا ہے؟

جواب (1) اس امت کی افضل عورتوں میں حضرت خدیجہ، فاطمہ اور عائشہ رضی اللہ عنہن ہیں، مگر ان میں سے سب سے افضل کون ہے؟ اس میں علما کا اختلاف ہے، تاہم اکثر اہلِ علم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو افضل قرار دیتے ہیں، کیوں کہ ان کی فضیلت میں حضرت ابوموسیٰ اور انس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمام عورتوں پر عائشہ کی فضیلت تمام کھانوں پر ثرید کی افضلیت جیسی ہے۔'' [2]

---

(1) مجموع الفتاویٰ (٥٣٢/٤-٥٣٩)

(2) صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٣٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٣١)

2: حیا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی فطرت و جبلت میں داخل تھی، اس لیے فرشتے بھی ان سے حیا کرتے تھے، کیوں کہ "الجزاء من جنس العمل" "جیسا عمل ویسا بدلہ"۔ واللہ أعلم[1]

خدیجہ رضی اللہ عنہا افضل ہیں یا عائشہ رضی اللہ عنہا؟

سوال ام المومنین خدیجہ رضی اللہ عنہا اور ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا دونوں میں افضل کون ہے؟

جواب خدیجہ رضی اللہ عنہا کو اسلام میں سبقت اور شرفِ تقدم حاصل ہے۔ آغازِ اسلام میں ان کے کافی اثرات ہیں اور انھوں نے دین کی نصرت و حمایت فرمائی ہے اور دین پر قائم رہی ہیں۔ ان فضائل میں کوئی ان کا شریک نہیں ہے، نہ عائشہ اور نہ دیگر امہات المومنین رضی اللہ عنہن۔

عائشہ رضی اللہ عنہا کے اسلام کے دورِ آخر میں اثرات، دین کے مسائل و احکام کا تحمل اور اسے امت تک پہنچانا اور علم کی تہہ تک پہنچنا، ان فضائل میں کوئی ان کا شریک نہیں ہے، نہ خدیجہ اور نہ ان کے علاوہ دیگر ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن، اپنی انہی خصوصیات کی وجہ سے وہ دوسروں سے ممتاز ہیں۔[2]

1: جامع المسائل (۹/۱۶۸)

2: مجموع الفتاویٰ (٤/۳۹۳)

اللہ تعالیٰ کی مختلف مخلوقات

زمین و آسمان کی ہیئت

سوال دو آدمیوں نے زمین اور آسمان کی کیفیت کے بارے میں مباحثہ کیا کہ کیا وہ دونوں دائری جسم ہیں؟ ایک نے کہا: وہ دونوں دائری ہیں۔ دوسرے نے یہ نظریہ رد کیا اور کہا: اس کی کوئی اصل اور دلیل منقول نہیں۔ آپ بتایئے درست کیا ہے۔

جواب آسمان مسلم علما کے نزدیک گول ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ کے ساتھیوں کے دوسرے طبقے سے تعلق رکھنے والے ایک نامور عالم اور تقریباً چار سو کتابوں کے مصنف ابوالحسنین احمد بن جعفر بن المنادی نے اس پر کئی ایک ائمہ اسلام کا اجماع نقل کیا ہے۔

ابومحمد بن حزم اور ابوالفرج بن جوزی نے بھی اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ علما نے یہ بات معروف اسناد کے ساتھ صحابہ و تابعین سے بھی نقل کی ہے۔ انھوں نے کتاب و سنت سے اس کا حوالہ دیا ہے اور شرعی دلائل کی روشنی میں اس پر بڑی مفصل گفتگو کی ہے۔ اگرچہ اس پر ریاضی کے دلائل بھی دلالت کرتے ہیں۔ میں مشہور مسلم علما میں سے ایک چھوٹے سے جدلی فرقے کے سوا کسی کو نہیں جانتا جس نے اس کا انکار کیا ہو۔ انھوں نے بھی جب ماہرینِ نجوم سے مناظرہ کیا اور ستاروں کے احوال اور تاثیر کے حوالے سے ان کے فاسد نظریے کا فساد بیان کیا تو ریاضی میں مناظرہ کرتے وقت بحث کو خلط ملط کر دیا۔

انھوں نے کہا: جوازاً یہ کہنا درست ہے کہ وہ مربع یا مسدس ہو، مگر انھوں نے اس کے گول ہونے کی نفی نہیں کی، لیکن اس کے متضاد کو عقلاً جائز کہا۔ میں نہیں جانتا کہ کسی جاہل کے سوا، جس کی کوئی اہمیت نہیں، کسی نے بھی یقینی انداز میں اس کو غیر دائری کہا ہو۔ اس کے دلائل درج ذیل ہیں، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ﴿٣٣﴾ ﴾ [الأنبياء: ٣٣]

''اور وہی ہے جس نے رات اور دن اور سورج اور چاند پیدا کیے، سب ایک ایک دائرے میں تیر رہے ہیں۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝ ﴾ [یٰسٓ: ٤٠]

''نہ سورج، اس کے لائق ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات ہی دن سے پہلے آنے والی ہے اور سب ایک ایک دائرے میں تیر رہے ہیں۔''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ کا قول ہے: ''چرخے کے دمکڑے کی طرح کے دمکڑے ہیں۔'' یہ گول اور دائری ہونے میں واضح اور صریح ہے۔

لغت میں فلک گول چیز کو کہا جاتا ہے۔ جب لڑکی کے پستان گول ہو جائیں تو کہا جاتا ہے: ''تفلك ثدي الجارية'' چرخے کے دمکڑے کو بھی گول ہونے کی وجہ سے فلکہ کہا جاتا ہے۔

اہلِ تفسیر اور لغت کا اتفاق ہے کہ فلک گول ہے۔ کتاب اللہ کے معانی کا علم بھی انہی دو ذرائع سے حاصل کیا جاتا ہے۔ ایک ثقہ مفسرین سلف سے اور دوسرے عربی زبان سے جس میں قرآن نازل ہوا اور یہ عربوں کی زبان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ ﴾ [الزمر: ٥]

''وہ رات کو دن پر لپیٹتا ہے اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے۔''

(تکویر کا معنی ہے تدویر، یعنی گول کرنا) جب عمامے کو سر پر لپیٹا جائے تو کہا جاتا ہے ''کوّرت العمامة'' مستدیر (گول) کو ''کارة'' بھی کہا جاتا ہے، جو اصل میں ''کورة'' ہے۔ واؤ متحرک ماقبل مفتوح ہونے کی وجہ سے الف میں بدل گئی تو ''کورة'' سے ''کارة'' ہو گیا۔ اس کو ''کرة'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا درمیان والا کلمہ (عین کلمہ) حذف ہو گیا، جس طرح ''ثبة'' اور ''قلة'' میں کہا جاتا ہے۔

دن رات اور زمانے کے تمام حالات حرکت کے تابع ہیں۔ زمانہ مقدارِ حرکت کا نام ہے۔ حرکت متحرک جسم کے ساتھ قائم ہے، اگر جسم کے تابع حرکت کے تابع زمانہ گولائی کے ساتھ موصوف ہے تو جسم گولائی کے زیادہ لائق ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ﴾ [الملك: ٣]

''تو رحمان کی تخلیق میں کوئی فرق نہیں دیکھے گا۔''

آسمان میں اجسام (اجرام) ہی ہیں، جو متشابہ ہیں۔ اس میں کوئی اختلاف ہے نہ کوئی تفاوت، کیوں کہ جو گولائی ہے وہی جوانب ہیں، لیکن تکون، مربع، مخمس (پانچ کونوں والا) اور مسدس (چھے کونوں والا) وغیرہ کونوں اور

اضلاع میں اختلاف و تفاوت ہوتا ہے۔

سنن ابی داود میں حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے مروی مشہور حدیث میں ہے:

''ایک بدوی نے کہا: اے اللہ کے رسول! لوگ مشکل میں ہیں، مال ہلاک ہو رہا ہے، عیال بھوک کا شکار ہیں، ہمارے لیے اللہ تعالیٰ سے بارش طلب کریں، ہم آپ کو اللہ تعالیٰ کے حضور سفارش کنندہ بناتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو آپ کے حضور۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تسبیح کرنا شروع کر دی، حتی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے چہروں میں محسوس کیا جانے لگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو تباہ ہو! اللہ تعالیٰ کو کسی کے ہاں سفارش کنندہ نہیں بنایا جاتا۔ اس کی شان اس سے کہیں بلند ہے۔ اس کا عرش اس کے آسمانوں پر اس طرح ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ گنبد نما بنایا۔ وہ اس کے ساتھ (اللہ تعالیٰ کے ساتھ) اس طرح آواز نکالتا ہے، جس طرح نیا کجاوہ اس پر سوار کی وجہ سے چرچراتا ہے۔''[1]

تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ عرش آسمانوں پر گنبد کی شکل میں ہے۔ یہ بلندی اور گولائی کی طرف اشارہ ہے۔

صحیحین میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان موجود ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب تم اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال کرو تو اس سے فردوس مانگو، وہ سب سے بلند جنت اور جنت کا اوسط (درمیان سے بلند) ہے، اس کی چھت رحمان کا عرش ہے۔''[2]

اوسط (درمیان سے بلند) گول ہی میں ہوتا ہے۔ ایاس بن معاویہ کا قول ہے: آسمان زمین پر قبہ نما (گنبد نما) ہے۔ اس موضوع پر آثار اس فتوے میں نہیں سما سکتے، یہ میں نے جلدی میں لکھا ہے۔

عقل کے ساتھ محسوسات سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے، چنانچہ قطب شمالی کے قریب اور اس کے ارد گرد تنگ مدار میں گھومنے والے ستاروں کی حرکت، پھر آسمان کے وسط میں وسیع مدار میں گھومنے والے ستاروں کی حرکت نیز اول شب اور آخر شب میں ان کی حرکت پر غور کر کے اس کو محسوس و معلوم کیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح زمین پر کھڑا کوئی بھی شخص جو آفتاب کے طلوع، آسمان میں برابر ہونے اور غروب کے وقت اس کی حالت کا ملاحظہ کرتا ہے کہ وہ تینوں اوقات میں ایک ہی فاصلہ اور ایک ہی شکل میں ہوتا ہے، تو اس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ گول دائرے میں گھومتا ہے، کیوں کہ اگر مدار مربع ہوتا تو وہ برابری کے وقت اس کے زیادہ قریب ہوتا جو طلوع اور غروب کے وقت اس کے متوازی ہوتا ہے۔ اس کے دلائل متعدد ہیں۔

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧٢٦) ضعيف الجامع (٦١٣٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٣٧، ٦٩٨٧)

جو کتاب و سنت کے خلاف دعویٰ کرتا ہے وہ اس باب میں باطل ہے، اگرچہ وہ گمان کرے کہ اس کے پاس ریاضی سے دلیل ہے۔ فلکیات میں غور و فکر کرنے والوں کے ہاں ایسے مغالطے عام ہیں، جیسے: جاہلوں کی ایک جماعت کا یہ دعویٰ کہ چاند کے آخری راتوں میں پوشیدہ رہنے کے بعد طلوع ہونے کے وقت کا اندازہ سورج سے اس کے فاصلے سے لگایا جا سکتا ہے، اس کے لیے وہ قوسِ رؤیت ('Orbit' کو غروبِ آفتاب کے بعد چاند اور سورج کے درمیان دوری کو جاننے کے لیے ٹیلی سکوپ پر چاند اور افق کے زاویوں کو متعین کیا جاتا ہے جو نصف دائری زاویہ ہے) نئے چاند کا فارمولا قرار دیتے ہیں۔

یہ دعویٰ باطل ہے۔ نامور علماے شریعت چاند کی تحدید کے لیے اس کو استعمال کرنا حرام قرار دیتے ہیں۔ عقل مند ریاضی دان اس پر متفق ہیں کہ چاند کے ظہور کو ریاضی کے ذریعے یقینی طور پر متعین اور ضبط نہیں کیا جا سکتا، اسی لیے ماہرینِ ریاضیات نے اس موضوع پر گفتگو نہیں کی، بلکہ انھوں نے اس کا انکار کیا ہے۔ تقریباً متاخرین نے اس میں گفتگو کی ہے۔ یہ اللہ کے دین سے انحراف اور اس میں تبدیلی ہے، جو یہود و نصاریٰ کی گمراہی سے ملتی جلتی ہے، جن کو چاند کے ساتھ اپنی تقویم متعین کرنے کا حکم دیا گیا، لیکن انھوں نے اس کو چھوڑ کر شمسی تقویم اختیار کر لی اور قمری مہینوں کو نہ اپنایا۔

"نسیئ" (اپنی مرضی سے مہینوں کو متعین کرنا) جو عرب میں تھی اور کفر میں اضافہ ہے، جس کے ذریعے وہ لوگ گمراہ ہوئے جنھوں نے کفر کیا، ایک سال اس کو حلال کرتے، دوسرے سال حرام۔ علماے حدیث، سیرت اور تاریخ نے اس کی تفصیل ذکر کی ہے۔ صحیحین میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّا أُمَّةٌ أُمِّيَّةٌ لَا نَكْتُبُ وَلَا نَحْسِبُ، صُومُوا لِرُؤْيَتِهِ وَأَفْطِرُوا لِرُؤْيَتِهِ»[1]

"ہم امی امت ہیں، لکھنا اور حساب کرنا نہیں جانتے، یعنی اس (یعنی چاند) کو دیکھ کر روزہ رکھو اور اس کو دیکھ کر افطار کرو (یعنی عید الفطر کرو)۔"

لہٰذا جس شخص نے چاند کو جاننے کے لیے، جس کو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لیے اور حج کے لیے وقت بنایا ہے، حساب کتاب کا راستہ اپنایا، وہ دین و عقل میں فاسد ہے۔

حساب کرنے والے کا حساب اگر درست بھی ہو تو اس سے زیادہ سے زیادہ غروب کے وقت سورج اور چاند کے درمیان مسافت کو ضبط کیا جا سکتا ہے، جس کو سورج سے چاند کی دوری کہا جاتا ہے، لیکن یہ بات کہ اس حساب کتاب سے لامحالہ چاند نظر آئے گا یا نظر نہیں آئے گا، معلوم نہیں ہوتا، کیوں کہ رؤیت، زمین کی بلندی اور پستی،

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحديث (١٨١٠، ١٨١٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٨٠)

مطلع کے صاف ہونے اور ابر یا غبار آلود ہونے، بصارت کی تیزی اور کمزوری، دیر تک دیکھنے یا تھوڑی دیر دیکھنے، نظر کے درست ہونے یا غلط ہونے، بہت زیادہ دیکھنے والوں اور تھوڑے دیکھنے والوں اور چاند کے موٹا ہونے کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہے۔ کبھی وہ غروب کے وقت نظر نہیں آتا، پھر اس کے بعد اس کی سورج سے دوری بڑھ جاتی ہے تو اس کی روشنی میں اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ اس شعاع سے خلاصی پا لیتا ہے جو اس کو دیکھنے میں رکاوٹ تھی، پھر وہ نظر آ جاتا ہے۔

اسی طرح رؤیت کے لیے وہ کسی ایک زاویے پر متفق نہیں، بلکہ اس میں وہ بے حد اضطراب کا شکار ہوئے ہیں، اس کا کوئی قاعدہ نہیں ہے۔ عرف و عادت ہی اس کا مرجع و مصدر ہے اور اس کا کوئی حسابی فارمولا نہیں۔ کچھ اس دوری کو دس ڈگری سے کم قرار دیتے ہیں، کچھ زیادہ کرتے ہیں، کم اور زیادہ میں اقوال ایک دوسرے کے مدِ مقابل ہیں، جس طرح تواتر میں خبر کا یقینی علم لازم قرار دینے کی تعداد کے تعین میں اختلاف ہے۔ اس کا کوئی عددی فارمولا نہیں، کیوں کہ علم کے عدد کے ماورا بھی اسباب ہوتے ہیں، جس طرح رؤیت کے ہیں۔

یہ ساری باتیں اس وقت ہیں جب آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوں اور ہلال کی تفسیر یہ کی جائے کہ وہ آسمان میں طلوع ہوا ہے، لیکن اگر ہلال کی تفسیر یہ کی جائے کہ لوگ اس کو دیکھ لیں، اس کا ادراک کر لیں اور کھلے لفظوں میں اس کا اعلان کریں، ہر مفروضے کے لحاظ سے یہ اعتراض دور ہو جاتا ہے۔ اس میں امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ کے مذہب میں علما کے درمیان اختلاف مشہور ہے اور دوسرا قول امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ کا ہے۔ واللہ أعلم[1]

شمس و قمر کی تنصیب و تنظیم

سوال آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور شمس و قمر اور کواکب کی ترکیب کے بارے میں بتائیں، کیا یہ افلاک میں برقرار اور فکس ہیں؟ افلاک ان کے ساتھ حرکت کرتے ہیں؟ یا یہ حرکت کرتے ہیں اور افلاک ثابت اور برقرار ہیں؟ یا دونوں ہی متحرک ہیں؟ کیا افلاک ہی آسمان ہیں یا کوئی دوسری چیز ہیں؟ کیا ستارے آسمانِ دنیا کے ساتھ ہی مختص ہیں؟ کیا شمس و قمر اگر کسی ایک آسمان میں ہیں تو ان کی روشنی تمام آسمانوں کو روشن کرتی ہے؟ کیا یہ دونوں ایک آسمان سے دوسرے آسمان کی طرف منتقل ہوتے ہیں؟ کیا زمینیں سات ہیں؟ ان کے اندر بھی کوئی مخلوق ہے، یا یہ ایک دوسری کے اوپر ہیں؟ کیا آسمانوں کے کنارے کسی پہاڑ پر ہیں یا زمین آسمان میں چھلکے میں انڈے کی طرح ہے، سمندر اس کے نیچے ہے اور ہوا اس کے نیچے؟ کیا آسمانوں کے اوپر عرش کے نیچے کوئی سمندر ہے؟

[1] مجموع الفتاویٰ (٦/٥٨٦-٥٩١)

جواب الحمد لله. یہ تمام مسائل بہت زیادہ تفصیل کے محتاج ہیں جس کی ان اوراق میں گنجایش نہیں۔ ان مسائل کے بارے میں پوچھنے والا بھی متعدد علوم کی معرفت حاصل کرنے کا محتاج ہے، تاکہ اس کو اطمینان بخش جوابات دیے جا سکیں، کیوں کہ ان میں بہت زیادہ اختلاف اور طویل بحثیں ہیں، لیکن ہم اس کے حسبِ حال کچھ ذکر کرتے ہیں۔

اس کا یہ پوچھنا کہ کیا افلاک ہی آسمان ہیں یا کوئی دوسری چیز ہیں؟ تو اس میں لوگوں کے دو مشہور اقوال ہیں، لیکن جو کہتے ہیں کہ افلاک ہی آسمان ہیں وہ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں:

﴿ اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۝ وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ۝ ﴾ [نوح: ١٦،١٥]

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ کس طرح اللہ نے سات آسمانوں کو اوپر تلے پیدا فرمایا۔ اور اس نے ان میں چاند کو نور بنایا اور سورج کو چراغ بنا دیا۔''

اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ قمر (چاند) آسمانوں میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا ہے:

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝ ﴾ [الأنبياء: ٣٣]

''اور وہی ہے جس نے رات اور دن اور سورج اور چاند پیدا کیے، سب ایک ایک دائرے میں تیر رہے ہیں۔''

نیز فرمایا:

﴿ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۭ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝ ﴾ [یٰسٓ: ٤٠]

''نہ سورج، اس کے لائق ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات ہی دن سے پہلے آنے والی ہے اور سب ایک ایک دائرے میں تیر رہے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے دونوں آیات میں بتایا ہے کہ چاند فلک میں ہے، جس طرح اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ آسمانوں میں ہے، نیز اللہ تعالیٰ نے یہ بھی کہا ہے کہ جو ہم دیکھتے ہیں وہ آسمان ہیں:

﴿ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۭ مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ۭ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ۝ ﴾ [الملك: ٤،٣]

''وہ جس نے سات آسمان اوپر نیچے پیدا فرمائے۔ رحمان کے پیدا کیے ہوئے میں تو کوئی کمی بیشی نہیں دیکھے گا۔ پس نگاہ کو لوٹا، کیا تجھے کوئی کٹی پھٹی جگہ نظر آتی ہے؟ پھر بار بار نگاہ لوٹا، نظر ناکام ہو کر تیری طرف پلٹ آئے گی اور وہ تھکی ہوئی ہو گی۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ أَفَلَمْ يَنظُرُوٓا۟ إِلَى ٱلسَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنَٰهَا وَزَيَّنَّٰهَا وَمَا لَهَا مِن فُرُوجٍ ۝٦ ﴾ [ق:٦]

''تو کیا انھوں نے اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا کہ ہم نے کیسے اسے بنایا اور اسے سجایا اور اس میں کوئی درزیں نہیں ہیں۔''

اس طرح کی آیات دلالت کرتی ہیں کہ آسمان نظر آتا ہے اور جو نظر آتا ہے وہ فلک ہی ہے تو معلوم ہوا وہ دونوں ایک ہی ہیں۔

اس کی یہ بات کہ کیا چاند اور سورج فلک کے بغیر حرکت کرتے ہیں یا ان دونوں کی حرکت فلک کی حرکت کے ساتھ ہی ہوتی ہے تو اس میں بھی اختلاف ہے، لیکن جمہور کا یہ خیال ہے کہ ان دونوں کی حرکت فلک کی حرکت کے ساتھ ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ ﴿ كُلٌّ فِى فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ﴾ اس میں جو ذکر ہوا ہے کہ وہ تیرتے ہیں، یہ اس امر سے مانع نہیں کہ وہ فلک کی حرکت کے تابع ہو جس طرح رات اور دن میں ہے۔ دن اور رات کا ایک دوسرے کے پیچھے آنا ان دونوں کے غیر کی حرکت کے تابع ہے اور یہ آیت: ﴿ كُلٌّ فِى فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ﴾ دن رات اور چاند سورج کو شامل ہے، جس طرح سورت انبیا میں بیان ہوا ہے۔ اسی طرح سورت یٰسین میں ہے:

﴿ وَءَايَةٌ لَّهُمُ ٱلَّيْلُ نَسْلَخُ مِنْهُ ٱلنَّهَارَ فَإِذَا هُم مُّظْلِمُونَ ۝٣٧ وَٱلشَّمْسُ تَجْرِى لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۚ ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ ٱلْعَزِيزِ ٱلْعَلِيمِ ۝٣٨ وَٱلْقَمَرَ قَدَّرْنَٰهُ مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ كَٱلْعُرْجُونِ ٱلْقَدِيمِ ۝٣٩ لَا ٱلشَّمْسُ يَنۢبَغِى لَهَآ أَن تُدْرِكَ ٱلْقَمَرَ وَلَا ٱلَّيْلُ سَابِقُ ٱلنَّهَارِ ۚ وَكُلٌّ فِى فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ۝٤٠ ﴾ [یٰسٓ: ٣٧-٤٠]

''اور ایک نشانی ان کے لیے رات ہے، ہم اس پر سے دن کو کھینچ اتارتے ہیں تو اچانک وہ اندھیرے میں رہ جانے والے ہوتے ہیں۔ اور سورج اپنے ایک ٹھکانے کے لیے چل رہا ہے، یہ اس سب پر غالب، سب کچھ جاننے والے کا اندازہ ہے۔ اور چاند، ہم نے اس کی منزلیں مقرر کر دیں، یہاں تک کہ وہ دوبارہ پرانی (کھجور کی) ٹیڑھی ڈنڈی کی طرح ہو جاتا ہے۔ نہ سورج، اس کے لائق ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات ہی دن سے پہلے آنے والی ہے اور سب ایک ایک دائرے میں تیر رہے ہیں۔''

یہ آیت: ﴿ كُلٌّ فِى فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ﴾ دن رات اور سورج چاند کو شامل ہے، جیسے سورت انبیا میں ذکر ہوا ہے۔ جب اس نے دن اور رات کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ دونوں تیرتے ہیں اور یہ دونوں کے غیر کی حرکت کے تابع ہے، اس طرح اس نے چاند اور سورج کے بارے میں بھی بتایا ہے کہ وہ فلک کے تابع تیرتے ہیں۔ اس کی کئی دلیلیں ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

ستاروں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ وہ آسمانِ دنیا کی زینت ہیں، ارشاد ہے:

﴿ اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ِ الْكَوَاكِبِ ﴾ [الصافات: ٦]

''بے شک ہم نے ہی آسمانِ دنیا کو ایک انوکھی زینت کے ساتھ آراستہ کیا، جو ستارے ہیں۔''

دوسری جگہ فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ ﴾ [الملك: ٥]

''اور بلاشبہہ یقیناً ہم نے قریب کے آسمان کو چراغوں کے ساتھ زینت بخشی۔''

جس نے کہا ہے کہ افلاک آسمان کے علاوہ کوئی چیز ہیں، اور یہاں آسمانِ دنیا سے مراد آٹھواں فلک ہے جس کے بارے میں ہیئت دان کہتے ہیں کہ کواکب اس میں ثابت اور برقرار ہیں۔ انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ اوپر والے آسمان ہیں اور افلاک آسمانِ دنیا، یعنی نیچے والے آسمان ہیں، لیکن یہ نظریہ ایک کمزور بنیاد پر قائم ہے، نیز جن کو ہم دیکھتے ہیں وہ کواکب ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ﴿١٥﴾ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ﴿١٦﴾ ﴾ [التكوير: ١٥، ١٦]

''پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ان (ستاروں) کی جو پیچھے ہٹنے والے ہیں! جو چلنے والے ہیں، چھپ جانے والے ہیں۔''

خنوس کا معنی ہے چھپ جانا، یہ ان ستاروں کے مشرق سے ظاہر ہونے سے پہلے ہوتا ہے، کنوس کا معنی ہے ان کا مغرب کی جانب سے لوٹنا تو جو ان کے ظہور سے پہلے چھپتا ہے وہ ان کے غائب ہونے کے بعد مغرب کی طرف سے لوٹتا ہے۔ اور وہ ستارے اپنے ظہور کے وقت چلنے والے ہیں جو مشرق سے مغرب کی طرف چلتے ہیں۔

سورج اور چاند فلک میں ہیں، جس طرح اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے، وہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان کی طرف منتقل نہیں ہوتے۔ آسمان زمین کے ساتھ ملے ہوئے ہیں، نہ کوہ قاف پر ٹھہرے ہوئے ہیں نہ کسی اور پر، بلکہ افلاک گول ہیں، جیسے: اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے بتایا ہے اور علمائے اسلام وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ ابو الحسین بن منادی، ابو محمد بن حزم اور ابو الفرج بن جوزی وغیرہ نے افلاک کے گول ہونے پر مسلمانوں کا اجماع نقل کیا ہے۔ ﴿ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴾ کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ ''وہ چرخے کے ٹکڑے کی طرح کے ٹکڑے میں تیرتے ہیں۔'' فلک عربی زبان میں گول چیز کو کہا جاتا ہے۔ جب لڑکی کے پستان گول ہو جائیں تو کہا جاتا ہے: ''تفلك ثدي الجارية''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے سات زمینوں کو پیدا کیا۔ وہ ایک دوسری کے اوپر ہیں، جس طرح صحیح میں یہ حدیث ہے

کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ ظَلَمَ شِبْراً مِنَ الْأَرْضِ طَوَقَّهُ مِنْ سَبْعِ أَرْضِينَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ »[1]

''جس نے زمین میں ایک بالشت بھر بھی ظلم کیا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کو اس حصے کا سات زمینوں سے طوق پہنائے گا۔''

ابوبکر انباری نے اس پر اجماع نقل کیا ہے اور اس سے اہلِ سنت اور محدثین کا اجماع مراد لیا ہے۔ عرش کے نیچے سمندر ہے، جس طرح احادیث میں ذکر ہوا ہے اور تفسیرِ قرآن میں بھی ذکر ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ اس نے چھے دنوں میں آسمانوں اور زمین کو بنایا۔ اس وقت اس کا عرش پانی پر تھا۔ عرش تمام مخلوقات کے اوپر ہے، وہ جنتِ عدن کی چھت ہے جو تمام جنتوں سے اوپر ہے۔ جس طرح صحیحین میں نبی اکرم ﷺ کی یہ حدیث ہے:

''جب تم اللہ سے جنت مانگو تو فردوس مانگو وہ سب سے اوپر والی جنت ہے اور اس کی چھت رحمان کا عرش ہے۔''[2]

زمین کا زیادہ حصہ پانی میں گھرا ہوا ہے۔ ہوا پانی اور زمین کو محیط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کو مخلوق کے لیے بچھایا اور اس کو پہاڑوں کے ساتھ مضبوطی سے باندھا، تاکہ وہ نہ ہلے۔ جس طرح بحری جہاز کو، جب سمندری لہریں بہت زیادہ ہوں تو ثقیل چیزوں کے ساتھ باندھا جاتا ہے، ورنہ وہ شوریدہ سر ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ إِنَّ اللَّهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُولَا وَلَئِنْ زَالَتَا إِنْ أَمْسَكَهُمَا مِنْ أَحَدٍ مِّنْ بَعْدِهِ إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا ﴿٤١﴾ ﴾ [الفاطر: ٤١]

''بے شک اللہ ہی آسمانوں کو اور زمین کو تھامے رکھتا ہے، اس سے کہ وہ اپنی جگہ سے ہٹیں اور یقیناً اگر وہ ہٹ جائیں تو اس کے بعد کوئی ان دونوں کو نہیں تھامے گا، بے شک وہ ہمیشہ سے نہایت بردبار، بے حد بخشنے والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے علوی (بلند) اور سفلی (نیچے والی) مخلوقات کو اپنی قدرت کے ساتھ تھاما ہوا ہے، اس نے ان میں جو قوتیں اور طبیعتیں بنائی ہیں ان کی تکوین اس کی قدرت اور مشیت کے ساتھ ہوتی ہے۔[3]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣٢٠، ٣٠٢٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦١٠، ١٦١١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٣٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٩٨٧)

[3] مجموع الفتاویٰ (٦/٥٩٢-٥٩٦)

آسمان و زمین کی تخلیق پہلے ہوئی یا دن رات کی؟

سوال کیا اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو دن اور رات سے پہلے پیدا کیا یا نہیں؟

جواب الحمد للّٰہ. دن اور رات جو سورج کے ذریعے وقوع پذیر ہوتے ہیں وہ آسمانوں اور زمین کے تابع ہے۔ اس نے ان آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے سے پہلے اس رات اور اس دن کو پیدا نہیں کیا، بلکہ اس دن اور اس رات کو ان آسمانوں اور زمین کے بالتبع پیدا کیا۔ جب اللہ تعالیٰ سورج کو طلوع کرتا ہے تو دن چڑھ جاتا ہے، جب سورج غروب ہو جائے تو رات آ جاتی ہے۔ لہٰذا دن اس کے ظہور (طلوع) کے ساتھ ہوتا ہے اور رات اس کے غروب کے ساتھ تو یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ یہ دن اور رات سورج سے پہلے ہوں؟ حالانکہ سورج اور چاند آسمانوں اور زمین کے ساتھ پیدا کیے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴾ [الأنبياء:٣٣]

"اور وہی ہے جس نے رات اور دن اور سورج اور چاند پیدا کیے، سب ایک ایک دائرے میں تیر رہے ہیں۔"

نیز فرمایا:

﴿ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴾ [يٰسٓ:٤٠]

"نہ سورج، اس کے لائق ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات ہی دن سے پہلے آنے والی ہے اور سب ایک ایک دائرے میں تیر رہے ہیں۔"

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: "چرخے کے ٹکڑے کی طرح کے ٹکڑے ہیں۔"

اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ دن اور رات اور سورج اور چاند فلک میں ہیں اور فلک اکثر علما کے نزدیک آسمان ہی ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں آیات میں ذکر کیا ہے کہ سورج چاند فلک میں ہیں۔ دوسری جگہ فرمایا:

﴿ اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۝ وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ﴾ [نوح: ١٥، ١٦]

"کیا تم نے نہیں دیکھا کہ کس طرح اللہ نے سات آسمانوں کو اوپر تلے پیدا فرمایا اور اس نے ان میں چاند کو نور بنایا اور سورج کو چراغ بنا دیا۔"

تو اس نے بتایا کہ اس نے سورج اور چاند کو آسمانوں میں بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ﴾ [الأنعام: ١]

''سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اندھیروں اور روشنی کو بنایا، پھر (بھی) وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، اپنے رب کے ساتھ برابر ٹھہراتے ہیں۔''

اس نے بیان کیا کہ اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اسی نے اندھیروں اور روشنی کو پیدا کیا، یہاں جَعَلَ تصییر (بنانا) کے معنی میں ہے، کہا جاتا ہے: جَعَلَ کَذَا (صیرہ)۔

اس نے ذکر کیا کہ اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اسی نے اندھیروں اور روشنی کو بنایا، کیوں کہ اندھیرے اور روشنی سورج اور چاند ہی سے بنائے جاتے ہیں جو آسمانوں میں پیدا کیے گئے ہیں۔ اندھیرا، روشنی اور دن رات کوئی قائم بنفسہ جسم نہیں، بلکہ وہ صفت اور عرض ہے جو غیر کے ساتھ قائم ہے۔ روشنی سورج کی شعاع اور چمک ہے جو اللہ تعالیٰ ہوا اور زمین میں پھیلاتے ہیں۔

رات کے اندھیرے کے بارے میں بھی کہا گیا ہے کہ یہ بھی اسی طرح عرض ہی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ وجودی چیز ہے۔ یہ دن اور رات جو ہمارے پاس باری باری آتے ہیں، اللہ تعالیٰ ایک کو دوسرے میں داخل کرتا ہے۔ دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور رات کو دن میں اور ایک کو دوسرے کے پیچھے لاتا ہے، یہ ایک دوسرے کے پیچھے پیچھے آتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿١٩٠﴾ ﴾

[آل عمران: ۱۹۰]

''بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے اور رات اور دن کے بدلنے میں عقلوں والوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ﴾ [یٰسٓ: ۴۰]

''نہ سورج، اس کے لائق ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات ہی دن سے پہلے آنے والی ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے کہ اس نے ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے، جس سے وہ آگے نہیں بڑھتی۔ سورج کو لائق نہیں کہ وہ چاند کے پیچھے آئے اور اس کو پائے، بلکہ اس کے چلنے کا ایک راستہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے مقرر کیا ہے اور چاند کا بھی ایک راستہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے بنایا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ﴿٣٨﴾ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰی عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ ﴿٣٩﴾ لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ ﴿٤٠﴾ ﴾

[یٰسٓ: ۳۸۔۴۰]

''اور سورج اپنے ایک ٹھکانے کے لیے چل رہا ہے، یہ اس سب پر غالب، سب کچھ جاننے والے کا اندازہ ہے اور چاند، ہم نے اس کی منزلیں مقرر کر دیں، یہاں تک کہ وہ دوبارہ پرانی (کھجور کی) ٹیڑھی ڈنڈی کی طرح ہو جاتا ہے۔ نہ سورج، اس کے لائق ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات ہی دن سے پہلے آنے والی ہے اور سب ایک ایک دائرے میں تیر رہے ہیں۔''

یعنی اس طرح نہیں ہوتا کہ رات دن کو چھوڑ کر اس سے پہلے آ جائے، حتی کہ ان دونوں میں کوئی برزخ (پردہ) ہو، بلکہ وہ اس کے ساتھ متصل ہے۔ نہ رات دن سے جدا ہوتی ہے نہ دن رات سے ﴿ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴾ مقصودِ بیان یہ ہے کہ اس دن اور رات کو اللہ تعالیٰ نے ان آسمانوں اور زمین کے بالتبع بنایا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے ان آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے اور اس دن کو بنانے سے پہلے اس کا عرش پانی پر تھا، جس طرح اس نے کہا ہے:

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ ﴾ [هود: ٧]

''اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھے دنوں میں پیدا کیا اور اس کا عرش پانی پر تھا۔''

اللہ تعالیٰ نے اس پانی کے بخارات سے ان آسمانوں کو بنایا، یہی وہ دخان (دھواں) ہے جس کا اس آیت میں ذکر ہے:

﴿ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ۝ فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ ﴾ [حٰم السجدة: ١١، ١٢]

''پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ ایک دھواں تھا تو اس نے اس سے اور زمین سے کہا کہ آؤ خوشی سے یا ناخوشی سے۔ دونوں نے کہا ہم خوشی سے آ گئے تو اس نے انھیں دو دنوں میں سات آسمان پورے بنا دیا۔''

جب زمین کی مٹی پانی میں ڈوبی ہوئی تھی اور اس پانی پر یہ ہوا چلتی تھی تو اللہ تعالیٰ نے ان آسمانوں اور زمین کو چھے دنوں میں پیدا کیا۔ پھر وہ عرش پر مستوی ہوا تو یہ وہ دن تھے جن میں اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا کیا۔[1]

دن رات کے اختلاف کی توضیح اور مختلف اوقات

سوال دن اور رات کا اختلاف کیا ہے؟ کیا جو کہتا ہے کہ جب دمشق میں ظہر کا وقت ہو تو اسی وقت کسی دوسرے ملک میں رات داخل ہو رہی ہوتی ہے، اس کی یہ بات صحیح ہے کہ نہیں؟

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٦/٥٩٧-٥٩٩)

جواب الحمد لله رب العالمين. سورج کا طلوع، زوال اور غروب مغرب سے پہلے مشرق میں ہوتا ہے۔ سرزمین ہندوستان، چائنہ اور خطِ استوا پر موجود ممالک میں سورج مغرب کی سرزمین سے پہلے طلوع، زائل اور غروب ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ شام سے پہلے عراق میں اور مصر سے پہلے شام میں طلوع وغروب ہوتا ہے۔ سورج کے طلوع اور غروب میں ہر اہلِ علاقہ کا اپنا اپنا حکم ہے۔

جب کسی علاقے میں فجر طلوع ہو جائے اور فجر کا وقت داخل ہو جائے تو وہاں کے باشندوں پر نماز اور روزہ واجب ہو جاتا ہے، اگرچہ دوسروں کے ہاں ابھی وقت نہ ہوا ہو۔ قریب قریب کے علاقوں میں یہ فرق بہت تھوڑا تھوڑا ہوتا ہے، لیکن جو اقصائے مشرق اور اقصائے مغرب میں رہتا ہو تو ان دونوں کے درمیان بہت زیادہ فرق ہوتا ہے، تقریباً آدھا دن۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بتایا ہے کہ سورج چاند اور دن رات سب کے سب فلک میں تیرتے ہیں، ارشاد ہے:

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ٣٣]

''اور وہی ہے جس نے رات اور دن اور سورج اور چاند پیدا کیے، سب ایک ایک دائرے میں تیر رہے ہیں۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴾ [يٰسٓ: ٤٠]

''نہ سورج، اس کے لائق ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات ہی دن سے پہلے آنے والی ہے اور سب ایک ایک دائرے میں تیر رہے ہیں۔''

فلک دائری ہے، جس طرح کئی صحابہ تابعین اور علمائے اسلام سے منقول ہے۔ جو گول ہو وہ آہستہ آہستہ ظاہر ہوتا ہے اور اس کو جو نزدیک ہوتا ہے وہ دور والے سے پہلے دیکھ لیتا ہے۔ واللہ أعلم[1]

روح کی تفصیل اور اہلِ سنت کا موقف

سوال روح قدیم ہے یا مخلوق؟ روح کو قدیم کہنے والا بدعتی ہے یا نہیں؟ اس مسئلے میں اہلِ سنت کا موقف کیا ہے؟ اللہ کے ارشاد: ﴿ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ ﴾ [بني إسرائيل: ٨٥] سے کیا مراد ہے؟ کیا روح کی صرف ذات کے معاملے کو اللہ کے سپرد کیا گیا ہے، یا اس کی صفات کو بھی یا ذات اور صفات دونوں کو اللہ کے حوالے کیا گیا ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں۔

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٦/٦٠٠-٦٠١)

جواب الحمد للہ رب العالمین. آدمی کی روح مخلوق اور حادث (از سرِ نو پیدا کی گئی) ہے۔ اسی پر اسلافِ امت، ائمہ امت اور تمام اہلِ سنت کا اتفاق ہے۔ مشہور امام اور اپنے زمانے میں اجماع اور اختلاف کا سب سے زیادہ علم رکھنے والے فقیہ محمد بن نصر مروزی اور کئی ایک اہلِ علم نے روح کے مخلوق ہونے پر اجماع نقل کیا ہے۔

اسی طرح ابو محمد بن قتیبہ نے خلقِ ارواح پر گفتگو کرتے ہوئے "کتاب اللقط" میں لکھا ہے کہ نسم ارواح کو کہتے ہیں اور لوگوں کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ ہی نے جسم کو پیدا کیا ہے اور وہی نسمہ، یعنی روح کو پیدا کرنے والا ہے۔ ابو اسحاق بن شاقلا اپنے اس جواب میں، جو اسی مسئلے سے تعلق رکھتا ہے، کہتے ہیں: اللہ تمھارے اوپر رحم فرمائے، تم نے روح کے بارے میں پوچھا ہے کہ وہ مخلوق ہے یا غیر مخلوق۔ اللہ کی توفیق سے بہرہ مند کسی شخص کو کوئی شبہہ نہیں ہو سکتا کہ روح مخلوقات میں سے ہے۔ اس مسئلے پر اکابر علما اور مشائخ کی کئی ایک جماعتوں نے گفتگو کی ہے اور ان لوگوں کی تردید کی ہے جو روح کو غیر مخلوق کہتے ہیں۔

حافظ ابو عبداللہ بن مندہ نے "الروح و النفس" کے موضوع پر ایک بڑی کتاب لکھی ہے۔ اس میں انھوں نے بہت سے آثار و احادیث ذکر کیے ہیں۔ ان سے پہلے امام محمد بن نصر مروزی وغیرہ، شیخ ابو یعقوب خراز، ابو یعقوب نہر جوری اور قاضی ابو یعلی وغیرہ نے بھی اس مسئلے پر تحریریں لکھی ہیں۔ ائمہ کبار نے واضح الفاظ میں اس کا تذکرہ کیا ہے اور ان لوگوں پر سخت تنقید کی ہے جو یہ بات عیسیٰ علیہ السلام کی روح کے بارے میں کہتے ہیں۔ خاص طور پر ان کے علاوہ دوسرے کی روح کے بارے میں، جیسا کہ امام احمد رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "الرد علی الزنادقة والجهمية" میں ذکر کیا ہے۔ چنانچہ کتاب کی ابتدا میں وہ لکھتے ہیں:

تمام حمد و ثنا اس اللہ کے لیے ہے جس نے رسولوں کے فترہ کے زمانے میں ایسے اہلِ علم باقی رکھے جو گمراہوں کو ہدایت کی طرف دعوت دیتے ہیں، ان سے پہنچنے والی تکلیفوں پر صبر کرتے ہیں، کتاب اللہ کے ذریعے مردہ دلوں کو زندگی عطا کرتے ہیں اور نورِ الٰہی سے اندھوں کی بصارت میں اضافہ کرتے ہیں۔ ابلیس کے ہاتھوں کتنے ہلاک ہونے والوں کو انھوں نے حیاتِ تازہ دے دی، کتنے گمراہوں اور درماندہ انسانوں کو ہدایت دے دی۔ انھوں نے لوگوں پر کتنے عمدہ اثرات ڈالے ہیں اور جواب میں لوگوں نے ان پر کس قدر برے اثرات مرتب کیے ہیں۔ وہ اللہ کی کتاب سے ان غلو پسندوں کی تحریف، باطل پرستوں کی مذہب سازی اور جاہلوں کی تاویل کی نفی کرتے ہیں جو بدعت کے اولین داعی ہیں، جنھوں نے فتنے کی رسی ڈھیلی چھوڑ دی ہے، وہ اللہ کی کتاب میں اختلاف کرتے ہیں، اس کی مخالفت کرتے ہیں، بلکہ اللہ کی کتاب کی مخالفت پر متفق ہیں۔ بغیر کسی علم کے اللہ پر، اللہ کی ذات میں اور اللہ کی کتاب میں گفتگو کرتے ہیں، متشابہ کلام پر باتیں کرتے ہیں۔ جو باتیں مشتبہ ہوتی ہیں ان کو لے کر جاہل انسانوں کو فریب دیتے

ہیں۔ گمراہوں کے فتنوں سے ہم اللہ کی پناہ چاہتے ہیں۔

آگے امام احمد رحمہ اللہ نے ان مسائل پر گفتگو کی ہے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ قرآن سے متعارض ہیں۔ اسی تعلق سے آگے فرماتے ہیں: یہی حال جہم اور اس کے ہم نواؤں کا ہے۔ انھوں نے لوگوں کو قرآن اور حدیث کے متشابہات کی دعوت دی اور بہتوں کو گمراہ کیا۔ اللہ کے دشمن جہم کے بارے میں ہمیں اطلاع ملی ہے کہ وہ خراسان کے علاقے ترمذ سے تعلق رکھتا تھا، جھگڑالو تھا اور علم کلام سے شغف رکھتا تھا۔ وہ اکثر اللہ کے بارے میں ہی بات کرتا تھا۔ اس کی ملاقات چند مشرکین سے ہوئی، جن کو سمنیہ کہا جاتا تھا۔ وہ جہم کو پہچان گئے اور اس سے کہا کہ ہم تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ہماری دلیل تم پر غالب آگئی تو تمھیں ہمارے دین میں داخل ہونا پڑے گا اور اگر تمھاری دلیل ہمارے اوپر غالب آگئی تو ہم تمھارے دین میں داخل ہوجائیں گے۔

جہم سے بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا: تمھارا خیال ہے کہ کوئی معبود ہے؟ جہم نے کہا: ہاں۔ انھوں نے پوچھا: کیا تم نے اپنے معبود کو دیکھا ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ انھوں نے پوچھا: کیا تم نے اس کا کلام سنا ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ انھوں نے پوچھا: کیا اس کی کوئی بو سونگھی ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ انھوں نے پوچھا: کیا اس کا احساس پایا ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ انھوں نے پوچھا: پھر تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ معبود ہے؟ یہ سن کر جہم حیران رہ گیا اور وہ چالیس دن تک اس کشمکش و پیچ میں مبتلا رہا کہ کس کی عبادت کرے۔ پھر اسے نصاریٰ کے زندیقوں جیسی دلیل سوجھی۔ نصاریٰ کے زندیقوں کا خیال تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے اندر جو روح تھی، وہ اللہ کی روح تھی، جس کا تعلق اس کی ذات سے ہے۔ جب اللہ کچھ کرنا چاہتا ہے تو اپنی بعض مخلوق کے اندر داخل ہوجاتا ہے، پھر اسی کی زبان سے بات کرتا ہے، جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے منع کر دیتا ہے اور وہ ایسی روح ہے جو نگاہوں سے غائب ہے۔

اس طرح جب نصاریٰ کے زندیقوں جیسی دلیل جہم کے ہاتھ لگی تو اس نے سمنی سے کہا: کیا تمھارا یہ خیال نہیں ہے کہ تمھارے اندر روح ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ اس نے پوچھا: کیا تم نے اسے دیکھا ہے؟ اس نے جواب دیا: نہیں۔ اس نے پوچھا: کیا تم نے اس کا کلام سنا ہے؟ اس نے جواب میں کہا: نہیں۔ اس نے پوچھا: کیا اس کا احساس کبھی پایا ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ اس نے کہا: اللہ اسی طرح ہے، اس کا چہرہ دکھائی نہیں دیتا، اس کی آواز سنائی نہیں دیتی، اس کی کوئی بو سونگھی نہیں جاتی، وہ نگاہوں سے غائب ہے اور کسی ایک جگہ نہیں رہتا۔

امام احمد نے قرآن اور رویت باری پر کلام کرنے کے بعد آگے فرمایا: پھر جہم نے ایک خاص چیز کا دعویٰ کیا۔ اس نے کہا کہ ہمیں کتاب اللہ میں ایک ایسی آیت ملی ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ قرآن مخلوق ہے۔ ہم نے پوچھا: وہ کون سی آیت ہے؟ اس نے کہا: اللہ کا یہ قول ہے:

﴿ إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَى مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِّنْهُ ﴾

[النساء: ۱۷۱]

''نہیں ہے مسیح عیسیٰ ابن مریم مگر اللہ کا رسول اور اس کا کلمہ، جو اس نے مریم کی طرف بھیجا اور اس کی طرف سے ایک روح ہے۔''

اور یہ بات معلوم ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام مخلوق ہیں۔

ہم نے کہا کہ اللہ نے تجھے فہم قرآن کی نعمت سے محروم کر دیا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے لیے ایسے الفاظ استعمال ہوتے ہیں جو قرآن کے لیے نہیں استعمال کیے جا سکتے۔ اللہ انھیں مولود، طفل، صبی اور غلام کا نام دیتا ہے۔ ان کے بارے میں بتاتا ہے کہ وہ کھانا کھاتے اور پانی پیتے تھے۔ انھیں امر و نہی سے مخاطب کیا جاتا تھا۔ ان پر وعد و وعید کے احکام جاری ہوتے تھے۔ پھر یہ کہ وہ نوح علیہ السلام کی نسل میں سے ہیں۔ اسی طرح وہ ابراہیم علیہ السلام کی ذریت میں سے بھی ہیں، لیکن ہمارے لیے جائز نہیں ہے کہ ہم قرآن کے بارے میں وہی باتیں کہیں جو ہم عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کہتے ہیں۔ کیا تم نے کبھی سنا ہے کہ اللہ قرآن کے بارے میں وہی کہتا ہے جو وہ عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کہتا ہے۔ اللہ کے ارشاد: ﴿ إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَى مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِّنْهُ ﴾ [النساء: ۱۷۱] میں اس کلمے سے مراد جو اللہ نے مریم کی طرف القا کیا، یہ وہی ہے جو اس نے ''کُن'' کہا۔ اس طرح عیسیٰ علیہ السلام ''کُن'' کہنے سے وجود میں آئے۔ وہ خود ''کُن'' نہیں ہیں، بلکہ ''کُن'' سے پیدا ہوئے ہیں۔ ''کُن'' اللہ کا قول ہے اور ''کُن'' مخلوق نہیں ہے۔

عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں نصاریٰ اور جہمیہ نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے۔ وہ اس طرح کہ جہمیہ نے کہا: عیسیٰ علیہ السلام اللہ کی روح اور اس کا کلمہ ہیں، اور کلمہ مخلوق ہے۔ نصاریٰ نے کہا: عیسیٰ (علیہ السلام) اللہ کی ذات سے اللہ کی روح ہے اور اللہ کی ذات سے اللہ کا کلمہ ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے: ''إن هذه الخرقة من هذا الثوب'' (چیتھڑا اس کپڑے کا ہے)

ہم کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کلمے سے وجود میں آئے ہیں۔ وہ بذاتِ خود کلمہ نہیں ہیں۔ اللہ کے قول: ﴿ وَرُوحٌ مِّنْهُ ﴾ کا مطلب ہے کہ حکم الٰہی سے روح ان کے جسم میں ڈالی گئی۔ جیسے اللہ کے اس ارشاد میں ہے:

﴿ وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ ﴾ [الجاثیة: ۱۳]

''اور اس نے تمھاری خاطر جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو اپنی طرف سے مسخر کر دیا۔''

یہاں اس آیت میں ﴿ مِّنْهُ ﴾ کا مطلب ہے: اس کے حکم سے۔ روح اللہ کی تفسیر یہ ہے کہ وہ اللہ کے کلمے

کے ساتھ روح ہیں جسے اللہ نے پیدا فرمایا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے: عبد اللہ (اللہ کا بندہ) سماء اللہ (اللہ کا آسمان)۔ امام احمد رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ نصاریٰ کے زنادقہ ہی یہ کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کی روح، اللہ کی ذات سے ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے واضح کیا ہے کہ اللہ کی طرف روح کی اضافت ملک اور خلق کی اضافت ہے، جیسے تم کہتے ہو: عبد اللہ اور سماء اللہ۔ یہ اضافت صفت کی موصوف کی طرف نہیں ہے، ورنہ پھر سارے آدمیوں کی روح کا کیا ہوگا۔ امام احمد رحمہ اللہ نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ حلول پر اعتقاد رکھنے والے یہ زندیق کہا کرتے ہیں کہ اللہ جب کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہے تو اپنے بعض مخلوق کے اندر داخل ہو جاتا ہے۔

جنید کے معاصر اور اکابر مشائخ اور ائمہ سے تعلق رکھنے والے شیخ ابو سعید خراز نے ارواح کے مخلوق ہونے کے مسئلے میں اپنی تحریر فرمودہ کتاب میں کئی دلائل سے حجت پکڑی ہے۔ ان میں سے بعض یہ ہیں:

روح اگر مخلوق نہ ہوتی تو ربوبیت کا اقرار کیوں کرتی ،جس وقت وہ اشباح میں چیونٹیوں کی طرح روحوں کی شکل میں تھے، اللہ نے ان سے عہد لیتے ہوئے پوچھا تھا:

﴿ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا ﴾ [الأعراف: ۱۷۲]

''کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ وہ کہنے لگے کہ کیوں نہیں ہم گواہ ہیں (کہ تو ہمارا رب ہے)''

اللہ نے روح کو اس کے جسم کے ساتھ مخاطب کیا۔ ایسی صورت میں کیا کوئی رب بغیر مربوب کے ہو سکتا ہے؟

روح اگر مخلوق نہ ہوتی تو پھر نصاریٰ پر کوئی ملامت نہیں ہو سکتی کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کی عبادت کیوں کرتے ہیں اور نہ اس وقت ان پر کوئی الزام دھرا جا سکتا تھا جب انھوں نے ان کو اللہ کا بیٹا، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ان کو ہی اللہ کہہ دیا۔

ابو سعید خراز مزید دلیل دیتے ہیں کہ روح اگر غیر مخلوق ہوتی تو جہنم میں کیوں داخل ہوتی۔ اسی طرح اگر وہ غیر مخلوق ہوتی تو اللہ سے حجاب کیوں کرتی، وہ بدن میں غائب نہ ہوتی اور نہ ملک الموت کا اس پر کوئی قابو چلتا، اس کی کوئی صورت نہ ہوتی جسے بیان کیا جا سکے۔ روح اگر مخلوق نہ ہوتی تو نہ اس کا حساب کتاب ہوتا اور نہ اسے عذاب دیا جاتا، نہ وہ عبادت کرتی، نہ خوف کھاتی اور نہ وہ امید رکھتی۔ روح اس لیے بھی غیر مخلوق نہیں ہے کہ اہلِ ایمان کی روحیں روشن اور چمک دار ہوں گی، جب کہ کافروں کی روحیں جلے ہوئے کوئلے کی طرح سیاہ۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''شہدا کی روحیں سبز پرندوں کے پوٹوں میں ہوں گی جو جنت میں چگتے پھریں گے اور عرش کے صحن میں قیام پذیر ہوں گے۔ جب کہ کافروں کی روحیں برہوت میں ہوں گی۔''[1]

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۸۸۷) آخری جملہ: "أرواح الکفار في برھوت" صحیح مسلم میں نہیں ہے۔ یہ الفاظ مصنف عبد الرزاق (۱۱۶/۵) صحیح ابن حبان (۲۸۳/۷) میں ہیں۔

شیخ ابو یعقوب نہر جوری کہتے ہیں: یہ روحیں اللہ کے حکم سے ہیں اور مخلوق ہیں۔ اللہ نے ان کو ملکوت سے پیدا کیا ہے، جس طرح اس نے آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا تھا۔ ہر وہ بندہ جو اپنی روح کو ذاتِ الٰہی سے منسوب کرتا ہے وہ اسے معطل کر دیتا ہے اور جن لوگوں نے روحوں کو اللہ کی ذات کی طرف نسبت دی ہے، وہ حلولی ہیں اور اباحیت کی طرف جانے والے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب ہماری روحیں جسم کی کدورتوں سے صاف ہو گئیں تو ہمیں وصال حاصل ہو گیا، ہم آزاد ہو گئے، بارِ عبودیت ہم سے ساقط ہو گیا اور ہمارے لیے ہر چیز حلال ہو گئی، جیسے عورتوں سے لذت اندوزی اور مال و دولت وغیرہ۔ وہ اس امت کے زنادقہ ہیں۔ انھوں نے ان کی اور زنادقہ کی بہت سی باتیں مزید نقل کی ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ روح کے قدیم ہونے کے جو لوگ قائل ہیں ان کی دو قسمیں ہیں:

1. صابی فلاسفہ: وہ کہتے ہیں کہ روح قدیم ہے ازلی ہے، لیکن رب کی ذات سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، جیسا کہ وہ یہی بات عقول اور نفوسِ فلکیہ کے بارے میں کہتے ہیں۔ مختلف ملتوں کے جو لوگ ان میں شامل ہوئے ہیں، ان کا خیال ہے کہ روح فرشتے ہیں۔

2. اس امت کے زنادقہ اور گمراہ جو صوفیہ، متکلمین اور بدعتیوں پر مشتمل ہیں، ان کا خیال ہے کہ روحیں اللہ کی ذات سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ لوگ مقدم الذکر لوگوں سے بھی بدتر ہیں۔ انھوں نے تو آدمی کو دو حصوں میں آدھا آدھا تقسیم کر دیا۔ ایک نصف لاہوت ہے اور وہی اس کی روح ہے۔ دوسرا نصف ناسوت ہے اور وہ اس کا جسم ہے۔ یعنی اس کا آدھا حصہ رب ہے اور آدھا حصہ بندہ ہے۔

مسیح علیہ السلام کی نسبت سے یہی بات کہنے کی وجہ سے اللہ نے نصاریٰ کو کافر قرار دیا ہے، پھر اس شخص کا کیا حال ہوگا جو ہر روح کے بارے میں یہی بات کہتا ہے؟ یہاں تک کہ فرعون، ہامان اور قارون کی روح کے بارے میں بھی اس کا یہی خیال ہے۔ جب ہر پہلو سے دلیل یہ ملتی ہے کہ انسان بندہ، مخلوق اور مربوب ہے اور اللہ اس کا رب، خالق، مالک اور معبود ہے تو یہی اس بات کی بھی دلیل ہے کہ اس کی روح مخلوق ہے۔

انسان بدن اور روح دونوں سے ایک ساتھ عبارت ہے، بلکہ وہ بدن کے مقابلے میں روح سے زیادہ قریب ہے۔ بدن روح کی سواری ہے، جیسا کہ ابودرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''میرا بدن میری سواری ہے۔ اگر میں اس کے ساتھ نرمی برتوں گا تو وہ مجھے منزلِ مقصود تک پہنچا دے گا اور اگر نرمی نہیں برتوں گا تو وہ مجھے منزلِ مقصود تک نہیں پہنچائے گا۔'' ابن مندہ وغیرہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: ''قیامت کے دن ساری مخلوق جھگڑا کرے گی، یہاں تک کہ روح اور بدن کے درمیان بھی جھگڑا ہوگا۔ روح بدن سے کہے گی کہ تو نے گناہوں کے کام کیے ہیں۔ بدن روح کو جواب دے گا: تو نے ان گناہوں کا مجھے حکم دیا تھا۔ اللہ دونوں کے درمیان فیصلہ کرنے

کے لیے ایک فرشتہ بھیجے گا۔ فرشتہ کہے گا: تم دونوں کی مثال اس اپاہج اور اندھے جیسی ہے جو ایک باغ میں پہنچے۔ اپاہج نے باغ میں لٹکے ہوئے پھل دیکھ کر اندھے سے کہا: میں پھل دیکھ رہا ہوں، لیکن اس تک پہنچنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ یہ سن کر اندھے نے کہا: میں اس تک پہنچنے کی سکت رکھتا ہوں، لیکن میں اسے دیکھ نہیں سکتا۔ اپاہج نے کہا: آؤ تم مجھے اٹھاؤ، تاکہ میں پھل توڑ سکوں۔ چنانچہ اندھے نے اسے اٹھایا۔ اپاہج اسے اپنی مرضی کے مطابق اِدھر اُدھر چلاتا رہا اور اس طرح اس نے پھل توڑ لیے۔ فرشتے نے کہا: اب بتاؤ کہ دونوں میں سے سزا کسے دی جائے گی؟ روح اور بدن دونوں نے جواب دیا: دونوں کو ایک ساتھ سزا دی جائے گی۔ فرشتے نے کہا: اسی طرح تم دونوں ہو۔''

مزید یہ کہ مشہور احادیث میں نبی اکرم ﷺ سے یہ ثابت ہے کہ روحیں قبض کی جاتی ہیں، ان کو ثواب بھی ملتا ہے اور عذاب سے بھی دوچار ہوتی ہیں۔ روح سے کہا جاتا ہے: اے پاکیزہ روح جو پاکیزہ بدن میں تھی باہر آ۔ اے خبیث روح جو خبیث بدن میں تھی باہر نکل۔ پہلی روح سے کہا جاتا ہے: بشارت ہو آرام اور خوشبو دار پھولوں کی، اور دوسری سے کہا جاتا ہے: وعید ہو کھولتے ہوئے پانی اور پیپ اور اس کی ہم شکل اور کئی قسمیں۔[1] مومنوں کی روحیں آسمان کی طرف چڑھتی ہیں اور کافروں کی روحوں کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جاتے۔

صحیح مسلم میں عبداللہ بن شقیق سے روایت ہے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''مومن کی روح جب نکلتی ہے تو اسے دو فرشتے لپک لیتے ہیں اور آسمان کی طرف لے کر چڑھتے ہیں۔'' حدیث کے ایک راوی حماد نے کہا: انھوں نے اس کی خوشبو اور مشک کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: اہلِ آسمان کہتے ہیں: پاکیزہ روح ہے جو زمین سے آئی ہے، تجھ پر اور اس بدن پر جس میں تو بسیرا کرتی تھی، اللہ کی رحمتیں نازل ہوں، پھر اسے اس کے رب کے پاس لے جایا جاتا ہے، پھر اللہ فرماتا ہے: اسے آخر اجل تک لے جاؤ۔ آگے بیان کرتے ہیں کہ کافر کی روح جب نکلتی ہے۔ اس کے بعد حماد نے اس کی بدبو اور اس پر لعنت کا ذکر اپنی روایت میں کیا ہے، پھر اس سے اہلِ آسمان کہتے ہیں: خبیث روح جو زمین کی طرف سے آئی ہے۔ کہتے ہیں کہ پھر اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اسے آخری اجل تک لے جاؤ۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے خبیث روح کی بدبو کا ذکر کیا تو رومال کو اپنی ناک پر رکھ لیا۔[2]

معراج کی صحیح حدیث میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد کی روحوں کو ان کے دائیں بائیں دیکھا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب ہم بلندی پر آسمان میں پہنچے تو ایک صاحب کو دیکھا جن کے داہنے کچھ سائے تھے اور بائیں بھی کچھ سائے تھے۔ جب وہ اپنے دائیں دیکھتے تو ہنسنے لگتے اور جب بائیں دیکھتے تو رونے

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٦٢)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٧٢)

لگتے۔ انھوں نے کہا: خوش آمدید! اے صالح نبی! اے صالح بیٹے! آپ ﷺ کہتے ہیں کہ میں نے جبریل علیہ السلام سے پوچھا: یہ کون صاحب ہیں؟ جبریل علیہ السلام نے بتایا کہ یہ آدم علیہ السلام ہیں اور یہ ان کے دائیں اور بائیں جو سائے ہیں، یہ ان کی اولاد کی روحیں ہیں۔ دائیں جانب والے جنتی ہیں اور بائیں جانب والے جہنمی۔ جب وہ اپنے دائیں دیکھتے ہیں تو ہنستے ہیں اور بائیں دیکھتے ہیں تو روتے ہیں۔[1]

حدیث میں یہ بھی ثابت ہے کہ مومنوں اور شہیدوں وغیرہ کی روحیں جنت میں رہیں گی۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ ایک روایت میں کہتے ہیں کہ کافروں کی روحیں جہنم میں ہوں گی اور مومنوں کی روحیں جنت میں اور جسم دنیا میں رہیں گے۔ اللہ جسے چاہے گا عذاب دے گا اور جس پر چاہے گا اپنے کرم سے رحم فرمائے گا۔ عبداللہ بن احمد کہتے ہیں: میں نے اپنے والد سے مُردوں کی روحوں کے بارے میں سوال کیا کہ کیا وہ اپنی قبروں کے باہر میدان میں ہوتی ہیں یا پرندے کے پوٹ میں؟ یا جسموں کی طرح وہ بھی مر جاتی ہیں؟ انھوں نے جواب دیا: نبی اکرم ﷺ سے حدیث روایت کی گئی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''مومن جب مر جاتا ہے تو اس کی روح پرندے کی شکل میں جنت کے درخت سے لٹکتی رہتی ہے، یہاں تک کہ اللہ اسے حشر کے دن اس کے جسم میں لوٹا دے گا۔''[2]

عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ مومنوں کی روحیں گھاس کی طرح سبز پرندوں کے پوٹوں میں ہوں گی، جنت میں ایک دوسرے سے تعارف حاصل کریں گی اور اس کے پھل کھائیں گی۔'' مزید فرماتے ہیں کہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ شہیدوں کی روحیں سبز پرندوں کے پوٹوں میں ہوں گی، عرش سے لٹکنے والی قندیلوں میں ان کا بسیرا ہوگا۔''[3]

امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں مسروق سے روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہم نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا:

﴿ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴾

[آل عمران:١٦٩]

''اور تو ان لوگوں کو جو اللہ کے راستے میں قتل کر دیے گئے، ہرگز مردہ گمان نہ کر، بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس رزق دیے جاتے ہیں۔''

انھوں نے فرمایا: ہم نے اس بابت جب رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تو آپ نے فرمایا: ان کی روحیں سبز

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٣، ١٦٤)

[2] مسند أحمد (٣/٤٥٥، ٤٥٦، ٤٦٠) سنن النسائي، رقم الحديث (١٠٨/٤) صحيح الجامع (٢٣٦٩) السلسلة الصحيحة (٩٩٥)

[3] الآيات البينات للآلوسي (ص:٩١)

پرندوں کے پوٹوں میں ہوں گی، ان کے لیے عرش سے لٹکتی قندیلیں ہوں گی، وہ جہاں چاہیں گی جنت میں سیر و تفریح کریں گی، پھر انھی قندیلوں میں بسیرا کریں گی، اللہ ان کی طرف جھانکے گا اور پوچھے گا: کیا کسی اور چیز کی خواہش ہے؟ وہ جواب دیں گی: اب ہم کیا چاہیں، ہمیں تو جنت میں جہاں چاہیں سیر و تفریح کی اجازت ہے؟ یہی بات اللہ تعالیٰ ان سے تین بار پوچھے گا۔ جب انھیں یہ اندازہ ہوجائے گا کہ انھیں اپنی کسی خواہش کا اظہار کرنا ہی ہے تو وہ کہیں گے: اے ہمارے رب! ہم چاہتے ہیں کہ ہماری روحیں ہمارے جسموں میں لوٹا دی جائیں، یہاں تک کہ تیری راہ میں ہم دوبارہ شہید ہوں۔ جب اللہ یہ دیکھے گا کہ انھیں کوئی ضرورت نہیں ہے تو پھر وہ اپنے حال پر چھوڑ دیے جائیں گے۔"[1] اللہ نے فرمایا ہے:

﴿ يَاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ ﴿27﴾ ارْجِعِىْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿28﴾ فَادْخُلِىْ فِىْ عِبٰدِىْ ﴾

[الفجر: ۲۷-۲۹]

"اے اطمینان والی جان! اپنے رب کی طرف لوٹ آ، اس حال میں کہ تو راضی ہے، پسند کی ہوئی ہے۔ پس میرے (خاص) بندوں میں داخل ہو جا۔"

یہاں اس سے خطاب کرکے کہا ہے کہ وہ اپنے رب کی طرف لوٹ چلے، اس کے بندوں میں شامل ہو جائے اور اس کی جنت میں داخل ہوجائے۔ اس سے یہ وضاحت ہو جاتی ہے کہ روح مربوب ہے۔ یہاں نفس سے مراد روح ہے جو قبض کی جاتی ہے، اس کی صفات نوع بہ نوع ہیں، جیسا کہ ایک صحیح حدیث میں ہے، جب ایک سفر میں سارے لوگ فجر کی نماز کے وقت سوئے رہ گئے تھے تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے ہماری روحوں کو جس وقت چاہا قبض کر لیا اور جس وقت چاہا لوٹا دیا۔"[2]

ایک دوسری روایت میں ہے:

"ہمارے نفسوں کو جس وقت چاہا قبض کر لیا۔" اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ ﴾

[الزمر: ٤٢]

"اللہ جانوں کو ان کی موت کے وقت قبض کرتا ہے اور ان کو بھی جو نہیں مریں ان کی نیند میں، پھر اسے روک لیتا ہے جس پر اس نے موت کا فیصلہ کیا۔"

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٨٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٠)

موت کے وقت قبض کی جانے والی چیز روح ہے، جیسا کہ صحیح مسلم میں ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، وہ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوسلمہ کے پاس آئے، ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، آپ نے ان کو بند کیا اور فرمایا: ''جب روح قبض کی جاتی ہے تو نگاہ اس کا پیچھا کرتی ہے۔'' یہ سن کر ان کے گھر کے لوگ چیخ پڑے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنوں کے لیے دعائے خیر ہی کرو، کیوں کہ جو کچھ تم کہتے ہو فرشتے اس پر آمین کہتے ہیں پھر آپ نے دعا فرمائی: ''اے اللہ! ابوسلمہ کی مغفرت فرما، ان کے درجات بلند فرما کر انھیں ہدایت یافتہ لوگوں میں شامل کر، ان کے پسماندگان میں ان کی جان نشینی فرما، اے رب العالمین! ہمیں بھی بخش دے اور انھیں بھی، ان کی قبر کو کشادہ کر دے اور ان کے لیے اس میں روشنی پیدا فرما دے۔''[1]

امام مسلم رحمہ اللہ ہی نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم دیکھتے نہیں کہ جب انسان مر جاتا ہے تو اس کی آنکھ کھلی رہ جاتی ہے۔'' لوگوں نے عرض کی: ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسی طرح اس وقت بھی کھلی رہ جاتی ہے جب اس کی نگاہ اس کی روح کا پیچھا کرتی ہے۔''[2] آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اسے روح سے تعبیر کیا ہے اور کبھی نفس سے۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور ابن ماجہ شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم اپنے مردوں کے پاس جاؤ تو ان کی آنکھیں بند کر دو، کیوں کہ نگاہ روح کا پیچھا کرتی ہے اور بھلی بات کیا کرو، کیوں کہ گھر والے جو کچھ کہتے ہیں اس پر آمین کہا جاتا ہے۔''[3]

اس اصل حقیقت کے دلائل اور روح و نفس کا ایک ہونا اور دونوں کا باہمی اشتراک کئی پہلوؤں سے واضح ہوتا ہے، لیکن اس کی تفصیلات پیش کرنے کا یہ جواب متحمل نہیں ہے۔ میں نے دوسری جگہ پر اس سلسلے میں مفصل گفتگو کی ہے۔

مذکورہ تفصیلی گفتگو سے ظاہر ہو گیا کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ بنو آدم کی روحیں قدیم ہیں غیر مخلوق ہیں، وہ عقیدۂ حلول کا قائل سب سے بڑا بدعتی ہے۔ اس کا قول تعطیل پر جا کر ختم ہوتا ہے، بندے کو رب بنا دیتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی وہ کئی طرح کی جھوٹی اور گمراہ کن بدعات میں ملوث ہو جاتا ہے۔

جہاں تک اللہ کے اس ارشاد کا سوال ہے:

﴿ قُلِ الرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ ﴾ [بني إسرائيل: ٨٥] ''کہہ دے روح میرے رب کے حکم سے ہے۔''

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٩٠)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٩٢١)

[3] مسند أحمد (١٢٥/٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٤٥٥) السلسلة الصحيحة (١٠٩٢)

تو اس سلسلے میں ایک قول یہ ہے کہ یہاں روح سے آدمی کی روح مراد نہیں ہے، بلکہ اس سے فرشتہ مراد ہے، جیسا کہ ذیل کی ان آیات میں ہے:

﴿ يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ﴾ [النبا: ٣٨]

''جس دن روح اور فرشتے صف بنا کر کھڑے ہوں گے۔''

﴿ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ ﴾ [المعارج: ٤] ''فرشتے اور روح اس کی طرف چڑھتے ہیں۔''

﴿ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ﴾ [القدر: ٤]

''اس میں فرشتے اور روح اپنے رب کے حکم سے ہر امر کے متعلق اترتے ہیں۔''

ایک دوسرے قول کے مطابق اس سے آدمی کی روح مراد ہے اور یہ دونوں ہی اقوال مشہور ہیں۔ بہر حال خواہ آیت زیرِ بحث سے مراد دونوں طرح کی روح ہو یا کوئی ایک مراد ہوں، لیکن اس میں اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ روح غیر مخلوق ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں:

قرآن میں لفظ امر سے کبھی مصدر مراد ہوتا ہے اور کبھی مفعول، یعنی مامور بہ مراد ہوتا ہے جیسے اللہ کا یہ ارشاد ہے:

﴿ اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ﴾ [النحل: ١]

''اللہ کا حکم آ گیا، سو اس کے جلد آنے کا مطالبہ نہ کرو۔''

ایک دوسری جگہ اللہ نے فرمایا:

﴿ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَا ﴾ [الأحزاب: ٣٨]

''اور اللہ کا حکم ہمیشہ سے اندازے کے مطابق ہے، جو طے کیا ہوا ہے۔''

یہ امر کے علاوہ دوسرے الفاظ، جیسے: خلق، قدرت، رحمت اور کلمہ وغیرہ میں ہوتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ روح امرِ الٰہی کا بعض حصہ ہے، یا امرِ الٰہی کا جز ہے، یا اسی طرح کی کوئی اور بات کہی جائے جس سے یہ واضح ہوتا ہو کہ روح امرِ الٰہی کا بعض حصہ ہے تو یاد رہے یہاں لفظ امر سے صرف مامور مراد ہو گا مصدر نہیں، کیوں کہ روح عین قائم بنفسہ ہے۔ آتی ہے، جاتی ہے، ثواب پاتی ہے اور عذاب سے دوچار ہوتی ہے۔ اور مصدر میں یہ تصور نہیں پایا جاتا، یہی اسلافِ امت، ائمہ اور جمہور کا مسلک ہے۔

متکلمین میں سے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ روح عرض قائم بالجسم ہے تو ان کے نزدیک یہ أمر یأمر أمراً کا مصدر نہیں ہے۔

قرآن کو جب امر اللہ کا نام دیا جاتا ہے تو قرآن اللہ کا کلام ہے اور کلام کلم یکلم تکلیماً وکلاماً،

وتکلم تکلماً وکلاماً کا اسم مصدر ہے۔ جب مصدر کے معنی میں اس کا نام اُمر رکھا جائے تو وہ اس کے مطابق ہوگا۔ خاص طور پر اس حالت میں جب یہ بھی سامنے رہے کہ کلام کی دو قسمیں ہیں: امر اور خبر۔

جو چیزیں قائم بالذات ہیں، ان کو امر کا نام نہیں دیا جاسکتا اور نہ مفعول بہ کے معنی میں اس کو استعمال کیا جاسکتا ہے اور مفعول بہ ہی مامور بہ ہے، جس طرح مسیح کو کلمہ کا نام دیا گیا ہے، کیوں کہ وہ کلمہ سے بنائے گئے ہیں۔ یہ ٹھیک اسی طرح ہے، جس طرح مقدور کو قدرت، جنت کو رحمت اور بارش کو رحمت کہا جاتا ہے۔ اس کی مثال میں اللہ کا یہ فرمان دیکھیں:

﴿ فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ﴾ [الروم: ٥٠]

''سو اللہ کی رحمت کے نشانات کی طرف دیکھ کہ وہ کس طرح زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے۔''

اس کی دوسری مثال نبی اکرم ﷺ کی وہ حدیث ہے جسے آپ اپنے رب سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ نے جنت کے لیے فرمایا: ''تو میری رحمت ہے، میں تیرے ذریعے جس پر چاہوں گا رحم کروں گا۔''[1] آپ ﷺ کا ایک ارشاد یہ بھی ہے: ''اللہ نے جس دن رحمت کو پیدا کیا تو اس کے سو حصے کیے۔''[2] اس کی مثالیں بہت سی ہیں۔ ابو سعید خراز کا یہ جواب ہے۔ انھوں نے فرمایا: اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اللہ فرماتا ہے:

﴿ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ ﴾ [بني إسرائيل: ٨٥] ''کہہ دے روح میرے رب کے حکم سے ہے۔''

اس آیت میں روح کو اس کا امر کہا گیا ہے۔ اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ اللہ کے امر کا مطلب مامور بہ ہے جو بنانے والے کے ذریعے بنا ہے۔

اسی طرح ابن قتیبہ ''کتاب المشکل'' میں لکھتے ہیں: روح کی کئی ایک قسمیں ہیں: جسموں کی روح جسے اللہ موت کے وقت قبض کرتا ہے اور روح سے جبریل بھی مراد ہیں، جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے:

﴿ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴾ [الشعراء: ١٩٣] ''جسے امانت دار فرشتہ لے کر اترا ہے۔''

ایک دوسری جگہ اللہ کا ارشاد ہے:

﴿ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ﴾ [البقرة: ٢٥٣] ''اور ہم نے اسے پاک روح القدس کے ساتھ قوت بخشی۔''

یہاں روح القدس سے جبریل علیہ السلام مراد ہیں۔ روح کے بارے میں مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ وہ اللہ کے فرشتوں میں سے ایک بڑا فرشتہ ہیں۔ وہ تنہا کھڑے ہوں گے تو صف بن جائیں گے اور دوسرے فرشتے ایک صف میں ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٦٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٤٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٠٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٥٢، ٢٧٥٣)

﴿ وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي ﴾ [بني إسرائيل: ۸۵]

''اور وہ تجھ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہہ دے روح میرے رب کے حکم سے ہے۔''

آگے فرماتے ہیں: روح کو اللہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے، کیوں کہ وہ اس کے حکم سے یا اس کے کلمے سے وجود میں آئے ہیں۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ لفظ ''من'' لغت میں کبھی بیانِ جنس کے لیے آتا ہے جیسے اہلِ زبان کا یہ قول: ''باب من حديد'' (لوہے کا دروازہ) ہے اور کبھی ابتداے غایت کے لیے آتا ہے جیسے ان کا یہ قول: ''خرجت من مكة'' لہٰذا اللہ کا یہ ارشاد: ﴿ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي ﴾ اس مسئلے میں واضح نص نہیں ہے کہ روح امر کا بعض حصہ یا اس کی جنس سے ہے، بلکہ ابتدائے غایت کا احتمال بھی ہے جب امر کے ساتھ اس کی تکوین اور صدور ہوا ہو۔ یہ ہے امام احمد رحمہ اللہ کے اس جواب کا مطلب جو انھوں نے ''وروح منه'' کے تعلق سے دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: اللہ کے قول ﴿ وَرُوحٌ مِّنْهُ ﴾ کا مطلب ہے کہ روح اسی سے اس کے امر سے تھی، جیسے کہ اللہ کے اس ارشاد میں ہے:

﴿ وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ ﴾ [الجاثية: ۱۳]

''اور اس نے تمھاری خاطر جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو اپنی طرف سے مسخر کر دیا۔''

اس کی ایک دوسری مثال اللہ کا یہ قول بھی ہے:

﴿ وَمَا بِكُم مِّن نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ ﴾ [النحل: ۵۳]

''اور تمھارے پاس جو بھی نعمت ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے۔''

جب تمام مسخرات اور نعمتیں اللہ کی طرف سے ہیں اور وہ اللہ کی ذات کا بعض حصہ نہیں، بلکہ اس کی جانب سے صادر ہوئی ہیں تو ضروری نہیں کہ مسیح علیہ السلام سے متعلق اس کے قول: ﴿ وَرُوحٌ مِّنْهُ ﴾ کا یہ معنی ہو کہ روح اللہ کی ذات کا بعض حصہ ہے۔ یہ بات تو معلوم ہی ہے کہ اللہ کا قول: ﴿ وَرُوحٌ مِّنْهُ ﴾ اس کے قول: ﴿ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي ﴾ سے زیادہ بلیغ ہے۔ جب اللہ کا قول: ﴿ وَرُوحٌ مِّنْهُ ﴾ عیسیٰ علیہ السلام کے مخلوق ہونے سے مانع نہیں ہے اور نہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ اللہ کی ذات کا بعض حصہ ہوں تو اس کا قول: ﴿ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي ﴾ بدرجہ اولی ان کے مخلوق ہونے سے مانع نہیں ہوگا اور نہ یہ ضروری ہوگا کہ ان کو اللہ کی ذات کا بعض حصہ، بلکہ اس کے امر کا بعض حصہ تسلیم کیا جائے۔

یہ صورت اس وقت ہوگی جب امر سے مراد وہ امر ہو جو اللہ کی صفات میں سے ایک صفت ہو۔ اس کے لیے یہ دونوں جوابات مستقل حیثیت کے حامل ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں کا ایک مشترک جواب دیا جائے اور یہ کہا

جائے کہ اللہ کے قول: ﴿ الرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ ﴾ میں امر سے مراد مامور بہ لیا جائے یا اس سے اللہ کی صفت مراد لی جائے۔ اگر اول مراد لیا جائے تو ممکن ہے کہ روح بعض حکمِ الٰہی کا حصہ ہو، ایسی صورت میں وہ مخلوق ہوگا، لیکن اگر امر سے صفتِ الٰہی مراد ہو تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ﴿ الرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ ﴾ اللہ کے دوسرے ارشادات: ﴿ وَ رُوۡحٌ مِّنۡهُ ﴾ اور ﴿ جَمِیۡعًا مِّنۡهُ ﴾ کی طرح ہوگا۔

یہ شبہہ اس وجہ سے پیدا ہوا کہ گمان کرنے والے نے یہ گمان کیا کہ امر اللہ کی قدیم صفت ہے اور بنی آدم کی روح اسی صفت کا بعض حصہ ہے، لیکن آیت ان دونوں مقدمات میں سے ایک پر بھی دلالت نہیں کرتی ہے۔ واللہ سبحانہ أعلم.

لفظِ روح قرآن میں دوسرے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد:

﴿ وَكَذٰلِكَ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ رُوۡحًا مِّنۡ اَمۡرِنَا ﴾ [الشوریٰ: ٥٢]

''اور اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے ایک روح کی وحی کی۔''

اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد:

﴿ كَتَبَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمُ الۡاِيۡمَانَ وَاَيَّدَهُمۡ بِرُوۡحٍ مِّنۡهُ ﴾ [المجادلة: ٢٢]

''جن کے دلوں میں اس نے ایمان لکھ دیا ہے اور انھیں اپنی روح کے ساتھ قوت بخشی ہے۔''

اس کے علاوہ بھی اس مفہوم کی آیات ہیں۔ جو قرآن اللہ نے نازل کیا ہے وہ اس کا کلام ہے، لیکن اس معنی میں نہیں جس سے سوال متعلق ہے۔

سائل کا یہ سوال کہ روح کی ذات یا صفات یا دونوں علمِ الٰہی کے حوالے کی گئی ہیں تو اس سلسلے میں معلوم رہے کہ یہ روح پر کلام کی خصوصیات میں سے نہیں ہے، بلکہ کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ اس چیز کے پیچھے لگے، جس کا اسے علم نہ ہو اور نہ اللہ کی طرف کوئی ایسی بات منسوب کرے جس کا اسے علم نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَلَا تَقۡفُ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ ؕ اِنَّ السَّمۡعَ وَالۡبَصَرَ وَالۡفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۤئِكَ كَانَ عَنۡهُ مَسۡئُوۡلًا ﴾

[بني إسرائيل: ٣٦]

''اور اس چیز کا پیچھا نہ کر جس کا تجھے کوئی علم نہیں۔ بے شک کان اور آنکھ اور دل، ان میں سے ہر ایک، اس کے متعلق سوال ہوگا۔''

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ [الأعراف: ٣٣]

''کہہ دے میرے رب نے تو صرف بے حیائیوں کو حرام کیا ہے، جو ان میں سے ظاہر ہیں اور جو چھپی ہوئی ہیں اور گناہ کو اور ناحق زیادتی کو اور یہ کہ تم اللہ کے ساتھ اسے شریک ٹھہراؤ جس کی اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور یہ کہ تم اللہ پر وہ کہو جو تم نہیں جانتے۔''

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اَلَمْ یُؤْخَذْ عَلَیْهِمْ مِّیْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا یَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ﴾ [الأعراف: ١٦٩]

''کیا ان پر کتاب کا عہد نہیں لیا گیا کہ اللہ پر حق کے سوا کچھ نہیں کہیں گے۔''

اللہ تعالیٰ کے استفسار پر فرشتوں نے کہا تھا:

﴿اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۝۳۱ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَاؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ﴾ [البقرة: ٣٢]

''مجھے ان کے نام بتاؤ، اگر تم سچے ہو۔ انھوں نے کہا: تو پاک ہے، ہمیں کچھ علم نہیں مگر جو تو نے ہمیں سکھایا، بے شک تو ہی سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے۔''

موسیٰ علیہ السلام نے خضر سے کہا:

﴿هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰۤی اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا﴾ [الكهف: ٦٦]

''کیا میں تیرے پیچھے چلوں؟ اس (شرط) پر کہ تجھے جو کچھ سکھایا گیا ہے اس میں سے کچھ بھلائی مجھے سکھا دے۔''

جب چھوٹی چڑیا نے سمندر میں چونچ ماری تو خضر نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا: میرے اور آپ کے علم نے اللہ کے علم میں سے اتنا بھی کم نہیں کیا ہے جتنا اس چڑیا نے سمندر کے پانی کو کم کیا ہے۔

کتاب و سنت میں ایسی کوئی دلیل نہیں ہے کہ مسلمانوں کو کتاب و سنت میں جتنا کچھ ثابت ہے، اس کے مطابق روح پر گفتگو کرنے سے منع کیا گیا ہے، نہ اس کی ذات کے بارے میں اور نہ اس کی صفات کے بارے میں، لیکن کسی چیز پر بغیر علم کے گفتگو کرنا حرام ہے۔ البتہ صحیحین میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینے کی بعض گلیوں سے گزر رہے تھے۔ بعض لوگوں نے کہا: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روح کے بارے میں پوچھو۔ بعض حضرات نے کہا: مت پوچھو ورنہ ایسی باتیں سنو گے جو تمھیں ناپسند ہوں گی۔ راوی کہتے ہیں کہ لوگوں نے آپ سے

پوچھا اس وقت آپ کھجور کی ایک ٹہنی سے ٹیک لگائے ہوئے تھے۔اس کے بعد ہی اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

اس سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ رب کی بادشاہت عظیم ہے، اس کی فوج، فوج کی صفت، اس کی قدرت اتنی عظیم ہے کہ آدمی اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ انھیں بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔کوئی مدعی علم اپنے ذہن میں یہ خیال بھی نہ لائے کہ جو کچھ اس سے پوچھا جائے گا اس کا علم اس کے لیے ممکن ہے اور نہ دنیا میں تمام موجودات کے بارے میں علم ہونا اس کے لیے ممکن ہے۔اپنی فوج کا صحیح علم اللہ ہی کے پاس ہے۔[1]

مومن کی روح کا آسمانِ الٰہی پر چڑھایا جانا

سوال کیا یہ بات درست ہے کہ مومن کی روح جب فرشتے قبض کرتے ہیں تو اسے لے کر چڑھتے ہوئے اس آسمان تک لے جاتے ہیں جہاں اللہ ہے؟

جواب جس حدیث میں مومن کی روح قبض کرنے اور اسے لے کر اس آسمان تک چڑھنے کا ذکر ہے جس میں اللہ تعالیٰ ہے، وہ معروف حدیث ہے اور اس کی سند جید ہے،[2] لیکن آپ ﷺ کا یہ قول « فیھا اللّٰہ »''جس میں اللہ ہے۔'' اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرح ہے:

﴿ ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِيَ تَمُوْرُ ۝ اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا فَسَتَعْلَمُوْنَ كَيْفَ نَذِيْرِ ﴾ [الملك: ١٦، ١٧]

''کیا تم اس سے بے خوف ہو گئے ہو جو آسمان میں ہے کہ وہ تمھیں زمین میں دھنسا دے، تو اچانک وہ حرکت کرنے لگے؟ یا تم اس سے بے خوف ہو گئے ہو جو آسمان میں ہے کہ وہ تم پر پتھراؤ والی آندھی بھیج دے، پھر عنقریب تم جان لو گے کہ میرا ڈرانا کیسا ہے۔''

اس صحیح اور ثابت کی طرح ہے جس میں نبی اکرم ﷺ نے حضرت معاویہ بن حکم کی لونڈی سے پوچھا تھا کہ اللہ کہاں ہے؟ اس نے جواب دیا تھا کہ آسمان میں ہے۔آپ ﷺ نے اس سے یہ بھی پوچھا کہ ''میں کون ہوں۔'' تو اس نے جواب دیا: ''آپ اللہ کے رسول ہیں۔'' اس کا جواب سن کر آپ ﷺ نے فرمایا: ''اسے آزاد کردو، یہ مومنہ ہے۔''[3]

ان نصوص سے یہ مراد نہیں ہے کہ آسمان رب کا احاطہ کیے ہوئے ہے یا اپنے اندر اسے سموئے ہوئے ہے، جس طرح وہ سورج چاند اور دوسرے اجرامِ سماویہ کو سموئے ہوئے ہے۔ یہ بات کوئی بھی مسلمان نہیں کہتا اور نہ کسی

---

[1] مجموع الفتاوىٰ (٤/٢١٦-٢٣١)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٦٢) صحيح الجامع (١٩٦٨)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٣٧)

صاحب عقل کا یہ عقیدہ ہو سکتا ہے، کیوں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ﴾ [البقرۃ: ۲۵۵]

''اس کی کرسی آسمانوں اور زمین سمائے ہوئے ہے۔''

کرسی میں آسمان اس انگوٹھی کی طرح ہے جو وسیع بیابان میں پڑی ہو اور کرسی عرش میں اس انگوٹھی کی طرح ہے جسے وسیع بیابان میں ڈال دیا گیا ہو۔ رب سبحانہ وتعالیٰ اپنے آسمانوں کے اوپر اپنے عرش پر ہے۔ اپنی مخلوق سے الگ ہے۔ اس کی مخلوقات میں اس کی ذات جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔ اسی طرح اس کی ذات میں اس کی مخلوق جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ﴾ [طٰہٰ: ۷۱]

''اور ضرور ہر صورت تمھیں کھجور کے تنوں پر بری طرح سولی دوں گا۔''

ایک دوسری جگہ فرمایا:

﴿ فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ ﴾ [التوبۃ: ۲] ''تم اس سرزمین میں چلو۔''

ایک تیسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ﴾ [المائدۃ: ۲۶] ''زمین میں سر مارتے پھریں گے۔''

ان آیات کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ کھجور کے تنوں کے اندر اور زمین کے پیٹ میں ہیں۔ اسی طرح اللہ کے آسمان میں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ آسمانوں کے اوپر ہے اور اپنی مخلوقات سے الگ ہے، جیسا کہ اس نے خود اپنی ذات کے متعلق اپنی کتاب میں بتایا ہے کہ اس نے آسمانوں اور زمین کو چھے دنوں میں پیدا کیا اور پھر عرش پر مستوی ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَيَّ ﴾ [آل عمران: ۵۵]

اے عیسیٰ! بے شک میں تجھے قبض کرنے والا ہوں اور تجھے اپنی طرف اٹھانے والا ہوں۔''

ایک دوسری جگہ کہتا ہے:

﴿ تَعْرُجُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ ﴾ [المعارج: ٤] ''فرشتے اور روح اس کی طرف چڑھتے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے ایک اور جگہ فرمایا:

﴿ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ﴾ [النساء: ۱۵۸] ''بلکہ اللہ نے اسے اپنی طرف اٹھا لیا۔''

کتاب وسنت میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ اس سوال کا جواب دوسری جگہ تفصیل سے دیکھا جا سکتا ہے۔[1]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۷۱/٤ـ۲۷۲)

عقل، روح، نفس کی حقیقت اور جسم میں مقام

سوال کیا انسان کی عقل عرض ہے؟ جسم کی تدبیر کرنے والی روح کیا ہے؟ کیا نفس سے مراد یہی روح ہے؟ کیا اس کی کوئی کیفیت معلوم ہے؟ یہ عرض ہے یا جوہر؟ اور کیا جسم میں روح اور عقل کا مسکن معلوم ہے؟

جواب الحمد لله رب العالمين.

عقل اللہ تعالیٰ کی کتاب، رسول اللہ ﷺ کی سنت، صحابہ کرام، تابعینِ عظام اور تمام ائمہ کے کلام میں ایک ایسی چیز ہے جو عاقل کے ساتھ قائم ہوتی ہے، خواہ اسے عرض کہا جائے یا صفت، وہ کوئی بذاتہ قائم چیز اور ذات نہیں، اسے جوہر کہیں یا جسم یا کچھ اور۔

عقل اور نفس کے بارے میں گفتگو کرنے والے فلاسفہ کے ایک گروہ کے مطابق اس عاقل ذات کو جو قائم بنفسہ جوہر ہو، عقل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہ عقولِ عشرہ یعنی دس عقلوں کا دعویٰ کرتے ہیں۔ جیسا کہ ارسطو وغیرہ کے پیروکار، مشائی فلاسفہ اور ان سے اخذ کرنے والے مختلف مذاہب کی طرف منسوب لوگوں سے نقل کیا جاتا ہے۔

کسی دوسری جگہ ان کے نظریات پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے اور بیان ہوا کہ عقل، نفوس، مجردات، مفارقات اور جواہرِ عقلیہ کے ان کے نظریے سے صرف نفسِ انسان اور اس کے ساتھ قائم علوم اور دیگر توابع ہی ثابت ہوتے ہیں، ان امور کو مفارقات کا نام دینا موت کے ساتھ نفس کے بدن کو داغِ مفارقت دینے سے ماخوذ ہے۔ یہ بات صحیح ہے۔ میت کا نفس موت کے ساتھ اس کے بدن کو چھوڑ جاتا ہے۔ یہ بات اس نظریے پر مبنی ہے کہ نفس قائم بنفسہ ہے اور موت کے بعد بدن کو چھوڑ دینے کے بعد نعمت میں رہتا ہے یا عذاب میں۔ یہ مسلمان اور دیگر آسمانی مذاہب کے پیروکاروں کا مذہب ہے۔ صحابہ کرام، تابعینِ عظام اور تمام ائمہ اسلام کا مذہب بھی یہی ہے۔ گو بہت سے متکلمین یہ خیال کرتے ہیں کہ نفس سے مراد وہ زندگی ہے جو بدن کے ساتھ قائم ہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ یہ جسم میں پھرنے والی ہوا، بادل سے نکلنے والی بھاپ کی طرح کا کوئی جزوِ بدن ہے۔

تاہم وہ نفس جو موت کے ساتھ بدن کو چھوڑ جاتا ہے وہ سلف صالحین کے نزدیک بدن کا کوئی جزو ہے نہ اس کی کوئی صفت۔ یہ دونوں باتیں جہمیہ اور معتزلہ جیسے بدعتی کہتے ہیں۔ مشائی فلاسفہ کا نظریہ ہے کہ نفس بدن سے جدا ہونے کے بعد بھی باقی رہتا ہے، لیکن وہ نفس کے ساتھ ایسی صفات جوڑتے ہیں جو باطل ہیں۔ ان کے نزدیک نفس بدن کو چھوڑنے کے بعد عقل بن جاتا ہے۔ ان کے نزدیک مادہ جسم ہے اور مادے اور مادے کے متعلقہ امور سے خالی چیز کا نام عقل ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہتے ہیں کہ نفس ہیولیٰ سے جدا اور مجرد چیز ہے اور ہیولیٰ ان کی زبان میں ظرف اور محل کو کہا جاتا ہے، یعنی مادہ اور شکل کا مجموعہ۔

ان کے نزدیک عقل قائم بنفسہ جوہر ہے، اس میں حرکت ہوتی ہے نہ سکون اور نہ اس کے حالات میں کسی طرح کی تبدیلی اور تجدد ہی ہوتا ہے۔

ان کے اس نظریے کا یہ مطلب ہے کہ نفس جب بدن سے جدا ہو جاتا ہے تو اس کے حالات میں علوم، تصورات، سماعت، بصارت، ارادہ اور غمی خوشی جیسے تجدد پذیر حالات میں سے کوئی حالت بھی وارد نہیں ہوتی، بلکہ عقل اور نفس ازلی اور ابدی طور پر ایک ہی حالت میں باقی رہتے ہیں۔

ان میں سے کچھ کا یہ نظریہ ہے کہ نفوس ذات کے اعتبار سے ایک ہی ہیں۔ کچھ دوسرے کہتے ہیں کہ یہ ایک نہیں، بلکہ متعدد ہیں۔ تاہم ان کے نظریات میں کئی باطل اور غلط باتیں ہیں، جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ یہاں صرف موقعے کی مناسبت سے یہ بیان کرنا مقصود تھا کہ فلاسفہ اور متکلمین مادہ، یعنی ہیولیٰ، یعنی جسم سے جو چیز ملتی ہے اور اس کو حیات بخشتی ہے اس کو اس نفس کی طرح نفس کہتے ہیں جو انسان کے بدن کی تدبیر و انتظام کرتا ہے۔ پھر آگے چل کر یہ دعوی کرتے ہیں کہ فلک، یعنی آسمانوں کا بھی ایک نفس ہوتا ہے، جو ان کو اسی طرح حرکت دیتا ہے جس طرح لوگوں کے نفوس ان کو حرکت دیتے ہیں، لیکن قدیم فلاسفہ کہا کرتے تھے: فلک کا نفس عرض ہے جو چوپائیوں کے نفوس کی طرح اس کے ساتھ قائم ہے جس طرح انسان کے ساتھ شہوت اور غصہ قائم ہے، لیکن ابن سینا وغیرہ کا نظریہ تھا کہ فلکی نفس انسانی نفس کی طرح قائم بنفسہ جوہر ہے۔ تو چونکہ انسان کا نفس اس کے بدن کی تدبیر کرتا ہے اس لیے اس کو نفس کہتے ہیں اور جب وہ بدن سے جدا ہو جائے تو اس وقت اس کو عقل کہتے ہیں، کیوں کہ عقل مادے اور مادے کے متعلقات سے مجرد اور خالی ہونے کا نام ہے۔

وہ ان چیزوں کو مجردات اس بنا پر کہتے ہیں کہ انسان کلی عقلی امور کو مخصوص حسی امور سے جدا اور علاحدہ کرتا ہے، مثلاً: وہ جب زید اور عمرو وغیرہ کی طرح کے انسانی افراد کو دیکھتا ہے تو اپنے دل میں انسانوں اور انسانیت کے درمیان کلی مشترک اور معقول امور میں قدرِ مشترک دیکھتا ہے۔ جب گھوڑوں، گدھوں، خچروں اور دیگر چار پائیوں وغیرہ کے حیوانی افراد کو دیکھتا ہے تو ان میں حیوانیت کی ایک کلی قدرِ مشترک دیکھتا ہے۔ جب حیوان کے ساتھ درختوں اور نباتات کو دیکھتا ہے تو ان میں غذا سے بڑھنے والے جسم کی کلی قدرِ مشترک سمجھ جاتا ہے (وہ نباتات میں پائی جانے والی حیات کو نباتاتی نفس کہتے ہیں)

اسی طرح جب تمام فلکی اجسام بالا اور سفلی عناصر کو دیکھتا ہے تو ان میں عام اور مطلق جسم کی کلی قدرِ مشترک پاتا ہے، پھر اس سے آگے بڑھ کر جب وہ دیگر موجودات کو دیکھتا ہے تو ان میں عام اور کلی وجود کی کلی قدرِ مشترک پاتا ہے اور یہ کلی وجود عام جوہر اور عرض میں تقسیم ہوتا ہے۔ یہ وجود فلاسفہ کے نزدیک وجود اور اس کے متعلقات میں دیکھنے اور غور کرنے والے ''اعلیٰ علم'' کا موضوع ہے اور یہی ان کے نزدیک ''پہلا فلسفہ'' اور ''بلند ترین حکمت'' ہے۔

فلاسفہ وجود کو جوہر اور عرض میں تقسیم کرتے ہیں۔ اعراض کی نو اقسام ہیں۔ یہ ارسطو اور اس کے پیروکاروں کا نظریہ ہے۔ ان اعراض کو وہ جملہ علم منطق سے قرار دیتے ہیں، کیوں کہ ان میں وہ مفردات بھی شامل ہیں جن سے مرکب حدود بنتی ہیں۔ ابن حزم وغیرہ کا نظریہ بھی یہی ہے۔

ابن سینا اور اس کے پیروکاروں کا کہنا ہے کہ ''اس باب میں کلام منطق کے ساتھ مخصوص نہیں۔''

اسی طرح ابن سینا کے پیروکاروں میں ابو حامد غزالی، سہروردی، رازی اور آمدی وغیرہ نے بھی ان اعراض کو منطق سے خارج کیا ہے۔ ارسطو کے وہ دس مقولات (کسی چیز کو جاننے کے لیے دس صفات اور کیٹگریز) درج ذیل ہیں: جوہر، کمیت، کیفیت، مکان، زمان، اضافت، حالت، ملکیت، فعل (کرنا) انفعال (متاثر ہوتا)۔ (ان میں پہلا جوہر ہے، باقی نو اعراض وصفات ہیں۔)

یہ دس مقولات درج ذیل دو اشعار میں بیان ہوئے ہیں ع

زيد الطويل الأسود بن مالك   في داره بالأمس كان متكأ

في يده سيف نضاه فانتضا   فهذه عشر مقولات سواء

''لمبا زید اسود بن مالک، کل اپنے گھر میں ٹیک لگائے ہوئے تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تلوار تھی۔ اس نے اس کو چمکایا تو وہ چمک گئی۔ پس یہ رہے پورے دس مقولات۔''

زيد (جوہر) الطويل (کمیت) ابن مالك (اضافت) في داره (مکان) بالأمس (زمان) كان متكئا (حالت) في يده (ملکیت) نضاه (فعل) انتضا (انفعال) الأسود (کیفیت)۔

اکثر لوگوں نے ان اعراض کے نو اجناس میں محصور ہونے سے انکار کیا ہے۔ ان کے مطابق اس کی کوئی دلیل نہیں۔ ان کے نزدیک ان کو تین یا دیگر اعداد میں محصور کرنا ممکن ہے۔

انھوں نے جواہر کی پانچ اقسام بنائی ہیں: ① جسم۔ ② عقل۔ ③ نفس۔ ④ مادہ۔ ⑤ شکل۔

جسم حسی اور مادی جوہر ہے۔ باقی عقلی جواہر ہیں۔ لیکن وہ عقلی جواہر کو ثابت کرنے کی جو دلیل ذکر کرتے ہیں وہ محض ذہنوں میں ان کے وجود پر دلالت کرتی ہے، خارج اور اعیان میں نہیں۔

ان چیزوں کو وہ عقلی مجردات کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک جواہر کی دو اقسام ہیں: مادی جواہر اور مجرد جواہر۔ مادی جواہر مادے کے ساتھ قائم ہوتے ہیں، اسی کو ہیولیٰ کہا جاتا ہے اور یہی جسم ہوتا ہے۔ مجردات وہ چیزیں ہیں جو مادے سے خالی اور مجرد ہوتی ہیں۔

یہ چیزیں جن کو یہ مجردات کہتے ہیں، یہ حقیقت میں وہ کلی اور معقول امور ہیں جو انسان کے نفس میں اور اس

کی عقل کی گرفت میں آتے ہیں۔ مفارقات کی حقیقت نفس کا بدن کو چھوڑ دینا ہے۔ یہ دونوں باتیں قابلِ انکار نہیں، لیکن یہ فلاسفہ نفس کی صفات اور اس کے حالات میں ایسے امور کا دعویٰ کرتے ہیں جو بے سروپا اور باطل ہیں۔

انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ عقلی جواہر اپنی ذاتوں کے ساتھ قائم ہیں۔ ان کے مطابق عاقل (سمجھنے والا) معقول (سمجھی گئی چیز) اور عقل (سمجھ) یہ تینوں ایک ہی چیز ہیں۔ رب العالمین کے بارے میں بھی وہ یہی کہتے ہیں: وہ عاقل معقول اور عقل ہے، عاشق، معشوق اور عشق ہے اور لذیذ، لذت اٹھانے والا اور لذت ہے۔

وہ صفت کو موصوف کا عین اور ذات قرار دیتے ہیں اور ہر صفت ہی کو دوسری صفت قرار دیتے ہیں (علاحدہ سے نہیں) لہٰذا نفسِ عقل کو (جو علم ہے) نفسِ عاقل (جو عالم ہے) قرار دیتے ہیں، نفسِ عشق (محبت) کو نفسِ عاشق (محبّ) قرار دیتے یں، پھر نفسِ لذت کو نفسِ علم اور نفسِ محبت قرار دیتے ہیں۔ قدرت اور ارادے کو نفسِ علم کہتے ہیں، علم کو قدرت، ارادہ، محبت اور لذت قرار دیتے ہیں۔

ان کے نزدیک عالم، ارادہ کرنے والا، لذت اٹھانے والا اور علم، ارادہ اور لذت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ وہ متنوع اور مختلف حقائق کو ایک ہی چیز قرار دیتے ہیں، متنوع صفات اور ان سے موصوف ذات کو ایک ہی چیز کہتے ہیں۔ اس کے بعد جب علم کی باری آتی ہے تو کہتے ہیں کہ وہ ذات نہیں۔ اس طرح ان کے نظریے میں تضاد پایا جاتا ہے۔ ابن سینا کے ''اشارات'' میں بھی تضاد پایا جاتا ہے۔ ابن سینا ہی نہیں، بلکہ دیگر محققین فلاسفہ کی باتوں میں تضادِ موجود ہے اور کسی دوسری جگہ بڑی تفصیل کے ساتھ ان کی تردید کی گئی ہے۔

یہاں یہ بات بیان کرنا مقصود ہے کہ وہ لفظ عقل سے قائم بنفسہ جوہر مراد لیتے ہیں، پھر عقلی جواہر ثابت کرتے ہیں اور ان کو مفارقات اور مجرداتِ مادہ کہتے ہیں، لیکن جب ان کی بات کی تحقیق کی جائے تو اس سے انسان کے اس نفس کے علاوہ کوئی اور چیز ثابت نہیں ہوتی جس کو یہ ناطق کہتے ہیں اور نہ اس عقل کے علاوہ کوئی عقل ہی ثابت ہوتی ہے جو انسان کے ساتھ قائم ہے۔

ارسطو اور اس کے پیروکار ''رب'' کو جوہر اور عقل کہتے ہیں، جو ان کے نزدیک اپنے علاوہ کسی چیز کو نہیں جانتا، کسی چیز کا ارادہ نہیں کرتا اور کوئی کام نہیں کرتا۔ وہ اس کو ''مبدا اول'' اور ''علتِ اولیٰ'' بھی کہتے ہیں، کیوں کہ ان کے نزدیک فلک اس کے ساتھ مشابہ ہونے کی وجہ سے یا عقل کے ساتھ مشابہت رکھنے کی وجہ سے متحرک ہے۔ ان کے نزدیک فلک کو حرکت کے لیے علتِ اولیٰ کی اتنی ہی اور اسی طرح ضرورت ہے جس طرح مقتدی کو امام کی اور شاگرد کو استاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ چلتا رہتا ہے یا علتِ اولیٰ نے اس طرح فلکِ اول کو حرکت دے دی ہے جس طرح معشوق اپنے عاشق کو حرکت دے دیتا ہے۔ ان کے نزدیک رب تعالیٰ نے کوئی چیز ایجاد کی ہے نہ کوئی کام کیا ہے۔ وہ اس کو واجب الوجود نہیں کہتے تھے اور نہ وجود کو واجب اور ممکن میں تقسیم کرتے تھے۔ وہ ممکن ہی کو قدیم

اور ازلی موجود کہتے تھے۔ جس طرح ان کے نزدیک فلک تھا، یعنی قدیم اور ازلی۔

لیکن ابن سینا اور اس کے پیروکاروں نے اپنے پیش رو فلاسفہ اور تمام حکما کی مخالفت کی اور خود اپنی بھی مخالفت کی اور تضاد بیانی کا شکار ہو گئے۔

انھوں نے بھی صاف صاف وہی بات کہی ہے جو ان کے پیشروؤں اور تمام حکما نے کہی ہے کہ جو ممکن ہو وہ موجود بھی ہو سکتا ہے اور معدوم بھی۔ لا حادث مسبوق بالعدم نہیں ہوتا، یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ حادث بھی نہ ہو اور اس پر عدم وارد بھی نہ ہوا ہو۔

جہاں تک اس ازلی کی بات ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا تو یہ ان کے نزدیک اور تمام حکما کے نزدیک وہ ممکن نہیں ہوتا جو وجود اور عدم کو قبول کرے، بلکہ وجود اور عدم سے پہلے جو بھی ہے وہ حادث ہوتا ہے۔ اس دلیل سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ اللہ کے علاوہ ہر چیز حادث (عدم سے وجود میں آنے والی) ہے۔ اس پر پہلے عدم کی کیفیت تھی اور وہ پہلے نہیں تھا، بعد میں وجود میں آیا، لیکن ابن سینا اور اس کے پیروکاروں کی اس بات میں بھی تناقض ہے، کیوں کہ انھوں نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ وجود واجب اور ممکن میں تقسیم ہوتا ہے اور ممکن قدیم ازلی، ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہنے والا اور عدم سے ماورا بھی ہو سکتا ہے، لیکن وہ واجب بنفسہ نہیں ہوتا، بلکہ دوسرے کے قائم کرنے کی وجہ سے قائم ہوتا ہے۔ انھوں نے فلک کو اس نوع سے شمار کیا ہے۔ اس طرح وہ ان تمام حکما کے اجماع سے باہر نکل آتے ہیں جنھوں نے اس بات میں ان کی مطابقت کی تھی کہ جو ممکن ہو اس کے وجود اور عدم کا امکان ہوتا ہے، لیکن جب وہ یہ بات کہتے ہیں کہ یہ ممکن ازلی ابدی، ممتنع العدم اور واجب الوجود بغیرہ ہو سکتا ہے تو یہ بات تمام حکما کے نزدیک ناممکن ہے۔ یہ بات بڑی واضح ہے اور جو انسان وجود اور عدم کو قبول کرنے والے ممکن کی حقیقت کا صحیح تصور رکھتا ہے اس کے نزدیک یہ عقل کے صریح مطابق ہے۔

یہ نام نہاد فلاسفہ جہمی اور معتزلی متکلمین اور ان کی راہ اختیار کرنے والوں پر ذہنی طور پر مسلط ہو گئے تھے، کیوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی اس شریعت کی حقیقت سے ناواقف تھے جو اللہ تعالیٰ نے رسولوں کے ذریعے نازل کی۔ انھوں نے اپنی تائید کے لیے صحیح عقلی دلائل سے استدلال نہ کیا اور عقلی اور نقلی دلائل کو پہچاننے میں تقصیر سے کام لیا۔ پھر طرح طرح کی باتیں کہیں، مثلاً: اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے کچھ نہیں کرتا اور نہ وہ اپنی مرضی سے بولتا ہے۔ اس کے بعد جو ہوتا رہا اسباب کے بغیر خود ہی ہوتا رہا۔ انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ رب تعالیٰ کے لیے اپنی مرضی کے مطابق کلام کرنا ہمیشہ ممتنع ہے، پھر جو ہوا وہ حادثے کے سبب کے از سر نو ہونے سے نہیں ہوا، کیوں کہ ان کے نظریے کے مطابق حادثات میں دوام ناممکن ہے۔ پھر جہم بن صفوان اور ابو ہذیل علاف جیسے ان کے ائمہ نے یہ موقف اختیار کیا کہ ماضی اور

مستقبل دونوں زمانوں میں حادثات میں دوام ممتنع اور ناممکن ہے۔ جہم نے کہا: جنت اور جہنم فانی ہیں۔ ابو ہذیل نے کہا: ان دونوں کی حرکات فانی ہیں اور وہ دونوں ہمیشہ سکون میں رہتی ہیں۔

ان کے مسلک پر چلنے والوں نے کہا کہ یہ بات عقل کے عین مطابق ہے، کیوں کہ جس چیز کی ابتدا ہے، اس کی انتہا ہونا لازمی ہے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ شریعت نے تو کہا ہے کہ جنت کی نعمتیں دائمی ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اُكُلُهَا دَآىِٕمٌ وَّظِلُّهَا ﴾ [الرعد: ٣٥] ''اس کا پھل ہمیشہ رہنے والا ہے اور اس کا سایہ بھی۔''

﴿ اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ ﴾ [صٓ: ٥٤]

''بلاشبہ یقیناً یہ ہمارا رزق ہے، جس کے لیے کسی صورت ختم ہونا نہیں ہے۔''

تو انھوں نے یہ گمان کر لیا کہ شریعت جہاں عقل پرستوں کی مخالفت کرے، وہاں شریعت کی تصدیق کرنا ضروری ہے، لیکن ان کو یہ علم نہیں کہ صریح عقلی دلیل صحیح شرعی دلیل کے متضاد نہیں ہوتی، بلکہ صحیح دلائل میں تعارض ناممکن ہے، خواہ وہ عقلی دلائل ہوں یا سمعی (شرعی) یا عقلی اور سمعی اور جب دو دلیلوں میں تعارض پیدا ہو جائے تو یا دونوں ہی فاسد ہوتی ہیں یا دونوں میں ایک فاسد ہوتی ہے۔

ان میں سے بہت سے متکلمین یہ کہتے ہیں کہ ماضی کو چھوڑ کر مستقبل میں حادثات کا دائمی ہونا ممکن ہے۔ پھر انھوں نے اس کی بہت سی فروع ذکر کیں، جن کا کمزور اور بودا ہونا ان کے ذہین ترین افراد پر بالکل واضح تھا۔ اس سے ان پر یہ لازم آتا ہے کہ رب تعالیٰ پہلے سے قادر نہیں تھا، لیکن بعد میں کسی ایسے سبب کے پیدا ہونے کے بغیر قادر ہوا جو اس کے قادر ہونے کو لازمی کرتا تھا، اس کے لیے اپنی مرضی اور مشیت کے مطابق کوئی کام کرنا یا کلام کرنا ممکن نہیں تھا۔ پھر کسی ایسے سبب کے بغیر اس کے لیے فعلیت ممکن ہو گئی جو امکان کے تجدد کو لازم کرتی۔ جب ان سے یہ بات کہی جاتی تو اس کا جواب دیتے: وہ ازل میں اس کام پر قادر تھا جو نہیں ہوا۔ دوبارہ ان سے کہا جاتا: جب مقدور ممتنع ہو تو اس وقت قادر قادر نہیں ہوتا، بلکہ کسی ممتنع کام کی قدرت محال اور ممتنع ہے۔ قادر وہی ہوتا ہے جس کے لیے کوئی کام کرنا ممکن ہو۔ اگر وہ قادر نہیں تو اس کے لیے کوئی کام کرنا بھی ممکن نہیں۔

ان لوگوں کے اسی نظریے کی بنا پر اللہ تعالیٰ کے کلام کے بارے میں تین اقوال تھے۔ ایک گروہ نے کہا: کلام رب تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم نہیں، بلکہ اس کا کلام مخلوق ہے، کیوں کہ وہ یا قدیم ہے یا حادث۔

قدیم ہونا تو محال ہے، کیوں کہ وہ اپنی مرضی اور قدرت کے ساتھ کلام کرتا ہے اور قدیم قدرت اور مرضی کے تابع نہیں ہوتا۔

اگر کلام قدرت اور مشیت کے تابع ہے تو پھر وہ مخلوق ہوگا اور اپنی ذات کے ساتھ قائم نہیں ہوگا، کیوں کہ اگر

وہ قائم بذاتہ ہوتا تو اس کے ساتھ حوادث بھی قائم ہوتے، جب کہ حوادث اس کے ساتھ قائم نہیں، کیوں کہ اگر حوادث اس کے ساتھ قائم ہوتے تو یہ اس سے خالی نہ ہوتا اور جو حوادث سے خالی نہ ہو وہ حادث ہوتا ہے۔ اس طرح اس قاعدے کی بنیاد پر وہ اجسام کے حادث ہونے اور جہاں کے حدوث کو ثابت کرتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں: یہ عقلاً معلوم ہے کہ جو چیز حادث سے پہلے نہ ہو وہ اس سے پہلے نہیں ہوتی، وہ اس کے ساتھ ہوگی یا اس کے بعد اور جو حادث کے ساتھ یا اس کے بعد رونما ہو وہ بھی حادث ہی ہوتی ہے۔

ان میں سے بہت سے لوگ حوادث کی نوع اور مخصوص حادثے کے درمیان فرق بھانپ نہیں پائے مخصوص حادثہ اور محصور و محدود حوادث کا ازلی اور دائمی ہونا محال ہے۔ جو اس سے پہلے نہ ہو تو وہ یا اس کے ساتھ ہوگا یا اس کے بعد اور جو اس طرح ہو یقیناً حادث ہوتا ہے، یہ بات کسی پر پوشیدہ نہیں۔

لیکن حوادث کی نوعیت مقامِ غور اور محلِ نزاع ہے کہ آیا یہ ممکن ہے کہ نوع دائمی ہو اور رب تعالیٰ ازل سے متکلم ہو یا اپنی مرضی اور قدرت کے مطابق کوئی کام کرے یا ایسا ہونا محال ہے؟ جب ایک گروہ نے اس فرق کو سمجھ لیا تو انھوں نے کہا: یہ بھی محال ہے، کیوں کہ حوادث کے لیے ابتدا کا نہ ہونا محال ہے، انھوں نے اس کی بہت زیادہ دلیلیں ذکر کیں، جیسے: دلیل تطبیق اور لامتناہی کے رکنے کے امتناع کی دلیل۔ اس کی تفصیل کسی دوسری جگہ گزر چکی ہے اور ہر جگہ ہر بات کے لیے مناسب نہیں ہوتی۔

ان نام نہاد فلاسفہ نے جب دیکھا کہ یہ نظریہ تو صریحاً عقل کے خلاف اور باطل ہے اور کسی حادثے کے بغیر حوادث کا رونما ہونا، رب تعالیٰ میں عدم اور فعلیت کا وجود میں آنا اور کامل موثر کے اثر کا اس سے پیچھے رہ جانا ناممکن اور محال ہے تو انھوں نے گمان کیا کہ اگر انھوں نے اس قول کی تردید کی تو جہان، جیسے: افلاک اور دیگر عناصر کے مواد کے قدیم ہونے کے بارے میں ان کا دعویٰ تسلیم کر لیا جائے گا۔

اسی طرح انھوں نے صریح معقولات اور رسولوں کی تکذیب کر کے کھلی گمراہی کی راہ منتخب کی۔

تمام رسولوں کا اس بات پر اتفاق اور اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز مخلوق اور عدم سے وجود میں آئی۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی چیز بھی قدیم نہیں۔ اس نے زمین و آسمان اور ان دونوں کی ہر چیز کو چھے دنوں میں پیدا کیا۔ تمام عقلیں یہ بات اچھی طرح جانتی ہیں کہ حوادث کے لیے محدث، یعنی ان کو پیدا کرنے والے کا ہونا ضروری ہے۔ اگر صرف ایک ازلی اور قدیم علت ہی ہوتی جو اپنے معلول کو مستلزم ہوتی تو جہاں میں کوئی حادثہ رونما نہ ہوتا، کیوں کہ ازلی قدیم اور اپنے معلول کو مستلزم علت سے اس حادثے کا صادر ہونا تو محال ہے، کیوں کہ اگر اس کا معلول اس کے ساتھ لازم ہے تو وہ اس کے ساتھ قدیم بھی ہوگا اور اس سے متاخر نہیں ہو سکتا، لہٰذا کسی بھی حادثے کا کوئی سبب نہیں

ہوسکتا جو اس کے رونما ہونے کا تقاضا کرے، چنانچہ اس نظریے کی بنا پر تمام حوادث محدث کے بغیر رونما ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اس بات سے فرار اختیار کرنا چاہتے ہیں کہ ان حادثات کو قادر کسی سبب کے بغیر پیدا کرے، لیکن اس کے مقابلے میں انھوں نے جو راہ اختیار کی ہے اس کے مطابق حادثات اصل میں کسی بھی محدث کے بغیر پیدا ہوتے ہیں، نہ کسی قادر کی طرف سے اور نہ کسی غیر قادر ہی کی طرف سے۔ لیکن یہ لوگ جس بات سے بچنا چاہتے تھے، اس سے بھی بری بات میں پھنس گئے، جس طرح کوئی شخص شدید گرمی سے بچنے کے لیے آگ کا سہارا لیتا ہے! ان کا عقیدہ یہ ہے کہ مفعول، مصنوع اور مخصوص ایجاد کردہ چیز (جیسے کہ فلک) کے فاعل کا ازلی اور ابدی رشتہ ہوتا ہے۔ فاعل زمانے کے اعتبار سے اس سے متقدم اور پہلے نہیں ہوسکتا، یعنی دونوں قدیم ہیں۔

دوسرے فریق کا نظریہ ہے کہ موثر کامل کا اثر اس سے پیچھے رہ جاتا ہے، پھر وہ اثر کسی ایسے سبب کے بغیر رونما ہوتا ہے جس کا وہ تقاضا کرتا ہو۔ پہلے فریق نے اس نظریے کے باطل ہونے کی صریح عقلی دلیلیں ذکر کیں تو دوسرے فریق نے بھی صریح عقلی دلائل سے ان کے قول کی تردید کی۔

تاہم اس بات میں کوئی شک نہیں کہ پہلے فریق کا نظریہ دوسرے فریق کے نظریے سے زیادہ فاسد اور صریح عقلیات اور صحیح نقلیات کے خلاف ہے۔

تیسرا قول: موثر کامل کی مکمل تاثیر کے بعد اس کے اثر کا فوراً رونما ہونا لازمی ہے۔ وہ نہ تو اس کے ساتھ ملا ہوا ہوتا ہے اور نہ اس میں تاخیر ہی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر جب کسی عورت کو طلاق دی جاتی ہے تو اس کے فوراً بعد وہ مطلقہ ہو جاتی ہے۔ غلام کو آزاد کیا جائے تو وہ آزاد ہو جاتا ہے۔ برتن کو توڑا جائے تو وہ ٹوٹ جاتا ہے۔ رسی کاٹی جائے تو کٹ جاتی ہے، لہٰذا طلاق اور آزادی کا وقوع پذیر ہونا طلاق دینے اور آزاد کرنے کے ساتھ ملا ہوا نہیں۔ یعنی اس کے ساتھ نہیں اور نہ اس سے متاخر ہی ہے، بلکہ اس کے فوراً بعد اس کے ساتھ متصل ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس اعتبار سے اس کے ساتھ اور اس سے جدا ہے کہ وہ اس کے متصل بعد ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس اعتبار سے اس کے بعد اور اس سے متاخر ہے کہ مکمل تاثیر کے بعد رونما ہوتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴾ [یٰس: ۸۲]

''اس کا حکم تو، جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے، اس کے سوا نہیں ہوتا کہ اسے کہتا ہے ''ہو جا'' تو وہ ہو جاتی ہے۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ جو بنانا چاہتا ہے وہ بن جاتا ہے، لیکن وہ جب اس کو بناتا ہے تو وہ اس کے بنانے کے متصل بعد بنتا ہے، نہ تو زمانے کے لحاظ سے تکوین اور بنانے کے ساتھ ہوتا ہے اور نہ اس سے اتنا متاخر ہی ہوتا ہے کہ دونوں

کے درمیان بہت زیادہ زمانی فاصلہ ہو، بلکہ وہ اس کی تکوین کے ساتھ متصل ہوتا ہے، جس طرح حرکت اور زمانے کے اجزا ایک دوسرے سے متصل ہوتے ہیں۔

اس دلیل سے استدلال کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز حادث ہے اور پہلے نہیں تھی بعد میں وجود میں آئی اور وہ ہمیشہ سے فاعل اور ہمیشہ سے متکلم ہے۔

یہ سلف صالحینِ امت اور ائمہ اسلام کا قول ہے۔ اس پر کتاب و سنت اور صریح عقل دلالت کرتی ہے، لیکن وہ دونوں گروہ اس قول تک نہیں پہنچ پائے۔

یہاں یہ بات بیان کرنا مقصود تھی کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ قرآن حادث ہے، رب تعالیٰ کے ساتھ کلام، ارادہ، علم، زندگی اور کوئی بھی صفت ثابت نہیں، ان کے قول کی اصل اور بنیادی وجہ یہ ہے جو ہم نے بیان کی ہے۔

جب یہ قول عقل اور شریعت کی روشنی میں باطل ثابت ہو گیا تو ان کے نظریے کے اصول سے موافقت رکھنے والے ایک گروہ نے کہا: وہ اپنی مرضی اور قدرت سے کلام نہیں کرتا، بلکہ اس کا کلام اس کی ذات کے ساتھ لازم ہے، جس طرح اس کی ذات کے ساتھ حیات لازم ہے۔ پھر ان میں سے کچھ نے کہا: وہ ایک ہی معنی اور مفہوم ہے، کیوں کہ ایک ہی آن میں کئی لامتناہی معانی کا اکٹھ محال ہے۔ نیز اس کو کسی مخصوص عدد میں محصور کرنا بھی محال ہے۔ پھر انھوں نے کہا یہ معنی ہر مامور کا امر اور ہر خبر دی گئی بات کی خبر ہے۔ اگر اس کو عربی میں بیان کیا جائے تو وہ قرآن ہے، اگر عبرانی میں بیان کیا جائے تو وہ تورات ہے اور اگر سریانی میں بیان کیا جائے تو وہ انجیل ہے؛ پھر انھوں نے یہ بھی کہا کہ امر اور نہی کلام کی صفات ہیں، انواع نہیں۔ آیت الکرسی آیت دَین، ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ اور ﴿تَبَّتْ يَدَآ اَبِىْ لَهَبٍ وَّتَبَّ﴾ کا ایک ہی معنی ہے۔

جمہور حکما نے ان سے کہا: اس نظریے کا تصور ہی اس کے فاسد ہونے کو بیان کر دیتا ہے۔ انھوں نے ان سے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کا سارا کلام سنا یا کچھ؟ اگر تم کہو: سارا ہی سنا تو اس سے لازم آئے گا کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کا سارا علم ہی جان لیا۔ اگر تم نے کہا: نہیں، کچھ سنا تو پھر اس کے حصے ہو گئے۔ پھر انھوں نے ان سے کہا: تمھارے نزدیک جو خبر کی حقیقت ہے، وہی امر کی حقیقت ہے اور وہی نہی کی۔ ہر مامور بہ کا حکم ہر مخبر عنہ کی خبر کی حقیقت ہی ہے تو پھر یہ بھی ضروری ہے کہ جو قدرت کی حقیقت ہے وہی علم کی حقیقت بھی ہو اور جو قدرت کی حقیقت ہے وہی ارادے کی حقیقت بھی ہو؟!

یہ اعتراضات سن کر ان کے ذہین افراد نے اعتراف کر لیا کہ اگر وہ ہر چیز کی حقیقت ایک ہی قرار دیں تو پھر ان ساری باتوں کا ان کو سامنا کرنا پڑے گا اور ان سے کوئی راہِ فرار نظر نہیں آئے گی۔ اس قول کا یہ لازمی نتیجہ ہو گا کہ

جو ذات کی حقیقت ہے وہی صفات کی حقیقت ہے، جو وجودِ واجب کی حقیقت ہے وہی وجودِ ممکن کی حقیقت بھی ہے۔

ان میں سے ایک گروہ نے اسی بات کو اختیار کر لیا اور کہا: وجود ایک ہی ہے۔ قدیم خالق وجودِ واجب بعینہٖ مخلوق حادث اور ممکن وجود ہے۔ ابن عربی، ابن سبعین جیسے وحدۃ الوجود کے قائلین اور ان دونوں کے پیروکاروں کے مذہب کی بنیاد یہی بات ہے۔

انھی لوگوں میں سے کچھ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کا متعین کلام متعین، قدیم اور ازلی حروف اور آوازیں ہیں جو ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ سے رہیں گی۔ ان کا دعویٰ ہے کہ قرآن، تورات اور انجیل سب اس کی ازلی اور قدیم حروف کی آوازیں ہیں جو ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔

جمہور حکما نے ان سے کہا: یہ بالبداہت معلوم ہے کہ با سین سے پہلے ہے اور سین میم سے پہلے ہے، لہٰذا یہ دونوں ایک ساتھ ازلی اور ابدی کس طرح ہو سکتی ہیں؟ اور یہ بھی معلوم ہے کہ ایک مخصوص آواز دو زمانوں میں باقی نہیں رہتی تو وہ ازلی اور ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ تک کس طرح رہ سکتی ہیں؟

تیسرے گروہ میں سے ان متکلمین کی راہ اختیار کرنے والوں نے کہا: وہ اپنی مشیت اور قدرت کے ساتھ کلام کرتا ہے جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے۔ کتاب و سنت اور اجماعِ سلف بھی اسی پر دلالت کرتا ہے۔ اگر اس سے اس کے ساتھ حوادث کا قیام لازم آئے تو اس میں شرعی اور عقلی طور پر کوئی ممانعت نہیں، بلکہ یہ تو حکما کے تمام گروہوں کو لازم ہے اور اس پر بہت ساری نصوص اور سلف صالحین کے اقوال بھی دلالت کرتے ہیں۔

نیز اللہ تعالیٰ اپنی مرضی اور قدرت کے ساتھ عربی قرآن کے ساتھ کلام کرتا ہے۔ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی آواز کے ساتھ مخاطب کیا اور انھوں نے وہ آواز سنی جس طرح نصوص اور اقوالِ سلف سے ثابت ہے، لیکن وہ ازل میں متکلم نہیں تھا اور اس کا اپنی مشیت اور قدرت کے ساتھ ہمیشہ سے متکلم ہونا محال ہے، کیوں کہ یہ ایسے حوادث کو مستلزم ہے جن کی کوئی ابتدا نہیں اور یہ ان کے قول کی اصل اور بنیاد ہے۔

ان سے کہا جائے گا: یہ بات ہر کسی کو معلوم ہے کہ کلام صفتِ کمال ہے، صفتِ نقص نہیں۔ جو اپنی مرضی اور قدرت کے ساتھ کلام کر سکتا ہے وہ اس سے زیادہ کامل ہے جو اپنی مرضی اور قدرت سے بول نہیں سکتا تو اس بات کی بنا پر جو ہمیشہ سے اپنی مرضی کے مطابق بول سکتا ہو وہ اس سے زیادہ کامل ہے جو پہلے نہیں بول سکتا تھا، لیکن بعد میں بولنے پر قادر ہوا۔

پھر ان سے یہ بھی کہا گیا: اگر تم کہتے ہو کہ پہلے اس کے لیے بولنا محال تھا، پھر وہ کسی ایسے سبب کے بغیر بولنے پر قادر ہوا جو اس کا تقاضا کرتا۔ تم نے کہا: وہ کلام پر قادر نہیں تھا اور کلام اس کے لیے ناممکن تھا، پھر وہ قادر ہو گیا

اور کسی سبب کے بغیر ہی اپنی مرضی کے ساتھ کلام کرنے لگا! تمھاری یہ بات عقل کے صریح خلاف ہے۔ یہ باری تعالیٰ سے صفاتِ کمال کی نفی کرتی ہے اور اس کو مخلوق کے مانند قرار دیتی ہے جو پہلے بولنے پر قادر نہیں ہوتے اور بعد میں بولنا شروع کرتے ہیں۔ سلف صالحین اور ائمہ نے صریح الفاظ میں کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے متکلم ہے، جب چاہے جس طرح چاہے بات کرسکتا ہے۔ یہ قول عبداللہ بن مبارک اور امام احمد بن حنبل اور دیگر ائمہ اسلام رحمہم اللہ سے منقول ہے۔ انھوں نے یہ کہا ہے کہ قرآن اللہ کا کلام، اس کا نازل کردہ اور غیر مخلوق ہے۔ ان میں سے کسی ایک نے بھی یہ نہیں کہا کہ وہ اپنی مشیت اور قدرت سے کلام نہیں کرسکتا تھا، نہ کسی نے یہ کہا ہے کہ وہ مخلوق اور اس سے جدا ہے اور نہ کسی نے یہ کہا ہے کہ وہ پہلے متکلم نہیں تھا، بعد میں بولنے پر قادر ہوا۔

یہ جہمیہ، معتزلہ، کلابیہ، کرامیہ، سالمیہ کے متکلمین اور ائمہ اربعہ کے متاخر پیروکاروں میں سے ان کے ہم خیال لوگوں کے اقوال ہیں۔ یہ اجماع، کتاب و سنت کی نصوص اور صریح عقل کے خلاف ہیں اور دہریہ فلاسفہ سے متاثر ہونے کا نتیجہ، لیکن فلاسفہ کا نظریہ معقولات اور منقولات کی نگاہ میں انتہائی زیادہ خراب اور فاسد ہے۔

فصل (جمہور عقلا کے نزدیک عقل کی ماہیت):

یہاں یہ بیان کرنا مقصود تھا کہ مسلمانوں اور جمہور عقلا کے نزدیک لفظِ عقل صفت ہے۔ اسی کو عاقل کے ساتھ قائم عرض بھی کہا جاتا ہے اور قرآن کی درج ذیل آیات سے یہی مراد ہے:

﴿ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴾ [البقرة: ٧٣] ''تاکہ تم سمجھو۔''

﴿ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا ﴾ [الحج: ٤٦]

''پھر کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ ان کے لیے ایسے دل ہوں جن کے ساتھ وہ سمجھیں۔''

﴿ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ ﴾ [آل عمران: ١١٨]

''بے شک ہم نے تمھارے لیے آیات کھول کر بیان کر دی ہیں، اگر تم سمجھتے ہو۔''

ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ عقل ''عَقَلَ يَعْقِلُ'' باب سے مصدر ہے۔ اس بنا پر عقل نہ خالی علم کو کہا جاتا ہے جس پر آدمی عمل نہ کرے اور نہ علم کے بغیر عمل کو کہا جاتا ہے، بلکہ وہ علم جس پر عمل کیا جائے اس کو عقل کہا جاتا ہے، اسی لیے جہنمی کہیں گے:

﴿ لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ ﴾ [الملك: ١٠]

''اگر ہم سنتے ہوتے یا سمجھتے ہوتے تو بھڑکتی ہوئی آگ والوں میں نہ ہوتے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ ﴾ [الحج: ٤٦]

''پھر کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ ان کے لیے ایسے دل ہوں جن کے ساتھ وہ سمجھیں۔''

وہ عقل جو شرعی تکلیف کے لیے شرط ہے اس سے مراد بھی وہ علوم ہیں جن کے ذریعے انسان اپنے نفع اور نقصان کے درمیان فرق کر سکتا ہے۔ وہ پاگل جو پیسوں اور درہموں کے درمیان فرق نہ کر سکے، ہفتے کے دنوں کی پہچان نہ رکھے، جو بات کہی جائے اس کو سمجھ نہ سکے وہ عاقل نہیں ہوتا۔ جو انسان بات سمجھتا ہے اور اپنے نفع اور نقصان میں فرق کر سکتا ہے وہ عاقل ہوتا ہے۔

پھر کچھ لوگ کہتے ہیں کہ عقل سے مراد ضروری علوم ہیں تو کچھ کے نزدیک ان علوم کے موجب پر عمل کرنا عقل ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ لفظ عقل ان دونوں پر بولا جاتا ہے۔ کبھی عقل سے انسان کی وہ قوتِ غریزی مراد ہوتی ہے جس کے ساتھ وہ جانتا ہے، امتیاز کرتا ہے اور نفع و نقصان کی پہچان کرتا ہے۔

امام احمد اور حارث محاسبی وغیرہ کا قول ہے کہ عقل قوتِ غریزی ہے اور یہ جبلت جمہور حکما کے نزدیک ثابت ہے۔ جس طرح آنکھ میں دیکھنے کی قوت ہوتی ہے، زبان میں چکھنے کی قوت ہوتی ہے اور جلد میں چھونے کی قوت ہوتی ہے۔

کچھ لوگ ان قوتوں اور طبائع کا انکار کرتے ہیں۔ یہ ابو الحسن اور مالک، شافعی اور احمد کے پیروکاروں میں سے اس کے ہم خیالوں کا موقف ہے۔

یہ ان فطری اور غریزی قوتوں کا انکار کرنے والے اسباب کا انکار بھی کرتے ہیں۔ ان کا قول ہے: اللہ تعالیٰ اسباب کے ساتھ نہیں، بلکہ ان کے پاس کوئی بھی فعل کرتا ہے۔ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ روٹی کے ساتھ سیر اور پانی کے ساتھ سیراب نہیں کرتا اور پانی کے ساتھ فصل نہیں اگاتا، بلکہ وہ ان کے پاس کرتا ہے، ان کے ساتھ نہیں۔ ان لوگوں نے معقولات و محسوسات کی مخالفت کے ساتھ کتاب و سنت اور اجماع کی مخالفت بھی کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے:

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۭ حَتّٰٓي اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَاۗءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۭ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴾ [الأعراف: ٥٧]

''اور وہی ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت سے پہلے بھیجتا ہے، اس حال میں کہ خوش خبری دینے والی ہیں، یہاں تک کہ جب وہ بھاری بادل اٹھاتی ہیں تو ہم اسے کسی مردہ شہر کی طرف ہانکتے ہیں، پھر اس سے پانی اتارتے ہیں، پھر اس کے ساتھ ہر قسم کے کچھ پھل پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح ہم مردوں کو نکالیں گے،

تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔''

اس آیت میں ذکر ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ پانی بادلوں کے سبب سے اتارتا ہے اور پھل پانی کے ذریعے پیدا کرتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ﴾ [البقرة: ١٦٤]

''اور اس پانی میں جو اللہ نے آسمان سے اتارا، پھر اس کے ساتھ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کر دیا۔''

﴿ وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ ۝ ﴾ [قٓ: ٩]

''اور ہم نے آسمان سے ایک بہت بابرکت پانی اتارا، پھر ہم نے اس کے ساتھ باغات اور کاٹی جانے والی (کھیتی) کے دانے اگائے۔''

﴿ قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ ﴾ [التوبة: ١٤]

''ان سے لڑو، اللہ انھیں تمھارے ہاتھوں سے عذاب دے گا۔''

﴿ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ ﴾

[المائدة: ١٥، ١٦]

''بے شک تمھارے پاس اللہ کی طرف ایک روشنی اور واضح کتاب آئی ہے۔ جس کے ساتھ اللہ ان لوگوں کو جو اس کی رضا کے پیچھے چلیں، سلامتی کے راستوں کی ہدایت دیتا ہے۔''

﴿ فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ﴾ [البقرة: ٢٦]

''تو وہ کہتے ہیں اللہ نے اس کے مثال دینے سے کیا ارادہ کیا؟ وہ اس کے ساتھ بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور اس کے ساتھ بہتوں کو ہدایت دیتا ہے۔''

قرآن کریم میں اس کی بہت زیادہ مثالیں ہیں۔

لوگ اپنی عقل اور حس کے ذریعے سے جانتے ہیں کہ کچھ چیزیں کچھ چیزوں کا سبب ہوتی ہیں۔ اسی طرح ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ پیٹ پکانے سے نہیں کھانے سے بھرتا ہے۔ پانی نباتات اور حیوانات کی زندگی کا سبب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ﴾ [الأنبياء: ٣٠]

''اور ہم نے پانی سے ہر زندہ چیز بنائی۔''

جانور کی پیاس پانی پینے سے مٹتی ہے، چلنے سے نہیں۔ اس کی مثالیں بہت ہیں اور ان مسائل کی مزید تفصیل کا مقام اور ہے۔

فصل (جسم کی تدبیر کرنے والی روح):

جسم کی تدبیر کرنے والی روح جو موت کے ساتھ اس کو چھوڑ جاتی ہے وہی روح ہے جو اس میں پھونکی گئی ہوتی ہے اور وہی وہ نفس ہے جو موت کے ساتھ اس سے جدا ہو جاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ جب سو گئے اور نماز نہ پڑھ سکے تو فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے جہاں چاہا، ہماری روحیں قبض کر لیں اور جہاں چاہا انھیں لوٹا دیا۔''[1] حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے معذرت کرتے ہوئے کہا: اے اللہ کے رسول! ''جس نے آپ کے نفس کو پکڑا، اس نے میرے نفس کو بھی پکڑا۔''[2]

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ﴾ [الزمر: ٥٦۔٥٧]

''اللہ جانوں کو ان کی موت کے وقت قبض کرتا ہے اور ان کو بھی جو نہیں مریں ان کی نیند میں، پھر اسے روک لیتا ہے جس پر اس نے موت کا فیصلہ کیا اور دوسری کو ایک مقرر وقت تک بھیج دیتا ہے۔''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور اکثر مفسرین کا قول ہے: ''اللہ تعالیٰ کا روح کو قبض کرنا دو طرح سے ہے: قبضۂ موت اور قبضۂ نیند۔ پھر نیند میں اس کو قبض کر لیتا ہے جس نے مرنا ہوتا ہے اور دوسرے کو اس کے مقررہ وقت، یعنی موت کے آنے تک چھوڑ دیتا ہے۔''

صحیحین میں حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب سونے کے لیے بستر پر جاتے تو یہ دعا پڑھتے:

((بِاسْمِكَ رَبِّيْ وَضَعْتُ جَنْبِيْ، وَبِكَ أَرْفَعُهُ، إِنْ أَمْسَكْتَ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لَهَا وَارْحَمْهَا، وَإِنْ أَرْسَلْتَهَا فَاحْفَظْهَا بِمَا تَحْفَظُ بِهِ عِبَادَكَ الصَّالِحِيْنَ))[3]

''اے میرے رب! تیرے ہی نام کے ساتھ میں نے اپنا پہلو (بستر پر) رکھا ہے اور تیری ہی توفیق سے اٹھاؤں گا، اگر تو نے میری روح (اسی دوران میں) قبض کر لی تو اسے بخش دینا اور اس پر رحم فرمانا اور اگر تو اسے چھوڑ دے (اور قبض نہ کرے) تو اس کی اس طریقے سے حفاظت فرمانا جیسے تو اپنے نیک بندوں کی حفاظت فرماتا ہے۔''

صحیح حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ شہدا کی ارواح کو سبز رنگ کے پرندوں کے پوٹوں

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٠)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٨٠)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٥٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧١٤)

میں بند کر دیتا ہے، وہ جنت میں گھومتے ہیں، پھر عرش کے ساتھ لٹکی ہوئی قندیلوں میں آ ٹھہرتے ہیں۔[1]

صحیح سند کے ساتھ یہ حدیث بھی ثابت ہے: ''جب انسان کی روح قبض کی جاتی ہے تو فرشتے کہتے ہیں: اے پاکیزہ نفس جو پاکیزہ بدن میں تھا! راضی خوشی نکل! وہ تجھ سے راضی ہے۔ اور کہا جاتا ہے: اے خبیث نفس جو خبیث بدن میں تھا، ناراضی کے عالم میں باہر نکل! وہ بھی تجھ سے ناراض ہے۔''[2]

ایک دوسری حدیث میں ہے: ''مومن کی روح ایک پرندے کی شکل اختیار کر لیتی ہے، جو جنت میں کھاتی ہے، پھر رحمان کے عرش کے نیچے لٹکی ہوئی قندیلوں میں آ ٹھہرتی ہے۔''[3] اس حدیث میں روح کے لیے نسمہ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

حدیثِ معراج میں ہے: ''حضرت آدم علیہ السلام کی دائیں جانب بھی بہت سے اشخاص تھے اور بائیں جانب بھی۔ جب دائیں جانب دیکھا تو ہنس دیے اور جب بائیں جانب دیکھا تو رو دیے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ دائیں جانب ان کی نیک بخت اولاد کی روحیں تھیں اور بائیں جانب بد بخت اولاد کی روحیں۔''[4]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: «وَالَّذِي فَلَقَ الْحَبَّةَ وَبَرَأَ النَّسَمَةَ!»[5] ''اس ذات کی قسم جس نے دانہ پھاڑا اور روح پیدا کی!''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: «إِنَّ الرُّوحَ إِذَا قُبِضَ تَبِعَهُ الْبَصَرُ»[6] ''جب روح قبض کی جاتی ہے تو نگاہ اس کے پیچھے لگ جاتی ہے۔''

لہٰذا موت اور نیند کے وقت جس چیز کو قبض کیا جاتا ہے اس کو روح بھی کہا جاتا ہے اور نفس بھی اور جس کو آسمان کی طرف لے جایا جاتا ہے اس کو بھی نفس اور روح کہا جاتا ہے۔ لفظ روح میں لطافت پائی جاتی ہے، اسی لیے روح کو روح کہا جاتا ہے، کیوں کہ وہ لطیف ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: «اَلرِّيحُ مِنَ رُوحِ اللّٰهِ»[7] ''ہوا اس روح سے تعلق رکھتی ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔'' اس جملے میں روح کی اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت صفاتی نہیں، بلکہ ملکیتی ہے۔

---

(1) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٨٧)

(2) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٦٢) صحيح الجامع (١٩٦٨)

(3) مسند أحمد (٣٨٦/٦) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٠٧٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٧١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٩٩٥)

(4) صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٦٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٣)

(5) صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨٨٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٨)

(6) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٢٠)

(7) سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٠٩٧) صحيح الجامع (٣٥٦٤)

کیوں کہ جو چیز اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کی جاتی ہے اگر وہ قائم بنفسہ وجود ہو تو وہ اس کی ملکیت ہوتی ہے اور اگر وہ کوئی قائم بغیرہ صفت ہو جس کا کوئی ایسا محل نہ ہو جس کے ساتھ وہ قائم ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہوتی ہے۔

پہلی کی مثال درج ذیل آیات ہیں:

﴿ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ﴾ [الشمس: ١٣]

''اللہ کی اونٹنی اور اس کے پینے کی باری (کا خیال رکھو)۔''

﴿ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۝ قَالَتْ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ۝ قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ۝ ﴾ [مریم: ١٧، ١٩]

''تو ہم نے اس کی طرف اپنا ایک خاص فرشتہ بھیجا تو اس نے اس کے لیے ایک پورے انسان کی شکل اختیار کی۔ اس نے کہا بے شک میں تجھ سے رحمان کی پناہ چاہتی ہوں، اگر تو کوئی ڈر رکھنے والا ہے۔ اس نے کہا میں تو تیرے رب کا بھیجا ہوا ہوں، تاکہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا عطا کروں۔''

﴿ وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا ﴾ [التحریم: ١٢]

''اور عمران کی بیٹی مریم کی (مثال دی ہے) جس نے اپنی شرم گاہ کی حفاظت کی تو ہم نے اس میں اپنی ایک روح پھونک دی۔''

حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں کہا:

﴿ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۝ ﴾ [صٓ: ٧٢]

''تو جب میں اسے پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی روح سے پھونک دوں تو تم اس کے سامنے سجدہ کرتے ہوئے گر جاؤ۔''

دوسری کی مثال درج ذیل جملے ہیں: علم اللہ، کلام اللہ، قدرۃ اللہ، حیاۃ اللہ، امر اللہ، لیکن کبھی مفعول بہ کو مصدر کے لفظ سے بیان کیا جاتا ہے اور معلوم کو علم، مقدور کو قدرت اور مامور بہ کو امر کہا جاتا ہے۔ کلمہ کے ساتھ جو پیدا کیا جائے اس کو کلمہ بھی کہا گیا ہے جس طرح ان آیات میں ہے:

﴿ اَتٰٓى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ﴾ [النحل: ١]

''اللہ کا حکم آ گیا، سو اس کے جلد آنے کا مطالبہ نہ کرو۔''

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ﴾ [آل عمران: ٤٥]

''بے شک اللہ تجھے اپنی طرف سے ایک کلمے کی بشارت دیتا ہے، جس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہے، دنیا اور آخرت میں بہت مرتبے والا ہوگا۔''

﴿ اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ اَلْقٰهَاۤ اِلٰی مَرْیَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ﴾ [النساء: ۱۷۱]

''نہیں ہے مسیح عیسیٰ ابن مریم مگر اللہ کا رسول اور اس کا کلمہ، جو اس نے مریم کی طرف بھیجا اور اس کی طرف سے ایک روح ہے۔''

رسول اللہ ﷺ کا درج ذیل فرمان بھی اسی باب سے تعلق رکھتا ہے: ''اللہ تعالیٰ نے جب رحمت پیدا کی تو سو رحمتیں پیدا کیں۔ ان میں سے صرف ایک رحمت دنیا میں اتار دی اور ننانوے اپنے پاس رکھ لیں۔ قیامت کے دن اس کو بھی ان ننانوے رحمتوں کے ساتھ ملا لے گا اور اپنے بندوں پر رحم کرے گا۔''[1] رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ جنت سے کہے گا: ''تو میری رحمت ہے۔ تیرے ساتھ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہوں گا رحمت کر دوں گا اور جہنم سے کہا: تو میرا عذاب ہے اور تیرے ساتھ جس کو چاہوں گا عذاب دوں گا۔ اور تم دونوں سے بھرنے کا وعدہ ہے۔''

فصل (لفظ روح اور نفس سے مراد):

لفظ روح اور نفس سے کئی معانی مراد لیے جاتے ہیں۔ بدن سے نکلنے اور اس میں داخل ہونے والی ہوا کو بھی روح کہا جاتا ہے اور رگوں میں بہنے والی اور دل کی گہرائی سے نکلنے والی بھاپ کو بھی روح کہا جاتا ہے۔

اطبا اسی کو روح حیوانی کہتے ہیں۔ یہ دونوں معانی اس روح کے علاوہ ہیں جو موت کے وقت بدن سے علاحدہ ہو جاتی ہے اور وہی نفس ہوتا ہے۔ نفس سے مراد کسی چیز کی ذات اور وجود بھی ہوتا ہے، جس طرح کہا جاتا ہے: ''رَأَیْتُ زَیْداً نَفْسَهُ وَعَیْنَهُ'' میں نے زید کی ذات اور وجود کو دیکھا۔'' اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَاۤ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ ﴾ [المائدة: ۱۱٦]

''تو جانتا ہے جو میرے نفس میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تیرے نفس میں ہے۔''

﴿ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ﴾ [الأنعام: ٥٤]

''تمھارے رب نے رحم کرنا اپنے آپ پر لازم کر لیا ہے۔''

﴿ وَیُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ﴾ [آل عمران: ۲۸] ''اور اللہ تمھیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے۔''

صحیح حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی ایک بیوی سے کہا: میں نے تیرے بعد صرف چار کلمات کہے،

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٠٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٥٢)

اگر ان کو اس کے ساتھ تولا جائے جو تم نے اب تک پڑھا ہے تو یہ اس کے برابر ہو جائیں، وہ یہ ہیں:

« سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ عَدَدَ خَلْقِهِ، سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ زِنَةَ عَرْشِهِ، سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ رِضَا نَفْسِهِ، سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ مِدَادَ كِلِمَاتِهِ »[1]

''میں اللہ تعالیٰ کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیحات کرتا ہوں اس کی مخلوق کی تعداد کے برابر۔ میں اللہ کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیحات کرتا ہوں اس کے عرش کے وزن کے برابر۔ میں اللہ کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیحات کرتا ہوں اس کی ذات کی خوش نوذی کے مطابق۔ میں اللہ تعالیٰ کی حمد کے ساتھ تسبیحات کرتا ہوں اس (کی تعریف) کے کلمات کی سیاہی کے برابر۔''

صحیح حدیثِ قدسی میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''میں اپنے بندے کے اس گمان کے قریب ہوتا ہوں جو وہ میرے بارے میں کرتا ہے۔ وہ جب مجھے یاد کرتا ہے، اس وقت میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔ اگر وہ مجھے اپنے نفس میں یاد کرے تو میں اس کو اپنے نفس میں یاد کرتا ہوں۔ اگر وہ مجھے لوگوں میں یاد کرے تو میں ان سے بہتر جماعت میں اس کو یاد کرتا ہوں۔''[2]

جمہور علما کے نزدیک ان جگہوں پر اللہ تعالیٰ کے نفس سے اس کی وہ ذات مراد ہے جو صفات سے متصف ہے، وہ نہیں جو صفات سے جدا ہو اور نہ اس سے ذات کی کوئی صفت ہی مراد ہے۔ لوگوں کا ایک گروہ اس کو صفات کے باب سے قرار دیتا ہے، جب کہ دوسرا گروہ اس سے صفات سے مجرد اور خالی ذات مراد لیتا ہے اور یہ دونوں اقوال ہی غلط ہیں۔

کبھی لفظِ نفس سے حیوانی خون مراد ہوتا ہے، جس طرح فقہا کہتے ہیں: ''ما له نفس سائلة وما ليس له نفس سائلة'' ''جس کا بہنے والا خون ہو اور جس کا بہنے والا خون نہ ہو'' جب عورت کو حیض آئے تو عربی میں کہا جاتا ہے: ''نَفَسَتِ الْمَرْأَةُ'' جب بچے کو جنم دے تب بھی کہا جاتا ہے: ''نَفِسَتْ'' اسی وجہ سے اس عورت کو نفاس والی عورت کہا جاتا ہے۔ یہ شعر بھی اسی معنی میں ہے ع

تسيل على حد الظباة نفوسنا — وليست علىٰ غير الظباة تسيل

''صرف تلوار کی دھار پر ہمارے خون بہتے ہیں اور دھار کے علاوہ کسی چیز پر نہیں بہتے۔''

نفس کے یہ دو معانی روح کے معنی میں نہیں۔ بہت سارے متاخرین کے نزدیک نفس سے اس کی مذموم صفات بھی مراد لی جاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے: ''فلان له نفس''، ''اترك نَفَسك'' ابو مرثد کا قول ہے: ''میں نے

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٢٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٧٠)

رب العزت کو خواب میں دیکھا تو کہا: اے رب! تم تک کس طرح پہنچا جا سکتا ہے تو رب تعالیٰ نے کہا: ''اترك نفسك'' ''اپنے نفس کو، یعنی بری عادتوں کو چھوڑ دے۔'' کیوں کہ ذات کو نہیں چھوڑا جا سکتا، بلکہ اس کی خواہشات اور مذموم افعال ہی کو چھوڑا جا سکتا ہے۔ اس کی مزید کئی مثالیں ہیں۔ کہا جاتا ہے: فلاں صاحبِ زبان ہے، فلاں کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں، فلاں صاحبِ دل ہے تو صاحبِ زبان سے بولنے والی زبان مراد ہوتی ہے، لمبے ہاتھوں سے کام کرنے والے اور ماہر ہاتھ مراد ہوتے ہیں اور صاحبِ دل سے عارفِ حق مراد ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ ﴾ [ق: ٣٧]

''بلاشبہ اس میں اس شخص کے لیے یقیناً نصیحت ہے جس کا کوئی دل ہو، یا کان لگائے، اس حال میں کہ وہ (دل سے) حاضر ہو۔''

اسی طرح جب بدن نفس کے عشق میں گرفتار ہو جائے تو وہ کثرت کے ساتھ اس کی پیروی کرتا ہے۔ لفظِ روح کے برعکس لفظِ نفس سے خواہشات کی پیروی کرنے والا النفس بھی مراد لیا جاتا ہے، لیکن لفظِ روح سے یہ مراد نہیں لیا جاتا، کیوں کہ وہ بدن کی تدبیر کرنے کے اعتبار سے وہ، یعنی نفس نہیں۔

کہا جاتا ہے کہ نفوس کی تین اقسام ہیں:

1. نفسِ امارۃ: یعنی برائی پر اکسانے والا النفس۔ اس نفس پر گناہوں اور نافرمانیوں کی وجہ سے اپنی خواہشات کی پیروی غالب ہوتی ہے۔
2. نفسِ لوامہ: یہ نفس گناہ کرتا ہے اور توبہ کرتا ہے۔ اس میں خیر اور شر دونوں ہوتے ہیں، لیکن جب برائی کرتا ہے تو توبہ کرتا ہے اور اللہ کی طرف لوٹتا ہے، یہ چونکہ بندے کو گناہ پر ملامت کرتا ہے یا اچھائی اور برائی کے درمیان لڑھکتا رہتا ہے، اس لیے اسے لوامہ کہا جاتا ہے۔
3. نفسِ مطمئنہ: یہ نفس نیکی اور اچھائی پسند کرتا ہے اور نیکی کرتا ہے۔ برائی سے نفرت کرتا ہے اور یہ اس کی عادت، فطرت اور سرشت بن جاتی ہے۔

یہ ایک نفس کے مختلف احوال اور صفات ہیں، ورنہ ہر انسان کا نفس ایک ہی ہوتا ہے اور اس بات کو انسان خود اپنے نفس میں محسوس کر سکتا ہے۔ فلاسفر اطبا کے ایک گروہ کا کہنا ہے: ''نفوس کی تین قسمیں ہیں: نباتاتی نفس، یہ جگر میں ہے۔ حیوانی نفس، یہ دل میں ہے اور نفسِ ناطقہ، یہ دماغ میں ہے۔'' اگر تو ان کی اس سے یہ مراد ہے کہ یہ تین قوتیں ان اعضا کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں تو یہ بات درست ہے، لیکن اگر ان کی یہ مراد ہے کہ یہ تین مستقل اور قائم بذاتہ ذاتیں اور وجود ہیں تو یہ واضح طور پر غلط ہے۔

فصل (روح کی کیفیت):

سائل کا یہ کہنا کہ کیا اس کی کوئی کیفیت ہے جو معلوم کی جا سکتی ہے تو یہ درحقیقت مجمل سوال ہے۔ اگر تو اس کی مراد یہ ہے کہ جو کچھ اس کی صفات اور احوال سے معلوم کیا جا سکتا ہے، کیا وہ معلوم ہو سکتا ہے۔ اس کا جواب ہے، ہاں، وہ معلوم ہو سکتا ہے۔ اگر یہ مراد ہے کہ نظر آنے والے اجسام کی جنس سے اس کی کوئی مثال ہے؟ تو اس کا جواب نہیں میں ہے، کیوں کہ روح ہوا، پانی، آگ اور مٹی جیسے عناصرِ اربعہ کی جنس سے تعلق رکھتی ہے نہ حیوانات، نباتات اور معدنیات کے اجسام کی جنس سے تعلق رکھتی ہے اور نہ افلاک وکواکب کی جنس ہی سے ہے۔ اس کی کوئی نظر آنے والی مثال نہیں اور کوئی ایسی جنس نہیں ہے جو ذہن میں موجود ہو، اسی لیے کہا جاتا ہے: اس کی کیفیت معلوم نہیں۔ نیز یہ بھی کہا جاتا ہے: "من عرف نفسه فقد عرف ربه" ''جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا، اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔''

یہ پہچان اعتبار، مقابلہ اور امتناع کے پہلوؤں سے ہوتی ہے۔ اعتبار اور فرض کے لحاظ سے اس طرح کہ انسان اپنے بارے میں جانتا ہے کہ وہ زندہ ہے، علم رکھتا ہے، قدرت رکھتا ہے، دیکھتا ہے، سنتا ہے، بات کرتا ہے، ان معانی کو وہ اچھی طرح سمجھتا ہے تو ان کو مدِنظر رکھ کر وہ اللہ تعالیٰ کی اپنے بارے میں بتائی ہوئی باتوں کے مفہوم سمجھ لیتا ہے کہ وہ حیی، علیم، قدیر اور سمیع وبصیر ہے، کیوں کہ اگر انسان اپنی ذات میں موجود ان معانی کو نہ سمجھتا ہو اور اپنے آپ میں ان کو نہ دیکھتا ہو تو اس کے لیے اس کو سمجھنا ممکن نہیں ہوتا جو اس کی نظروں سے اوجھل ہو۔ اسی طرح اگر دنیا میں موجود شہد، دودھ، پانی، شراب، ریشم، سونا اور چاندی وغیرہ کی طرح کی چیزوں کے تصور سے ناآشنا ہو تو اس کے لیے جنت میں بتائی گئی چیزوں کا تصور محال ہو گا جو اس کی نظروں سے اوجھل ہیں، لیکن یہ ضروری نہیں کہ جو اوجھل ہو وہ بعینہ اسی کی طرح ہو جو نظر آ رہا ہے۔ اسی لیے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا تھا: "ليس في الدنيا مما في الجنة إلا الأسماء" ''دنیا میں جنت کی چیزوں کے صرف نام ہیں۔''

یہ حقائق جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ وہ جنت میں ہوں گے وہ دنیا میں موجود اشیا کے ہم مثل نہیں، یعنی یہ ضروری نہیں کہ جو دنیا کی ان چیزوں کے لیے امور جائز ہوں وہ ان کے لیے بھی جائز ہوں، جو ان کے لیے واجب ہوں وہ ان کے لیے بھی واجب ہوں اور جو ان کے لیے ممتنع ہوں ان کے لیے بھی ممتنع ہوں۔ ان دونوں کا مواد ایک ہی ہو اور دونوں کا ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلنا ایک ہی طرح کا ہو۔

ہم جانتے ہیں کہ جنت کا پانی خراب ہو گا نہ بوسیدہ، اس کے دودھ کا ذائقہ نہیں بدلے گا، اس کی شراب سردرد اور نشہ پیدا نہیں کرے گی، اس کا پانی مٹی سے پھوٹے گا نہ آسمان سے اترے گا جس طرح دنیا میں ہوتا ہے اور اس کا دودھ جانوروں سے پیدا نہیں ہو گا جس طرح دنیا میں ہوتا ہے۔

اگر یہ مخلوق اس مخلوق کے ساتھ نام میں مشابہت رکھتی ہے اور ان میں ایک قدرِ مشترک اور مشابہت ہے تو ہمیں ان الفاظ کا معنی معلوم ہو جاتا ہے جن کے ساتھ ہمیں مخاطب کیا گیا ہے، حالانکہ حقیقت ایک نہیں اور حقیقت، حقیقت کی طرح نہیں۔ خالق سبحانہ وتعالیٰ تو ان مخلوقات کی مشابہت سے بھی بہت دور ہے جو جنت میں ہوں گی دنیا کی مخلوقات سے مشابہت رکھنا تو ایک طرف رہا۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اگر اپنے بارے میں بتایا ہے کہ وہ زندہ ہے، علم رکھتا ہے، سنتا ہے، دیکھتا ہے اور قدرت رکھتا ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اپنی مخلوق کے ہم مثل ہو، بلکہ اس کا مخلوق سے مماثلت رکھنا اتنا ہی دور ہے جتنا ایک مخلوق کا دوسری مخلوق کے ساتھ مشابہت رکھنا، بلکہ اس سے بھی بہت بڑھ کر۔ ہر چھوٹے سے چھوٹا جانور بھی زندگی، قوت اور عمل رکھتا ہے، لیکن اس کی زندگی قوت اور عمل فرشتوں کی زندگی، قوت اور عمل سے مماثلت نہیں رکھتا، اس لیے یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ رب العالمین اپنی مخلوقات کی کسی بھی چیز سے مماثلت رکھتا ہو؟

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی ذات اور صفات کو نام دیے ہیں اور وہی نام اپنی بعض مخلوقات کو بھی دیے ہیں۔ اس نے اپنا نام، حي، علیم، سمیع، بصیر، عزیز، جبار، متکبر، ملک، رؤف اور رحیم رکھا ہے اور اپنے بعض بندوں کو بھی علیم، بعض کو حلیم، بعض کو رؤف و رحیم، بعض کو سمیع و بصیر، بعض کو ملک، بعض کو عزیز اور بعض کو جبار اور متکبر کا نام دیا ہے۔ یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ بندہ حلیم، اللہ حلیم کی طرح نہیں اور بندہ سمیع اللہ سمیع کی طرح نہیں، اسی طرح تمام اسما میں کوئی مشابہت نہیں۔

درج ذیل آیات میں ایک طرف اللہ تعالیٰ کے اسما و صفات ہیں اور دوسری طرف بندوں کو بھی وہی نام دیے گئے ہیں:

1 ﴿ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴾ [النساء: ١١]

''بے شک اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا، بڑی حکمت والا ہے۔''

دوسری طرف:

﴿ وَبَشَّرُوهُ بِغُلَامٍ عَلِيمٍ ﴾ [الذاریات: ٢٨]

''اور انھوں نے اسے ایک بہت علم والے لڑکے کی خوش خبری دی۔''

2 ﴿ إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝١٤٣ ﴾ [البقرة: ١٤٣]

''بے شک اللہ لوگوں پر یقیناً بے حد شفقت کرنے والا، نہایت رحم والا ہے۔''

دوسری طرف:

﴿ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝١٢٨ ﴾ [التوبة: ١٢٨]

''مومنوں پر بہت شفقت کرنے والا، نہایت مہربان ہے۔''

3 ﴿ إِنَّ اللَّهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا ﴾ [النساء: ۵۸]

''بے شک اللہ ہمیشہ سے سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔''

دوسری طرف:

﴿ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَٰهُ سَمِيعًا بَصِيرًا ﴾ [الدھر: ۲]

''ہم اسے آزماتے ہیں، سو ہم نے اسے خوب سننے والا، خوب دیکھنے والا بنا دیا۔''

اسی طرح دیگر مذکورہ اسما میں۔

لیکن انسان جس کو جانتا ہے، اس کو بنیاد بنا کر غیر معلوم کی معرفت حاصل کرتا ہے۔ اگر اس طرح نہ ہوتا تو اس کے لیے بہت سارے غائب امور کی معرفت حاصل کرنے کے راستے مسدود ہو جاتے۔

تقابل کے اعتبار سے اس طرح کہ جو انسان بندگی کے ساتھ اپنے نفس کو پہچانتا ہے وہ اپنے رب کو ربوبیت کے ساتھ پہچان لیتا ہے۔ جو اپنے نفس کو فقر کے ساتھ پہچانتا ہے وہ اپنے رب کو غنا اور تونگری سے پہچانتا ہے۔ جو اپنے نفس کو عجز سے پہچانتا ہے تو مقابلے میں اپنے رب کو قدرت سے پہچانتا ہے، اپنے نفس کو جہالت کے ساتھ پہچانتا ہے تو مقابلے میں اپنے رب کو علم کے ساتھ پہچانتا ہے اور اپنے نفس کو ذلت کے ساتھ پہچانتا ہے اور اس کے مقابلے میں اپنے رب کو عزت کے ساتھ پہچانتا ہے، کیوں کہ بندے کے نفس اور ذات میں عدم کے سوا کچھ نہیں اور تمام صفاتِ نقص عدم کی طرف ہی لوٹتی ہیں، لیکن رب تعالیٰ کی تمام صفات، صفاتِ کمال ہیں۔ وہ اس کی ذات کے لوازم ہیں اور اس کا ازلی اور ابدی طور پر ان صفات سے جدا ہونا محال ہے۔ نیز ان کا عدم بھی محال ہے، کیوں کہ وہ ازلی اور ابدی واجب الوجود ہے۔ اس کی صفاتِ کمال اس کی ذات کے ساتھ لازم ہیں اور لازم اسی وقت زائل ہو سکتا ہے جب ملزوم زائل ہو، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کمال میں سے کوئی بھی صفت اس کی ذات کے عدم کے بغیر معدوم نہیں ہو سکتی اور اس کی ذات کا معدوم ہونا ممتنع اور محال ہے، لہٰذا اس کی صفاتِ کمال میں سے کسی بھی صفت کا معدوم ہونا بھی محال ہے۔

پھر عجز و امتناع، یعنی عدمِ امکان کے لحاظ سے اس طرح کہ بندے کا نفس اور اس کی ذات جو اس کے سب سے زیادہ قریب ہوتی ہے، بلکہ وہ اس کی شناخت ہے، وہ اس کی کیفیت بھی نہیں جانتا اور نہ اس کی حقیقت کا پوری طرح علم رکھتا ہے تو خالق عزوجل کی کیفیت جاننا اور اس کی حقیقت کا پوری طرح علم رکھنا کس طرح ممکن ہے؟ اسی لیے ساری مخلوق سے افضل اور اپنے رب کے بارے میں سب سے زیادہ جاننے والی شخصیت بھی کہا کرتی تھی:

« اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ وَبِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوْبَتِكَ، وَبِكَ مِنْكَ لَا

أُحۡصِي ثَنَاءً عَلَيۡكَ، أَنۡتَ كَمَا أَثۡنَيۡتَ عَلىٰ نَفۡسِكَ »[1]

''اے اللہ! میں تیری رضا کے ساتھ تیرے غصے سے پناہ مانگتا ہوں، تیری معافی کے ساتھ تیری سزا سے پناہ مانگتا ہوں اور تیری ذات کے ساتھ تجھ سے پناہ مانگتا ہوں، میں تیری تعریف کا احاطہ ہی نہیں کرسکتا، تو اسی طرح ہے جس طرح تو نے اپنی تعریف کی ہے۔''

صحیح مسلم وغیرہ میں ہے کہ آپ ﷺ سجدے میں یہ دعا پڑھا کرتے تھے اور ترمذی وغیرہ میں ہے کہ آپ ﷺ قنوتِ وتر میں یہ پڑھا کرتے تھے،[2] اس حدیث میں بھی کچھ نظر ہے، لیکن پہلی صحیح اور ثابت ہے۔

فصل (روح جوہر ہے کہ عرض؟):

سائل کا پوچھنا کہ کیا روح جوہر ہے یا عرض تو لفظ جوہر میں اجمال ہے۔ یہ تو ظاہر بات ہے کہ جوہر کا لغوی معنی نہیں پوچھا گیا، حالانکہ اس لفظ کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ عربی زبان سے تعلق نہیں رکھتا۔

تاہم سائل کی جوہر سے مراد اصطلاحی جوہر ہے جس کے مطابق تمام موجودات کو جوہر اور عرض میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

حکما میں سے کچھ جوہر سے وہ چیز مراد لیتے ہیں جو متحیز، یعنی دائرے میں سما سکتی ہو۔ ان کے نزدیک جسم متحیز جوہر ہے۔ کبھی جوہر سے ان کی مراد فرد ہوتا ہے۔ یہ اس جز کو کہتے ہیں جو مزید تقسیم نہیں ہوسکتا۔ تاہم حکما کا اس میں اختلاف ہے کہ کیا اجسام مفرد جواہر سے مرکب ہیں یا مادہ اور شکل سے مرکب اور بنے ہیں یا ان دونوں ہی سے مرکب نہیں؟

ان تین اقوال میں سے صحیح ترین قول تیسرا ہے جس کے مطابق اجسام نہ تو جواہرِ مفردہ سے مرکب ہیں اور نہ مادہ اور شکل ہی ہے۔ اکثر متکلمین جیسے، ہشامیہ، ضراریہ، نجاریہ، کلابیہ اور اکثر کرامیہ اور جمہور فقہا و محدثین اور صوفیہ وغیرہ کا قول بھی یہی ہے، بلکہ اکثر حکما نے بھی یہ قول اختیار کیا ہے اور اس کی تفصیل اس کے مقامِ بحث پر گزر چکی ہے۔

جو کہتے ہیں کہ لفظ جوہر متحیز کو کہا جاتا ہے وہ پھر اختلاف کرتے ہیں کہ کیا کوئی ایسا جوہر بھی ہوسکتا ہے جس کا وجود متحیز نہ ہو؟ ان میں سے کچھ کا کہنا ہے کہ ہر موجود یا جوہر ہوتا ہے یا عرض اور موجودِ واجب جوہر کے مسمّٰی میں داخل ہو جاتا ہے۔ کچھ دوسرے کہتے ہیں: ہر موجود جسم ہوتا ہے یا عرض، لہٰذا موجودِ واجب جسم کے مسمّٰی میں داخل ہوتا ہے۔

یہ دونوں اقوال مسلمان مفکرین کے ایک ایک گروہ نے کہے ہیں۔ فلاسفہ اور عیسائی اس کو جوہر کہتے ہیں، جسم نہیں کہتے۔ بعض مسلمان حکما سے یہ منقول ہے کہ وہ اس کو جسم کہتے ہیں، جوہر نہیں کہتے۔ ان کے نزدیک جسم وہ ہوتا

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٨٦)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٢٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٦٦) صحيح الجامع (١٢٨١)

ہے جس کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے، یا وہ قائم بنفسہ ہوتا ہے اور جوہر مفرد جوہر ہوتا ہے۔

لفظِ عرض کا لغوی معنی ہے وارد ہونا اور زائل ہونا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ يَأْخُذُونَ عَرَضَ هَٰذَا الْأَدْنَىٰ ﴾ [الأعراف: ١٦٩] ''وہ اس حقیر دنیا کا سامان لیتے ہیں۔''

لیکن علمِ کلام کی اصطلاح میں عرض سے مراد وہ چیز ہوتی ہے جو مطلقاً کسی دوسرے کے ساتھ قائم ہو۔ کبھی اس سے وہ صفات بھی مراد لی جاتی ہیں جو جسم کے ساتھ قائم ہوتی ہیں۔ اس اصطلاحی معنی کے علاوہ بھی اس کے بہت زیادہ معانی ہیں۔

سلف صالحین، ائمہ امت اور عام اہلِ سنت اللہ تعالیٰ کی صفات کا اثبات کرتے ہیں۔ وہ اس کے علم، قدرت، زندگی اور کلام کا اقرار کرتے ہیں اور ان کو صفات کہتے ہیں۔ پھر ان میں سے کچھ لوگ کہتے ہیں: یہ صفات ہیں اعراض نہیں، کیوں کہ عرض دو زمانوں میں باقی نہیں رہتا، یعنی اس میں ہر لحہ تبدیلی اور تجدد ہوتا ہے، لیکن یہ صفات باقی ہیں۔

جو کہتا ہے کہ ہر عرض دو زمانوں میں باقی نہیں رہتا اس کا یہ قول کمزور ہے۔ اگر باقی رہنے والی صفات کو اعراض کہا جا سکتا ہے تو ان کو بھی اعراض کہا جا سکتا ہے۔ کچھ کہتے ہیں: ہم اس میں مطلقاً کچھ نہیں کہہ سکتے، کیوں کہ اطلاق کے لیے شرعی دلیل کی ضرورت ہے۔

پھر علما کا اس بات میں بھی اختلاف ہے کہ کیا وہ لفظ جس کا لغوی، عقلی اور شرعی معنی درست ہو وہ اللہ تعالیٰ کا نام رکھا جا سکتا ہے، اگر چہ اس کو بولنے پر نہ کوئی نص دلالت کرتی ہو اور نہ اجماع ہی؟ یا وہی لفظ بولا جائے گا جو کسی نص میں وارد ہوا ہو یا جس کے بولنے پر اجماع منعقد ہوا ہو؟ اس میں یہ دو مشہور اقوال ہیں۔

عام مفکرین اور حکما ایسے الفاظ کا اطلاق کرتے ہیں جو کسی نص یا اجماع سے ثابت نہیں، جیسے: لفظ قدیم اور لفظ ذات وغیرہ ہیں۔ کچھ لوگ ان ناموں میں جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو پکارا جاتا ہے اور ان ناموں میں جن کے ساتھ ضرورت کے وقت اس کے بارے میں بتایا جاتا ہے، فرق کرتے ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو جب پکارا جائے تو اس کے اسمائے حسنیٰ ہی کے ساتھ پکارا جائے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَلِلَّهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ فَادْعُوهُ بِهَا ﴾ [الأعراف: ١٨٠]

''اور سب سے اچھے نام اللہ ہی کے ہیں، سو اسے ان کے ساتھ پکارو۔''

لیکن جب اس کے بارے میں بتانے کے لیے کسی لفظ کا سہارا لینا پڑے، مثلاً: یہ کہا جائے: وہ قدیم ہے، نہ موجود ہے اور نہ قائم بنفسہ ذات ہے وغیرہ تو اس کے جواب میں اس کا اثبات کرتے ہوئے کہا جائے گا: وہ قدیم ہے، موجود ہے اور قائم بنفسہ ذات ہے۔ اگر کہا جائے: ''وہ کوئی چیز نہیں'' تو کہا جائے: وہ چیز ہے تو یہ استعمال جائز ہے۔

اگر چہ اس کو ایسے ناموں کے ساتھ نہیں پکارنا چاہیے، جس میں اس کی کوئی تعریف نہ ہو، مثلاً: کوئی کہے: اے چیز! کیوں کہ یہ لفظ ہر موجود پر عمومی طور پر بولا جاتا ہے، اسی طرح لفظ ذات اور موجود ہے، لیکن اگر کوئی اللہ تعالیٰ کو تلاش کرنے کے بعد پا لینے کی وجہ سے موجود کہے تو یہ اس موجود سے خاص ہوتا ہے جو خالق اور مخلوق پر عمومی طور پر بولا جاتا ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَ وَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ ﴾ [النور: ٣٩] ''اور اللہ کو اپنے پاس پاتا ہے۔''

اگر یہ بنیادی باتیں واضح ہوگئی ہیں تو نفس انسانی بدن کی تدبیر کرنے والی روح، ان چیزوں سے تعلق رکھتی ہے جو بنفسہ قائم ہوتی ہیں، جنھیں جوہر اور قائم بنفسہ ذات کہا جاتا ہے، یہ اعراض سے تعلق نہیں رکھتی جو قائم بغیرہ صفات ہوتی ہیں، لیکن اس کو جوہر یا جسم کہنے میں اختلاف ہے، یہ اختلاف کچھ اصطلاحی ہے اور کچھ معنوی، جو جوہر سے قائم بنفسہ چیز مراد لیتا ہے تو یہ جوہر ہے، جو جسم سے ایسی چیز مراد لیتا ہے جس کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہو تو یہ اس کے نزدیک جسم ہے۔ جس کے نزدیک جسم سے مراد جواہرِ مفردہ کا مرکب یا مادہ اور صورت کا مرکب ہے تو ان میں سے بھی کچھ اس کو جسم کہتے ہیں۔ جو جوہر سے تقسیم سے قابل متحیز مراد لیتے ہیں تو ان میں سے کچھ کہتے ہیں کہ یہ جوہر ہے، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ نہ تو جواہرِ مفردہ، یا مادہ اور شکل سے مرکب ہے اور نہ ان اجسام کی جنس سے ہے جو متحیز ہیں، دیکھے جاتے ہیں اور ذہن میں ہوتے ہیں۔

جہاں تک اس کی طرف اشارے کی بات ہے تو اس کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے، یہ اترتا ہے، بدن سے نکلتا ہے، نکالا جاتا ہے، جس طرح شرعی نصوص میں ذکر ہوا ہے اور عقلی شواہد بھی دلالت کرتے ہیں۔

فصل:

یہ سوال کہ جسم میں اس کا مسکن کہاں ہے؟ تو روح کے لیے جسم میں کوئی خاص جگہ نہیں، بلکہ یہ اسی طرح جسم میں چلتی ہے، جس طرح سارے جسم میں زندگی چلتی ہے۔ زندگی روح کے ساتھ مشروط ہے، اگر جسم میں روح ہو تو اس میں زندگی ہوتی ہے، اگر وہ اس سے جدا ہو جائے تو اس سے زندگی جدا ہو جاتی ہے۔

فصل (جسم عقل کا مسکن):

یہ سوال کہ جسم میں عقل کہاں رہتی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے عقل اس انسان کے نفس کے ساتھ قائم ہوتی ہے جو عقل رکھتا ہے، لیکن جسم میں یہ دل کے ساتھ متعلق ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا ﴾ [الحج: ٤٦]

''پھر کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ ان کے لیے ایسے دل ہوں جن کے ساتھ وہ سمجھیں۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا: آپ نے کس طرح علم حاصل کیا؟ انھوں نے جواب دیا: ''بلسان سؤول وقلب عقول'' ''بہت زیادہ سوال کرنے والی زبان اور بہت زیادہ سمجھنے والے دل کے ساتھ۔''

لیکن لفظ قلب (دل) سے کبھی تو وہ صنوبری شکل (بند مٹھی کی شکل) کا گوشت کا ٹکڑا مراد ہوتا ہے جو سینے میں بائیں جانب ہوتا ہے جس کے اندر سیاہ جما ہوا خون ہوتا ہے، جس طرح بخاری و مسلم کی اس حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« إِنَّ فِيْ الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ لَهَا سَائِرُ الْجَسَدِ، وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ لَهَا سَائِرُ الْجَسَدِ »[1]

''جسم میں ایک ٹکڑا ہوتا ہے اگر وہ صحیح رہے تو اس کے لیے سارا بدن صحیح رہتا ہے، اگر خراب ہو جائے تو اس کے لیے سارا بدن خراب ہو جاتا ہے۔''

کبھی قلب سے مطلقاً انسان کا باطن مراد ہوتا ہے۔ اس معنی کو بنیاد بنا کر اگر قلب سے یہ مراد لیا جائے تو عقل دماغ کے ساتھ بھی تعلق رکھتی ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے: عقل دماغ میں ہے۔ اکثر اطبا بھی یہی کہتے ہیں۔ امام احمد سے بھی یہی منقول ہے۔ ان کے اصحاب کے ایک گروہ کا کہنا ہے، عقل بنیادی طور پر دل میں ہوتی ہے، جب مکمل ہو جاتی ہے تو دماغ تک پہنچ جاتی ہے۔

تحقیقی بات یہ ہے کہ روح، جو نفس ہے، اس کا ان دونوں کے ساتھ تعلق ہے اور جس کو عقل کہا جاتا ہے اس کا تعلق بھی ان دونوں کے ساتھ ہے، لیکن فکر و نظر دماغ میں ہوتی ہے اور ارادہ دل میں ہوتا ہے۔

عقل سے علم بھی مراد ہوتا ہے اور عمل بھی، کیوں کہ اختیاری علم و عمل کی بنیاد ارادہ ہے۔ ارادہ اصل میں دل میں ہوتا ہے اور ارادہ کرنے والا اس وقت تک ارادہ نہیں کر سکتا جب تک اپنی مراد کا تصور نہ کر لے، لہٰذا ضروری ہے کہ دل تصور کرے۔ تو ارادہ اور تصور دونوں چیزیں دل میں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے اثرات دماغ کی طرف چڑھتے ہیں۔ وہیں اس کا آغاز ہوتا ہے۔ تو دل سے آغاز ہوتا ہے اور دماغ پر اختتام۔ لہٰذا دونوں اقوال کی صحیح وجہ اور پہلو موجود ہے۔ ان اوراق میں اتنا کچھ ہی لکھا جا سکتا تھا۔ واللہ أعلم[2]

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٥٢) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٥٩٩)

[2] مجموع الفتاویٰ (٩/٢٧١-٣٠٤)

جنات کا وجود

سوال اس شخص کے بارے میں کیا خیال ہے جو کہتا ہے کہ اگر مجھ پر جنات کی ماہیت اور ان کی صفات کی حقیقت واضح ہوگئی تب تو ٹھیک ورنہ اس بابت میں علما کی کوئی بات تسلیم نہیں کروں گا؟

جواب اس پر جنات کی کیفیت اور ان کی ماہیت کا واضح نہ ہونا صرف یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنے عدمِ علم کی اطلاع دے رہا ہے، وہ جنوں کے وجود کا منکر نہیں ہے، کیوں کہ ان کا وجود کتاب اور سنت کے علاوہ دوسرے بہت سے ذرائع سے ثابت ہے۔ بہت سے لوگ ایسے موجود ہیں جنھوں نے ان کو دیکھا ہے اور ان لوگوں کی بھی کمی نہیں جنھوں نے جن دیکھنے والوں کو دیکھا ہے۔ یہ سب باتیں اس کی نظر میں یقینی ہیں اور مشاہدات اس کے گواہ ہیں۔

بعض ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے جنوں سے بات کی ہے اور جنوں نے ان سے بات کی ہے۔ اسی طرح کچھ ایسے افراد بھی پائے جاتے ہیں جو جنوں کو حکم دیتے، انھیں بعض باتوں سے منع کرتے اور ان پر تصرف رکھتے ہیں۔ یہ نیک صالح افراد کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور غیر صالح افراد کے ساتھ بھی۔ اگر میں وہ واقعات ذکر کرنے بیٹھ جاؤں جو جنوں کے تعلق سے میرے اور میرے اصحاب کے ساتھ گزرے ہیں تو بات بہت لمبی ہوجائے گی۔

اسی طرح ان واقعات کی بھی کثرت ہے جو ہمارے علاوہ دوسروں کے ساتھ گزرے ہیں، لیکن علمی جوابات پر اعتماد اس علم کی اساس پر ہوتا ہے جو سب کے درمیان مشترک ہو، اس علم پر نہیں جو صرف جواب دینے والے کے ساتھ خاص ہو اِلا یہ کہ جواب ایسے شخص کو دیا جا رہا ہو جو جواب دینے والے کو سچا جانتا اور اس کی اطلاعات پر بھروسا کرتا ہو۔[1]

کیا جن مکلّف ہیں؟

سوال کیا مومن جنات اسلامی عبادات نماز اور روزے کے بھی مکلّف ہیں یا وہ صرف تصدیق کرنے کے مکلّف بنائے گئے ہیں؟

جواب اس میں کوئی شک نہیں کہ انھیں تصدیق سے زیادہ اعمال کا حکم دیا گیا ہے اور تکذیب کے علاوہ دوسرے اعمال سے بھی انھیں منع کیا گیا ہے۔ وہ اپنے حسبِ حال اصول اور فروع دونوں کے پابند بنائے گئے ہیں۔ حد اور حقیقت میں وہ انسانوں کی طرح نہیں ہیں، جس حد تک انسانوں کو اوامر و نواہی کا پابند کیا گیا ہے، جنوں کے اوامر و نواہی اس کے مساوی نہیں ہیں، لیکن امر و نہی اور حلال و حرام کی جنسِ تکلیف میں وہ انسانوں کے ساتھ شریک ہیں۔ یہ بات تسلیم شدہ ہے، اس میں اہلِ اسلام کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٢٣٢/٤)

اسی طرح اس بابت بھی ان میں اختلاف نہیں ہے کہ جنوں میں سے جو کافر، فاسق اور نافرمان ہوں گے، آدمیوں کی طرح وہ بھی عذابِ جہنم کے مستحق ہوں گے، البتہ ان میں سے جو مومن ہیں ان کے بارے میں اختلاف ہے۔ جمہور، یعنی امام مالک کے اصحاب، امام شافعی، امام احمد، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کا خیال ہے کہ وہ جنت میں داخل ہوں گے۔ ایک حدیث میں، جسے طبرانی نے نقل کیا ہے، یہ ہے کہ ''وہ جنت کی فصیل کے نیچے ہوں گے، انھیں انسان دیکھیں گے، لیکن وہ انسانوں کو نہیں دیکھ سکیں گے۔''

اس کے برعکس ایک دوسری جماعت کا، جس میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ شامل ہیں، جیسا کہ ان سے نقل کیا جاتا ہے، خیال ہے کہ جنوں میں سے جو مطیع وفرماں بردار رہے ہوں گے وہ جانوروں کی طرح مٹی بنا دیے جائیں گے اور جہنم سے نجات ہی کو ان کا ثواب قرار دیا جائے گا۔

کیا ان کے درمیان رسول بھیجے گئے تھے یا صرف ڈرانے والے آئے تھے؟ اس سلسلے میں دو اقوال ہیں:

① ایک قول یہ ہے کہ ان کے درمیان رسول آئے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ ﴾ [الأنعام: ١٣٠]

''اے جنوں اور انسانوں کی جماعت! کیا تمھارے پاس تم میں سے کوئی رسول نہیں آئے۔''

② اس سلسلے میں دوسرا قول یہ ہے کہ رسول تو انسانوں میں آئے ہیں اور جنوں میں ڈرانے والے آئے ہیں۔ یہی قول زیادہ مشہور ہے۔ ان کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ انھوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی اتباع کی تھی اور انھوں نے کہا تھا:

﴿ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ۝ قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ﴾

[الأحقاف: ٢٩۔٣٠]

''تو اپنی قوم کی طرف ڈرانے والے بن کر واپس لوٹے۔ انھوں نے کہا اے ہماری قوم! بے شک ہم نے ایک ایسی کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے۔''

رہا اس آیت کا سوال جس میں یہ کہا گیا ہے: ''کیا تمھارے پاس تم ہی میں سے پیغمبر نہیں آتے رہے۔'' تو یہ اللہ کے اس قول کی طرح ہے:

﴿ يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ﴾ [الرحمن: ٢٢] ''ان دونوں سے موتی اور مرجان نکلتے ہیں۔''

موتی اور مونگے کھارے پانی سے نکلتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرح بھی ہے:

﴿ وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ﴾ [نوح: ١٦]

''اور اس نے ان میں چاند کو نور بنایا اور سورج کو چراغ بنا دیا۔''

اور چاند ایک میں ہے۔ جنوں کو بھی امر و نہی کا حکم دیا گیا اور وہ بھی تحلیل و تحریم کے قوانین کے پابند ہیں۔ اس کے لیے بہت سے دلائل ہیں، جیسے وہ حدیث جو صحیح مسلم میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''میرے پاس جنوں کا داعی آیا۔ میں اس کے ساتھ گیا۔ میں نے ان کے سامنے قرآن کی تلاوت کی۔''

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں اس جگہ لے کر گئے اور ہمیں ان کے اور ان کی آگ کے آثار دکھائے۔ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زاد اور طعام کے بارے میں پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر وہ ہڈی جس کو اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو وہ بڑی مقدار میں تمھارے ہاتھ آئے گی اور ہر لید اور گوبر تمھارے جانوروں کا کھانا ہوگا۔'' اسی وجہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''تم ہڈی اور گوبر سے استنجا نہ کیا کرو۔''[1]

یہ حکم آپ نے اس لیے دیا، تاکہ جنوں کا کھانا اور ان کے جانوروں کی خوراک خراب نہ ہو۔ یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ ان کے لیے صرف ان ذبیحوں کی ہڈی حلال ہے، جن کو اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو۔ جن جانوروں کو اللہ کے نام پر ذبح نہ کیا گیا ہو ان کی ہڈی ان کے لیے حلال نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَقَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾ [الأنفال: ٤٨]

''اور جب شیطان نے ان کے لیے اعمال خوش نما بنا دیے اور کہا آج تم پر لوگوں میں سے کوئی غالب آنے والا نہیں اور یقیناً میں تمھارا حمایتی ہوں، پھر جب دونوں جماعتوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو وہ اپنی ایڑیوں پر واپس پلٹا اور اس نے کہا بے شک میں تم سے بری ہوں، بے شک میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ رہے ہو، بے شک میں اللہ سے ڈرتا ہوں اور اللہ بہت سخت عذاب والا ہے۔''

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ شیطان اللہ سے ڈرتا ہے اور سزا یا تو کسی امر کے ترک کرنے پر دی جاتی ہے یا کسی ممنوع کام کے ارتکاب پر دی جاتی ہے اور یہ محض تصدیق نہیں ہے۔

مزید یہ کہ ابلیس جو جنوں کا باپ ہے، اس کی معصیت تکذیب نہیں تھی۔ اللہ نے اسے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٤٥٠)

کا حکم دیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اللہ نے اسے یہ حکم دیا ہے اور اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی رسول نہیں تھا، جس کو اس نے جھٹلایا تھا، لیکن جب اس نے سجدہ کرنے سے انکار کیا تو اللہ نے اسے بدترین سزا دی۔ اسی لیے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

''جب ابن آدم سجدہ کرتا ہے تو شیطان روتے ہوئے اس سے الگ ہٹ جاتا ہے۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام کے واقعے میں فرمایا:

﴿وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ وَّاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ﴾ [سبا: ١٢]

''اور سلیمان کے لیے ہوا کو (تابع کر دیا)، اس کا صبح کا چلنا ایک ماہ کا اور شام کا چلنا ایک ماہ کا تھا اور ہم نے اس کے لیے تانبے کا چشمہ بہایا، اور جنوں میں سے کچھ وہ تھے جو اس کے سامنے اس کے رب کے اذن سے کام کرتے تھے اور ان میں سے جو ہمارے حکم سے کجی کرتا، ہم اسے بھڑکتی آگ کا کچھ عذاب چکھاتے تھے۔''

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ذکر کیا ہے کہ انھیں سلیمان علیہ السلام کی اطاعت کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کے بارے میں یہ ذکر فرمایا ہے کہ اس نے نافرمانی کی تھی، یہ نہیں کہا کہ اس نے تکذیب کی تھی۔ جنوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٣٠﴾ يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٣١﴾ وَمَنْ لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْاَرْضِ﴾ [الأحقاف: ٣٠-٣٢]

''انھوں نے کہا اے ہماری قوم! بے شک ہم نے ایک ایسی کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے، اس کی تصدیق کرنے والی ہے جو اس سے پہلے ہے، وہ حق کی طرف اور سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔ اے ہماری قوم! اللہ کی طرف بلانے والے کی بات قبول کرو اور اس پر ایمان لے آؤ، وہ تمھیں تمھارے گناہ معاف کر دے گا اور تمھیں دردناک عذاب سے پناہ دے گا اور جو اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت قبول نہ کرے گا تو نہ وہ زمین میں کسی طرح عاجز کرنے والا ہے۔''

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ انھیں اللہ تعالیٰ کے داعی کی، جو رسول ہی تھے، دعوت پر لبیک کہنے کا حکم دیا گیا تھا۔

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٨١)

دعوت کا جواب دینا اور اسے قبول کرنا امر ونہی کی اطاعت ہی ہے اور یہ وہی عبادت ہے جس کے لیے جن و انسان کی تخلیق کی گئی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ﴾ [الذاريات: ٥٦]

''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا نہیں کیا مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں۔''

جو یہ کہتا ہے کہ عبادت سے مراد وہ معرفت ہے جو فطرت میں موجود ہے اور وہ وہی ایمان ہے جو جن وانس کے صرف اندرون میں موجود ہے۔ اگر یہی بات ہوتی تو جن و انس میں کوئی کافر نہ ہوتا، جب کہ اللہ نے ابلیس اور دوسرے جن وانس کے کفر کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ أَجْمَعِينَ ﴾ [ص: ٨٥]

''کہ میں ضرور بالضرور جہنم کو تجھ سے اور ان سب لوگوں سے بھر دوں گا جو ان میں سے تیری پیروی کریں گے۔''

اللہ نے اس آیت میں بتا دیا ہے کہ وہ جہنم کو ان سے اور ان کے متبعین سے بھر دے گا اور یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ جہنم میں ابلیس کے متبعین ہی داخل کیے جائیں گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جتنے بھی کفار و فساق داخلِ جہنم ہوں گے وہ سب ابلیس ہی کی اتباع کرنے والے تھے۔ یہ حقیقت تو سبھی کو معلوم ہے کہ کفار نہ تو مومن ہیں اور نہ انھیں وہ معرفت حاصل ہے جس سے وہ مومن کہلائے جاسکیں۔

آیت میں حرفِ لام اس جملہ شرعیہ کے بیان کے لیے ہے جو ارادہ شرعیہ سے متعلق ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے:

﴿ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ﴾ [البقرة: ١٨٥]

''اللہ تمھارے ساتھ آسانی کا ارادہ رکھتا ہے اور تمھارے ساتھ تنگی کا ارادہ نہیں رکھتا۔''

اور اللہ کا یہ قول بھی ہے:

﴿ يُرِيدُ اللَّهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ ﴾ [النساء: ٢٦] ''اللہ چاہتا ہے کہ تمھارے لیے کھول کر بیان کرے۔''

کبھی حرف لام عاقبتِ کونیہ کے بیان کے لیے استعمال ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے:

﴿ فَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ ﴾ [الأنعام: ١٢٥]

''تو وہ شخص جسے اللہ چاہتا ہے کہ اسے ہدایت دے، اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔''

یہ اللہ تعالیٰ کے مندرجہ ذیل ارشاد کی طرح ہے:

﴿ وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ ۝ إِلَّا مَنْ رَحِمَ رَبُّكَ ﴾ [هود: ١١٨، ١١٩]

''اور وہ ہمیشہ مختلف رہیں گے، مگر جس پر تیرا رب رحم کرے۔''

مطلب یہ ہے کہ ایک قوم کو اختلاف کے لیے پیدا کیا ہے اور ایک دوسری قوم کو رحمت کے لیے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ ﴾ [الأعراف: ۱۷۹]

''اور بلاشبہ یقیناً ہم نے بہت سے جن اور انسان جہنم ہی کے لیے پیدا کیے ہیں۔''

اسی طرح لام اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں:

﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ﴾ [الذاريات: ٥٦]

''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا نہیں کیا مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں۔''

اگرچہ وہی لام ہے، لیکن اس کا مدلول فاعل کا ارادہ اور اس کا مقصود ہے۔ اسی لیے اللہ کی کتاب میں ارادے کی دو قسمیں بیان ہوئی ہیں: ایک ارادہ دینیہ اور دوسرے ارادہ کونیہ۔ اسی طرح اللہ کی کتاب میں کلمات، امر، نہی، حکم، قضا، تحریم اور اذن وغیرہ کی تقسیم ہے۔

مزید یہ آیت بھی ملاحظہ ہو:

﴿ يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِي وَيُنذِرُونَكُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَٰذَا ۚ قَالُوا شَهِدْنَا عَلَىٰ أَنفُسِنَا ۖ وَغَرَّتْهُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ أَنَّهُمْ كَانُوا كَافِرِينَ ﴾ [الأنعام: ۱۳۰]

''اے جنوں اور انسانوں کی جماعت! کیا تمھارے پاس تم میں سے کوئی رسول نہیں آئے، جو تم پر میری آیات بیان کرتے ہوں اور تمھیں اس دن کی ملاقات سے ڈراتے ہوں؟ وہ کہیں گے ہم اپنے آپ پر گواہی دیتے ہیں اور انھیں دنیا کی زندگی نے دھوکا دیا اور وہ اپنے آپ پر گواہی دیں گے کہ یقیناً وہ کافر تھے۔''

اس آیت سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ رسولوں نے اللہ کی آیات کی تلاوت جن و انس دونوں کے سامنے کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے ایک سورت صحابہ کرام کے سامنے پڑھی تو فرمایا: ''جنوں کے لیے بھی ہے جو یہاں تھے۔''[1] آپ ﷺ نے انھیں اطاعتِ الٰہی کی، جو امر و نہی پر مشتمل ہے، دعوت دی۔ محض اطاعت سے خالی بات کی دعوت نہیں۔ اسی طرح تصدیق ابلیس کے پاس تھی، لیکن قہرِ الٰہی سے اسے بچا نہیں سکی۔

اس اصل پر دلالت کرنے والے دلائل بہت ہیں اور اس موضوع پر آثار و احادیث بھی بہت ہیں، جن سے

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۲۹۱) صحيح الجامع (٥٠١٤)

ثابت ہوتا ہے کہ جن حج کرتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں، جہاد کرتے ہیں اور یہ کہ انھیں گناہوں پر سزا دی جائے گی۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں اطلاع دیتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَاَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَمِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ كُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا ﴾ [الجن: ١١]

''اور یہ کہ ہم میں سے کچھ نیک ہیں اور ہم میں کچھ اس کے علاوہ ہیں، ہم مختلف گروہ چلے آئے ہیں۔''

لوگوں نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ان کے بھی مختلف مذاہب ہیں۔ ان میں مسلمان بھی ہیں، یہودی و عیسائی بھی ہیں اور شیعہ اور سنی بھی ہیں۔

اس آیت میں اللہ نے یہ واضح فرما دیا کہ ان میں بعض صالح ہیں اور بعض صالح نہیں ہیں۔ اس صورت میں یا تو وہ فرماں بردار ہوگا تو وہ مومن ہوگا یا نافرمان ہوگا تو کافر کہلائے گا۔ مومن کی تقسیم صالح اور غیر صالح نہیں ہوتی، کیوں کہ غیر صالح کے بارے میں یہ اعتقاد درست نہیں ہے کہ وہ ترکِ طاعات سے غیر صالح ہوا ہے۔ صالح وہ ہے جو اپنے فرائض ادا کرتا ہو اور غیر صالح وہ ہوگا جو بعض اوامر میں نافرمانی کرے۔ یہ تقسیم غیر کافر کی ہے، کیوں کہ کافر کا اس طرح وصف بیان نہیں کیا جاتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جو بعض واجبات کو ترک کرتے ہیں۔ واللہ أعلم[1]

[1] مجموع الفتاویٰ (٤/٢٣٣ـ٢٣٧)

متفرق مسائل

زمین بوسی کا حکم

سوال کیا وہ شخص گناہ گار ہے جو زمین کو ہمیشہ بوسہ دیتا ہے؟ اسی طرح اس شخص کا کیا حکم ہے جس سے یہ کام زبردستی کرایا جاتا ہے اور وہ روزی کی خاطر مجبوری میں ایسا کرتا ہے؟

جواب زمین چومنا، سر اٹھانا اور اس جیسے دوسرے ایسے کام کرنا جن میں سجدہ کرنا پڑے، جیسا کہ بعض مشائخ اور بادشاہوں کے سامنے کیا جاتا ہے؛ یہ قطعاً جائز نہیں ہے، بلکہ رکوع کی حالت کی طرح جھکنا بھی روا نہیں ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ لوگوں نے نبی اکرم ﷺ سے پوچھا: ہم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی سے ملاقات کرتے وقت کیا اس کے لیے جھک سکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں۔ [1]

جب معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ شام سے واپس آئے تو انھوں نے نبی اکرم ﷺ کو سجدہ کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: معاذ! یہ کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا: اے اللہ کے رسول! میں نے اہلِ شام کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے مذہبی پیشواؤں کو سجدہ کرتے ہیں اور یہ بات وہ اپنے نبیوں کے حوالے سے ذکر کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ اپنے نبیوں کی طرف جھوٹ منسوب کرتے ہیں۔ اگر میں کسی کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ شوہر کے حق کی وجہ سے اسے سجدہ کرے۔ اے معاذ! سجدہ اللہ کے سوا کسی کے لیے روا نہیں۔ [2]

ایسا کام دین اور قربتِ الٰہی کا ذریعہ سمجھ کر کرنا عظیم ترین برائیوں میں سے ہے۔ اس طرح کے کاموں کو جو شخص قربتِ الٰہی اور دینی تقاضا سمجھتا ہے وہ گمراہ اور افترا پرداز ہے۔ اسے یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ کام نہ دین ہے اور نہ قربتِ الٰہی کا ذریعہ ہے۔ اس کے باوجود اگر وہ اپنے اس گمراہ کن عقیدے پر اصرار کرے تو اس سے توبہ کرائی جائے، توبہ کر لے تو ٹھیک ہے ورنہ اسے قتل کر دیا جائے۔

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧٢٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٧٠٢) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے حسن قرار دیا ہے۔

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٤٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٥٩) صحيح الجامع (٥١٧٠، ٥١٧١) صحيح الترغيب والترهيب (١٩٧/٢)

البتہ وہ شخص جس کو ایسا کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہو اور مجبوری بھی اس درجے کی ہو کہ اگر ایسا نہیں کرے گا تو مار پڑے گی، اسے قید کر دیا جائے گا، مال ضبط کر لیا جائے گا، بیت المال سے ملنے والا وظیفہ بند کر دیا جائے گا یا اس قسم کے دوسرے نقصانات سے دوچار ہونا پڑے گا تو ایسی صورت میں اکثر علما اسے جائز قرار دیتے ہیں، کیوں کہ ان کے نزدیک جبر و اکراہ سے حرام کام، جیسے: شراب پینا وغیرہ، جائز ہو جاتا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ کا مشہور قول یہی ہے۔ لیکن ایسے مجبور شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ دل سے اسے ناپسند کرے اور ممکنہ حد تک اس سے باز رہنے کی خواہش رکھے۔ اللہ تعالیٰ جس کے دل کی سچائی جان لے گا، اس کی مدد فرمائے گا اور اس کی سچائی کی برکت سے اس سے سرزد ہونے والے گناہ کو معاف فرما دے گا۔

ایک دوسری جماعت کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جبر و اکراہ کی صورت میں زبان سے کوئی خلافِ شرع بات نکالنا تو جائز ہے، لیکن اعضا و جوارح سے خلافِ شرع کوئی کام کرنا جائز نہیں ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور ان کے جیسے دوسرے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اس طرح کی روایت بیان کی جاتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ تقیہ صرف زبان سے ہوتا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کا ایک دوسرا قول بھی یہی ہے۔ البتہ اس طرح کا کام سیاسی اثر و رسوخ حاصل کرنے اور دولت میں اضافہ کرنے کے لیے کرنا ہرگز جائز نہیں ہے۔ اگر اس طرح کے کاموں کے لیے کوئی شخص مجبور کر دیا جائے اور اپنے دل میں نیت رکھے کہ یہ جھکنا اللہ کے لیے ہے تو یہ اس کے حق میں بہتر ہوگا، جیسے کہ کلمۂ کفر کہنے پر مجبور کر دیا جانے والا شخص اپنے دل میں اس کے جائز معنی کی نیت کر لے۔ واللہ أعلم.[1]

کسی کی آمد پر تعظیماً کھڑے ہونے کا حکم

سوال کسی معتبر شخص کی آمد پر اس کی تعظیم کے لیے اٹھنا اور کھڑے ہونا، جیسا کہ لوگوں کا معمول بن چکا ہے، جائز ہے یا ناجائز؟ خاص طور پر اس وقت جب بیٹھا ہوا شخص یہ خیال کرے کہ آنے والا شرمندہ ہوگا، دل میں اذیت محسوس کرے گا اور ممکن ہے کہ ایسا نہ کرنے سے وہ بغض و عداوت پر اتر آئے یا ناراض ہو جائے۔ اسی طرح محلات وغیرہ میں ملاقات کے وقت اس کی تعظیم کے لیے کھڑا ہونا، زمین کی طرف گردن اور سر جھکانا جائز ہے یا حرام ہے؟

اگر کوئی شخص عادتاً اور طبعاً ایسا کرتا ہے، اس کے قصد و ارادے کا اس میں کوئی دخل نہ ہو تو کیا یہ حرام ہے، یا محترم شخصیات اور علما کے حق میں ناجائز ہے؟

نیز اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جو یہ کام مطمئن ہو کر ہمیشہ کرتا ہے؟ کیا وہ گناہ گار ہے یا نہیں؟ اس

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۱/۳۷۲_۳۷۳)

موقع پر کسی کا یہ کہنا درست ہے یا غلط کہ میں نے سجدہ اللہ کو کیا ہے؟

جواب الحمد للہ رب العالمین. نبی اکرم ﷺ کے عہد میں خلفائے راشدین اور سلف کی یہ عادت نہیں تھی کہ وہ آپ کو دیکھ کر کھڑے ہو جایا کرتے ہوں، جیسا کہ بہت سے لوگ کرتے ہیں، بلکہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام کی نظر میں نبی اکرم ﷺ سے زیادہ کوئی محبوب نہیں تھا، لیکن وہ آپ ﷺ کو دیکھ کر کھڑے نہیں ہوتے تھے، کیوں کہ انھیں معلوم تھا کہ نبی اکرم ﷺ اسے پسند نہیں کرتے ہیں۔[1] البتہ بسا اوقات سفر سے واپس آنے والے سے ملاقات کے لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کھڑے ہو جاتے تھے، جیسا کہ نبی اکرم ﷺ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ عکرمہ کے آنے پر آپ ﷺ ان کے لیے کھڑے ہوئے۔[2] اسی طرح آپ نے سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے تشریف لانے پر انصار سے کہا: «قُومُوا إِلَى سَيِّدِكُمْ» ''اپنے سردار کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔''[3] سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ بنو قریظہ سے متعلق فیصلہ کرنے کے لیے آئے تھے، کیوں کہ انھیں کے فیصلے کی شرط پر وہ قلعے سے نیچے اترے تھے۔

البتہ لوگوں کے لیے مناسب یہ ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں سلف صالحین کے نقشِ قدم کی پیروی کریں، کیوں کہ یہی حضرات سب سے بہتر زمانے سے تعلق رکھتے ہیں، سب سے بہترین کلام، اللہ کا کلام ہے اور سب سے بہترین طریقہ محمد ﷺ کا طریقہ ہے۔ کوئی شخص مخلوقات میں سب سے بہتر شخصیت کی ہدایت اور خیر القرون کی روشنی سے ہٹ کر ان سے کم تر لوگوں کی پیروی نہ کرے۔ محترم شخصیت جس کی اطاعت کی جاتی ہے، اس کے لیے بہتر ہوگا کہ اپنے متبعین اور معتقدین کے لیے یہ چیز روا نہ رکھے کہ جب وہ اسے دیکھیں تو کھڑے ہو جایا کریں، اِلا یہ کہ کسی خاص ملاقات کا کوئی موقع ہو۔ سفر وغیرہ سے آنے والے شخص کا استقبال کرنے کے لیے کھڑے ہونا اچھا ہے۔

جہاں لوگوں کا معمول بن چکا ہو کہ وہ آنے والے کا کھڑے ہو کر تعظیم و اکرام کرتے ہوں، اگر اس طرح اس کی تعظیم نہ کی جائے تو یہ سمجھنے لگے کہ اس کا حق ادا نہیں کیا گیا یا اس کی قدر و منزلت کو گھٹانے کی کوشش کی گئی اور اسے سنت کے مطابق عادت کا علم نہ ہو تو بہتر ہے کہ کھڑے ہو کر اس کی تعظیم کی جائے، کیوں کہ اس سے باہمی محبت و یگانگت پیدا ہوتی ہے اور بغض و عداوت کا ازالہ ہوتا ہے، البتہ جسے سنت سے وابستہ قوم کی عادت کا علم ہو تو اس کے لیے قیام نہ کرنا، اس کے لیے باعث اذیت نہیں ہوگا۔

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧٥٤)

[2] یہ روایت سخت ضعیف اور من گھڑت ہے، تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة (١٤٤٣)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨٧٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٦٨)

یہاں جس قیام کے جواز کا تذکرہ کیا گیا ہے، مندرجہ ذیل حدیث سے وہ قیام مراد نہیں ہے:

''نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''جسے اس بات سے خوشی ہوتی ہو کہ لوگ اس کے سامنے کھڑے رہا کریں وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔''[1]

اس حدیث میں اس قیام سے روکا گیا ہے کہ لوگ اس کے لیے کھڑے رہیں اور وہ خود بیٹھا رہے۔ اس میں کسی آنے والے کے لیے قیام کرنے سے منع نہیں کیا گیا ہے۔ اسی لیے ''قمت إليه'' اور ''قمت له'' کے درمیان لوگوں نے فرق کیا ہے۔ آنے والے کے لیے کھڑا ہونے والا قیام میں اس کے برابر ہے، جب کہ بیٹھے ہوئے کے لیے کھڑا ہونے والا ایسا نہیں ہے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی بیماری میں جب صحابہ کرام کو بیٹھ کر نماز پڑھائی اور لوگ کھڑے ہوکر نماز ادا کر رہے تھے تو آپ ﷺ نے انھیں بیٹھ جانے کا حکم دیا اور فرمایا: ''تم میری تعظیم اس طرح سے نہ کرو جس طرح عجم کے لوگ آپس میں ایک دوسرے کی کرتے ہیں۔''[2]

آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نماز میں کھڑے ہونے سے منع کیا جب کہ آپ خود بیٹھ کر نماز پڑھا رہے تھے، تا کہ ان عجمیوں کی مشابہت لازم نہ آئے جو اپنے بڑوں کے لیے کھڑے رہتے ہیں، حالاں کہ وہ خود بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں۔

مختصر یہ کہ سلف کی عادات اور اخلاق کی پیروی ہی زیادہ بہتر ہے۔ ممکنہ حد تک انھی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرنی چاہیے، لیکن اگر کوئی شخص اس پر اعتقاد نہیں رکھتا اور نہ اسے سلف کی عادت کا علم ہے اور معمول کے مطابق احترام نہ کرنے سے بڑی خرابی ظاہر ہوسکتی ہے تو اس صورت میں چھوٹی خرابی کو اپنا کر بڑی خرابی کو دور کرے گا، جس طرح دو اچھائیوں میں سے بڑی اچھائی پر عمل کرنا واجب ہے، جب کم تر درجے کی اچھائی کے ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ ہو۔

سلام کرتے وقت جھکنے سے منع کیا گیا ہے، جیسا کہ امام ترمذی نے یہ حدیث نقل کی ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس شخص سے متعلق دریافت فرمایا جو اپنے بھائی سے ملاقات کرے کہ کیا وہ اس کے لیے جھک سکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں۔[3]

اس ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ رکوع اور سجود اللہ کے علاوہ کسی کے لیے جائز نہیں۔ اگرچہ ہماری شریعت کے علاوہ

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٢٢٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧٥٥) السلسلة الصحيحة (٣٥٧)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤١٣)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧٢٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٧٠٧)

دیگر شریعتوں میں یہ چیز برائے تعظیم جائز رہی ہے، جیسا کہ یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں ہے:

﴿ وَخَرُّوا لَهُ سُجَّدًا ۖ وَقَالَ يَا أَبَتِ هَٰذَا تَأْوِيلُ رُؤْيَايَ مِن قَبْلُ ﴾ [یوسف:۱۰۰]

''اور وہ اس کے لیے سجدہ کرتے ہوئے گر پڑے اور اس نے کہا اے میرے باپ! یہ میرے پہلے کے خواب کی تعبیر ہے۔''

لیکن ہماری شریعت میں سجدہ صرف اللہ کے لیے جائز ہے، بلکہ یہاں تو عجمیوں کی طرح قیام تک کرنے کی ممانعت آئی ہے، جیسا کہ گذشتہ صفحات میں اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ پھر رکوع اور سجدے کیوں کر جائز ہو سکتے ہیں۔ ممانعت کے اس حکم کا اطلاق اس جھکنے پر بھی ہوگا جو رکوع سے ذرا سا کم ہو۔[1]

غیب کی خبریں بتانے والوں کے پاس جانے کا حکم

سوال ایک عورت نے بتایا کہ وہ آسیب زدہ ہے، جن اس کو ہر کام کی خبر دیتے ہیں اور وہ لوگوں کو دل کی باتیں بتا دیتی ہے، لوگ بھی اس کی بات کا یقین کرتے ہیں، اس کا کیا حکم ہے؟

جواب اس عورت کو ایسی عبرت ناک تعزیری سزا دی جائے کہ وہ آیندہ کسی کو ایسی بات نہ بتائے، خواہ اس کے ساتھ قرین ہو یا نہ ہو، اگر اس کے ساتھ قرین ہو تو جن اکثر جھوٹ بولتے ہیں نہ ان کی باتیں قابلِ اعتماد ہیں اور نہ ان کی طرف سے بیان کرنے والوں کی۔ زیادہ سے زیادہ یہ عورت کاہن ہو سکتی ہے۔ کاہنوں کے پاس عموماً جن ہوتے ہیں جو انھیں آسمانی باتیں بتاتے ہیں۔ اکثر علما کے نزدیک کاہن کی سزا قتل ہے۔ اس عورت سے بھی اس کام سے توبہ کروائی جائے۔

کسی گم شدہ چیز کے بارے میں اس کی بتائی گئی کسی بات پر یقین کرنا جائز اور درست نہیں، کیوں کہ یہ عموماً جھوٹ پر مبنی ہوتی ہے، خواہ وہ اپنی طرف سے بتائے یا اپنے قرین کی طرف سے، اگر اس کے ساتھ قرین ہو، صحیح مسلم میں ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو کسی عراف (ٹیوہ لگانے والے) کے پاس آیا تو چالیس دنوں تک اس کی نماز قبول نہیں ہوگی۔''[2]

صحیح میں ہے: کسی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: ہمارے کچھ لوگ کاہنوں کے پاس جاتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم ان کے پاس نہ جاؤ۔''[3] لہٰذا جو شخص اس طرح کی غیب کی خبریں بتانے والیوں کے پاس جاتا ہے، اور ان کی بتائی گئی باتوں پر اعتماد کرتا ہے وہ اللہ اور رسول کی نافرمانی کرتا ہے۔[4]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۱/۳۷٤_۳۷۷)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۲۳۰)

[3] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۵۳۷)

[4] جامع المسائل (۹/۳٦۱_۳٦۲)

خضر کی حیات اور ان سے دعوائے ملاقات کی اصلیت

سوال خضر علیہ السلام سے متعلق ایک سوال: کیا وہ اب بھی زندہ ہیں یا نہیں۔ جو عالمِ بیداری اور ہوش میں ان سے ملاقات کا دعویٰ کرے، اگر کوئی اس کو جھوٹا کہے تو کیا گناہ گار ہو گا؟

جواب الحمد لله. اگر کوئی شخص خضر علیہ السلام سے ملاقات کا دعویٰ کرتا ہے، اس سے قطع نظر کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے یا سچ، اہلِ اسلام کے دین میں اس دعوے سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا، بلکہ اہلِ اسلام کا اتفاق ہے کہ دین کے کسی بھی معاملے میں خضر سے رجوع کیا جائے گا نہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق اور سند کے علاوہ خضر سے نقل کرنے والے کسی راوی سے۔ خضر تو ایک طرف رہے، اگر کوئی موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام جیسے کسی نبی سے بھی ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے کے بغیر کوئی بات نقل کرتا ہے تو مسلمان کسی دینی معاملے میں اس سے رجوع نہیں کرتے۔ سنن میں تو یہاں تک مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تورات کا ایک ورق دیکھا تو فرمایا:

« أَمُتَهَوِّكُوْنَ يا ابْنَ الْخَطَّابِ؟! لَقَدْ جِئْتُكُمْ بِهَا بَيْضَاءَ نَقِيَّةً، لَوْ كَانَ مُوْسٰى حَيًّا ثُمَّ اتَّبَعْتُمُوْهُ وَتَرَكْتُمُوْنِي لَضَلَلْتُمْ »[1]

''کیا حیرت زدہ ہو، ابن خطاب! میں تمھارے پاس اجلی ہوئی اور صاف کتاب لے کر آیا ہوں۔ اگر موسیٰ زندہ ہوتے اور تم مجھے چھوڑ کر ان کی پیروی کرتے تو گمراہ ہو جاتے۔''

اور ایک روایت میں ہے: ''موسیٰ کو بھی میری پیروی کے بغیر چارہ نہ ہوتا۔''[2]

صحیح میں ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام زمین پر اتریں گے تو وہ امت پر اس کے رب کی کتاب اور اس کے نبی کی سنت کے مطابق ہی حکومت کریں گے۔ اگر خضر لوگوں کے درمیان موجود بھی ہوتے تو مسلمان اپنے کسی دینی معاملے میں ان سے رجوع نہ کرتے۔ وہ تو شریف ابوعلی بن ابوموسیٰ وغیرہ اور جمہور علمائے امت کے نزدیک نبی بھی نہیں تھے۔ اور اس امت میں حضرت ابوبکر و عمر اور دیگر مہاجرین اور انصار ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو ان سے افضل ہیں۔ اگر وہ نبی بھی ہوں، جس طرح ابو الفرج بن جوزی اور ابوعمرو ابن الصلاح وغیرہ کی رائے ہے، تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور عیسیٰ علیہ السلام ان سے افضل ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام بھی جب اتریں گے تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے ساتھ ہی اتریں گے، نہ کہ اپنی شریعت کے ساتھ۔

---

[1] مسند أحمد (٣/٣٨٧، ٤٧٠) سنن الدارمي (١/١٢٦) شعب الإيمان (٤/٣٠٧) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے حسن کہا ہے۔

[2] مسند أحمد (٣/٣٨٧) شعب الإيمان (١/١٩٩) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے حسن کہا ہے۔

بنابریں جب خضر کے وجود اور زندگی سے مسلمانوں کے دین کا کوئی معاملہ وابستہ نہیں اور وہ دینی امور میں مرجع بھی نہیں تو ان کے وجود کے متعلق کثرتِ کلام سے گمراہیوں، جہالتوں اور لوگوں کے لیے دروغ بافی اور غلط باتیں بنانے کی راہ کھولنے کے علاوہ کچھ حاصل نہیں۔

ائمہ دین کا تو یہاں تک اتفاق ہے کہ اگر کوئی شخص آج ہمارے زمانے میں ائمہ حدیث کے نزدیک معروف راویانِ حدیث کے علاوہ کسی غیر معروف شخص کی وساطت سے نبی اکرم ﷺ سے کوئی حدیث روایت کرتا ہے تو اس کی کچھ حیثیت نہیں، مثلاً کئی گمراہ لوگ بابا رتن ہندی نامی شخص کے بارے میں صحابی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اس کی وساطت سے حدیث نقل کرتے ہیں۔ اسی طرح ابو طالب نے اپنی کتاب ''قوت القلوب'' میں ''مسبعات'' کی سند میں ذکر کیا ہے کہ رقبۃ بن مصقلہ نے خضر سے روایت کیا اور خضر نے نبی اکرم ﷺ سے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے نبی کو جو دین دے کر بھیجا، آپ ﷺ نے اس کو بیان بھی کر دیا اور پہنچا بھی دیا، لہٰذا وہ بالکل محفوظ ہے اور مسلمانوں کو اس میں اپنے نبی کے علاوہ کسی ذوسرے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اللہ نے امت کے لیے دین مکمل کر دیا۔ ان پر اپنی نعمت کا اتمام کر دیا اور ان کے لیے اسلام کو بطور دین پسند کر لیا ہے۔ یہ وہ بنیادی بات اور قاعدہ ہے کہ ہر مسلمان کو اس کا علم ہونا ضروری ہے۔ اس کے بعد صحیح بات یہ ہے کہ حضرت خضر نبی اکرم ﷺ سے پہلے وفات پا چکے تھے اور انھوں نے نہ رسول اللہ ﷺ کا زمانہ پایا نہ آپ ﷺ کو دیکھا اور نہ کسی صحابی نے ان کے وجود کا تذکرہ تک کیا، میں نے بہت سی جگہوں پر بڑی تفصیل سے اس کے دلائل ذکر کیے ہیں۔

جو شخص کہتا ہے کہ خضر زندہ ہے، اگر وہ سچ کہہ رہا ہے تو تلبیس کا شکار ہے اور غلطی سے کسی دوسرے شخص کو خضر سمجھ رہا ہے، یا کسی شخص نے اس سے کہا ہو کہ میں خضر ہوں اور وہ جھوٹ کہہ رہا ہو یا اس انسان نے اپنے تخیل میں کسی کو دیکھا تو اس کو خارج میں خضر گمان کر لیا۔

اگر وہ جھوٹ کہہ رہا ہے تو بہتان باز اور افترا پرداز ہے اور تعزیر کا مستحق۔ آج بہت سے ایسے لوگ ہیں جو لوگوں میں اپنا اعتماد پیدا کرنے اور ان کو گھیرنے کے لیے یہ مشہور کروا دیتے ہیں کہ انھیں خضر کی زیارت ہوئی ہے۔ یہ سب جھوٹے، دجال اور مکار ہیں۔ ان کو عبرت خیز سزا دی جانی چاہیے۔ ہم نے ایسے بہت سے لوگوں کو دیکھا ہے۔ کچھ کو تعزیری سزا دی گئی اور کچھ نے توبہ کر لی۔

بنابریں خضر کا وجود ثابت کرنے والوں میں کچھ ان کو غیر مرئی اور نظروں سے اوجھل قرار دیتے ہیں اور کچھ اس کو ایک رتبہ قرار دیتے ہیں جس طرح آنحضرت ﷺ کے بارے میں کہتے ہیں۔ یہ سب غلط باتیں ہیں اور ان کی تفصیل دوسری جگہ گزر چکی ہے۔

ایک تیسرا گروہ خضر اور الیاس کو دل کی دو حالتوں قبض و بسط کا استعارہ قرار دیتے ہیں۔ یہ فصوص الحکم کے مصنف ابن عربی اور اس طرح کے باطنیہ ملحدوں کی رائے ہے۔ واللہ أعلم [1]

تہتر فرقوں کی تفصیل اور وضاحت

سوال رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث کا کیا معنی ہے کہ ''میری امت تہتر (۷۳) فرقوں میں بٹ جائے گی۔'' فرقے کیا ہیں اور ان اصناف کے ہر فرقے کا کیا عقیدہ ہے؟

جواب الحمد لله. یہ حدیث صحیح ہے اور سنن و مسانید میں مشہور ہے، جیسے سنن ابی داود، سنن ترمذی وغیرہ۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

« اِفْتَرَقَتِ الْيَهُوْدُ عَلَى إِحْدَى وَسَبْعِيْنَ فِرْقَةً كُلُّهَا فِيْ النَّارِ إِلَّا وَاحِدَةً، وَافْتَرَقَتِ النَّصَارَى عَلَى اثْنَتَيْنِ وَسَبْعِيْنَ فِرْقَةً كُلُّهَا فِيْ النَّارِ إِلَّا وَاحِدَةً وَسَتَفْتَرِقُ هٰذِهِ الْأُمَّةُ عَلَى ثَلَاثٍ وَّسَبْعِيْنَ فِرْقَةً كُلُّهَا فِيْ النَّارِ إِلَّا وَاحِدَةً » [2]

''یہودی اکہتر (۷۱) فرقوں میں بٹ گئے۔ ایک کے سوا سب جہنم میں جائیں گے۔ عیسائی بہتر (۷۲) فرقوں میں بٹ گئے۔ ایک کے سوا سب جہنم میں جائیں گے۔ اور یہ امت تہتر (۷۳) فرقوں میں تقسیم ہوگی، ایک کے سوا سب جہنم میں جائیں گے۔''

ایک حدیث میں یہ الفاظ ہیں:

« عَلَى ثَلَاثٍ وَّسَبْعِيْنَ مِلَّةً » ''تہتر ملتوں میں بٹ جائیں گے۔''

ایک روایت میں ہے:

« قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! مَنِ الْفِرْقَةُ النَّاجِيَةُ؟ قَالَ: مَنْ كَانَ عَلَى مِثْلِ مَا أَنَا عَلَيْهِ الْيَوْمَ وَأَصْحَابِيْ » [3]

''انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! نجات پانے والا فرقہ کون سا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جو اس مسلک پر ہوا جس پر آج میں اور میرے صحابہ ہیں۔''

ایک روایت میں ہے:

---

[1] جامع المسائل (۹/۵۵۔۶۰)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٥٩٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٤١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٩٩٢، ٣٩٩٣) سنن الدارمي (٢/٢٤١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٤١٩٢)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٤١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٣٤٣)

«هِيَ الْجَمَاعَةُ، يَدُ اللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ» [1]

''وہ جماعت ہے، جماعت پر اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہے۔''

اس بنیاد پر اہلِ سنت والجماعت کو فرقہ ناجیہ (نجات پانے والا فرقہ) کہا جاتا ہے، وہی جمہورِ اکبر اور سوادِ اعظم (امت کی بڑی تعداد) ہیں (اہلِ سنت والجماعت سے مراد خود ساختہ اہلِ سنت نہیں، بلکہ سنتِ نبوی کے پیروکار اور صحابہ کے مسلک کو اختیار کرنے والے ہیں۔) باقی فرقے شذوذ پسند، فرقہ پرست، بدعت کے مارے ہوئے اور خواہشات کے غلام ہیں۔ ان کا کوئی فرقہ بھی فرقہ ناجیہ سے زیادہ ہونا تو درکنار ان کی تعداد کے قریب بھی نہیں پہنچتا، بلکہ ان میں کچھ فرقوں کی تعداد انتہائی کم ہے۔ ان تمام فرقوں کا شعار اور امتیازی نشان کتاب وسنت اور اجماعِ امت کی مخالفت اور مفارقت ہے۔ جو کتاب وسنت اور اجماع کا قائل ہے وہ اہلِ سنت والجماعت سے تعلق رکھتا ہے۔

جہاں تک ان فرقوں کی تعیین وتخصیص کا تعلق ہے تو بہت سارے لوگوں نے ان کے بارے میں مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں اور انھوں نے افکار ونظریات کی کتابوں میں بھی ان کا ذکر کیا ہے، لیکن یقین کے ساتھ کہنا کہ یہ فرقہ ان بہتر فرقوں میں سے ایک ہے اس کے لیے دلیل کا ہونا ضروری ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی بھی بات بلاعلم کہنا عموماً اور کوئی بھی بات بلاعلم اللہ کی طرف منسوب کرنا خصوصاً حرام قرار دیا ہے، ارشاد ہے:

﴿ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ [الأعراف: ٣٣]

''کہہ دے میرے رب نے تو صرف بے حیائیوں کو حرام کیا ہے، جو ان میں سے ظاہر ہیں اور جو چھپی ہوئی ہیں اور گناہ کو اور ناحق زیادتی کو اور یہ کہ تم اللہ کے ساتھ اسے شریک ٹھہراؤ جس کی اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور یہ کہ تم اللہ پر وہ کہو جو تم نہیں جانتے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾

[البقرة: ١٦٨، ١٦٩]

''اے لوگو! ان چیزوں میں سے جو زمین میں ہیں حلال، پاکیزہ کھاؤ اور شیطان کے قدموں کی پیروی مت کرو، بے شک وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔ وہ تو تمھیں برائی اور بے حیائی ہی کا حکم دیتا ہے اور یہ کہ تم اللہ پر وہ بات کہو جو تم نہیں جانتے۔''

---

[1] سنن النسائي (٩٢/٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٦٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٨٠٦٥)

ایک مقام پر ارشاد ہے:

﴿ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ﴾ [بني إسرائيل: ٣٦]

''اور اس چیز کا پیچھا نہ کر جس کا تجھے کوئی علم نہیں۔''

لہٰذا بہت سارے لوگ ان فرقوں کے بارے میں محض گمان اور ذاتی رائے کے مطابق بتاتے ہیں۔ اپنے گروہ اور اپنے امام کے پیروکاروں اور ہم نواؤں ہی کو اہلِ سنت قرار دیتے ہیں۔ اپنے فرقے کی مخالفت کرنے والوں کو بدعتی شمار کرتے ہیں۔ یہ بہت کھلی گمراہی ہے، کیوں کہ اہلِ حق اور اہلِ سنت کا امام متبوع (جس کی پیروی کی جاتی ہے) صرف اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، جو اپنی خواہش سے نہیں بولتے، بلکہ وہ وحی ہے جو ان پر اتاری جاتی ہے۔

آپ ﷺ کی ہر بتائی ہوئی بات کی تصدیق کرنا اور آپ ﷺ کے دیے گئے ہر حکم کی پیروی کرنا فرض ہے۔ یہ مرتبہ آپ ﷺ کے علاوہ کسی امام کو حاصل نہیں، بلکہ رسول اللہ ﷺ کے سوا ہر شخص کی بات قبول بھی کی جاسکتی ہے اور رد بھی۔ جس نے رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی بھی شخص کو یہ درجہ دیا کہ اس کے ساتھ اتفاق رکھنے والوں اور محبت کرنے والوں کو اہلِ سنت سے قرار دیا اور اس کی مخالفت کرنے والے کو بدعتی اور فرقہ پرست ٹھہرایا، جیسے بہت سارے ائمہ متکلمین کے پیروکاروں کے گروہوں میں یہ چیز موجود ہے، وہ بدعتی گمراہ اور فرقہ پرست ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ فرقہ ناجیہ کہلانے کا حق رکھنے والے اہلِ حدیث و سنت ہیں، جن کا امام متبوع، جس کے لیے وہ عصبیت اور حمیت رکھیں، رسول اللہ ﷺ کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ وہ آپ ﷺ کے اقوال اور افعال کو تمام لوگوں سے زیادہ جانتے ہیں اور ان اقوال، افعال اور احوال میں صحیح اور غیر صحیح کی سب سے زیادہ تمیز اور پہچان رکھنے والے ہیں۔ ان کے ائمہ ان کی فقاہت اور معانی کی معرفت رکھتے ہیں، ان کی اتباع کرتے ہیں، قولاً وعملاً تصدیق کرتے ہیں، ان سے محبت رکھتے ہیں۔ جو ان کو عزیز رکھتا ہے، اس کو عزیز رکھتے ہیں اور جو ان سے عداوت رکھتا ہے اس کے ساتھ عداوت رکھتے ہیں۔

وہ تمام اقوال ونظریات کو کتاب وحکمت کی روشنی میں پرکھتے ہیں۔ کوئی ایسا نظریہ یا قول جو رسول اللہ ﷺ کے پیش کردہ دین و ہدایات سے ثابت نہ ہو، اس کو نظریہ قرار دیتے ہیں نہ اپنے دین کے اصول اور اپنے کلام کے جملے بناتے ہیں، بلکہ رسول اللہ ﷺ کو جو کتاب وحکمت دے کر مبعوث کیا گیا اس کو عقیدہ اور قابلِ اعتماد اصل قرار دیتے ہیں۔

صفات، تقدیر، وعید، اسما، امر بالمعروف و نہی عن المنکر وغیرہ کی طرح کے مسائل میں لوگوں کے اختلافات کو اللہ اور اس کے رسول ہی کی طرف لوٹاتے ہیں۔ وہ مجمل الفاظ جن میں فرقہ پرست اور اختلاف پسند اختلاف کرتے ہیں ان کی تفسیر کرتے وقت جو ان کے معانی کتاب وسنت کے مخالف ہوں ان کی نفی کرتے ہیں۔ گمان اور ہوائے نفس

کی پیروی نہیں کرتے، کیوں کہ گمان کی پیروی جہالت اور الٰہی ہدایت کے بغیر ہوائے نفس کی اتباع ظلم ہے۔ پھر ہر شر کی اصل جڑ جہالت اور ظلم ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ﴿٧٢﴾ لِيُعَذِّبَ اللَّهُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِينَ وَالْمُشْرِكَاتِ وَيَتُوبَ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا﴾

[الأحزاب: ٧٢، ٧٣]

''اور انسان نے اسے اٹھا لیا، بلاشبہہ وہ ہمیشہ سے بہت ظالم، بہت جاہل ہے۔ تاکہ اللہ منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو عذاب دے اور (تاکہ) اللہ مومن مردوں اور مومن عورتوں کی توبہ قبول کرے اور اللہ ہمیشہ سے بے حد بخشنے والا نہایت رحم والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے توبہ کا ذکر کیا، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ہر انسان میں ظلم اور جہالت کا ہونا ضروری ہے، پھر اللہ جس کو چاہتا ہے توبہ کی توفیق دیتا ہے، بندۂ مومن کے سامنے ہمیشہ حق واضح ہو کر آ جاتا ہے، جس سے وہ لاعلم اور جاہل ہوتا ہے اور وہ اپنے اس عمل سے رجوع کر لیتا ہے، جس میں اس نے ظلم کیا ہوتا ہے، اس کی کم تر صورت اس کا اپنی جان پر ظلم کرنا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ﴾ [البقرة: ٢٥٧]

''اللہ ان لوگوں کا دوست ہے جو ایمان لائے، وہ انھیں اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ عَلَى عَبْدِهِ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ لِيُخْرِجَكُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ﴾ [الحديد: ٩]

''وہی ہے جو اپنے بندے پر واضح آیات اتارتا ہے، تاکہ تمھیں اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالے۔''

ایک مقام پر ارشاد فرمایا ہے:

﴿الر كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ﴾ [إبراهيم: ١]

''الرٰ ایک کتاب ہے جسے ہم نے تیری طرف نازل کیا ہے، تاکہ تُو لوگوں کو اندھیرے سے روشنی کی طرف نکال لائے۔''

یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ اصولِ دین اور علم کلام میں متبوع اماموں کی طرف منسوب فرقوں کے کئی درجے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو بڑے اصول میں اہلِ سنت کی مخالفت کرتے ہیں، کچھ ایسے ہیں جو چھوٹے اور دقیق امور میں سنت کی مخالفت کرتے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو نسبتاً اپنے سے زیادہ سنت سے دوری رکھنے والے فرقوں کی تردید کرتے

ہیں۔ وہ اس اعتبار سے تو قابلِ تعریف ہیں کہ باطل کی تردید کرتے ہیں اور حق کا پرچار کرتے ہیں، لیکن وہ بسا اوقات باطل کی تردید میں حدِ انصاف سے تجاوز کرتے ہوئے حق کی کچھ صورتوں کا انکار اور باطل کی کچھ صورتوں پر اصرار کرتے ہیں، گویا یہ لوگ بڑی بدعت کا علاج چھوٹی بدعت سے اور ایک باطل کی تردید اس سے خفیف تر باطل سے کرتے ہیں۔ اہلِ سنت والجماعت کی طرف منسوب اکثر متکلمین کی یہی صورت حال ہے۔

ان جیسے لوگ جب اپنے بنائے ہوئے قول اور نظریے کو بنیاد بنا کر مسلمانوں کی جماعت سے علاحدگی اختیار نہ کریں اور اس کی بنا پر محبت و عداوت اور ولاء و براء کے تعلقات استوار کریں، تو ان کا یہ قول ایک طرح کی غلطی شمار ہوگا اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ مومنوں کی اس طرح کی غلطیاں معاف کر دیتے ہیں۔ اس لیے اس جیسی بہت ساری غلطیوں کا امت کے اگلے لوگ اور ائمہ شکار ہوئے ہیں۔ ان کے ایسے اقوال ہیں جو انھوں نے اجتہاد کرتے ہوئے کہے تھے اور وہ کتاب وسنت میں ثابت دلائل کے خلاف ہیں۔ لیکن اس کے عکس جو شخص اپنے ہم مشرب کے ساتھ دوستی رکھتا ہے، اپنے مخالف کے ساتھ دشمنی رکھتا ہے، مسلمانوں کی جماعت میں پھوٹ ڈالتا ہے، آراء اور اجتہادات کے مسائل میں اپنے ہم مسلک کو چھوڑ کر اپنے مخالف کو کافر اور فاسق قرار دیتا ہے، اپنے ہم مسلک کو چھوڑ کر اپنے مخالف کے ساتھ لڑائی کو حلال سمجھتا ہے تو ایسے لوگ اختلافات پسند اور فرقے بندی کے دلدادہ ہیں۔

اس وجہ سے بدعتیوں میں سے سب سے پہلے خوارج نے، جو دین سے نکلنے والے ہیں، مسلمانوں کی جماعت سے علاحدگی اختیار کی، خوارج کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے حدیث دس (۱۰) طُرق سے صحیح ثابت ہے۔ اور یہ مختلف اسناد کے ساتھ صحیح مسلم اور صحیح بخاری میں مروی ہے۔

نبی اکرم ﷺ کے صحابہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سربراہی میں ان سے لڑائی لڑی۔ انھوں نے ان کے ساتھ جنگ میں اس طرح کا کوئی اختلاف نہ کیا جو اختلاف جنگِ جمل اور جنگِ صفین میں فتنے کی لڑائی کے وقت کیا۔ اس وقت ان کے تین فریق تھے، ایک فریق ایک گروہ کے ساتھ تھا، دوسرا دوسرے گروہ کے ساتھ اور تیسرا فریق لڑائی سے علاحدہ رہا اور نصوص میں اسی حالت کو ترجیح دینے کا حکم آیا۔ خوارج نے جب مسلمانوں کی جماعت کو چھوڑ دیا، ان کو کافر قرار دیا اور ان کے خلاف لڑائی کو حلال کیا تو ان کے بارے میں سنت میں جو ذکر ہوا، اس میں یہ فرمانِ نبوی بھی تھا:

''تم ان کی نماز، روزے اور تلاوتِ قرآن کے سامنے اپنی نماز، روزے اور تلاوتِ قرآن کو حقیر سمجھو گے۔ وہ قرآن کی تلاوت کریں گے جو ان کے حلق سے آگے نہیں بڑھے گا، وہ اسلام سے ایسے نکل جائیں گے، جیسے تیر ہدف سے۔ تم انھیں جہاں ملو، ان سے لڑو۔ ان سے لڑنے والوں اور ان کو قتل کرنے

والوں کو قیامت کے دن اللہ کے ہاں اجر ملے گا۔"[1]

ان کا پہلا آدمی عہدِ رسالت میں نکلا، جب اس نے رسول اللہ ﷺ کو مالِ غنیمت کو تقسیم کرتے دیکھا تو کہا: محمد ﷺ! عدل کر، تم نے عدل نہیں کیا، نبی اکرم ﷺ نے اس کو جواب میں کہا: "میں ناکام اور خسارہ پانے والا ہوا، اگر میں نے عدل نہ کیا۔ ایک صحابی نے کہا: "اے اللہ کے رسول! مجھے اجازت دیں میں اس منافق کی گردن اڑا دوں۔" آپ ﷺ نے فرمایا: "اس کی نسل سے ایسی قومیں نکلیں گی، تم میں سے ایک ان کی نماز، روزے اور تلاوتِ قرآن کے سامنے اپنے روزے، نماز اور تلاوتِ قرآن کو حقیر دیکھے گا۔"[2] چنانچہ بدعت کا آغاز سنت میں گمان اور خواہش پرستی کی وجہ سے اعتراض کرنے سے ہوا، جس طرح ابلیس نے اپنی رائے اور خواہش پرستی کی وجہ سے اپنے رب کے حکم پر اعتراض کیا۔

ہلاک ہونے والے فرقوں کی تعیین کے بارے میں ہم تک جو علم پہنچا ہے اس کے مطابق سب سے پہلے یوسف بن اسباط، پھر عبداللہ بن مبارک نے ان کو گمراہ قرار دینے کے بارے میں بات کی۔ یہ دونوں مسلمانوں کے جلیل القدر امام ہیں۔ ان کے مطابق بدعتوں کے اصول اور بنیادیں چار ہیں:

① روافض ② خوارج ③ قدریہ ④ مرجئہ

حضرت عبداللہ بن مبارک سے پوچھا گیا: جہمیہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟ انھوں نے جواب دیا: یہ امتِ محمدیہ سے تعلق نہیں رکھتے۔ وہ کہا کرتے تھے: ہم یہود و نصاریٰ کا کلام نقل کرتے ہیں، لیکن جہمیہ کا کلام نقل نہیں کر سکتے۔ ان کی اسی بات کی پیروی امام احمد وغیرہ کے اصحابِ علم کے ایک گروہ نے بھی کی اور انھوں نے کہا: جہمیہ کافر ہیں۔ یہ بہتر فرقوں میں داخل نہیں۔ ایسے ہی ان میں وہ منافق بھی داخل نہیں جو دل میں کفر چھپاتے ہیں اور بظاہر اسلام کا لبادہ اوڑھتے ہیں، یہی زندیق ہیں۔

امام احمد کے کچھ دیگر اصحاب نے کہا ہے: جہمیہ بہتر فرقوں میں داخل ہیں۔ انھوں نے بدعتوں کے اصول پانچ قرار دیے۔ ان کے قول کے مطابق ان پانچ "بدعتی فرقوں" کے ہر گروہ کے بارہ فرقے ہیں۔ پہلوں کے قول کے مطابق ان چار "بدعتی فرقوں" میں سے ہر گروہ کے اٹھارہ فرقے ہیں۔

یہ مسئلہ ایک دوسرے قاعدے "اہلِ بدعت کی تکفیر" پر مبنی ہے۔ جو جہمیہ کو ان سے نکالتا ہے، وہ دیگر تمام بدعتیوں کی طرح ان کو بھی کافر قرار نہیں دیتا، بلکہ ان کو فاسقوں اور نافرمانوں کے قائم مقام ٹھہرا کر اہلِ وعید میں شمار

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤١٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٦٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٦٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٦٤)

کرتا ہے اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کو: وہ آگ میں جائیں گے۔'' اسی طرح قرار دیتا ہے جس طرح یہ دیگر گناہوں کے بارے میں کہا گیا ہے، جیسے یتیم کا مال کھانے والا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوٰلَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ﴾ [النساء: ١٠]

''بے شک جو لوگ یتیموں کے اموال ظلم سے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ کے سوا کچھ نہیں کھاتے۔''

کچھ ان تمام کو کافر کہتے ہیں۔ یہ بعض متاخرین یا متکلمین کا قول ہے۔ سلف صالحین اور ائمہ نے ''مرجئہ'' اور تفضیلی شیعہ (حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلافت کا زیادہ حق دار سمجھنے والے) وغیرہ کی عدمِ تکفیر میں کوئی اختلاف نہیں کیا۔ اس مسئلے میں امام احمد کے اقوال میں بھی کوئی اختلاف نہیں، اگرچہ ان کے اصحاب میں کچھ ایسے بھی ہیں جنھوں نے تمام بدعتیوں کی تکفیر میں (خواہ وہ یہ ہوں یا دوسرے) امام احمد سے یا ان کے مذہب میں اختلاف نقل کیا ہے، بلکہ بعض نے تو ان کو اور دوسروں کو دائمی جہنمی قرار دیا ہے۔ یہ ان کے مذہب اور شریعت کی طرف بھی غلط بات منسوب کی گئی ہے۔

کچھ علما ان تمام میں سے کسی ایک کو بھی کافر نہیں کہتے۔ وہ بدعتیوں کو گناہ گاروں کے ساتھ ملحق کرتے ہیں۔ ان کا قول ہے: جیسے اہلِ سنت والجماعت کا یہ قول ہے کہ وہ کسی کو گناہ کی وجہ کافر نہیں کہتے، اسی طرح وہ کسی کو بدعت کی وجہ سے بھی کافر نہیں کہتے۔

سلف اور ائمہ سے خالص جہمیہ کی علی الاطلاق تکفیر کے اقوال ملتے ہیں، جو صفات کا انکار کرتے ہیں۔ ان کے عقیدے کی یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ بولتا ہے نہ دیکھتا ہے نہ مخلوق سے جدا ہے، نہ اس کا علم ہے نہ قدرت نہ سماعت نہ بصارت اور نہ حیات، بلکہ قرآن مخلوق ہے، اس کو جس طرح جہنمی نہیں دیکھیں گے، اسی طرح جنتی بھی نہیں دیکھیں گے، یہ اور اس طرح کے دیگر اقوال ونظریات۔

خوارج اور روافض کی تکفیر کے بارے میں امام احمد وغیرہ کے ہاں نزاع اور تردد ہے۔

وہ قدریہ جو کتابتِ تقدیر (تقدیر کا لکھا ہوا ہونا) اور علم کی نفی کرتے ہیں، ان کو کافر قرار دیا جاتا ہے، لیکن جو علم کا اثبات کرتا ہے، لیکن افعال کے مخلوق ہونے کا انکار کرتا ہے، اس کو ائمہ کافر نہیں کہتے۔

اس باب میں یہ مندرجہ ذیل دو اصول فیصلہ کن بات کی حیثیت رکھتے ہیں:

1. پہلا قاعدہ: یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ نماز پڑھنے والوں میں، نفسِ امر میں کافر منافق کے سوا کوئی نہیں ہوتا، کیوں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جب سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن نازل کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی اس وقت سے لوگوں کی تین اصناف ٹھہریں:

1. آپ پر ایمان رکھنے والا۔

۲ آپ کے ساتھ کفر کرنے والا اور اپنے کفر کو ظاہر کرنے والا۔

۳ منافق، کفر کو چھپانے والا۔

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے سورت بقرہ کے آغاز میں انھی تین اصناف کا ذکر کیا۔ چار آیات مومنوں کے بیان میں ذکر کیں، دو کفار کے بیان اور دس کے قریب آیات منافقین کے بیان میں ذکر کیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآنِ کریم میں کئی مقامات پر کافروں اور منافقوں کا ذکر کیا ہے، جیسے درج ذیل آیات میں:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا ﴾ [النساء: ١٤٠]

''بے شک اللہ منافقوں اور کافروں، سب کو جہنم میں جمع کرنے والا ہے۔''

﴿ فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ [الحدید: ١٥]

''سو آج نہ تم سے کوئی فدیہ لیا جائے گا اور نہ ان لوگوں سے جنھوں نے انکار کیا۔''

یہاں ان کا کافروں پر عطف محض ان کے اظہارِ اسلام کو ممیّز کرنے کے لیے ڈالا گیا ہے، ورنہ وہ باطن میں کافروں سے برے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کہتے ہیں:

﴿ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ﴾ [النساء: ١٤٥]

''بے شک منافق لوگ آگ کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے۔''

﴿ وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾

[التوبة: ٨٤]

''اور ان میں سے جو کوئی مر جائے اس کا کبھی جنازہ نہ پڑھنا اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہونا، بے شک انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا۔''

نیز فرمایا:

﴿ قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝ وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّاۤ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴾ [التوبة: ٥٣، ٥٤]

''کہہ دے خوشی سے خرچ کرو، یا ناخوشی سے، تم سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔ بے شک تم ہمیشہ سے نافرمان لوگ ہو۔ اور انھیں کوئی چیز اس سے مانع نہیں ہوئی کہ ان کی خرچ کی ہوئی چیزیں قبول کی جائیں مگر یہ بات کہ بے شک انھوں نے اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا اور وہ نماز کو نہیں

آتے مگر اس طرح کہ سست ہوتے ہیں اور خرچ نہیں کرتے مگر اس حال میں کہ ناخوش ہوتے ہیں۔‘‘

جب حقیقت یہ ہے تو بدعتیوں میں کچھ منافق زندیق ہیں اور یہ کافر ہیں۔ ان جیسوں کی کثرت رافضہ اور جہمیہ میں ہے۔ ان کے سربراہان منافق اور زندیق تھے۔ سب سے پہلے جس نے بدعتِ رفض کا آغاز کیا وہ بھی منافق تھا۔ اسی طرح جہمیہ کی اصل بھی زندیقیت اور منافقت ہی ہے۔ اسی لیے باطنی فرقے قرامطہ کے منافق، زندیق فلسفی اور ان جیسے دیگر رافضہ اور جہمیہ سے قرب کی وجہ سے ان کی طرف جھکاؤ رکھتے ہیں۔

بدعتیوں میں کچھ ایسے ہیں، جن میں ظاہراً اور باطناً ایمان موجود ہے، لیکن ان میں جہالت اور ظلم موجود ہے، حتی کہ اہلِ سنت میں سے بھی جس نے خطا کھائی سو خطا کھائی، یہ نہ کافر ہے، نہ منافق۔ پھر اس سے کچھ ظلم اور زیادتی بھی ظاہر ہوسکتی ہے جس کی وجہ سے وہ فاسق یا نافرمان ہوتا ہے اور کبھی تاویل کی بنا پر غلطی کر سکتا ہے، اس کی غلطی بخشی ہوئی ہے۔ اس کے باوجود اس میں اتنا ایمان اور تقویٰ ہوسکتا ہے، جس کی مقدار کے مطابق اس میں ولایت ہو سکتی ہے۔ یہ دو اصول میں سے ایک اصول ہے۔

۲ دوسرا قاعدہ: وہ بات اور فکر ہی کفر ہو، مثلاً: وہ نماز، زکات، روزہ اور حج کے وجوب کے انکار، اور زنا، شراب، جوا اور ابدی محرمات کے ساتھ نکاح کو حلال قرار دینے پر مشتمل ہو۔ پھر اس نظریے کا قائل ایسا شخص بھی ہوسکتا ہے کہ اس تک ان احکام کے وجوب اور حرمت کے بارے میں دلیل ہی نہ پہنچی ہو۔ ایسے انکار کرنے والے کو کافر قرار نہیں دیا جائے گا، مثلاً: ایسا شخص جس نے نیا نیا اسلام قبول کیا ہو، یا اس نے ایسے دور دراز کے علاقے میں پرورش پائی جہاں اسلامی احکام نہیں پہنچ پائے، ایسے شخص کو کسی ایسے حکم کے انکار کی بنا پر جو رسولِ کریم ﷺ پر نازل ہوا اور اس کو علم نہیں ہوسکا کہ یہ رسول پر نازل ہوا، کافر قرار نہیں دیا جائے گا۔

جہمیہ کے انکار اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی صفات اور رسول پر نازل شدہ احکام کے (کو جاننے کے باوصف) انکار پر مبنی ہیں۔ ان کے نظریات تین وجوہ سے بہت سخت اور قابلِ مواخذہ ہیں۔

۱ ان کے اقوال کی مخالف نصوصِ قرآن و سنت اور اجماعِ امت میں بہت زیادہ اور مشہور ہیں۔ یہ ان کو تحریف کر کے رد کرتے ہیں۔

۲ ان کے قول اور عقیدے کی حقیقت صانع کو معطل کرتی ہے، گو ان میں ایسے لوگ ہیں جو نہیں جانتے کہ ان کا قول صانع (خالقِ کائنات) کی تعطیل (بے کاری) کو مستلزم ہے، جس طرح ایمان کی اصل اللہ کا اقرار ہے، اسی طرح کفر کی اصل اللہ کا انکار ہے۔

۳ یہ ان نظریات کی بھی مخالفت کرتے ہیں جن پر تمام ملتوں (ادیانِ سماویہ کے ماننے والے) اور تمام فطرتِ سلیمہ

کے مالک عقل مندوں کا اتفاق ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے بہت سارے افکار بہت سے اہلِ ایمان پر پوشیدہ رہ سکتے ہیں۔ وہ ایسے شبہات پیش کرتے ہیں کہ یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ حق ان کے ساتھ ہے۔

یہ ایمان والے ظاہری اور باطنی طور پر اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھنے والے ہی رہتے ہیں۔ صرف ان پر یہ معاملہ پوشیدہ اور مشتبہ ہو گیا ہے جس طرح دیگر بدعتیوں کی اقسام پر اشتباہ ہو جاتا ہے، لہٰذا یہ قطعاً کافر نہیں، بلکہ ان میں فاسق اور گناہ گار بھی ہو سکتے ہیں اور خطا کار بخشے ہوئے بھی۔ ان میں ایمان و تقویٰ بھی ہو سکتا ہے اور ایمان و تقویٰ کی مقدار کے مطابق ولایت۔

خوارج، جہمیہ، معتزلہ اور مرجئہ سے اہلِ سنت کا اصل اختلاف جو ان سے ممتاز کرتا ہے وہ ایمان میں کمی بیشی اور تفاضل و تبعیض کا مسئلہ ہے، یعنی ایمان میں کمی بیشی ہوتی ہے اور وہ اجزا میں تقسیم ہوتا ہے، جیسے فرمانِ نبوی ہے:

«يَخْرُجُ مِنَ النَّارِ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ إِيْمَانٍ»[1]

''آگ سے وہ بھی نکل آئے گا، جس کے دل میں ذرے کے برابر ایمان ہوگا۔''

لہٰذا ولایت اس کے مطابق گھٹتی اور بڑھتی ہے۔

جب بدعتیوں کی اصل کی معرفت حاصل ہو چکی ہے تو یہ جاننا بھی مفید ہے کہ خوارج کے قول اور نظریے کی اصل یہ ہے کہ وہ گناہ کی وجہ سے کافر قرار دیتے ہیں۔ اس کو گناہ سمجھتے ہیں جو گناہ نہیں۔ وہ قرآن کی پیروی کرتے ہیں اور اس حدیث کو چھوڑتے ہیں جو ظاہر قرآن کی مخالفت کرتی ہو، اگرچہ متواتر ہو۔ وہ اپنے مخالفین کو کافر کہتے ہیں اور اس کو مرتد خیال کرتے ہوئے اس میں ایسی ایسی چیزوں کو حلال قرار دیتے ہیں جو اصل کافر میں بھی حلال قرار نہیں دیتے۔ جیسے رسول اللہ ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا ہے: ''وہ اہلِ اسلام کو قتل کریں گے اور بت پرستوں کو چھوڑ دیں گے۔''[2] انہی خبیث افکار کی بنا پر انھوں نے حضرت عثمان، حضرت علی رضی اللہ عنہما اور ان کے پیروکاروں کو کافر کہا اور جنگِ صفین میں شریک دونوں فریقوں کو بھی کافر قرار دیا۔

رافضہ کے قول اور نظریے کی اصل یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے کی نص قطعی کے ذریعے وصیت کی جس میں عذر کی کوئی گنجایش نہیں ہوتی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ امام معصوم ہیں۔ جس نے ان کی مخالفت کی وہ کافر ہے۔ مہاجرین اور انصار نے اس نص (وصیت) کو چھپایا اور امام معصوم کے ساتھ کفر کیا۔ انھوں نے اپنی خواہشات کی پیروی کی۔ دین کو تبدیل کیا۔ شریعت کو مسخ کر دیا۔ ظلم و زیادتی کا بازار گرم کیا، بلکہ چند صحابہ کے سوا تمام صحابہ، نعوذ باللہ،

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٦٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٦٤)

کافر ہو گئے۔ وہ جو مسلمان رہ گئے ان کی تعداد نو، دس کے قریب تھی۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں: حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما اور ان جیسے دیگر صحابہ منافق ہی رہے۔ کبھی یہ کہتے ہیں، بلکہ ایمان لائے پھر انھوں نے کفر کیا (نعوذ باللہ)۔

ان کی اکثریت اپنے مخالفین کو کافر گردانتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو مومن کہتے ہیں اور اپنے مخالفین کو کافر۔ وہ ان اسلامی شہروں کو جہاں ان کے اقوال کی پذیرائی نہیں ہوتی اور وہ ظاہر نہیں ہوتے، ارتداد کے گڑھ قرار دیتے ہیں، جو ان کے نزدیک مشرکوں اور عیسائیوں کے شہروں سے بھی زیادہ برے ہیں۔ اسی بنا پر بعض جمہور مسلمانوں کے خلاف یہود و نصاریٰ اور مشرکوں سے دوستی رکھتے ہیں اور مسلمانوں کے ساتھ عداوت اور لڑائی رکھتے ہیں۔ جمہور مسلمانوں کے خلاف کافروں، مشرکوں، عیسائیوں، فرنگیوں اور یہودیوں سے ان کی دوستی کے چرچے عام ہیں۔ زندیقیت اور منافقت کے سربرآوردہ افراد نے انہی کی کوکھ سے جنم لیا، جیسے باطنی فرقے قرامطہ کی زندیقیت۔ بلاشبہہ یہ سب بدعتی فرقوں سے زیادہ کتاب و سنت سے دور ہیں۔ اسی وجہ سے یہی عام لوگوں کے ہاں اہلِ سنت کے مخالف مشہور ہیں۔ جمہور عوام سنی کا متضاد رافضی ہی سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی کہے: میں سنی ہوں، تو اس کا مطلب ہے کہ میں رافضی نہیں۔

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ یہ خارجیوں سے برے ہیں۔ خوارج آغازِ اسلام میں اہلِ جماعت کے خلاف تلوار نکالنا ناجائز سمجھتے تھے، لیکن روافض کی کافروں سے دوستی خوارج کی تلوار سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔

اہلِ سنت والجماعت کے ساتھ مخالفت رکھنے والے قرامطہ اور اسماعیلیہ وغیرہ انہی کی طرف منسوب ہیں، لیکن خوارج سچ میں مشہور ہیں اور روافض جھوٹ میں شہرت یافتہ۔ خوارج اسلام سے نکل گئے اور ان رافضیوں نے اسلام کو پسِ پشت ڈال دیا۔

جہاں تک خالص قدریہ کی بات ہے تو وہ ان تمام سے بہتر اور کتاب و سنت سے قریب ہیں، لیکن معتزلہ وغیرہ قدریہ، جہمی بھی ہیں جو اپنے مخالفین کو کافر قرار دیتے ہیں اور کبھی مسلمانوں کا خون حلال قرار دیتے ہیں تو یہ ان (قرامطہ وغیرہ) سے قریب تر ہوں گے۔

مرجئہ ان مغلظ بدعتوں سے تعلق نہیں رکھتے، بلکہ ان کے قول کو کئی فقہا اور عباد کے گروہوں نے اختیار کیا۔ وہ اہلِ سنت ہی سے شمار ہوتے تھے، لیکن جیسے انھوں نے مغلظ اور بھاری اقوال اختیار کرنا شروع کیے ان کا معاملہ بھی بھاری اور سنگین ہو گیا۔

چونکہ ارجاء (مرجئہ) اور تفضیل (حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ پر فضیلت دینا) کی طرف بڑے نامور مشہور اور متبوع لوگ منسوب تھے، اس لیے مشہور ائمہ اہلِ سنت نے تفضیلی مرجئہ کی مذمت کی، تاکہ لوگ ان کے افکار سے نفرت کرنے لگیں، جیسے: سفیان ثوری رحمہ اللہ کا یہ قول: ''جس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور شیخین

(عمر و عثمان رضی اللہ عنہما) پر مقدم کیا، اس نے مہاجرین و انصار کی عیب جوئی کی۔ میرا نہیں خیال کہ اس عقیدے کے ساتھ اس کا کوئی عمل اللہ کی طرف چڑھے۔'' انھوں نے یہ بات اس وقت کہی جب بعض کوفی ائمہ کی طرف تقدیمِ علی کی نسبت کی گئی۔

ایوب سختیانی کا قول ہے کہ جس نے عثمان پر علی کو مقدم کیا اس نے مہاجرین و انصار کی تنقیص کی ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ انھوں نے اس سے رجوع کر لیا تھا۔ اسی طرح جب ارجاء کی نسبت مشہور لوگوں کی طرف کی گئی تو سفیان ثوری، امام مالک اور امام شافعی رحمہ اللہ نے اس کی مذمت کی۔

اس باب میں امام احمد کا کلام ان سے پہلے ائمہ ہدایت کے کلام کے مطابق ہی ہے۔ ان کا کوئی ایسا قول نہیں جو بدعت کے زمرے میں آتا ہو۔ لیکن جب بدعتوں اور خواہشات کو ہوا دی جانے لگی تو انھوں نے سنت کا اظہار کیا، اس کو بیان کیا، اس کا دفاع کیا، مخالفینِ سنت کی حالت بیان کی، اس کے لیے جہاد کیا اور اس کی وجہ سے ملنے والی اذیت پر صبر کیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ ﴾ [السجدة: ٢٤]

''اور ہم نے ان میں سے کئی پیشوا بنائے، جو ہمارے حکم سے ہدایت دیتے تھے، جب انھوں نے صبر کیا اور وہ ہماری آیات پر یقین کیا کرتے تھے۔''

صبر اور یقین ہی کے ساتھ دین کی امامت ملتی ہے۔ جب انھوں نے یہ کام کیا تو سنت میں امامت ان کے نام کا حصہ بن گئی۔ اس میں ان کو اتنی شہرت حاصل ہوئی کہ وہ بعد والے لوگوں کے لیے متبوع اور مقتدا بن گئے، جس طرح وہ اپنے پیش رؤوں کی اتباع کرنے والے تھے۔ ورنہ سنت وہی ہے جس کو صحابہ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کیا، ان سے تابعین نے اور ان سے ان کی پیروی کرنے والوں نے۔ یہ سلسلہ اسی طرح قیامت تک چلتا رہے گا، اگرچہ بعض ائمہ اس کو زیادہ جاننے والے ہوتے ہیں اور اس پر زیادہ صبر کرنے والے۔ واللہ سبحانه وتعالىٰ أعلم وأحكم.[1]

کتبِ منطق کی حیثیت

سوال کتبِ منطق کی حیثیت کیا ہے؟

جواب منطق کی کتابیں ایسے علم پر مشتمل نہیں جس کا شرعی طور پر حکم دیا جاتا ہے، اگرچہ بعض لوگوں نے اپنے اجتہاد سے کہا ہے کہ یہ فرضِ کفایہ ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں، اس کے بغیر علوم قائم ہی نہیں ہوتے۔ یہ بات ابو حامد نے بھی ذکر کی ہے جو عقلی اور شرعی اعتبار سے بہت بڑی غلطی ہے۔

[1] مجموع الفتاویٰ (٣/٣٤٥-٣٥٧)

عقلی اعتبار سے اس طرح غلط ہے کہ متکلمین کی تمام انواع سے تعلق رکھنے والے تمام حکما نے یونانی منطق کے بغیر اپنے علوم کو ضبطِ تحریر کیا اور شرعی اعتبار سے اس طرح غلط ہے کہ دینِ اسلام نے اہلِ علم و ایمان پر یہ یونانی منطق سیکھنا لازمی قرار نہیں دیا۔

جہاں تک بذاتِ خود اس علم کا تعلق ہے تو اس کا کچھ حصہ حق ہے اور کچھ باطل۔ جو حق ہے اس میں سے بہت زیادہ یا اکثر کی ضرورت ہی نہیں اور جس قدر ضرورت ہے تو اکثر سلیم الفطرت لوگ اس کے بغیر بھی ان کو جانتے ہیں۔ کند ذہن اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا اور ذہین کو اس کی ضرورت نہیں۔ جو شخص انبیائے کرام کے علوم سے ناواقف ہو وہ اس سے فائدے سے زیادہ نقصان اٹھاتا ہے۔ اس میں بہت سے منفی اور فاسد قواعد ہیں جو بہت سے فضلا کے ہاں مروج ہیں اور ان کے نفاق کا باعث اور ان کے علوم کی تباہی کا سبب بنے۔

جو شخص کہتا ہے کہ یہ سارے کا سارا حق اور صحیح ہے، وہ غلط کہتا ہے۔ منطق کی مباحث، جیسے: حد، ذاتی صفات، اعراض، برہان اور قیاس کی اقسام وغیرہ بہت سارے فاسد مواد سے بھری ہوئی ہیں۔ ہم نے کسی دوسری جگہ ان کی تفصیل بیان کی ہے اور علمائے اسلام نے بھی ان امور کی وضاحت کی ہے۔ واللہ أعلم [1]

علم اور عقل میں سے افضل

سوال علم افضل ہے یا عقل؟

جواب اگر علم سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ علم ہے جو اس نے کتاب کی صورت میں اتارا، جیسا کہ فرمایا:

﴿ فَمَنْ حَآجَّكَ فِيهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ ٱلْعِلْمِ ﴾ [آل عمران: ٦١]

''پھر جو شخص تجھ سے اس کے بارے میں جھگڑا کرے، اس کے بعد کہ تیرے پاس علم آ چکا۔''

تو وہ انسان کی عقل سے بہتر ہے، کیوں کہ وہ خالق کی صفت ہے اور عقل مخلوق کی صفت ہے اور بلاشبہہ خالق کی صفت مخلوق کی صفت سے افضل ہے۔

اگر عقل سے مراد یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے امر و نہی کو سمجھے اور اس کے مطابق عمل کرے تو یہ عقل انسان کو جنت میں داخل کرے گی اور یہ اس علم سے افضل ہے جو انسان کو جنت میں داخل کرنے کا سبب نہیں بن سکتا، مثلاً: وہ شخص جو علم تو رکھتا ہے، لیکن عمل نہیں کرتا۔

اگر عقل سے مراد وہ جبلت اور قوت ہے جس کے ساتھ بندہ علم و عمل حاصل کرتا ہے تو جو اس کے ذریعے سے

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۹/۲٦۹۔۲۷۰)

حاصل ہوتا ہے وہ افضل ہے، کیوں کہ علم مقصود ہے اور قوتِ عقل محض وسیلہ اور مقاصد وسائل سے افضل ہوتے ہیں۔

اگر عقل سے مراد وہ علوم ہیں جو قوتِ عقل سے حاصل ہوتے ہیں تو یہ علم ہی سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے یہ نہیں کہا جاتا کہ ان دونوں میں سے کون افضل ہے، بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ ان علوم میں سے کون سا علم افضل ہے، کیوں کہ علوم میں بعض بعض سے افضل ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں علم اس کی مخلوق کے بارے میں علم سے افضل ہے، اس لیے آیت الکرسی قرآن کریم کی افضل آیت ہے، کیوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ ایک تہائی قرآن کے برابر ہے، کیوں کہ قرآن کے تین حصے ہیں: ایک توحید پر مشتمل ہے، ایک قصص اور واقعات پر مشتمل ہے اور ایک امر و نہی، یعنی احکام پر مشتمل ہے اور توحید کا حصہ دوسروں سے افضل ہے۔ اس مسئلے میں تفصیل بیان کرنا ضروری ہے، کیوں کہ دونوں الفاظ بہت زیادہ معانی کا احتمال رکھتے ہیں، لہٰذا تفصیل کے بغیر مطلق جواب دینا درست نہیں، اس لیے جو اس میں تفصیل بیان نہیں کرتا وہ بہت زیادہ اختلاف کا شکار ہو جاتا ہے اور جو تفصیل بیان کرتا ہے وہ درست بات تک پہنچ جاتا ہے۔ واللہ أعلم[1]

عقل کی حجیت اور نبوت کے ثبوت کے لیے اس سے استدلال

سوال کیا عقل شریعت کے ورود و ظہور سے پہلے حجت کا درجہ رکھتی ہے؟ اگر حجت نہیں رکھتی تو نبوت کو کس چیز کے ساتھ ثابت کیا جا سکتا ہے؟ نیز جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا: ﴿ هٰذَا رَبِّيْ ﴾ تو کس چیز کے ساتھ استدلال کیا؟

جواب عقل سے مراد وہ جبلت اور خلقی خودکار تحریک ہے جو اللہ نے انسان میں رکھی ہے اور اس سے وہ علوم و اعمال بھی مراد ہوتے ہیں جو اس جبلت سے مستفاد و ماخوذ ہوتے ہیں۔ عقل ایمان باللہ اور خدا کی کتابوں اور رسولوں کی پہچان کے لیے بنیادی شرط ہے۔ عقل کے بغیر علم و ایمان کا حصول ناممکن ہوتا ہے۔ لیکن جس حجت کی مخالفت کرنے والے کو اللہ عذاب دے گا وہ رسولوں کے ساتھ ثابت اور قائم ہوتی ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ﴾ [النساء: ١٦٥]

''تاکہ لوگوں کے پاس رسولوں کے بعد اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت نہ رہ جائے۔''

فرمایا:

﴿ كُلَّمَاۤ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَاۤ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ۝ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ ﴾ [الملك: ٨، ٩]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٩/٣٠٥۔٣٠٦)

''جب بھی کوئی گروہ اس میں ڈالا جائے گا، اس کے نگران ان سے پوچھیں گے کیا تمھارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا؟ وہ کہیں گے کیوں نہیں! یقیناً ہمارے پاس ڈرانے والا آیا تو ہم نے جھٹلا دیا اور ہم نے کہا اللہ نے کوئی چیز نہیں اتاری، تم تو ایک بڑی گمراہی میں ہی پڑے ہو۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ جس کو بھی آگ میں پھینکا جائے گا اس کے پاس خدا کا ڈرانے والا آیا ہو گا۔

اللہ کے رسول جب لوگوں تک اللہ کے پیغامات پہنچا دیتے ہیں تو لوگ اپنی عقلوں کے ذریعے ان کو دی گئی نشانیاں پہچان کر ان کی صداقت تسلیم کر لیتے ہیں اور ان پر ایمان لے آتے ہیں۔ انسان بعض اوقات محض عقل کے ذریعے جان لیتا ہے کہ اس کا کوئی خالق ہے اور وہ اس کی کچھ صفات بھی پہچان لیتا ہے، لیکن جو تفصیلات رسولوں نے پیش کی ہیں وہ صرف انہی سے معلوم کی جا سکتی ہیں، مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۚ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِنَا ۭ ﴾ [الشوریٰ: ۵۲]

''اور اسی طرح ہم نے تیری طرف اپنے حکم سے ایک روح کی وحی کی، تو نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور نہ یہ کہ ایمان کیا ہے اور لیکن ہم نے اسے ایک ایسی روشنی بنا دیا ہے جس کے ساتھ ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں راہ دکھاتے ہیں۔''

نیز فرمایا:

﴿ قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰي نَفْسِيْ ۚ وَاِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوْحِيْٓ اِلَيَّ رَبِّيْ ۭ ﴾ [السبا: ۵۰]

''کہہ دے اگر میں گمراہ ہوا تو اپنی جان ہی پر گمراہ ہوں گا اور اگر میں نے ہدایت پائی تو اسی کی وجہ سے جو میرا رب میری طرف وحی بھیجتا ہے۔''

محمد ﷺ عقل کے اعتبار سے بھی سب انسانوں سے زیادہ کامل تھے، اس لیے آپ ﷺ اپنی نبوت سے پہلے بھی اللہ تبارک و تعالیٰ کے رب ہونے کا عقیدہ رکھتے تھے، اس کے باوجود آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿ وَاِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوْحِيْٓ اِلَيَّ رَبِّيْ ۭ ﴾ اور اللہ نے آپ ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

﴿ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ ﴾ [الشوریٰ: ۵۲]

''تو نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور نہ یہ کہ ایمان کیا ہے۔''

اس ایمان سے مراد اس غیب پر ایمان ہے جو جبرائیل علیہ السلام لے کر حاضر ہوئے اور آپ اس سے پہلے واقف نہیں تھے۔

رسولوں کے ذریعے دو طریقوں سے خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے:

1 کبھی وہ دلوں کو اس طرح بیدار اور تذکیر کرتے کہ ان کے اندرونی گوشے وا ہو جاتے ہیں اور انسان اپنی عقل و نظر اور رسول کے بتائے ہوئے استدلال کو بروئے کار لا کر رسول ﷺ کی بتائی ہوئی خبر پر یقین کر لیتا ہے۔ اس اندازِ فکر میں وہ نہ تو خبر دینے والے کا مقلد ہوتا ہے اور نہ محض اس کی خبر سے استفادہ کرنے والا، بلکہ رسول کے بتائے ہوئے عقلی استدلال پر غور وفکر کے بعد خدا کی معرفت حاصل کرتا ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اپنی وحدانیت، رسولوں کی صداقت، امکانِ آخرت اور اپنی صفات پر دلالت کرنے والے بیسیوں دلائل بیان فرمائے ہیں۔ رسولوں نے جب یہ نشانیاں اور دلائل پیش کیے تو غور وفکر اور عقلی استدلال سے بھی ان کی صداقت پر مہرِ تصدیق ثبت کی۔

2 رسول نے ان کو وہ باتیں بتائیں جن تک عقل کی رسائی نہ ہو تو رسول کی بتائی ہوئی باتوں سے بھی خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے، کیوں کہ لوگ رسول کی صداقت پر دلالت کرنے والی نشانیوں سے عقلی استدلال کر کے اس کی صداقت تسلیم کر لیتے ہیں، پھر اس کی بتائی ہوئی باتوں کو بھی سچا مان لیتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دیگر نبیوں اور رسولوں نے بھی عقلی دلائل اور یقینی براہین سے نہ صرف استدلال کیا، بلکہ لوگوں کو بھی ان سے استدلال کرنے کی راہ سمجھائی، خدا کی معرفت کروانے اور توحید ثابت کرنے کے لیے یہ نبیوں کا پہلا طریقہ ہے۔

''کیا عقل حجت ہے؟'' اگر اس سے سائل کی مراد یہ ہے کہ کیا الٰہیات وغیرہ کے علوم میں سے کوئی بات رسولوں کے بغیر اور محض عقل کے ساتھ معلوم کی جا سکتی ہے؟ تو یاد رہے الٰہیات سے قطع نظر بلاشبہہ بہت سے علوم عقل سے معلوم کیے جاتے ہیں۔

اگر یہ مراد ہے کہ کیا بندوں پر محض ان کی عقل کی وجہ سے حجت قائم ہو جاتی ہے کہ اللہ ان کی طرف کوئی رسول بھیجے بغیر محض اس وجہ سے ان کو کافر ہونے پر سزا دے گا کہ ان کا کفر عقل کے تقاضے کے خلاف ہے؟ یہاں جمہور اہلِ اسلام کا مذہب یہ ہے کہ اللہ کسی کو بھی اس وقت تک عذاب نہیں دیتا جب تک اس کی طرف رسول مبعوث نہ کرے جس طرح کتاب وسنت ناطق ہیں۔ جب رسول نشانیاں لے کر آجائے تو وجوب ثابت ہو جاتا ہے اور بندوں پر ایمان لانا فرض ہو جاتا ہے۔ اگر وہ ایمان نہ لائیں تو سزا اور مذمت کے مستحق بن جاتے ہیں۔ چاہے غور وفکر کریں یا نہ کریں، کیوں کہ وجوب ایمان بالاتفاق غور وخوض پر موقوف نہیں۔ سزا کی شرط علم وعمل پر قدرت رکھنا ہے۔ رسول کی صداقت کی معرفت حاصل کرنا بندے کے بس میں ہے۔ اگر وہ غور وفکر نہ کرے اور جاننے کی کوشش بھی نہ کرے تو کوتاہی

کرنے والا متصور ہوگا، جس کی بنا پر سزا کا مستحق ہوگا۔ سائل کا پوچھنا کہ نبوت کس چیز کے ساتھ ثابت ہوتی ہے؟ جواب یہ ہے کہ خود نبوت کا ثبوت تو اللہ کے انبیا کو نبی بنانے اور رسولوں کو رسول بنانے سے ثابت ہوتا ہے، مگر ہمارے لیے اس کا ثبوت اور علم ان نشانیوں اور دلائل کے ساتھ ثابت ہوتا ہے جو انبیا پیش کرتے ہیں۔ ہم اپنی عقل کے ذریعے ان دلائل اور نشانیوں کا تجزیہ کرتے ہیں تو انبیا کو سچا پاتے ہیں جس طرح ہر صحیح دلیل کے ساتھ اس کے مدلول پر استدلال کیا جاتا ہے۔

یہ بات کہ ابراہیم علیہ السلام نے کس چیز کے ساتھ استدلال کیا تھا؟ تو ابراہیم علیہ السلام نے عقلی دلیلوں ہی سے استدلال کیا تھا۔ انھوں نے سورج، چاند کے غائب ہو جانے سے یہ استدلال کیا کہ جو اس طرح چھپ جائے، رب بنائے جانے کے قابل نہیں۔ اُن کی قوم ستاروں اور بتوں کی پوجا کرتی تھی، کیوں کہ وہ ان کے عقیدے کے مطابق ان کو فائدہ پہنچاتے تھے۔ وہ مشرک تھے، لیکن صانعِ کائنات کے منکر نہیں تھے۔

اسی طرح ابراہیم علیہ السلام نے ﴿ هٰذَا رَبِّيْ ﴾ سے یہ مراد نہیں لیا تھا کہ یہ زمین و آسمان کا خالق ہے، کیوں کہ یہ بات کوئی بھی عقل مند کہہ سکتا ہے نہ کسی نے آج تک کہی ہے۔ اسی طرح انھوں نے ان کواکب کی حرکت اور انتقال سے اس مطلوب (یعنی ان کے ظاہری فوائد) کے نہ ہونے پر استدلال کیا تھا، بلکہ جب انھوں نے اس کوکب یعنی چاند اور سورج کو حرکت میں دیکھا تو اس کی حرکت سے کسی چیز پر استدلال نہ کیا، لیکن جونہی وہ غروب ہوا تو آپ نے اس کے چھپنے اور غروب ہو جانے سے استدلال کیا۔

ان کی قوم کا کوئی فرد کسی کوکب کو اختیار کر کے اس کی عبادت شروع کر دیتا پھر اس کے ذریعے اس کا فائدہ طلب کرنے میں لگ جاتا تو اس پر شیطان اترتے اور اس سے مخاطب ہوتے جس طرح آج بھی کواکب پرستوں پر یہ اترتے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام نے ان کو وضاحت سے بتایا کہ وہی معبود عبادت کا حق رکھتا ہے جو حیی و قیوم ہو، عالم ہو، قادر ہو، ہر وقت بندوں کے امور منظم کرنے والا ہو، جس سے کسی بھی وقت میں بے نیاز نہیں رہا جا سکتا، مگر جو غروب ہو جائے اور چھپ جائے وہ اپنی عبادت کرنے والے کے سامنے حاضر ہوتا ہے نہ اس کی باتیں سن سکتا ہے اور نہ اس کے کام بنانے پر قادر ہوتا ہے، لہٰذا وہ معبود بننے کے قابل نہیں ہوتا۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نقطہ استدلال تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان کی قوم نے ان سے بحث اور جھگڑا کیا تو انھوں نے جواب دیا:

﴿ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّيْ فِي اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ ؕ وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ رَبِّيْ شَيْـًٔا ؕ وَسِعَ رَبِّيْ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿80﴾ وَكَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا ؕ فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿81﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ

يَلْبِسُوٓا إِيمَٰنَهُم بِظُلْمٍ أُولَٰٓئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ وَهُم مُّهْتَدُونَ ﴿٨٢﴾ وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ ءَاتَيْنَٰهَآ إِبْرَٰهِيمَ عَلَىٰ قَوْمِهِۦ ۚ نَرْفَعُ دَرَجَٰتٍ مَّن نَّشَآءُ ۗ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴾ [الأنعام: ۸۰۔ ۸۳]

''اس نے کہا کیا تم مجھ سے اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہو، حالانکہ یقیناً اس نے مجھے ہدایت دی ہے اور میں اس سے نہیں ڈرتا جسے تم اس کے ساتھ شریک بناتے ہو، مگر یہ کہ میرا رب کچھ چاہے، میرے رب نے ہر چیز کا احاطہ علم سے کر رکھا ہے، تو کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے۔ اور میں اس سے کیسے ڈروں جسے تم نے شریک بنایا ہے، حالانکہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ بے شک تم نے اللہ کے ساتھ اس کو شریک بنایا ہے جس کی کوئی دلیل اس نے تم پر نہیں اتاری، تو دونوں گروہوں میں سے امن کا زیادہ حق دار کون ہے، اگر تم جانتے ہو۔ وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو بڑے ظلم کے ساتھ نہیں ملایا، یہی لوگ ہیں جن کے لیے امن ہے اور وہی ہدایت پانے والے ہیں۔ اور یہ ہماری دلیل ہے جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلے میں دی، ہم درجوں میں بلند کرتے ہیں جسے چاہتے ہیں۔ بے شک تیرا رب کمال حکمت والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِى حَآجَّ إِبْرَٰهِۦمَ فِى رَبِّهِۦٓ أَنْ ءَاتَىٰهُ اللَّهُ الْمُلْكَ ﴾ [البقرة: ۲۵۸]

''کیا تو نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے اس کے رب کے بارے میں جھگڑا کیا، اس لیے کہ اللہ نے اسے حکومت دی تھی۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے مخالف کے ساتھ دلیل، نظر و فکر اور عقلی استدلال کے ساتھ مباحثہ کیا، صرف سماعی، یعنی وحی کی خبر کے ساتھ نہیں۔ یہ کوئی عقل مند نہیں کہہ سکتا کہ مخبر کی صداقت معلوم کرنے سے پہلے ہی اس کی دی گئی خبر مان لی جائے۔ تاہم بہت سے مفکرین کے خیال میں قرآن و سنت اور تمام انبیا کے کلام و اشارات سے استدلال محض ان کی خبر سے استدلال ہے۔ اس لیے اس سے پہلے عقلی دلائل کے ساتھ ان کی صداقت ثابت کرنا ضروری ہے۔ یہ بات گو صحیح ہے مگر انھوں نے دو وجوہ سے غلطی کھائی ہے:

1 ان کے گمان میں رسولوں نے لوگوں کے لیے خدا کا وجود اور اس کے رسولوں کی صداقت ثابت کرنے والی عقلی دلیلیں بیان نہیں کی، یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے، کیوں کہ رسول جب قوم کو اللہ کی طرف بلاتا ہے تو اس کا یہ بلانا اور دعوت اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک وہ اپنی صداقت ثابت کرنے والے دلائل مہیا نہیں کرتا، اس کی صداقت خدا کی پہچان کروانے سے معلوم ہوتی ہے، پھر بہت سے عقلی دلائل رسول کی بتائی ہوئی خبر کی صداقت

پر دلالت کرتے ہیں، اس لیے یہ باور کروانا کہ رسول محض نقل اور خبر کی بنیاد پر لوگوں کو چلاتے اور ان کی راہنمائی کرتے ہیں، بے دلیل ہے۔ رسول سے متعلق ایسا گمان کوئی انتہائی جاہل ہی کر سکتا ہے، کیوں کہ رسولوں نے بھی اپنی صداقت پر دلالت کرنے والے دلائل اور شواہد پیش کیے ہیں اور قرآن نے بھی ان کی صداقت کے، بلکہ خدا کے وجود، اس کی صورت، علم، وحدانیت اور ان تمام مقدمات کے سیکڑوں شواہد بیان کیے ہیں جن سے رسولوں کی صداقت معلوم ہو جاتی ہے۔

2 ان لوگوں نے خدا کا وجود اور رسولوں کی صداقت ثابت کرنے کے لیے ایسے خود ساختہ طریقے اختیار کیے ہیں جو انبیا کے طریقوں کے مطابق نہیں، لہٰذا دین میں یہ ایجاد کردہ طریقے رسولوں کے وہ طریقے نہیں جو انھوں نے لوگوں کو سکھائے اور جن کے مطابق ان کو دعوت دی۔

ان بدعی اور خود ساختہ طریقوں کے اپنے لوازم ہیں، لہٰذا جو ان کے ساتھ استدلال کرتا ہے ان کے لوازم کو اختیار کرنے کا پابند ہو جاتا ہے، کیوں کہ لازم کے بغیر ملزوم کا ثبوت ممتنع اور محال ہے۔

اب ان میں سے بہت سے لوازم رسولوں کے پیش کردہ استدلالات کے متضاد ہوتے ہیں اور یہ رسول کی صداقت ثابت کرنا چاہتے ہیں، مگر جو مقدمات استعمال کرتے ہیں وہ رسول کی تکذیب پر منتج ہوتے ہیں، لہٰذا بہت سے دانش ور جو ان طریقوں کا غیر شرعی ہونا سمجھتے ہیں، مگر یہ سمجھ کر کہ اگرچہ یہ غیر شرعی ہیں، مگر عقل سے ان کی صحت معلوم ہو سکتی ہے، اس لیے ان کو بروئے کار لے آتے ہیں، مگر جب نتیجہ رسول کی بتائی ہوئی خبر کے مخالف دیکھتے ہیں تو سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں کہ اگر ان طریقوں کی تردید اور نفی کریں تو ان عقلی اصول کی نفی لازم آتی ہے جن کے ساتھ رسول کی صداقت ثابت ہوتی ہے اور اگر ان طریقوں کو درست قرار دیں تو رسول کی بہت سی بتائی ہوئی چیزوں کی تکذیب لازم آتی ہے۔ جو ہر حالت میں ان طریقوں کو درست قرار دیتا ہے وہ یا تو رسول کی بتائی ہوئی بات کی تحریف کرتا ہے یا پھر اس پر غور وفکر کرنے سے منہ موڑ لیتا ہے، تاہم جو ان بدعی اور خود ساختہ طریقوں کی حقیقت سے آگاہ ہو وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ بدعت ہونے کی وجہ سے بے کار ہیں۔ اس لیے رسول کے پیش کردہ حقائق کے علم کے لیے اصول نہیں بن سکتے، بلکہ رسول کے بیان کردہ حقائق کے بھی معارض ہیں اور صریح عقلیات کے بھی۔ یہ متکلمین اپنے تئیں یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ وہ ان خود ساختہ اصول کے ساتھ اللہ کا اس جہاں کا خالق ہونا اور قادر، عالم اور متکلم ہونا ثابت کرتے ہیں، تاکہ اس کا رسول کو بھیجنا ممکن و مقدور ہو!

صفات کے حقائق سے آگاہی رکھنے والا اچھی طرح جانتا ہے کہ پروردگار کے اس جہاں کے خالق، قادر، عالم، متکلم اور قرآن اور رسول بھیجنے والا ہونے کا علم یا ان خود ساختہ اصول کے ابطال و تردید کے ساتھ ثابت ہوتا ہے یا ان

کے صحیح ہونے کا عقیدہ رکھنے کی تردید کے ساتھ ثابت ہوتا ہے، کیوں کہ یہ طریقہ رسولوں کی صداقت ثابت کرنے والے علم کے خلاف ہے۔ واللہ أعلم

عقل کی اولیت، فاتحہ کے خزانے اور تین چیزوں میں لوگوں کی شراکت کی بابت احادیث کی تحقیق

سوال مندرجہ ذیل احادیث کی صحت کی بابت سوال ہے، نیز کیا انھیں کسی معتبر محدث نے صحیح اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے؟

1 «أَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْعَقْلَ، قَالَ لَهُ: أَقْبِلْ فَأَقْبَلَ، ثُمَّ قَالَ لَهُ: أَدْبِرْ، فَأَدْبَرَ، ثُمَّ قَالَ: وَعِزَّتِي وَجَلَالِي مَا خَلَقْتُ أَكْرَمَ عَلَيَّ مِنْكَ، بِكَ آخُذُ، وَبِكَ أُعْطِي، وَبِكَ أُثِيبُ، وَبِكَ أُعَاقِبُ»

''اللہ نے سب سے پہلے عقل کو پیدا کیا، اس سے کہا: آگے آ، وہ آگے آئی، پھر اس سے کہا: پیچھے ہٹ جا، وہ پیچھے ہٹ گئی، پھر کہا: میری عزت و جلال کی قسم! میں نے جو کچھ پیدا کیا اس میں کوئی چیز ایسی نہیں جو میرے نزدیک تجھ سے زیادہ معزز ہو، میں تیرے ساتھ ہی پکڑوں گا، تیرے ساتھ ہی دوں گا، تیرے ساتھ ہی ثواب دوں گا اور تیرے ساتھ ہی سزا دوں گا۔''

2 «أُمِرْتُ أَنْ أُخَاطِبَ النَّاسَ عَلٰى قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ»

''مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں کی عقلوں کے مطابق ہی ان کو مخاطب کروں۔''

کیا یہ حدیث کے الفاظ ہیں یا ان میں کوئی تحریف یا کمی بیشی ہوئی ہے؟

3 «إِنَّ اللّٰهَ مَنَّ عَلَيَّ فِيْمَا مَنَّ عَلَيَّ: أَنْ أَعْطَيْتُكَ فَاتِحَةَ الْكِتَابِ وَهِيَ مِنْ كُنُوْزِ عَرْشِي، قَسَمْتُهَا بَيْنِي وَبَيْنَكَ نِصْفَيْنِ»

''اللہ نے جو مجھ پر احسانات کیے، ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ اس نے کہا: میں نے تجھے فاتحہ الکتاب دی ہے، جو میرے عرش کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے، میں نے اسے اپنے اور تمھارے درمیان آدھا آدھا تقسیم کیا ہے۔''

4 «اَلنَّاسُ شُرَكَاءُ فِيْ ثَلَاثٍ: اَلْمَاءِ، وَالْكَلَأَ وَالنَّارِ»

''لوگ تین چیزوں میں شریک ہیں: پانی، گھاس اور آگ۔''

---

(1) جامع المسائل (۷/۳۶۷۔۳۷۴)

جواب پہلی حدیث، حدیث کا علم رکھنے والے محدثین کے نزدیک جھوٹی اور موضوع ہے۔ یہ اسلام کی کسی معتبر کتاب میں موجود نہیں۔ اسے داود بن مُحبّر [1] اور اس جیسے عقل کے بارے میں لکھنے والے اور ''رسائل اخوان الصفا'' لکھنے والے فلسفی وغیرہ روایت کرتے ہیں۔ اسے ابو حامد غزالی نے بھی اپنی بعض کتابوں میں لکھا ہے۔ اسی طرح ابن عربی، ابن سبعین اور ان جیسے لوگ بھی نقل کرتے ہیں۔ لیکن یہ حدیث کا علم رکھنے والوں کے نزدیک جھوٹ ہے جو آنحضرت ﷺ کے نام پر گھڑا گیا، جس طرح ابو حاتم رازی اور ابو الفرج بن جوزی جیسے علمِ حدیث میں لکھنے والے مصنفین نے ذکر کیا ہے۔

ایک روایت میں اس حدیث کے یہ الفاظ بھی ہیں: «أول ما خلق الله العقل .....» اس کے آخر میں ''وبك أثيب وبك أعاقب'' کے بجائے ''وبك الثواب وبك العقاب'' کے الفاظ ہیں اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: «لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ الْعَقْلَ قَالَ لَهُ كَذٰلِكَ» جب اللہ تعالیٰ نے عقل کو پیدا کیا تو اس سے اسی طرح کہا۔ اس حدیث کا یہ معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تخلیق کے اول اوقات میں اس سے کہا۔ اس میں یہ ذکر نہیں کہ عقل کو اللہ نے سب مخلوقات سے پہلے پیدا کیا، لیکن ارسطو کے پیروکار فلاسفہ جو جہاں کی قدامت کے قائل ہیں اور ان کی راہ پر چلنے والے باطنی شیعہ، صوفیہ اور متکلمین انھوں نے اسے اس طرح روایت کیا ہے: «أَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ: الْعَقْلُ» (عقل پر پیش کے ساتھ) ''اللہ نے جو سب سے پہلی چیز پیدا کی وہ عقل تھی۔'' تا کہ یہ حدیث ان کے اس مذہب کی دلیل بنے جس کے مطابق عقلِ اول کو سب سے پہلے پیدا کیا گیا۔ یہ الفاظ کسی محدث نے روایت نہیں کیے، بلکہ جو مروی الفاظ ہیں وہ اپنے ضعف کے باوجود اس کے الٹ مفہوم پر دلالت کرتے ہیں، کیوں کہ اس حدیث میں آگے چل کر کہا گیا ہے: ''میں نے تجھ سے زیادہ معزز کوئی مخلوق پیدا نہیں کی۔'' جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے کئی دوسری چیزیں پیدا ہو چکی تھیں۔ فلاسفہ جسے عقلِ اول سے تعبیر کرتے ہیں، ان کے نزدیک اس سے پہلے کوئی مخلوق نہیں تھی۔ اسی طرح اس میں یہ بھی کہا گیا ہے: ''تیرے ہی ساتھ پکڑوں گا، تیرے ہی ساتھ دوں گا، تیرے ہی ساتھ ثواب دوں گا، تیرے ہی ساتھ سزا دوں گا۔'' اس میں اس کے ساتھ یہ چار اعراض بھی منسلک کیے ہیں، حالانکہ ان باطنی فلاسفہ کے نزدیک تمام عالم عقلِ اول سے صادر ہوا، جو ان کے نزدیک زمینوں آسمانوں اور ان کے مابین تمام مخلوقات کا رب ہے۔ وہ اگرچہ واجب بذاتہ کے لیے مربوب اور اس کے پروردہ ہیں، لیکن یہ سب ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ

---

[1] داود بن مُحبَّر بن قحذم بن سليمان بن ذكوان أبو سليمان الطائي البصري، له كتاب العقل وضع فيه أحاديث. قال الذهبي: ليته لم يصنفه وقد ضعفه الإمام أحمد والبخاري وأبو زرعة وابن معين والجوزجاني وصالح محمد البغدادي والدارقطني وغيرهم. وقال ابن حبان البستي: كان يضع الحديث على الثقات ويروي عن المجاهيل المقلوبات. وتوفي سنة ٢٠٦هـ . انظر ''تاريخ بغداد''، ''كتاب المجروحين من المحدثين والضعفاء والمتروكين'' و ''ميزان الاعتدال''

سے نکلے ہیں، اس کی ذات کے ساتھ لازم ہیں۔ یہ یہودیت، عیسائیت اور اسلام جیسے آسمانی مذاہب کے پیروکاروں میں سے ملحدوں کے علاوہ کسی کا قول نہیں، بلکہ یہ مجوسیوں، جمہور صابیوں، اکثر مشرکوں، جمہور فلاسفہ کا قول بھی نہیں، بلکہ فلاسفہ کے ایک گروہ کا قول ہے۔

نیز عقل مسلمانوں کی لغت میں اعراض میں سے ایک عرض ہے، جو قائم بغیرہ ہے اور یہ ایک غریزہ، یعنی جبلی چیز ہے، یا علم ہے، یا علم پر عمل ہے۔ مسلمانوں کی لغت میں عقل قائم بنفسہ جوہر نہیں، لہٰذا یہ عقل جو تمام مخلوقات میں سے سب سے اول تھی، اس کا عرض قائم لغیرہ ہونا ناممکن ہے، کیوں کہ عرض محل کے بغیر قائم نہیں ہوتا، لہٰذا کسی بھی ذات کے وجود سے پہلے اس عرض کا وجود ممتنع اور ناممکن ہے، لیکن ان فلاسفہ کی اصطلاح میں عقل قائم بنفسہ جوہر ہے۔ مسلمانوں کی زبان میں عقل کا یہ معنی نہیں، نبی اکرم ﷺ مسلمانوں کو عربی زبان میں مخاطب کرتے تھے۔ یونانی زبان میں نہیں، لہٰذا معلوم ہوا کہ اس سے فلاسفہ نے جو معنی مراد لیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس کا قصد نہیں کیا تھا۔ یہ تو اس صورت میں بات ہوگی کہ آپ ﷺ نے یہ لفظ استعمال کیا ہو، لیکن آپ ﷺ نے تو یہ لفظ بولا ہی نہیں![1]

دوسری حدیث (مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں کی عقلوں کے مطابق ہی ان کو مخاطب کروں) بھی کسی معتبر عالمِ حدیث نے روایت نہیں کی اور یہ ان کی کتابوں میں بھی موجود نہیں۔ اللہ اور اس کے رسول کا لوگوں سے خطاب عام ہوتا ہے جو تمام مکلفین کو شامل ہوتا ہے، جیسے یہ الفاظ ہیں: "يأيها الناس" "اے لوگو!" "يأيها الذين آمنوا" "اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو!" "يا عبادي" "اے میرے بندو!" "يا بني إسرائيل" "اے بنی اسرائیل!" اسی طرح نبی اکرم ﷺ منبر پر ایک ہی کلام کے ساتھ لوگوں کو مخاطب کرتے تھے، جسے ہر کوئی سنتا، لیکن لوگ اپنی قوتِ فہم اور حسنِ عقیدہ میں تفاضل کے اعتبار سے کلام کو سمجھنے میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں، اسی لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی مراد اور مفہوم کو سب سے زیادہ جانتے تھے، جس طرح صحیحین میں حضرت ابوسعید سے مروی ہے: "نبی اکرم ﷺ نے لوگوں کو خطبہ دیا اور کہا: اللہ تعالیٰ نے ایک بندے کو دنیا اور آخرت میں سے ایک کا انتخاب کرنے کا اختیار دیا تو اس بندے نے آخرت کو منتخب کر لیا۔" راوی کہتا ہے: ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر رونا شروع کر دیا اور کہنے لگے: اللہ کے رسول! ہم آپ پر اپنی جانیں اور مال سب کچھ نچھاور کرتے ہیں۔ لوگ اس پر تعجب کرنے لگے اور کہنے لگے: اس بزرگ پر تعجب ہے، رسول اللہ ﷺ نے کسی بندے کا ذکر کیا ہے اور اس نے رونا شروع کر دیا ہے۔ راوی کہتا ہے: "جس کو اختیار دیا گیا وہ آنحضرت ﷺ ہی تھے اور حضرت

[1] اس کی تفصیل کے لیے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی "بغية المرتاد" نامی کتاب (ص: ۱۶۹ تا آخر) دیکھیں۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ ہم سے زیادہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جانتے تھے۔‘‘[1] اس حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مطلق ایک بندے کا ذکر کیا، لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پہچان لیا کہ وہ کون ہے۔

اسی طرح وہ روایت بھی ثابت نہیں ہے جو بعض لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ روایت کرتے ہیں کہ ابوبکر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپس میں باتیں کیا کرتے تھے اور میں ان دونوں کے درمیان ایک حبشی کی طرح ہوتا تھا، یہ جھوٹی اور خانہ ساز روایت ہے۔ اسی طرح جو یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اور جواب دیا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اور جواب دیا، یہ بھی بالاتفاق موضوع روایت ہے۔[2]

دعوت کا طریقہ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا حکم

سوال درج ذیل آیت کا کیا مطلب ہے؟

﴿ قُلۡ هَٰذِهِۦ سَبِيلِيٓ أَدۡعُوٓاْ إِلَى ٱللَّهِۚ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا۠ وَمَنِ ٱتَّبَعَنِيۖ ﴾ [یوسف: ۱۰۸]

’’کہہ دے یہی میرا راستہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، پوری بصیرت پر، میں اور وہ بھی جنھوں نے میری پیروی کی ہے۔‘‘

کیا عام دعوت ہر مسلمان مرد اور عورت کی ذمے داری میں شامل ہے؟ کیا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس دعوت میں شامل ہے؟ اگر یہ دونوں داخل ہیں یا داخل نہیں، ان دونوں صورتوں میں کیا یہ ہر مسلمان فرد اور شخص کے فرائض میں داخل ہیں؟ اگر یہ دونوں ہر مسلمان پر واجب ہیں تو کیا یہ مشقت کے باوجود مطلق طور پر واجب ہیں یا نہیں؟ اگر نیکی کا حکم دینے والے اور برائی سے منع کرنے والے کو کوئی اذیت پہنچائے اور ظلم کا شکار بنائے تو کیا وہ اس سے قصاص لے سکتا ہے، تاکہ یہ اس کی جانب سے حق کی طرف دست درازی کی خواہش کا سبب نہ بنے، یا وہ ایسا نہیں کرسکتا؟ اگر وہ قصاص لینے کا حق رکھتا ہے تو کیا اس کو مطلق ترک کر دینا زیادہ بہتر ہوگا یا نہیں؟

جواب الحمد لله رب العالمين. اللہ کی طرف بلانے اور دعوت دینے کا مطلب ہے، اللہ پر ایمان رکھنے، رسولوں کی پیش کردہ تعلیمات کو قبول کرنے، ان کی بتائی گئی باتوں اور خبروں کی تصدیق کرنے اور ان کے احکام کی فرماں برداری کرنے کی دعوت دینا، یہ توحید و رسالت کی گواہی، نماز قائم کرنے، زکات ادا کرنے اور رمضان کے روزے رکھنے اور بیت اللہ کا حج کرنے کی دعوت، اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٩١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨٢)

[2] مجموع الفتاویٰ (١٨/٣٣٦۔٣٣٩)

رسولوں، مرنے کے بعد اٹھنے، تقدیر کے اچھا یا برا ہونے پر ایمان کی دعوت اور اللہ کی اس طرح عبادت کرنے کی دعوت پر مشتمل ہے، گویا بندہ اللہ کو دیکھ رہا ہو۔

کیوں کہ یہ اسلام، ایمان اور احسان کے تین درجات ہیں جو دین میں داخل ہیں، جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے:

«هَذَا جِبْرَائِيلُ جَاءَكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِينَكُمْ» [1]

''یہ جبرائیل تھے جو تمھیں تمھارا دین سکھانے کے لیے آئے تھے۔''

جب جبرائیل علیہ السلام نے ان تین چیزوں کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تو آپ ﷺ نے ان کو ان کے سوالات کے جوابات دیے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ یہ جبرائیل تمھیں دین سکھانے کے لیے آیا تھا۔ تو اس سے ثابت ہوا کہ یہ سب امور ہمارے دین سے تعلق رکھتے ہیں۔

لفظ ''دین'' مصدر ہے۔ جو فاعل اور مفعول دونوں کی طرف متعدی ہوتا ہے، کہا جاتا ہے: ''دَانَ فُلَانٌ فُلَاناً'' ''فلاں نے فلاں کی بندگی اور اطاعت کی۔'' اس کا ایک معنی ذلیل و مطیع اور ماتحت کرنا بھی ہے۔ بندے کا اللہ کا دین اختیار کرنے کا مطلب ہے، اس کی عبادت اور اطاعت کرنا۔ جب دین کی نسبت بندے کی طرف کی جائے تو وہ اس کے عابد اور مطیع ہونے کے اعتبار سے ہوتی ہے اور جب اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف مضاف کیا جائے تو یہ اضافت اس کے معبود اور مطاع ہونے کے لحاظ سے ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ ﴾ [الأنفال: ٣٩]

''اور ان سے لڑو، یہاں تک کہ کوئی فتنہ نہ رہے اور دین سب کا سب اللہ کے لیے ہو جائے۔''

لہٰذا اللہ تعالیٰ کی دعوت درحقیقت اس کے دین کی دعوت ہوتی ہے اور دین کی اصل یہ ہے کہ اللہ اکیلے کی عبادت کی جائے جس کا کوئی شریک نہیں۔ یہی پیغام دے کر اللہ نے رسول مبعوث کیے اور یہی دعوت اپنی کتابوں کو نازل کر کے دی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ ﴾ [الشورى: ١٣]

''اس نے تمھارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا جس کا تاکیدی حکم اس نے نوح کو دیا اور جس کی وحی ہم نے تیری طرف کی اور جس کا تاکیدی حکم ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا، یہ کہ اس دین کو قائم رکھو اور اس میں جدا جدا نہ ہو جاؤ۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨، ٩)

نیز فرمایا:

﴿ وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَاۤ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ﴾ [الزخرف: ٤٥]

''اور ان سے پوچھ جنھیں ہم نے تجھ سے پہلے اپنے رسولوں میں سے بھیجا، کیا ہم نے رحمان کے سوا کوئی معبود بنائے ہیں، جن کی عبادت کی جائے؟''

مزید فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ﴾ [النحل: ٣٦]

''اور بلاشبہ یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو، پھر ان میں سے کچھ وہ تھے جنھیں اللہ نے ہدایت دی اور ان میں سے کچھ وہ تھے جن پر گمراہی ثابت ہوگئی۔''

ایک جگہ فرمایا:

﴿ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْۤ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴾ [الأنبياء: ٢٥]

''اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف یہ وحی کرتے تھے کہ بے شک حقیقت یہ ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کرو۔''

صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« إِنَّا مَعَاشِرَ الْأَنْبِيَاءِ، دِيْنُنَا وَاحِدٌ، اَلْأَنْبِيَاءُ إِخْوَةٌ لِعَلَّاتٍ وَإِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِابْنِ مَرْيَمَ لَأَنَا، إِنَّهُ لَيْسَ بَيْنِي وَبَيْنَهُ نَبِيٌّ »[1]

''ہم انبیا کی جماعت کا دین ایک ہی ہے۔ انبیا علاتی (سوتیلے) بھائی ہیں۔ بے شک سب لوگوں سے زیادہ عیسیٰ بن مریم کے قریب تو میں ہوں، کیوں کہ میرے اور اس کے درمیان کوئی نبی نہیں۔''

لہٰذا دین ایک ہی ہے، صرف ان کی شریعتوں اور مناہج میں تنوع اور بوقلمونی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ﴾ [المائدة: ٤٨]

''تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے ایک راستہ اور ایک طریقہ مقرر کیا ہے۔''

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٢٥٩) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٣٦٥)

بنا بریں تمام رسول اعتقادی اور عملی اصول کے جامع دین میں متفق ہیں، اعتقادی اصول سے اللہ تعالیٰ، رسولوں اور آخرت کے دن جیسے امور پر ایمان لانا مراد ہے اور عملی اصول سے مراد وہ عام اعمال ہیں جو سورت انعام، اعراف اور بنی اسرائیل کی درج ذیل آیات میں مذکور ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿١٥١﴾ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿١٥٢﴾ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿١٥٣﴾ ﴾ [الأنعام: ١٥١۔١٥٣]

''کہہ دے آؤ میں پڑھوں جو تمھارے رب نے تم پر حرام کیا ہے، (اس نے تاکیدی حکم دیا ہے) کہ اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ خوب احسان کرو اور اپنی اولاد کو مفلسی کی وجہ سے قتل نہ کرو، ہم ہی تمھیں رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی اور بے حیائیوں کے قریب نہ جاؤ، جو ان میں سے ظاہر ہیں اور چھپی ہوئی ہیں اور اس جان کو قتل نہ کرو جسے اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے مگر حق کے ساتھ۔ یہ ہے جس کا تاکیدی حکم اس نے تمھیں دیا ہے، تاکہ تم سمجھو۔ اور یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ، مگر اس طریقے سے جو سب سے اچھا ہو، یہاں تک کہ وہ اپنی پختگی کو پہنچ جائے اور ماپ اور تول انصاف کے ساتھ پورا کرو۔ ہم کسی شخص کو تکلیف نہیں دیتے مگر اس کی طاقت کے مطابق اور جب بات کرو تو انصاف کرو خواہ رشتہ دار ہو اور اللہ کے عہد کو پورا کرو۔ یہ ہے جس کا تاکیدی حکم اس نے تمھیں دیا ہے، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔ اور یہ کہ بے شک یہی میرا راستہ ہے سیدھا، پس اس پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ تمھیں اس کے راستے سے جدا کر دیں گے۔ یہ ہے جس کا تاکیدی حکم اس نے تمھیں دیا ہے، تاکہ تم بچ جاؤ۔''

نیز فرمایا:

﴿ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ﴿٢٣﴾ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ﴿٢٤﴾ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ اِنْ تَكُوْنُوْا

صٰلِحِیْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِیْنَ غَفُوْرًا ﴿25﴾ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا ﴿26﴾ اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ كَانُوْۤا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ ؕ وَكَانَ الشَّیْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴿27﴾ وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّیْسُوْرًا ﴿28﴾ وَلَا تَجْعَلْ یَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ﴿29﴾ ﴾ [بني إسرائيل: ٢٣-٢٩]

’’اور تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ سے اچھا سلوک کرو۔ اگر کبھی تیرے پاس دونوں میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ ہی جائیں تو ان دونوں کو ’’اف‘‘ مت کہہ اور نہ انھیں جھڑک اور ان سے بہت کرم والی بات کہہ۔ اور رحم دلی سے ان کے لیے تواضع کا بازو جھکا دے اور کہہ اے میرے رب! ان دونوں پر رحم کر جیسے انھوں نے چھوٹا ہونے کی حالت میں مجھے پالا۔ تمھارا رب زیادہ جاننے والا ہے جو تمھارے دلوں میں ہے۔ اگر تم نیک ہو گے تو یقیناً وہ بار بار رجوع کرنے والوں کے لیے ہمیشہ سے بے حد بخشنے والا ہے۔ اور رشتہ دار کو اس کا حق دے اور مسکین اور مسافر کو اور مت بے جا خرچ کر، بے جا خرچ کرنا۔ بے شک بے جا خرچ کرنے والے ہمیشہ سے شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان ہمیشہ سے اپنے رب کا بہت ناشکرا ہے۔ اور اگر کبھی تو ان سے بے توجہی کر ہی لے، اپنے رب کی کسی رحمت کی تلاش کی وجہ سے، جس کی تو امید رکھتا ہو تو ان سے وہ بات کہہ جس میں آسانی ہو۔ اور نہ اپنا ہاتھ اپنی گردن سے بندھا ہوا کر لے اور نہ اسے کھول دے، پورا کھول دینا، ورنہ ملامت کیا ہوا، تھکا ہارا ہو کر بیٹھ رہے گا۔‘‘

اور فرمایا:

﴿ قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ وَاَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ﴾ [الأعراف: ٢٩]

’’کہہ دے میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے اور اپنے رخ ہر نماز کے وقت سیدھے رکھو اور اس کے لیے دین کو خالص کرتے ہوئے اس کو پکارو۔‘‘

مزید فرمایا:

﴿ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿33﴾ ﴾ [الأعراف: ٣٣]

’’کہہ دے میرے رب نے تو صرف بے حیائیوں کو حرام کیا ہے، جو ان میں سے ظاہر ہیں اور جو چھپی ہوئی ہیں اور گناہ کو اور ناحق زیادتی کو اور یہ کہ تم اللہ کے ساتھ اسے شریک ٹھہراؤ جس کی اس نے کوئی

دلیل نہیں اتاری اور یہ کہ تم اللہ پر وہ کہو جو تم نہیں جانتے۔''

یہ امور اس دین سے تعلق رکھتے ہیں جس پر تمام شریعتوں کا اتفاق ہے، عام مکی سورتوں کے مضمون کی طرح، جو ان اصول پر مشتمل ہیں، جن پر تمام رسولوں کا اتفاق ہے۔ ان سورتوں میں خطاب ایسے لوگوں کو دعوت دینے پر مشتمل ہے جو اصل رسالت کا اقرار نہیں کرتے، لیکن مدنی سورتوں میں اصل رسالت کا اقرار کرنے والوں کو خطاب ہے، جیسے اہلِ کتاب جو کتاب کے کچھ حصے پر ایمان رکھتے تھے اور کچھ پر ایمان نہیں رکھتے تھے، اسی طرح ان سورتوں میں وہ مومن بھی مخاطب ہیں جو اللہ کی کتابوں اور رسولوں پر ایمان رکھتے تھے۔ اسی لیے ان میں ان شرعی احکام کو مقرر کیا گیا، جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے دین کی تکمیل کی، جیسے: قبلہ، حج، صیام، اعتکاف، جہاد، نکاح کے احکام وغیرہ اور مالی معاملات کے احکام، جیسے: خرید وفروخت میں عدل سے کام لینا احسان سے متعلقہ احکام جیسے صدقہ خیرات کرنا اور ظلم سے متعلقہ احکام جیسے سود اور اس طرح کے دیگر احکام جن کا دین کی کاملیت سے تعلق ہے۔

اسی لیے مکی سورتوں میں ﴿ يَاَيُّهَا النَّاسُ ﴾ (اے لوگو!) سے مخاطب کیا گیا ہے، کیوں کہ اصول کی عمومی دعوت دینا مقصود تھا، کیوں کہ جو اصل کا اقرار نہیں کرتا، اس کو فرع کی دعوت نہیں دی جاتی۔

جب رسول اللہ ﷺ نے مدینے ہجرت کی اور وہاں اہلِ ایمان کو عزت ملی تو وہاں چونکہ اہلِ کتاب بھی رہتے تھے، اس لیے مدنی سورتوں میں ان دونوں کو مخاطب کیا گیا۔ مومنوں کو ﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ سے مخاطب کیا گیا ہے اور اہلِ کتاب کو کبھی ﴿ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ ﴾ کے الفاظ سے مخاطب کیا گیا تو کبھی ﴿ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴾ کے الفاظ سے۔ مکہ میں ان جیسے الفاظ میں سے کوئی لفظ نازل نہیں ہوا، لیکن مدنی سورتوں میں ﴿ يَاَيُّهَا النَّاسُ ﴾ کے الفاظ سے خطاب ملتا ہے، جیسے سورت نساء اور سورت حج میں ہے اور یہ دونوں ہی مدنی سورتیں ہیں، اسی طرح سورت بقرہ میں بھی یہ انداز موجود ہے۔

اس سے حبرِ امت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول متاثر اور مکدر ہوتا ہے، کیوں کہ ان آیات میں مذکور حکم لوگوں کی جنس کو شامل ہے اور مخصوص نام کے ساتھ دعوت دینا عام نام کے ساتھ دعوت دینے کے منافی نہیں، اس لیے ﴿ يَاَيُّهَا النَّاسُ ﴾ کے خطاب میں بھی اہلِ ایمان اسی طرح داخل ہیں جس طرح ﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ کے خطاب میں داخل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت ہر اس امر اور نہی کو شامل ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور جس سے منع کیا ہے۔ یہی ہر معروف، یعنی نیکی کا حکم دینا ہے اور ہر منکر، یعنی برائی سے منع کرنا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے یہی دعوت دی، کیوں کہ آپ ﷺ نے امت کو ہر اس کام کا حکم دیا جس کا اللہ نے حکم دیا اور ہر اس کام سے منع کیا جس سے اللہ نے منع کیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۚ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُم بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِندَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ ﴾ [الأعراف: ١٥٦، ١٥٧]

''اور میری رحمت نے ہر چیز کو گھیر رکھا ہے، سو میں اسے ان لوگوں کے لیے ضرور لکھ دوں گا جو ڈرتے ہیں اور زکات دیتے ہیں اور (ان کے لیے) جو ہماری آیات پر ایمان لائیں گے۔ وہ جو اس رسول کی پیروی کریں گے، جو امی نبی ہے، جسے وہ اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پائیں گے، جو انھیں نیکی کا حکم دے گا اور انھیں برائی سے روکے گا اور ان کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کرے گا اور ان پر ناپاک چیزیں حرام کرے گا۔''①

رسول اللہ ﷺ نے اللہ کی طرف جو دعوت دی وہ اللہ کی اجازت سے تھی، آپ ﷺ نے کسی ایسے دین کو شریعت بنا کر پیش نہیں کیا جس کی اللہ تعالیٰ نے اجازت نہ دی ہو، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝ وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا ۝ ﴾ [الأحزاب: ٤٥، ٤٦]

''اے نبی! بے شک ہم نے تجھے گواہی دینے والا اور خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ اور اللہ کی طرف بلانے والا اس کے اذن سے اور روشنی کرنے والا چراغ۔''

ان لوگوں کے خلاف جن کی اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں مذمت کی ہے:

﴿ أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ شَرَعُوا لَهُم مِّنَ الدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَن بِهِ اللَّهُ ﴾ [الشورىٰ: ٢١]

''یا ان کے لیے کچھ ایسے شریک ہیں جنھوں نے ان کے لیے دین کا وہ طریقہ مقرر کیا ہے جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی۔''

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ قُلْ أَرَأَيْتُم مَّا أَنزَلَ اللَّهُ لَكُم مِّن رِّزْقٍ فَجَعَلْتُم مِّنْهُ حَرَامًا وَحَلَالًا قُلْ آللَّهُ أَذِنَ لَكُمْ ۖ أَمْ عَلَى اللَّهِ تَفْتَرُونَ ۝ ﴾ [یونس: ٥٩]

''کہہ کیا تم نے دیکھا جو اللہ نے تمھارے لیے رزق اتارا، پھر تم نے اس میں سے کچھ کو حرام اور کچھ کو

---

① مستقبل والا ترجمہ اس لیے کیا ہے کہ یہ مکالمہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہوا تھا، جو ماضی میں ہے، اس لیے اس جگہ مستقبل والا معنی درست ہے، اس میں امتِ محمدیہ کے اوصاف بیان ہوئے ہیں۔

حلال بنا لیا۔ کہہ کیا اللہ نے تمھیں اجازت دی ہے، یا تم اللہ پر جھوٹ باندھ رہے ہو۔''

ہماری ذکر کردہ بات کی تصدیق اور وضاحت اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ اللہ نے اپنے نبی کو کبھی اپنی طرف دعوت دینے کا حکم دیا تو کبھی اپنے راستے کی طرف، جیسے اس آیت میں ہے:

﴿ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ﴾ [النحل: ۱۲۵]

''اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلا۔''

کیوں کہ یہ معلوم ہے کہ داعی اور مبلغ جب کسی دوسرے کو کسی کام کی دعوت دیتا ہے تو اس کی دعوت وتبلیغ میں دو امور کا ہونا ضروری ہے:

1. ایک مقصود ومراد۔
2. دوسرا منزل ومقصود تک پہنچانے کا راستہ اور ذریعہ۔

اس لیے کبھی اللہ کی طرف دعوت دینے کا ذکر کیا جاتا ہے اور کبھی اللہ کے راستے کی دعوت کا ذکر ہوتا ہے، کیوں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ جو معبود ہے، دعوت سے وہی مقصود ومطلوب ہے۔

عبادت ایک ایسا لفظ ہے جو اللہ کے لیے کمالِ محبت اور کمالِ اطاعت، یعنی حد درجہ مسکینی کو جامع ہے۔ جو کسی غیر کے سامنے جھکے اور اللہ کے ساتھ بغض رکھے وہ عابد نہیں ہوتا، اسی طرح جو اس کے سامنے جھکنے اور ذلیل و عاجز ہونے کے بغیر اس کے ساتھ محبت کرے وہ بھی عابد نہیں ہوتا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا یہ استحقاق ہے کہ اس کے ساتھ غایت درجہ محبت رکھی جائے، بلکہ وہ محبوب مطلق ہونا چاہیے کہ جس چیز سے بھی محبت کی جائے اسی کی خاطر کی جائے اور اس کے سامنے آخری حد تک جھکا جائے، بلکہ کسی بھی چیز کے لیے اگر جھکا اور ذلیل ہوا جائے تو صرف اس کی خاطر جھکا اور ذلیل ہوا جائے جو ان دونوں امور میں، یعنی محبت اور ذلت میں اس کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کرتا ہے، وہ حقیقی محبتِ الٰہی اور تعظیمِ خداوندی سے محروم رہتا ہے، کیوں کہ شرک محبت میں کمی کو لازم کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ﴾ [البقرة: ١٦٥]

''اور لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو غیر اللہ میں سے کچھ شریک بنا لیتے ہیں، وہ ان سے اللہ کی محبت جیسی محبت کرتے ہیں اور وہ لوگ جو ایمان لائے، اللہ سے محبت میں کہیں زیادہ ہیں۔''

یعنی یہ جتنی محبت اپنے شریکوں سے رکھتے ہیں، مومن ان سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ اللہ سے محبت کرتا

ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ﴾ [الزمر: ۲۹]

''اللہ نے ایک آدمی کی مثال بیان کی جس میں ایک دوسرے سے جھگڑنے والے کئی شریک ہیں اور ایک اور آدمی کی جو سالم ایک ہی آدمی کا (غلام) ہے، کیا دونوں مثال میں برابر ہیں؟''

اسی طرح استکبار، یعنی اپنے آپ کو بڑا سمجھنا اللہ کے سامنے جھکنے اور عاجز ہونے میں مانع ہے، بلکہ اللہ کی حقیقی محبت میں مانع اور رکاوٹ ہے، کیوں کہ مکمل محبت ذلت (مسکینی) اور اطاعت کو لازم کرتی ہے، کیوں کہ محبت کرنے والا محبوب کا فرماں بردار ہوتا ہے۔

اس بنا پر محبت کے کئی درجات ہیں، جن میں سب سے بلند درجہ تَتَیُّم (دیوانگی) کا ہے۔ اس کا مطلب ہے محبت کی وجہ سے کسی کا غلام بن جانا اور تیمُ اللہ کا معنی ہے عبداللہ، یعنی اللہ کا غلام، جسے اللہ سے محبت ہو اور اس کی بندگی میں دیوانہ ہو چکا ہو اور بندگی کرنا بھی ہے۔ قَلبٌ مُتَیَّمٌ ایسے دل کو کہا جاتا ہے جو اپنے محبوب کا غلام ہو، اس لیے اکیلے اللہ کے سوا اس درجے کی محبت کا کوئی استحقاق نہیں رکھتا۔

اسلام کا معنی ہے، بندے کا صرف اللہ کے سامنے جھکنا اور سرِ تسلیم خم کرنا، جس طرح ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ'' سے بھی مستفاد ہوتا ہے۔ جو اللہ کے سامنے بھی جھکے اور غیر کے سامنے بھی، وہ مشرک ہوتا ہے۔ جو اس کے سامنے نہیں جھکتا وہ متکبر ہوتا ہے اور یہ دونوں رویے ہی اسلام کے خلاف ہیں، شرک عیسائیوں اور امت میں ان کی مشابہت رکھنے والے گمراہوں میں غالب ہے۔

ہم نے اس موضوع سے متعلق تفصیلی گفتگو بہت سے دیگر مقامات پر پیش کی ہے، یعنی اللہ کی توحید اور الوہیت کا اثبات، شرک کا انکار اور تردید، اللہ کے علاوہ کسی دوسرے معبود کو فرض کرنا زمین و آسمان کے فساد اور بربادی کا موجب ہے، اسی طرح ربوبیت میں شرک اور الوہیت میں شرک کے درمیان کیا فرق ہے؟ اللہ کا اقرار، اس کی محبت اور تعظیم بندوں کی فطرت میں داخل ہے، دلوں کی اصلاح، کمال، لذت، سرور، خوشی اور سعادت صرف ایک اللہ کی عبادت کی مرہونِ منت ہے۔ صراطِ مستقیم سے مراد انبیا، صدیقین، شہدا اور صالحین کے انعام یافتہ گروہ کا راستہ ہے، ان کے راستے پر چلنے کے بغیر صراطِ مستقیم پر چلنا ناممکن ہے، یہ مسائل اور ان جیسے وہ مسائل جنھیں اپنانا اور عملی زندگی کا حصہ بنانا نبوی دعوت اور رسالتِ الٰہی کے مقصود کو عملی جامہ پہنانا ہے، وہ سب اس مقام سے تعلق رکھتے ہیں، بلکہ یہ قرآن کا لبِ لباب اور خلاصہ ہے، علمی اور قولی توحید کا بیان سورت اخلاص میں ہے اور قصدی اور عملی توحید کا ذکر

سورت کافرون میں ہے۔ کیوں کہ یہ اللہ کی طرف دعوت کی اصل، حقیقت اور مقصود کا بیان ہے۔

لیکن اس جواب میں ان امور کا اجمالی طور پر ذکر کرنا مقصود ہے، کیوں کہ یہ تفصیل کا متحمل نہیں۔ ہر وہ باطنی اور ظاہری واجب اور مستحب امر جو اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہو اس کا حکم دینا اللہ کی طرف دعوت دینا ہے اور ہر وہ ظاہری اور باطنی امر جو اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک قابلِ نفرت ہو اس سے منع کرنا اللہ کی طرف دعوت دینا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت اس وقت تک پوری نہیں ہوتی جب تک ایسے افعال کی دعوت نہ دی جائے جو اللہ کو پسند ہوں اور ان اعمال سے منع نہ کیا جائے جو اس کے نزدیک مبغوض اور قابلِ نفرت ہوں، ان میں ظاہری اور باطنی اقوال اور افعال سب شامل ہیں، مثلاً: اللہ تعالیٰ کے اسما و صفات، آخرت کے امور، عرشِ الٰہی، کرسیِ الٰہی، فرشتوں، انبیا، گزشتہ اقوام، ان کے دشمنان اور دیگر مخلوقات کے بارے میں رسول کی بتائی ہوئی باتوں کی تصدیق کرنا، دین کو اللہ کے لیے خالص کرنا، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے ساتھ سارے جہاں سے بڑھ کر محبت کرنا، اللہ پر توکل کرنا، اس کی رحمت کی امید رکھنا، اس کے عذاب سے ڈرنا، اس کے حکم پر صبر کرنا، سچ بولنا، امانت ادا کرنا، وعدہ پورا کرنا، صلہ رحمی کرنا، پڑوسیوں سے حسنِ سلوک کرنا اور اللہ کی راہ میں دل، زبان اور ہاتھ سے جہاد کرنا۔

جب یہ مفہوم واضح ہو گیا ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینا ہر اس فرد پر واجب ہے جو آنحضرت ﷺ کی اتباع کرتا ہے اور یہ آپ ﷺ کی امت ہے جو اسی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دیتی ہے جس طرح آپ ﷺ نے اللہ کی دعوت دی۔

اسی طرح یہ دعوت امر بالمعروف و نہی عن المنکر دونوں کو شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے کئی مقامات پر آپ ﷺ کی امت کی یہ صفت ذکر کی ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ﴾ [آل عمران: ۱۱۰]

''تم سب سے بہتر امت چلے آئے ہو جو لوگوں کے لیے نکالی گئی، تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے منع کرتے ہو۔''

نیز فرمایا:

﴿ وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ﴾ [التوبۃ: ۷۱]

''اور مومن مرد اور مومن عورتیں، ان کے بعض بعض کے دوست ہیں، وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں۔''

یہ فریضہ امت پر مجموعی طور پر فرض ہے، علمائے کرام اسے فرضِ کفایہ کا نام دیتے ہیں، اگر امت کا ایک گروہ اسے ادا کردے تو یہ باقی ماندہ سے ساقط ہو جاتا ہے، اسے ادا کرنے کے لیے ساری امت مخاطب ہے، لیکن اگر ایک گروہ اس سے عہدہ برآ ہو جائے تو یہ دیگر افرادِ امت سے ساقط ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ ﴾ [آل عمران: ١٠٤]

''اور لازم ہے کہ تم میں ایک ایسی جماعت ہو جو نیکی کی طرف دعوت دیں اور اچھے کام کا حکم دیں اور برائی سے منع کریں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''

چنانچہ اللہ تعالیٰ کی دعوت کے معاملے میں ساری امت آنحضرت ﷺ کے قائم مقام ہے، اس لیے امت کا اجماع قطعی حجت کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ ﷺ کی امت گمراہی پر اکٹھی نہیں ہوسکتی۔ اگر کسی مسئلے میں تنازعہ اور اختلاف ہو جائے تو اس اختلاف کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹانے کا حکم ہے۔ امت اگر مجموعی طور پر اس فرض سے غفلت برتے تو پھر یہ امت کے ہر فرد پر بقدرِ استطاعت واجب ہوتا ہے، لیکن اگر کچھ افراد یہ کام کرتے ہیں تو باقی ماندہ سے ساقط ہو جاتا ہے۔ تاہم انسان جس کام کو کرنے سے عاجز اور نااہل ہو وہ کام اس سے مطلوب بھی نہیں ہوتا، لیکن اگر کوئی دوسرا اس ذمے داری کو نہ نبھائے اور وہ اس کو نبھانے کے قابل ہو تو پھر اسے نبھانا اس پر فرض ہو جاتا ہے، چنانچہ صاحبِ استطاعت پر جو فرض ہے وہ نااہل پر نہیں۔

بعض اوقات اس اعتبار سے یا کسی دوسرے لحاظ سے یہ دعوت امت پر منقسم بھی ہو جاتی ہے۔ کچھ افراد فرض عقیدے کی دعوت کے لیے مختص ہو جاتے ہیں۔ کچھ ظاہری طور پر فرض اعمال کی دعوت کا کام کرتے ہیں اور کچھ باطنی طور پر فرض اعمال کی دعوت کی ذمے داری اٹھاتے ہیں، لہٰذا دعوت کا تنوع کبھی وجوب میں ہوتا ہے تو کبھی وقوع میں۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ کی طرف بلانا اور دعوت دینا ہر مسلمان پر واجب اور لازم ہے، لیکن یہ فرضِ کفایہ کا درجہ رکھتی ہے۔ اگر کوئی دوسرا اس سے پہلو تہی کرے تو یہ مخصوص افراد پر اس کی قدرت کے مطابق، واجب ہو گی۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر، تبلیغِ اسلام، جہاد فی سبیل اللہ اور ایمان وقرآن کی تعلیم کا حکم بھی یہی ہے۔

اس سے یہ بات بھی عیاں ہوتی ہے کہ دعوت بذاتِ خود امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نام ہے، کیوں کہ داعی جس کام کی دعوت دیتا ہے اس کا تقاضا کرتا ہے اور اس کی طرف بلاتا ہے اور یہی اس کے حکم دینے کا مطلب ہے، کیوں کہ حکم کا مطلب ہے جس کام کا حکم دیا جا رہا ہو اس کو طلب کرنا، اس کی استدعا کرنا اور اس کی طرف بلانا، اس بنا پر اللہ کی طرف بلانے کا معنی ہے اس کی راہ کی طرف بلانا، لہٰذا یہ اس کے راستے کو اختیار کرنے کا حکم دینا ہے

اور اس کا راستہ وہ ہے جو اس نے بتایا اس کی تصدیق کی جائے اور جو اس نے حکم دیا اس کی اطاعت کی جائے۔

اس تقریر سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ دونوں یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر مسلمان پر فرضِ کفایہ کے طور پر واجب ہیں، لیکن نمازِ پنج گانہ کی طرح فرضِ عین نہیں، بلکہ جہاد کی طرح فرضِ کفایہ ہے۔ واجب دعوت کی طرح کے جتنے بھی واجبات ہیں، ان سب کو ادا کرنے کے لیے چند شرطوں کا ہونا بھی ضروری ہے، حدیثِ رسول ﷺ ہے:

«يَنْبَغِي لِمَنْ أَمَرَ بِالْمَعْرُوْفِ، وَنَهىٰ عَنِ الْمُنْكَرِ أَنْ يَّكُوْنَ فَقِيهاً فِيمَا يَأْمُرُ بِهِ، فَقِيهاً فِيْمَا يَنْهىٰ عَنْهُ، رَفِيقاً فِيمَا يَأْمُرُ بِهِ، رَفِيقاً فِيمَا يَنْهىٰ عَنْهُ، حَلِيماً فِيمَا يَأْمُرُ بِهِ، حَلِيماً فِيْمَا يَنْهىٰ عَنْهُ»

''جو نیکی کا حکم دے اور بدی سے منع کرے، اس کو نیکی کا حکم دیتے وقت بھی اور برائی سے روکتے وقت بھی فقیہ یعنی سمجھدار، نرم اور بردبار ہونا چاہیے۔''

فقہ، یعنی مسئلے کی سمجھ اور حکم، اس کا حکم دینے سے پہلے ہوتا ہے، تاکہ وہ مقصود کو حاصل کرنے کے لیے سب سے زیادہ قریبی راستے پر چل سکے اور بردباری حکم دینے (اور منع کرنے) کے بعد ہے، تاکہ اس کے نتیجے میں اگر اس کو کسی اذیت سے دوچار ہونا پڑے تو وہ اس پر صبر کر سکے، کیوں کہ اکثر اوقات اس کو اس کام کی وجہ سے تکلیف اور اذیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَاۤ اَصَابَكَ ﴾ [لقمان: ١٧]

''اور نیکی کا حکم دے اور برائی سے منع کر اور اس (مصیبت) پر صبر کر جو تجھے پہنچے۔''

اللہ تعالیٰ نے ہمارے پیارے نبی کو کئی مقامات پر صبر اختیار کرنے کا حکم دیا ہے، جیسا کہ درج ذیل آیات میں ہے، سورت مدثر کے آغاز میں ہے:

﴿ قُمْ فَاَنْذِرْ ۞ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۞ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۞ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۞ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۞ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۞ ﴾ [المدثر: ٢، ٧]

''اٹھ کھڑا ہو، پس ڈرا۔ اور اپنے رب ہی کی پس بڑائی بیان کر۔ اور اپنے کپڑے پس پاک رکھ۔ اور پلیدگی کو پس چھوڑ دے۔ اور (اس نیت سے) احسان نہ کر کہ زیادہ حاصل کرے۔ اور اپنے رب ہی کے لیے پس صبر کر۔''

نیز فرمایا:

﴿ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا ﴾ [الطور: ٤٨]

''اور اپنے رب کا حکم آنے تک صبر کر، پس بے شک تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔''

مزید فرمایا:

﴿ فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ ﴾ [طٰہٰ: ۱۳۰] ''سو اس پر صبر کر جو وہ کہتے ہیں۔''

ایک مقام پر ارشاد ہوا:

﴿ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰی مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰی اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ﴾

[الأنعام: ٣٤]

''اور بلاشبہہ یقیناً تجھ سے پہلے کئی رسول جھٹلائے گئے تو انھوں نے اس پر صبر کیا کہ وہ جھٹلائے گئے اور ایذا دیے گئے، یہاں تک کہ ان کے پاس ہماری مدد آ گئی۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ﴾ [القلم: ٤٨]

''پس اپنے رب کے فیصلے تک صبر کر اور مچھلی والے کی طرح نہ ہو۔''

درج ذیل آیت میں اللہ تعالیٰ نے صبر اور تقویٰ کو ایک ساتھ ذکر کیا ہے:

﴿ لَتُبْلَوُنَّ فِیْۤ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۟ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْۤا اَذًی كَثِیْرًا ؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝۱۸۶ ﴾

[آل عمران: ١٨٦]

''یقیناً تم اپنے مالوں اور اپنی جانوں میں ضرور آزمائے جاؤ گے اور یقیناً تم ان لوگوں سے جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور ان لوگوں سے جنھوں نے شرک کیا، ضرور بہت سی ایذا سنو گے اور اگر تم صبر کرو اور متقی بنو تو بلاشبہہ یہ ہمت کے کاموں سے ہے۔''

اہلِ ایمان لوگوں کو اللہ پر ایمان لانے، نیکی پر عمل کرنے اور برائی سے روکنے کی تبلیغ کرتے تو مشرک اور اہلِ کتاب ان کو اذیتیں پہنچاتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کے وقوع سے پہلے بتا دیا تھا کہ اگر وہ صبر اور تقویٰ کا دامن تھامے رکھیں تو یہ عزیمت کا کام ہوگا۔ فرمایا:

﴿ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴾ [آل عمران: ١٨٦]

''اور اگر تم صبر کرو اور متقی بنو تو بلاشبہہ یہ ہمت کے کاموں سے ہے۔''

حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا:

﴿ اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَآ اَخِيْ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَآ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ ﴾ [يوسف: ٩٠]

''میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے، یقیناً اللہ نے ہم پر احسان فرما دیا ہے۔ بے شک حقیقت یہ ہے کہ جو ڈرے اور صبر کرے تو بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔''

تقویٰ اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر مشتمل ہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس اطاعت میں شامل ہے۔ صبر مصائب کو شامل ہے اور اس میں وہ اذیتیں بھی داخل ہیں جو نیکی کا حکم دینے والوں اور برائی سے منع کرنے والوں کو ان لوگوں کی طرف سے پہنچائی جاتی ہیں جن کو وہ نیکی کا سبق دیتے اور برائی سے روکتے ہیں۔ لیکن نیکی کا حکم دینے والے اور برائی سے منع کرنے والے کو اسی طرح اپنی جان کا دفاع کرنے کا حق حاصل ہے جس طرح کوئی حملہ آور انسان کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے تو وہ اپنا دفاع کرتا ہے۔ اگر وہ فرد جس کو نیکی کا حکم دیا جا رہا ہو یا برائی سے روکا جا رہا ہو، اس کو مارنے یا اس کا مال ہتھیانے یا اس طرح کا نقصان پہنچانے کا سوچ رہا ہو، جو اس کو دعوت دیتا ہے اور وہ داعی اپنا دفاع کرنے کی قدرت رکھتا ہے تو اس کو اپنا دفاع کرنے کا حق حاصل ہے، لیکن اگر وہ اذیت پہنچانے والا توبہ کر لے تو یہ صبر اور حلم کا مقام ہے، اس باب میں اگر کمال کو دیکھنا ہو تو وہ ہمارے نبی ﷺ کا رویہ تھا۔ صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

''آپ ﷺ نے کبھی اپنے ہاتھ سے اپنے کسی خادم، اپنی کسی بیوی، اپنے کسی جانور یا کسی بھی چیز کو نہیں مارا، سوائے اس کے کہ آپ ﷺ اللہ کی راہ میں جہاد کر رہے ہوں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ ﷺ کو اذیت پہنچائی گئی ہو اور آپ ﷺ نے اپنی ذات کے لیے انتقام لیا ہو، سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کی کسی حرمت کی بے حرمتی کی جائے۔ جب اللہ کی حرمتوں کو پامال کیا جاتا تو آپ ﷺ جب تک اللہ کے لیے انتقام نہ لے لیتے، چین سے نہ بیٹھتے۔''[1]

یہ حدیث آپ ﷺ کے اس عظیم اخلاق پر دلالت کرتی ہے کہ آپ ﷺ اپنی ذات کے لیے انتقام نہیں لیتے تھے، لیکن جب معاملہ اللہ تعالیٰ کی کسی حرمت کا ہوتا تو پھر آپ چپ نہیں بیٹھتے تھے۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو اذیت پہنچانا سب سے بڑا حرام کام ہے۔ جو آپ ﷺ کو اذیت پہنچاتا ہے وہ اللہ کو اذیت پہنچاتا ہے۔ آپ ﷺ کو گالی دینے والے کو قتل کرنا امت کے اتفاق کے ساتھ واجب ہے، خواہ یہ کہا جائے کہ یہ اس کے مرتد ہونے کی سزا ہے یا اس کو مغلظ ارتداد قرار دیا جائے جس کی وجہ سے آپ ﷺ کو گالی دینے والے کو قتل کرنا حد کے زمرے میں داخل ہو جاتا ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣٦٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٢٨)

نبی اکرم ﷺ سے ایسے بہت سے واقعات منقول ہیں، جن میں آپ ﷺ نے اذیت پہنچانے والوں کو برداشت کیا اور درگزر سے کام لیتے ہوئے ان کو معاف کر دیا، جیسے: اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَٰبِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّنۢ بَعْدِ إِيمَٰنِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم مِّنۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ﴾ [البقرة: ۱۰۹]

''بہت سے اہلِ کتاب چاہتے ہیں کاش! وہ تمھیں تمھارے ایمان کے بعد پھر کافر بنا دیں، اپنے دلوں کے حسد کی وجہ سے، اس کے بعد کہ ان کے لیے حق خوب واضح ہو چکا۔ سوتم معاف کرو اور درگزر کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لے آئے۔''

لٰہذا داعی کو جب تکلیف پہنچائی جائے تو یہ اذیت حدود اللہ سے تجاوز ہوگا۔ اس اعتبار سے اس میں اللہ تعالیٰ کا حق بھی پایا جاتا ہے اور ہر ایک کو اس سے منع کرنا ضروری ہے۔ ایسا کرنے والا سزا کا مستحق ٹھہرتا ہے، لیکن چونکہ اس میں آدمی کا حق بھی داخل ہے اور وہ اس کو معاف کرنے کا اختیار رکھتا ہے، جس طرح الزام لگانے والے اور قاتل کو معاف کیا جا سکتا ہے (کیوں کہ ان مسائل میں اللہ کا حق بھی ہے اور بندے کا حق بھی، لیکن بندے کا حق غالب ہے) لیکن اس کا اس کو معاف کر دینا اس سزا کو ساقط نہیں کرتا جو اللہ تعالیٰ کے حق کی وجہ سے واجب ہوئی، تاہم اس داعی کے لیے صبر، عفو اور درگزر کا مقام زیادہ کامل ہے، جو اللہ تعالیٰ نے ان جیسے حالات میں جائز رکھا ہے، تاکہ وہ درج ذیل آیات کا مصداق بن جائے:

﴿ وَإِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ﴾ [آل عمران: ۱۸۶]

''اور اگر تم صبر کرو اور متقی بنو تو بلاشبہہ یہ ہمت کے کاموں سے ہے۔''

﴿ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ﴾ [البقرة: ۱۰۹]

''سوتم معاف کرو اور درگزر کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لے آئے۔''

یہاں ایک لطیف سا فرق ہے۔ صبر کا حکم تو مطلقاً ہے جو منسوخ نہیں ہوا، لیکن اللہ تعالیٰ نے عفو و درگزر کی ایک مدت متعین کی تھی، جو اس آیت میں مذکور ہے:

﴿ حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ﴾ [البقرة: ۱۰۹] ''یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لے آئے۔''

جب رسول ﷺ کی نصرت، تمکین اور اقتدار کی صورت میں اللہ کا حکم آ گیا، آپ ﷺ ان کے خلاف جہاد کرنے، ان کو نیکی کا حکم دینے اور برائی سے منع کرنے پر قادر ہو گئے۔ اس وقت آپ ﷺ کے لیے ہاتھ کو استعمال کرنا ضروری ہو گیا کہ پہلے جس سے آپ ﷺ عاجز تھے، لیکن اس حالت میں بھی آپ ﷺ کو صبر کا اسی طرح حکم تھا

جس طرح پہلی صورت میں تھا۔

جہاد کا مقصد کلمۃ اللہ کو بلند کرنا اور اللہ کے دین کو غالب کرنا ہے، لہٰذا آپ ﷺ کا مقصد اقامتِ دین تھا، آدمی کے ذاتی حصے کو پورا وصول کرنا نہیں تھا،اس لیے مجاہد کو اپنی جان، مال میں جو نقصان اٹھانا پڑتا، اس کا اجر اللہ کے ذمے تھا۔ اللہ تعالیٰ نے جنت کے بدلے مومنوں کے مال اور جانیں خرید لیں، لہٰذا کافر اگر مسلمان ہو جائیں یا معاہدہ کر لیں تو انھوں نے مسلمانوں کو جو جانی یا مالی نقصان پہنچایا ہوتا ہے، اس کا تاوان ان سے نہیں لیا جاتا، بلکہ اگر وہ مسلمان ہو جائیں اور ان کے پاس وہ مال ہو جو انھوں نے مسلمانوں سے بطورِ غنیمت پایا ہو تو جمہور علما، جیسے: امام مالک، ابو حنیفہ اور احمد کے نزدیک وہ ان کی ملکیت سمجھا جائے گا۔ یہی رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے اور یہی خلفائے راشدین کا طریق۔ لہٰذا داعی کو اگر تکلیف یا اذیت پہنچائی جائے، پھر وہ شخص توبہ کر لے جس کو اس نے نیکی کی دعوت دی اور برائی سے روکا اور اس سے حق قبول کر لے تو پھر اس داعی کے لیے اس سے بدلہ لینا اس کو اس اذیت کی سزا دینا زیب نہیں دیتا۔ اس سے توبہ کرنے کی وجہ سے اسی طرح اللہ کا حق ساقط ہو جاتا ہے جس طرح اسلام قبول کرنے کی وجہ سے کسی کافر سے اللہ تعالیٰ کے حقوق ساقط ہو جاتے ہیں۔ صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلْإِسْلَامُ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ، وَالتَّوْبَةُ تَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهَا))[1]

''اسلام، اپنے سے پہلے ہر چیز کو توڑ دیتا ہے، یعنی مٹا دیتا ہے اور توبہ اپنے سے پہلے ہر چیز کو ملیا میٹ کر دیتی ہے۔''

لہٰذا جب کوئی کافر اسلام قبول کرتا ہے اس وقت اسلام ان تمام چیزوں کو ختم اور ملیا میٹ کر دیتا ہے جو اس سے پہلے تھیں، اس میں اس کی وہ مالی اور جانی زیادتیاں بھی شامل ہیں جن کا اس نے مسلمانوں کو شکار بنایا تھا، کیوں کہ وہ ان کو حرام نہیں، بلکہ حلال سمجھتا تھا، جب اس نے کفر سے توبہ کر لی تب اس کا یہ حلال سمجھنا بھی معاف ہو گیا اور کفر کے دیگر توابع اور متعلقات بھی معاف ہو گئے۔

جس کو نیکی کا حکم اور برائی سے منع کیا جا رہا ہو، اگر وہ داعی کو اذیت پہنچانا حلال سمجھتا ہو، جس طرح بدعتی اور خواہش پرست لوگ جو اپنے آپ کو حق پر سمجھتے ہیں اور اس داعی کو زیادتی کرنے والا خیال کرتے ہیں۔ یہ اگر توبہ کر لیں تو ان کو اس زیادتی کی سزا نہیں دی جائے گی، جو انھوں نے کسی صاحبِ سنت داعی پر کی۔ مثال کے طور پر اگر کوئی رافضی جو صحابہ کرام کو کافر یا فاسق سمجھتا ہے اور ان پر تبرا کرتا ہے، اپنے اس عقیدے سے توبہ کر لے اور پھر ان سے محبت کرنا شروع کر دے اور ان کی دوستی کو اپنا ایمان بنا لے تو اس پر ان کا حق باقی نہیں رہتا، بلکہ سقوط اور اثبات کے

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۲۱)

اعتبار سے ان کا حق اللہ کے حق میں داخل ہو جائے گا، کیوں کہ یہ اس کے اعتقاد کے تابع ہے۔ اس بنا پر جمہور فقہا، جیسے: امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام احمد سے زیادہ صحیح روایت اور امام شافعی کے دو اقوال میں سے ایک قول کے مطابق اگر باغی گروہ کسی تاویل کی بنا پر اہلِ عدل کو کوئی نقصان پہنچائے تو ان سے تاوان وصول نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح اہلِ عدل ایسے باغیوں کو جو نقصان پہنچائیں تو ان سے بھی اس کا تاوان وصول نہیں کیا جائے گا۔ اس پر علما کا اتفاق ہے۔

اسی طرح مرتدوں کے بارے میں بھی علما کے دو اقوال میں سے صحیح ترین قول یہی ہے، کیوں کہ مرتد تاویل کرنے والا، باغی اور بدعتی ان میں سے ہر کوئی اپنے آپ کو حق پر سمجھ رہا ہوتا ہے، لہٰذا جو سلوک تاویل کرنے والے کے ساتھ کیا جائے گا وہی ان کے ساتھ بھی کیا جائے گا۔

اگر وہ توبہ کر لے، جس طرح کافر اپنے کفر سے توبہ کرتا ہے تو اس نے پہلے جو کام تاویل کی بنا پر کیے تھے، معاف ہو جائیں گے، لیکن اس کے برعکس جو شخص ظلم اور زیادتی کر رہا ہوتا ہے اور اس کو ظلم اور زیادتی ہی سمجھتا ہے، جیسے کوئی مسلمان کسی مسلمان پر ظلم کرے، ذمی، مسلمان پر ظلم کرے، مرتد جو کسی کا مال تلف اور ضائع کر دے، یعنی جو حربی نہ ہو، بظاہر مسلمان ہو یا ذمی ہو، یہ لوگ جب کوئی نقصان پہنچائیں تو بالاتفاق ضامن ہوں گے اور ان سے اس کا تاوان وصول کیا جائے گا۔

لہٰذا جس شخص کو نیکی کا حکم اور برائی سے منع کیا جا رہا ہو اور وہ یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ حکم دینے والے اور منع کرنے والے (داعی) کو اذیت پہنچانا جائز ہے تو وہ تاویل کرنے والوں میں سے ہو گا۔ اس حکم دینے والے اور منع کرنے والے کا حق اللہ کے حق میں داخل ہے۔ اگر وہ توبہ کر لے تو یہ دونوں حق ساقط ہو جائیں گے۔ اگر توبہ نہ کرے تو اللہ کا حق مطلوب ہو گا، جو آدمی کے حق کو بھی شامل ہے۔ وہ یا کافر ہو گا یا فاسق یا نافرمان۔ یہ سب اپنے اپنے حال کے مطابق شرعی سزا کے مستوجب اور سزاوار ہیں، اگر وہ مجتہد ہو، لیکن غلطی کر رہا ہو تو ایسے مجتہد کی خطا معاف ہے۔ اگر اس کے غلط اجتہاد کی وجہ سے داعی کو کوئی ناحق اذیت پہنچے تو وہ اس حاکم کے حکم میں ہو گا جو غلط اجتہاد کر بیٹھتا ہے اور وہ اجتہاد کسی مسلمان کے لیے اذیت کا باعث بن جاتا ہے، یا اس کو ایسے گواہ یا ایسے مفتی کے حکم میں سمجھا جا سکتا ہے جو اپنی گواہی اور اپنے فتوے میں غلطی کا شکار ہوتا ہے۔ اگر اس غلط اجتہاد کرنے والے مجتہد کے سامنے غلطی آشکار نہ ہو تو یہ اس داعی کے لیے ایک آزمایش ہو گی، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً أَتَصْبِرُونَ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيرًا ﴾ [الفرقان: ۲۰]

''اور ہم نے تمھارے بعض کو بعض کے لیے ایک آزمایش بنایا ہے۔ کیا تم صبر کرو گے؟ اور تیرا رب ہمیشہ سے سب کچھ دیکھنے والا ہے۔''

اس صورت میں نفسِ امر میں اس سے گناہ اٹھ جائے گا۔ اسی طرح سزا کے طور پر بدلہ بھی ساقط ہو جائے گا، لیکن یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ بدلہ تو ساقط ہو جائے گا جو عمد کی صورت میں قصاص کے طور پر واجب ہوتا ہے، لیکن وہ تاوان ثابت ہوگا جو (قتلِ) خطا میں واجب ہوتا ہے، جیسے: قتلِ خطا میں دیت واجب ہوتی ہے۔ اگر کوئی بچہ یا پاگل کسی کو مالی نقصان پہنچائے تو ان کے اموال سے اس کا تاوان بھرنا ضروری ہوتا ہے۔ اگر غلطی کی وجہ سے قتل کرنے والے کے عصبہ، یعنی باپ کی طرف سے رشتہ دار پر اس کی معاونت کرتے ہوئے دیت ادا کرنا واجب ہوتا ہے تو جس شخص کو غلطی کی وجہ سے ظلم کا شکار بنایا جائے، اس کو اس کا حق وصول کروانا بھی ضروری ہے۔ اسی طرح یہ شخص ہے جو خطا کی وجہ سے ظلم کا شکار ہوا ہے، لیکن یہ کہا جائے گا کہ جس معاملے میں اللہ کا حق اصالۃً ہو اور بندے کا حق بالتبع ہو اور جس میں خالص بندے کا حق ہو یا غالب ہو تو ان دونوں معاملات میں فرق کیا جائے۔ امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور جہاد کا اسی باب سے تعلق رکھنا ان جمہور علما کے قول کے مطابق ہے جو تاویل کرنے والے باغیوں پر ان نقصانات کا تاوان لازم نہیں کرتے جو وہ اہلِ عدل کو پہنچائیں، اگرچہ یہ ان کی غلطی ہو اور کفر اور فسق نہ ہو۔

اگر اہلِ عدل ان پر غالب آ جائیں تو ان کو ان میں سے پیٹھ پھیرنے والوں کا پیچھا کرنے کا حکم ہے نہ ان کے زخمیوں کو قتل کرنے کا، نہ ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنانے کا اور نہ ان کا مال بطورِ غنیمت لوٹنے کا۔ اگر وہ ان کو اتنا ہی جانی اور مالی نقصان پہنچا دیں جتنا انھوں نے پہنچایا تو وہ مزید ان کے ساتھ اس بنا پر نہیں لڑ سکتے۔

معلوم ہوا اس جگہ سے قصاص ساقط ہو جاتا ہے، کیوں کہ یہ جہاد کا باب ہے، جس میں اجر اللہ کے ذمے ہوتا ہے۔

یہ تو تھی حکم دینے والے اور منع کرنے والے بندے کے حق کی تفصیل۔ جہاں تک سائل کی یہ بات ہے کہ کیا اس سے قصاص لیا جائے گا، تاکہ یہ اس کی جانب سے حق کی طرف دست درازی کی خواہش کا سبب نہ بنے؟ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ جو اس نے کیا ہے، اگر اس میں حق کی جانب کسی فساد کا پہلو نکلتا ہے اور اس میں اللہ اور اس کے رسول کا حق ہے تو اس میں وہی کیا جائے گا جو اس جیسے مسئلے میں کیا جا سکتا ہے، اگرچہ اس میں داعی، یعنی حکم دینے والے اور منع کرنے والے کے لیے کوئی اذیت نہ ہو۔

اس میں مصلحت ایک نہیں، بلکہ نوع بہ نوع ہے، کبھی شرعی مصلحت لڑائی کا تقاضا کرتی ہے، کبھی صلح کا۔ کبھی مصلحت رک جانے اور صلح کے بغیر آیندہ کے لیے مستعد رہنے میں ہوتی ہے۔ یہ مسئلہ بھی اسی کے مشابہ ہے، لیکن انسان کے دل میں یہ خیال آ سکتا ہے کہ اگر اس نے ظالم کو معاف کر دیا تو وہ اس کو جاری رکھے گا، لیکن بات اس طرح نہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

''میں تین باتوں پر حلف اٹھا سکتا ہوں: اللہ تعالیٰ کسی کو معاف کرنے کی وجہ سے بندے کی عزت میں

اضافہ ہی کرتا ہے، صدقہ مال میں کوئی کمی نہیں کرتا، جو اللہ کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے، اللہ اس کو بلند ہی کرتا ہے۔''[1]

اس باب میں انسان کو یہ موقف اختیار کرنا چاہیے کہ وہ اپنے حق کو معاف کر دے، لیکن حسبِ امکان اللہ کا حق پورا وصول کرے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴾ [الشوریٰ: ۳۹]

''اور وہ لوگ کہ جب ان پر زیادتی واقع ہوتی ہے وہ بدلہ لیتے ہیں۔''

ابراہیم نخعی کا قول ہے: ''وہ ذلت ناپسند کرتے تھے۔ جب قادر ہوتے تو معاف کر دیتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴾ ''وہ بدلہ لیتے ہیں۔'' یہ ان کی تعریف ہے کہ ان میں حق کا بدلہ لینے کی ہمت اور جذبہ ہے۔ وہ ان لوگوں سے نہیں جو ذلت یا عجز کی وجہ سے معاف کر دیتے ہیں، کیوں کہ یہ مذمت کا مقام ہے۔ قابلِ تعریف درگزر وہ ہے جو قدرت کے ساتھ اور حق کی نصرت کے لیے ضروری اقدام کے بعد ہو، اللہ تعالیٰ کے حق اور بندے کے حق سے غفلت برت کر نہیں۔ واللّٰہ أعلم[2]

بے ریش لڑکے کے چہرے پر نگاہ ڈالنے کا حکم

سوال اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں:

﴿ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا ﴾ [النور: ۳۰، ۳۱]

''مومن مردوں سے کہہ دے اپنی کچھ نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں، یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزہ ہے۔ بے شک اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے جو وہ کرتے ہیں۔ اور مومن عورتوں سے کہہ دے اپنی کچھ نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت ظاہر نہ کریں مگر جو اس میں سے ظاہر ہو جائے۔''

رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث مبارک میں سارے اعضائے بدن کے زنا کے بارے میں ذکر ہوا ہے، اب سوال یہ ہے کہ اگر کسی آدمی کا ہاتھ کسی امرد (کم سن اور بے ریش) بچے کو چھو لے تو اس کا حکم کیا ہے؟ کیا اس کو

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۵۸۸)

[2] مجموع الفتاویٰ (۱۵/۱۵۷۔۱۷۴)

عورتوں کی جنس سے شمار کیا جا سکتا ہے کہ جن کو چھونے سے وضوٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟ اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جو امردوں کو چھو کر لذت اٹھاتا ہے؟ کیا خوب صورت بے ریش لڑکے کے چہرے کو دیکھنے کے حرام ہونے کے بارے میں کوئی نص مذکور ہے؟ اس حدیث کی صحت کیسی ہے کہ «إِنَّ النَّظْرَ إِلَى الْوَجْهِ الْمَلِيْحِ عِبَادَةٌ» ''خوب صورت چہرے پر نظر ڈالنا عبادت ہے۔'' اگر کوئی کہے: میں کسی خاص مقصد کے تحت خوب صورت امرد پر نظر نہیں ڈالتا، لیکن جب اس کو دیکھتا ہوں تو ''سبحان الله'' کہتا ہوں، یہ کہتا ہوں: ''تَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ'' کیا یہ قول صحیح ہے یا غلط؟ ہمیں فتویٰ دیجیے، اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔

جواب شیخ الاسلام کا جواب (اللہ ان کی روح کو مقدس کرے، ان کی قبر منور کرے، ان پر رحمت کرے، ان سے راضی ہو، ان کے علوم سے نفع پہنچائے اور ہمیں ان کے گروہ میں جمع کرے!)۔

الحمد لله. جب کوئی شخص شہوت بھری نظر سے امرد کو چھوئے تو اس کے بارے میں امام احمد وغیرہ کے مذہب میں دو اقوال ہیں:

ایک یہ ہے کہ وہ عورتوں کو شہوت بھری نظر سے چھونے ہی کے مترادف ہے، جس سے وضوٹوٹ جاتا ہے۔ امام مالک کے مذہب میں بھی یہی مشہور ہے۔ اس کو قاضی ابو یعلی نے ''شرح المذهب'' میں ذکر کیا ہے اور امام شافعی کے مذہب میں بھی یہ دو وجوہ میں سے ایک ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ یہ امام شافعی کا مشہور مذہب ہے۔ لیکن پہلا قول زیادہ ظاہر ہے، کیوں کہ دُبر میں مجامعت ان تمام عبادات کو فاسد کر دیتی ہے جن کو قُبل، یعنی شرم گاہ میں مجامعت فاسد کرتی ہے، جیسے: روزہ، احرام اور اعتکاف ہیں۔ جس طرح دوسری مجامعت سے غسل واجب ہوتا ہے اسی طرح دبر میں مجامعت کی وجہ سے بھی غسل واجب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ عبادات کے باب میں دبر میں مجامعت کے مقدمات اور ابتدائی اقدام، شرم گاہ میں مجامعت کے مقدمات کی طرح ہی ہیں۔ اگر کوئی انسان احرام کی حالت میں کسی امرد کو شہوت بھرے انداز میں چھوئے تو اس پر دم لازم آئے گا، بالکل اسی طرح جس طرح وہ شہوت کے انداز میں کسی پرائی عورت کو چھوتا ہے تو اس پر دم دینا واجب ہو جاتا ہے۔ علی ہذا القیاس اگر وہ شہوت بھرے انداز میں امرد کو چھوئے تو ضروری ہے کہ وضوٹوٹنے کے معاملے میں اس کو ایسے ہی تصور کیا جائے، جیسے اس نے عورت کو شہوت کی نظر سے چھوا ہو۔

وضوٹوٹنے کے معاملے میں جن کے نزدیک اس کو چھونے کی وجہ سے وضو نہیں ٹوٹتا، ان کی دلیل یہ ہے کہ امرد اس (شہوت) کے محل اور جگہ کے طور پر پیدا نہیں ہوا۔

اس کے جواب میں کہا جائے گا: بلاشبہہ وہ اس کا محل نہیں اور قومِ لوط کی فحاشی (لونڈے بازی) تمام حرام

کاموں سے بڑا حرام کام ہے، لیکن یہ مقدار کچھ مجامعت (صرف چھونا) میں معتبر نہیں، اگر دبر میں مجامعت کی جائے تو جو احکام ذکر ہوئے ہیں، وہ اس کے متعلق ہوں گے، گو دبر مجامعت کے لیے پیدا نہیں کی گئی۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ نفیس طبیعتیں محض چھونے کی نسبت دبر میں مجامعت سے زیادہ نفرت کرتی ہیں۔ چھونے کی وجہ سے وضوٹوٹ جانے میں حکمت کی حقیقت کو مدِنظر رکھا جاتا ہے، اور وہ اکثر کے نزدیک، جیسے کہ امام مالک اور احمد وغیرہ ہیں، شہوت کی نظر سے چھونا ہے، جس طرح احرام اور اعتکاف میں اس کو مدِنظر رکھا جاتا ہے، یہاں بھی اس کو اسی طرح مدِنظر رکھا جائے گا۔

اس قول کے مطابق جہاں شہوت کی غرض سے چھونا پایا جائے، وہاں یہ حکم لاگو ہوگا، حتی کہ اگر انسان اپنی بیٹی، بہن یا ماں کو شہوت کی غرض سے چھوئے تو اس کا وضو بھی ٹوٹ جائے گا، اسی طرح امرد کو اس نیت سے چھونے سے ٹوٹ جائے گا۔

لیکن امام شافعی کے ہاں اور ایک روایت میں امام احمد کے نزدیک شہوت کے گمان کے محل کا اعتبار کیا جائے گا جو عورتیں ہیں (بیویاں) اس لیے ان کو، خواہ شہوت کی غرض سے چھوا جائے یا شہوت کے بغیر، وضوٹوٹ جائے گا۔ اس بنا پر محرم عورتوں کو چھونے سے وضو نہیں ٹوٹے گا، لیکن اگر کوئی انسان اپنی کسی مَحرم عورت کو شہوت کی غرض سے چھوئے تو حکمت کی حقیقت ثابت اور واقع ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر امرد کو شہوت کے لیے چھوا جائے تو اس میں یہ حکمت متحقق ہو جائے گی۔ امرد کو چھو کر لذت اٹھانا بالاجماع اسی طرح حرام ہے جس طرح محرم عورتوں اور پرائی عورت کو چھو کر لذت اٹھانا حرام ہے۔ جمہور علما کے نزدیک لونڈے بازی کرنے والے کی سزا پرائی عورت سے زنا کرنے سے بھی زیادہ بری اور زیادہ سخت ہے، چنانچہ اس میں فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کرنا واجب ہے، خواہ ان دونوں میں کوئی ایک شادی شدہ ہو یا نہ ہو، چاہے ایک دوسرے کا مملوک اور غلام ہو یا نہ ہو، ہر دوصورتوں میں یہی ان کی سزا ہے۔ یہ احادیث میں بھی مذکور ہے اور صحابہ نے اس پر بلا اختلاف عمل بھی کیا ہے۔ انھوں نے ایسے شخص کو سنگسار کیا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے قومِ لوط پر پتھروں کی بارش برسا کر ان کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ شریعت میں بھی زنا کار کی یہی سزا وارد ہوئی ہے کہ اس کو پتھر مار مار کر قتل کر دیا جائے۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنی زندگی میں ماعز بن مالک، غامدیہ عورت، دو یہودیوں اور اس عورت کو سنگسار کیا جس کے پاس آپ ﷺ نے حضرت انیس کو تحقیق حال کے لیے بھیجا اور کہا: اگر وہ اعتراف کرے تو اس کو رجم کر دینا۔ اس نے اعتراف کر لیا تو اس کو سنگسار کر دیا گیا۔[1]

بنا بریں امرد پر شہوت بھری نظر ڈالنا محرم عورتوں اور پرائی عورت کے چہرے پر شہوت بھری نظر ڈالنے ہی کی طرح ہے، چاہے یہ مجامعت کی شہوت ہو یا پھر صرف دیکھ کر لطف اٹھانے کی شہوت، جس طرح پرائی عورت کے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٨٣٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٩٧)

چہرے پر نگاہ ڈال کر لذت حاصل کی جاتی ہے، جس طرح اس کا حرام ہونا ہر کسی کو معلوم ہے، اسی طرح امرد کے چہرے پر اس نیت سے نظر ڈالنا بھی ائمہ کے اتفاق کے ساتھ حرام ہے۔

سوال میں جو یہ بات کہی گئی ہے کہ کیا امرد کے چہرے پر نگاہ ڈالنا عبادت ہے؟ یہ اسی طرح ہے جس طرح کوئی کہے: پرائی عورتوں کے چہروں پر نگاہ ڈالنا اور ماں بہن کی طرح کی محرم عورتوں کے چہرے پر نگاہ ڈالنا عبادت ہے۔ یہ ایک عام بات ہے کہ جو اس حرام نظر کو عبادت کا درجہ دیتا ہے وہ ایسے ہی ہے کہ وہ فحش کاریوں کو عبادت قرار دے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿28﴾ ﴾ [الأعراف: ٢٨]

''اور جب وہ کوئی بے حیائی کرتے ہیں تو کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادا کو اس پر پایا اور اللہ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے۔ کہہ دے بے شک اللہ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا، کیا تم اللہ کے ذمے وہ بات لگاتے ہو جو تم نہیں جانتے۔''

اسی طرح پرائی اور محرم عورتوں کے چہروں میں بھی خالقِ کائنات کی یاد دلانے والا حسن و جمال کا وہ پرتو ہوسکتا ہے جو نوخیز بالکوں کے چہروں پر تصور کیا جاتا ہے تو کیا اس بنا پر کوئی مسلمان یہ کہہ سکتا ہے کہ انسان اس نیت سے دنیا جہاں کی دلربا عورتوں کے چہروں اور اپنی محارم کے چہروں پر نگاہ ڈال سکتا ہے اور یہ نگاہ ڈالنا عبادت کے زمرے میں داخل ہے؟!

بلکہ جو شخص اس جیسی نظر کو عبادت قرار دیتا ہے، وہ کافر اور مرتد ہے، جس سے توبہ کروانا ضروری ہے۔ اگر وہ توبہ نہ کرے تو اس کو قتل کر دیا جائے۔ وہ اس شخص کی طرح ہے جو بدکاری کے طلب گار کی مدد کو عبادت قرار دے۔ تھوڑی سی شراب نوشی کو عبادت کہے یا حشیش (بھنگ، نشہ اور گھاس) سے نشہ حاصل کرنے کو عبادت کا درجہ دے۔

جو شخص ان امور میں معاونت یا ایسی کسی حرام چیز کو عبادت قرار دے جس کا حرام ہونا دین اسلام میں بالبداہت معلوم ہے، اس سے توبہ کروائی جائے، اگر وہ توبہ کر لے تو صحیح، ورنہ اس کو قتل کر دیا جائے۔ وہ اس بات میں ان مشرکوں کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے:

﴿ وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿28﴾ ﴾ [الأعراف: ٢٨]

''اور جب وہ کوئی بے حیائی کرتے ہیں تو کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادا کو اس پر پایا اور اللہ نے ہمیں

اس کا حکم دیا ہے۔ کہہ دے بے شک اللہ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا، کیا تم اللہ کے ذمے وہ بات لگاتے ہو جو تم نہیں جانتے۔''

ان لوگوں کی فحاشی تو یہ تھی کہ وہ ننگے ہو کر بیت اللہ کا طواف کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے: ہم ان کپڑوں میں طواف نہیں کریں گے جن میں ہم نافرمانی کرتے رہے ہیں۔ یہ لوگ گناہ کے کپڑوں میں طواف کرنے سے اجتناب کرنے کے لیے ننگے طواف کیا کرتے تھے، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت کی، لیکن جو شخص شہوت انگیز فحاشی کے کام کو عبادت قرار دے، اس کے بارے میں کتنا سخت حکم ہوگا!

اللہ عزوجل نے اپنی کتاب میں نگاہ نیچی رکھنے کا حکم دیا ہے، اس کی دو انواع ہیں:

ایک قابلِ پوشیدگی اعضائے بدن سے نگاہ پست رکھنا اور دوسرے محلِ شہوت، یعنی شہوت خیز مقام سے نگاہ نیچی رکھنا۔

پہلے کی مثال یہ ہے کہ آدمی کسی دوسرے کے ستر پر نگاہ نہ ڈالے، جیسے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''آدمی آدمی کے ستر اور عورت عورت کے ستر کو نہ دیکھے۔''[1] انسان پر اپنے ستر کو چھپانا فرض ہے، آپ ﷺ نے معاویہ بن حیدہ سے کہا تھا:

> ''اپنی بیوی یا لونڈی کے سوا ہر کسی سے اپنا ستر چھپا۔'' میں نے کہا: جب ہم سے کوئی اپنی قوم کے سامنے ہو؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر تم ایسا کر سکو کہ تم وہ کسی کو نہ دکھاؤ تو اسے کوئی بھی نہیں دیکھے گا۔'' میں نے کہا: اگر ہم میں سے کوئی بالکل تنہا ہو؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ لوگوں سے زیادہ حق رکھتا ہے کہ اس سے شرم کی جائے۔''[2]

بقدرِ ضرورت ستر کھولنا جائز ہے، جیسا کہ آدمی بیت الخلاء میں کھولتا ہے۔ اسی طرح آدمی کسی چار دیواری یا آڑ میں بالکل برہنہ ہو کر غسل کر سکتا ہے۔ اس کا ثبوت حضرت موسیٰ، ایوب، بلکہ فتح مکہ کے موقع پر خود آنحضرت ﷺ سے بھی ملتا ہے۔

نظر کی دوسری قسم، جس میں کسی پرائی عورت کی داخلی زیب و زینت پر نظر ڈالی جائے۔ پہلی نظر سے زیادہ سخت حکم رکھتی ہے، جس طرح شراب مردار، خون اور خنزیر کے گوشت سے زیادہ شدید حکم رکھتی ہے اور شراب نوش حد کا سزاوار ٹھہرتا ہے۔ لہٰذا ان حرام چیزوں کو کوئی اگر حلال سمجھ کر بھی کھائے تو وہ تعزیر کا مستحق ٹھہرے گا، کیوں کہ نفس جس

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٣٨)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٠١٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧٩٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٩٢٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٠٣)

طرح شراب کی طلب اور خواہش رکھتا ہے ان کی نہیں رکھتا، اسی طرح آدمی کے ستر پر نظر ڈالنا اس طرح مرغوب نہیں ہوتا جس طرح عورت کے ستر پر نظر ڈالنا مرغوب اور شہوت خیز ہوتا ہے۔ ایسے ہی امرد پر شہوت بھری نظر ڈالنا اسی باب سے تعلق رکھتا ہے، جو علما کے اتفاق کے ساتھ اسی طرح حرام ہے جس طرح پرائی عورت اور محرم عورت پر شہوت بھری نظر ڈالنا حرام ہے۔

خالق سبحانہ و تعالیٰ کی ہر مخلوق کو دیکھ کر اس کی پاکیزگی اور تسبیح بیان کی جا سکتی ہے۔ بے ریش امرد کی تخلیق باریش مرد کی تخلیق سے زیادہ تعجب خیز نہیں۔ اسی طرح اللہ کی قدرت میں عورتوں کی تخلیق مردوں کی تخلیق سے زیادہ بڑا عجوبہ نہیں، چنانچہ دیگر انسانوں کو چھوڑ کر امرد کے چہرے پر نظر پڑنے کو تسبیح کے لیے مخصوص کرنا ایسے ہی ہے جیسے مرد کو چھوڑ کر عورت کے چہرے پر نظر پڑنے کو تسبیح کے لیے خاص کیا جائے۔ یہ اس وجہ سے نہیں کہ امرد کی تخلیق خالق کی عظمت پر زیادہ دلالت کرتی ہے، بلکہ یہ حسن ہے، جس پر ایسے انسان کی نظر پڑتی ہے تو وہ اس کے دل و دماغ پر حاوی ہو جاتا ہے اور اس کی عقل چندھیا جاتی ہے۔ ایسے عالم میں اس کے منہ سے جو سبحان اللہ نکلتا ہے تو وہ عشق و خواہش کی وجہ سے ہوتا ہے، جیسے عورتوں کی نظر جب حسنِ یوسف پر پڑی تو وہ اپنے ہوش کھو بیٹھیں۔ اسی عالم میں انھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے اور بے اختیار ان کے منہ سے نکل آیا:

﴿ حَٰشَ لِلَّهِ مَا هَٰذَا بَشَرًا إِنْ هَٰذَآ إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ ﴿٣١﴾ ﴾ [یوسف: ۳۱]

''اللہ کی پناہ! یہ کوئی آدمی نہیں ہے، یہ نہیں ہے مگر کوئی نہایت معزز فرشتہ۔''

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ تبارک و تعالیٰ تمھاری شکلوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا، بلکہ وہ تمھارے دلوں اور تمھارے اعمال کو دیکھتا ہے۔''[1]

اگر اللہ تعالیٰ شکلوں اور مالوں کو نہیں، بلکہ دلوں اور اعمال کو دیکھتا ہے تو پھر کوئی شخص ایسی چیز کے ساتھ کس طرح افضل ہو سکتا ہے جس کو اللہ ترجیح نہیں دیتا؟ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِۦٓ أَزْوَٰجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ ﴾ [طٰہٰ: ۱۳۱]

''اور اپنی آنکھیں ان چیزوں کی طرف ہرگز نہ اٹھا جو ہم نے ان کے مختلف قسم کے لوگوں کو دنیا کی زندگی کی زینت کے طور پر برتنے کے لیے دی ہیں، تاکہ ہم انھیں اس میں آزمائیں۔''

منافقوں کے بارے میں فرمایا:

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٦٤)

﴿وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ وَإِن يَقُولُوا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ كَأَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ يَحْسَبُونَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ قَاتَلَهُمُ اللَّهُ﴾ [المنافقون: ٤]

''اور جب تو انھیں دیکھے تجھے ان کے جسم اچھے لگیں گے اور اگر وہ بات کریں تو تو ان کی بات پر کان لگائے گا، گویا وہ ٹیک لگائی ہوئی لکڑیاں ہیں، ہر بلند آواز کو اپنے خلاف گمان کرتے ہیں، یہی اصل دشمن ہیں، پس ان سے ہوشیار رہ۔ اللہ انھیں ہلاک کرے۔''

اگر یہ منافق ظاہری طور پر اتنے خوبرو اور خوش جسم تھے کہ دیکھنے والا دیکھتا ہی رہ جاتا، حالانکہ یہ ان اصناف میں نہیں تھے جن کو آدمی شہوت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کو اچھے انداز میں ذکر نہیں کیا تو ان کے بارے میں کیا حکم ہوسکتا ہے جن کو شہوت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے؟!

انسان کبھی کسی دوسرے پر اس نظر سے نگاہ ڈالتا ہے کہ وہ مجسم ایمان وتقویٰ ہوتا ہے، یہاں وہ اس کے دل اور عمل کو خاطر میں رکھتا ہے۔ کبھی انسان اس نظر سے دیکھتا ہے کہ اس کی صورت مصور کی مہارت پر دلالت کرتی ہے تو یہ اچھی بات ہے۔ کبھی وہ اس کی تخلیق کو استحسان، یعنی سراہنے کی نظر سے دیکھتا ہے، جیسے گھوڑوں، جانوروں، درختوں، دریاؤں اور پھولوں وغیرہ کو دیکھنا۔ یہ دیکھنا بھی اگر دنیا اور مال و جاہ کو اچھا سمجھنے کی نیت سے ہو تو مذموم ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ﴾ [طٰہٰ: ١٣١]

''اور اپنی آنکھیں ان چیزوں کی طرف ہرگز نہ اٹھا جو ہم نے ان کے مختلف قسم کے لوگوں کو دنیا کی زندگی کی زینت کے طور پر برتنے کے لیے دی ہیں، تاکہ ہم انھیں اس میں آزمائیں۔''

لیکن اگر یہ نظر ڈالنا اس انداز میں ہو جس سے دین میں کوئی نقص لازم نہ آتا ہو، صرف راحتِ نفس کا سامان ہو، جیسے پھولوں پر نظر ڈالنا تو یہ اس باطل میں سے ہوگا جس کے ذریعے حق کے خلاف مدد نہیں لی جاتی۔

نظر کی ان تمام اقسام میں جہاں شہوت پائی جائے گی وہ بلاشبہہ حرام ہوگی، خواہ یہ صرف نظر سے لذت اندوز ہونے کی شہوت ہو یا مجامعت کی شہوت بھری نظر۔ پھولوں اور درختوں پر نظر ڈالنے سے حاصل ہونے والی لذت اور عورتوں اور بے ریش لڑکوں کے چہروں پر نظر ڈالنے سے حاصل ہونے والی لذت میں فرق بڑا واضح ہے۔ اس فرق کی بنیاد پر شرعی حکم بھی متفرق ہے، ایک سانہیں۔

بنا بریں: بے ریش لڑکوں پر نظر ڈالنے کی تین اقسام ہیں:

1. شہوت بھری نظر سے دیکھنا، یہ بالاتفاق حرام ہے۔

2 قطعی طور پر شہوت سے خالی نظر، مثلاً: کسی نیک آدمی کا اپنے خوب صورت بیٹے یا خوب صورت بیٹی یا خوب صورت ماں کو دیکھنا، اس میں شہوت کا تصور نہیں کیا جا سکتا، اِلا یہ کہ وہ کوئی بدکارترین انسان ہو۔ تاہم جب نظر کے ساتھ شہوت مل جائے تو وہ حرام ہو جاتی ہے۔

3 شہوت سے خالی نظر، یعنی جس کے دل میں امردوں کی طرف میلان نہ ہو، جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے یا وہ قومیں جو اس بدکاری سے ناآشنا تھیں۔ یہ اپنے بیٹے پر نظر ڈالنے، اپنے پڑوسی کے بچے پر نظر ڈالنے اور کسی پرائے بچے پر نظر ڈالنے میں کوئی فرق نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے دلوں میں ان بچوں کو دیکھ کر کوئی شہوت خیز خیال انگڑائی نہیں لیتا تھا، کیوں کہ یہ ان کے ہاں کوئی معروف کام نہیں تھا۔ وہ سلیم القلب تھے۔ عہدِ صحابہ میں لونڈیاں گلیوں میں ننگے سر گھوما کرتی تھیں۔ مردوں کی خدمت کیا کرتی تھیں اور دل سلیم تھے۔ اگر آج کے دور میں ہمارے شہروں میں خوب صورت ترکی لونڈیوں کو لوگوں کے درمیان کھلے عام پھرنے کی اجازت دی جائے جس طرح عہدِ صحابہ میں ان کو اجازت تھی تو فساد کا ایک (نہ بند ہونے والا) دروازہ کھل جائے۔

یہی حال خوب رو بے ریش لڑکوں کا ہے۔ ان کے لیے ضرورت کے بغیر ایسی جگہوں اور ایسے گلی محلے میں جانا درست نہیں جہاں ان کی فتنہ گری کا اندیشہ ہو، لہٰذا خوب صورت امرد کو بے پردگی کی اجازت دینی چاہیے نہ اس کو اجنبی اور پرائے لوگوں کے ساتھ حمام میں بٹھانا چاہیے اور نہ لوگوں کے درمیان رقص کرنے کی کھلی چھٹی دینی چاہیے۔ نیز ایسا کوئی کام نہیں کرنے دینا چاہیے جو لوگوں کے لیے فتنے کا سامان ہو۔

علما کے درمیان تیسری قسم کی نظر میں اختلاف ہے، یعنی شہوت سے خالی نظر، لیکن اس کے بھڑکنے کا اندیشہ موجود ہو۔ اس صورتِ حال کے بارے میں امام احمد رحمہ اللہ کے مذہب میں دو نقطہ ہائے نظر ہیں، لیکن ان میں سے جو صحیح ترین ہے وہ یہ ہے کہ یہ ناجائز ہے اور یہی امام شافعی وغیرہ سے صریحاً منقول ہے۔

دوسرے قول کے مطابق یہ جائز ہے، کیوں کہ اصل کے اعتبار سے یہ نظر شہوت بھڑکانے والی نہیں، لہٰذا شک کی بنا پر اس کو حرام نہیں کہا جا سکتا، البتہ یہ مکروہ ہے، تاہم پہلا قول ہی راجح ہے اور امام شافعی اور امام احمد کا راجح مذہب یہ ہے کہ پرائی عورت پر بلا ضرورت نظر ڈالنا ناجائز ہے، خواہ شہوت ناپید ہو، لیکن یہ اس لیے ناجائز ہے کہ اس کے بھڑکنے کا اندیشہ بہرحال موجود رہتا ہے، اور اسی لیے پرائی عورت کے ساتھ اکیلا ہونا حرام ہے، کیوں کہ اس میں فتنے کے پائے جانے کا گمان غالب ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ جب کوئی چیز فتنے کا سبب بنے تو وہ ناجائز ہوگی۔ فساد کے ذریعے کو روکنا ضروری ہے، بشرطیکہ وہ کسی راجح مصلحت سے متصادم نہ ہو، اسی لیے وہ نظر جو فتنے کا سبب بن سکتی ہو حرام ہوگی، لیکن اگر وہ کسی راجح مصلحت کی بنا پر ہو تو پھر اور بات ہے، مثلاً: نکاح کے خواہش مند کا عورت پر نظر

ڈالنا، ڈاکٹر کا دیکھنا وغیرہ۔ کیوں کہ ضرورت کے وقت، شہوت کے بغیر نظر ڈالنا جائز ہے، لیکن ضرورت کے بغیر محلِ فتنہ پر نظر ڈالنا جائز نہیں جو امرد وغیرہ پر تکرار کے ساتھ اور ہمیشہ نظر ڈالتا رہتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ شہوت کی نظر نہیں ڈالتا، جھوٹ بولتا ہے، کیوں کہ اگر نظر کا کوئی واضح داعیہ اور سبب موجود نہیں تو پھر وہ نظر صرف لذتِ قلب کے لیے ہی ہے، جو بار بار دیکھنے سے حاصل ہوتی ہے۔

جہاں تک اچانک پڑنے والی نظر کا تعلق ہے تو آدمی اگر اپنی نگاہ پھیر لے تو یہ معاف ہے۔

صحاح میں حضرت جریر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اچانک پڑنے والی نظر کے بارے میں پوچھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنی نگاہ پھیر لے۔''[1]

سنن میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا: اے علی! نظر کے پیچھے نظر نہ ڈال! پہلی تیرے لیے جائز ہے، دوسری نہیں۔''[2]

مسند احمد وغیرہ کی حدیث میں موجود ہے: ''نظر ابلیس کا ایک زہریلا تیر ہے۔''

اس میں یہ حدیث بھی ہے: ''جو کسی عورت کے محاسن کو دیکھتا ہے، پھر اپنی نگاہ اس سے ہٹا لیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے دل کو عبادت کی لذت سے آشنا کرتا ہے، جس کو وہ قیامت تک محسوس کرتا رہتا ہے۔''[3] یا جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اس بنا پر کہا گیا ہے کہ عورت اور خوب صورت امرد سے، جن کو دیکھنا ممنوع ہے، نظریں جھکانا تین عظیم الشان فوائد سے ہمکنار کرتا ہے:

پہلا فائدہ: کسی چیز کو صرف اللہ کی خاطر چھوڑنے سے انسان ایمان کی مٹھاس اور لذت پاتا ہے جو ہر چیز سے زیادہ میٹھی اور پاکیزہ چیز ہے۔ جو شخص کوئی چیز صرف اللہ کے لیے چھوڑتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو اس کا نعم البدل عطا کرتا ہے۔ انسانی نفس ان خوش شکلوں کو دیکھنے کا دلدادہ ہوتا ہے بالخصوص اہلِ ریاضت اور اہلِ صفا کے نفوس، اس لیے کہ ان میں اتنی رقت اور نازکی ہوتی ہے، جس کی وجہ سے وہ ان خوب صورت چہروں کی جانب کھنچے چلے آتے ہیں اور یہ خوش نما چہرے ان کے اندرون کو اسی طرح اپنا گرویدہ بنا لیتے اور پچھاڑ دیتے ہیں جس طرح کوئی درندہ کسی کو پچھاڑ دے۔

اسی بنا پر کسی تابعی نے کہا ہے: ''ایک نیک اور توبہ کرنے والے نوجوان کے لیے کسی درندے کا قرب اور

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٤٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧٧٦) مسند أحمد (٣٦١/٤)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٤٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧٧٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٩٥٣)

[3] المستدرك للحاكم (٣٩٤/٤) المعجم الكبير (١٧٣/١٠) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٠٦٥)

صحبت اتنی خوف ناک نہیں جتنی کسی خوب صورت نوعمر لڑکے کی صحبت ہے۔''

کسی بزرگ کا یہ فرمانا بھی ہے: ''بادشاہوں کے لڑکوں کو دیکھنے سے بچو، ان کا فتنہ کنواری لڑکیوں کے فتنے جیسا ہے۔'' علم اور دین کے امام، ائمہ ہدایت اور شیوخِ طریقت، ہمیشہ نوعمروں کی صحبت ترک کرنے کی وصیت کرتے آئے ہیں، بلکہ فتح موصلی کا قول ہے: ''مجھے تیس ابدال کی صحبت کا شرف حاصل رہا ہے۔ ان سب نے وقتِ رخصت مجھے نوعمروں کی صحبت سے دور رہنے کی وصیت کی۔'' کسی صاحبِ نظر کا قول ہے: ''جب کوئی بندہ اللہ کی نظروں سے گر جاتا ہے تو وہ اس کو ان بدبوداروں (نوعمروں) کی صحبت میں مبتلا کر دیتا ہے۔''

پھر نظر محبت پیدا کرتی ہے، جس سے علاقہ، یعنی وابستگی پیدا ہوتی ہے، کیوں کہ دل محبوب کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے، اس کے بعد صبابہ، یعنی گرویدگی کی کیفیت طاری ہوتی ہے، کیوں کہ دل محبوب کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ پھر غرام، یعنی شیفتگی اور فریفتگی کا مقام آتا ہے، کیوں کہ یہ کیفیت دل کو دائمی طور پر جکڑ لیتی ہے۔ اس کے بعد عشق کا درجہ آتا ہے جو انسان کو دیوانگی کی حدود میں داخل کر دیتا ہے۔ اس کے بعد اگلی منزل تَتَیُّم، یعنی بندگی اور غلامی کی ہوتی ہے، جس میں محبت کرنے والا اس حد تک آگے چلا جاتا ہے کہ اس کا محبوب اس کا صنم بن جاتا ہے اور وہ اس کی پوجا کرنا شروع کر دیتا ہے۔ تَیْمُ اللّٰہِ کا مطلب ہوتا ہے عبداللہ۔ اس طرح اگر کسی خوب رو کے ساتھ اس کا تعلق ہو جائے تو اس کا دل اس کا غلام بن جاتا ہے، حالانکہ اس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک بھائی یا خادم بننے کے قابل بھی نہیں ہوتا۔

اس بیماری میں وہی لوگ مبتلا ہوتے ہیں جو اللہ کے لیے اخلاص سے اعراض کرتے ہیں اور جن میں شرک کی ایک نوع موجود ہوتی ہے، ورنہ اہلِ اخلاص کی کیفیت کچھ اور ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں بیان کیا ہے:

﴿ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ۭ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ﴾ [یوسف: ٢٤]

''اسی طرح ہوا، تاکہ ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو ہٹا دیں۔ بے شک وہ ہمارے خالص کیے ہوئے بندوں سے تھا۔''

عزیزِ مصر کی بیوی مشرک تھی اور شادی شدہ ہونے کے باوجود اس کے دل میں برائی کا خیال پیدا ہوا، لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے اخلاص کی وجہ سے ان کے کنوارہ ہونے، اس عورت کے ان کو ورغلانے، پھر اس کے لیے عورتوں سے معاونت طلب کرنے اور ان کے پاکدامنی اختیار کرنے کی وجہ سے اس عورت کے ان کو قید کرنے کی سزا دینے کے باوجود، ان کو اس گناہ سے بچا لیا اور شیطان کے جواب میں اپنی یہ بات سچ ثابت کی، شیطان نے کہا تھا:

﴿ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴾ [الحجر: ٣٩، ٤٠]

''اور ہر صورت میں ان سب کو گمراہ کر دوں گا۔ مگر ان میں سے تیرے وہ بندے جو خالص کیے ہوئے ہیں۔''

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَٰنٌ إِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَاوِينَ ﴾ [الحجر: ٤٢]

''بے شک میرے بندے، تیرا ان پر کوئی غلبہ نہیں، مگر جو گمراہوں میں سے تیرے پیچھے چلے۔''

اس آیتِ کریمہ میں وارد لفظ ﴿ الْغَاوِينَ ﴾ الْغَيّ سے ہے اور غيّ کا مطلب ہے خواہش کی پیروی کرنا۔

یہ دروازہ یعنی امردوں سے عشق کا دروازہ خواہش کی پیروی کے ابواب میں سے سب سے بڑا دروازہ ہے اور ابن سینا اور اس کے ہم نوا فلاسفہ، اسی طرح ایرانیوں میں سے جس نے بھی اچھی صورتوں کے ساتھ عشق کرنے کا حکم دیا ہے، جیسا کہ بعض جاہل خود ساختہ صوفی لوگوں نے بھی یہی بات کہی ہے تو یہ سب گمراہ ہیں، وہ یہود کی خواہش پرستی اور عیسائیوں کی گمراہی میں شرکت کے ساتھ ساتھ ان دونوں امتوں سے ان دونوں قباحتوں میں بہت آگے نکل گئے ہیں۔ یہ اس علت کے فریب خوردہ اگرچہ بزعمِ خویش یہ سمجھتے ہیں کہ اس میں عاشق کو اپنے نفس کو نرم ولطیف کرنے اور اپنے اخلاق کو بہتر بنانے کا موقع اور فائدہ حاصل ہوتا ہے یا معشوق کی تعلیم وتربیت جیسی مصلحتیں مدِ نظر ہوتی ہیں، لیکن اس کا نقصان اس کے فائدے سے کئی گنا زیادہ ہے، پھر اس فائدے کے مقابلے میں اس کا جو عظیم تر گناہ ہے اس کا کہاں جوڑ ہے؟!

یہ تو اسی طرح ہے جس طرح یہ کہا جائے: زنا میں دونوں فریقوں کا فائدہ ہوتا ہے، کیوں کہ دونوں ہی لذت اور سرور اٹھاتے ہیں اور عورت اس کے مقابلے میں اجرت بھی لیتی ہے۔ یا کوئی یہ کہے کہ شراب نوشی کے جسمانی اور نفسیاتی فوائد ہیں، اللہ تعالیٰ شراب نوشی اور قمار بازی کے بارے میں فرماتے ہیں:

﴿ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا ﴾ [البقرة: ٢١٩]

''کہہ دے ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے ہیں اور ان دونوں کا گناہ ان کے فائدے سے بڑا ہے۔''

یہ ان کو حرام قرار دینے سے پہلے کی بات ہے، ان باتوں کو چھوڑیے جو اس کی تحریم اور اس کے بعد کہی گئیں ہیں۔ ان خوش شکلوں کے ساتھ عبادت کرنا فواحش کے قبیل سے تعلق رکھتا ہے اور اس کا باطن فواحش کے باطن سے ہے، اور وہ گناہ باطن میں سے ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَذَرُوا ظَاهِرَ الْإِثْمِ وَبَاطِنَهُ ﴾ [الأنعام: ١٢٠] ''اور ظاہر گناہ کو چھوڑ دو اور اس کے چھپے کو بھی۔''

نیز فرمایا:

﴿ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ [الأعراف: ٣٣]

''کہہ دے میرے رب نے تو صرف بے حیائیوں کو حرام کیا ہے، جو ان میں سے ظاہر ہیں اور جو چھپی ہوئی ہیں اور گناہ کو اور ناحق زیادتی کو اور یہ کہ تم اللہ کے ساتھ اسے شریک ٹھہراؤ جس کی اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور یہ کہ تم اللہ پر وہ کہو جو تم نہیں جانتے۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَیْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ [الأعراف: ٢٨]

''اور جب وہ کوئی بے حیائی کرتے ہیں تو کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادا کو اس پر پایا اور اللہ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے۔ کہہ دے بے شک اللہ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا، کیا تم اللہ کے ذمے وہ بات لگاتے ہو جو تم نہیں جانتے۔''

ائمۂ دین کے ہاں اس کے غیر مستحب ہونے میں کوئی اختلاف نہیں اور یہ واجب بھی نہیں۔ جو اس کو قابلِ تعریف کہتے ہوئے اس کو اچھے لفظوں سے یاد کرتا ہے وہ اہلِ اسلام اور یہود و نصاریٰ کے اجماع، بلکہ تمام امتوں کے عقلاء کے مسلّمات سے بھی خارج ہو جاتا ہے، وہ ایسے لوگوں میں شامل ہے، جو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے بغیر اپنی ہی خواہش کے پرستار ہوتے ہیں۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَیْرِ هُدًی مِّنَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴾ [القصص: ٥٠]

''اور اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہے جو اللہ کی طرف سے کسی ہدایت کے بغیر اپنی خواہش کی پیروی کرے۔ بے شک اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

نیز فرمایا:

﴿ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَی النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰی ۞ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰی ﴾ [النازعات: ٤٠، ٤١]

''اور رہا وہ جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈر گیا اور اس نے نفس کو خواہش سے روک لیا۔ تو بے شک جنت ہی (اس کا) ٹھکانا ہے۔''

مزید فرمایا:

﴿ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ﴾ [ص: ٢٦]

''اور خواہش کی پیروی نہ کر، ورنہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔ یقیناً وہ لوگ جو اللہ کی راہ سے بھٹک جاتے ہیں، ان کے لیے سخت عذاب ہے، اس لیے کہ وہ حساب کے دن کو بھول گئے۔''

جو اس گمان کے تحت امردوں کو دیکھتا ہے کہ وہ جمالِ الٰہی کے مظاہر کو دیکھ رہا ہے اور اس کو طریقت کی ایک راہ قرار دیتا ہے، جس طرح معرفت کے دعوے دار کچھ گروہ ایسا کرتے ہیں، اس شخص کا یہ قول بت پرستوں کے کفریہ نظریے اور قومِ لوط کے کفر سے بھی بڑا کفر ہے۔ یہ بدترین زنادقہ اور مرتدین میں سے ہیں جن کا باجماعِ امت قتل کر دینا چاہیے۔ بتوں کے پجاریوں نے تو یہ کہا تھا:

﴿ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ﴾ [الزمر: ٣]

''ہم ان کی عبادت نہیں کرتے مگر اس لیے کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں۔''

حالانکہ یہ لوگ خود اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو ان بتوں میں موجود اور حلول کیا ہوا قرار دیتے ہیں۔ یہ لوگ اس کے اپنی مخلوقات میں ظہور اور تجلی کو اس کی ذات پر دلیل قرار نہیں دیتے، بلکہ اس کے پیچھے ان کا یہ نظریہ ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ خود ان میں ظاہر اور تجلی فرما ہے، اس کی ذات اس کی مخلوقات میں اس طرح حلول کیے ہوئے ہے جس طرح اون میں پانی، دودھ میں مکھن یا زیتون کے پھل میں تیل اور تلوں میں تیل ہوتا ہے، اسی طرح اس کی ذات مخلوقات کی ذات میں داخل ہو کر ایک ہی ہو گئی ہے۔ جو بات عیسائیوں نے خاص حضرت عیسیٰ کے بارے میں کہی ہے کہ اللہ کی ذات ان میں حلول کر گئی ہے، ان لوگوں نے اس سے بڑھ کر کہا کہ اللہ نعوذ باللہ ہر مخلوق میں حلول کر گیا ہے، پھر یہ لوگ نوعمر لڑکوں کو جمالِ الٰہی کا مظہر قرار دیتے ہیں۔ اس طرح یہ اس شرک کی راہ سے بدکاریوں کو حلال کرنے، بلکہ ہر حرمت والی چیز کو حلال قرار دینے کی راہ نکالتے ہیں۔

ان کے سب سے بہتر مرشد تلمسانی سے پوچھا گیا کہ اگر تم کہتے ہو کہ تمام وجود ایک ہی ہے اور وہی حق تعالیٰ ہے تو پھر میری ماں، بہن اور بیٹی میں حلال حرام کا فرق کیوں ہے؟ اس نے جواب دیا: ہمارے نزدیک یہ سب برابر ہیں، لیکن یہ جن پر پردہ پڑا ہوا ہے کہتے ہیں یہ رشتے حرام ہیں تو ہم نے کہہ دیا: تم پر حرام ہیں۔

حلول اور وحدت الوجود کے بعض قائلین اس کو بعض شخصیات کے ساتھ مخصوص کرتے ہیں، وہ انبیا کی شخصیات بھی ہو سکتی ہیں، جیسے حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں یہ عقیدہ گھڑا گیا اور بعض صحابہ کی شخصیات بھی ہو سکتی ہیں، جیسے غالی شیعہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبت یہ بات کہی یا بعض مشائخ کے بارے میں بھی بات کہی گئی، جس طرح حلاجیہ

فرقے کا حسین بن منصور الحلاج کے بارے میں یہ گمان ہے۔ وہ بعض بادشاہ بھی ہو سکتے ہیں اور بعض شکلیں بھی ہو سکتی ہیں، جیسے: امردوں کی شکلیں۔ اس نظریے کا حامل ایک شخص کہتا ہے: میں اپنے خالق کی صفات دیکھتا ہوں اور ان کو اس شکل میں حاضر پاتا ہوں۔ اس قول اور نظریے میں کفر اتنا واضح ہے کہ وہ کسی اس بندۂ مومن پر مخفی نہیں رہ سکتا جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہے۔ اگر اس طرح کی بات کسی معزز نبی کے بارے میں کہی جائے تو کہنے والا کافر ہو جاتا ہے، چہ جائیکہ وہ نوعمر بچے کے بارے میں کہی جائے؟! اللہ ایسے گروہ کو برباد کرے جس کا معبود اس کی جائے مجامعت کی قبیل سے ہو! اللہ تعالیٰ تو یہ فرماتے ہیں:

﴿ وَلَا يَأْمُرَكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ أَرْبَابًا أَيَأْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴾

[آل عمران: ٨٠]

''اور نہ یہ (حق ہے) کہ تمھیں حکم دے کہ فرشتوں اور نبیوں کو رب بنا لو، کیا وہ تمھیں کفر کا حکم دے گا، اس کے بعد کہ تم مسلم ہو۔''

اگر فرشتوں اور نبیوں کو اس اعتراف کے ساتھ بھی کہ وہ مخلوق ہیں، رب بنانا کفر ہے تو جو اللہ کی بعض مخلوقات کو رب بناتا ہے، ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ اللہ ان میں داخل ہو چکا ہے یا اس میں اس طرح یک جان ہو چکا ہے کہ دونوں کا وجود ایک ہی ہو چکا ہے اور اس سے ملتے جلتے غلط نظریات اختیار کرتا ہے تو اس کے بارے میں کیا فتویٰ ہو سکتا ہے؟!

نگاہ نیچی رکھنے کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ دل میں نور اور فراست پیدا ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قومِ لوط کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿ لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴾ [الحجر: ٧٢]

''تیری عمر کی قسم! بے شک وہ یقیناً اپنی مدہوشی میں بھٹکے پھرتے تھے۔''

خوش شکلوں کے ساتھ وابستگی عقل کو خراب، بصیرت کو اندھا اور دل کو مدہوش اور پاگل کر دیتی ہے، کسی شاعر نے کہا ہے:

سُكْرَانِ: سُكْرُ هَوًى وَسُكْرُ مُدَامَةٍ فَمَتٰى يُفِيْقُ مَنْ بِهِ سُكْرَانِ؟!

''نشے دو ہیں: ایک شراب کا اور دوسرا عشق کا، جو ان دونشوں میں مدہوش ہو، ہوش میں کب آئے گا؟''

ایک دوسرا کہتا ہے:

قَالُوْا جُنِنْتَ بِمَنْ تَهْوٰى فَقُلْتُ لَهُمْ اَلْعِشْقُ أَعْظَمُ مِمَّا بِالْمَجَانِيْنِ

اَلْعِشْقُ لَا يَسْتَفِيْقُ الدَّهْرَ صَاحِبُهُ وَإِنَّمَا يُصْرَعُ الْمَجْنُوْنُ فِي الْحِيْنِ

''لوگوں نے کہا: تم اپنے محبوب کے عشق میں پاگل ہو چکے ہو، میں نے کہا: عشق جنون سے بہت آگے کا مرحلہ ہے، عاشق کبھی ہوش میں آتا ہی نہیں، جب کہ پاگل پر تو کبھی کبھار پاگل پن کا دورہ پڑتا ہے۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے نگاہیں نیچی رکھنے کی آیات کے بعد آیتِ نور ذکر کی ہے:

﴿ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ [النور: ۳۵] ''اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔''

شجاع بن شاہ کرمانی کی فراست اس کو کبھی دھوکا نہیں دیتی تھی۔ وہ کہا کرتا تھا: جس شخص نے اپنے ظاہر کو اتباعِ سنت اور باطن کو دائمی مراقبے اور محاسبے کے ساتھ آباد کیا، اپنی نگاہوں کی حفاظت کی، اپنے آپ کو شہوت سے روکے رکھا اور حلال کھایا، اس کی فراست اس کو دھوکا نہیں دیتی۔ اللہ تعالیٰ بندے کو اس کے عمل کی جنس ہی سے بدلہ دیتا ہے، لہٰذا وہ اس کو نورِ بصیرت عطا کرتا ہے، اس پر علم ومعرفت اور کشف کا دروازہ کھول دیتا ہے۔

تیسرا فائدہ: دل قوی، ثابت قدم اور دلیر ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ ایسے انسان کو دلیل کی قوت کے ساتھ بصیرت کی قوت سے بھی نواز دیتا ہے۔ ایک اثر میں ہے:

''جو اپنی خواہش کی مخالفت کرتا ہے، شیطان اس کے سائے سے بھی ڈرتا ہے۔''

یہی وجہ ہے کہ خواہشِ نفس کا پجاری اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی وجہ سے ذلیل و رسوا اور کمزور ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عزت اس کا مقدر رکھا ہے جو اس کی فرماں برداری کرتا ہے اور ذلت اس کے نصیب میں لکھی ہے جو اس کی نافرمانی کرتا ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ يَقُوْلُوْنَ لَىِٕنْ رَّجَعْنَاۤ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ۚ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [المنافقون: ۸]

''وہ کہتے ہیں یقیناً اگر ہم مدینہ واپس گئے تو جو زیادہ عزت والا ہے وہ اس میں سے ذلیل تر کو ضرور ہی نکال باہر کرے گا، حالانکہ عزت تو صرف اللہ کے لیے اور اس کے رسول کے لیے اور ایمان والوں کے لیے ہے۔''

نیز فرمایا:

﴿ وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ ﴾ [آل عمران: ۱۳۹]

''اور کمزور نہ بنو اور نہ غم کرو اور تم ہی غالب ہو، اگر تم مومن ہو۔''

کسی بزرگ کا قول ہے: ''لوگ بادشاہوں کے دروازوں پر عزت تلاش کرتے ہیں، لیکن وہ ان کو اللہ کی فرماں برداری کے سوا کہیں نہیں ملتی۔'' حضرت حسن بصری کا قول ہے:

"وَإِنْ هَملَجَتْ بِهِمُ الْبَرَاذِيْنُ، وَطَقطَقَتْ بِهِم ذُلَلُ الْبِعَالِ، فَإِنَّ ذُلَّ الْمَعْصِيَةِ فِيْ رِقَابِهِم، أَبىٰ اللّٰهُ إِلَّا أَن يُذِلَّ مَن عَصَاه"

''یہ گناہ گار لوگ کیسی ہی خوش حالی میں ہوں، معصیت کی ذلت ان کی گردنوں میں ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نافرمانوں کو ذلیل کیے بنا نہیں چھوڑتا۔''

کیوں کہ جو اللہ کی اطاعت کرتا ہے اللہ اس کو اس اطاعت میں دوست رکھتا ہے اور جو اس کی نافرمانی کرتا ہے تو وہ نافرمانی کی مقدار کے مطابق اس کی دشمنی سے حصہ وصول کرتا ہے۔ دعائے قنوت میں ہے:

«إِنَّهُ لَا يَذِلُّ مَنْ وَّالَيْتَ وَلَا يَعِزُّ مَنْ عَادَيْتَ» [1]

''جس کا تو دوست ہو اس کو کوئی ذلیل نہیں کر سکتا اور جس کا تو دشمن ہو اس کو کوئی عزت نہیں دے سکتا۔''

مزید برآں مشہور صوفیائے کرام جو امت میں نیک نام ہیں، وہ اس فعل کو اچھا نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اس سے منع کرتے تھے اور نوعمروں کی صحبت کی مذمت، وحدت الوجود اور اہلِ حلول کے عقائد کی تردید میں ان کے اتنے اقوال ہیں، جن کو ذکر کرنے کی یہاں گنجایش نہیں۔ اس فعل کو صرف ایسے نام نہاد صوفیہ اچھا سمجھتے ہیں جو اندرونی طور پر فاسق، نافرمان یا کافر ہوتے ہیں، بظاہر ولایت اور ایمان وعرفان کے بلند بانگ دعوے کرتے ہیں، لیکن حقیقت میں یہ اللہ کے سب دشمنوں، منافقوں اور بہتان تراشوں سے برے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے متقی اور پرہیز گار اولیا کو دنیا اور آخرت کی بھلائی سے سرفراز کرتا ہے اور اپنے دشمنوں کے مقدر میں گھاٹے کا سودا رکھتا ہے۔ واللّٰه سبحانه وتعالىٰ أعلم. [2]

نوخیز لڑکوں کی صحبت کا حکم

سوال امرد (نوخیز لڑکا) کی صحبت اختیار کرنا جائز ہے یا ناجائز؟ وہ لوگ جو اس علت کا شکار ہیں، ان لڑکوں کو چومتے ہیں، ساتھ بھی لٹاتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ صحبت صرف خدا کی رضا کے لیے ہے، ایسے لوگوں کا کیا حکم ہے اور اس حالت میں کس طرح ان سے پیش آنا چاہیے؟

جواب خوبرو اور بے ریش لڑکا بہت سے امور اور احکام میں اجنبی اور پرائی عورت کے قائم مقام ہے، اس لیے لذت اندوزی کے لیے اس کو چومنا جائز نہیں، بلکہ باپ اور بھائیوں کے علاوہ کسی کے لیے اس کو چومنا جائز نہیں، کیوں کہ ان سے جنسی لذت اندوزی کا ایسا کوئی خدشہ نہیں ہوتا۔ اس نیت سے اس کے چہرے پر نظر ڈالنا

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٢٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٤٦٤) شیخ البانی رحمہ اللہ نے إرواء الغليل (٤٢٩) میں اسے صحیح کہا ہے۔

[2] مجموع الفتاویٰ (١٥/ ٤١٠۔٤٢٧)

بالاتفاق ناجائز ہے، بلکہ جمہور کے نزدیک اگر ایسا کوئی خدشہ ہو تو پھر اس کے چہرے پر نظر ڈالنا بھی حرام ہو جاتا ہے۔ صرف ضرورت کے وقت اس کا کوئی معاملہ کرتے وقت، کسی غلط نگاہ کے بغیر اس کو دیکھنا جائز ہے، جس طرح ضرورت اور حاجت کے وقت پرائی عورت پر نظر ڈالی جاتی ہے۔

اس کو ساتھ لٹانا تو بہت قبیح اور فحش حرکت ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''جب بچے سات سال کے ہو جائیں تو انھیں نماز کا حکم دو، دس سال کی عمر ہونے میں (نماز نہ پڑھنے کی صورت میں) ان کو مارو اور ان کے بستر جدا کر دو۔''[1] دس سال کی عمر میں عموماً بچہ بالغ بھی نہیں ہوتا، جب اس کا بستر جدا کرنے کا حکم ہے تو اس سے بڑے کو ساتھ لٹانا کیسے جائز ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے: ''جب مرد عورت کے ساتھ علاحدگی میں ہو تو تیسرا شیطان ہوتا ہے۔''[2] پھر یہ فرمان ہے: ''عورتوں کے پاس جانے سے بچو! صحابہ نے خاوند کے رشتے داروں (دیور جیٹھ وغیرہ) کے بارے میں پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دیور/ جیٹھ موت ہے۔''[3] اگر خلوت برائی کے خدشے کی وجہ سے حرام ہے تو ساتھ لٹانا کس طرح جائز ہوگا؟

جو یہ کہتا ہے کہ وہ یہ کام اللہ کی رضا کے لیے کرتا ہے، یہ زیادہ تر جھوٹ ہی ہے۔ ایک طرف اللہ کے لیے ہو اور دوسری طرف نفس کی خواہش کی تسکین! اجنبی عورتوں کی صحبت کے حوالے سے بھی کچھ لوگ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں، یہ ایسے ہی ہے جیسے اللہ نے شراب کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿ فِيهِمَآ إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَٰفِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَآ أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا ﴾ [البقرة: ٢١٩]

''کہہ دے ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے ہیں اور ان دونوں کا گناہ ان کے فائدے سے بڑا ہے۔''

شعبی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ جب وفدِ عبدالقیس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو ان میں ایک خوبرو اور روشن جبین لڑکا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پشت کے پیچھے بٹھایا اور فرمایا: ''داود علیہ السلام کی غلطی نظر ہی تھی۔''[4]

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، جن کی نو بیویاں تھیں۔ وہ وفد بھی نیک لوگوں کا تھا، پھر عرب میں امرد پرستی کی علت بھی نہیں تھی؟! مشائخ نے نوخیز لڑکوں کی صحبت سے خبردار کیا ہے۔

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩٤، ٤٩٥) صحيح الجامع (٥٨٦٨)

[2] مسند أحمد (١٨/١) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٧١) شیخ احمد شاکر رحمہ اللہ نے مسند پر اپنی تحقیق میں اسے صحیح کہا ہے۔

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٣٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٧٢)

[4] یہ روایت ہمیں نہیں ملی ہے۔

کسی انسان کو ایسا کام اختیار کرنا زیب نہیں دیتا جو حرام مفاسد اور برائیوں کا سبب بنتا ہو، خواہ اس میں تعلیم یا تادیب کی کوئی مصلحت ہی کیوں نہ ضم ہو۔ بے ریش لڑکوں کی تربیت اور تادیب ان خرابیوں کے بغیر بھی ممکن ہے جو ان کے لیے تباہی کا باعث اور ان کی صحبت اختیار کرنے والوں کے لیے بھی بربادی کا سبب بنتی ہیں۔ یہ کام کبھی بدگمانی پیدا کرتا ہے تو کبھی شبہے کو جنم دیتا ہے، بلکہ بیان کیا جاتا ہے: ایک آدمی کے پاس امرد لڑکے بیٹھتے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی مجلس اور بیٹھک میں اٹھنے بیٹھنے سے منع کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک نوجوان کے بال کاٹ دیے، کیوں کہ اس کی وجہ سے کچھ عورتیں اس میں دلچسپی لیتی تھیں اور اس کو ملک بدر کر دیا۔

جو شخص اپنے کسی بیٹے، بھائی یا زیرِ پرورش بچے کو اس عادت میں گرفتار دیکھے، پھر بھی منع نہ کرے وہ دیوث اور ملعون ہے اور ''دیوث جنت میں داخل نہیں ہوگا۔'' در پردہ فحاشی کی کئی ظاہری علامتیں اور دلیلیں بھی ہوتی ہیں اور یہ فتیج معاشرت بالکل ظاہر دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ﴾ [الأنعام: ١٥١]

''اور بے حیائیوں کے قریب نہ جاؤ، جو ان میں سے ظاہر ہیں اور چھپی ہوئی ہیں۔''

فرمایا:

﴿ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ﴾ [الأعراف: ٣٣]

''کہہ دے میرے رب نے تو صرف بے حیائیوں کو حرام کیا ہے، جو ان میں سے ظاہر ہیں اور جو چھپی ہوئی ہیں۔''

اگر ہم یہاں اس کام کے وہ سارے مفاسد اور نقصانات گنوانا شروع کر دیں جو علما نے بیان کیے ہیں تو بات بہت لمبی ہو جائے گی، آدمی خواہ متقی ہو یا بد، متقی اور پرہیزگار اپنی خواہش کے خلاف جنگ اور نفس کے خلاف جہاد میں بہت زیادہ تلخیوں کا سامنا کرتا ہے اور اکثر اس کا نفس اور شیطان اس پر غالب آ جاتا ہے اور یہ فاجر کام کر کے اپنی بدکاری کی تکمیل کرتا ہے۔ واللہ أعلم۔[1]

عشق کے زہریلے تیر سے بچاؤ کی تدابیر

سوال جو شخص ابلیسی زہریلے تیر (عشق بازی) کا شکار ہو جائے، وہ کس طرح اپنا بچاؤ کر سکتا ہے؟

جواب جس کو اس طرح کا زہریلا زخم لگے وہ اس کا تریاق اور مرہم استعمال کرے جو حسبِ ذیل ہے، ان شاء اللہ شفا ہوگی:

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٣٢/٢٤٧)

1 وہ شادی کرے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''تم میں سے کوئی جب کسی عورت کے محاسن پر نظر ڈالے تو اپنی بیوی کے پاس آ جائے، اس کے ساتھ بھی اس طرح کی چیز ہے جو اس کے ساتھ ہے۔''[1] اس سے شہوت کم ہو جاتی ہے اور عشق کا زور ٹوٹ جاتا ہے۔

2 نمازِ پنج گانہ پر ہیشگی اختیار کرے۔ دعا کرتا رہے اور سحری کے وقت اللہ کے حضور گڑگڑائے۔ نماز حضورِ قلب اور مکمل توجہ سے پڑھے اور کثرت سے یہ دعا کرے:

« يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ! ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلَى دِيْنِكَ، يَا مُصَرِّفَ الْقُلُوْبِ صَرِّفْ قَلْبِيْ إِلَى طَاعَتِكَ وَطَاعَةِ رَسُوْلِكَ »[2]

''اے دلوں کو الٹ پلٹ کرنے والے! میرے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھ، اے دلوں کو پھیرنے والے! میرے دل کو اپنی اور اپنے رسول کی فرماں برداری کی طرف پھیر دے۔''

جب انسان اس دعا کو وردِ جان بنا لے اور اللہ کے حضور گڑگڑاتا رہے تو وہ اس کا دل ان چیزوں سے پھیر دیتا ہے، ارشادِ باری عزوجل ہے:

﴿ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ۚ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ﴾ [يوسف: ٢٤]

''اسی طرح ہوا، تاکہ ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو ہٹا دیں۔ بے شک وہ ہمارے خالص کیے ہوئے بندوں سے تھا۔''

3 اس شخص کے قرب اور صحبت سے دور رہے، بلکہ اتنا دور چلا جائے کہ اس سے ملاقات کرنے، اس کو دیکھنے اور اس کی کوئی بھی خبر سننے کا امکان نہ رہے، جدائی جفا پیدا کرتی ہے، جب یاد کم ہو جائے تو دل میں عشق کا اثر کم ہونا شروع ہو جاتا ہے، وہ یہ کام کرے اور دیکھے کیا حالات پیدا ہوتے ہیں۔ واللہ أعلم[3]

کتاب ''تنقلات الأبصار'' پر تبصرہ

احمد بن عبداللہ بکری کی طرف منسوب کتاب ''تَنَقُّلَاتُ الْأَنْوَار'' پر تبصرہ۔

شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے کہا: یہ کتاب اللہ تعالیٰ، اس کے رسول اور صحابہ کرام پر افترا بازی اور دروغ بافی سے بھری ہوئی ہے۔ اس میں اس نے اس طرح کی باتیں گھڑی ہیں جس طرح کی باتیں دروغ گو کہانی نویسوں نے دلہمہ،

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٤٣) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٥١) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٥٨)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٥٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٤٠) السلسلة الصحيحة (١٦٨٩، ٢٠٩١)

[3] مجموع الفتاویٰ (٥/٣٢)

بطال، عنترہ، رشید، اس کے وزیر جعفر برمکی، زئبق مصری عیار اور احمد دنق عیار کے بارے میں گھڑی ہیں (یہ سب عرب کی لوک کہانیاں ہیں) تاہم ان کہانی نویسوں نے ایسے لوگوں کے نام پر یہ کہانیاں بنائی ہیں جو انبیا نہیں تھے، لیکن "تنقلات الأنوار" کے مولف نے تو اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام کے نام پر ایسے ایسے جھوٹ باندھے ہیں کہ الامان والحفیظ! اس کی بعض باتوں میں کچھ سچ بھی ہے، لیکن وہ آٹے میں نمک کے برابر ہے اور اسی طرح کا سچ ہے جو عنترہ اور بطال کی کہانی میں ہے۔ عنترہ زمانۂ جاہلیت کا ایک مشہور شاعر اور شاہ سوار تھا۔ اس کا قصیدہ دورِ جاہلیت کے سات مشہور قصائد میں سے ایک تھا۔ لیکن راویوں نے اس کے قصے میں جھوٹ کی اتنی آمیزش کر دی ہے جو ناقابلِ شمار ہے، بلکہ ہر بعد میں آنے والا اس کے جھوٹوں میں اضافہ کرتا چلا گیا۔

اسی طرح ابو محمد بطال مسلمانوں کا مشہور امیر تھا۔ مسلمانوں نے قسطنطنیہ پر دو مرتبہ چڑھائی کی تھی۔ پہلی مرتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں اپنے بیٹے یزید کو امیر بنا کر قسطنطنیہ روانہ کیا اور اس کے ساتھ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی شریک ہوئے، جن کے گھر میں رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کر کے کچھ عرصہ قیام کیا تھا۔ حضرت ابو ایوب اسی غزوہ (جنگ) میں فوت ہوئے اور ان کو قسطنطنیہ کے ایک پہلو میں دفنا دیا گیا۔

امام بخاری نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«أَوَّلُ جَيْشٍ يَغْزُوْ الْقُسْطُنْطِيْنِيَّةَ مَغْفُوْرٌ لَّهُ»[1]

"پہلا لشکر جو قسطنطنیہ کے خلاف جنگ لڑے گا وہ مغفور (بخش دیا گیا) ہے۔"

دوسرا غزوہ عبد الملک بن مروان کی خلافت میں ہوا۔ اس نے اپنے بیٹے مسلمہ کو امیر بنایا، یا اپنے بیٹے ولید کو پیچھے چھوڑا۔ اس کے ساتھ ایک لشکرِ جرار روانہ کیا۔ مسلمانوں نے قسطنطنیہ کا دو سال تک محاصرہ کیے رکھا، پھر اس شرط پر ان کے ساتھ مصالحت کی کہ مسلمان شہر میں داخل ہوں، چنانچہ وہ اس میں داخل ہوئے اور انھوں نے وہاں ایک مسجد تعمیر کی۔ یہ مسجد آج تک موجود ہے۔ اس کے بعد جھوٹے لوگ آئے اور انھوں نے بطال اور عبد الوہاب کے کارناموں میں اتنا جھوٹ داخل کر دیا جسے اللہ کے سوا کوئی شمار نہیں کر سکتا، پھر دلہمہ اور قاضی عقبہ نے اس میں بہت سی بے حقیقت باتیں شامل کر دیں۔

"تنقلات الأنوار" کا مصنف بکری بھی انھی دو جھوٹوں کی راہ پر چلا، لیکن اس نے اپنے جھوٹ کے لیے رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو چنا۔ اس کتاب میں جھوٹ، افتراءات، موضوعات کی ایسی اقسام اور ایسی عجیب اور حیرت ناک باتیں ہیں جو بیان سے باہر ہیں، مثلاً: سات قلعوں اور ھضام بن حجاف کی حدیث،

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٦٦)

حدیثِ دھر، رأس الغول، کلندجہ اور دیگر کتب، جگہیں اور لڑائیاں جن کا صفحہ ہستی پر کوئی وجود نہیں، اسی طرح ایسے نام اور مسمیات ہیں جنھیں کوئی صاحبِ علم بھی نہیں جانتا، اس میں ایسی روایات ذکر کی گئی ہیں جو کتاب وسنت، تواتر اور اجماعِ امت کے خلاف ہیں۔

اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف ایسے اقوال اور افعال منسوب کیے گئے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے انھیں بری کیا ہوا ہے۔ یہ باتیں زنادقہ، نصیریہ اور ان جیسے ملتے جلتے لوگوں کی باتوں سے ملتی جلتی ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات میں غلو کرتے ہوئے بڑی بڑی باتیں تراش لیتے ہیں۔ اس کتاب میں دینِ اسلام پر ایسے انداز میں تنقید اور اس کی تنقیص کی گئی ہے کہ جو شخص ان باتوں کا قائل ہو وہ واجب القتل ہو جاتا ہے۔ اگر وہ جاہل ہو تو اس سے توبہ کروائی جاتی ہے۔ اگر توبہ کر لے تو درست ورنہ اس کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ جو شخص اس طرح کی چیزیں نقل اور روایت کرتا ہے اس کو کم از کم ایسی عبرت ناک سزا ضرور دینی چاہیے کہ وہ یہ کام چھوڑ دے۔ اسی طرح جو یہ کتابیں کسی کو اُجرت لے کر مہیا کرتا ہے، ان کے نسخے بناتا ہے اور ان کی تصدیق کرتا ہے وہ بھی سزا کا مستحق ہے۔

اہلِ علم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس کتاب کا اور اس طرح کی دیگر جھوٹ پر مبنی کتابوں کا پول کھول دیں۔ احادیث میں جہاں جہاں لوگوں نے جھوٹ کی آمیزش کی کوشش کی ہے، ان کی کذب بیانی واضح کریں۔ موضوع روایات کی حقیقت بیان کریں، جس طرح محدثین نے جھوٹے راویوں کا پردہ چاک کر دیا ہے اور ان کی جھوٹی روایات کو بھی ننگا کر دیا ہے۔ بہت سی موضوع روایات ایسی ہیں جن کے موضوع اور بناوٹی ہونے کو صرف خاص محدثین ہی جانتے ہیں، لیکن "تنقلات الأنوار" میں جو جھوٹی روایات ذکر کی گئی ہیں، انھیں تو ہر وہ شخص جانتا ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، احوال اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات سے ادنیٰ سی شناسائی بھی ہو۔

جو شخص اس طرح کی روایات نقل کرتا ہے یا کسی بھی طرح ان کو عام کرنے میں معاونت کرتا ہے اس کو سزا دینا اربابِ اقتدار کی ذمے داری ہے اور ان کتابوں کو جلا دینا چاہیے، جس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کچھ کتابوں کو جلایا تھا، جو اوراق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جلائے تھے ان کی نسبت ان جھوٹی کتابوں کو جلانا زیادہ ضروری اور بہتر ہے۔ واللّٰہ أعلم [1]

چند واقعاتِ سیرت کی تحقیق

سوال کچھ قصہ گو لوگ قلعہ کے نیچے، مساجد میں اور بازاروں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات کے واقعات اور انبیائے کرام علیہم السلام کے واقعات بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

[1] مجموع الفتاویٰ (۱۸/۳۵۱_۳۵٤)

نبی اکرم ﷺ کے پاس ایک بادشاہ آیا، جس کا نام حبیب تھا۔ اس نے کہا: اگر تم اللہ کے رسول ہو تو ہم چاہتے ہیں کہ چاند ستائیسویں رات واپس آئے، تمھاری قمیص کے کالر سے اترے اور تمھاری آستینوں سے طلوع ہو۔ آپ ﷺ نے ان کو یہ دکھا دیا تو وہ سب آپ پر ایمان لے آئے اور آپ ﷺ نے فرمایا: یہ رب تھے۔

وہ یہ بھی کہتے ہیں: آپ ﷺ کے پاس ایک بشیر بن غنام نامی بادشاہ آیا۔ اس نے کوئی تدبیر کر کے نو افراد کو کھجور کے درخت پر لٹکا دیا۔ آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا تو انھوں نے ان کو نجات دلائی۔ ان میں ایک خالد بھی تھے۔

آپ ﷺ مکے میں تھے کہ آپ ﷺ کے پاس ایک دحاق نامی بادشاہ آیا۔ اس کی ایک بیٹی تھی جس کا نام حمانہ تھا۔ اس کی شادی بلال سے کر دی۔ اس کو کسی نے قتل کر دیا۔ نبی اکرم ﷺ نے اس پر اپنی چادر رکھی تو اللہ نے اس کو زندہ کر دیا۔

آپ ﷺ نے حضرت مقداد کو الملک الخطار نامی ایک بادشاہ کے پاس بھیجا۔ راستے میں ان کی ملاقات ایک روضہ نامی ملکہ سے ہو گئی۔ انھوں نے اس کے ساتھ شادی کر لی۔ پھر اس بادشاہ کے پاس پہنچے جس کے پاس آپ ﷺ نے ان کو بھیجا تھا۔ ان کی اس بادشاہ کے ساتھ لڑائی ہوئی اور انھوں نے اس کو قید کر کے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا۔

پولس بن عبدالصلیب رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا۔ یہ غزوۂ تبوک اور احزاب میں آپ ﷺ کے مقابلے کے لیے نکلا۔ دشمن ہزاروں میں تھے۔ وہ تمام گروہ جو جنگِ احزاب کے موقعے پر لڑائی کے لیے آتے تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے سترہ گروہوں میں شکست خوردہ ہو کر گر گئے۔ ہر ایک گروہ کے پیچھے ایک آدمی تلوار لے کر ان کو مارنے لگا اور کہنے لگا: میں ہوں علی، آپ کا ولی۔ اس نے عمرو بن عامری کو مارا اور اس کی ران کاٹ دی۔ عمرو نے اپنی ران پکڑی اور مسلمانوں کو اس کے ساتھ مارا، اس نے ایک درخت اکھاڑا اور ان کی ایک جماعت کو قتل کر دیا۔ اس وقت فرشتے چیخ اٹھے: کہنے لگے ذوالفقار کے سوا کوئی تلوار نہیں اور علی کے سوا کوئی نوجوان نہیں۔

یہ بھی کہتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کنویں میں جنوں سے لڑائی لڑی۔ ان کو منجنیق میں ڈال کر حصن الغراب میں پھینک دیا گیا، لیکن وہ ہدف تک نہ پہنچ پائے تو انھوں نے ہوا میں چلنا شروع کر دیا۔ انھوں نے مرحب یہودی کو سر پر تلوار مار کر گھوڑے سمیت دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ جبکہ مرحب کے سر پر پتھر کی خود تھی۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ سارا لشکر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کلائی سے گزر کر خیبر پہنچ گیا۔ انھوں نے قلعے کو توڑ دیا۔ ان پر ذوالفقار (تلوار) آسمان سے اتری، کیوں کہ اللہ نے ان کو آسمان سے نام لے کر پکارا اور کہا: ''علی عجلت سے بھی زیادہ تیز ہے۔'' ان کو ہر نبی کے ساتھ سری طور پر اور نبی اکرم ﷺ کے ساتھ جہری طور پر بھیجا گیا۔ وہ موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی، نوح علیہ السلام کا سفینہ اور

سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی تھے۔ رسول اللہ ﷺ فوت ہوئے تو انھوں نے آپ ﷺ کی ناف سے پیا تو تمام اگلے پچھلے لوگوں کا علم جان لیا۔

رسول اللہ ﷺ کے پاس موت کا فرشتہ ایک دیہاتی کی شکل میں آیا۔ نبی اکرم ﷺ نے اس سے کہا: روح قبض کرنے آئے ہو یا ویسے ہی ملنے؟ اس نے کہا: میں نے آپ سے پہلے کبھی کسی سے ملاقات نہیں کی کہ آپ سے ملاقات کروں۔ اس نے آپ ﷺ کو ایک سیب دیا۔ آپ ﷺ نے اسے سونگھا تو اس سیب میں آپ ﷺ کی روح پرواز کر گئی۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ پر رونا شروع کر دیا اور اتنا روئیں کہ اہلِ مدینہ کو پریشان کر دیا۔ انھوں نے تنگ آ کر ان کو ان گھروں میں منتقل کر دیا جہاں غم زدہ لوگ رہتے تھے۔

یہ قصہ گو لوگ اس طرح کے واقعات اور ان سے ملتے جلتے انبیائے کرام کے واقعات بیان کرتے ہیں، پھر آیات کے ساتھ ان کی ایسی تفسیر کرتے ہیں جو کسی عالم سے سننے کو نہیں ملتی، پھر یہ لوگ اس طرح کے واقعات بیان کرنے کے لیے ہر رات مجلس لگاتے ہیں۔

کچھ علما نے ان کو یہ باتیں نقل کرنے سے منع کیا تھا اور کہا تھا کہ ایسی کتابوں سے نقل کریں جن پر اہلِ علم مشائخ کے سماعات کی مہر ثبت ہو۔ پھر انھوں نے ایسی کتابوں پر اعتماد کرنا شروع کر دیا جن میں اس طرح کے واقعات درج ہیں، جن میں ایک البکری نامی آدمی کی تصنیف بھی ہے۔ ان جیسے امور میں ان پر کیا عائد ہوتا ہے؟ کیوں کہ یہ ایسے واقعات سناتے ہیں جو رسولوں سے ثابت واقعات کے خلاف ہیں، پھر ان میں ان کی توہین کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ جو شخص ان کو منع کرتا ہے کیا اس کو ثواب ملے گا؟

یہ لوگ ایک یہ کہانی بھی بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے چہرے کے نور سے ایک مٹھی لی، اس کو دیکھا تو وہ پسینے سے شرابور ہو گئی، پھر اللہ تعالیٰ نے ہر قطرے سے ایک نبی پیدا کیا۔ وہ مٹھی نبی ﷺ تھے اور چمکدار ستاروں کی طرح باقی رہے۔ آپ نور تھے جو مردوں کی صلبوں (پشتوں) سے عورتوں کے رحموں میں منتقل ہوتے رہے۔

جواب قدوۃ الایمان شیخ الاسلام تقی الدین ابو العباس احمد بن عبدالحلیم بن عبدالسلام ابن تیمیہ حرانی رحمہ اللہ نے جواب دیا:

الحمد للہ رب العالمین.

یہ احادیث ان روایات میں شمار ہوتی ہیں جو اہلِ علم کے اتفاق کے ساتھ من گھڑت ہیں۔ اس جیسی روایات، بکری کی "تنقلات الأنوار" اور اس جیسے دیگر بکثرت جھوٹی روایات ذکر کرنے والوں سے لی جاتی ہیں۔

پہلی حدیث کا جواب یہ ہے کہ چاند رسول اللہ ﷺ کے کالر میں داخل ہوا تھا نہ آپ ﷺ کے کپڑوں میں اور

نہ وہ رسول اللہ ﷺ کے جسم کے ساتھ ہی لگا تھا، بلکہ دو ٹکڑوں میں تقسیم ہوا تھا۔ ایک ٹکڑا پہاڑ کے نیچے کی جانب اور دوسرا پہاڑ کے اوپر کی جانب ہو گیا۔

اسی طرح ابو مالک حبیب کا کوئی وجود نہیں۔

بشیر بن غنام کے بارے میں مذکور حدیث بھی جھوٹ ہے۔ یہ نام غیر معروف اور مجہول ہے۔ حضرت خالد بن ولید کبھی گرفتار نہیں ہوئے، بلکہ وہ حدیبیہ کے بعد مسلمان ہوئے تھے اور اپنی جنگوں میں ہمیشہ ظفر مند رہے ہیں۔

اسی طرح جو دحاق نامی بادشاہ کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے وہ بھی جھوٹ ہے۔ جو لوگ رسول اللہ ﷺ کے آس پاس رہے اور جن میں آپ رہے ان میں اس نام کا کوئی شخص نہیں ملتا، لیکن جو اس امت میں موت کے بعد رہے ان میں ایک گروہ صحابہ اور تابعین کے زمانے میں تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے جن مومنوں کے لیے ان کے جانور کو موت کے بعد زندہ کیا، ان میں کچھ عہدِ نبی میں مسلمان تھے اور کچھ آپ ﷺ کی موت کے بعد تھے۔

اسی طرح جو الخطار نامی بادشاہ کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے وہ بھی بے حقیقت اور جھوٹی بات ہے۔

غزوہ تبوک میں لڑائی ہی نہیں ہوئی تھی، بلکہ نبی اکرم ﷺ شام آئے، جہاں رومی بھی تھے، عربی بھی اور دوسرے بھی۔ کسی غزوے میں آپ ﷺ کے ساتھ اتنے لوگ اکٹھے نہیں ہوئے تھے جتنے اس غزوے میں ہوئے تھے۔ یہ غزوہ آپ ﷺ کا آخری غزوہ تھا۔ آپ ﷺ نے تبوک میں بیس دن قیام کیا اور کوئی عیسائی آپ ﷺ کے مقابلے کے لیے نہ نکلا۔

اسی طرح جنگِ احزاب میں بھی دونوں لشکروں میں لڑائی نہیں ہوئی تھی، بلکہ یہ سارے گروہ اس خندق کے باہر محاصرے میں تھے جو مسلمانوں نے مدینہ نبویہ کے ایک جانب میں کھودی تھی اور خود مسلمان خندق کے اندر تھے۔ کچھ مسلمانوں اور کچھ کافروں کے درمیان مبارزت طرز کی کچھ جھڑپیں ہوئیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عمرو بن عبدِ ود عامری کو قتل کیا تھا، لیکن کافروں کے گروہ اور احزاب جو لڑنے کے لیے آئے تھے، لڑائی کے ساتھ ہزیمت خوردہ نہیں ہوئے تھے۔ مسلمانوں اور کافروں میں کوئی خاطر خواہ لوگ مارے بھی نہیں گئے تھے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان پر ہوا چلائی اور فرشتوں کو بھیجا، جیسے قرآن میں ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ﴾ [الأحزاب: ۹]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے آپ پر اللہ کی نعمت یاد کرو، جب تم پر کئی لشکر چڑھ آئے تو ہم نے ان پر آندھی بھیج دی اور ایسے لشکر جنھیں تم نے نہیں دیکھا تھا۔''

اسی طرح عمرو بن عبدِ ود کے قتل کی جو کیفیت بیان کی گئی ہے، جھوٹ ہے۔ یہ بھی جھوٹ ہے کہ عمرو بن عبدِ ود نے اپنی ران سے درخت کو مار کر اکھاڑ دیا۔ وہاں کوئی درخت نہیں تھا۔ کھجور کے درخت بھی فوجی مقام سے دور تھے۔

یہ جو بات بیان کی گئی ہے کہ فرشتے پکار اٹھے: ''ذوالفقار کے سوا کوئی تلوار نہیں اور علی کے سوا کوئی نوجوان نہیں'' جھوٹ اور الزام تراشی ہے۔ اسی طرح کچھ نے یہ بیان کیا ہے کہ یہ جنگِ بدر کا واقعہ ہے۔ یہ بھی جھوٹ ہے۔

ذوالفقار حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تلوار نہیں تھی، بلکہ ابوجہل کی تلوار تھی، جو مسلمانوں کو بدر کے موقع پر غنیمت میں ملی۔ وہ عام معدنی تلوار تھی۔ کوئی آسمان سے نہیں اتری تھی۔ اسی طرح نہ یہ تلوار نہ کوئی دوسری تلوار ہی لمبی ہوئی تھی۔

جنوں کے ساتھ لڑنے کے حوالے سے جو یہ بات ذکر ہوئی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ یا کسی دوسرے انسان نے ذات العلم کنویں میں لڑائی کی، یہ سب جھوٹ ہے۔ جن اصل میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے لڑائی کر ہی نہیں سکتے تھے۔ یہ کافر جن تھے جو مومن جنوں سے لڑتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ یا کوئی دوسرا صحابی اس سے کہیں بلند شان رکھتا ہے کہ اس کے ساتھ کسی جن کی لڑائی ثابت ہو۔ صحیح بخاری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

«مَا رَآكَ الشَّيْطَانُ سَالِكاً فَجًّا إِلَّا سَلَكَ فَجًّا غَيْرَ فَجِّكَ» [1]

''شیطان تجھے جس راستے پر چلتا ہوا دیکھے اسے چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کر لیتا ہے۔''

یہ جو بیان کیا گیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو منجنیق میں ڈال کر حصن الغراب میں پھینکا گیا، یہ سب جھوٹ اور افترا ہے۔ مسلمانوں نے کبھی کسی بھی شخص کو نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اور نہ کسی دوسرے مسلمان ہی کو منجنیق میں ڈال کر کافروں کی طرف نہیں پھینکا، بلکہ عہدِ رسالت میں مسلمانوں نے منجنیق کا استعمال صرف طائف کے محاصرے کے وقت کیا تھا۔ جب حنین کے بعد ہوازن کو شکست ہوئی تو طائف کا محاصرہ کیا گیا۔ وہاں منجنیق نصب کی گئی اور ایک مہینے تک محاصرہ جاری رہا۔ طائف کو فتح نہ کیا گیا بلکہ وہاں کے لوگ بعد میں راضی خوشی مسلمان ہو گئے۔ جب مسلمانوں نے مسیلمہ کذاب اور اس کے ماننے والوں کے خلاف لڑائی لڑی تو وہ باغ میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ تب مسلمانوں نے حضرت براء بن مالک کو اٹھا کر اس کے اندر پھینکا تو انھوں نے اس کا دروازہ کھول دیا۔

مرحب کو قتل کرنے کے حوالے سے صحیح بخاری میں دو روایات ہیں: ایک روایت کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کو قتل کیا اور دوسری روایت کے مطابق حضرت محمد بن مسلمہ نے اس کو قتل کیا۔ بعض کا کہنا ہے کو یہ روایت غلط ہے۔ اسی طرح یہ سب بھی غلط اور جھوٹ ہے کہ اس کے سر پر جو خود تھا وہ پتھر کا تھا، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ضرب نے گھوڑے اور گھڑ سوار دونوں کو کاٹ دیا اور زمین میں بھی شگاف پڑ گیا۔ اس جیسی کوئی بات سیرت نگاروں اور مغازی کا

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٨٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٩٦)

علم رکھنے والوں نے نقل نہیں کی۔ ایسی باتیں صرف جاہل اور جھوٹے لوگ نقل کرتے ہیں۔ اس سے بھی بڑا جھوٹ یہ ہے جو بیان کیا گیا ہے کہ پورا لشکر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کلائی سے گزر گیا۔ خچر گزرا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کو بے نسلی کی بد دعا دی۔ ایسی باتیں وہ لوگ بیان کرتے ہیں جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات سے ناواقف ہیں اور کائنات کے احوال سے بھی۔ خچر اب بھی بانجھ ہے۔ خیبر کی فوج میں اصل میں کوئی خچر تھا ہی نہیں، بلکہ مسلمانوں کے پاس کوئی خچر نہیں تھا، کیوں کہ خچر مدینے میں یا ارد گرد کی سرزمین میں پایا ہی نہیں جاتا تھا۔ صرف ایک خچر تھا جو مصر کے فرماں روا مقوقس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خیبر کے بعد تحفے میں دیا تھا، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اہلِ حدیبیہ کے ساتھ صلح کی اور واپس آئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو خیبر کی فتح سے سرفراز کیا۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف بادشاہوں کے پاس اپنے ایلچی بھیجے، جن میں کسریٰ، قیصر، مقوقس اور شام، یمن، یمامہ اور مشرق کے عرب بادشاہ شامل تھے، لیکن اہلِ علم کے ہاں یہ معروف ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خیبر کا دروازہ اکھاڑا تھا۔

ذوالفقار کے بارے میں جو کہا جاتا ہے کہ یہ آسمان سے اتری، جھوٹ ہے۔ پہلے گزر چکا ہے کہ یہ ابوجہل کی تلوار تھی جو مسلمانوں کو جنگِ بدر میں غنیمت میں ملی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام ان کے باپ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی بنائے جانے سے پہلے اور بچوں یا مردوں میں سے کسی کے بھی مسلمان ہونے سے پہلے رکھا تھا۔

کہنے والے کا یہ کہنا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، موسیٰ علیہ السلام کا عصا، نوح علیہ السلام کا سفینہ اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی تھے ایسی بات کوئی عقل مند نہیں کہہ سکتا جس کو پتا ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ یہ عقل مندوں کی بات کی نسبت پاگلوں سے زیادہ مشابہت رکھتی ہے۔

کوئی جہالت میں سرتاپا غرق انسان ہی یہ بات کہہ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تعریف و توصیف کا قصد کر سکتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان سے کم درجے کے صحابی بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں ان جمادات (کشتی، عصا، انگوٹھی) سے کہیں زیادہ معزز ہیں، گو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی ان کی نشانی تھی، لیکن جو چیز نبی کا معجزہ ہو وہ مومنوں سے افضل نہیں ہو سکتی، بلکہ اہلِ ایمان اس پرندے سے بھی افضل ہیں جسے حضرت مسیح علیہ السلام مٹی سے بنا کر اس میں پھونک مارتے اور وہ اللہ کے حکم سے اڑنے لگتا۔ وہ اس ٹڈی، جوں، مینڈک اور خون سے افضل ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نشانی تھے۔ وہ لاٹھی، سانپ اور صالح علیہ السلام کی اونٹنی سے بھی افضل ہیں۔ جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ وہ اس جھوٹ اور جہالت کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مدح سرائی کر رہا ہے، اس کی مدح اور تعریف سے لاعلمی اس کی اس لاعلمی کی نوع سے ہے کہ یہ جمادات کبھی آدمی نہیں رہے۔

قائل کا یہ کہنا کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی ناف مبارک سے پیا تو تمام اگلے اور پچھلے لوگوں کا علم جان لیا، بکواس اور جھوٹ ہے، کیوں کہ وہ علم جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے سیکھا تھا وہ ان کو آپ ﷺ کی موت سے پہلے ہی حاصل ہو چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد جس علم، فہم اور سماع سے نوازا، اس کا سبب آپ ﷺ کی ناف مبارک کا پانی پینا نہیں تھا، بلکہ اصل میں ایسے ہوتا ہی نہیں کہ کوئی نبی یا غیر نبی کا پانی پیے تو اس کو اس کی وجہ سے علم حاصل ہو۔ اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں کوئی بھی، نہ ابو بکر نہ عمر نہ عثمان نہ علی رضی اللہ عنہم اور نہ کوئی دوسرا تمام اگلے اور پچھلے لوگوں کا علم جانتا تھا۔

صحیح احادیث میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایسے فضائل ثابت ہیں جن کے ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان کو افترا پردازوں کے جھوٹوں سے بے نیاز کر دیا ہے۔

❀ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلت میں چند ایک احادیث درج ذیل ہیں:

١. ''اگر میں اہلِ زمین میں سے کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکر کو بناتا۔''[1]

٢. ''مسجد میں ابوبکر کی کھڑکی کے سوا تمام کھڑکیاں بند کر دی جائیں۔''[2]

٣. ''ہم پر سب سے زیادہ احسان ابوبکر کا ہے۔''[3]

٤. ''لوگو! میں تمھارے پاس آیا اور کہا: میں اللہ کا رسول ہوں، تم نے کہا: تم غلط کہتے ہو، ابو بکر نے کہا: آپ سچ کہتے ہیں، کیا تم میرے لیے میرے دوست کو چھوڑنے والے نہیں ہو؟! یہ بات آپ ﷺ نے تین مرتبہ کہی۔''[4]

٥. آپ ﷺ نے اپنے مرض الموت میں کہا: ''ابوبکر سے کہو: نماز پڑھائے۔''[5]

٦. آپ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا: ''اپنے باپ اور بھائی کو بلاؤ، تاکہ میں ابوبکر کے لیے ایک نوشتہ تحریر کروا دوں اور لوگ میرے بعد اختلاف نہ کریں۔'' پھر فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اور اہلِ ایمان بھی ابو بکر کے علاوہ سب کا انکار کریں گے۔''[6]

❀ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨٢)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨٢)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٦٤)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤١٨)

[6] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨٧)

1. ''تم سے پہلی امتوں میں محدَّث (مُلہم من اللہ) ہوتے تھے۔ اگر میری امت میں کوئی محدث ہو تو وہ عمر ہو سکتا ہے۔''[1]
2. ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: ''شیطان تجھ کو دیکھ کر اپنا راستہ بدل لیتا ہے۔''[2]
3. آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''میں نے خواب میں دیکھا، میرے پاس ایک دودھ کا کٹورا لایا گیا۔ میں نے اس سے پیا، اور جو باقی بچا میں نے وہ عمر کو دے دیا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: آپ اس کی تعبیر کیا فرماتے ہیں؟ فرمایا: علم۔''[3]
4. آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''میں نے خواب دیکھا: لوگ میرے پاس پیش کیے جا رہے ہیں۔ انھوں نے قمیصیں پہن رکھی ہیں۔ کچھ کی سینے تک تھیں۔ کچھ کی اس سے نیچے۔ میرے پاس عمر کو پیش کیا گیا تو انھوں نے بھی قمیص پہن رکھی تھی اور وہ اتنی لمبی تھی کہ وہ اس کو کھینچ رہے تھے۔ صحابہ نے پوچھا: اس کی تعبیر کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دین۔''[4]
5. آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک کنویں پر کھڑا ہوں اور پانی نکال رہا ہوں، پھر اسے ابن ابی قحافہ، یعنی حضرت ابوبکر نے پکڑا اور ایک ڈول نکالا، اللہ اس کو معاف کرے، اس کے کھینچنے میں کمزوری تھی، پھر اس کو ابن خطاب نے پکڑا تو وہ بہت بڑے ڈول میں تبدیل ہو گیا، میں نے اس جیسا قوت اور تنومندی سے کام کرنے والا کوئی عبقری، یعنی نابغۂ روزگار نہیں دیکھا، حتی کہ لوگ اپنے اونٹوں کو سیراب کر کے گھاٹ کے پاس ہی بیٹھ گئے۔''[5]

❀ اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے فضائل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

1. ''کیا میں اس سے شرم محسوس نہ کروں جس سے فرشتے بھی شرم محسوس کرتے ہیں۔''[6]
2. آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو بئرِ رومہ خریدے گا اس کو بدلے میں جنت ملے گی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسے خرید لیا۔''[7]
3. جب تبوک کے لیے لشکر تیار ہو رہا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عثمان نے آج جو کر دیا ہے، اس کے بعد یہ جو کرے اس کو اس کا کوئی نقصان نہیں ہو گا۔''[8]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٨٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٩٨)
[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٨٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٩٦)
[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٩١)
[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٩٠)
[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٣٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٩٣)
[6] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٠١)
[7] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٧٠٣) سنن النسائي، رقم الحديث (٣١٨٢)
[8] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٧٠١)

④ بیعتِ رضوان کے موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ میرا ہاتھ عثمان کے ہاتھ کی طرف سے ہے۔''[1]

⑤ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں کہا کرتے تھے: ابوبکر، پھر عمر، پھر عثمان رضی اللہ عنہم وغیرہ۔[2]

❀ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مناقب میں آپ ﷺ نے کہا:

1 خیبر کے موقع پر آپ ﷺ نے کہا: میں کل اس شخص کو جھنڈا دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے اور اللہ اور اس کا رسول بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھ پر فتح نصیب فرمائے گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ غیر موجود تھے اور آشوبِ چشم کی وجہ سے مدینے ہی میں رہ گئے تھے۔ وہ نبی اکرم ﷺ سے آملے۔ جب صبح ہوئی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ آئے۔ آپ ﷺ نے ان کو جھنڈا دیا، تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھ پر فتح دی۔[3]

2 جب غزوۂ تبوک کے لیے تمام مسلمان نکل پڑے تو آپ ﷺ نے صرف عذر والوں کو پیچھے رہنے کی اجازت دی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مدینے میں نائب مقرر کیا۔ کچھ منافقوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا۔ ان سے برداشت نہ ہو سکا اور فوراً رسول اللہ ﷺ سے آملے اور روتے ہوئے کہنے لگے: آپ ﷺ نے مجھ کو بچوں اور عورتوں کے ساتھ پیچھے چھوڑ دیا ہے؟ آنحضرت ﷺ نے جواب دیا: ''کیا تم پسند نہیں کرتے کہ تم میرے نزدیک اس مرتبے پر فائز ہو جو ہارون کا موسیٰ علیہ السلام کے ہاں تھا؟ صرف یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔''[4]

3 آپ ﷺ نے حضرت علی، فاطمہ اور حسنین کریمین رضی اللہ عنہم کو اپنی چادر کے نیچے کیا اور فرمایا: ''اے اللہ! یہ میرے اہلِ بیت ہیں تو ان سے پلیدی دور کر دے اور ان کو اچھی طرح پاک کر دے۔''[5]

4 جب آپ ﷺ نے اہلِ نجران کے ساتھ مباہلہ کرنے کا ارادہ کیا تو حضرت علی، فاطمہ اور حسنین کریمین رضی اللہ عنہم کو اپنے ساتھ لیا۔

5 جب حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کی پرورش کے معاملے میں حضرت علی، جعفر اور زید رضی اللہ عنہم کے درمیان اختلاف ہوا تو آپ ﷺ نے اس کو اس کی خالہ کے سپرد کرنے کا فیصلہ سنایا جو حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی بیوی تھی۔ اس وقت آپ ﷺ نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ سے کہا: ''تم میرے اخلاق اور خلقت سے مشابہت رکھتے ہو۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٩٥)

② صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٩٤)

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٩٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٠٧)

④ صحيح البخاري، رقم الحديث (٤١٥٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٧٠٢)

⑤ سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٨٧١) اس کی اصل صحیح مسلم (٢٤٢٤) میں ہے۔

سے کہا: ''تم مجھ سے ہو اور میں تجھ سے۔'' زید رضی اللہ عنہ سے کہا: ''تم ہمارے بھائی اور آزاد کردہ ہو۔''[1]

- آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشعریوں کی خوبی بیان کرتے ہوئے کہا: ''اشعری جب سفر میں ہوں اور ان کا زادِ راہ ختم ہو جائے یا مدینے میں ان کے عیال کا خرچہ کم ہو جائے تو ان کے پاس جو کچھ ہوتا ہے اس کو ایک کپڑے میں جمع کرتے ہیں اور آپس میں برابر تقسیم کر لیتے ہیں، وہ مجھ سے ہیں اور میں ان سے۔''[2]
- آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا: ''ہر امت کا ایک امین ہوتا ہے اور اس امت کا امین ابو عبیدہ بن جراح ہے۔''[3]
- حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا: ''ہر نبی کے حواری ہوتے ہیں اور میرا حواری زبیر ہے۔''[4]

یہ اور اس طرح کی دیگر احادیث جو صحاح میں موجود ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے جھوٹ کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔

اسی طرح جو یہ کہانی بیان کی گئی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موت کا فرشتہ ایک دیہاتی کی شکل میں آیا، اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک سیب دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سونگھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پرواز کر گئی، بالکل جھوٹی ہے۔

بلکہ وہ لمبی حدیث جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کا واقعہ اس طرح درج ہے کہ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا تو سب ایک ایک کر کے اس کی طرف نکلے۔ جب انھوں نے پہچان لیا کہ وہ موت کا فرشتہ ہے تو سب اس کے سامنے جھک گئے۔ یہ بھی محدثین کے اتفاق کے ساتھ جھوٹ ہے۔ اگرچہ اسے طبرانی نے عبدالمنعم بن ادریس عن ابیہ کی سند سے وہب بن منبہ عن ابن عباس کی حدیث سے روایت کیا ہے، لیکن یہ عبدالمنعم جھوٹی روایات بیان کرنے میں مشہور ہے۔

ایک یہ روایت بھی ذکر کی گئی ہے کہ حضرت فاطمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر اتنا روئیں کہ اہلِ مدینہ بھی پریشان ہو گئے اور انھوں نے ان کو ان گھروں میں منتقل کر دیا جو غم کے لیے جانے جاتے تھے۔ یہ بھی جھوٹی اور خانہ ساز روایت ہے۔ اس جیسی روایت یا تو کوئی جاہل روایت کر سکتا ہے یا پھر فاطمہ اور صحابہ کرام کے بارے میں بدزبانی کرنے والا۔ یہ وہ فعل ہے جس سے اللہ نے صحابہ اور فاطمہ کو بری رکھا ہے۔

ایک یہ روایت بھی ذکر کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے چہرے کے نور سے ایک مٹھی بھری، اس کی طرف دیکھا تو وہ پسینے سے بہنے لگی .....'' یہ بھی محدثین کے اتفاق کے ساتھ جھوٹ ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٥٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣٥١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٠٠)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٥٣٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤١٩)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٩١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤١٥)

اس طرح وہ روایات بھی اس سے ملتی جلتی ہیں جنھیں شیرویہ الدیلمی اپنی کتاب ''الفردوس'' میں ذکر کرتا ہے اور ان کو ابن حمویہ اپنی کتاب ''المحبوب'' جیسے اپنے حقائق ناموں میں نقل کرتا ہے، یہ ذکر کرتے ہیں کہ نبی ﷺ ایک ستارہ تھے یا سارا جہان آپ ﷺ سے پیدا ہوا، یا آپ ﷺ اپنے والدین کے پیدا ہونے سے بھی پہلے موجود تھے، یا جبرائیل علیہ السلام کے آنے سے پہلے ہی آپ ﷺ کو سارا قرآن یاد تھا، ان جیسی باتیں یہ لوگ ذکر کرتے ہیں سب محدثین اور علمائے سیرت کے اتفاق کے ساتھ جھوٹی اور خود ساختہ ہیں۔ تمام انبیا نبی ﷺ سے پیدا نہیں کیے گئے، بلکہ ہر ایک اپنے اپنے والدین سے پیدا ہوا، اللہ تعالیٰ نے ہر ایک میں روح پھونکی۔ اس طرح بھی نہیں ہوتا تھا کہ جب اللہ نے اپنے رسولوں کی طرف کوئی وحی بھیجنا چاہی تو ہر ایک نے جبرائیل علیہ السلام کے واسطے ہی سے وحی لی، بلکہ کبھی اللہ ان کے ساتھ وحی کے ذریعے کلام کرتا ہے اور کبھی پردے کے پیچھے سے (جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کلام کیا) اور کبھی فرشتہ بھیج دیتا ہے جو اس کے حکم سے جو چاہتا ہے وحی کرتا ہے۔ کچھ انبیا دوسرے نبیوں کی شریعت ہی پر ہوتے ہیں، جس طرح بنی اسرائیل کے انبیا تورات کی شریعت پر تھے۔

یہ بات کہ وہ سب ایک ہی سے اخذ کرتے ہیں، وحدۃ الوجود کے قائل ملحدوں کی بات ہے۔ ابن عربی نے ''فتوحاتِ مکیہ''، ''فصوص الحکم'' میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اس نے جب اپنا مذہب ذکر کیا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ وجود ایک ہی ہے، خالق اور مخلوق کے وجود میں کوئی فرق نہیں، دونوں ایک ہی ہیں۔ اگرچہ عدم میں ثابت اعیان متعدد ہوں، وہ کہتا ہے: یہ علم خاتم الرسل اور خاتم الانبیا کے سوا کسی کو نہیں ہوتا، نبی اور رسول جو بھی دیکھتا ہے، خاتم الرسل کے مشکاتِ نبوت ہی سے دیکھتا ہے، اسی طرح جو ولی بھی جو کچھ بھی دیکھتا ہے، خاتم الاولیا کے مشکاتِ ولایت ہی سے دیکھتا ہے، حتی کہ رسول بھی جب اسے دیکھیں تو خاتم الاولیا کے مشکات ہی کے ایک دریچے سے دیکھتے ہیں۔ رسالت اور نبوت منقطع ہو چکی ہے، لیکن ولایت کبھی منقطع نہیں ہوگی، چنانچہ رسول اولیا ہونے کے اعتبار سے اسے خاتم الاولیا ہی کے مشکاۃِ ولایت سے دیکھتے ہیں۔

آگے چل کر لکھتا ہے: خاتم الانبیا چاندی کی ایک اینٹ رکھنے کی جگہ ہے، لیکن خاتم الاولیا دو اینٹوں کو رکھنے کی جگہ ہے، ایک سونے کی اور دوسری چاندی کی۔ وہ ظاہری احکام کی بنا پر چاندی کی اینٹ رکھنے کی جگہ ہے، کیوں کہ وہ معاملے کو اسی طرح دیکھتا ہے جس طرح نظر آ رہا ہوتا ہے، اس لیے اس کو اسی طرح دیکھنا ضروری ہے، لیکن یہ باطن میں سونے کی اینٹ رکھنے کی جگہ ہے، کیوں کہ وہ اس معدن اور سرچشمے سے اخذ کرتا ہے، جس سے وہ فرشتہ اخذ کرتا ہے، جو رسولوں کی طرف اس حکم کو وحی کرتا ہے۔

یہ اور اس جیسا کلام مجموعۂ گمراہی ہے، مثلاً: وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ تمام انبیا اور رسول اللہ تعالیٰ کی معرفت

خاتم الانبیا ہی سے حاصل کرتے ہیں، یہ سراسر جھوٹ ہے۔ جو شخص کہتا ہے کہ ابراہیم خلیل اللہ، موسی کلیم اللہ اور عیسیٰ روح اللہ وغیرہم نے اللہ تعالیٰ کی معرفت نبی آخر الزماں سے حاصل کی، وہ جھوٹ بولتا ہے، بلکہ اللہ نے خود ان پر وحی کی اور ان کو سکھایا۔ جس وقت وہ پیدا ہوئے اس وقت نبی اکرم ﷺ موجود نہیں تھے۔ جو پہلے گزر چکا ہو وہ بعد میں آنے والے سے استفادہ نہیں کر سکتا۔

نبی اکرم ﷺ کا یہ فرمان ہے:

«كُنتُ نَبِيًّا وَآدمُ بَيْنَ الرُّوحِ وَالْجَسَدِ»[1]

”میں اس وقت نبی تھا اور دوسری روایت کے مطابق میں اس وقت نبی لکھ دیا گیا تھا، جب آدمی ابھی روح اور جسم کی درمیانی کیفیت میں تھے۔“

اسی طرح ہے جس طرح آپ ﷺ کا یہ فرمانا ہے:

«إِنِّي عِنْدَ اللّٰهِ لَمَكْتُوبٌ خَاتَمُ النَّبِيِّينَ وَإِنَّ آدَمَ لَمُنْجَدِلٌ فِي طِينَتِهِ»[2]

”میں اللہ کے ہاں اس وقت سے خاتم النبیین لکھ دیا گیا ہوں جس وقت آدم علیہ السلام ابھی اپنے گارے میں گندھے ہوئے تھے۔“

کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کا بدن پیدا کرنے کے بعد اور ان میں روح پھونکنے سے پہلے لکھا اور ان کی پیدا ہونے والی اولاد کو ظاہر کیا تو اس وقت محمد ﷺ کی نبوت کو لکھ دیا اور اس کو ظاہر کر دیا۔ جس طرح صحیحین میں یہ حدیث موجود ہے، آپ ﷺ فرماتے ہیں: ”تم میں سے ہر ایک کی پیدائش اس کی ماں کے پیٹ میں چالیس دن تک نطفے کی شکل میں رکھی جاتی ہے، پھر وہ جمے ہوئے خون کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور اتنے ہی دن رہتی ہے، پھر وہ گوشت کا لوتھڑا بن جاتا ہے، وہ بھی اتنے ہی دن رہتا ہے۔ اس کے بعد ایک فرشتے کو چار باتیں دے کر بھیجا جاتا ہے۔ اس کو کہا جاتا ہے: اس کا رزق، اس کی موت، اس کا عمل اور اس کا نیک بخت یا بد بخت ہونا لکھ دے، پھر اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔“[3] اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے بتایا کہ جب ماں کے پیٹ میں بچے کی تخلیق ہوتی ہے تو اس میں روح پھونکنے سے پہلے اس کا رزق، موت، عمل اور نیک بختی یا بد بختی لکھ دی جاتی ہے۔ اسی طرح جب آدم علیہ السلام ابھی ڈھانچے کی شکل میں تھے اور ان میں روح پھونکنا باقی تھا، اس وقت اللہ تعالیٰ نے آدم کی اولاد کے سردار کی خبر لکھ دی۔

---

1. سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦٠٩) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٨٥٦)
2. مسند أحمد (٤/ ١٢٧، ١٢٨) ضعيف الجامع، رقم الحديث (٢٠٩١)
3. صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٣٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٣)

یہ صحیح حدیث کے الفاظ ہیں جو اوپر گزرے۔ کچھ لوگ اس روایت کو اس طرح بھی نقل کرتے ہیں: ''كُنْتُ نَبِيًّا وَ آدَمُ بَيْنَ الْمَاءِ وَالطِّيْنِ'' ''میں اس وقت بھی نبی تھا جب آدم علیہ السلام پانی اور گیلی مٹی کے درمیان تھے۔'' یہ عقلاً اور نقلاً دونوں اعتبارات سے باطل ہے، کیوں کہ آدم علیہ السلام پانی اور مٹی کے درمیان نہیں تھے، بلکہ گیلی مٹی پانی اور خشک مٹی کا آمیزہ تھی۔ آدم علیہ السلام تو روح اور جسم کی درمیانی کیفیت میں تھے۔ ان جیسی روایات میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ چیزوں کے وجود میں آنے سے پہلے ہی ان کو جانتے ہیں۔ اس نے ان کو لکھا ہوا تھا اور اس کو ان کی خبر دی، لیکن اس میں ان چیزوں کی ذوات کے اس وقت موجود ہونے کا ثبوت نہیں، کیوں کہ اعیان اور وجود اسی وقت وجود میں آتے ہیں جب انھیں پیدا کیا جاتا ہے۔

جو شخص علم، کلام اور کتابت میں کسی چیز کے ثبوت اور خارج میں حقیقت میں اس کے وجود کے درمیان فرق نہیں کرتا، اسی طرح علمی اور عینی وجود کے فرق کو بھی مدِ نظر نہیں رکھتا، وہ بہت بڑا جاہل اور گمراہ ہے۔

اہلِ علم نے اس شخص کے خلاف بڑی سزا بیان کی ہے، جو کہتا ہے: معدوم بھی شے ہے جو خارج میں ثابت ہے۔ ان لوگوں کا اگر یہ اس گمان کی بنا پر عقلی شبہہ ہے کہ علم اور ارادے میں اس چیز کی تمیز خارج میں اس کی تمیز کا تقاضا کرتی ہے، تو ان کا یہ گمان غلط ہے، کیوں کہ تحقیق کا تقاضا ہے کہ علمی اور عینی (وجودی) ثبوت میں فرق کیا جائے۔ یہ کہنا کہ چیزیں اپنی تخلیق سے پہلے بھی (حسی) وجود رکھتی ہیں، جاہلانہ اور گمراہوں والی بات ہے۔

رہا ان لوگوں کا یہ دعویٰ کہ تمام اولیا، حتیٰ کہ انبیا بھی خاتم الاولیا سے مستفید ہوتے ہیں، تو یہ عقل و شریعت دونوں کے مخالف ہے۔ انبیا اولیا سے ہر حال میں افضل ہیں اور جو ولی جتنا اچھا اور بہتر ہوگا اتنا ہی زیادہ انبیا کا پیروکار ہوگا، جس طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ انبیا و رسل کے بعد صفحۂ ہستی پر سب سے زیادہ بزرگوار شخصیت تھے۔

اسی طرح ان کا یہ دعویٰ بھی بہت بڑا کفریہ اور گمراہی پر مبنی دعویٰ ہے کہ خاتم الاولیا ظاہری علم وہیں سے لیتے ہیں جہاں سے نبی لیتا ہے، لیکن وہ باطنی علم اس معدن اور سرچشمے سے اخذ کرتا ہے جس سے فرشتہ اخذ کر کے نبی کو وحی کرتا ہے۔ یہ دعوی فلاسفہ کے اس قول اور نظریے پر مبنی ہے، جس کے مطابق نبوت ایک فیض ہے جو نبی کی عقل پر ہوتا ہے۔ نیز جو دعویٰ کرتے ہیں کہ فرشتے سے مراد وہ نورانی اشکال ہیں جو نبی کے نفس میں پیدا ہوتی ہیں اور نبی ان خیالی صورتوں سے اخذ و استفادہ کرتا ہے جو ان کے نزدیک فرشتہ ہے، لہٰذا جو شخص عقلی معانی عقلِ مجرد سے اخذ کرتا ہے وہ اس سے زیادہ کامل ہے جو خیالی صورتوں سے اخذ کرتا ہے۔

ان صوفیائے وحدت نے ان ملحد اور بے دین فلاسفہ کے اقوال و نظریات کے مطابق اپنا عقیدہ بنا لیا اور ریاضت و مجاہدے کو اپنا مسلک بنا لیا، پھر ان الحادی فلسفی امور کے ساتھ بحث کرنے لگے اور ان کو مکاشفات اور

مخاطبات کے قالب میں پیش کرنے لگے۔

خاتم الاولیا کے بارے میں انھوں نے جو کچھ بھی بیان کیا ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں، گو حکیم ترمذی نے اپنی کتاب ''خاتم الاولیاء'' میں اس کا ذکر کیا ہے، لیکن اس نے اس کتاب میں غلط بات پیش کی ہے جو اہلِ علم و ایمان کے ہاں واضح طور پر غلط ہے۔ ان امور کی تفصیل کسی دوسری جگہ گزر چکی ہے۔

یہ اور ان جیسی احادیث محدثین کے نزدیک جھوٹ اور الزام ہیں، بالخصوص جو عقلی طور پر باطل معلوم ہوں، بلکہ عقل سے خالی ہوں، انھیں روایت کرنے اور بیان کرنے کی صرف اس صورت میں اجازت ہے جب ان کا جھوٹ بیان کیا جائے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«مَنْ رَوىٰ عَنِّي حَدِيْثاً وَهُوَ يَرىٰ أَنَّهُ كَذِبٌ فَهُوَ أَحَدُ الْكَاذِبِيْنِ» [1]

''جو میری طرف سے کوئی ایسی روایت نقل کرتا ہے جسے جھوٹ سمجھتا ہے تو وہ دو جھوٹوں میں سے ایک ہے۔''

ہر جگہ اس جیسی روایات نقل کرنے پر پابندی لگانا اربابِ اقتدار کا کام ہے۔ جو انھیں بیان کرنے پر اصرار کرے، اس کو ایسی عبرت ناک سزا دی جائے جو اس کو رسول اللہ ﷺ، صحابہ کرام، آلِ بیت اور دیگر اہلِ علم و دین کی طرف جھوٹ منسوب کرنے سے روک دے۔ واللہ أعلم [2]

درزیہ اور نصیریہ فرقے کی حقیقت

سوال درزیہ اور نصیریہ فرقے کا کیا حکم ہے؟

جواب درزیہ اور نصیریہ بالاتفاق کافر ہیں۔ ان کے ذبیحے جائز ہیں نہ ان کی عورتوں سے شادی کرنا جائز ہے، بلکہ جزیے کے ساتھ بھی ان سے تعلقات استوار نہیں کیے جا سکتے، کیوں کہ یہ مرتد ہیں، مسلمان نہیں اور یہودی و عیسائی بھی نہیں۔ یہ نمازِ پنج گانہ، رمضان کے روزوں اور حج کی فرضیت کے قائل نہیں۔ مردار اور خنزیر وغیرہ کی حرمت کے قائل بھی نہیں جو اللہ اور رسول نے حرام قرار دی ہیں۔

یہ لوگ اگر ان عقائد کے ساتھ کلمہ طیبہ کا بھی اظہار کریں پھر بھی بالاتفاق کافر ہیں۔

نصیریہ، ابو شعیب محمد بن نصیر کے پیروکار ہیں۔ یہ غالی شیعہ تھا جن کے عقیدے کے مطابق حضرت علی معبود ہیں۔ یہ لوگ یہ اشعار پڑھتے ہیں:

---

[1] صحيح مسلم (١/٧، ١٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٦٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦١٩٩)

[2] مجموع الفتاویٰ (١٨/٣٣٥-٣٧١)

أشهد أن لا إله إلا حيدرة الأنزع البطين
ولا حجاب عليه إلا محمد الصادق الأمين
ولا طريق إليه إلا سلمان ذوالقوة المتين

''میں گواہی دیتا ہوں کہ حیدر کے سوا کوئی معبود نہیں جو چوڑے پیٹ والا ہے اور جس کی کن پٹیوں پر بال نہیں۔ محمد صادق امین کے سوا اس پر کوئی حجاب نہیں۔ اس کی طرف جانے کی راہ صرف مضبوط قوت والے سلمان کی طرف سے ہے۔''

دروز یہ ہشتکین درزی کے پیروکار ہیں۔ یہ فاطمی حکمران ''الحاکم'' کا موالی تھا۔ اس نے اس کو وادی تیم اللہ بن ثعلبہ کی طرف اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا۔ یہ الحاکم کی الوہیت کا پرچار کرتا تھا۔ یہ اس کو ''الباری'' (پیدا کرنے والا) اور ''العلام'' (بہت علم والا) کے نام سے یاد کرتے تھے اور اس کے نام کی قسم کھاتے تھے۔ یہ اسماعیلیہ فرقے سے تعلق رکھتے ہیں جن کا عقیدہ ہے کہ محمد بن اسماعیل نے محمد (ﷺ) بن عبداللہ کی شریعت منسوخ کر دی ہے۔ یہ غالیہ (غلو پرست) سے بھی بڑے کافر ہیں۔ ان کے نزدیک عالم یعنی جہان قدیم ہے۔ آخرت کا کوئی وجود نہیں۔ اور یہ لوگ اسلام کے فرائض اور محرمات کا انکار کرتے ہیں۔ یہ قرامطہ باطنی فرقے کے پیروکار ہیں جو یہود و نصاریٰ اور مشرکینِ عرب سے بھی بڑے کافر ہیں۔

یہ یا تو ارسطو اور اس جیسے فلاسفہ کے مذہب کے پیروکار فلسفی ہیں یا پھر مجوسی، ان کا عقیدہ فلاسفہ اور مجوسیوں کے عقائد کا مرکب ہے، جب کہ یہ لوگ منافقت کی چادر اوڑھ کر اپنے آپ کو شیعہ ظاہر کرتے ہیں۔ واللہ أعلم [3]

قلندری فرقے کی حقیقت

سوال یہ ''قلندریہ'' کون ہیں جو ڈاڑھیاں منڈواتے ہیں اور کس فرقے سے تعلق رکھتے ہیں؟ ان کا عقیدہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے شیخ قلندر کو انگور کھلایا اور عجمی زبان میں اس سے بات کی؟

جواب یہ ڈاڑھی منڈے قلندریہ گمراہ اور جاہل لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی اکثریت اللہ اور رسول کی منکر ہے۔ یہ لوگ نہ نماز روزے کی فرضیت کے قائل ہیں اور نہ محرمات کو حرام ہی سمجھتے ہیں۔ یہ دینِ حق کے پیروکار نہیں، بلکہ ان میں سے اکثر یہود و نصاریٰ سے بھی بڑے کافر ہیں۔ یہ نہ اہلِ ملت سے تعلق رکھتے ہیں نہ اہلِ ذمہ سے۔ ان میں کوئی مسلمان بھی ہوسکتا ہے مگر وہ یا تو بدعتی اور گمراہ ہوگا یا پھر فاسق فاجر۔

---

(1) مجموع الفتاویٰ (٣٥/١٦١۔١٦٢)

جس کا یہ عقیدہ ہے کہ ''قلندر'' رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں موجود تھا وہ جھوٹا اور افترا پرداز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نوع کی اصل کا تعلق ایرانیوں کی ایک تارک الدنیا جماعت سے ہے۔ وہ لوگ فرائض ادا کرتے اور حرام کاموں سے بچتے۔ اس کے بعد دلی راحت کے حصول کے لیے گھومتے رہتے۔ شیخ ابو حفص سہروردی نے اپنے ''عوارف'' میں ان کا یہی تعارف کروایا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے ''ملامیہ'' فرقے کی طرح فرائض چھوڑ دیے اور حرام کاموں کا ارتکاب شروع کر دیا۔

ملامیہ فرقہ اپنی نیکیاں چھپا کر کرتا اور اپنا ظاہری حلیہ بگڑے ہوئے مالداروں کی طرح بناتا، تاکہ ان کے بارے میں نیک اور اچھا ہونے کا گمان نہ کیا جا سکے۔ یہ تو اتنا بعید کام نہیں۔ ایسے شخص کو اپنی نیت کا اجر ملتا ہے۔ اس کے بعد کچھ نئے لوگ آ گئے جنھوں نے شریعت میں ناجائز اور ناپسندیدہ کاموں کا ارتکاب شروع کر دیا اور معاملہ اس حد تک بگڑ گیا کہ کچھ لوگوں نے بے حیائی اور برائی کے کام شروع کر دیے۔ فرائض اور واجبات کو ایک طرف رکھ دیا اور سمجھتے رہے کہ وہ ''ملامیہ'' میں داخل ہو چکے ہیں۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ وہ دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ کی سزا، مذمت اور ملامت کے ٹھیک حق دار بن چکے ہیں۔ ان سب کو سزا دینی چاہیے اور ان کو اس لعنتی علامت سے روکنا چاہیے۔ یہ انہی کی بات نہیں، بلکہ ہر علانیہ بدعت یا فسق و فجور کرنے والے کی یہی سزا ہے جو بھی نام نہاد تارک دنیا عبادت گزار، خود ساختہ فقیہ، پیر فقیر، بزعم خویش متکلم، فلسفی اور ان کے ہم نوا بادشاہ، مالدار، نجومی، طبیب، دربار شاہی سے وابستہ اور عام لوگ، ہدایت نبوی اور دین حق کے مخالف ہیں اور رسول کی پیش کردہ تمام تعلیمات و اخبار کے منکر ہیں، اللہ اور رسول کے حرام کردہ کو حرام نہیں سمجھتے یا ایسے دین پر کاربند ہیں جو اللہ کے رسول کے پیش کردہ دین کے ظاہر یا باطن میں مخالف ہے، مثلاً کوئی شخص اپنے پیر سے متعلق رازق ہونے کا عقیدہ رکھے یا اس سے مدد، فریاد یا ہدایت طلب کرے یا اس کی عبادت کرے، اس کے سامنے سجدہ ریز ہو، اس کو پکارے یا اس کو رسول اللہ ﷺ پر ایسی مطلق یا مقید فضیلت دے جس کو قرب الٰہی کا ذریعہ سمجھے یا اپنے آپ کو یا اپنے پیر کو رسول اللہ ﷺ کی پیروی سے مستثنیٰ اور بے پروا خیال کرے تو یہ سب لوگ اگر ان عقائد کا اظہار کریں تو کافر ہیں، اگر ان عقائد کو چھپا کر رکھیں تو منافق ہیں۔

اس طرح کے لوگ گو آج کے زمانے میں کثرت سے ہیں، مگر علم و ایمان کی قلت اور اکثر ممالک میں آثار رسالت کے کمزور ہو جانے کی وجہ سے اور ان میں اکثر لوگوں کے پاس رسالت و نبوت کی وراثت اور آثار کے نہ ہونے کی وجہ سے ہدایت کو پہچاننا مشکل ہو چکا ہے۔ اکثر تک یہ پیغام ہی نہیں پہنچ پایا۔ فترت کے اوقات اور جگہوں میں آدمی کے پاس جو تھوڑا سا ایمان ہو تو اس پر بھی ثواب کا حق دار بن جاتا ہے جس پر حجت قائم نہ ہو سکی ہو۔ اللہ تعالیٰ اس کی وہ خطائیں معاف کر دیتے ہیں جو اس کی نہیں معاف کرتے جس پر حجت قائم ہو چکی ہو۔

حدیث میں ہے: ''لوگوں پر ایک ایسا وقت بھی آئے گا جس میں نماز، روزے، حج اور عمرے سے صرف بڑی عمر کے مرد اور بوڑھی عورتیں واقف ہوں گی۔ وہ کہیں گے: ہم نے اپنے بڑوں کو لا إله إلا الله کہتے ہوئے پایا ہے۔''[1] حضرت حذیفہ بن یمان سے پوچھا گیا: ''لا إله إلا الله ان کو کیا فائدہ دے گا؟'' انھوں نے کہا: ''یہ ان کو آگ سے بچا لے گا۔''

اصل بات یہ ہے کہ وہ قول اور عقیدہ جو کتاب و سنت اور اجماع کے ساتھ کفر ہو، شرعی دلائل کی روشنی میں مطلق کفر ہے، کیوں کہ ایمان ایسے احکام سے تعلق رکھتا ہے جو اللہ اور اس کے رسول سے اخذ کیے جاتے ہیں۔ اس میں لوگ اپنے گمانوں اور خواہشات کی روشنی میں کوئی فیصلہ دینے کے مجاز نہیں، لہٰذا جو شخص بھی اس طرح کا عقیدہ رکھتا ہے اس کو اس وقت تک کافر قرار دینے کا فیصلہ کرنا ضروری نہیں جب تک اس میں تکفیر کی ساری شرطیں ثابت اور تمام موانع اور رکاوٹیں ختم نہ ہو جائیں، مثلاً کوئی شخص نیا نیا مسلمان ہوا ہو یا کسی دور دراز کی بستی میں رہتا ہو جہاں علم سے محروم ہو اور کہہ دے کہ شراب یا سود حلال ہے یا کوئی بات سن کر اس کا انکار کر دے اور اس کے قرآن یا حدیث میں سے نہ ہونے کا عقیدہ رکھے، جس طرح اسلاف میں سے کچھ بزرگ کئی اشیا کا انکار کر دیتے جب تک ان کے نزدیک ان کا رسول اللہ ﷺ کا قول ہونا ثابت نہ ہو جاتا۔ صحابہ کو بھی کئی اشیا مثلاً دیدارِ الٰہی وغیرہ جیسے مسائل میں شک ہوتا، جب تک رسول اللہ ﷺ سے ان کے متعلق پوچھ نہ لیتے، مثلاً بنی اسرائیل کے ایک شخص نے کہا: جب میں مر جاؤں تو میرے جسم کو سفوف بنا کر سمندر برد کر دینا، وغیرہ۔ ایسے لوگوں کی تکفیر اس وقت تک نہیں کی جا سکتی جب تک ان پر رسالت کے ساتھ حجت قائم نہ ہو جائے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ﴾ [النساء: ١٦٥]

''تاکہ لوگوں کے پاس رسولوں کے بعد اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت نہ رہ جائے۔''

اللہ تعالیٰ نے اس امت سے بھول چوک اور غلطی معاف کر رکھی ہے۔ ہم نے اس جواب سے تعلق رکھنے والے قواعد کی تفصیل اور کامل بحث اپنے مقام پر ذکر کی ہے، یہ فتویٰ اس سے زیادہ تفصیل کا متحمل نہیں۔ واللہ أعلم[2]

نجومی کا پیشہ اختیار کرنے اور نجومی کے پاس جانے کا حکم

سوال نجومی کا پیشہ اختیار کرنے اور قسمت معلوم کرنے کے لیے نجومی کے پاس جانے کا حکم کیا ہے؟

جواب الحمد لله رب العالمين. پیشۂ نجوم جس میں ستاروں کی چال دیکھ کر حال احوال بیان کیے جاتے ہیں، ان کی تاثیر کو بنیاد بنا کر زمینی حوادث و واقعات کی تعبیر و استدلال کیا جاتا ہے اور فلکی قوتوں کو ان کے مقابل زمینی

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٤٩) السلسلة الصحيحة (٨٧)

[2] مجموع الفتاویٰ (١٦٣/٣٥ـ١٦٦)

قوتوں کے ساتھ مخلط کیا جاتا ہے۔ یہ پیشہ کتاب وسنت اور اجماع امت کی روشنی میں حرام ہے، بلکہ تمام انبیا کی زبانوں سے تمام ملتوں میں حرام قرار دیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ أَتَىٰ ﴾ [طٰہٰ: ٦٩] ''اور جادوگر کامیاب نہیں ہوتا جہاں بھی آئے۔''

نیز فرمایا:

﴿ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُؤْمِنُونَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوتِ ﴾ [النساء: ٥١]

''کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا، وہ بتوں اور باطل معبود پر ایمان لاتے ہیں۔''

حضرت عمر وغیرہ نے ﴿ الْجِبْتِ ﴾ کی تفسیر جادو کی ہے۔

ابو داود میں حسن سند سے مروی ہے، قبیصہ بن مخارق نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''عیافہ، طیرہ اور طرق ﴿ الْجِبْتِ ﴾ سے ہیں۔''[1] حدیث کا راوی تفسیر کرتے ہوئے کہتا ہے: ''عیافہ پرندوں کو ڈانٹنا (ان کے ناموں، آوازوں اور گزرگاہوں سے فال پکڑنا) ''طرق'' زمین پر آڑھی ترچھی لکیریں کھینچنا یا اس کے عکس اور طیرہ نحوست پکڑنا ہے۔ اگر زمین پر آڑے ترچھے خط کھینچنا اور زائچے بنانا جو علم نجوم کی مختلف شاخیں ہیں، وہ ﴿ الْجِبْتِ ﴾ ہیں تو علمِ نجوم بذاتِ خود ﴿ الْجِبْتِ ﴾ کیوں نہیں؟ نجومی بھی ستاروں کی شکلیں اور چال دیکھ کر زمین میں زائچے بناتے ہیں جو فلکی شکلوں ہی سے نکلتے ہیں۔

مسند احمد، ابو داود اور ابن ماجہ میں صحیح سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« مَنِ اقْتَبَسَ عِلْماً مِنَ النُّجُومِ، فَقَدْ اقْتَبَسَ شُعْبَةً مِنَ السِّحْرِ، زَادَ مَا زَادَ »[2]

''جس نے علمِ نجوم سے کچھ اکتساب کیا، اس نے جادو کے ایک شعبے سے اکتساب کیا، جتنا زیادہ (نجوم) سے اکتساب کیا، اتنا ہی زیادہ اس سے (جادو سے) اکتساب کیا۔''

اس فرمان میں رسولِ اکرم ﷺ نے صریح الفاظ میں علمِ نجوم کو جادو قرار دیا ہے اور جادو کے متعلق ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ أَتَىٰ ﴾ [طٰہٰ: ٦٩] ''اور جادوگر کامیاب نہیں ہوتا جہاں بھی آئے۔''

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٩٠٧) ضعيف الجامع (٣٩٠٠)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٩٠٥) السلسلة الصحيحة (٧٩٣)

امرِ واقع اور حقیقتِ حال یہی ہے۔ استقرا اور تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ نجومی کبھی فلاح نہیں پاتے، نہ دنیا میں اور نہ آخرت ہی میں۔

مسند احمد اور صحیح مسلم میں حضرت صفیہ بنت عبید نے رسول اللہ ﷺ کی کسی زوجہ محترمہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ أَتیٰ عَرَّافاً فَسَأَلَهُ عَنْ شَيْءٍ، لَمْ تُقْبَلْ لَهُ صَلَاةُ أَرْبَعِيْنَ يَوْماً» [1]

''جو کسی عراف (ٹیوہ لگانے والا، مستقبل کی خبریں دینے والا، کاہن) کے پاس گیا اور اس سے کسی چیز کے متعلق پوچھا تو چالیس دن تک اس کی نماز قبول نہیں ہوگی۔''

نجومی بعض علما کے نزدیک ''عراف'' میں شامل ہے اور بعض کے نزدیک یہ نجومی کا مترادف اور ہم معنی لفظ ہے۔ اگر سائل کا یہ حکم ہے تو مسئول یعنی جس سے پوچھا جائے، اس کا حکم کتنا سنگین ہوگا؟!

صحیح میں معاویہ بن حکم سلمی سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں، میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہمارے کچھ لوگ کاہنوں کے پاس جاتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ان کے پاس نہ جاؤ۔'' [2] آپ ﷺ نے ان کو کاہنوں کے پاس جانے سے منع کیا اور نجومی، خطابی اور دیگر علما کے نزدیک، کاہن میں داخل ہے، عربوں سے بھی یہ منقول ہے، کچھ دوسرے علما کے نزدیک نجومی کاہن ہی کی ایک قسم ہے، مگر اس سے بھی بدتر ہے، اس طرح یہ معنوی لحاظ سے کاہن کے ہم حکم ہے۔

صحیح میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کتے کی قیمت، زانیہ کی کمائی اور کاہن کو پیش کی جانے والی مٹھائی (اجرت) خبیث ہے۔'' [3] اس مفہوم کے اعتبار سے کاہن کو پیش کی جانے والی مٹھائی اور نذرانے میں وہ اجرت بھی شامل ہے جو نجومی، فال نکالنے والے اور زائچے بنانے والوں کو دی جاتی ہے، لہٰذا ان لوگوں کو جو دیا جاتا ہے، وہ حرام ہے، بلکہ بغوی، قاضی عیاض اور کئی دیگر علما نے اس کے حرام ہونے پر اجماع نقل کیا ہے۔

صحیح بخاری و مسلم میں زید بن خالد سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں:

''حدیبیہ کے مقام پر رات کے وقت ہونے والی بارش کے بعد آپ ﷺ نے ہمیں مخاطب کیا اور فرمایا: ''کیا تمھیں معلوم ہے کہ تمھارے رب نے آج رات کیا کہا ہے؟'' ہم نے کہا: اللہ اور رسول ہی جانیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میرے بندوں میں سے کچھ نے مجھ پر ایمان رکھتے ہوئے صبح کی ہے اور کچھ نے

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۲۳۰)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۵۳۷)

[3] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۵۶۷، ۱۵۶۸)

کفر کرتے ہوئے۔ جس نے کہا: ہمیں اللہ کے فضل و رحمت سے بارش ملی، وہ مجھ پر ایمان رکھنے والا اور کواکب، یعنی ستاروں کے ساتھ کفر کرنے والا ہے۔''[1]

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب اللہ آسمان سے برکت، یعنی بارش اتارتا ہے تو لوگوں کا ایک گروہ اس کے ساتھ کفر اور اس کا انکار کرتے ہوئے کہتا ہے: یہ فلاں فلاں ستارے کا کرشمہ ہے۔''[2]

صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''میری امت میں چار چیزیں جاہلیت کی ہیں: حسب و نسب پر فخر کرنا، نسبوں میں طعن کرنا، نوحہ گری کرنا اور ستاروں سے بارش طلب کرنا۔''[3]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: ﴿ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ﴾ [الواقعة: ٨٢] ''اور تم اپنا حصہ یہ ٹھہراتے ہو کہ بے شک تم جھٹلاتے ہو۔'' اور اس کی تفسیر میں فرمایا: ''یہ ستاروں سے بارش طلب کرنا ہے۔''[4]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تمام ائمہ سے اس کی ممانعت کی نصوص اس قدر زیادہ ہیں کہ یہاں ان کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔

ہماری اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اس کام کی اجرت، ہبہ اور بخششیں دینے والے، لینے والے اور اس کام میں معاون بننے والے تمام افراد کے لیے حرام ہے۔ جو برسرِ اقتدار اور صاحبِ استطاعت ہیں وہ اسے مٹانے کی کوشش کریں اور ایسے لوگوں کو دکانوں پر یا فٹ پاتھوں پر اڈے لگا کر یا لوگوں کے گھروں میں جا کر خدمات پیش کرنے سے روکیں، اگر یہ ایسا نہ کریں گے تو پھر اللہ ان کو پوچھ لے گا، جس نے فرمایا ہے:

﴿ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ﴾ [المائدة: ٧٩]

''وہ ایک دوسرے کو کسی برائی سے، جو انھوں نے کی ہوتی، روکتے نہ تھے۔''

فرمایا:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨١٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧١)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٢، ٧٣)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٣٤)

[4] تفسير الطبري (٢٧/٢٠٧۔ ٢٠٩)

﴿ لَوۡلَا یَنۡہٰہُمُ الرَّبّٰنِیُّوۡنَ وَ الۡاَحۡبَارُ عَنۡ قَوۡلِہِمُ الۡاِثۡمَ وَ اَکۡلِہِمُ السُّحۡتَ ؕ ﴾ [المائدة: ٦٣]

''انھیں رب والے لوگ اور علما ان کے جھوٹ کہنے اور ان کے حرام کھانے سے کیوں نہیں روکتے؟''

یہ لعنتی لوگ یعنی نجومی وغیرہ گناہ کی بات کرتے ہیں اور حرام کھاتے ہیں۔ اس پر سب مسلمانوں کا اجماع ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''لوگ جب برائی دیکھیں اور اسے تبدیل نہ کریں تو قریب ہے کہ اللہ ان کو عمومی عذاب سے دوچار کرے۔''[1]

ان خبیثوں، فسادیوں، رسولوں کے دشمنوں اور ستاروں کے پجاری صابیوں کے بچونگڑوں کے اس برے فعل سے کون سا فعل زیادہ برا ہے؟!

حنفا کے امام حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو انھی صابیوں اور ستارہ پرستوں کے بڑے بزرگ نمرود بن کنعان کی طرف ہی مبعوث کیا گیا تھا۔ صابیوں کے علما نجومی ہی تھے۔ عمومی طور پر جو بت پرستی بھی ہوئی، وہ اسی خبیث صنف کی رائے کا نتیجہ ہے۔ یہ لوگوں کا مال حرام طریقے سے کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔ جو بظاہر دین کا نام لینے والے، مگر پسِ پردہ انھی کے چبائے ہوئے لقمے کھاتے ہیں، وہ خدا کے اس فرمان کے مصداق ہیں:

﴿ وَ لَمَّا جَآءَہُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَہُمۡ نَبَذَ فَرِیۡقٌ مِّنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ ٭ۙ کِتٰبَ اللّٰہِ وَرَآءَ ظُہُوۡرِہِمۡ کَاَنَّہُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۰۱﴾ وَ اتَّبَعُوۡا مَا تَتۡلُوا الشَّیٰطِیۡنُ عَلٰی مُلۡکِ سُلَیۡمٰنَ ۚ وَ مَا کَفَرَ سُلَیۡمٰنُ وَ لٰکِنَّ الشَّیٰطِیۡنَ کَفَرُوۡا یُعَلِّمُوۡنَ النَّاسَ السِّحۡرَ ٭ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ عَلَی الۡمَلَکَیۡنِ بِبَابِلَ ہَارُوۡتَ وَ مَارُوۡتَ ؕ وَ مَا یُعَلِّمٰنِ مِنۡ اَحَدٍ حَتّٰی یَقُوۡلَاۤ اِنَّمَا نَحۡنُ فِتۡنَۃٌ فَلَا تَکۡفُرۡ ؕ فَیَتَعَلَّمُوۡنَ مِنۡہُمَا مَا یُفَرِّقُوۡنَ بِہٖ بَیۡنَ الۡمَرۡءِ وَ زَوۡجِہٖ ؕ وَ مَا ہُمۡ بِضَآرِّیۡنَ بِہٖ مِنۡ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰہِ ؕ وَ یَتَعَلَّمُوۡنَ مَا یَضُرُّہُمۡ وَ لَا یَنۡفَعُہُمۡ ؕ وَ لَقَدۡ عَلِمُوۡا لَمَنِ اشۡتَرٰىہُ مَا لَہٗ فِی الۡاٰخِرَۃِ مِنۡ خَلَاقٍ ؕ۟ وَ لَبِئۡسَ مَا شَرَوۡا بِہٖۤ اَنۡفُسَہُمۡ ؕ لَوۡ کَانُوۡا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۰۲﴾ ﴾ [البقرة: ١٠١، ١٠٢]

''اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے ایک رسول اس کی تصدیق کرنے والا آیا جو ان کے پاس ہے تو ان لوگوں میں سے ایک گروہ نے، جنھیں کتاب دی گئی تھی، اللہ کی کتاب کو اپنی پیٹھوں کے پیچھے پھینک دیا، جیسے وہ نہیں جانتے۔ اور وہ اس چیز کے پیچھے لگ گئے جو شیاطین سلیمان کے عہدِ حکومت میں پڑھتے تھے اور سلیمان نے کفر نہیں کیا اور لیکن شیطانوں نے کفر کیا کہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے اور (وہ اس چیز کے پیچھے لگ گئے) جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت اور ماروت پر اتاری گئی، حالانکہ وہ دونوں کسی ایک کو

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٣٣٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٦٨) صحيح الجامع (١٩٧٤)

نہیں سکھاتے تھے، یہاں تک کہ کہتے ہم تو محض ایک آزمائش ہیں، سوتو کفر نہ کر۔ پھر وہ ان دونوں سے وہ چیز سیکھتے جس کے ساتھ وہ مرد اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی ڈال دیتے اور وہ اس کے ساتھ ہرگز کسی کو نقصان پہنچانے والے نہ تھے مگر اللہ کے اذن کے ساتھ۔ اور وہ ایسی چیز سیکھتے تھے جو انھیں نقصان پہنچاتی اور انھیں فائدہ نہ دیتی تھی۔ حالانکہ بلاشبہہ یقیناً وہ جان چکے تھے کہ جس نے اسے خریدا آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں اور بے شک بری ہے وہ چیز جس کے بدلے انھوں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا۔ کاش وہ جانتے ہوتے۔"

اسی طرح پہلے اور پچھلے بڑے بڑے نجومیوں نے ہمیشہ یہ اعتراف کیا ہے کہ جو ان کے دعوے کے مطابق افلاک کی مصیبتیں متوقع ہوتی ہیں، وہ اہلِ ایمان، اہلِ عبادت اور دعائیں کرنے والوں کی عبادت، ایمان، دعا اور توکل علی اللہ کی برکت سے دور ہو جاتی ہیں اور یہ بھی اعتراف کرتے ہیں کہ ان نیک لوگوں کو دنیا و آخرت میں وہ ثواب حاصل ہوتا ہے جو ستاروں کی قوتوں کے بس میں نہیں۔ واللہ أعلم [1]

علمِ رمل کی حقیقت

سوال کیا یہ صحیح ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام رمل یعنی ریت میں مختلف ہندسے اور خط کھینچ کر غیب کی باتیں بتایا کرتے تھے، نیز کیا اس علم کو بروئے کار لانا حلال ہے یا نہیں؟

جواب لوگوں میں یہ جو علمِ رمل کے نام سے ریت وغیرہ میں خط کھینچ کر مستقبل کی خبریں بتانے کا رواج ہے، ادریس علیہ السلام ہوں یا کوئی اور نبی، کسی سے ثابت نہیں۔ اللہ اور رسول نے اس علم میں مشغول ہونے اور اس کے ذریعے مستقبل کی باتیں نکالنے کی کوشش کرنے کی کوئی اجازت نہیں دی۔ یہ تیروں کے ذریعے قسمت آزمائی کی قبیل سے ہے۔ واللہ أعلم [2]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۱۹۱/۳۵-۱۹۷)

[2] جامع المسائل (۱٦۹/۹)

یادداشت



Street no: 5, Hameed Colony, Gill Road, Gujranwala
+92-55-3823990 darabitayyab1@gmail.com
fb/darabitayyab www.darabitayyab.com

دار أبي الطيب
للبحث والتحقيق